مسلم پرسنل لا نمبر

مسلم پرسنل لا نمبر

ماہنامہ

زندگی

رامپور

مدیر:- سید احمد قادری۔

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۲ شلنگ
ہوائی ڈاک سے

سالانہ چندہ
ستان سے ۰۰-۔/10
ستان سے ۰۰-۔/10
ششماہی
ستان سے ۰۰-۔/5
ستان سے ۰۰-۔/5
قیمت مسلم پرسنل لا نمبر:- ۰-۔/3

جلد ۵۰،۵۱	شوال و ذیقعدہ ۹۲ھ مطابق دسمبر و جنوری ۷۲-۷۳ء	شمارہ: ۵-۶-۱

اس دائرے ○ میں سرخ نشان کا مطلب ہے

کہ آپ کی مدت خریداری اس شمارے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ اگر آپ کی طرف سے چندہ یا رسالہ بند کرنے کے لیے خط نہ مل سکا تو اگلا پرچہ ان شاء اللہ وی پی سے حاضر ہوگا۔ امید ہے کہ وی پی وقت پر وصول فرمائیں گے۔

منیجر "زندگی" رام پور۔ یوپی

مسلم پرسنل لا نمبر (۲)

ان شاء اللہ اگلا فروری ۷۳ء کا شمارہ "مسلم پرسنل لا نمبر ۲" ہوگا۔ متعدد اچھے اور مفید مقالات جو اس خاص نمبر میں نہیں آسکے وہ فروری کے شمارے میں شائع ہوں گے۔

منیجر زندگی رام پور

مالک۔ جماعت اسلامی ہند۔ ایڈیٹر سید احمد عروج قادری۔ پرنٹر پبلشر۔ احمد حسن۔ مطبع ناظم پریس، رام پور، یوپی

مقام اشاعت۔ زندگی، رام پور۔ یوپی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اشارات

(سیّد احمد قادری)

مسلم پرسنل لا میں تبدیلیوں کی کوشش انگریزوں کے عہد حکومت ہی سے شروع ہو چکی ہے لیکن ہم
ن سطروں میں عہد غلامی کی ان کوششوں پر تبصرہ کرنا نہیں چاہتے۔ جب ہمارے ملک پر آزادی کا
آفتاب طلوع ہوا تو مسلمانوں نے سوچا کہ اب ہم آزاد ہو گئے ہیں اس لئے ہماری تہذیب، ہماری
، ہماری انفرادیت اور کم سے کم ہمارے پرسنل لا پر کوئی آنچ نہ آئے گی بلکہ ہماری یہ تمام چیزیں
زاد فضا میں فروغ پائیں گی اور ہم امن و سکون سے اپنی صلاحیتیں ملک کی تعمیر میں صرف کر سکیں گے لیکن
ہوں نے جو کچھ سوچا تھا وہ صحیح ثابت نہیں ہوا۔ یکساں سول کوڈ کا مسئلہ اسی وقت زیر بحث آگیا جب
دستان کا دستور بن رہا تھا اور مسلم پرسنل لا پر خطرات کا بادل اسی وقت افق پر نمودار ہو گیا اور
اب ۲۵-۲۶ سال کی مدت میں وہ سیاہ بادل پورے افق کو گھیر چکا ہے۔ دستور میں ایک طرف تو
اقلیتوں کو بہت سے بنیادی حقوق دیئے گئے اور دوسری طرف رہنما اصولوں میں، یکساں سول کوڈ پورے
ملک میں نافذ کرنے کا وعدہ بھی کیا گیا۔ "سرکاری پالیسی کے رہنما اصول" میں دفعہ ۴۴ کے متن کا
رجمہ یہ ہے:

"حکومت شہریوں کے لئے ایک ایسا مشترکہ سول کوڈ رائج کرنے کے لئے جد و جہد
کرے گی جس کا نفاذ ہندوستان کے طول و عرض میں ہو۔"

دستور ساز اسمبلی کے متعدد مسلم و غیر مسلم ممبروں نے اس رہنما اصول پر اعتراض کیا تھا اور بعض

مسلمان ممبروں نے ترمیم بھی پیش کی تھی، لیکن ان کی ترمیم منظور نہیں کی گئی۔ ڈاکٹر امبیدکر نے جن کی نگرانی میں دستور بن رہا تھا اقلیت سے تعلق رکھنے والے ممبروں کو یہ یقین دہانی کرائی تھی اور دستور ساز اسمبلی میں اعلان کیا گیا:-

حکومت کو محض اختیار دیا جا رہا ہے جس کا یہ مطلب نہیں کہ مذہبی شخصی قوانین ختم کر دینا اس کے لئے لازم ہوگا۔ کسی صاحب کو یہ خطرہ نہیں ہونا چاہیئے کہ محض یہ اختیار مل جانے کے باعث حکومت فوراً اس پر عمل کرنے پر مصر ہو جائے گی خواہ ملک کے مسلمان یا عیسائی یا کوئی اور فرقہ اس سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ کرے۔ حکومت کے اختیار عملاً ہمیشہ محدود ہوتے ہیں، خواہ آپ انھیں لفظی طور پر کتنا ہی لامحدود کر دیں، کیوں کہ حکومت کو اپنے اختیارات کے استعمال میں مختلف فرقوں کے جذبات کا احترام کرنا ہی پڑتا ہے۔ کوئی گورنمنٹ اپنے اختیارات کا استعمال اس طرح نہیں کر سکتی جس کے نتیجے میں مسلمان بغاوت پر آمادہ ہو جائیں۔ اگر کسی وقت گورنمنٹ ایسا کرنے کی سوچے تو اسے فاترالعقل کہنا چاہیئے۔[1]

لیکن بہت جلد معلوم ہو گیا کہ یہ یقین دہانی سیاسی طفل تسلی کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ حکومت ہند نے دفعہ ۴۴ کو اپنا نصب العین بنائے رکھا ہے اور وہ بتدریج یکساں "سول کوڈ" کی طرف قدم بڑھا رہی ہے۔ وہ اپنے ملازمین پر بلاتفریق مذہب، تعدد ازواج کا دروازہ بند کر چکی ہے اور ان کے لئے یک زوجگی کو لازم قرار دے چکی ہے۔ وہ اسپیشل میرج ایکٹ پاس کر چکی ہے جس کے تحت ایک مسلمان عورت اپنا مذہب تبدیل کئے بغیر کسی غیر مسلم سے شادی کر سکتی ہے اور جس کے تحت وہ اپنے شوہر کی نصف جائداد کی مالک ہو جاتی ہے۔ صوبہ یوپی وغیرہ کی اسمبلیاں زرعی ایکٹ پاس کر چکی ہیں اور یہ ایکٹ مسلمانوں پر بھی نافذ ہیں۔ ان میں زرعی زمین کی وراثت کے ضابطے اسلامی شریعت کے بالکل خلاف بنائے گئے ہیں اور ابھی حال میں "لے پالک بل" پارلیمنٹ میں پیش ہو چکا ہے۔ مرکزی وزارت قانون نے حکومت کی نیت کو چھپایا بھی نہیں ہے بلکہ بآواز بلند اس کو ظاہر کیا ہے تاکہ مقتدی اپنے امام کی نیت سے بخوبی واقف ہو جائیں۔ جب "ہندو کوڈ بل" پاس ہو رہا تھا تو اس وقت کے مرکزی وزیر قانون مسٹر پاٹسکر نے اپنی ایک پریس کانفرنس میں کہا تھا:

"ہندو قوانین میں جو اصلاحات کی جا رہی ہیں وہ مستقبل قریب میں ہندوستان کی تمام آبادی پر نافذ کی جائیں گی، اگر ہم ایسا قانون بنانے میں کامیاب ہو گئے جو ہماری پچاس فیصدی آبادی

---

[1] طاہر محمود "مسلم پرسنل لا کے تحفظ کا مسئلہ" بحوالہ "دستور ساز اسمبلی کے مباحثے" نمبر ۷، صفحات ۹-۵۶۷

کیلئے ہو تو اس کا نفاذ باقی آبادی پر مشکل نہ ہوگا اس قانون سے پورے ملک میں یکسانیت پیدا ہوگی ۔"

ابھی جو "متبنیٰ بل" زیر غور ہے اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے موجودہ وزیر قانون نے صراحت کیساتھ کہا ہے کہ یہ یکساں سول کوڈ کی طرف پہلا قدم ہے۔ جیسا کہ اوپر گذرا یہ پہلا قدم نہیں ہے بلکہ پہلے بھی کئی قدم اٹھائے جا چکے ہیں۔ ان اقدامات و اعلانات کے بعد حکومت کا ارادہ بالکل واضح ہو چکا ہے۔ کانگریس الیکشن کے وقت جو اعلانات کرتی ہے یا حکومت کے ذمہ دار افراد خاص مواقع پر مسلمانوں کو جو تسلی دیتے ہیں اس سے دھوکا نہیں کھانا چاہیئے مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کا عبرتناک معاملہ ہمارے سامنے ہے ۔۔ سوال یہ ہے کہ اس صورتحال میں ہم مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیئے ؟

ہمارے نزدیک اس سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ حکومت کو مداخلت فی الدین کے اس ارادے سے باز رکھنے کے لئے ہم مسلمانوں کو پورے عزم اور حوصلہ کے ساتھ، ایک سخت جدوجہد اور کشمکش (اسٹرگل) کے لئے تیار رہنا چاہیئے اور اس جدوجہد میں ان مذہبی غیر مسلموں سے بھی تعاون حاصل کرنا چاہیئے جو کسی کے مذہب میں مداخلت کو غلط سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک مسلمانوں کے پرسنل لا، کا تحفظ دو باتوں پر موقوف ہے، ایک یہ کہ دستور ہند کے رہنما اصول کی دفعہ ۴۴ ختم کیجائے اور دوسری یہ کہ شخصی قوانین سے متعلق مقدمات کے فیصلہ و تصفیہ کا اختیار، دین دار اور اسلامی شریعت سے واقف مسلمان ججوں اور قاضیوں کے حوالہ کیا جائے۔ میں نے اس پر اختصار کیساتھ اظہار خیال اپنی تحریر "قضاء شرعی کا قیام ضروری ہے" میں کیا ہے جو اسی شمارے میں شائع ہو رہی ہے۔ ہمارے نزدیک کوشش کی صحیح سمت یہی ہے۔

جدوجہد کی صحیح سمت متعین کر لینے کے بعد کوشش کا ایک رخ تو وہ ہے جس کا تعلق وقت کی حکومت سے ہے اور دوسرا رخ وہ ہے جسکا تعلق خود ہم مسلمانوں سے ہے جن میں ہم حکومت کی منظوری کے محتاج نہیں ہیں۔ اس سلسلے کی چند تدابیر ہم یہاں اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں:

(۱) سب سے پہلی تدبیر یہ ہے کہ شرعی قوانین پر مسلمان خود عمل کریں۔ نکاح، مہر، طلاق، وراثت، ہبہ، وصیت اور اسی طرح کے شرعی احکام پر اگر مسلمان خود عمل نہ کریں یا اسکے خلاف عمل کریں تو پھر مسلم پرسنل لا کے تحفظ اور قضاء شرعی کے قیام کا مطالبہ وہ کس بنیاد پر کریں گے اور ان کی کوشش موثر کس طرح ہوگی ؟ علماء اور مسلمان تنظیموں کے رہنما، اہل علم اور اخبارات و رسائل کو پوری کوشش کرنی چاہیئے کہ جہاں کہیں مسلمان، شریعت کے خلاف، مقامی رسم و رواج یا خاندانی روایات پر عمل کر رہے ہوں وہ اسے ترک کر دیں اور قوانین شریعت پر عمل شروع کر دیں۔

(۲) لوک سبھا، راجیہ سبھا اور ریاستی اسمبلیوں کے مسلمان ممبروں کو اس بات پر آمادہ کرنا چاہیئے کہ وہ مسلم پرسنل لا کے تحفظ اور قضاء شرعی کے قیام کے مطالبہ میں مسلمانوں کا ساتھ دیں اور مسلمانوں سے متعلق ہر ایسے بل کی مخالفت کریں جو شریعت کے کسی قانون کے خلاف ہو مثال کے طور پر اس وقت متبنّٰی (لے پالک) بل لوک سبھا کے سامنے ہے اس کے خلاف انھیں اپنی آواز بلند کرنی چاہیئے۔

(۳) ایسے تمام انصاف پسند غیر مسلموں کا تعاون حاصل کرنا چاہیئے جو دستور میں اقلیتوں کو دئے ہوئے حقوق کے حامی ہیں اور جو مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں حکومت کی مداخلت پسند نہیں کرتے، اس طرح عیسائیوں اور دوسری اقلیتوں کو بھی ساتھ لینا چاہیئے جن کے پرسنل لا یکساں سول کوڈ کی زد میں آجائیں گے۔

(۴) مسلمان خواتین کو خصوصیت کے ساتھ اس جدوجہد میں حصہ دار بنانا چاہیئے کیونکہ عام طور پر انہی کی مظلومیت کا نعرہ لگا کر مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کا جواز پیدا کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں کچھ کوششیں ہوئی ہیں اور متعدد بڑے شہروں میں اہم اجتماعات منعقد ہو چکے ہیں لیکن انھیں پر اکتفا کرنا صحیح نہیں ہوگا کیونکہ ہمیں اپنی جدوجہد اس وقت تک جاری رکھنی ہوگی جب تک حکومت ہمارا مطالبہ تسلیم نہ کرے۔ دفعہ

(۵) مسلم پرسنل لا کی دین اسلام میں کیا اہمیت ہے اس کو تمام مسلمانوں اور غیر مسلموں پر واضح کرتے رہنا چاہیئے۔ جہاں تک تعلیم یافتہ مسلمانوں پر اسے واضح کرنے کا تعلق ہے اس پر خاصہ کام ہوا ہے۔ متعدد کتابیں، پمفلٹ، مضامین اور اخبارات و رسائل کے مسلم پرسنل لا نمبر شائع ہو چکے ہیں اور ماہنامہ زندگی کا یہ خاص نمبر بھی اسی کوشش کا ایک حصہ ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی واضح کرتے رہنے کی ضرورت ہے کہ جس شرعی قوانین کے مجموعہ کو مسلم پرسنل لا کہا جاتا ہے وہ انگریزوں کے وضع کئے ہوئے نہیں ہیں بلکہ اللہ رب العالمین نے انھیں اپنی کتاب قرآن مجید میں نازل فرمایا ہے۔ اس وضاحت کی ضرورت یوں ہے کہ جو لوگ مسلم پرسنل لا میں تبدیلی چاہتے ہیں وہ مسلمانوں کو یہ مغالطہ بھی دے رہے ہیں کہ مسلمانوں کے لئے مسلم پرسنل لا انگریزوں نے وضع کیا تھا لہٰذا اس میں تبدیلی کرنا دین میں مداخلت نہیں ہے۔ یہ باور کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے کہ وہ لوگ اتنی بات نہ جانتے ہوں کہ مسلمانوں کے شخصی قوانین کے لئے انگریزی زبان میں صرف "مسلم پرسنل لا" کی اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ انگریزوں نے وہ قوانین وضع نہیں کئے ہیں۔ کیا وہ حضرات یہ تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے لئے مثال کے طور پر تعدد ازدواج کا قانون انگریزوں نے وضع کیا تھا؟ دراصل وہ جان بوجھ کر مسلمانوں کو دھوکہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ہم نے کوشش کی ہے کہ ماہنامہ زندگی کا یہ خاص نمبر اس موضوع سے متعلق شائع شدہ نمبروں پر اضافہ ثابت ہو۔ ہم نے اپنے علم وفہم کے مطابق مسلمانوں کے مطالبے اور جدوجہد کے لئے صحیح سمت بھی متعین کی ہے اور متعدد تدابیر بھی سامنے رکھی ہیں۔ اس خاص نمبر کا دوسرا امتیاز یہ ہے کہ ہم نے مسلم پرسنل لا میں تبدیلی چاہنے والوں کے دو طویل مقالے شائع کئے ہیں تاکہ یکجا طور پر ان لوگوں کے خیالات، دلائل اور تجاویز قارئین زندگی کے سامنے آجائیں۔ اسی کے ساتھ ہم نے ان دو مقالات کے مدلل معقول جوابات بھی شائع کئے ہیں۔ ہم نے تھوڑی کوشش کر کے مستشرقین اور ان کے ہم نوا ان مسلمانوں کے خیالات بھی شائع کئے ہیں جو ہندوستان کے مغرب زدہ مسلمانوں کے اولین قائد و رہنما ہیں اور ان مدین نے یہ مقام حاصل کیا ہے کہ اب خود مستشرقین جب مسلم پرسنل لا کے مسائل پر اظہار خیال کرتے ہیں مسلمان قائدین کے حوالے دیتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ آج فیضی صاحب اور انھیں کی طرح دوسرے مسلمان جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کا اصل ماخذ کیا ہے۔

ہم نے اس خاص نمبر میں مختلف ایکٹوں کا ایک مختصر تعارف بھی دیا ہے۔ مقالات میں ان ایکٹوں کے حوالے آتے رہتے ہیں اب ان کو سمجھنا آسان ہوگا اس سے دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ قارئین زندگی اندازہ کرسکیں گے کہ انگریزوں کے عہد سے اب تک کس طرح رفتہ رفتہ شریعت اسلامیہ کے عائلی قوانین کو محدود سے محدود تر کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ کوشش مسلسل جاری ہے۔ موجودہ حکومت ہند کا نقطۂ نظر واضح ہے۔ وہ یکساں سول کوڈ کی طرف اقدامات کر رہی ہے۔

ہم نے مسلم پرسنل کی دینی ومذہبی حیثیت اور اس سے متعلق چند مسائل پر مستند، مدلل اور سنجیدہ مقالات شائع کرنے کی کوشش کی ہے۔ "وراثت سے یتیم پوتے کی محرومی" کے مسئلے پر اب تک اتنی تفصیل سے نہیں لکھا گیا تھا یا کم سے کم راقم الحروف کی نظر سے اتنا مفصل کوئی مقالہ نہیں گزرا۔ "مرد کے حق طلاق" پر اعتراضات اور ان کے جوابات بھی شاید پہلی بار اتنی تفصیل سے پیش کئے گئے ہیں۔ مسلم ممالک میں جو تبدیلیاں بعض مسائل میں کی گئی ہیں ان پر کوئی مقالہ شریک اشاعت نہیں کر سکا۔ ویسے جو تبدیلیاں کی گئی ہیں وہ ہمارے لئے ہرگز قابل تقلید نہیں ہیں اور مقالات میں اس پر ضمناً لکھا بھی گیا ہے۔

جن مقالہ نگاروں نے میری درخواست قبول کر کے اپنے مقالے بھیجے ہیں میں ان کا بہت شکر گزار ہوں اور جن ممتاز اہل علم نے اپنے مقالات نہیں بھیجے لیکن میرے خطوط کے حوصلہ افزا جوابات دیئے

میں ان کا بھی شکر گذار ہوں — مسلم پرسنل لا سے متعلق ہمارے پاس جو مقالات تھے یا اہل علم نے بھیجے
ہم ان سب کو اس خاص نمبر میں شائع نہیں کر سکے۔ ایک مصری عالم کے قابل قدر مضمون کا ترجمہ جو خود
راقم الحروف نے کیا تھا وہ بھی قلت گنجائش کی وجہ سے شائع نہیں ہو سکا۔
خیال ہے کہ زندگی کا آئندہ شمارہ اس خاص نمبر کا حصہ دوم ہوگا۔ آخر میں یہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ
تعالیٰ ہماری اس محنت کو قبول فرمائے۔ لوگوں کے لئے یہ نمبر کارآمد ثابت ہو وہ مقالات سے فائدہ
اٹھائیں اور ان میں مسلم پرسنل لا کے تحفظ کی جد وجہد کے لئے عزم اور حوصلہ پیدا ہو۔

بقیہ مضمون حکومت کو مسلم پرسنل لا میں مداخلت کا کوئی حق حاصل نہیں ہے) اسی طرح اس وقت عدالتوں
میں جو محمڈن لا رائج ہے وہ فی الواقع اینگلو محمڈن لا ہے اور اس میں متعدد قوانین شریعت سے متصادم یا
مختلف ہیں ان تمام قوانین پر نظر ثانی کر کے انھیں کتاب وسنت اور فقہ اسلامی کے مطابق بنانے کی ضرورت ہے
اس قسم کے غیر اسلامی قوانین یا قوانین مروجہ کے غیر شرعی اجزاء کو شریعت اسلامیہ کے مطابق بنانے کا کام
ظاہر ہے کہ ہر کہ ومہ کے بس کی بات نہیں بلکہ اس کے لئے وہی لوگ اہل ہیں جن کو کتاب وسنت کا کماحقہ علم حاصل
ہو اور جو اسلامی فقہ، اسلامی فلسفہ قانون اور اسلامی تاریخ پر عبور کے ساتھ ساتھ ان معاملات میں بصیرت بھی
رکھتے ہوں۔

مندرجہ بالا امور کی روشنی میں بعض باتیں قابل توجہ ہیں جو درج ذیل ہیں:-

مسلمانوں کے مطالبات

مسلم پرسنل لا کے سلسلہ میں حکومت سے مسلمانوں کا مطالبہ ہے کہ:-
(۱) رہنما اصولوں میں سے دفعہ ۴۴ منسوخ ہو (۲) مسلم پرسنل لا میں حکومت
کوئی ترمیم نہ کرے (۳) اسپیشل میرج ایکٹ کا اطلاق مسلمانوں پر نہ ہو (۴) متبنیٰ بل ۱۹۷۲ء واپس لیا جائے یا
کم از کم مسلمانوں کو اس کے دائرہ اثر سے خارج رکھا جائے (۵) حکومت آئندہ کوئی ایسا بل نہ لائے جس کا منشا
یکساں سول کوڈ کو جزاً جزاً نافذ کرنا ہو، جیسا کہ وہ اس وقت کر رہی ہے۔ جب تک یہ مطالبات پورے نہ
ہوں گے مسلمانوں کو چین نصیب نہ ہوگا اور وہ یہ محسوس نہ کر سکیں گے کہ ان کا دین وایمان اور ان کی
شریعت وتہذیب ملک میں محفوظ ہے۔

یقیناً طوفان شدید ہے لیکن اگر حکمت ودانش، عزم واتحاد اور توکل علی اللہ سے کام لے کر آگے بڑھیں
تو نصرت ایزدی سے اس طوفان میں سے اپنے لئے راستہ نکال سکتے ہیں۔ واللہ خیر الناصرین۔

جناب محمد یوسف امیر جماعت اسلامی ہند

حکومت کو مسلم پرسنل لا میں مداخلت کا کوئی حق حاصل نہیں ہے

آپ کسی بھی راسخ العقیدہ مسلمان سے سوال کیجیے کہ وہ اسلامی شریعت سے اتنی محبت کیوں کرتا ہے تو اس کا سیدھا سادا جواب وہ یہ دے گا کہ ایک فرد جو اللہ اور رسولؐ سے محبت کرتا ہے ان کی اطاعت و فرماں برداری کا عہد کر چکا ہے، اور اس عہد کو اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ کہہ کر دن رات میں بار بار دہراتا رہتا ہے۔ اس کی گھٹی اور فطرت میں یہ بات ودیعت ہو چکی ہے کہ وہ اس دین اور شریعت سے محبت کرے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کی معرفت نازل فرمایا ہے اور اس طرح اپنی چند روزہ زندگی میں خدا کے ساتھ اپنی وفاداری کا ثبوت پیش کرے۔

آپ اس سے اگر یہ سوال کریں کہ وہ اپنے پرسنل لا میں ترمیم کیوں نہیں چاہتا تو وہ دو ٹوک لفظوں میں یہی کہے گا کہ چونکہ اسلامی شریعت کو وہ مکمل اور دین کا جز سمجھتا ہے نیز تمام دنیا کے قوانین سے بالا و برتر اصلح اور کامل سمجھتا ہے۔ اس لئے وہ مسلم پرسنل لا میں جو شریعت اسلامیہ کا ایک حصہ ہے کسی کتر بیونت کا قائل نہیں ہے۔

وہ آپ کو یہ بھی بتلائے گا کہ وہ اس بات پر یقین کامل رکھتا ہے کہ اس چند روزہ دنیاوی زندگی کے مقابلہ میں آخرت کی زندگی بدرجہا بہتر بھی ہے اور دائمی بھی اور وہ یوم حساب کی اس باز پرس سے

ڈرتا ہے کہ اس نے اس مختصر سی زندگی میں خدا اور اس کے رسولؐ کے احکام کی فرمانبرداری کیوں نہیں کی۔ اس کا عقیدہ ہے کہ اسلام صرف نماز، روزہ کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک مکمل دین ہے جس کے ہر جز کی اتباع اسی طرح لازم ہے جس طرح نماز روزہ کے احکام کی۔ لہٰذا اگر وہ ان تمام احکام کی پابندی کرتا ہے جن میں اس کا پرسنل لا بھی شامل ہے تو وہ امید رکھتا ہے کہ خدا اپنے فضل سے اس کو دائمی مسرت کے اس مقام میں داخل کرے گا جس کا نام جنت ہے، لیکن اگر اس نے کسی حکم کی نافرمانی کی خواہ وہ پرسنل لا ہی کے سلسلہ میں کیوں نہ ہو تو اس کو سخت عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا جس کے تصور ہی سے اس کی روح لرز جاتی ہے۔

وہ بہت سنجیدگی کے ساتھ آپ سے یہ بھی کہے گا کہ خدا کے ماننے والے اگر اس کے کسی ایک حکم میں کتر بیونت کرنے لگیں تو ایسے لوگ نہ صرف یہ کہ دوسرے احکام خداوندی کی کانٹ چھانٹ میں جری ہو جائیں گے بلکہ کسی بھی مروجہ قانون اور لیجسلیچر کے احکام کی پابندی سے بھی گریز کرنے لگیں گے۔

ممکن ہے کہ حکومت ہماری ان باتوں کو فرقہ واریت پر محمول کرے کیونکہ ہمارا تعلق جماعت اسلامی سے ہے اور جماعت کو حکومت آئے دن بلاوجہ مطعون کرتی رہتی ہے، لیکن اگر اپنے مذہب کی باتیں بیان کرنے اور ان پر یقین کامل رکھنے کا نام فرقہ واریت ہے تو ہم بخوشی اس الزام کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں، البتہ حکومت کو یہ تبلائے دیتے ہیں کہ یہ خیالات صرف جماعت اسلامی ہی کے نہیں ہیں بلکہ سارے ہی مسلمانوں کے ہیں۔ اس سلسلے میں مناسب ہوگا کہ انڈین نیشنل کانگریس کے ایک سابق صدر اور حکومت ہند کے ایک ممتاز مرکزی وزیر مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی رائے غور سے سن لی جائے جن کے الفاظ یہ ہیں:۔

"اسلام کے احکام کوئی راز نہیں جن تک گورنمنٹ کی رسائی نہ ہو، چھپی ہوئی کتابوں میں مرتب ہیں اور مدرسوں کے اندر شب و روز یہ درس و تدریس دیتے ہیں، پس گورنمنٹ کو چاہیے کہ صرف اس بات کی جانچ کرے کہ واقعی اسلام کے شرعی احکام ایسے ہی ہیں یا نہیں؟ اگر ثابت ہو جائے کہ ایسا ہی ہے تو پھر صرف دو ہی راہیں گورنمنٹ کے سامنے ہونی چاہئیں۔

یا مسلمانوں کے لئے ان کے مذاہب کو چھوڑ د[illegible] ایسی بات نہ کرے جس سے ان کے مذہب میں مداخلت ہو ...... یا [illegible] گے اس کو مسلمانوں کے مذہبی احکام کی کوئی پروا نہیں ہے، نہ اس پالیسی پر قا[illegible] ن کے مذہب میں مداخلت نہ ہوگی۔ اس کے بعد مسلمانوں کے لئے بھی نہایت آ[illegible] ے گا کہ اپنا وقت بے سود شور و فغاں میں ضائع نہ کریں اور برٹش گورنمنٹ ا[illegible] ی دونوں میں سے کوئی ایک بات اپنے لئے پسند کریں۔" (مسئلہ خلافت و جزیرۂ [illegible] ۲۰[illegible] - ۲۰۵ طبع ثانی)

ہمیں پورا یقین ہے کہ مولانا آزاد مرحو[illegible] ہ ہوتے تو وہ بھی "اسلام کے شرعی احکام" کے سلسلہ ہی جماعت اسلامی ہی کی صف میں نظ[illegible]

دراصل یہ باتیں جماعت اسلامی یا ہ[illegible] کے مسلمانوں کی ہی من گھڑت نہیں ہیں بلکہ اسلام کا یہ مسلمہ اصول اور مسلمانان عالم کا ہمیشہ [illegible] متفقہ مسلک رہا ہے کہ احکام خداوندی میں کوئی بھی ترمیم نہیں کی جاسکتی۔

ایک بے وزن بات

مسلمانوں ک[illegible] ینے کے لیے یہ بات بار بار دہرائی جاتی ہے کہ فلاں مسلم ملک نے [illegible] ل لا میں تبدیلی کردی ہے، اس لیے ہندی مسلمانوں کو بھی اپنے پرسنل لا میں تبدیلی ک[illegible] ہیے۔ لیکن یہ دلیل ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ فلاں فلاں مسلمان چونکہ شراب پیت[illegible] کھیلتے ہیں تو کیوں نہ دوسرے مسلمان بھی ایسا ہی کریں۔ ظاہر ہے کہ ایسے استدلال کو استدلال کہنا [illegible] کی توہین ہے۔ یہاں سوال اصول کا ہے نہ کہ کسی کے عمل کا۔ اگر کسی کا عمل اصول کے خلاف ہے تو [illegible] کو غلط قرار دیا جائے گا۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ شریعت کے کسی منصوص جزء میں ترمیم کا ک[illegible] ق حاصل نہیں ہے، خواہ اقدام کوئی کرے، بفرض محال ساری دنیا کے مسلمان متفقہ طور پر [illegible] خداوندی میں ترمیم کردیں تو ان کا یہ اقدام غلط ہی ہوگا کیوں کہ وہ اس کے قطعی مجاز نہیں ہی[illegible] م صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے بموجب کہ "لا طاعة لمخلوق فی معصیة [illegible] تمام احکام و قوانین دیوار پر دے مارنے کے قابل ہیں جو کتاب و سنت سے بے نیاز ہو ک[illegible] نہ ہوں۔"

جو لوگ ایسے ا[illegible] کریں ان کو ڈرنا چاہیے کہ خدا کی سزا بڑی سخت ہے۔ اب ان تبدیلیوں

کی بھی حقیقت جان لینی چاہیے جو بعض مسلم [illegible] نے مسلمانوں کے پرسنل لا میں کی ہیں۔ یہ حقیقت فی الاصل بس اتنی ہے کہ جن ممالک میں مسلم [illegible] لا میں ترمیم و اصلاح کی گئی ہے کہ ان سب میں سوائے دو ملکوں کے — یہ ترمیم و اصلاح [illegible] حدود شریعت کے اندر رہتے ہوئے کی گئی ہے۔ یعنی کسی ایک ہی مکتب فقہ کی بجائے مختلف [illegible] مسالک کو سامنے رکھ کر اخذ و انتخاب کا طریقہ اختیار کرکے ایک مجموعۂ قوانین مدن کر لیا گیا ہے یعنی اس مجموعۂ قوانین کا سرچشمہ بہرحال اسلامی ذخیرۂ فقہ ہی ہے۔ پھر اس سلسلے میں جو کچھ کیا ہے وہ خود مسلمانوں ہی نے کیا ہے۔ اور علماء و ماہرین قانون اسلام کے مشورے سے کیا ہے غیر مسلمین کا اس میں کوئی دخل نہیں رہا ہے۔ اس ذیل میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ان مسلمان ملکوں نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لیے یکساں سول کوڈ بنانے کی کوشش نہیں کی ہے جیسا کہ ہمارے ملک کے سیاست دانوں کے پیش نظر ہے۔ بلکہ غیر مسلموں کے لیے ان کے پرسنل لا محفوظ رکھے گئے ہیں۔

اس بات کو پھر ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ اگر کسی مسلم ملک نے کوئی ایسی تبدیلی کی بھی ہو جو قرآن و سنت کے خلاف ہو تو خدا اور رسول کے مقابلہ میں یہ ایک باغیانہ روش اور غیر مجاز عمل ہے جس کو نہ تو نظیر بنایا جا سکتا ہے نہ اس کو بنیاد بنا کر قرآن و سنت کے مطابق عمل کرنے پر اصرار کرنے والوں کے مقابلہ میں کوئی حجت قائم کی جا سکتی ہے۔ کتاب و سنت ہی دراصل مسلمانوں کی پوری زندگی کے لیے مشعل راہ ہیں۔ ان کا ہر چھوٹا بڑا حکم ان کے لیے واجب الاتباع ہے۔

ایک غلط دعویٰ عام طور سے یہ دعویٰ بھی کیا جاتا ہے کہ ہندوستان کے دستور کی رو سے پارلیمنٹ کو مسلم پرسنل لا میں ترمیم کا حق حاصل ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ دستور ہند کے کچھ احرار بنیادی ہیں اور کچھ غیر بنیادی — ان بنیادی [illegible] میں ترمیم کا کسی پارلیمنٹ کو اختیار حاصل نہیں ہے۔ ہندوستان کے شہریوں نے ملکی ڈھانچے [illegible] نظام کو اس وجہ سے قبول کیا ہے کہ اس میں بنیادی حقوق کی دفعات موجود ہیں۔ ان حقوق میں [illegible] ضمانت سے اندیشہ ہے کہ ایک نئے انقلاب کا دروازہ کھل جائے۔ جس میں شہریوں کے [illegible] حقوق کی مستحکم ضمانت دی گئی ہو۔ ہندوستانی شہری اس بات کے قائل نہیں ہیں کہ عارضی [illegible] کامیابی حاصل کرنے والی پارٹیوں کی خواہشات پر ہوا کے اکھڑے ہوئے پتوں کی طرح [illegible] رہیں۔ بلکہ انھوں نے

بجا طور پر کچھ ایسی مستقل بنیادوں کو دستور میں جگہ دے رکھی ہے جو بنیادی انسانی حقوق کی ضامن ہیں اور اہل ملک کی ہر اٹھنے والی قیادت کو پابند کیا ہے کہ وہ ان بنیادوں میں رخنہ اندازی نہ کرے۔

یہ صحیح ہے کہ دستور ہند میں بنیادی حقوق کے باب کے بعد رہنما اصولوں کے باب کے تحت ایک دفعہ میں مشترکہ سول کوڈ کا تصور بھی دیا گیا ہے لیکن لوگوں کو مغالطہ میں نہ رہنا چاہئے کہ ریاست اس کی عملاً بھی پابند ہے۔ اس سلسلے میں ایک واضح مثال شراب بندی کے قانون کی ہے۔ جو رہنما اصولوں میں درج ہے لیکن حکومت سے ایک بار نافذ کر کے اب دھیرے دھیرے ختم کرتی جارہی ہے۔ اس ضمن میں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ دستور ہند کی رو سے کسی شہری کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ حکومت اگر کسی رہنما اصول پر عملدرآمد کرنے سے قاصر رہے تو عدالتی چارہ جوئی کر کے اسے مجبور کیا جاسکے۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ دستور ہند میں یکساں سول کوڈ کی دفعہ ۴۴ دستور کے چوتھے باب کا ایک جز ہے۔ دستور کے چوتھے باب میں چند وہ رہنما اصول مندرج ہیں جن کو پیش نظر رکھ کر حکومت کو قانون سازی کرنی ہے۔ دفعہ ۴۴ کے الفاظ یہ ہیں:۔

”ریاست ملک کے تمام شہریوں کے لیے ایک مشترک سول کوڈ مہیا کرنے کی کوشش کرے گی

دستور کے باب سوم کا عنوان ہے ”بنیادی حقوق“ اور اس باب میں ہندوستان میں رہنے والے تمام ہی باشندوں کے لیے چند حقوق کو ان کے بنیادی حقوق کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے اور ان کے تحفظ کی ضمانت دی گئی ہے۔ ان بنیادی حقوق میں سے ایک حق مذہب کو اختیار کرنے، اس پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کا ہے۔ (دفعہ ۲۵) اور اسی باب میں دفعہ ۲۹ کے ذریعہ یہاں کے شہریوں کے ہر طبقہ کو اپنے مخصوص کلچر کو برقرار اور محفوظ رکھنے کے حق کی ضمانت دی گئی ہے

دستور ہند کے ان دونوں ابواب یعنی باب سوم اور باب چہارم کے تقابلی مطالعہ سے یہ بات نکھر کر سامنے آتی ہے کہ بنیادی حقوق کو رہنما اصولوں پر فوقیت اور بالادستی حاصل ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اگر کوئی رہنما اصول کسی بنیادی حق سے متصادم ہو تو اس رہنما اصول کو پس پشت ڈال دیا جائے گا۔ اس فرق کو متعین کرنے والے چند وجوہ یہ ہیں:۔

بنیادی حقوق کے متعلق دستور ہی کی دفعہ ۳۲ میں اس بات کی صراحت کر دی گئی ہے

کہ ہر بنیادی حق کو سپریم کورٹ کے ذریعہ نافذ کرایا جا سکے گا۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ دفعہ ۳۲ کی گنجائش
دفعہ ۲۲۶ سے مستزاد ہے جس کے تحت ہر ہائی کورٹ میں کسی بھی حق کے نفاذ کے لیے رٹ داخل
کی جا سکتی ہے۔ اس دفعہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر ریاست کسی بھی فرد کو کسی قانون کے ذریعے یا کسی
عاملانہ حکم کے ذریعہ اس کے کسی بنیادی حق سے محروم کرے تو وہ اس قانون یا حکم کو عدالت
میں چیلنج کر کے اس کی منسوخی کا فیصلہ حاصل کر سکتا ہے۔

لیکن رہنما اصولوں کے تعلق سے ایسی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی ہے اور قانون دانوں کے
درمیان یہ بات متفق علیہ ہے کہ اگر ریاست کسی رہنما اصول کو اختیار کرنے میں قصور اور کوتاہی
کرے تو کسی عدالت کے ذریعہ ریاست کو اسے اختیار کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اس
صورت حال سے بھی بنیادی حقوق کی رہنما اصولوں پر بالادستی واضح ہوتی ہے۔

بنیادی حقوق کو دفعہ ۱۳ ضمن ۲ کے ذریعے مزید مستحکم کر دیا گیا ہے اس دفعہ کی رو سے ریاست
کے اختیارات قانون سازی پر یہ صریح تحدید عائد کی گئی ہے کہ ریاست کوئی ایسا قانون نہیں
بنا سکتی جس سے باب سوم میں مندرج بنیادی حقوق میں سے کسی حق پر کوئی ضرب پڑتی ہو۔
رہنما اصولوں کے باب میں ایسی کوئی مثبت یا منفی نوع کی دفعہ شامل نہیں ہے۔ جس سے
ریاست پر کوئی لزوم عاید ہوتا ہے یا شہریوں کے حقوق کو محدود کیا گیا ہو۔

دستور کے باب سوم میں جن بنیادی حقوق کی ضمانت دی گئی ہے وہ اپنی نوع میں بنیادی
انسانی حقوق ہیں جو انسان کے فطری عز و شرف کا خاصہ ہیں۔ اور جن کو آج کی ہر متمدن ریاست
تسلیم کرتی ہے۔ نیز وہ اقوام متحدہ کے منشور برائے بنیادی حقوق میں بھی شامل ہیں۔ اور اس
منشور پر دستخط کر کے حکومت ہند نے بھی ان کو تسلیم کر لیا ہے۔ اسی لیے اس باب سوم میں بیشتر
بنیادی حقوق کی ضمانت (بہ شمول دفعہ ۲۵ میں دی ہوئی مذہبی آزادی کے) تمام لوگوں کے لیے ہے
جب کہ یکساں سول کوڈ کا دائرہ صرف ہندوستان کے شہریوں تک ہی محدود ہے۔ جس کا مطلب
یہ ہے کہ مذہبی آزادی کے بنیادی حق سے ہندوستان میں رہنے والا مقیم کوئی بھی شخص حتی
کہ ایک غیر شہری بھی جو عارضی طور پر ہندوستان میں مقیم ہو مستفید ہو سکتا ہے۔ اور اس
کے تحفظ کے لیے ہندوستان کی عدالتوں کی پشت پناہی اسے حاصل ہوگی۔ رہنما اصول کے

مقابلے میں بنیادی حقوق کا یہ علوم بھی ان کی بالادستی کو ظاہر کرتا ہے۔

اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگر پارلیمنٹ یا کوئی ریاستی مجلس قانون ساز ایسا قانون وضع کرے جو دستور میں دیئے ہوئے بنیادی حقوق سے متصادم ہو تو وہ قانون غیر آئینی ہوگا۔ اور یہی بات یکساں سول کوڈ کے لیے بھی ہے۔

یہ حقیقت بھی مسلمہ ہے کہ پارلیمنٹ ایک ایسا ادارہ ہے جو دستور ہند کی بعض دفعات کے نتیجے میں وجود میں آیا ہے۔ اس لیے اس کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ دستور کے صحیح منشا کے خلاف کوئی قانون وضع کرے اور اس کے ذریعہ اقلیتوں کے بنیادی حقوق کو غصب کرلے دستور ہر حال میں پارلیمنٹ سے بالاتر ہے۔ اس کی بالادستی کے علی الرغم پارلیمنٹ اگر کوئی ایسا قانون وضع کرتی ہے جو اس کے بنیادی حقوق سے متصادم ہو تو یہ سمجھا جائے گا کہ پارلیمنٹ نے اپنے حقوق سے تجاوز کیا ہے۔ اور ان سب لوگوں کو جو ایسا قانون وضع کرنے میں کسی حیثیت سے شریک ہوں یہ سمجھا جائے گا کہ ان کا یہ اقدام حلف وفاداری کے خلاف ہے جو انہوں نے دستور ہند کے مطابق عمل کرنے کے سلسلے میں اٹھایا ہے۔

دستور ہند کی مذکورہ بالا خصوصیات کی بنا پر یہ نتیجہ نکالنا بالکل صحیح ہے کہ پارلیمنٹ کو مسلم پرسنل لا میں ترمیم کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ اس لیے کہ مسلم پرسنل لا دین اسلام کا ایک اہم جزء ہے۔ اور اسلامی کلچر میں داخل ہے۔ اس لیے کوئی ایسا قانون نہیں بنایا جا سکتا جو اس کلچر پر ضرب لگاتا ہو۔

مشترکہ سول کوڈ کی ایک جھلک

مسلم پرسنل لا کے سلسلہ میں ہمیں ایک اور اندیشہ بھی لاحق ہے جس سے خبردار رہنے کی ضرورت ہے یہ اندیشہ اس شکل میں سامنے آرہا ہے کہ اس وقت ایسے متعدد قوانین منظور کئے گئے اور کئے جا سکتے ہیں جو مسلم معاشرہ کے شخصی قوانین پر اثر ڈالنے والے ہیں اور جو مشترک سول کوڈ میں شامل ہیں۔

بچوں کی تبنیت (Child Adoption) کے سلسلہ میں اس وقت عام آبادی پر ایک قانون نافذ کرنا حکومت کے پیش نظر ہے جس کو (Adoption of Children Bill 1972) کے نام سے پاس کرانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یاد رہے کہ پارلیمنٹ میں یہ بل

حکومت کی طرف سے پیش کیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ حکومت مسلم پرسنل لا کو ابھی بدلنا نہیں چاہتی، صحیح نہیں ہے۔ صاف دیکھا جا سکتا ہے کہ غیر محسوس طریقہ پر پرسنل لا میں تبدیلیوں کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس بل کی دفعہ ۱۳ ملاحظہ ہو:-

تنبیت کا اثر دفعہ ۱۳:-

(۱) حکم تنبیت اس تاریخ سے نافذ متصور ہوگا جس تاریخ کی صراحت ڈسٹرکٹ کورٹ نے اپنے حکمنامہ میں کی ہو یا اگر تحت دفعہ ۱۲ اس حکم کے خلاف کوئی مرافعہ کیا گیا ہو تو اس تاریخ سے جس کی صراحت عدالت مرافعہ کے حکم میں کی گئی ہو۔

(۲) وہ بچہ جس کے بارے میں حکمنامہ تنبیت جاری ہوا ہو حکمنامہ میں مندرج تاریخ سے جملہ اغراض کے لئے (بشمول بلا وصیت انتقال کی صورت کے) مثل اپنے متبنّی گیرندہ کے حقیقی بچہ کے اور اس کے متبنّی گیرندگان مثل اس کے حقیقی والدین کے متصور ہوں گے گویا کہ وہ ان کے رشتہ مناکحت کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے اور اس تاریخ سے اس بچہ کے جملہ تعلقات اپنے خاندان پیدائش سے منقطع اور متبنّی گیرندگان کے خاندان سے قائم شدہ متصور ہوں گے مگر شرط یہ ہے کہ:-

(الف) وہ بچہ کسی ایسے فرد سے شادی نہ کر سکے گا جس سے وہ شادی نہ کر سکتا اگر وہ اپنے خاندان پیدائش ہی میں رہتا۔

(ب) اگر کوئی جائداد تاریخ حکمنامہ تنبیت سے قبل اس بچہ کو حاصل ہو چکی تھی تو تابع ان ان شرائط کے، اگر کوئی ہوں، جن کے تحت وہ اس بچے کو حاصل ہوئی تھی، وہ اس بچہ کی ملکیت میں باقی رہے گی۔

(ج) متبنّی کسی فرد کو کسی ایسی جائداد کے حقوق ملکیت سے محروم نہ کرے گا جو حکمنامہ تنبیت سے قبل اس فرد کو حاصل ہو چکے ہوں۔

متبنّی کے یہ حقوق بعینہٖ وہی ہیں جو Hindu Adoption and Maintenance Act 1956 کے تحت ہندوؤں کے سلسلے میں مقرر کئے گئے ہیں اور اب ان کو سب ہندوستانیوں پر لاگو کیا جانا پیش نظر ہے۔

چنانچہ ۱۹۷۲ء کے اس بل کے اغراض و مقاصد میں یہ بات واضح طور پر کہی گئی ہے کہ اس مسودہ قانون کا مقصد تنبیت کے بارے میں مروجہ ہندو قانونِ تنبیت و گذارے کے جزو متعلقہ

تبنیت اور اس سلسلہ کے سارے رواجی قوانین کو ختم کر کے ایک ایسا قانون بنانا ہے جو تمام فرقوں پر لاگو ہو۔

اس سے قیاس کر لیجئے کہ مشترک سول کوڈ کس طرح اکثریت کے مزاج اور روایات کا عکس بن کر سامنے آنے والا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن وسنت نے مسلمان خاندانوں کے نظم واستحکام کیلئے جو شخصی قوانین بنائے ہیں ان پر اگر آزادانہ اور غیر متعصبانہ طور پر غور کیا جائے تو ہر منصف مزاج انسان یہ مطالبہ کرنے پر آپ کو آمادہ پائے گا کہ ان قوانین کو مسلم سماج ہی کے لئے خاص رکھنے کے بجائے ملک گیر اور آفاقی حیثیت دی جانی چاہیئے۔ کیوں کہ ان کے علاوہ خاندان کا استحکام اور سماجی انصاف کسی اور طرح ممکن ہی نہیں۔ مگر برا ہو تنگ نگاہی کا کہ اس کے باعث ایسے مفید اور جامع قوانین سے استفادہ کرنا تو درکنار، الٹا ان لوگوں کو بھی اس سے محروم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے جو ان کو اپنائے ہوئے ہیں۔

ہم یقیناً اس وقت ایک اجنبی ماحول میں گھرے ہوئے ہیں تاہم مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ تاریکی کا وجود ہی اس امر کا متقاضی ہے کہ اس میں روشنی کا چراغ جلایا جائے۔ ہمیں اپنی جگہ اس وقت ایک طرف تو یہ عزم کر لینا چاہیئے کہ اپنے معاشرہ میں اسلامی روح کے مطابق خاندانوں کی اصلاح کریں گے اور ہمارا ایک ایک گھر خدمت دین اور اقامت دین کا روشن منارہ بنے گا' دوسری جانب ملی پیمانہ پر ہماری طرف سے اس بات کا صریح مطالبہ کیا جانا چاہیئے کہ مسلم پرسنل لا میں ترمیم وتبدیلی کا کسی حکومت یا پارلیمنٹ کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔

ڈاکٹر امبیدکر کا انتباہ

اس ذیل میں یہ تذکرہ فائدہ سے خالی نہ ہوگا کہ جب مجلس دستور ساز میں مجوزہ دستور پر دفعہ وار بحث ہو رہی تھی اور یہ دفعہ ۴۴ (جو مسودہ دستور میں دفعہ ۳۵ تھی) زیر بحث آئی تو بعض ممبران مجلس دستور ساز نے اس کی شدت سے مخالفت کی اور ان تقریروں سے یہ بات بھی کھل کر سامنے آئی کہ اس کی مخالفت صرف مسلمان ہی نہیں کرتے بلکہ خود ہندوؤں کا بھی ایک بڑا طبقہ مشترک سول کوڈ کا مخالف ہے اور اس کو مداخلت فی الدین اور دستور میں دیئے گئے بنیادی حقوق کے منافی سمجھتا ہے' اس موقع پر ڈاکٹر امبیدکر صاحب نے جنھوں نے دستور کا مسودہ تیار کرنے میں نمایاں حصہ لیا تھا اس بارے میں یہ فرمایا تھا:۔

"ریاست صرف یہ چاہتی ہے کہ اسے اس طرح ایک قانون بنانے کا حق حاصل ہو جائے اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ریاست پرسنل لا کو ختم کرنے کی پابند ہو جائے۔ لہذا کسی شخص کو اس بات کا اندیشہ نہیں ہونا چاہیئے کہ اگر ریاست نے اپنے لئے اس قسم کا اختیار حاصل کر لیا ہے تو وہ فوراً ہی اس اختیار کا استعمال اور اس کو اس طرح نافذ بھی کردے گی جو مسلمانوں یا عیسائیوں یا دوسرے فرقوں کے لئے قابل اعتراض ہو۔
کوئی بھی ریاست اپنے اختیارات کا استعمال اس طرح نہیں کر سکتی جس کے باعث مسلمانوں کو بغاوت پر آمادہ ہو جانا پڑے، اگر ریاست ایسا کرے تو میری دانست میں وہ پاگل پن ہوگا"

اس بحث کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صرف دفعہ ۴۴ کے تحت یکساں سول کوڈ کے خطرہ سے اپنے اپنے کو محفوظ کر لینے پر بات ختم ہو جاتی ہے، صورت حال یہ ہے کہ اس وقت بھی ملک میں چند ایسے قوانین نافذ ہیں جو مسلم پرسنل لا، سے متصادم ہیں، ان میں سے خصوصیت سے (SPECIAL MARRIGE ACT) قابل ذکر ہے۔ یہ قانون ہندوستان کی آزادی کے بعد ہماری پارلیمنٹ نے ۱۹۵۴ء میں بنایا ہے اس کی رو سے نکاح کے لئے نہ تو جانبین کا ہم مذہب ہونا ضروری ہے اور نہ ہی نکاح کے منعقد ہونے کے لئے کسی مذہبی رسم کا ادا کرنا۔ صرف حکومت کے ایک عہدہ دار کے پاس اس بات کا تحریری اقرار کافی ہے کہ طرفین قانون مذکورہ کے تحت رشتہ مناکحت میں بندھ رہے ہیں اور اس قانون کے تحت شادی کے بعد طرفین اور ان کی اولاد وراثت کے باب میں Indian Succession Act سے متعلق ہوں گے نہ کہ ان میں سے کسی ایک کے شخصی قانون، وراثت سے، اس قانون کا ایک عجیب پہلو یہ ہے کہ اگر طرفین ایک ہی مذہب کے ہوں یعنی مرد اور عورت دونوں ہندو یا دونوں مسلمان ہوں تب بھی اس قانون کے تحت شادی کر لینے کے نتیجہ میں ان کا مذہبی قانون وراثت ان سے متعلق نہ ہوگا بلکہ مذکورہ بالا قانون Indian Succession Act سے متعلق ہوگا جو ہندو قانون وراثت اور اسلامی قانون وراثت دونوں سے مختلف ہے۔

اس طرح کے تمام قوانین کو منسوخ کرانے کی ضرورت ہے یا یہ طے کرا لیا جائے کہ ان قوانین کا اطلاق مسلمانوں پر نہ ہوگا۔ (باقی صفحہ پر)

مسلم پرسنل لا اور اسلام

(یہ مقالہ زیر تصنیف کتاب "مسلم پرسنل لا ــــ یکساں سول کوڈ کی تجویز کی روشنی میں" کا ایک باب ہے)

(مولانا صدر الدین اصلاحی)

قانون کی ضرورت اور افادیت

قانون، خواہ وہ انسانی زندگی کے کسی بھی شعبے سے تعلق رکھتا ہو، انسان اور انسانی تہذیب کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ اس کے بغیر نہ انسانیت کی عظمت برقرار رہ سکتی ہے، نہ تہذیب کا کوئی وجود باقی رہ سکتا ہے۔ یہی قانون وہ چیز ہے جس سے انسانی معاشرہ 'معاشرہ' بنتا ہے۔ اسی سے افراد کے حقوق کی حفاظت ہوتی ہے، اور اجتماع کے شیرازے کو بقا و استحکام حاصل رہتا ہے۔ ظلم اور بدی کی تباہ کاریوں سے امان ملتی ہے۔ لوگوں کو انصاف اور اطمینان میسر ہوتا ہے۔ انسانی تہذیب کو پھولنے اور پھلنے کا موقع ملتا ہے۔ قانون کا حصار نہ ہو تو ہر طرف محرومی ہی محرومی پھیلی نظر آئے گی اور انسانی بستیاں جنگلوں کو بھی مات دینے لگیں گی۔ اس لیے یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ قانون کا وجود اور قانونی اداروں کا قیام انسان کی اپنی ایک عظیم ترین ضرورت کی پیداوار اور فطری طلب کا نتیجہ ہے، جس سے وہ کسی حال میں بھی بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

اچھے قانون کے بنیادی اوصاف

یہ مسلمہ حقیقت قانون کے لیے دو اوصاف کو ضروری قرار دیتی ہے۔

(۱) ایک تو یہ کہ اسے معاشرے کے لیے فلاح اور ترقی کا واقعی ذریعہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ یہی وہ مقصود ہے جس کے لیے قانون کا وجود عمل میں آیا ہے، اور جس کی خاطر انسان نے اس کی بندشوں کو اپنے اوپر عائد کیا ہے۔ اس لیے کسی معاشرے پر اگر کوئی ایسا قانون نافذ ہو جس سے یہ مقصد

حاصل نہ ہوتا ہو تو اس کی اپنی آزادی کی یہ رضاکارانہ قربانی رائگاں سمجھی جائے گی، اور ایسی حالت میں نہ اس نام نہاد "قانون" کے نفاذ کی کوئی وجہِ جواز باقی رہ جائے گی اور نہ اسے اس معاشرے کے لیے قابلِ گوارا رہنا چاہیے۔

(۲) دوسری بات یہ کہ قانون کو لازماً معاشرے کے بنیادی افکار و تصورات سے ہم آہنگ اس کے تہذیبی اصول و اقدار کا آئینہ دار اور اس کے جذبات و احساسات کا عکاس ہونا چاہیے۔ موزوں اور کامیاب قانون کی صفت یہ ہے کہ جن لوگوں پر اس کا نفاذ ہو وہ اس سے ذہنی طور پر مانوس ہوں، ان کے اندر اس کے احترام کا جذبہ ہو، اور وہ اس کی خوش دلی کے ساتھ پابندی کرنے کے لیے آمادہ ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اسے ایک ناگوار بوجھ محسوس کریں، جسے اپنے سر سے اتار پھینکنے کی فکر میں لگے رہیں اور اس کے ساتھ برابر آنکھ مچولی کھیلتے رہیں۔ عقل اور تجربہ دونوں کا فیصلہ یہ ہے کہ کسی قانون میں یہ وصف اسی وقت پیدا ہو سکتا اور معاشرے کے اندر عملاً یہ مقام اسے اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب وہ اس کے اصول و اقدار کی روح اپنے اندر سموئے ہوئے ہو، اور اس کی جڑیں اس کے افکار و جذبات میں پیوست ہوں۔

اگر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ ان دونوں باتوں میں سے دوسری بات پہلی سے زیادہ اہم اور مقدم ہی نہیں ہے بلکہ بڑی حد تک اس کی اساس بھی ہے۔ کیونکہ کوئی قانون فلاح و ترقی کا واقعی ذریعہ اس وقت تک ہرگز نہیں ثابت ہو سکتا جب تک کہ معاشرے کے اصول و اقدار اور افکار و جذبات نے اس کی صورت گری نہ کی ہو۔ گویا قانون کے لیے پہلی اور آخری ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اس کی بنیاد معاشرے کے اصول و اقدار پر رکھی جائے۔ اس کے بغیر نہ وہ ایک اچھا اور کامیاب قانون بن سکتا ہے، نہ معاشرے کو خیر و فلاح عطا کر سکتا ہے اور جب یہ سب کچھ نہیں کر سکتا تو اسے لوگوں پر مسلط ہونے کا کوئی حق بھی نہیں پہنچتا۔ ایسا نام نہاد قانون اگر اپنے لیے کوئی قوم خود بناتی ہے تو یہ فی الواقع اس کی تہذیبی خودکشی ہوگی، اور اگر کوئی دوسری طاقت اسے اس پر مسلط کرتی ہے تو یہ اس کا تہذیبی قتل ہوگا۔

"قانون" کے بارے میں اس اہم ترین اصولی حقیقت کو نگاہ میں رکھیے اور پھر اس قانون کے مسئلے کو

مسلم پرسنل لا کس نوعیت کا قانون ہے؟

لیجیے جسے "مسلم پرسنل لا" (مسلمانوں کا شخصی قانون) کہا جاتا ہے۔ اس قانون کے "مسلمانوں کا شخصی قانون" ہونے کے کھلے ہوئے معنے یہی قرار پائیں گے کہ وہ مسلمانوں کے ملی مزاج سے ایک خاص ربط رکھتا ہے، اور ان کے مخصوص افکار و تصورات کا مظہر، اور ان کے اصول و اقدار کا آئینہ دار ہے۔ ورنہ ممکن نہیں تھا کہ وہ وجود میں آتا اور چودہ سو برس سے ان پر نافذ اور حکمراں رہتا۔ اس لیے اس قانون کے بارے میں غور و فکر کرنے اور کسی بحث و گفتگو کا حق ادا کر سکنے کے لیے سب سے مقدم ضرورت بلکہ ناگزیر شرط اس بات کی ہے کہ اس "خاص ربط" کی نوعیت معلوم کر لی جائے اور مسلمانوں کے ان مخصوص افکار و تصورات کو پوری تحقیق کے ساتھ متعین کر لیا جائے جو اس قانون کا سرچشمہ ہیں۔ "مسلمان" واضح طور پر کوئی جغرافیائی یا نسلی یا لسانی یا ایسی ہی کسی اور طرح کی قوم ہونے کے بجائے ایک خالص نظریاتی اور اصولی ملت ہیں۔ اس حقیقت کے پیش نظر امکان دو باتوں کا ہے:- اس کا بھی کہ مسلمانوں کا وہ مخصوص مزاج اور ان کے وہ مخصوص افکار و نظریات، جو ان کے پرسنل لا کی بنیاد بنتے ہیں، صرف ان کی قومی زندگی کے مخصوص تمدنی حالات اور معاشرتی مصالح ہی کی پیداوار ہوں، اور اس کا بھی کہ وہ اس سے آگے بڑھ کر ان کی عین نظریاتی اور اصولی حیثیت ہی کا فطری نتیجہ ہوں۔ چنانچہ قوانین عالم کے ذخیرے میں یہ دونوں ہی طرح کے پرسنل لا پائے بھی جاتے ہیں۔ کسی قوم کا شخصی قانون اگر پہلی قسم کا ہے، یا رہا ہے، تو کسی کا دوسری قسم کا دیکھنے میں آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مسلم پرسنل لا کی ان دونوں ممکن نوعیتوں یا حیثیتوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ پہلی حیثیت کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ قانون مسلمانوں کے صرف قومی امتیاز اور ان کی ملی شخصیت کے لیے اہمیت رکھتا ہے، اور وہ صرف ایسے رسوم و ضوابط کا مجموعہ ہے جنھیں انھوں نے اپنی صوابدید سے خود وضع کر لیا تھا۔ اور اب وہ روایتی طور پر ان کے نظام زندگی کا ایک حصہ بن چکے ہیں۔ دوسری حیثیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اس قانون کا رشتہ براہ راست ان کے عقائد اور اصول حیات سے جڑا ہوا ہے، اور یہ بھی اسی دین و شریعت کا ایک جزو ہے جس پر وہ ایمان رکھتے ہیں اور جس کی مکمل پیروی کا اہتمام رکھنے ہی کا نام فی الواقع مسلمان ہونا اور مسلمان باقی رہنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ قانون اصلاً ان کا وضع کیا ہوا نہیں ہے بلکہ وہ خود اس کے "وضع کیے ہوئے" ہیں۔ اس قانون کو سمجھنے اور اس پر رائے زنی کا اہل ہونے کے لیے اس کے سرچشمۂ وجود کا معلوم کر لینا بجائے خود ضروری تھا ہی، لیکن اب یہ سوال سامنے آجانے کے بعد کہ اس کی اصل حیثیت فی الواقع

کون سی ہے، پہلی یا دوسری، یہ اور زیادہ ضروری ہو گیا ہے۔ کیونکہ جب تک اس سوال کا جواب نہیں معلوم ہو جاتا اور اس قانون کی واقعی حیثیت متعین نہیں ہو جاتی، اس وقت تک اس کے بارے میں کسی معقول بحث و گفتگو کا اگلا قدم اٹھایا ہی نہیں جا سکتا۔ اگر اٹھایا جائے گا تو وہ تحقیقی ہوگا نہ علمی، و حقیقت پسندانہ ہوگا، نہ دیانت دارانہ۔ اس لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے اسی بنیادی حقیقت کو تلاش اور متعین کر لیا جائے۔ تاکہ آگے ہم صحیح خطوط پر بڑھ سکیں۔

تحقیق کا صحیح طریقہ اس بات میں دو رائے نہیں ہو سکتیں کہ منطقی طور پر اس تلاش و تحقیق کا معقول اور صحیح طریقہ ایک ہی ہوگا، اور وہ یہ کہ مسلمان جس دین کے پیرو ہیں اسی کا مطالعہ کیا جائے اور اس کے اصل سرچشموں، 'قرآن اور سنت' کا تفصیلی جائزہ لے کر دیکھا جائے کہ جس چیز کو مسلم پرسنل لا کہا جاتا ہے اس کا ان کے صفحات میں کوئی وجود ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کس حیثیت سے اور کس اہمیت کے ساتھ ہے؟ اس جائزے سے صورت واقعہ اگر یہ نظر آئی کہ قرآن اور سنت اس قانون کے ذکر و بیان سے یکسر خالی ہیں تو یہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ اس کی کوئی دینی حیثیت نہیں ہے، اور اس کی جو بھی اہمیت ہے وہ صرف قومی لحاظ سے اور تمدنی پہلوؤں سے ہے۔ اور اگر صورت واقعہ دوسری دکھائی دی تو پھر حقیقت نفس الامری بھی دوسری ہی قرار پائے گی، اور اس قانون کی حیثیت کو دینی اور شرعی تسلیم کرنا ناگزیر ہو جائے گا۔

مسلم پرسنل لا کے متعلق ثابت شدہ حقائق اب جہاں تک قرآن اور سنت کے جائزے کا تعلق ہے، اس کے نتیجے میں حسب ذیل حقائق بالکل واضح اور ناقابلِ اختلاف شکل میں ہمارے سامنے آتے ہیں:-

ا۔ کتاب و سنت کا ایک اہم باب سب سے پہلی حقیقت تو یہ ہے کہ مسلمانوں کی عائلی زندگی اور دوسرے شخصی معاملات کے بارے میں قرآن اور حدیث کے اندر احکام و ہدایات موجود ہیں، اور خاصی تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔ چنانچہ ان کے اوراق الٹتے جائیے اور ان احکام و ہدایات کا پیہم مشاہدہ کرتے جائیے۔ نکاح، مہر اور نفقہ، طلاق، خلع اور ایلاء، عدت اور ثبوت نسب، حضانت اور کفالت، وراثت اور وصیت، وقف اور ہبہ وغیرہ مسائل میں سے کوئی بھی مسئلہ ایسا نہ ملے گا جس سے انھوں نے بحث نہ کی ہو، ہدایتیں نہ دی ہوں، قاعدے

اور قانون نہ مقرر کیے ہوں۔ یہ اتنی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اس کے لیے متعلقہ آیتوں اور حدیثوں کا بیان حوالہ دینا بالکل غیر ضروری ہے۔ جو شخص بھی چاہے قرآن حکیم کے کسی ترجمے ہی پر ایک نظر ڈال کر اس کی تصدیق کرا سکتا ہے۔

پھر امر واقعہ صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ شخصی قوانین کتاب و سنت میں موجود ہیں، بلکہ یہ بھی ہے کہ بڑی وضاحت کے ساتھ موجود ہیں، اور جس تفصیل کے ساتھ قرآن حکیم میں انھیں بیان کیا گیا ہے ویسی تفصیل سے دوسرے کسی بھی شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے احکام کے بیان میں کام نہیں لیا گیا ہے۔ حد یہ ہے کہ نماز اور زکوٰۃ، روزہ اور حج جیسے بنیادی امورِ دین کے بارے میں بھی ایسی تفصیل دکھائی نہیں دیتی۔ ظاہر ہے کہ یہ بات کسی مصلحت اور ضرورت کے بغیر نہیں ہو سکتی تھی۔ اس مصلحت اور ضرورت کی تعیین میں ممکن ہے کہ ایک سے زیادہ رائیں ہوں، لیکن اس بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ شخصی قوانین کے بیان میں غیر معمولی تفصیل سے کام لینا قرآن کی نگاہ میں ان کی خصوصی اہمیت کی دلیل ہے۔

۲۔ احکام خداوندی ہونے کی صراحت قرآن اور سنت میں کسی حکم کا مذکور ہونا خود یہ معنی رکھتا ہے کہ اس کی پابندی مسلمانوں کے لیے لازم ہے، اور الگ سے اس کی صراحت کرنے کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں۔ اس لیے زیر بحث شخصی قوانین جب قرآن و سنت میں موجود ہیں تو ان کی پیروی بھی یقیناً لازمی ہی ہونی چاہیے۔ لیکن قرآن نے اس اصولی حقیقت پر اعتماد کر کے ان قوانین کو صرف بیان کر دینے ہی پر اکتفا نہیں کر لیا ہے، بلکہ قدم قدم پر ان کے فرض اور واجب الاتباع ہونے کی صراحت بھی کرتا گیا ہے۔ مثلاً نکاح کے کچھ احکام دینے کے بعد ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ :۔

...... كِتَابَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ...... الخ (نساء - ۲۴)	...... تم پر اللہ نے (ان قوانین کو) فرض ٹھیرا دیا ہے۔

ایک اور مقام پر فرمایا جاتا ہے کہ :۔

...... ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ (ممتحنہ - ۱۰)	...... یہ اللہ کا حکم ہے، وہ تمہارے درمیان فیصلہ کرتا ہے۔

اسی طرح طلاق اور خلع کے بارے میں چند احکام بیان کر کے خبردار کیا جاتا ہے کہ :۔

...... تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا (بقرہ - ۲۲۹) ...... یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں، پس ان سے تجاوز نہ کرنا۔

عدت کے متعلق کچھ ہدایتیں دے کر یاد دہانی کی جاتی ہے کہ :۔

ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗ اِلَيْكُمْ (طلاق - ۵) یہ اللہ کا حکم ہے جو اس نے تمہارے پاس بھیجا ہے۔

ایک اور جگہ طلاق اور عدت سے متعلق کچھ احکام دے کر انہیں حدود اللہ (اللہ کے مقرر کیے ہوئے ضوابط) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۔ سورۂ طلاق آیت ۱)

وراثت کے قوانین کے بارے میں تو یہ صراحت غیر معمولی رنگ اختیار کر گئی ہے۔ چنانچہ انھیں بیان کرتے وقت سب سے پہلے، تمہید ہی کے اندر، صاف طور سے فرمایا جاتا ہے کہ :۔

لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا (نساء - ۷)

مردوں کا (بھی) اس ترکے میں حصہ ہو جسے والدین اور نزدیک کے قرابت داروں نے چھوڑا ہو اور عورتوں کا (بھی) اس ترکے میں حصہ ہے جسے والدین اور نزدیک کے قرابت داروں نے چھوڑا ہو، یہ ترکہ کم ہو یا زیادہ، ایک مقرر شدہ حصہ۔

پھر جب ان قوانین کے بیان کا آغاز ہوتا ہے تو ان لفظوں سے ہوتا ہے :۔

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ..... الخ (نساء - ۱۱)

اللہ تمہیں تمہاری اولاد (کے حقوق وراثت) کے سلسلے میں اس بات کی وصیت کرتا ہے کہ ..... الخ

اس کے بعد ابھی ان قوانین کا ایک حصہ ہی بیان ہو چکتا ہے کہ درمیان میں رک کر پھر بتایا اور یاد دلایا جاتا ہے کہ :۔

..... فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ اِنَّ ..... یہ (حصے وراثت کے) اللہ کی

اللہ کان علیما حکیما ۔۔۔ طرف سے مقرر کیے ہوئے ہیں۔ یقیناً اللہ سب کچھ جانتا ہے اور بڑی حکمت والا ہے۔

(نساء - ۱۱)

اور پھر جب اس بیان کا خاتمہ ہوتا ہے تو ان الفاظ کے ساتھ ہوتا ہے:

...... وصیۃ من اللہ واللہ علیم حکیم ○ تلک حدود اللہ .... الخ ..... یہ اللہ کی طرف سے وصیت (یعنی تاکیدی ہدایت) ہے، اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور بردبار ہے۔ یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں .... الخ

(نساء - ۱۲، ۱۳)

اس طرح ان قوانین وراثت کے بارے میں ایک دو نہیں، بلکہ الفاظ اور انداز بیان کے تغیر کے ساتھ پانچ پانچ بار اس حقیقت پر زور دیا گیا ہے اور اسے ذہنوں میں اتارا گیا ہے کہ یہ اللہ تعالےٰ کے مقرر کیے ہوئے اور لازم ٹھیرائے ہوئے قانون ہیں۔

قرآن حکیم کی ان صراحتوں کے ہوتے ہوئے کوئی نامعقول سے نامعقول منطق بھی اس خیال کا جواز مہیا نہیں کر سکتی کہ یہ قوانین مسلمانوں کے لیے کسی وقت غیر ضروری بھی ہو سکتے ہیں اور انہیں ضمنی قوانین کی سطح پر رکھا جا سکتا ہے۔

۳۔ اسلامی اقدار کا مظہر تیسری بات یہ کہ یہ قوانین اسلام کے بنیادی اصول و مقاصد کے حامل اور امین ہیں، اور ان کے اندر روح ان قدروں کی کارفرما ہے جو دین کا مغز ہیں۔ اس طرح یہ مسلمانوں کی شخصی زندگی کے معاملات کو صرف منضبط کرنے ہی کا ذریعہ نہیں ہیں بلکہ ان کے اندر ایمانی تقاضوں اور اسلامی قدروں کو سموئے رکھنے کا بھی ناگزیر وسیلہ ہیں۔ مثال کے طور پر نکاح کے مسئلے میں اسلام کا ایک بنیادی قانون یہ ہے کہ اہل شرک کے ساتھ مناکحت کا رشتہ بالکل نہیں قائم کیا جا سکتا۔ اس کی وجہ قرآن نے یہ بتائی ہے کہ ایسا رشتہ مسلمان کو ایمان اور اسلام کی دولت اور آخرت کی فلاح سے محروم کر دینے کا سبب بن سکتا ہے۔ (سورۂ بقرہ - ۲۲۱) چونکہ ایمان کی دولت ایک مسلمان کی سب سے قیمتی متاع ہوتی اور آخرت کی فلاح ہی اس کا مقصود حقیقی ہوتا ہے اس لیے اس کا تحفظ اسلام کا ایک بنیادی اصول ہونا ہی چاہیے تھا، اور اس کی خاطر اہل شرک سے نکاح کو ممنوع ٹھیرانا بہرحال مناسب اور ضروری تھا۔ اسی طرح اسلام نے عدل کی شرط کے ساتھ ایک سے زائد

نکاح کی اجازت دے رکھی ہے اور اس کا دروازہ بالکل ہی بند نہیں کر دیا ہے۔ یہ اجازت بھی بہت سے معاشرتی اور اخلاقی مصالح کی خاطر دی گئی ہے اور ان میں سب سے زیادہ اہم اور نمایاں مقصد یتیموں کے حقوق و مصالح کی حفاظت ہے (سورۂ نساء۔۳) ایک اور مثال طلاق کی لیجیے۔ اسلام نے ازدواجی رشتے کو بڑا اہم اور بڑا محترم رشتہ قرار دینے کے باوجود طلاق اور خلع کی بھی گنجائش رکھی ہے اور اس کا مقصد یہ بتایا ہے کہ حدود اللہ کو مسلسل پامال ہوتے رہنے سے بچایا جائے۔ (سورۂ بقرہ ۲۲۹) یعنی باہمی ناچاقی اور منافرت کے باعث ازدواجی زندگی کا مدعا اگر دونوں کی آنکھوں سے بری طرح اوجھل ہو چکا ہو، موافقت کی کوئی توقع باقی نہ رہ گئی ہو اور اب اس رشتے کو برقرار رکھنا گویا اپنے اخلاق و کردار کو پیہم داغ دار بناتے اور ان حقوق و فرائض کو تاراج کرتے رہنا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ایک کے دوسرے پر عائد کر رکھے ہیں، تو یہ ایک کھلا ہوا معاشرتی فساد ہوگا۔ اور چونکہ اسلام زندگی کے کسی گوشے میں فساد اور اختلال کو بالکل گوارا نہیں کرتا، اور اس معاشرتی فساد کا انسداد زوجین میں علیحدگی کے بغیر عملاً ممکن نہیں رہ جاتا اس لیے اس مقصد کے حصول کے لیے علیحدگی کی اجازت دینا ضروری سمجھا گیا۔

ان چند مثالوں سے بآسانی محسوس کر لیا جا سکتا ہے کہ اسلام کے شخصی قوانین مجرد قوانین ہی نہیں ہیں، بلکہ اس کے مطلوبہ مقاصد اور اقدار کے حامل بھی ہیں۔ (آگے کی بحثوں سے، جن میں ان قوانین پر تفصیلی گفتگو آ رہی ہے، یہ حقیقت پوری طرح روشن ہو جائے گی)

۴۔ شرطِ ایمان و شرطِ نجات چوتھی حقیقت قرآنی نصوص سے یہ بھی واضح ہوتی ہے کہ زیر گفتگو قوانین پر عمل درآمد ایمان کا لازمہ اور نجاتِ اخروی کی شرط ہے۔ یہ حقیقت بظاہر محتاجِ وضاحت بالکل نہیں تھی، کیونکہ خدا کی کتاب اور رسول کے ارشادات میں ان کا موجود ہونا اس کے سوا اور کوئی معنے رکھتا ہی نہیں کہ ایک مسلمان کے لیے ان پر عمل کرنا اس کے ایمان و اسلام کا ناگزیر تقاضا ہو۔ لیکن معلوم ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو ایسی حجت بازی پر اتر آ سکتے ہیں۔ کہ کسی قانون کا قرآن میں مذکور اور اللہ کا مقرر کردہ ہونا اس بات کو لازم نہیں کہ وہ دینی حیثیت رکھتا ہو اور شریعت کا جزو ہو۔ وہ اس کے باوجود بھی دنیوی اور غیر دینی قسم کا قانون ہو سکتا ہے۔ اور اس کا فیصلہ کہ کون سا حکم قرآنی دینی حیثیت کا مالک ہے اور کون سا دنیوی حیثیت کا،

اس معاملے کی نوعیت کرے گی جس سے یہ حکم تعلق رکھتا ہے۔ چونکہ وہ معاملات، جن سے یہ شخصی قوانین متعلق ہیں، خالص دنیوی قسم کے ہیں، اس لیے انہیں بھی دنیوی حیثیت کا حامل سمجھنے کی، کم ازکم گنجائش تو بہر حال موجود ہے[1] اس لیے ضروری ہے کہ قرآن حکیم کی یہ صراحتیں بھی سن لی جائیں کہ یہ ایسے احکام ہیں جن کی بجا آوری ایمان کا عین تقاضا اور خدا پرستی کا ناگزیر لازمہ ہے، اور ان کی خلاف ورزی ظلم ہے، معصیت ہے، کفر ہے، موجب عذاب ہے۔ چنانچہ وراثت کے قوانین بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ :-

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ

یہ (قوانین) اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں۔ جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کا کہا مانے گا (اور ان حدود کا پاس رکھے گا) اسے اللہ ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ ان باغوں میں وہ ہمیشہ رہے گا۔

---

[1] یہ کوئی مفروضہ نہیں بلکہ ایک امر واقعہ ہے۔ ڈاکٹر گجیندر گدکر جیسا دانشور "ہندوستان کا اتحاد" کے موضوع پر لکچر دیتے ہوئے صاف لفظوں میں کہتا ہے کہ "مسلم برادری کے لیے سیکولرزم کا اعلان ہے کہ مشترک سول کوڈ کے، اور تعدد ازدواج کے ختم کرنے کے مسئلے پر صرف سماجی بنیادوں پر غور ہوگا، قرآن کے حوالے سے نہیں۔" (قومی آواز، ۶ دسمبر ۱۹۶۸ء)

اسی طرح پروفیسر فیضی صاحب، جن کو بدقسمتی سے مسلم پرسنل لا پر اتھارٹی کہا جاتا ہے، اپنے ایک لکچر میں فرماتے ہیں کہ

"مقدس قرآن بحث و تمحیص سے بالاتر آسمانی صحیفہ ہے لیکن اس میں کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جنھیں بدل دینے کی ضرورت ہے، جیسے تعدد ازدواج، پردہ اور طلاق۔"

اسٹیٹس مین، دہلی ص۱ کالم ۸۔ ۱۱ اگست ۱۹۶۸ء

ظاہر ہے کہ ایک طرف تو کسی حکم کو قرآن میں موجود تسلیم کرنا دوسری طرف اسے ناقابل التفات یا قابلِ ترمیم ٹھیرانا اسی وقت ممکن ہے جب اسے جزوِ قرآن ہونے کے باوجود دین و ایمان سے غیر متعلق خیال کیا جائے، بالخصوص ایسی شکل میں جبکہ ساتھ ہی قرآن کو "مقدس" اور "بحث و اختلاف سے بالاتر صحیفہ آسمانی" بھی تسلیم کیا جا رہا ہو۔

يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيهَا وَلَهُ عَذَابٌ مُّهِينٌ ۝

اور یہی بڑی کامیابی ہے۔ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کریگا اور اس کی مقرر کی ہوئی حدود سے تجاوز کر جائے گا اسے وہ جہنم کی آگ میں ڈال دے گا، جس میں وہ ہمیشہ پڑا رہے گا، اور کے لیے رسواکن عذاب ہوگا۔

(نساء - ۱۳-۱۴)

یہ ارشاد الٰہی اس امر کا صاف اعلان ہے کہ قرآن کے دیے ہوئے احکام وراثت کی پیروی کا انجام آخرت کی ابدی کامیابی، اور ان کی خلاف ورزی کا حشر آخرت کی دائمی ناکامی کی شکل میں نکلے گا۔

اسی طرح طلاق کے کچھ احکام دینے کے بعد فرمایا جاتا ہے :-

ذَالِكَ يُوعَظُ بِهِ مَنْ كَانَ مِنكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (بقرہ-۲۳۲)

یہ نصیحت (فرمان خداوندی پر عمل پیرا رہنے کی) تم میں سے ان لوگوں کو کی جاتی ہے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔

گویا ان احکام کی تعمیل کرنا اور مومن ہونا، قرآن کی نگاہ میں لازم ملزوم چیزیں ہیں۔ ممکن نہیں کہ ایک شخص سچے دل سے مسلمان بھی ہو اور ساتھ ہی ان احکام سے روگردانی بھی کرے۔

سورۂ مجادلہ میں ظہار کے احکام بیان کرنے کے بعد ان کی اہمیت ان لفظوں میں بیان کی گئی ہے

ذَالِكَ لِتُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝

یہ (احکام) اس لیے (دیے گئے ہیں) تاکہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھنے والے بنو، اور یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں اور انکار کرنے والوں کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔

(آیت-۴)

"وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ" کے الفاظ یہاں جس سیاق میں آئے ہیں اس سے قرآن کا منشاء واضح طور پر یہ دکھائی دے رہا ہے کہ اوپر بیان ہونے والے احکام ظہار کو ٹھکرا دینے کے بعد کوئی شخص ایمان کے دائرے میں باقی نہیں رہ سکتا، وہ لازمی طور پر دائرۂ کفر میں داخل ہو جائے گا۔

جزوِ دین ہونے کا بدیہی ثبوت

اسلام کے شخصی قوانین کے بارے میں قرآن کی بیان کی ہوئی ان ساری حقیقتوں کو — جو در اصل تو اہم حقیقتیں ہیں اور ان میں سے ایک بھی اگر اللہ اور رسول کے کلام میں موجود ہوتی تو باقی تینوں کا پایا جانا بھی بالکل ناگزیر تھا — سامنے رکھیے اور پھر فیصلہ کیجیے کہ یہ قوانین دین اسلام کا جزو ہیں یا نہیں؟ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس سوال کا جواب نفی میں دینا نہ عقل کے لیے ممکن ہے نہ علمی دیانت کے لیے۔ کیونکہ یہ تو گویا آنکھوں دیکھی بات کا انکار ہوگا۔ ایسے واضح شواہد کی موجودگی میں ہر معقول انسان کی زبان اس اعتراف پر مجبور ہوگی کہ یہ قوانین بالیقین قرآن اور سنت ہی کا ایک باب ہیں — ویسا ہی اہم باب جیسا اہم کہ ان کا کوئی اور باب ہو سکتا ہے — یہ احکام، دین و شریعت ہی کا ایک حصہ ہیں — ایسا حصہ جسے کبھی اس سے الگ نہیں کیا جا سکتا، اور جس کے بغیر اسلام کی تصویر بن ہی نہیں سکتی — آخر جو احکام و ضوابط کلامِ الٰہی میں صراحۃً مذکور ہوں، جن کی مزید تفصیلیں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں پائی جا رہی ہوں، جن کو قرآن حکیم نے خود 'حدود اللہ' قرار دیا ہو، جنھیں 'فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ' اور 'وَصِيَّةً مِّنَ اللَّهِ' فرمایا ہو، پھر جو قرآن کے دیے ہوئے مجرد احکام ہی نہ ہوں، بلکہ اس کے بنیادی اصول و مقاصد اور اس کی مسلمہ اخلاقی اقدار کے حامل بھی ہوں اور سب سے آخری بات یہ کہ جن کی پیروی کو اس نے لازمۂ ایمان اور شرطِ نجات ٹھیرایا ہو — ایسے احکام و ضوابط کو بھی اگر دین کا جزو نہ کہا جائے تو دین اور اسلام کے معنی ہی کیا رہ جائیں گے! ہاں اگر کوئی شخص چاہے تو یہ بحث ضرور اٹھا سکتا ہے کہ اس طرح کے قوانین کو دین و شریعت کا جزو ہونا ہی نہیں چاہیے تھا اور نہ انسان کی تمدنی اور معاشرتی زندگی سے قرآن و سنت کو تعرض کرنا چاہیے تھا، بلکہ اور زیادہ کھل کر وہ یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ سرے سے یہ قرآن اور یہ اسلام ہی ناقابلِ اعتبار شے ہیں۔ لیکن اسے یہ کہنے کا کوئی حق نہیں کہ فلاں احکام اگرچہ قرآن کے اندر موجود ہیں اور اس نے انہیں پوری قوت سے واجب التعمیل، شرطِ ایمان اور شرطِ نجات، سب کچھ قرار دے رکھا ہے، لیکن اس کے باوجود ان کی کوئی دینی اہمیت نہیں! یہ تو بیک وقت ان کے وجود کے اقرار اور سورج کے وجود کے انکار جیسی ہٹ دھرمی کی بات ہوگی۔

'مسلم' نہیں 'اسلامک' لا

حقیقتِ واقعی یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ 'مسلم پرسنل لا' کہے جانے والے احکام اصلاً دین ہی کا ایک جزو ہیں اور ان کی حیثیت ان [illegible]

قوموں کے شخصی قوانین سے قطعی مختلف ہے جنھوں نے انہیں خود وضع کر رکھا ہے، انھیں "مسلم پرسنل لا" کہنا بھی امرِ واقعی کی اگر غلط نہیں تو غیر محتاط تعبیر ضرور ہے۔ آپ نے دیکھا کہ یہ قوانین 'مسلم' نہیں بلکہ اسلامی قوانین ہیں، ان کا سرچشمہ مسلمانوں کی اپنی عقل و فہم، اپنی پسند اور اپنی صوابدید نہیں ــ بلکہ قرآن اور سنت ہیں۔ اس لیے انہیں مسلم پرسنل لا کے نام سے یاد کرنا دانستہ یا نادانستہ ان کی اصل حیثیت پر پردہ ڈال دینا ہے۔ چنانچہ ان کا یہ نام بھی دراصل اسی انگریزی دور کا ایک نامبارک عطیہ ہے جس میں مسلمانوں کی تہذیب اور ان کے دین کو ضرر پہنچانے اور ان کے تصور کو مسخ کر ڈالنے کی مسلسل کوششیں ہوتی رہتی تھیں۔ اسی اسلام دشمن یا اسلام ناشناس اندازِ فکر کے نتیجے میں قرآن اور اسلام کے احکام کو 'قرآنک لا' اور 'اسلامک لا' کہنے کے بجائے 'محمڈن لا' کی تعبیر اختیار کی گئی، اور قانون کی کتابوں اور عدالتوں میں اسے رواج دے کر عام زبانوں پر اس طرح چڑھا دیا گیا گویا اس کے صحیح اور حقیقت کے عین مطابق ہونے میں کوئی کلام ہی نہیں اور پھر اسی کے شاخسانے کے طور پر ان احکام شریعت کو جو مسلمانوں کی شخصی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں، "مسلم پرسنل لا" کا نام دے دیا گیا۔ حالانکہ وہ 'مسلم' نہیں 'اسلامک لا' تھے۔ اس لیے راستی اور حقیقت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ ان احکام کو ان کے اسی اصل نام سے یاد کیا جائے۔ یہ صرف حقیقت پسندی ہی کا تقاضا نہیں ہے بلکہ اس سے بڑھ کر ضرورت کا بھی تقاضا ہے۔ آج اسلام سے ناواقفیت کا یہ عالم ہے کہ اکثر تعلیم یافتہ کہے جانے والے افراد بھی کسی چیز کے 'اسلامی' اور 'مسلم' ہونے میں فرق نہیں کرتے۔ ایسی صورت حال میں اگر 'مسلم پرسنل لا' کی اصطلاح اسی طرح جاری رہتی ہے تو اس کا قدرتی نتیجہ یہی ہوگا کہ ان احکامِ شریعت کی اصل تصویر عام نگاہوں کو دکھائی نہ دے سکے گی۔ لوگ یہی خیال کیا کریں گے کہ یہ تو 'مسلم پرسنل لا ہے' اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ تمام تر تعلق اس کا صرف مسلمانوں سے ہے۔ اور یہ مسلمان نامی قوم کے ویسے ہی خالص تمدنی قوانین ہیں جیسے کہ دنیا کی بہت سی قوموں کے شخصی قوانین، مذہب سے آزاد اور خالص تمدنی وضع کردہ ہیں۔ کیا اتنی بڑی بنیادی غلط فہمی کو باقی رکھنا اور اسے غذا دیتے رہنا انصاف اور معقولیت کی بات ہے؟

جزءِ دین ہونے کی منطقی وجہ

آگے بڑھنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ یہاں ذرا رک کر وہ وجہ بھی سمجھ لی جائے جس کے نتیجے میں اسلامی تعلیمات کا دائرہ عائلی اور معاشرتی مسائل تک وسیع ہے۔ یہ وجہ ان بنیادی تصورات میں پائی جاتی ہے جو قرآن حکیم نے "اللہ، دین" اور

"عبادت" کے بارے میں ظاہر فرمائے ہیں، اور جن کے سوا ہر تصور اس کے نزدیک یا تو ناقص ہے، یا یک سر غلط، جاہلانہ اور باطل ہے۔ ان تصورات کی ضروری وضاحت مختصر لفظوں میں یہ ہے:

خدا وہ ہستی ہے جس نے ساری کائنات کو پیدا کیا ہے، اور ہر مخلوق کی پروردگار ہے۔ وہ ربوبیت، عدل، حکمت، رحمت، قدرت اور علم کل وغیرہ ساری اچھی صفات سے کمال کی حد تک متصف ہے۔ وہ جس طرح پوری کائنات کا خالق اور پروردگار ہے اسی طرح اس کا مدبر و منتظم بھی ہے، مالک اور آقا بھی ہے، حاکم اور مقتدر اعلیٰ بھی ہے، شارع اور قانون دہندہ بھی ہے، اور معبود و مسجود بھی ہے۔ دوسرا کوئی بھی اس کی ان صفات میں، اس کی ان حیثیتوں میں، اس کے اختیارات میں اور اس کے حقوق میں ذرہ برابر شریک نہیں۔ اس لیے پرستش کے لائق بھی صرف وہی ہے، اور اطاعت ــــ حقیقی، مکمل اور غیر مشروط اطاعت ــــ کا مستحق بھی وہی ہے۔

دین خدا کے اس ہدایت نامے یعنی ان احکام و قوانین کے مجموعہ کا نام ہے جو اس کی طرف سے انسان کو راہِ راست دکھانے، جادۂ حق پر چلانے اور حقیقی فلاح کی منزل تک پہنچانے کے لیے عطا ہوا ہے۔ یہ خدا کے عادل، حکیم، پروردگار اور حاکم و مقتدر اعلیٰ ہونے کا عین تقاضا تھا کہ وہ انسان کو اس کی اخلاقی اور روحانی زندگی کے لیے بھی اسی طرح "سامانِ رزق" مہیا کرے جس طرح اس نے اس کی مادی زندگی کے لیے مہیا کر رکھا ہے۔ ورنہ اس کی ربوبیت ناتمام اور اس کا عدل ناکام، اس کی حکمت بے مغز اور اس کی حاکمیت یکسر بے معنے ثابت ہوتی۔ دوسرے لفظوں میں پھر خدا خدا کہلانے ہی کا حق دار نہ ہوتا۔ دوسری طرف انسان بھی اس بات کا شدید ضرورت مند تھا کہ اسے اپنی زندگی کے مقصد کے اور اس مقصد کے حصول کی صحیح راہ سے اچھی طرح باخبر کر دیا جاتا، اسے اپنے پروردگار کی مرضی اور اپنے حاکم حقیقی کے احکام دے دیا جاتا، تاکہ اس علم کی رہنمائی میں وہ اپنے لیے فکر و عمل کی سیدھی راہ پا سکتا، اور ظن و تخمین کے اندھیروں ہی میں بھٹکتا نہ رہ جاتا۔ چونکہ 'دین' کا منشا اور مدعا یہ تھا، وہ انسان کی پوری اخلاقی زندگی کی ضرورت کی چیز تھی، وہ خدا کی صفاتِ ربوبیت و حاکمیت کا فطری مقتضا تھا، اس لیے وہ حیاتِ انسانی کے تمام شعبوں کو محیط ہے، کوئی گوشہ بھی اس کا ایسا نہیں جو اس کے دائرے سے کلیۃً باہر ہو۔ کیونکہ انسانی زندگی کا کوئی بھی معاملہ ایسا نہیں جس کے سلسلے میں اخلاقی پہلو کی، حسن و قبح کی بحث نہ پیدا ہوتی ہو۔ اس لیے ضروری تھا کہ دین یعنی ہدایتِ الٰہی بھی کسی معاملے کو نظر انداز نہ کرے اور کوئی فیصلہ

بھی اس کی رہنمائی سے محروم نہ رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ آخری دین، اسلام بھی ایک ایک کرکے سارے ہی مسائل حیات سے بحث کرتا ہے، اور عبادت گاہ سے لے کر اجتماعی زندگی کے آخری سرے تک ہر معاملے کے متعلق ہدایتیں دیتا ہے۔ اور ان سبھی ہدایات کے مجموعے کا نام 'دین' ہے، اور اس مجموعے کا ہر حصہ یکساں طور پر دین کا جزو ہے۔

عبادت کا مفہوم اسلام کی نگاہ میں پوجا اور پرستش سے بہت وسیع ہے۔ خدا کی پرستش اور اس کی یاد یقیناً 'عبادت' کی جان ہے، مگر کل عبادت نہیں ہے۔ کل عبادت یہ ہے کہ اللہ کے بھیجے ہوئے دین کی کمل پیروی کی جائے، کسی تفریق و تقسیم کے بغیر کی جائے۔ اور پورے اخلاص اور سچے جذبۂ اطاعت کے ساتھ کی جائے۔ جیسا کہ ابھی معلوم ہو چکا، 'اللہ کا بھیجا ہوا یہ دین' ایک جامع ہدایت نامہ ہے، اور پوری انسانی زندگی کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس لیے اللہ کی عبادت کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ اس ہدایت نامے اور اس مجموعۂ احکام خداوندی کے ایک ایک حرف کو دانتوں سے نہ پکڑ لیا جائے، اور پوری زندگی اس ہدایت کے حوالے نہ کر دی جائے۔

جب خدا اور دین و عبادت کے صحیح تصورات قرآن اور اسلام کے نزدیک یہ تھے تو یہ کس طرح ممکن تھا کہ انسان کی شخصی زندگی سے تعلق رکھنے والے معاملات سے انہیں کوئی بحث ہی نہ ہوتی؟ یا اگر بحث ہوتی بھی تو وہ نہ دین کا جزو قرار پاتی، نہ عبادت اور خدا پرستی کے لوازم میں شمار ہوتی؟ عائلی اور معاشرتی معاملات بھی تو اسی انسانی زندگی کا ایک حصہ تھے، بلکہ انتہائی اہم اور بہر حال بڑے ناگزیر حصے تھے۔ پھر ان کو خدا کا دین کس طرح نظر انداز کر دیتا؟ ان کے بارے میں ہدایتیں نہ دیتا؟ حق، عدل اور راستی کے تقاضے نہ بتاتا؟ یا جو احکام ان کے سلسلے میں اس نے دیے ہیں ان کی کوئی دینی اہمیت نہ ہوتی؟ ان کی پابندی ضروری نہ قرار دی جاتی؟ مومن و مسلم ہونے پر ان کی پیروی یا عدم پیروی کا کوئی اثر نہ پڑتا؟

بلاشبہ جن لوگوں کا تصور خدا اور تصور دین اور تصور عبادت کچھ اور ہے ـــ اور بلاشبہ اکثریت ایسے ہی لوگوں کی ہے ـــ ان کے لیے اسلام کے شخصی قوانین کی دینی حیثیت کو سمجھ پانا اور اسے معقول تسلیم کرنا بڑا مشکل ہے۔ مگر یہاں گفتگو معقولیت اور غیر معقولیت کی بالکل نہیں ہو رہی ہے، بلکہ نفس واقعہ کی ہو رہی ہے۔ اور نفس واقعہ بالبداہت یہی ہے، جس کا انکار کسی طرح نہیں کیا جا سکتا، کہ یہ قوانین

دینی حیثیت کے مالک اور دین کا جزو ہیں، اور ایسا ہونا قرآنی تصورِ دین و تصورِ تمدن کے پیشِ نظر بہر حال ضروری تھا۔

ملّی اور تہذیبی اہمیت مسلمانوں کے شخصی قوانین کی جو اصل حیثیت اور بنیادی اہمیت ہے وہ اوپر کے مباحث سے پوری طرح واضح ہو چکی، اور اس بارے میں مزید بحث و تمحیص کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ لیکن حالات کا تقاضا پھر بھی یہ ہے کہ ان قوانین کی اس اصلی حیثیت — دینی حیثیت — سے ہٹ کر خالص تہذیبی اور ملّی پہلو سے بھی ان کی قدر و قیمت کا جائزہ لے لیا جائے۔ تاکہ جن لوگوں کا ذہن، کسی نہ کسی وجہ سے، ان کی دینی حیثیت کو سمجھ پانے سے قاصر ہے وہ بھی یہ محسوس کر لینے کے قابل ہو سکیں کہ مسلمان اگر اپنے پرسنل لا کو دانتوں سے پکڑے ہوئے ہیں تو انہیں ایسا کرنا ہی چاہیے۔

اگر ملّی اور تہذیبی مصالح کو نظر میں رکھ کر مسلم قوانینِ شخصی کا جائزہ لیا جائے تو ان کی اہمیت کے درج ذیل پہلو سامنے آتے ہیں۔

(۱) پرسنل لا — ملّی شخصیت کا قالب پہلی بات تو یہ کہ مسلمانوں کے شخصی قوانین ان کی ملّی شخصیت کے لیے اتنے ہی ناگزیر ہیں جتنا کہ کسی زندہ جسم کے لیے اس کے اعصاب ضروری ہوتے ہیں۔ اس امر کی وجہ یا اس دعوے کی صداقت معلوم کرنے کے لیے ملتوں اور تہذیبی گروہوں کی ساخت پر غور کیجیے اور یہ دیکھیے کہ وہ تہذیبی گروہ کس طرح بنا کرتے ہیں؟ وہ کون سے مخصوص عناصر ہوتے ہیں جو کسی مجموعۂ افراد کو، دوسرے تمام افراد اور گروہوں سے الگ ایک منفرد شخصیت رکھنے والے گروہ اور ایک مستقل ملت کی حیثیت دے دیتے ہیں۔ اس غور و فکر کے نتیجے میں آپ دیکھیں گے کہ اس معاملے میں اگرچہ اولین اہمیت بنیادی عقائد و تصورات ہی کو حاصل ہوتی ہے اور وہی اس ملت کی انفرادیت کا حقیقی سرچشمہ ہوا کرتے ہیں، لیکن ساتھ ہی ان احکام و ضوابط اور آداب و رسوم کی اہمیت بھی اس باب میں کچھ کم نہیں ہوتی جن کے تحت اس ملت کے افراد کی پوری زندگی بسر ہوا کرتی ہے۔ یہ اس لیے کہ عقائد و افکار آنکھوں دکھائی دینے والی شے نہیں ہوتے، کہ وہ کسی ملت کی شخصیت کا مظہر اور اس کی انفرادیت کی علامتِ فارقہ بن سکیں۔ عملاً ملّی تشخص اور

انفرادیت کی علامت تو اس کے وہ ظاہری طور طریقے اور قوانین و ضوابط ہی بنا کرتے اور بن سکتے ہیں جنہیں وہ اپنے بنیادی عقائد و تصورات کے تحت اختیار کیے ہوتی ہے، اور جن کے مطابق اس کی زندگی کا پورا کاروبار چل رہا ہوتا ہے۔ پھر چونکہ ان قوانین و ضوابط کے بھی مختلف شعبے قوم کی عملی ضرورت اور اس کی عام زندگی سے عملی ربط کے لحاظ سے یکساں نہیں ہوتے، اس لیے اس کی شخصیت کی تشکیل میں بھی ان کا عمل دخل برابر نہیں ہو سکتا۔ جن قوانین کا ربط، افراد قوم کی زندگی سے جتنا ہی زیادہ ہوگا ان کا عمل دخل بھی اس کی تشکیل ذات میں اتنا ہی بڑا ہوگا۔ اب ہر شخص جانتا ہے کہ اس پہلو سے شخصی قوانین ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ رضاعت، حضانت اور کفالت، نکاح، مہر اور نفقہ، ازدواجی حقوق اور فرائض، طلاق، خلع اور فسخ نکاح، وراثت، وصیت اور وقف ایسے مسائل و معاملات ہیں جن کا عملی تعلق سبھی لوگوں سے ہوتا ہے، اور تقریباً فرد فرد کی زندگی ان سے گھری ہوتی ہے۔ جب کہ دوسرے مسائل حیات کا عملی رابطہ نسبۃً محدود افراد ہی کی زندگی سے ہوتا ہے، یا محدود پیمانے ہی پر ہوتا ہے۔ اس لیے قدرتی بات ہے کہ معاملات زندگی کو منضبط کرنے والے مقدم الذکر قوانین کی ملی اہمیت بھی بہت زیادہ اور نمایاں تر ہوگی اور ملت کی انفرادیت اور مخصوص شخصیت کا انحصار جتنا ان پر ہوگا دوسرے قوانین پر ہرگز نہ ہوگا۔ غلط نہ ہوگا، اگر یہ کہا جائے کہ عام حالات میں یہی قوانین اس انفرادیت اور مخصوص شخصیت کے آئینہ دار ہوں گے۔ یہی وہ قالب ہوں گے جس کے اندر یہ شخصیت پائی جا سکے گی، جس کے ذریعے اسے پہچانا جا سکے گا، جو اس کے وجود و بقا کا ضامن بن سکے گا۔

(۲) پرسنل لا — روح ملت کا محافظ دوسری بات یہ کہ شخصی قوانین ملت اسلامیہ کی ملی روح کے محافظ بھی ہیں۔ کیونکہ ملتوں کی زندگی اور موت کے مسئلے پر اگر گہرائی میں اتر کر دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ کسی بھی ملت کے شخصی قوانین کی بقا سے ان عقائد و افکار تک کی زندگی وابستہ ہوتی ہے جن کی اساس پر اس کی تشکیل ہوئی ہوتی ہے۔ یہ اس لیے کہ یہ قوانین اگرچہ اس کی اصل و اساس نہیں ہوتے لیکن اس کی اصل و اساس کے لیے ناگزیر برگ و بار ہوتے ہیں۔ اس کی مثال درخت کی سی ہے۔ درخت کی شاخیں اور پتیاں اگرچہ اس کی جڑ ہی سے نکلتی ہیں، اور یہی جڑ ان کو زندگی اور شادابی بخشتی رہتی ہے، لیکن خود یہ جڑ بھی اپنی زندگی اور تازگی کے بارے میں اپنی ان شاخوں اور پتیوں سے یکسر بے نیاز نہیں ہوتی۔ چنانچہ جہاں جڑ کے کٹ جانے یا سوکھ جانے کے بعد شاخیں اور

پتیاں بھی سوکھ کر رہ جاتی ہیں، وہیں دیکھنے میں یہ بھی آتا ہے کہ جس درخت کی پتیاں اور شاخیں کیڑوں کی لپیٹ کا شکار ہو گئی ہوں یا کاٹ ڈالی گئی ہوں اس کی جڑ بھی زیادہ دنوں تک اپنی قوت اور تازگی باقی نہیں رکھ پاتی، اور آہستہ آہستہ خشک ہو کر گل سڑ جاتی ہے۔ ٹھیک یہی حال ملتوں کے بنیادی افکار و تصورات کا بھی ہے۔ جب تک ان تصورات کے عملی تقاضے اور مظاہر زندگی کے میدان میں کارفرما رہتے ہیں اس وقت تک ان تصورات میں بھی زندگی اور توانائی موجزن رہتی ہے جوں ہی یہ عملی مظاہر میدان حیات سے غائب ہوئے ان تصورات کی نبض بھی کمزور پڑنے لگتی ہے اور آخر کار ڈوب کر رہ جاتی ہے۔ اگرچہ بنیادی تصورات کے عملی مظاہر وہ سارے ہی قوانین ہوتے ہیں جن کے تحت قوم اپنی زندگی بسر کر رہی ہوتی ہے، لیکن چونکہ اس کی شخصیت کے لیے اس کے شخصی قوانین کی عملی اہمیت سب سے زیادہ ہوتی ہے، جیسا کہ ابھی معلوم ہو چکا، اس لیے ان قوانین سے اس کی عملی وابستگی یا عدم وابستگی کا نتیجہ بھی اس کے اپنے بنیادی تصورات کے حق میں سب سے زیادہ نمایاں مرتب ہوتا ہے۔ ان قوانین پر مضبوطی سے کاربند رہنے کی شکل میں ان تصورات سے ذہنی رابطہ لازماً برقرار رہتا ہے، اور اگر ان سے عملی رشتہ منقطع ہو جائے تو پھر اس رابطے کا کمزور، نیم جان اور بالآخر بے جان ہو جانا ضروری ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ان قوانین سے عملی رشتہ کاٹ لینے کے معنی ہی یہ ہوں گے کہ اب وہ اس قوم کی نظر میں معقول اور قابل قبول نہیں رہ گئے تھے، اور ان کو نامعقول اور ناقابل قبول ٹھہرا دینے کے معنی لازماً یہ ہوں گے کہ وہ جن اساسی افکار و تصورات کی پیداوار ہیں فی الواقع خود ان تصورات ہی کی معقولیت اور صداقت اب اس کے نزدیک تسلیم شدہ اور یقینی نہیں رہ گئی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اسے ابھی اس بے یقینی کا خود بھی اعتراف یا شعور نہ ہو۔

پھر یہ ذہنی تبدیلی اسی حد پر رک نہ جائے گی، بلکہ لازماً آگے بڑھے گی اور قوم کچھ دوسرے ہی افکار و تصورات سے متاثر ہونے لگے گی۔ کیونکہ جب وہ اپنے شخصی قوانین سے عملی رشتہ کاٹ لے گی تو ضروری ہوگا کہ ان کی جگہ کوئی دوسرا مجموعۂ قوانین اپنائے۔ ظاہر ہے کہ یہ دوسرے قوانین کسی اور ہی تصور یا نظریے کے تحت بنے ہوں گے۔ اس لیے بالکل فطری بات ہوگی کہ جن تصورات کی بنیاد پر بنے ہوئے شخصی قوانین کو وہ اپنا چکی ہے خود ان کے لیے بھی اس کے ذہن کے دروازے کھل جائیں۔ اور چونکہ اس کا تعلق اپنے بنیادی نظریات سے کمزور پڑ چکا ہوگا اس لیے وہ اس حملے کا مقابلہ

کرنے میں شجیبہ نہ رہ جائے گی۔ بات بالآخر یہاں تک پہنچکر رہے گی کہ اس کے اپنے بنیادی افکار و تصورات کی جڑیں لاز ماً ہل جائیں گی' اور شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ ان کے اندر ردّ و بدل قبول کر لینے پر آمادہ ہو رہے گی۔ اس لیے یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی ملت کا پرسنل لا جہاں اس کی شخصیت کا قالب ہوتا ہے وہاں اس کی روح کا محافظ بھی ہوتا ہے۔

اس امر کی شہادت سے قوموں اور ملتوں کی تاریخ بھری پڑی ہے' اور سب سے قریب کی شہادت خود ملت اسلامیہ کی اپنی ہی تاریخ میں موجود ہے۔

(۳) پرسنل لا سے محرومی ملی تشخص کی موت تیسری بات یہ کہ اپنے پرسنل لا سے محروم ہو جانے کے بعد ملت کی شخصیت کسی طرح برقرار نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ جس پرسنل لا کی یہ اہمیت ہو کہ وہ قوم کی مخصوص شخصیت کا قالب بھی ہوتا ہے اور اس کی روح کا محافظ بھی' اس سے محروم ہو جانے کے بعد بھی اس کی شخصیت کا باقی رہ جانا بالکل غیر منطقی ہو گا۔ اس محرومی کے معنے واضح طور پر یہی ہوں گے کہ اس قوم کو اپنی شخصیت سے محروم کر دیا گیا اور اس سے اس کی اپنی ہستی چھین لی گئی۔ یہ اس لیے کہ جب اس کے پرسنل لا کو کالعدم کر کے اس کی شخصیت کے امتیازی خط مٹا دیے گئے اور اسے ایک دوسرے ہی قالب میں ڈھال دیا گیا ہو' یہاں تک کہ اس "کایا پلٹ" کے باعث اس کی فکری اور تصوراتی بنیادیں بھی ہلتی اور کھوکھلی ہوتی چلی گئی ہوں' تو آخر اب بھی اس کا بدستور زندہ برقرار رہ جانا ممکن ہو گا؟ اس انقلاب حال کے بعد تو کسی دوسرے تہذیبی گروہ کے اندر بارش کے قطروں کی طرح جذب ہو رہنا ہی اس کا مقدر بن جائے گا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس قوم یا ملت کے افراد بھی اب باقی نہ رہ جائیں گے۔ نہیں' وہ باقی رہیں گے' اور ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی اپنی جگہ زندگی کے میدان میں ترقیوں پر ترقیاں بھی کرتے چلے جائیں' مگر مطلق افراد کا نام قوم یا ملت نہیں ہوتا۔ ایسے لاکھوں اور کروڑوں افراد کے موجود ہوتے ہوئے بھی قوم کی اپنی شخصیت بالیقین ماضی کی داستان بن چکی ہو گی۔

(۴) پرسنل لا کی تنسیخ ایک خطرناک اقدام قوموں اور ملتوں کے پرسنل لا کی یہی وہ غیر معمولی اہمیت ہے جس کے باعث کوئی بھی ملت جس کے اندر خود داری [illegible] خود شناسی کی رمق بھی باقی ہو' اپنے پرسنل لا کو جان سے زیادہ عزیز رکھتی

ہے' اور ہر قیمت پر اس کی حفاظت کرنا چاہتی ہے۔ اس سے اس کا نظریاتی رشتہ تو ہوتا ہی ہے'
گہرا جذباتی لگاؤ بھی ہوتا ہے۔ اور معلوم ہے کہ جس چیز سے انسان کو گہرا جذباتی لگاؤ ہو' اس
کے بارے میں اس کے احساسات بڑے نازک ہوتے ہیں' اور اس کی حرمت کی پامالی اس کے لیے
بالکل ہی ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ وہ اپنی دوسری چیزوں سے محرومی چاہے گوارا کرلے مگر اپنی
کسی عزیز ترین متاع سے محرومی کی وہ سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ماضی کی عظیم ترین
اور طاقتور سے طاقتور شہنشاہیتوں نے بھی اپنی زیردست قوموں کا اگرچہ سب کچھ چھین لیا تھا مگر
ان کے شخصی قوانین پر ہاتھ ڈالنے کی جسارت نہیں کی تھی۔ رومن امپائر اور برطانوی شہنشاہیت
اس کی سب سے نمایاں مثالیں ہیں۔ انگریزوں نے ہندوستان پر حاکمانہ تسلط قائم کرنے کے بعد
ان عام اسلامی قوانین کو جو اب تک یہاں نافذ چلے آرہے تھے' بتدریج ختم کرکے اپنا وضع کردہ
قانون جاری کردیا' مگر جہاں تک یہاں کے باشندوں کے پرسنل لا کا تعلق ہے' انہیں منسوخ نہیں کیا۔
اس کی وجہ ان کے سامنے کی یہی حقیقت تھی کہ یہاں کے مسلمانوں اور ہندوؤں کو اپنے اپنے شخصی قوانین
سے جو گہری جذباتی وابستگی ہے اس کے باعث وہ جان دے دیں گے مگر اپنے ان قوانین کی منسوخی ہرگز
گوارا نہ کریں گے۔ اس لیے ان کے اس نازک ترین جذبے کو چھیڑنا انجام کے لحاظ سے سخت مضر ہوگا۔
یقیناً جو بات اب تک ایک حقیقت رہی ہے وہ آج بے حقیقت نہیں بن جائے گی۔

پرسنل لا کی یہ تہذیبی اہمیت جس طرح دوسری قوموں اور ملتوں کے بارے میں ناقابل انکار ہے'
اسی طرح ملت اسلامیہ کے سلسلے میں بھی ناقابلِ انکار ہی رہے گی۔ اس کا پرسنل لا بھی اس کی شخصیت کے
لیے قالب کی' اور اس کی اجتماعی روح کے لیے محافظ کی حیثیت رکھتا ہے' اور اس سے محروم ہوجانے
کا نتیجہ بھی اس کے ملی تشخص کے لیے موت ہی کی شکل میں نکل سکتا ہے۔ اس لیے اگر اس کا رشتہ اس کے
دین و ایمان سے نہ جڑا ہوتا تو بھی وہ اس کے لیے جان سے کم عزیز نہ ہوتا۔

مسلم پرسنل لا

اور اس میں تبدیلی

(مولانا سید حامد علی)

(یہ مختصر سا مقالہ مسلم پرسنل لا سے متعلق ایک سمینار میں پڑھا گیا تھا جو ۱۹۶۸ء میں علیگڈھ میں ہوا تھا۔ مقالہ معمولی ترمیم کے ساتھ جوں کا توں شائع کیا جا رہا ہے، البتہ حواشی کے ذریعے اسے کچھ اَپ ٹو ڈیٹ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اسلامی قانون کی اصل حیثیت

ملتِ اسلامیہ کی تشکیل نسل، وطن، زبان اور اس طرح کے دوسرے حوالے سے جو عموماً قوموں کی تشکیل کا باعث بنتے ہیں، نہیں ہوتی ہے۔ ملتِ اسلامیہ کا وجود اسلام کا رہینِ منت ہے۔ مسلمان اس فرد کا نام ہے جس کا دین اسلام ہو اور ملت اسلامیہ اس ملت کا جو اسلام کی بنیاد پر وجود میں آئی ہو۔ اسلام کے بغیر مسلمان یا امت مسلمہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ امت مسلمہ سے تعلق رکھنے والے افراد اگر زندہ و سلامت رہیں، مگر خدانخواستہ اسلام سے اپنا رشتہ منقطع کر لیں تو ان افراد کے زندہ رہنے کے باوجود ملت اسلامیہ کا خاتمہ ہو جائے گا اور کوئی اور قوم اس کی جگہ لے لے گی۔ بالفاظ دیگر ملتِ اسلامیہ کی بقا اسلام سے وابستگی پر منحصر ہے اور فنا عدم وابستگی کا لازمی ثمرہ و نتیجہ۔

جس طرح یہ ایک بنیادی حقیقت ہے اسی طرح دوسری بنیادی حقیقت یہ ہے کہ اسلام مغرب کے تصورِ مذہب کے مطابق کوئی مذہب (ریلیجن) نہیں ہے جسے صرف عقائد و عبادات سے بحث ہو اور زندگی کے دوسرے معاملات سے سروکار نہ ہو۔ اسلام اس کے برعکس طریقِ زندگی اور نظامِ حیات ہے جو عقائد، عبادات، اخلاق، معاشرت، معاملات، معیشت، سیاست میں ہوا

امور غرض انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

قُلْ اِنَّنِیْ ھَدٰىنِیْ رَبِّیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۚ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰھِیْمَ حَنِیْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ لَا شَرِیْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝

(الانعام ۱۶۲ تا ۱۶۴)

کہو (اے نبی) یقیناً میرے رب نے مجھے صراط مستقیم کی طرف رہنمائی فرمائی ہے یعنی دین قیم کی طرف جو ابراہیم حنیف کا مسلک ہے وہ ابراہیم جن کا شرک سے کوئی تعلق نہ تھا (اے نبی) کہو میری نماز میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العٰلمین کے لیے ہے، کوئی اس کا شریک نہیں، مجھے اسی کا حکم ملا ہے اور میں سب سے پہلے مسلمان ہوتا ہوں (خدا کی اطاعت کرتا ہوں)

یعنی اسلام ایک ایسا دین ہے جو عمل کے میدان میں عبادات سے شروع ہو کر پوری زندگی پر حاوی ہوتا ہوا موت پر جا کر ختم ہوتا ہے اور کوئی شخص اسی وقت سچا مسلمان بنتا ہے جب عبادات کی طرح اس کا جینا اور مرنا بھی اللہ ہی کے لیے ہو۔

اس آیت میں جو حقیقت مجمل انداز میں بیان ہوئی ہے قرآن مجید اور سنت رسول اس کی تفصیل و توضیح سے پر ہیں۔ کتاب و سنت کا سرسری مطالعہ کرنے والا بھی اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ اسلام نے زندگی کے تمام شعبوں کے بارے میں احکام دیے ہیں اور ملت اسلامیہ کے لیے ان کا اتباع اسی طرح ضروری ہے جس طرح عبادات کی بجا آوری۔ یہ حقیقت مسلمان علماء و فقہاء ہی نہیں غیر مسلم ماہرین قانون اور مغربی محققین سے بھی مخفی نہیں ہے۔ پروفیسر جے۔ این۔ ڈی اینڈرسن جو مغرب میں اسلامی قانون کے موضوع پر سند خیال کیے جاتے ہیں۔ اپنی کتاب "اسلامک لاء ان دی ماڈرن ورلڈ" (Islamic law in the modern World) (اسلامی قانون جدید دنیا میں) جو اسلامی قانون کے موضوع پر ان کے تحقیقی لیکچرس کا مجموعہ ہے، کے پہلے لیکچر (Conceptions of Law - Islamic & Western) (قانون کے

تصورات ــ اسلامی و مغربی) میں فرماتے ہیں :۔

" لیکن یہ حقیقت براہِ راست قانون کے ان دونوں سسٹموں (اسلامی و مغربی) کے درمیان دوسرے بنیادی فرق تک رہنمائی کرتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلامی قانون اپنے دائرۂ کار کے لحاظ سے مغربی قانون سے غیر معمولی طور پر وسیع ہے ۔ مغربی ذہن کے لیے قانون کی تعریف ــ قانون داں کے مفہوم میں ۔ ہمارے موجودہ مقصد کے تحت یہی جا سکتی ہے کہ قانون وہ ہے جو عدالتوں کے ذریعے نافذ ہوتا ہے یا ہو سکتا ہے ۔ اس کے برعکس اسلامی قانون سارے انسانی معاملات کو اپنے دائرۂ کار میں لے لیتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس طرح اسلامی قانون ۔ قانون کے ہر میدان ' پبلک ' پرائیویٹ ' قومی اور بین الاقوامی اور ان کے علاوہ بہت سے ایسے امور پر محیط ہے ۔ جنہیں ہم مغرب کے لوگ سرے سے قانون تصور ہی نہیں کرتے ۔" (ص ۴)

اپنے دوسرے لیکچر Islamic Law and Modern Life (اسلامی قانون اور جدید زندگی) کے آغاز میں وہ فرماتے ہیں :۔

" مزید براں وہ (اسلامی قانون) زندگی کے ہر شعبے اور قانون کے ہر میدان کو محیط ہے ۔" (ص ۱۷)

Dr. Saba Habachy کتاب کے انٹروڈکشن میں فرماتے ہیں :۔

" اسلام مکمل طریق زندگی ' مذہب ' اخلاق ' قانون ' نظام ۔ بہ یک وقت سب کچھ ہے ۔ تیسری بنیادی حقیقت یہ ہے کہ اسلام انسانی قانون نہیں ' خدائی قانون ہے اور اس لیے نہ صرف یہ کہ حقاً ' مذہباً اور اخلاقاً واجب الاتباع ہے ' بلکہ خدائی ہدایت ہونے کی وجہ سے ناقابلِ تغیر و تبدل بھی ہے ۔ انسان انسانی قانون کو بدل سکتا ہے مگر خدائی قانون کو بدلنے کا وہ مجاز ہے ' اسے کوئی حق ہے ' نہ خدا سے اور اس کے قانون سے آزاد ہو کر قانون بنانے کا ۔ انسان کے لیے ایک ہی رویہ صحیح ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر قانون کی پیروی کو چھوڑ کر وہ اپنے خالق ' مالک اور فرماں روائے حقیقی کی کامل اور مخلصانہ پیروی میں لگ جائے ۔ اس رویے کے اختیار کرنے میں دنیا و آخرت کی کامرانی ہے اور انحراف میں دنیائی ناکامی اور آخرت کا عذاب الیم

قرآن مجید میں ہے :-

وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَٰذَا حَلَالٌ وَهَٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ (نحل، ۱۱۶)

تم اپنی زبانوں سے جھوٹ کہتے ہوئے یہ نہ کہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام اس طرح تم اللہ کی طرف جھوٹ منسوب کرکے اس پر افترا پردازی کرتے ہو۔

أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ شَرَعُوا لَهُم مِّنَ الدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَن بِهِ اللَّهُ (شوریٰ، ۲۱)

(کیا ان کے لیے خدا کی خدائی میں) شریک کچھ ایسی ہستیاں ہیں جنہوں نے ان کے لیے دین بنایا ہے جس کی اجازت اللہ نے انہیں نہیں دی ہے۔

اتَّبِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءَ (اعراف، ۳)

تمہارے رب کی طرف سے جو دین تمہاری طرف آتا ہے اس کی پیروی کرو اور اللہ کے بجائے کسی اور کی پیروی کرکے اسے خدا نہ بنا لو

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ (روم، ۲۰)

تو یکسو ہو کر اپنا رخ (اللہ کے) دین کی طرف سیدھا کرلو، یہ دین اللہ کی پیدا کردہ فطرت ہے جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں، یہی دین قیم ہے۔

ان آیات سے واضح ہوا کہ قانون سازی صرف اللہ کا حق ہے، اس کے علاوہ کسی کو علی الاطلاق شارع و قانون ساز ماننا یا اس کے وضع کردہ قانون کو صحیح تسلیم کرنا شرک ہے۔ دوسری بات یہ واضح ہوئی کہ اسلام اللہ کا نازل کردہ قانون اور فطرت انسانی کے عین مطابق ہے، اس لیے اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت ہے، نہ کسی انسان کو ـــ مسلم ہو یا غیر مسلم ـــ اس

میں تبدیلی کرنے کا حق ہے۔ مسٹر جے۔ این۔ ڈی۔ اینڈرسن اسلامی قانون کے اس پہلو پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں۔

"اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کیا جاسکتا کہ پہلا' بنیادی اور (قانون کے اسلامی و مغربی) دونوں سسٹموں کے درمیان سب سے زیادہ واضح فرق یہ ہے کہ مغربی قانون جیسا کہ ہم آج جانتے ہیں اپنی اصلیت کے اعتبار سے لادینی ہے جبکہ اسلامی قانون اپنی اصلیت کے اعتبار سے دینی ہے۔" (کتاب مذکور ص ۲)

"وہ (اسلامی قانون) بنیادی طور سے خدائی قانون سمجھا گیا ہے اور اس لیے وہ بنیادی طور سے ناقابل ترمیم ہے۔" (ص ۳)

یہ ہے اسلامی قانون کی حقیقی حیثیت اور اس کے سلسلے میں مسلمان کا صحیح موقف۔ مسلمان اسلامی قانون میں نہ خود ترمیم کرسکتا ہے اور نہ کسی ترمیم کو برداشت کر سکتا ہے۔ یہی نہیں اس کی ذمہ داری ہے کہ اپنی پوری زندگی کو اللہ کے قانون — اسلام — کے تابع کر دے اور اگر زندگی کے کچھ شعبوں پر غیر الٰہی قوانین کا غلبہ ہو تو وہ اس وقت تک اطمینان کا سانس نہ لے جب تک یہ غلبہ زائل نہ ہو جائے اور انسانی زندگی تمام شعبوں سمیت اللہ کے دین کے تحت نہ ہو جائے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ	اللہ نے تمہارے لیے وہی دین
مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّ الَّذِيْ	مشروع کیا ہے جس کی تاکید اس نے
اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا	نوح کو کی تھی اور جس کی وحی (اے نبی)
بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰى	ہم نے تم کو کی ہے اور جس کی تاکید ہم نے
اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا	ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو کی تھی کہ دین
تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ (شوریٰ ۱۳)	قائم کرو اور اس معاملے میں متفرق نہ ہو

اسلامی قانون کا نفاذ مختلف ادوار میں

دورِ نبوی اور دورِ خلافتِ راشدہ تاریخ انسانی کے وہ تاروشن ترین

ملہ واضح رہے کہ ناقابل ترمیم ہونے کا تعلق اسلامی قانون کے اس حصہ سے ہے جو کتاب و سنت کی صریح نصوص سے ثابت ہے۔ رہے وہ قوانین جو قیاس و اجتہاد کے ذریعے مستنبط ہیں ان پر یقیناً نظر ثانی کی جا سکتی ہے اور ہوتی رہتی ہے۔

اور مثالی ادوار ہیں جب کہ اللہ کا قانون اپنی مکمل شکل میں اور حقیقی روح کے ساتھ افراد کے ظاہر و باطن، معاشرت، معاملات و امور، عدالتوں کے فیصلوں اور ریاست کے نظم و نسق پر پوری طرح چھا گیا تھا۔ دین کے اس کامل غلبہ کا نتیجہ مثالی افراد، مثالی معاشرہ اور مثالی ریاست کی صورت میں رونما ہوا۔ یہ وہ دور تھا جب امت مسلمہ کے تمام مسائل ایک ایک کر کے حل ہوئے اور وہ دنیوی کامرانی و سربلندی اور خیر و صلاح کے اس مقام پر سرفراز ہوئی جس پر کوئی قوم کبھی فائز نہ ہوئی تھی۔ متمدن دنیا کے بہت بڑے حصے پر اسلام قانونِ زندگی بنکر چھا گیا اور امت مسلمہ کی قیادت و رہنمائی میں نوعِ انسانی کا بہت بڑا حصہ گمراہی، ظلم، بدکرداری اور نیچ نیچ اور ناخداترسی کی عمیق پستیوں سے نکل کر ہدایت، انسانیت، عدل، مرحمت، کردار، مساوات اور خداترسی کے مقامات بلند پر پہنچ گیا۔ کتنا زریں تھا یہ دور اور کس قدر مقام بلند پر فائز تھی امت مسلمہ! درحقیقت یہ سب کچھ اللہ کے قانون کے مکمل نفاذ کے ثمرات تھے۔

خلافت راشدہ کے بعد خلافت غیر راشدہ کا دور شروع ہوا۔ اس دور میں نام خلافت کا چلتا تھا مگر شکل اور روح دونوں اعتبار سے موروثی و خاندانی بادشاہت قائم تھی۔ خلیفہ کا عزل و نصب، ریاست کا نظم و نسق اور بیت المال کا انصرام ـــ یہ تمام امور بہت کچھ اسلامی قانون کی گرفت سے نکل گئے۔ ریاستی دائرے میں فساد پھیلنے کا فطری نتیجہ یہ نکلنا چاہیے تھا کہ معاشرہ میں بگاڑ پھیلے اور یہی ہوا۔ خلافت کا نظام اسلام میں اس لیے قائم کیا گیا تھا کہ وہ اسلامی قانون کی تنفیذ کے ساتھ اصلاح اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فرائض انجام دے مگر نظام خلافت کے بگڑنے کے باعث یہ سارے امور تغافل کی نذر ہوئے، یہی نہیں، ایسا بھی ہوا کہ بعض خلفاء نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی جگہ نہی عن المعروف کے سیاہ کارنامے انجام دیے۔ پھر کچھ خلفاء اور ان کے عمال کی بدکرداریاں معاشرے میں بدکرداریوں کے فروغ کا ذریعہ بنیں اور نتیجہ یہ نکلا کہ افراد اور سماج پر اسلامی قانون کی گرفت ڈھیلی ہوتی چلی گئی لیکن انحطاط و فساد کے اس دور میں بھی عدالتوں کا قانون کم و بیش اسلامی ہی رہا اور فیصلے اسلام کے دیوانی و فوجداری قوانین ہی کے تحت ہوتے رہے۔

خلافت عباسیہ کے سقوط کے بعد خلافت کا یہ نام کا نظم اور امت مسلمہ کی رہی سہی اجتماعیت بھی ختم ہو گئی اور لامرکزیت اور چھوٹی چھوٹی بادشاہتوں کا دور شروع ہوا جن کا دائرہ ایک یا دو ملکوں تک محدود ہوتا اور کبھی ایک ہی ملک میں کئی بادشاہتیں ہوتیں۔ اس دور میں ملوکیت

کو اور فروغ ہوا۔ امت مسلمہ کے زوال، فساد اور انتشار میں اور اضافہ ہوا اور افراد اور معاشرے پر سے اسلام کی گرفت اور کمزور ہوئی مگر اس دورِ انحطاط میں بھی عدالتوں کا قانون اسلامی ہی تھا اور اسلام کے دیوانی و فوجداری قوانین ہی کے تحت مقدمات کا فیصلہ ہوتا تھا۔ ہندوستان کی مسلمان حکومتوں کا بھی یہی حال تھا۔ یہ حال اس وقت تک قائم رہا جب تک کہ انگریز اور دوسری مغربی اقوام کی سیاسی و ذہنی غلامی کا دور شروع نہ ہوا

مسلمانوں کے دورِ حکومت کے دو پہلو اور قابلِ ذکر ہیں۔ ایک یہ کہ افراد اور سماج کی اسلامی قانون سے بڑھتی ہوئی بے تعلقی اور فرماں رواؤں کی مطلق العنانی و بے کرداری کو کبھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔ ایسا کبھی خیال نہیں کیا گیا کہ رجعت پسندی اور قدامت پرستی پر ترقی پسندی روشن خیالی اور تہذیب و ثقافت کو غلبہ نصیب ہو رہا ہے۔ اس کے بجائے اسے زوال، انحطاط اور فساد ہی خیال کیا گیا اور مفکرین، مصلحین اور مجددین اس صورتِ حال کو بدلنے اور افراد، سماج اور ریاست کو زیادہ سے زیادہ اسلامی بنانے کی کوشش میں مصروف رہے اور ان کوششوں میں انہیں ایک حد تک کامیابی بھی ہوئی۔ ہندوستان میں مغل حکومت کے زوال کے وقت سید احمد شہیدؒ مولانا اسمٰعیل شہیدؒ اور دوسرے صلحائے امت نے امت کی عمومی اصلاح کے علاوہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ اور نظامِ اسلامی کے قیام کے لیے ایک منظم تحریک چلائی اور سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ نظامِ اسلامی کے قیام کی یہ جدوجہد کامیاب ہو کر خود اپنوں کی غداری کے نتیجے میں ناکام ہو گئی۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ ان فرماں رواؤں کو اپنی بدکاری اور مطلق العنانی کے باوجود یہ ہمت کبھی نہیں ہوئی کہ اسلامی قانون کے کسی جزو کو باضابطہ منسوخ کر کے اس کی جگہ کوئی دوسرا قانون نافذ کریں۔ ایک آدھ خودسر اور بد دماغ فرماں روا نے اس کی کوشش کی تو اسے منہ کی کھانی پڑی۔ اکبر کی مثال ہمارے سامنے ہے، جب اس نے کچھ اسلامی احکام منسوخ کیے اور کچھ اسلامی شعائر کو مٹانا چاہا تو شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور دوسرے علمائے حق کی تلقین پر خود اکبر کے مسلمان امراء نے اس کوشش کو ناکام بنا دیا۔

سیاسی و ذہنی غلامی کے ثمرات

اسلامی قانون کی باضابطہ منسوخی کا آغاز انگریز یا د
مغربی اقوام کی سیاسی و ذہنی غلامی سے ہوتا ہے

ہندوستان پر انگریز کے تسلط کے کچھ عرصے بعد ۱۸۶۰ء تک اس ملک میں اسلام کا دیوانی و فوجداری قانون نافذ تھا۔ اس کے بعد برطانوی حکومت نے ملتِ اسلامیہ کو تحلیل کرنے اور اپنے تسلط کو جاری رکھنے کے لیے بتدریج اسلامی قوانین کو منسوخ کرنا اور اپنے وضع کردہ قوانین کو نافذ کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ انیسویں صدی کے وسط تک پہنچتے پہنچتے پوری شریعت منسوخ ہو گئی اور اس کا صرف وہ حصہ مسلمانوں کے پرسنل لا کی حیثیت سے باقی رہنے دیا گیا جو نکاح، طلاق، مہر، وراثت، وقف وغیرہ مسائل سے متعلق تھا۔ بعد میں اس حصے کو شریعت ایکٹ کے نام سے پاس کر کے باضابطہ قانونِ ہند کا جزء بنا لیا گیا۔

مسلمانوں کے حساس اور دیندار طبقے میں انگریزی حکومت کے خلاف نہ ختم ہونے والی نفرت اور اس حکومت کو الٹ دینے کی مسلسل جد و جہد کے پیچھے اصل وجہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ انگریز نے مسلم پرسنل لا کے علاوہ سارے اسلامی قانون کو منسوخ کر کے رکھ دیا تھا اور مسلمان ججوں (قضاۃ) کو برطرف کر کے مسلمانوں کے تمام امور و معاملات کو عام عدالتوں کے حوالے کر دیا تھا۔ اس اقدام نے ہندوستان کو دار الاسلام سے دار الحرب میں منتقل کر دیا تھا جسے دار الاسلام میں تبدیل کرنا ہر مسلمان کا دینی و ملی فریضہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کا دیندار طبقہ برطانوی حکومت سے مسلسل برسرِ پیکار رہا۔ اس سلسلے میں سید احمد شہیدؒ کے جانشین علمائے صادق پور وغیرہ نے جو بے مثال قربانیاں دیں اور برطانوی حکومت کے خلاف جس طرح مسلح تحریک چلائی، اہلِ علم اس سے باخبر ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کا ایک اہم محرک ہندوؤں اور مسلمانوں کا یہ اندیشہ تھا کہ ان کے مذہب کو خراب کیا جا رہا ہے اور مولانا فضلِ حق خیرآبادی اور دوسرے اہلِ علم نے انگریزی حکومت کے خلاف اس لیے فتوے دیے تھے کہ انگریزی حکومت نے اسلامی قوانین کو معطل کر کے رکھ دیا تھا۔ ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں علماء کے زیرِ قیادت مسلمانوں نے جو غیر معمولی حصہ لیا اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ ان کے نزدیک انگریزی حکومت اسلام اور عالمِ اسلام کی دشمن تھی اور انگریزی اقتدار کے ہٹ جانے کے بعد یہ توقع کی جاتی تھی کہ اسلامی نظام یا اس کا معتد بہ حصہ پھر سے نافذ ہو سکے گا۔ کم از کم خلافت تحریک تک تو یہی بات لوگوں کے ذہن و دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ حضرت شیخ الہندؒ، رئیس الاحرار مولانا محمد علیؒ اور مولانا ابو الکلام کی اس دور کی تحریریں اور تقریریں پڑھیے اور انگریزی عدالتوں اور قانون ساز اداروں کے

بابتیکات کے فتووں کا مطالعہ کیجیے۔ آپ کو صاف نظر آئے گا کہ انگریزی اقتدار سے مسلمانوں کو اصل شکایت یہ نہ تھی کہ اس نے انہیں مادی اعتبار سے محکوم بنالیا تھا۔ بلکہ یہ تھی کہ وہ ان کے دین کو خراب، اسلامی قوانین کو منسوخ اور ان کی تہذیب و روایات کو تباہ کرنے کا موجب ہے۔ وہ اس لیے آزادی چاہتے تھے اور انھوں نے اس غرض کے لیے بے مثال قربانیاں دیں کہ اسلامی قوانین پھر سے بحال ہوں اور انہیں اپنے دین، اپنی تہذیب اور اپنی روایات کے مطابق زندگی گذارنے کا موقع ملے۔

یہ ہندوستان کا حال تھا، دوسرے مسلم ممالک بھی انگریزیا دوسری مغربی اقوام کے محکوم یا نیم محکوم یا ذہنی و فکری غلام تھے اور ان ممالک میں بھی مغربی اقوام کی سیاسی غلامی یا مغربی افکار و نظریات کی ذہنی غلامی کے نتیجے میں اسلامی قوانین منسوخ ہونا شروع ہوئے اور ان کی جگہ مغربی قوانین لیتے گئے تا آنکہ صرف پرسنل لا کی حد تک اسلامی قوانین کا نفاذ باقی رہ گیا۔ افغانستان سعودی عرب اور نائیجیریا وغیرہ ممالک اس سے مستثنیٰ ہیں۔ ان ممالک میں اسلام ہی کے دیوانی و فوجداری قوانین نافذ رہے۔ ترکی نے آگے بڑھ کر اتاترک کی ڈکٹیٹر شپ کے تحت یہ اعلان کیا کہ ترکی حکومت ایک لادین حکومت ہے اور اس نے نکاح، طلاق اور وراثت تک کے قوانین میں ترمیمات کر ڈالیں۔

مسلم ممالک میں یہ جو کچھ ہوا مغرب کی ذہنی و سیاسی غلامی کا نتیجہ تھا اور اسے وہاں کے دیندار طبقہ اور اسلام پسند عوام کی تائید حاصل نہ تھی۔ چنانچہ دین پسند عناصر نے اسلامی قانون کی منسوخی کی ہر قدم پر مخالفت کی اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلم ممالک خانہ جنگی اور اندرونی کش مکش کی آماج گاہ بن کر رہ گئے تمام مسلم ممالک میں یہ کش مکش آج بھی جاری ہے۔ برسر اقتدار طبقہ فوجی یا سیاسی ڈکٹیٹر شپ سے فائدہ اٹھا کر ملک پر مغرب کے لادینی نظریات و دساتیر مسلط کر رہا ہے اور اسلام کا وفادار طبقہ اس کی مزاحمت کر رہا ہے۔ اس مزاحمت میں اسے جان و مال کی عظیم قربانیاں دینی پڑی ہیں اور معاملہ دار و رسن تک پہنچ گیا ہے۔ عرب ممالک میں کش مکش کی اصل آماج گاہ مصر و شام ہیں، غیر عرب ممالک میں یہ کش مکش ترکی میں شدید ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ عدنان مندریس اور ان کے ساتھیوں کی جانی قربانیاں رنگ لائیں اور اب ترکی میں جو پارٹی برسر اقتدار ہے وہ نسبتہً دین پسند ہے اور اس کے زیر سایہ ترکی مغربیت سے اسلام کی طرف لوٹ

رہا ہے[1]

اکثر و بیشتر مسلم ممالک میں پرسنل لا کے علاوہ بقیہ اسلامی قوانین کی منسوخی اور ترکی وغیرہ میں پرسنل لا میں کی جانے والی تحریفات ترقی پسندی کا نہیں، مغرب کی ذہنی و فکری غلامی کا ثبوت ہیں[2] ۔ ان اقدامات کو ان ممالک کے مسلم عوام کی تائید حاصل نہیں ہے۔

نہ یہ اقدامات کسی ملک کے لیے حجت و سند کا مقام رکھتے ہیں۔ غلط کار مسلمان فرماں رواؤں نے اسلامی نظام خلافت کو ختم کر کے ملوکیت کو رائج کرنے اور مسلم سوسائٹی میں ظلم و تشدد، عدم مساوات اور فسق و فجور کو عام کرنے کے جو سیاہ کارنامے انجام دیے تھے اگر وہ تقلید کے نہیں، تنقید اور نفرت کے مستحق ہیں اور آج ہم ان سے اظہار برأت کرتے ہیں تو موجودہ مغرب زدہ اور لادین فرماں رواؤں کی اسلامی قانون سے نظری و عملی بغاوت اسلام کے فدائیوں کے لیے کس طرح سند و حجت کا مقام حاصل کر سکتی ہے جبکہ اسلام کی رو سے پوری امت مسلمہ کو بھی اسلام کے کسی ایک قانون کو منسوخ کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ اسلامی قوانین کا واضع اللہ ہے اور وہی اسے منسوخ کر سکتا ہے اور اس نے دین کی تکمیل کر کے اور نبوت کا دروازہ

---

[1] جمال عبدالناصر کے انتقال کے بعد مصر بھی بتدریج دین کی طرف لوٹ رہا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے بہتر حال لیبیا کا ہے جہاں کرنل قذافی کی زیر قیادت اسلامی قانون کو مکمل طور پر نافذ کرنے کی تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں۔

[2] کہا جاتا ہے کہ عرب ممالک میں مسلم پرسنل لا میں بہت زیادہ ترمیمات کر دی گئی ہیں اور اسلامی شریعت کو بالکلیہ یا بہت بڑی حد تک منسوخ کر دیا گیا ہے۔ لیکن یہ بات بالکلیہ غلط ہے۔ عرب ممالک میں کہیں بھی اسلامی شریعت کو منسوخ نہیں کیا گیا، نہ کہیں یکساں سول کوڈ نافذ کیا گیا ہے۔ بلاشبہ ان ممالک میں مسلم پرسنل لا کے بعض مسائل میں کچھ ترمیمات ہوئی ہیں مگر یہ ترمیمات کتاب و سنت کے دائرے اور فقہائے امت کے مسالک کے اندر رہتے ہوئے کی گئی ہیں اور یہ ترمیمات خود مسلمان علماء اور ماہرین قانون نے کی ہیں۔ ہندوستان میں بھی کتاب و سنت کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے اس طرح کی ترمیمات کی جا سکتی ہیں مگر یہ کام مسلمان علماء اور دینی ماہرین قانون کے کرنے کا ہے، نہ کہ حکومت کے عمال کا جو شریعت اسلامیہ کو منسوخ کرنا چاہتے ہیں۔

کرکے اسلامی قانون کو ہمیشہ کے لیے ناقابلِ تنسیخ بنا دیا ہے۔ ہاں اسلامی قوانین کا جو حصہ مجتہدین کے اجتہادات پر مشتمل ہے اس پر نظر ثانی ہوسکتی ہے

برطانوی حکومت سے طویل کش مکش

آزادی اور مسلم پرسنل لا کی تنسیخ کے عزائم کے بعد ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کو آزادی کا آفتاب طلوع ہوا۔ آزادی کسی قوم کو اس لیے درکار ہوتی ہے کہ وہ اپنے نظریات و افکار اپنے طریقِ زندگی اور اپنی تہذیب و روایات کے مطابق زندگی بسر کرسکے۔ مسلمانوں کے سامنے آزادیِ ہند کا سب سے بڑا محرک یہ تھا کہ اسلامی قانون جسے انگریز نے اپنے جبر و استبداد سے منسوخ کردیا تھا، بحال ہوگا اور پرسنل لا سے متعلق امور کے علاوہ دوسرے امور میں بھی اسلام پر چلنے کی آزادی حاصل ہوگی لیکن ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو جب نیا دستور نافذ ہوا تو انہیں یہ خوش خبری ملی کہ انگریزی محکومی کے دور میں مسلم پرسنل لا کے تحت زندگی کے کچھ شعبوں میں اسلام پر چلنے کے جو مواقع حاصل تھے یکساں سول کوڈ بن جانے کے بعد وہ مواقع بھی چھن جائیں گے۔ نئے دستور نے حکومت ہند کو رہنمائی دی تھی کہ وہ یکساں سول کوڈ ضرور بنالے۔ دستور ہند کا چوتھا حصہ ریاست کی پالیسی کے رہنما اصول **Directive principles of state policy** کے زیرِ عنوان متعدد دفعات پر مشتمل ہے۔ ان دفعات میں سے دفعہ ۴۴ کا عنوان ہے **Uniform Civil Code for Citizens** اس دفعہ کا مفہوم ہے۔

"ریاست ہندوستان کے پورے علاقے کے شہریوں کے لیے یکساں سول کوڈ بنانے کی پوری کوشش کرے گی۔

کہا جاتا ہے کہ مسلم پرسنل لا کی تنسیخ دستور کے بنیادی حقوق کی دفعات سے ٹکراتی ہے۔[1]

---

[1] یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ "رہنما اصولوں" اور "بنیادی حقوق" کے ابواب میں سے کون باب مقدم ہے۔ ماہرین قانون کا اس مسئلے میں اختلاف ہے۔ ویسے عدلیہ کا عام رجحان "بنیادی حقوق" ہی کو اہم تر قرار دینے کی طرف ہے مگر شراب بندی کے رہنما اصول کو کانگریسی حکومتیں جس بری طرح نظر انداز کر رہی ہیں اور جو ریاستوں میں شراب کی بندش تھی ان میں کیے بعد دیگرے اس بندش کو ختم کر رہی ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ارباب اقتدار نہ بنیادی حقوق کی دفعات کا احترام کرتے ہیں اور نہ رہنما اصولوں کا (باقی صفحہ آئندہ)

اس لیے حکومت اس طرح کا اقدام نہ کرسکے گی اور کرے گی تو یہ اقدام غیر آئینی ہوگا لیکن درحقیقت یہ ایک خوش فہمی ہے جو دستور کی متعلقہ دفعات کو بغور نہ پڑھنے سے پیدا ہوئی ہے۔ بنیادی حقوق میں مذہبی آزادی سے متعلق دفعہ یوں ہے:۔

(I) Subject to public order, morality and health and to other provisions of this part, all persons are equally entitled to freedom of concience and the right freely to profess. Practise and propagate religion,

(2) Nothing in this article shall afect the operation of any existing law or prevent the state from making any law.

(a) Reculating or Restricting any Economic. Financial, or other seculer activity which may be associated with religious practice.

(b) Providing for social welfare and reform, or the throwing open of hindu religious institutions of a public character to all classes and sections of hindus.

مذہبی آزادی کی یہ دفعہ اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہے یہ آزادی نہ غیر محدود ہے اور نہ غیر مشروط مذہبی آزادی سے متعلق دستور کی یہ دفعہ مختلف مصالح کے تحت مذہبی امور میں مداخلت کی اجازت دیتی ہے اور یکساں سول کوڈ کی دفعہ ریاست کو پابند کرتی ہے کہ وہ تمام شہریوں کے لیے یکساں سول کوڈ فراہم کرے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ ان دونوں دفعات کے درمیان تضاد اور مسلم پرسنل لا کی منسوخی کو خلاف آئین قرار دینے کی باتیں کیوں کرتے ہیں جبکہ یہ سب اعتراضات دستور سازی کے وقت اٹھائے گئے تھے اور ان کے جوابات دیے جاچکے تھے اور واضح کیا جاچکا تھا کہ مسلم پرسنل لا کو باقی نہیں رہنا ہے۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ دستور ساز اسمبلی کے ایک مسلمان ممبر مسٹر نذیرالدین نے "یکساں سول کوڈ" والی دفعہ میں حسب ذیل ترمیم پیش کی تھی۔

(بقیہ حاشیہ) وہ حضرات اپنے مفاد اور اپنے خواہشات کی تکمیل چاہتے ہیں۔

"شخصی قوانین بدلے نہ جائیں گے۔ بجز اس شکل کے کہ (متعلقہ) کمیونٹی سے پہلے ہی سے منظوری حاصل کر لی جائے ایسے طریقے سے جسے یونین لیجسلیچر طے کر دے"

اس طرح کی متعدد ترمیمات پیش کی گئی تھیں مگر یہ ساری ترمیمات رد کر دی گئیں اور اب تو اس سلسلے میں نظری بحث کی گنجائش بھی باقی نہیں ہے۔ دستور کے نفاذ کے بعد اسپیشل میرج ایکٹ (جس کا اثر ہندو اور مسلم دونوں پرسنل لا پر پڑتا تھا) اور ہندو میرج ایکٹ (جس کا اثر ہندو پرسنل لا پر پڑتا تھا) پاس ہوئے پھر ہندو پرسنل لا کو منسوخ کر کے ہندو کوڈ بل کو پاس کر دیا گیا۔ یہی ہندو کوڈ بل مستقبل قریب میں ہندوستان کے تمام شہریوں پر لاگو کیا جائے گا۔ جس زمانے میں ہندو پرسنل لا میں ترمیم کی جارہی تھی مرکزی وزیر قانون مسٹر پاٹسکر نے ایک ریڈیائی تقریر میں کہا تھا۔

"ہم نے اپنے آئین کے نفاذ یعنی ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کے بعد اسپیشل میرج ایکٹ اور ہندو میرج ایکٹ پاس کیے ہیں۔ ہندو قانون وراثت کا مسودہ زیر غور ہے۔ یہ سب ضابطۂ دیوانی کو یکساں بنانے کے اقدامات ہیں صرف جذباتی لوگ ان اقدامات کی مخالفت کرتے ہیں اور دریافت کرتے ہیں کہ ہم صرف ہندو قانون ہی کو ایک ضابطہ میں لانے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں۔ اس کا جواب صاف ہے۔ سارے سماج کو متحد اور مضبوط بنانے کے لیے ہمیں سب سے پہلے اس کے بڑے حصے ہی کو اکٹھا کرنا ہوگا۔ ہم اس وقت تک کے لیے سارے بھارت کے لیے واحد ضابطہ دیوانی بنانے کا خیال بھی نہیں کر سکتے جب تک ہم ملک کے ان لوگوں کے پرسنل لاز کو ایک ضابطہ میں نہیں لے آتے جنہیں ہندو کہا جاتا ہے اور جو ملک کی آبادی کا پچاسی فی صدی ہیں"

مرکزی وزیر قانون نے اسی زمانے میں اپنی پریس کانفرنس میں کہا تھا:-

"ہندو قوانین میں جو اصلاحات کی جارہی ہیں وہ مستقبل قریب میں ہندوستان کی تمام آبادی پر نافذ کی جائیں گی۔ اگر ہم ایسا قانون بنانے میں کامیاب ہوگئے جو ہماری پچاسی فی صدی آبادی کے لیے ہو تو اس کا نفاذ باقی آبادی پر مشکل نہ ہوگا اس قانون سے پورے ملک میں یکسانیت پیدا ہوگی"

یہ ہے حقیقی آئینی اور عملی صورت حال۔ اس میں اتنی بات کا اور اضافہ کر لیجیے کہ ہندوستان

کی تمام سیاسی پارٹیاں ــــ مسلم لیگ کے سوا ــــ اس معاملے میں کانگریس کی ہم نوا ہیں اور غیر مسلم رہنماؤں میں سے ہم کسی کو نہیں جانتے جو اس معاملے میں ملت اسلامیہ کے موقف کو سمجھتا اور صحیح تسلیم کرتا ہو[1]

مسلم پرسنل لا کی منسوخی کے محرکات

مسلم پرسنل لا کی منسوخی کے حقیقی اور اہم محرکات صرف دو ہیں۔

(۱) ہندوستان میں بعض سیاسی پارٹیاں یہ نقطۂ نظر رکھتی ہیں کہ ہندوستان ہندوؤں کا ہے اور ہندو تہذیب ہی ہندوستانی تہذیب ہے۔ ان کے نزدیک ملک کی فلاح اسی میں ہے کہ کسی طرح یہاں کے سارے لوگ ہندو قومیت، ہندو تہذیب، ہندو رسم و رواج، ہندو روایات اور ہندو کابرکو اپنالیں۔ یہ کم سے کم بات ہے ورنہ ان کے نزدیک صحیح بات تو یہ ہے کہ ہندو دھرم کو چھوڑ کر یہ لوگ مجبوراً اسلام یا عیسائیت کے آغوش میں چلے گئے تھے۔ یہ مجبوری اب ختم ہو گئی ہے اس لیے وہ ہندو ملت کے آغوش میں واپس لوٹ آئیں۔ اس طرح کی پارٹیوں کا سیاسی اثر چاہے ابھی ملک میں بہت زیادہ نہ ہو مگر ان کا انداز فکر نوجوان نسل میں تیزی کے ساتھ سرایت کر رہا ہے اور ہندوستان کی کوئی سیاسی پارٹی ایسی نہیں ہے جس کے افراد اس فکر کے اثرات سے بالکلیہ پاک ہوں۔

ظاہر ہے کہ اس نقطۂ نظر کے رکھنے والے اسلام، مسلم پرسنل لا اور مسلمانوں کی ملی انفرادیت کو کسی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتے لیکن اس کے باوجود ہمیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے ہمیں ایسے لوگوں سے زیادہ سے زیادہ تعلقات قائم کر کے ان پر یہ واضح کرنا چاہیے کہ یہ نقطۂ نظر خود ان کے مذہب اور تہذیب اور ان کے مقصد کے لیے مضر ہے۔ اس سے دوسرے مذاہب کے ماننے والوں میں شدید ردعمل پیدا ہوگا۔ انہیں یہ بھی بتانے کی ضرورت ہے کہ اس سے ملک میں انتشار پیدا ہوگا۔ انہیں یہ بھی بتانے کی ضرورت ہے کہ اسلام فی الواقع کیا ہے اور اس سے ملک اور انسانیت کی فلاح کس طرح وابستہ ہے۔ اور ان پر اپنے قول و عمل سے واضح کر دینے کی بھی ضرورت ہے کہ مسلمان جان تو دے سکتا ہے مگر اسلام سے اپنا تعلق توڑ نہیں سکتا۔

---

[1] حال ہی میں آر ایس ایس کے رہنما گورو گولوالکر اور رام راج پریشد کے رہنما سوامی کرپاتری جی نے یکساں سول کوڈ کی مخالفت کی ہے۔ ہندو سماج کا یہ اچھا رجحان ہے جو ہمارے سامنے آرہا ہے

(۲) کچھ دوسرے لوگ ہیں وہ ہندو قومیت کے بجائے ہندوستانی قومیت کے اور ہندو تہذیب کے بجائے ہندوستانی تہذیب کے قائل ہیں۔ وہ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی اور تمام فرقوں اور ملتوں کو ایک ہندی قوم خیال کرتے ہیں اور ایک قوم سمجھنے کا تقاضا یہ خیال کرتے ہیں کہ ان کے مابین مذہبی اور تہذیبی امتیازات کم سے کم ہوں تاآنکہ ایک مشترکہ مذہب اور مشترکہ تہذیب وجود میں آجائے۔ یہ حضرات اپنے آپ کو سیکولر کہتے ہیں اور اپنے اس نقطہ نظر کو سیکولرزم۔ ایسے افراد الگ الگ پرسنل لاز کو متحدہ قومیت کے لیے سم قاتل خیال کرتے ہیں۔ وہ ملت اسلامیہ کے انفرادی تشخص کے برقرار رکھنے کے بھی قائل نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک جداگانہ ملی وجود۔ جداگانہ پرسنل لا، جداگانہ تہذیب اور جداگانہ رسم الخط یہ سب چیزیں نہ صرف یہ کہ ہندوستانی قوم میں انتشار پیدا کرتی ہیں اور ملک کے لیے شدید خطرے کا موجب بنتی ہیں، بلکہ خود اقلیتوں کے لیے سخت مضرت رساں ہیں۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کی یہ علیحدگی پسندی ہی ہے جو فرقہ واریت کو فروغ دیتی اور فرقہ وارانہ فسادات کا باعث ہے وہ بھارت، بھارتیہ راشٹرا در خود مسلمانوں کے تحفظ و فلاح کے نقطہ نظر سے ضروری سمجھتے ہیں کہ ہندو مسلم امتیازات کم سے کم ہوں، ان کے الگ الگ پرسنل لا ہونے کے بجائے ایک ہی پرسنل لا ہو وہ الگ تیوہار منانے کے بجائے ایک ہی نیشنل تیوہار منائیں، مختلف فرقوں کے مابین شادی بیاہ کے روابط قائم ہوں اور اس طرح سب لوگ ایک مشترکہ قومی دھارے میں بہنے لگیں۔

ایسے افراد کو یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ اکبر جیسا فرماں روا اور کبیر و گرونانک جیسے مذہبی پیشوا اس مقصد کو حاصل کرنے میں ناکام ہو گئے بلاشبہ ہندوستانی ایک قوم ہیں لیکن یہ ایک ایسی قوم ہے جو مختلف ملتوں، مذہبوں، تہذیبوں، رسوم و روایات کے ماننے والوں پر مشتمل ہے اور ملک کی فلاح اس میں نہیں ہے کہ انہیں زبردستی کوٹ چھان کر ایک مذہب اور ایک تہذیب کے سانچے میں ڈھال دیا جائے، بلکہ اس میں ہے کہ ہر گروہ کے مذہب، پرسنل لا، تہذیب و روایات اور طور طریق کو پھلنے پھولنے کے یکساں اور پورے مواقع ملیں تاکہ ہر کمیونٹی دل سے یہ محسوس کرے کہ وہ واقعۃً آزاد ہے اور اسے یکساں شہری حقوق حاصل ہیں

ایسے افراد کو یہ بتانے کی بھی ضرورت ہے کہ اسلام اور مسلم پرسنل لا کا مسئلہ مسلمان کے لیے

زندگی و موت کا مسئلہ ہے وہ اگر زندہ رہے لیکن ان کا پرسنل لا (ان کا دین) زندہ نہ رہا تو یہ زندگی موت سے بھی بدتر ہے کیونکہ اس کا انجام آخرت کا عذاب الیم ہے اور وہ دنیا کی ہر مصیبت سے بڑھ کر ہے۔

مسلم پرسنل لا میں جزوی ترمیمات

لیکن مسئلہ صرف اتنا نہیں ہے کہ دستور میں یکساں سول کوڈ کی دفعہ ہے اور حکومت اس کے تحت مسلم پرسنل لا کو بہ تدریج منسوخ کرنے کے اقدامات کر رہی ہے[1] اور تمام سیاسی پارٹیاں اس معاملے میں حکومت کے ساتھ ہیں۔ بات اس سے بھی آگے ہے اور وہ یہ ہے کہ خود مسلمانوں کے اندر سے بھی ایسی آوازیں اٹھتی رہتی ہیں کہ مسلم پرسنل لا پر نظر ثانی اور اس میں ترمیمات ہونی چاہییں۔ آئیے ان آوازوں کو سننے اور سمجھنے کی کوشش کریں

مسلمانوں میں ایک گروہ تو وہ ہے جو مغربی افکار و نظریات اور مغربی قوانین کا دلدادہ اور مغربی افکار و قوانین نے مغربی اقوام کی زندگیوں میں جو پیچیدگیاں پیدا کر دی ہیں اور ان میں جو تلخیاں گھول دی ہیں ان سے بے خبر ہے۔ یہ طبقہ مسلم پرسنل لا کی منسوخی چاہتا ہے مگر وہ منسوخی کی تجویز لانے کے بجائے اسلام کے احکام پر ایک ایک کر کے اعتراض کرتا ہے۔

ہم اس گروہ کے افراد سے بہت ادب سے عرض کرتے ہیں کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے حال پر کرم فرمائیں۔ اگر انہیں اسلامی اقدار و احکام پر یقین نہیں رہا ہے تو جن اقدار پر انہیں یقین ہے انہیں جرأت کے ساتھ علی الاعلان قبول کر لیں اور ملت اسلامیہ سے اپنا رشتہ منقطع کر لیں۔ ان کا مقام ملت کے اندر نہیں باہر ہے اور انہیں مسلمانوں کے مسائل میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو مسلمانوں کی پستی کردار سے پیدا شدہ نتائج کا ذمہ دار مسلم پرسنل کو سمجھتا ہے

[1] انگریزی حکومت کی طرح یکے بعد دیگرے مختلف ایکٹ پاس کر کے اس سلسلے کی تازہ کوشش تبنیت بل ہے جو اس وقت زیر غور ہے۔ یہ بل اگر پاس ہو گیا تو وراثت کا سارا شرعی نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اس بل کو پیش کرتے ہوئے مرکزی وزیر قانون نے خود صراحت کی ہے کہ یہ یکساں سول کوڈ کی طرف ایک قدم ہے۔ یہی بات اس سے پہلے بعض دوسرے ایکٹوں کے بارے میں بھی کہی گئی ہے

اور قوانین کی ترمیم و اضافے کے ذریعے اس صورت حال کی اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ یہ طبقہ ملت کا درد رکھتا ہے مگر ہم اس سے عرض کریں گے کہ بے کرداری سے پیدا شدہ الجھنوں کا مداوا قوانین سے نہیں ہو سکتا۔ بے کرداری میں مبتلا افراد قانون شکنی کے لیے اور راہیں نکال لیں گے اور آپ مزید قانون بنائیں گے۔ قانون سازی اور قانون شکنی کا یہ چکر چلتا رہے گا تا آنکہ زندگی انتہائی پر پیچ اور بوجھل ہو جائے گی اور پستیِ کردار اپنی انتہا کو پہنچ جائے گی۔ آپ ٹھنڈے دل سے غور کر کے دیکھیں کہ کس صورت حال کے پیدا کرنے کے ذمہ دار پرسنل لا سے متعلق قوانین ہیں اور کس کی ذمہ دار مسلمانوں کی پستیِ کردار ہے۔ پہلی چیز کا علاج قانون سے ضرور کیجیے لیکن دوسری چیز کے علاج کے لیے قانون کا سہارا لینے کے بجائے اللہ کی بندگی و اطاعت کا سہارا لیجیے اور ملت کی اصلاح کے لیے سرگرم عمل ہو جائیے۔

تیسرا گروہ وہ ہے کہ جو ایک غیر الٰہی نظام حکومت۔ غیر الٰہی نظام عدالت اور غیر الٰہی قوانین کے ہجوم کے درمیان مسلم پرسنل لا کے عمل درآمد سے پیدا شدہ پیچیدگیوں کا ذمہ دار مسلم پرسنل لا کے کچھ قوانین کو خیال کرتا ہے۔ حالانکہ یہ پیچیدگیاں اس عجیب و غریب صورت حال ہی کا نتیجہ ہیں اور اس کا اس کے سوا کوئی مداوا نہیں کہ آپ اسلامی نظام کے قائم کرنے کی جد و جہد میں لگ جائیں اور عبوری دور میں مسلم پرسنل لا کے تحفظ کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی جد و جہد کریں کہ مسلم پرسنل لا سے متعلق مقدمات کا فیصلہ دین کا علم رکھنے والے قاضیوں یا مسلمان ججوں کے ذریعے ہو۔

چوتھا گروہ وہ ہے جو ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرنے کے بعد یہ رائے رکھتا ہے کہ مسلم پرسنل لا کے بعض قوانین ایسے ہیں جو نظر ثانی کے مستحق ہیں اور بدلتے ہوئے حالات میں ان پر اصرار کرنے کے بجائے انہیں تبدیل کر دینا چاہیے۔ ہم نظر ثانی کے بالکلیہ مخالف نہیں ہیں بلکہ ضروری ترمیمات کے شدید حامی ہیں لیکن اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ دائرۂ کار اور طریق کار کے بارے میں گفتگو ہو جائے۔

ترمیمات کا دائرۂ کار اور طریق کار یہ بات نہایت وضاحت سے آ چکی ہے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے جو احکام صراحۃً ثابت ہیں ان

کے سلسلے میں ہم ترمیم کے مجاز نہیں ہیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا کام ان پر ایمان لانا ہے اور پوری وفاداری اور دل جمعی سے ان کا اتباع کرنا ہے۔

جو احکام اجماع امت سے ثابت ہیں اور پوری امت ان پر متفق رہی ہے ان میں بھی ہمیں ترمیم کرنے کا حق نہیں ہے۔

آیات و احادیث کی کوئی ایسی تعبیر کرنے کا بھی ہمیں حق نہیں ہے جو سلف کی متفقہ تعبیر سے ٹکراتی ہو۔

اس دائرہ کے اندر رہتے ہوئے ہم قیاس، اجتہاد، استحسان، عرف اور مصالح مرسلہ کے تحت آنے والے تمام قوانین پر نظر ثانی کرنے کے مجاز ہوں گے۔

مجھے شیعہ فرقے کی فقہ میں کوئی درک نہیں ہے اس لیے اسے مجبوراً چھوڑتے ہوئے سنی فقہ کے بارے میں کچھ ضمنی خطوط کار کی نشان دہی کرنا چاہتا ہوں۔

۱۔ ان قوانین کی فہرست مرتب کی جائے جو حل طلب ہیں اور جن سے واقعتہً پیچیدگیاں پیدا ہو رہی ہیں۔

۲۔ یہ دیکھا جائے کہ یہ قوانین کتاب و سنت میں منصوص تو نہیں ہیں۔ اگر منصوص ہوں تو انہیں فہرست سے خارج کر دیا جائے اور یہ سمجھ لیا جائے کہ ان پر صحیح طور سے عمل درآمد نہیں ہو رہا ہے یا معاشرے کی پستی اس کی ذمہ دار ہے۔ ہاں یہ غور کیا جا سکتا ہے کہ کیا یہ بات کتاب و سنت کے منشا کے خلاف تو نہ ہوگی کہ اس حکم کے اندر کچھ شرائط و قیود کا اضافہ کر دیا جائے۔

۳۔ اجتہادی مسائل میں بالعموم ائمہ اربعہ کے مسالک سے باہر جانے کی کوشش نہ کی جائے لیکن بہر حال یہ کوئی آخری حد نہیں ہے۔ ضرورت پڑنے پر ائمہ اربعہ کے متفقہ مسلک سے بھی ہٹ کر فیصلہ کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ سلف میں کوئی قابل ذکر قول اس کے حق میں موجود ہو۔ اس سلسلے میں امام ابن تیمیہؒ، امام ابن قیمؒ اور شاہ ولی اللہؒ جیسے چوٹی کے محققین کے افکار و خیالات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔ میرے ذہن میں اس ذیل کا ایک مسئلہ ہے اور وہ ایک مجلس میں تین طلاق دینے کا ہے [1]

[1] اس موضوع پر میں نے ایک مبسوط تحقیقی مقالہ لکھا ہے جو انشاء اللہ پھر کبھی شائع ہوگا۔

ہم مسلمان ملکوں میں اکثر و بیشتر فقہ حنفی مکمل قانون کی حیثیت سے رائج رہا ہے اور ہندوستان کے اہلِ سنت کی عظیم ترین اکثریت فقہِ حنفی پر اعتماد کرتی ہے۔ اس لیے فقہ حنفی سے خواہ مخواہ انحراف نہ کیا جائے۔ البتہ اس معاملے میں حضرت شاہ ولی اللہ کے مشورے پر عمل کیا جائے اور حنفی فقہار کے مختلف اقوال میں سے اس قول کو لیا جائے جو کتاب و سنت سے زیادہ قریب ہو اور جس سے مسلے کو حل کرنے میں زیادہ مدد ملتی ہو۔

یہ ایک واضح بات ہے کہ اس نازک ترین ذمہ داری سے وہی لوگ عہدہ برآ ہو سکتے ہیں جو کتاب و سنت، اجماع اور مسالک فقہار کا گہرا علم رکھتے ہوں۔ استنباطِ احکام کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوں۔ حالات کی نزاکتوں اور مسائل کی پیچیدگیوں سے باخبر ہوں۔ کم از کم اپنے ملک کے قانون اور عدالتوں نظام سے واقف ہوں اور کتاب و سنت کے پورے وفادار ہوں۔

اگر میں یہ کہوں تو اسے گستاخی پر نہیں میری کوتاہ نظری پر محمول کیا جائے کہ میری نظر میں ایسے جامع الصفات افراد اپنے ملک کی حد تک نہیں ہیں اس لیے بدرجۂ مجبوری ایک ایسی کمیٹی تشکیل دی جائے جو اہلِ سنت کے مختلف فرقوں اور جماعتوں کے نمائندہ چوٹی کے علمار اور دیندار ماہر قانون پر مشتمل ہو اور وہ باہمی مشورے سے ایک مسودہ ترتیب دے۔

یہ مسودہ بحث و مباحثے کے لیے اہلِ علم کے پاس بھیجا جائے اس پر کھل کر بحث ہو اور تمام اونکا و آرار کو سامنے رکھ کر یہ کمیٹی اس مسودے کو آخری شکل دے دے۔

اس کے بعد اسلامی نقطۂ نظر سے یہ مسودہ قانون کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور مسلمان اس کے مطابق اپنے شخصی معاملات طے کر سکتے ہیں مگر چونکہ ہمارے ملک میں ایک قانونی نظام موجود ہے اور عدالتوں کا سارا نظام اس کے تحت ہے اور شریعت ایکٹ کے تحت مسلم پرسنل لا بھی اس قانونی نظام کا ایک جز ہے اور جب تک اس مسودے کو پارلیمنٹ سے منظور نہ کرایا جائے شریعت ایکٹ ہی نافذ رہے گا اس لیے مجبوراً پارلیمنٹ کی طرف رجوع کرنا پڑے گا اور کوشش کرنا ہوگی کہ یہ مسودہ بعینہ پاس ہو جائے اور اگر اس میں کوئی ترمیم ہو تو علمار اور مسلمان ماہرین قانون کی مذکورہ بالا کمیٹی کی منظوری کے بعد ہو لیکن اس کی کیا شکل ہوگی اور اس کی کہاں تک توقع ہے۔ اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔ البتہ میرا ایمان ہے کہ اگر ہم اخلاص و للہیت کے ساتھ اللہ کی بندگی اور اس کے قانون کی پیروی میں لگ جائیں اور دین پر چلنے اور اسے پھیلانے اور غالب کرنے کے لیے متحد و متفق ہو جائیں تو اللہ کی نصرت و رحمت سے ہماری ساری مشکلات دور ہو سکتی ہیں۔

اسلامی شریعت اور مستشرقین و متجدّدین

پروفیسر عبدالمغنی صاحب

"ملّتِ اسلامیہ اور اس کی فکر کے عملی میلان کی امتیازی خصوصیت کا اظہار یہ ہے کہ اس کی اولین سرگرمی اور سب سے بالبدیہ نمود " الاہیات " کے بجائے " قانون " کی شکل میں ہے ....

درحقیقت مسلم علماء کی نگاہ میں قانون کوئی علاحدہ اور تجربی مطالعہ نہیں تھا۔ یہ اس دینی و معاشرتی اصول کا عملی پہلو تھا جس کی تبلیغ محمد (صلعم) نے کی تھی۔ دورِ اوّل کے مسلمانوں کے لئے " دینی " اور " قانونی " کے درمیان بہت ہی کم یا کوئی فرق نہیں تھا۔ قرآن میں یہ دونوں پہلو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ بلکہ ایک دوسرے میں پیوستہ ہیں، اور ایسا ہی حدیث میں ہے۔ قرآن کا مطالعہ و تفسیر کبھی اِس اور کبھی اُس پہلو پر مشتمل ہوتا تھا، اور ایک صدی گذر جانے پر ایسا ہوا کہ علماء نے کسی ایک پہلو پر اختصاص شروع کیا ....

قانون اور مذہب کے درمیان جو ارتباط حضرت محمدؐ نے قائم اور ان کے پیرووں نے اختیار کیا بعد کی تمام ہی صدیوں میں جاری رہا۔ اسی خصوصیت کے باعث اسلامی قانون کی تمام تشریحات " فرائضِ دینی " یا " اعمالِ عبادت "، مثلاً وضو و غسل، نماز اور حج، سے شروع ہوتی ہیں۔

(" محمڈن ازم " از ایچ، اے، آر، گب :
باب " شریعت ". صفحہ ۷۳-۷۰ ، اشاعت ۱۹۵۵ء)

مشہور مستشرق گب کے اس اقتباس سے اسلامی ضابطۂ معاشرت (پرسنل لا) کے متعلق

سب سے اہم اور بنیادی نکتے کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اسلام کا تجویز کردہ شخصی و عائلی قانون جو آج دنیا میں مروج ہے وہ، بہت سارے مستشرقین اور متجددین کے بے سروپا الزام کے بالکل برخلاف محض فقیہوں اور مفتیوں کا مرتب کیا ہوا نہیں ہے، بلکہ اس کی بنیاد براہ راست اللہ کا کلام (قرآن) اور رسولؐ کی سنت (حدیث) ہے اور خود حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ضابطۂ معاشرت کو اپنی "شریعت" کے طور پر پیش کیا، یہاں تک کہ اسلام کے دور اولین میں قانون اور مذہب کے درمیان سرے سے کوئی فرق نہیں تھا۔ گب نے بہت صحیح کہا ہے کہ قرآن و حدیث میں دین و قانون ایک دوسرے سے بالکل ہم آمیز ہیں اور اسی لئے مفسروں نے قرآنی آیات کی تشریح میں دونوں ہی قسم کے احکام بیان کئے ہیں، یہاں تک کہ اسلامی فقہ کی کتابیں بھی، جو اسلامی قوانین سے بحث کرتی ہیں، دینی فرائض و عبادات کو سب سے پہلے درج کرتی ہیں، ہر شخص جانتا ہے کہ باب الطہارت، باب الصلوٰۃ اور باب الحج کو فقہی کتابوں میں اولیت حاصل ہے اور ان کے بعد ہی نکاح و طلاق اور وراثت وغیرہ کے ابواب درج کئے جاتے ہیں، لیکن یہ دونوں قسم کے ابواب ایک ہی کتاب میں اس طرح جمع کئے جاتے ہیں کہ عبادات اور معاملات ایک ہی شریعت کے باہم دگر پیوستہ اجزائے ترکیبی کی حیثیت سے نمودار ہوتے ہیں اور دونوں کی اصل و اساس قرآن و حدیث ہی کی ہدایات ہوتی ہیں۔ لہٰذا مسلم پرسنل لا پر حملہ کرنے کے لئے مستشرقین اور متجددوں کا یہ موقف کہ اسلامی قانون اصولی ہدایات کے کسی بھی گوشے میں شارعِ اسلام اور ان پر وحی کی ہوئی کتاب دستور کے احکام سے مختلف کوئی چیز ہے، یکسر جہالت اور شرارت پر مبنی ہے۔ اور اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ ملک کے قانون ساز ادارے مسلم پرسنل لا میں من مانی تبدیلیاں کر سکیں۔

گب نے اپنی مذکورہ کتاب کے محوّلہ باب میں اسلامی قانون کی اصلیت و حقیقت پر مزید بحث کرتے ہوئے بہت ہی فکر انگیز اور آج کے حالات میں نہایت اہم اور بصیرت افروز نکتے پیش کئے ہیں جو بالخصوص عطائی قسم کے متجددین کے لئے سخت عبرت خیز ہیں:

"اس طرح اسلام میں قانون کا تصور انتہائی حد تک حاکمانہ ہے سنٹیلانا نے "ڈورٹیو" میں ٹھیک کہا ہے: "قانون، جو ملتِ اسلامیہ کا دستور ہے، صرف

اُس منشائے الٰہی کا نام ہے جو پیغمبرِ اسلام ؐ کے وسیلے سے ظہور پذیر ہوا۔"......... نتیجۃً اس قانون کی خلاف ورزی یا اس سے غفلت محض نظامِ معاشرت کے ایک قاعدے کو توڑنا نہیں ہے، بلکہ یہ مذہب کی عدمِ اطاعت کا ایک عمل، ایک گناہ ہے اور ایک مذہبی جرمانے کا مستوجب ہے۔" (ص ۳۳)

اس پیراگراف سے متصل ہی دوسرے پیراگراف میں، مذکورہ صفحے پر گب رقم طراز ہے:

"اب ہم اختصار کے ساتھ اس خدائی قانون سازی کی ترکیب و کردار کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ مسلم ماہرینِ قانون نے یہ اصول پیش کیا ہے کہ "قانون کا بنیادی قاعدہ آزادی ہے۔" لیکن چوں کہ انسانی فطرت کمزور ہے، اس کو آسانی سے گم راہ کیا جا سکتا ہے، اور یہ ذرا ناشکری اور حریص بھی ہے، لہٰذا فرد اور سماجی نظام دونوں کے مفادات کے لئے ضروری ہے کہ انسان کی آزادیٔ عمل پر کچھ حدیں لگا دی جائیں یہی حدود قانون کی تشکیل کرتی ہیں۔ اور اسی لئے مسلم ماہرینِ قانون [فقہائے اسلام] "حکمِ قانونی" کے معنے میں "حد" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔"

اسلامی قانون کی اس نوعیت کی تشریح کرتے ہوئے گب اسی صفحے پر فوراً ہی بعد لکھتا ہے:

"یہ حدود، جو اللہ کی حکمت و رحمت کی تجویز کردہ ہیں، دو قسموں کی ہیں، انسانی فطرت کی روحانی و جسمانی ثنویت کے مطابق۔ جس طرح نظامِ انسانی میں روح اور جسم ایک دوسرے کا تکملہ ہیں، اسی طرح نظامِ معاشرت میں قانون کے دونوں پہلو ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ انسان کی روحانی زندگی کے لئے مقرر کردہ حدود' اللہ کے ساتھ اس کے رشتے کی تعین کرتی ہیں، یعنی مذہبی عقیدے کے اصول تجویز کرتی ہیں، خاص کر ان اعمال کو جن سے ان اصولوں کا خارجی اظہار ہوتا ہے، مثلاً ارکانِ خمسہ۔" اسی طرح انسان کی جسمانی سرگرمیوں پر جو حدود لگائی گئی ہیں وہ ہم جنس انسانوں کے ساتھ اس کے رشتوں کی تعین کرتی ہیں۔ محدود مفہوم میں، یہی حدود قانون کا مواد و موضوع ہیں، مثلاً شخصی حیثیت، خاندانی تنظیم بہ شمول

نکاح و طلاق، جائداد کی ملکیت اور خرید و فروخت، تجارتی سرگرمیاں اور ضابطہ فوجداری، گرچہ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی کتب قانون میں دیوانی، فوجداری شخصی وغیرہ اقسام قانون کی مغربی تفریقات کو تسلیم نہیں کیا جاتا ہے۔"

اس تفصیل سے اسلامی قانون کے بارے میں مصنف نے یہ نتیجہ نکالا ہے:

"اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی تصور میں قانون کبھی فرض سے علاحدہ نہیں ہوا..... چناں چہ اس کی معیاری تعریف یوں کی گئی: "علم قانون حقوق و فرائض کا وہ علم ہے جس کے ذریعے آدمی اس دنیا میں اپنی زندگی مناسب طور پر گذار سکتا ہے اور اپنے آپ کو مستقبل کی زندگی [آخرت] کے لئے تیار کر سکتا ہے۔" اس طرح شریعتِ اسلامی کی تعبیر کسی رسمی ضابطے کے اندر کبھی نہیں ہوئی، بلکہ یہ، جیساکہ درست کہا گیا ہے، ہمیشہ "مسلمانوں کے فرائض کی ایک بحث" ہی رہی۔ یہ خصوصیت ان امور پر فیصلے کی نوعیت متعین کرتی ہے۔ جس سے شریعت بحث کرتی ہے، یہ فیصلہ شرعی خدائی قانون سازی کے اس بنیادی تصور تک جا پہونچتا ہے جو نیک و بد کے مطلق معیار کی تعیین کرتا ہے۔" (ص۸۰ و ص۸۱)

گب نے اسلامی حکومت کے اندر سلطنت اور شریعت کے درمیان تسلیم شدہ حدِ فاصل کی نشان دہی بھی کی ہے:

"چوں کہ دینی قانون کی تشکیل دنیوی اقتدار سے بالکل آزاد تھی، لہذا اس قانونِ شرعی کے احکام اور فیصلوں میں خلفاء و سلاطین کی مداخلت کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھ سکتا تھا۔ دنیوی حکام اس نوعیتِ قانون کو تسلیم کرنے اور اپنی سلطنت کے تمام حصوں میں قضاۃ کا تقرر کر کے اس کی تعمیل کا انتظام کرنے پر مجبور تھے۔" (ص۸۳)

اس کے بعد بعض معاملات میں مفتیوں کے ذریعے سلاطین کی قانونی مداخلتوں کا تذکرہ کرنے کے بعد گب نے شریعتِ اسلامی کی سالمیت، استقلال اور طاقت و استحکام کو ان لفظوں میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

"..... شریعت ہمیشہ ایک مثالی اور آخری عدالتِ مرافعہ کے طور پر نافذ رہی اور

اپنی وسعت و جامعیت کی بدولت اسلامی تہذیب کی خاص اور اصل قوت جامعہ بنی رہی۔ انحرافات اور مقامی نظاموں میں منتشر ہو جانے پر روک لگا کر، اس کے بے لچک ہونے ہی نے یہ نتیجہ پیدا کیا۔ شریعت اجتماعی زندگی اور اسلامی ادبیات کے ہر گوشے اور شعبے میں سرایت کر گئی۔ زیر بحث مضمون کے جدید علماء میں ایک نہایت بصیرت مند شخص، برگسٹراسر کے الفاظ میں، بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ شریعت "اسلام کی صحیح روح کا خلاصہ، اسلامی فکر کا سب سے فیصلہ کن اظہار اور اسلام کا مغز اصلی ہے۔" (ص۲۱۴)

ایک مستشرق کی حیثیت سے شریعت اسلامی کے تجویز کردہ معاشرتی ضابطے کے متعلق گب نے جو کچھ لکھا ہے وہ اس کے مستشرق ہونے کی بدولت نہیں ہے بلکہ مستشرق ہونے کے باوجود ہے، ورنہ عام طور پر سنجیدہ سے سنجیدہ مستشرق اسلام کے بارے میں صاف ذہن اور وسیع نظر سے محروم ہے بالعموم مستشرقوں نے اپنے زعم میں اسلام کا مطالعہ آثار قدیمہ کی ایک نادر چیز کی حیثیت سے کیا ہے۔ مگر جو ان کے اس انداز نظر میں اسلامی معاشرت کی مسلسل زندگی حائل ہوتی رہی ہے۔ چناں چہ انھوں نے ایک طرف تو شریعت کی جان داری پر حیرت کا اظہار کیا ہے اور دوسری طرف ناصح مشفق بن کر مسلمانوں کو مستقبل کے اندیشوں سے ڈرایا ہے اور انہیں مشورہ دیا ہے کہ اگر انھوں نے بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ شریعت کی اصلاح جدید تصورات کے مطابق کر لی تو اسلامی معاشرہ کے تحفظ کا سامان ہو سکتا ہے۔ اس نقطے پر مستشرقوں کی ملاقات متجددوں سے ہو جاتی ہے اور دونوں کے مقاصد اسلام کے معاشرتی نظام کے بارے میں یکساں ہو جاتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ متجددین مستشرقوں ہی کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ مغربی و مسیحی یورپ کے ممالک نے مشینی ترقیات اور سیاسی فتوحات کے بل پر پوری دنیا میں غلبہ حاصل کر لیا تو علوم و فنون اور ادبیات و اجتماعیات کے تمام دائروں میں ان کی مخصوص تہذیب کے اثرات سرایت کر گئے اور ان نوآبادیاتی ممالک نے، پوری سامراجی شان کے ساتھ، اس بات کا اہتمام بھی کیا کہ ان کے تحت چلنے والی دانش گاہوں اور تحقیقاتی اداروں سے ان ہی کی تہذیب کے فرزند ڈھل کر نکلیں، خواہ اصلاً وہ کسی بھی ملت اور معاشرے کے چشم و چراغ ہوں۔ میکاؤلے کے ضابطۂ تعلیم و تربیت سے فیض یاب

ہونے والی یہی وہ نسل ہے جو اپنے مستشرق استادوں کا مشن متجددین کر پورا کر رہی ہے اور حق شاگردی ادا کرنے میں اس نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام طور پر مستشرقوں کا رویہ اپنے ان روحانی وارثوں کے متعلق بہت ہی سرپرستانہ اور بہی خواہانہ ہے۔ مستشرقوں اور متجددوں کے درمیان ایک بات اور یہ ہے کہ متجدد بالعموم صاحبِ ایمان و اسلام ہیں، اس لئے وہ تجدد کی جتنی بھی باتیں کرتے ہیں وہ ان کی عام اصلاحی کوششوں کا صرف ایک حصّہ ہیں، جبکہ یہ ساری کوششیں اصلاً دورِ حاضر میں اسلامی ضابطۂ حیات کا جواز مہیا کرنے کے لئے اور اس کے دفاع میں کی جاتی ہیں، لیکن مستشرق کو اسلام کی حقانیت کا کوئی یقین نہیں آتا بلکہ اس کی نگاہ بالعموم نکتہ چیں کی ہوتی ہے، چناں چہ یہ مستشرقین متجددوں کے ان ہی پہلوؤں کو ابھارنے کی کوشش کرتے ہیں جو ان کے نزدیک مسیحی اور مغربی فکر سے قریب تر اور مشرقی و اسلامی فکر سے بعید تر ہوتے ہیں، اس طرح درحقیقت یہ لوگ خود مشرقیات کا عالم بن کر اپنے مشرقی شاگردوں کو مغربیات کا تقلیدی طالب علم بنانا چاہتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ بات اپنی جگہ بالکل واضح ہے کہ مستغرب متجددین اسلام کے تجویز کردہ اجتماعی ضابطوں کی تجدید و تجدد کے سارے نقشے مغربی تہذیب و تعلیم کے معیار پر ہی اور اسی کے ذہنی حوالے سے مرتب کرتے ہیں۔

شریعتِ اسلامی کے سلسلے میں مغربی مستشرقوں کا یہی وہ عمومی موقف ہے جہاں سے انھوں نے ہندوستان کے دو متجددوں کو اپنے تمام مطالعات میں لاڈلا بنا لیا ہے سرسید احمد خاں اور جسٹس امیر علی کو ہر مستشرق نے اسلام کی جدید تاریخ پر اپنے تبصروں میں نمایاں ترین جگہ دی ہے۔ آلفریڈ گیلوم نے "اسلام" میں لکھا ہے:

> "سرسید احمد خاں نے جس اسکول کی بنیاد ڈالی وہ نہایت بااثر ثابت ہوا۔ اس کا ایک اثر یہ تھا کہ اس نے مخلص مسلمانوں کو مجبور کر دیا کہ وہ تعدادِ ازواج، طلاق اور غلامی جیسی سماجی برائیوں پر سنجیدگی کے ساتھ غور کریں اور اپنے روایتی طریقِ زندگی اور اس کے بانی علما کے متعلق ایک تنقیدی رویہ اختیار کریں۔"

(باب "آج کا اسلام"، ص ۱۵۹)

"سرسید کے بعد سید امیر علی سامنے آئے، جو ایک شیعہ ہیں، اور ان کی کتاب

"دی اسپرٹ آف اسلام" [روحِ اسلام] بہتیرے مسلم ممالک میں ایک سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے، جس کا مطالبہ یہ ہے کہ قرآن ان علما کی عائد کردہ تفسیروں کے بغیر پڑھا جانا چاہیئے جو اپنے پیش رَووں کی غیر مجاز تعلیمات کی پابندی کرتے ہیں۔ چناں چہ امیر علی نے قرآن کی سند پر تعدد ازدواج کی مذمت کی ہے۔ قرآن نے گرچہ چار بیویوں کی تحدید کی ہے، مگر اس نے یہ حکم بھی دیا ہے کہ اگر کوئی مرد ان سب کے ساتھ مساوات و انصاف نہیں کر سکتا تو اس کو ایک سے زیادہ شادی ہرگز نہیں کرنی چاہئیے۔ امیر علی نے لکھا ہے: "چونکہ مکمل عدل احساس کے معاملات میں ناممکن ہے، لہذا قرآن کی تجویز درحقیقت امتناع کے مترادف ہے" (اگر اس کتاب کا مقصد مناظرہ ہوتا تو ایک شخص یہ پوچھنا چاہتا کہ اگر واقعی یہ صورت ناممکن ہے تو قرآن نے اس کی قانونی تجویز ہی کیوں کی؟)"

(ایضاً)

گب نے بھی "محمڈن ازم" میں مذکورہ دونوں متجددوں کا ذکر اپنے مخصوص مبصرانہ انداز میں کیا ہے:

"نئی، وسیع النظر الاہیات جو سر سید کے اسلام کے متعلق عقلیت پسند طرزِ فکر سے بروئے کار آئی وہ اپنے ہمراہ ملتِ اسلامیہ کی روایتی معاشرتی اخلاقیات کی قدر و قیمت کا ایک نیا اندازہ لائی۔ غالباً یہی چیز مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے اس ذہین طبقے کے لئے زبردست کشش کا باعث ہوئی جو ان سماجی برائیوں کو شدت کے ساتھ سمجھ رہے تھے جن کا تعلق غلامی، غیر منضبط تعددِ ازدواج و طلاق جیسے اعمال سے ہے۔ اس معاملے میں فی الواقع سر سید اسکول کا اثر ہندوستانی اسلام کی سرحدوں سے بہت آگے بڑھ چکا ہے، اس لئے کہ مسلمانوں کے عمل اور ان کے معاشرتی اصول کو کچھ معذرت خواہانہ گرچہ معناً مصلحانہ انداز سے بھی پیش کیا جانے لگا ہے۔"

(اسلام دنیائے جدید میں: ص ۱۳۹)

"جن ہندوستانی اہلِ قلم نے نئی، وسیع النظر الاہیات و اخلاقیات کو مقبول بنایا ان

میں سر فہرست ایک شیعی ماہر قانون سید امیر علی ہیں۔ ان کی تصنیف مطبوعہ ۱۸۹۱ء نے مغربی دنیا کے مقابلے میں درکار مدلل خودشناسی کے ساتھ مسلمانوں کی سیاسی بیداری کا سامان کیا۔ یہ ان کے ہم عصروں کی ذہنی کیفیت کے اتنی موافق بات ہوئی کہ کم ہی تعلیم یافتہ مسلمان اس حقیقت کو سمجھ سکے کہ امیر علی مغربی فکر کے مطابق اسلامی ضابطے کی ایک نئی تشکیل کر رہے تھے۔ ٹھیک جس طرح ان کے "نیچری" پیش رووں نے کیا تھا۔" (ایضاً)

جدید اسلامی تاریخ میں، 'رواداری' کے رجحان کا ذکر کرتے ہوئے "اسلام اِن موڈرن ہسٹری" [اسلام تاریخ جدید میں] کے مصنف ولفرڈ کینٹول اسمتھ نے امیر علی کو ان مسلم وسیع النظروں کا سرخیل قرار دیا ہے جنھوں نے "علمائے مغرب کی تشکیل دی ہوئی صورت کو اپنا لیا"۔ اس قسم کی وسیع النظری کو خود اسمتھ نے "مسلم معاشرے سے باہر کی رواداری" بتایا ہے۔ بہر حال، امیر علی اور ان کے طبقۂ فکر کے بارے میں اسمتھ رقم طراز ہے:

"اول الذکر یعنی متحرک شرکاءِ مہم نے اپنی تحریک کا ذہنی اظہار ایک وسیع النظر اسلام کی صورت میں کیا۔ اس سلسلے میں بہترین مثال امیر علی کی ہے، جن کی یادگار زمانہ تصنیف "اسپرٹ اوف اسلام" غالباً اس پورے رجحان کی سب سے عظیم منفرد تخلیق ہے۔"
(باب 'اسلام حالیہ تاریخ میں'، ص ۶۸-۶۹)

میں نے متجددین اسلام میں سر سید احمد خاں اور سید امیر علی کا تذکرہ اس طبقے کا بہترین نمونہ دکھانے کے لئے کیا ہے۔ اس کے علاوہ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت برصغیر ہند و پاک میں اسلام کی تجدید یا تجدد کا علم اٹھانے والے جتنے بھی مغرب زدہ متجددین ہیں ان سب کی ذہنیت اور جدوجہد کا سررشتہ بالآخر انیسویں صدی کے ان ہی دونوں تجدد نوازوں تک جا پہونچتا ہے۔ بہر حال، ان دونوں قائدین تجدد کا خلوص اپنی جگہ جیسا کچھ بھی ہو، مگر یہ لوگ عقلیت کے تمام دعووں کے باوجود نہایت بے عقل اور کم علم تھے۔ سید احمد کی نیچریت تو انیسویں صدی کے مغربی فلسفے کا ایک بالکل خام چربہ تھا، موصوف نے محض سنی سنائی پر، حالات زمانہ اور ترقیات مغرب سے مرعوب ہو کر روشن خیالی کا ایک ہوائی محل تعمیر کر لیا تھا، نہ تو ان کا اسلامیات کا مطالعہ مکمل و منضبط تھا اور نہ

تو مغرب پرستی کی کوئی بات نہیں، انگریزی نہ عربی، آپ دونوں زبانوں کے ماہر تھے اور نہ انگریزی سے واقف
تھے۔ امیر علی کی انگریزی کتابیں ان کی مہارت پر اور مغربی فلسفے سے ان کی واقفیت جتنی بھی ہو،
مگر عربی اور علوم اسلامی پر ان کی دسترس بہت ہی معمولی اور محدود تھی، سب سے بڑھ کر یہ کہ
اسلامی اقدار و روایات کا شعور جیسا بھی امیر علی کو سرسید کے اتنا بھی نہیں تھا، بلکہ بصورت سرسید
کے برخلاف انگریزی ادبیات ہی پر پلے تھے۔ اور ذہنی طور پر مغرب کے مقابلے میں بالکل شکست
خوردہ اور سپر انداز تھے۔ دونوں ہی کی نگاہ انیسویں صدی کے نابالغ، مادہ پرستانہ سائنس
کے طلسم میں اسیر تھی۔

امیر علی تو اس درجہ گم کردہ راہ اور مادیت زدہ تھے کہ قرآن حکیم کو وحی الٰہی کے بجائے رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصنیف سمجھنے لگے تھے، جب کہ آپ کی منطق کے بودے پن کا عالم یہ تھا کہ خود
ان کے مداح گیلانی نے بھی لکھا ہے کہ اگر قرآن کا منشا امیر علی کے بقول تعددِ ازدواج کو مشروط
کر کے عملاً ممنوع کرنا تھا تو پھر یہ تعلیق بالمحال اور قانون سازی برائے ناممکن کا بے معنی تکلف
قرآن نے کیا ہی کیوں؟ حقیقت تو یہ ہے کہ امیر علی نے یا تو قرآن پڑھا ہی نہیں یا پڑھ کر
سمجھا نہیں یا سمجھ بوجھ کر بڑی بددیانتی کے ساتھ قرآن کے معانی میں تحریف کرنی چاہی، ورنہ کیا
امیر علی کی نظر عدل و مساوات سے متصل ہی ان آیاتِ قرآنی پر نہیں کی گئی جن میں صراحت کر دی گئی
ہے کہ اگر بہ تقاضائے بشری دو یا دو سے زیادہ بیویوں کے درمیان عدل و مساوات ممکن نہ ہو تو
کم از کم اس کا ضرور لحاظ کرنا چاہیے کہ کسی ایک ہی کی طرف پوری طرح ڈھل کر باقی کو معلق نہ چھوڑ دیا
جائے بلکہ حتی الوسع سبھوں کے حقوق ادا کیے جائیں؟ اس طرح قرآن نے تو عدلِ کامل کے ساتھ
تعدد کو مشروط و محدود نہیں کیا ہے بلکہ صرف یہ جتایا ہے کہ حقوق سب کے حتی المقدور یکساں
طور پر ادا کیے جائیں۔ لہٰذا مستشرق نے مجتہد کی منطق پر قرآنی حکم کے بارے میں تعلیق بالمحال اور
رخصت برائے ناممکن کے جس اندیشے کا اظہار کیا ہے وہ سرے سے بے بنیاد ہے۔ قرآن نے
کسی ناممکن الوقوع مفروضے پر تعدد کے حکم کی بنیاد رکھی ہی نہیں ہے، اس کے پیش نظر تو انسان کی
حقیقی ضروریات اور فطرتِ انسانی کی ممکنہ رعایت ہے۔[1]

---

1. امیر علی نے سورۂ نساء کی جس آیت کا حوالہ دیا ہے وہ نمبر ۳ ہے، جب کہ اسی سورہ کی آیت نمبر ۱۲۹ میں شریعت کے

اس ایک مثال سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ تجدد اپنی اہلیت اور صلاحیت [illegible]
دونوں مطلوبہ اوصاف کے لحاظ سے کار تجدید اور عمل اصلاح کی قابلیت نہیں رکھتے۔ [illegible] ادکاری
صرف تجدد کا شوق رکھتے ہیں اور بالکل اناڑیوں کی طرح محض قیاس کے گھوڑے دوڑاتے ہیں۔ یہ
نہ محقق ہیں، نہ دانشمند۔ جس مہم پر یہ لوگ رواں دواں ہیں اس کو سرانجام کرنے کے لئے کوئی مہارت
اور اختصاصی علم انہیں حاصل نہیں۔ فی الواقع یہ اپنا کام جانتے ہی نہیں، ان کو فرض شناس کہا
ہی نہیں جاسکتا، یہ بالکل عطائی اور مقلدِ محض ہیں، جس اجتہاد کی یہ تمنا کرتے ہیں اس کی استعداد
انہیں میسر ہی نہیں آئی، ان کا مغرب و مشرق، سائنس اور مذہب، دونوں کا علم محض سطحی قسم
کا ہے، جس میں نہ انفرادیت ہے نہ جدت، ان کا سارا ذہنی سرمایہ بس خواہشات ہیں۔ یہی وجہ ہے
کہ ان کی پیٹھ ٹھونکنے اور ان کی کارکردگی کو اچھالنے کے باوجود مستشرقین بھی ان کو مجتہد نہیں تسلیم
کرتے، بلکہ اسلام اور دور جدید کے درمیان تطبیق کی ان کی ساری کوششوں کو معذرت خواہی
(apology) اور دفاعی (defensive) قرار دیتے ہیں۔

نئی بجلی کہاں ان بادلوں کے جیب و دامن میں
پرانی بجلیوں سے بھی ہے جن کی آستیں خالی (اقبالؒ)

متجددین جب عقلیت پسندی میں مستشرقین کی متعین کردہ حدود سے، مستشرقین سے بھی کہیں
آگے بڑھتے اور اسلام کو مغربی مقبولیت کے معیار پر لانے کی کوشش کرتے ہیں تو عجیب و غریب
صورت حال پیدا ہوتی ہے۔ لیکن بعض وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر کوئی متجدد مستشرقین کے بنائے
ہوئے معیار پر پورا نہیں اترتا اور اسلام کے دفاع پر اصرار کرتا ہے تو ایک دلچسپ نقشہ سامنے
آتا ہے۔ ان دونوں حالتوں میں ایک طرف تو متجدد اسلام کے معیار کو چھوڑ کر مغربی معیار کے چکر
میں خواہ مخواہ اپنا بھرم کھوتا ہے، اور دوسری طرف مستشرق متجدد کے بھی درپے ہو جاتا ہے اور
متجدد کے اصل موقف کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے اور پھر اس پر طنز و استہزا کے تیر چلانے سے بھی

مطلوبہ عدل کی وضاحت کر دی گئی ہے: "اور تم خواہ کتنا ہی چاہو عورتوں میں ہرگز برابری نہ کر سکو گے تو ایسا
بھی نہ کرنا کہ ایک ہی طرف ڈھل جاؤ اور دوسری کو ایسی حالت میں چھوڑ دو کہ گویا [illegible]

بلاشبہ یہ بات ہے کہ بعض مستشرقین نے تو بعض اکابرِ مفکرینِ اسلام کو زبردستی متجددوں کی صف
میں لاکھڑا کیا ہے اور اس غلط جگہ کھڑا کر ان پر نشانۂ ستم لگایا ہے۔ اس سلسلے میں غالباً مستشرقوں کا
مقصد اقبال اور مسلم [illegible] مصلحین اسلام کو جنہوں نے مغرب کا طلسمِ افکار توڑ کر رکھ دیا ہے،
غلط [illegible] میں [illegible] اور انتقاداً ہدفِ تنقید بنانا ہے، تاکہ ان عظیم اسلامی مفکروں کی حیثیت
مغرب اور مشرق دونوں جگہ مجروح ہو جائے اور مغربی فکر پر ان کے موثر حملوں کا زور کچھ ٹوٹ جائے
مستشرقینِ یورپ کے اس مہم کی نمایاں ترین مثال اقبالؒ کے متعلق ان کا رویہ ہے۔ یہ لوگ ایک
تو اقبال کے کلام سے بڑی حد تک نابلد ہیں، دوسرے "تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" کے بہت
ہی غلط مطالب نکالتے رہتے ہیں، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اقبال کی تحریر کو صحیح اور مکمل طور پر
سمجھنے کے لئے ان کی شاعری اور فلسفے کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر پڑھنا ہوگا اور دونوں کا
تاریخی وار تعلق و ترتیب سے منظم مطالعہ کرنا ہوگا۔ گیلوم نے "اسلام" میں اقبال کے فلسفے کی اپنی
سی ترجمانی کرنے کے بعد عورتوں کے حقوق، ان کی حیثیت اور وراثت میں ان کے حصے کا ذکر
کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اقبال کا بیان:

"[یہ قاعدہ] عورتوں پر مردوں کی برتری کا مفروضہ نہیں قائم کرتا،
اس لئے کہ ایسا مفروضہ روحِ اسلام کے منافی ہوگا۔"

"اس عورت کی مشکل ہی سے تسلی کر سکتا ہے جس نے باپ کی جائیداد سے اپنے بھائی کے مقابلے
میں آدھا حصہ پایا ہے۔" (آج کا اسلام: ص ۱۶۳)

اسی تسلسل میں گیلوم تبصرہ کرتا ہے:

"لیکن یہاں اقبال نے قرآن کے اس تحسین بیان کو نظر انداز کر دیا ہے کہ "مرد
عورتوں سے ایک درجہ اوپر ہیں"۔ اقبال نے ایک مختصر نظم میں کہا ہے:

میں بھی مظلومیِ نسواں سے ہوں غمناک بہت
نہیں ممکن مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود

یہ ایک ایسے شخص کی بات ہے جو موروثی رسوم و اقدار کی عظیم قوت کا مقابلہ نہیں
کر سکتا۔" (ایضاً)

مستشرق نے اقبال کے جس شعر کا حوالہ دیا ہے وہ ضرب کلیم کی ایک نظم "عورت" سے ماخوذ ہے، جب کہ اسی نظم کے دوسرے اشعار دراصل زندگی اور سماج میں عورت کے اس امتیازی مقام اور کارنامے کی نشان دہی کرتے ہیں جو اسلام کو مطلوب ہے، یعنی عورت کا عورت کی حیثیت سے اپنی فطری حدود میں رہنا اور کام کرنا۔ اس طرح محولہ بالا شعر کا مطلب بھی مسلم سماج میں عورت کی حیثیت پر ماتم کرنا نہیں، بلکہ حیات انسانی کی ایک ناگزیر حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ اس موضوع پر اقبال کے خیالات کا مطالعہ کرنے کے لئے کم از کم "ضرب کلیم" ہی کے اس پورے باب "عورت" پر ایک نظر ڈال لینی چاہیئے جس کا صرف ایک شعر ہمارے مستشرق کو اپنے کام کا نظر آیا۔ اس سلسلے میں ایک نظم تو "آزادیِ نسواں" ہی کے عنوان سے بہت معنی خیز اور بصیرت افروز ہے۔

اسی طرح اقبال کے بیان اور قرآن کی آیت کو ایک دوسرے کے متوازی اور متبائن ثابت کرنے کی جو کوشش جناب مستشرق نے فرمائی ہے وہ استشراق کی ایک مشہور و معروف حکمت عملی ہے، یعنی بیانات کو ان کے سیاق و سباق سے نکال کر ان کے من مانے معانی بیان کرنا۔ قرآن کی آیت اپنی جگہ محکم اور واضح ہے اور واقعتہً اسلام کا یہی نقطۂ نظر ہے کہ مرد و عورت کے درمیان رشتے کی ترتیب یہ ہے کہ مرد عورت کے مقابلے میں "قوّام" ہے اور اس کو اس لحاظ سے عورت پر فضیلت حاصل ہے، اس کے باوجود کہ مرد و عورت انسانی و اخلاقی سطح پر اسلام کے نزدیک ایک دوسرے کے مساوی اور ایک دوسرے کا تکملہ ہیں، قرآن کے الفاظ میں: "جس طرح عورتوں پر مردوں کے حقوق ہیں ٹھیک اسی طرح عورتوں کے مردوں پر حقوق ہیں"، اور: "عورتیں تمہارے لئے لباس ہیں اور تم عورتوں کے لئے لباس ہو۔" ایسی صورت میں اقبال کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ مرد کو عورت پر کوئی ذاتی تفوق [محولہ بیان میں انگریزی لفظ Superiority ہے] حاصل نہیں۔ اقبال کا موقف بس یہ ہے۔

نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد

("عورت کی حفاظت": ضرب کلیم)

یہ تقریباً ترجمہ ہے اس آیتِ قرآنی کا:

اَلرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ

یہاں نے امیر علی اور اقبال دونوں کے سلسلے میں عورتوں کے متعلق مستشرقوں کے رویے کا تذکرہ قدرے تفصیل کے ساتھ اس لئے کیا ہے کہ اسلام کے ضابطہ معاشرت (مسلم پرسنل لا) جس کا ایک اہم حصہ ہے، پر مستشرقوں کے اعتراضات کا بہت بڑا حصہ شریعت میں عورتوں کی حیثیت اور حقوق ہی سے متعلق ہے۔ بالخصوص تعدد ازدواج جس پر تیشہ چلانے کے لئے امیر علی کو چنا گیا، اور وراثت، جس کا ذکر عورت کے بارے میں اقبال کے موقف کا حوالہ دیتے ہوئے کیا گیا، زیر بحث موضوع کے نمایاں ترین عنوانات ہیں۔

ان عنوانات پر مستشرقوں اور متجددوں کے برخلاف اسلام کی حقیقی تعلیمات کا ذکر اوپر کر دیا گیا۔ اب دور حاضر کے علمی اکتشافات اور جدید انسانی معاشرے کے مسائل کو مدنظر رکھ کر عورتوں کے متعلق اور مرد و عورت کے باہمی رشتہ کے بارے میں اسلام کے تجویز کردہ اصول و ضوابط پر غور و فکر کیا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ شریعت اسلامی سے زیادہ معقول و مفید کوئی دوسرا نظام فکر و عمل متصور نہیں۔ حیاتیات اور نفسیات کے علوم نے تجربہ اور تجزیہ کر کے اس بنیادی حقیقت کی تشریح کر دی ہے کہ مرد اور عورت اپنی جسمانی ساخت اور ذہنی کیفیات کے اعتبار سے یکساں شخصیت کے حامل نہیں، بلکہ ان کے اعضا اور میلانات دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں، فطرت نے مرد کو ایک طرح اور ایک قسم کے کام کے لئے بنایا ہے اور عورت کو دوسری طرح اور دوسری قسم کے کام کے لئے۔ لیکن جدید مغربی سماج نے اپنے ہی علوم کے ان نتائج سے صرف نظر کر لیا ہے اور ثابت شدہ حقائق کے بالکل برخلاف مرد و عورت کی متقابل صنفوں کو زبردستی ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط کرنے پر تلا ہوا ہے۔ چناں چہ فطرت کے اصولوں کو نظر انداز کرنے کی حماقت اب گل کھلانے لگی ہے اور مغربی سماج بالکل پارہ پارہ ہو رہا ہے، اس کی معاشرت یکسر تباہ ہو کر رہ گئی ہے اور خاندانی نظام بالکل برہم ہو چکا ہے۔ اسلام کا ضابطہ معاشرت چوں کہ ایک حکیم و علیم ہستی کا وضع کیا ہوا ہے اس لئے بقول اقبال:

حقائق ابدی پر اساس ہے اس کی
یہ زندگی ہے، نہیں ہے طلسم افلاطون

(مدنیت اسلام، ضرب کلیم)

چناں چہ اس ضابطے میں مرد و عورت کو ان کی خلقت اور استعداد کے لحاظ سے ان کی اپنی اپنی مناسب جگہ پر رکھا گیا ہے اور ان کے درمیان معاشرتی اشتغال کی تقسیم و ترتیب کر دی گئی ہے تاکہ صنفی تضادات متصادم ہو کر سماج کے نظم و ضبط کو برہم نہ کر دیں اور انسانی معاشرہ مکمل طاقت کے ساتھ اعلیٰ ترین ترقیات کے راستے پر متوازن انداز میں گام زن رہے۔ اسی موقف سے شریعت اسلامی نے مرد و عورت کے باہمی حقوق اور حصص مقرر کئے ہیں۔ اسلام کے نظام معاشرت میں رکھ کر اگر ان حقوق و حصص پر غور کیا جائے تو ان کی حکمت و مصلحت اور معقولیت و افادیت بالکل واضح ہو جائے گی۔

اب مستشرقین کی اسلام کے مقابلے میں ذہنی الجھنوں پر ایک نظر ڈال لینا بھی مناسب ہوگا۔ میں اس سلسلے میں ذیل کے نکات غور و فکر کے لئے پیش کرتا ہوں۔

۱۔ مستشرقین اسلام پر جو بھی مطالعہ و تبصرہ کرتے ہیں وہ خالصتہً علمی اور اسلامی نظریہ و نظام پر مستقل طور سے انحصار کر کے نہیں ہوتا، بلکہ در حقیقت ان کا معیار ذہنی مسیحی اور مغربی فلسفہ حیات اور طرز معاشرت ہوتا ہے، جس کو گویا اصول موضوعہ سمجھ کر ہی ساری گفت و گو ہوتی ہے۔ اس طرح علماء مغرب کا سارا مطالعۂ اسلام دراصل چند مفروضات، قیاسات اور خواہشات پر مبنی ہے، اور اس کی حیثیت معروضی objective کم، موضوعی Subjective زیادہ ہے۔

۲۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے مطالعۂ اسلام میں اہل مغرب اسلام اور براہ راست اس کے مستند سر چشموں قرآن و حدیث، کو مرکز و محور بنانے کے بجائے بیش تر زور مسلم ممالک یا اقوام اور ان کے سماجی تغیرات پر صرف کرتے ہیں اور اسی دنیوی و تاریخی و عمرانی واسطے سے دینی و شرعی و اخلاقی اصولوں اور ضابطوں پر تنقید کرتے ہیں۔

۳۔ چناں چہ اسلامی معاشرے کو بھی انھوں نے مسیحی معاشرے کی طرح ایک سراسر الحاقی اور اتفاقی ادارہ تصور کر لیا ہے، جس میں وہ ہدایت وحی اور نمونۂ نبوت سے مختلف یا ان پر متزاد امور کا سراغ بنیادی احکام کے متعلق بھی لگاتے ہیں، اور اس طرح مسیحیت کی مثال پر اسلام کو بھی کچھ الوہی اور کچھ انسانی افکار کا ایک معجون مرکب بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ اس غیر حکیمانہ آمیزش کے بعد

اسلام کے بنیادی اصول و تعلیمات میں بھی کاٹ چھانٹ کرنا مستشرقین کے لئے آسان ہو جاتا ہے۔

۴۔ یہی وجہ ہے کہ مستشرقین نے قرآنی احکام اور ضوابطِ شریعت کو بالکل نظر انداز کر کے اپنے مطالبات میں، دنیائے مسیحیت کے نمونے پر، اولوالامر اور قاضی و مفتی کو حاکمانہ اور مطلق اختیارات کا حامل بنا کر پیش کیا ہے اور ان کے فیصلوں اور فتووں کو مستقلاً جزوِ شریعت فرض کر لیا ہے، حالانکہ اسلام میں قرآن و سنت، ہدایاتِ الٰہی اور احکامِ نبوی کے علاوہ کسی بھی سند کی کوئی اپنی حیثیت ہے ہی نہیں امرا و علما سب کے سب بہت ہی محدود اختیار رکھتے ہیں اور کوئی اقدام قرآن و حدیث کی مقرر کردہ حدودِ شریعت سے باہر جا کر نہیں کر سکتے۔ اجماع، قیاس، اجتہاد قانونِ اسلامی کے ثانوی و اضافی وسائل ہیں اور قرآن و سنت کے حوالے سے ہی ان کا اعتبار ہے۔ اسی لئے علماء نے اسلام نے فقیہوں کے نتائج افکار کو صرف مکاتبِ فکر کی حیثیت دی ہے اور ان کی سند کو قرآن و سنت کے اصولِ دین کے ماتحت کر دیا ہے۔

۵۔ مستشرقوں نے اسلامی شریعت کے بارے میں اپنی نافہمی، یا اس کے متعلق غلط فہمی پھیلانے کی حد یہ کر دی ہے کہ اسلامی نظامِ معاشرت کے ارتقا کو الگ الگ زمانوں اور ملکوں میں تقسیم کر دیا ہے اور اس طرح مختلف سیاسی قومیتوں میں اسلام کے مختلف اڈیشن مرتب کرانے کی کوشش کی ہے۔:

حکمتِ مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز

جب کہ:

تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط وحدتِ آدم!

اس سلسلے میں ترکی اور مصر کی "ترقی پسندی" سے مستشرقین اسلام کو بڑی شاندار توقعات رہی ہیں، اور اب اسمتھ نے ہندوستان کی ملتِ اسلامیہ کو اپنی آرزوؤں کا مرکز بنا لیا ہے:

"دنیائے اسلام کے تمام حصے آج اپنے آپ کو بنیادی طور پر اجنبی حالات میں پاتے ہیں۔ بیسویں صدی میں زندہ رہنے کا یہی مطلب ہے۔ ہر حصہ ایک ایسی صورتِ حال

میں سب سے جو اس کے لئے خاص بھی ہے۔ ہمارے زمانے میں اسلامی تاریخ مکمل طور پر الگ الگ ہو کر آگے بڑھ رہی ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کا گروپ کسی بھی حالت میں اس صورت حال سے مستثنیٰ نہیں۔ معاصر اسلامی ارتقا میں یقیناً اس کا رول الگ رہا ہے اور بہت کچھ اس کا اپنا ہے۔ حال میں اس کی کوئی مثال اور ماضی میں اس کی کوئی نظیر نہیں۔ اگر ہندوستان کے مسلمان اس چیلنج کا کافی جواب دے سکے تو ان کی ملت جدید اسلام میں ایک نہایت اہم اور تخلیقی ملت ہو جائے گی۔ (اسلام ان موڈرن ہسٹری : صفحہ ۲۹۱-۹۲)

ہندوستان کے مسلمان اس نتیجہ انگیزی کا مطلب سمجھ لیں۔ اسلام اب ہندوستانی ہوگا اگر اسمتھ صاحب کے قیمتی مشورے پر عمل کیا گیا!

گب نے آج کے مسلمانوں کے نام بہت ہی فکر انگیز انتباہ جاری کیا ہے:

”آج ایک دین کی حیثیت سے اسلام کو جو خطرات درپیش ہیں وہ شاید ماضی کے تمام خطرات سے بڑے ہیں۔ سب سے نمایاں خطرات تو ان قوتوں کی طرف سے ہیں جو تمام الوہی مذاہب کو دریا برد کر چکے ہیں یا کرنے کی دھمکی دے رہے ہیں۔ لادینیت [سیکولرزم] کا خارجی دباؤ، خواہ قوم پرستی [نیشنلزم] کی دل فریب شکل میں ہو یا حکیمانہ مادہ پرستی یا تاریخ کی اقتصادی تشریح کی صورت میں، مسلم معاشرے کے کئی ایک طبقات پر پہلے ہی اپنے نقوش مرتسم کر چکی ہے۔ لیکن، اس کا اثر کتنا ہی مہلک ہو، یہ آخری نتیجے کے لحاظ سے دینی ضمیر اور اسلام کی جامع روایت کے اضمحلال سے کم خطرناک ہے۔“

(محمڈن ازم : اسلام دنیائے جدید میں، ص ۱۴۳)

یتیموں کا مال

جو لوگ یتیموں کا مال ناجائز طور پر کھاتے ہیں، وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں اور دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔ (النساء : ۱۰)

مختلف ایکٹوں کا تعارف

شریعت ایکٹ ۱۹۳۷ء

علمائے کرام اور عام مسلمانوں کے مطالبہ اور کوشش کی بنا پر ۱۹۳۷ء میں مسلم پرسنل لا (شریعت) ایکٹ، ۱۹۳۷ء نافذ کیا گیا تھا۔ اور آج تک نافذ ہے۔ اسی ایکٹ کو مختصر طور پر شریعت ایکٹ کہتے ہیں۔ یہ چند دفعات پر مشتمل ایک مختصر ایکٹ ہے جس کے متن کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

(۱) وراثت، نکاح، تنسیخ نکاح بشمول طلاق، ہبہ اور اوقاف کے معاملات میں تمام مسلمان مسلم پرسنل لا کے تابع ہوں گے اور ان معاملات سے متعلق ایسے تمام مقامی رسم و رواج جو شریعت سے متصادم ہوں قطعاً باطل ہوں گے۔

(۲) وصیت اور تبنیت کے معاملات میں مسلم پرسنل لا کا اطلاق اختیاری ہوگا۔ اگر کوئی عاقل و بالغ شریعت ایکٹ میں مذکورہ طریقہ پر ان معاملات میں بھی مسلم پرسنل لا کو قبول کر لیتا ہے تو وہ خود، اس کی اولاد اور ان کی بعد کی پشتیں ان دونوں معاملات میں شرعی قوانین کے تابع ہوں گی۔

(۳) زرعی آراضی کی وراثت سے متعلق مقدمات پر مسلم پرسنل لا کا اطلاق نہ ہوگا۔

موپلا وراثت ایکٹ ۱۹۱۸ء اور موپلا وصیت ایکٹ ۱۹۲۸ء

جنوبی ہند کے موپلا مسلمان، جن کی بھاری اکثریت ریاست کیرالا کے علاقہ مالابار میں رہتی ہے ملک میں اسلام کے قدیم ترین نام لیواؤں میں سے ہیں اور عصر حاضر میں ایک با اثر اور محترم حیثیت کے حامل ہیں۔ اس طبقے سے متعلق دو خصوصی قوانین ہیں جو ۱۹۱۸ء اور ۱۹۲۸ء میں پاس ہوئے تھے۔ وراثت اور وصیت کے تمام معاملات میں موپلا مسلمان لازمی طور پر اسلامی قوانین کے تابع ہیں۔ موپلا وراثت ایکٹ ۱۹۱۸ء میں اور موپلا وصیت ایکٹ ۱۹۲۸ء میں پاس ہوا تھا۔

میمن ایکٹ ۱۹۳۸ء

مسلمانوں کے میمن طبقے کے لیے ۱۹۳۸ء میں ایک خصوصی قانون پاس ہوا تھا جو وصیت کو اسلامی قوانین کے لازمی اطلاق سے مستثنیٰ نہیں کرتا۔

وصیت اور تبنیت کے معاملات

موجودہ قانونی کیفیت یہ ہے کہ کوئی مسلمان اگر موپلا یا میمن ہے تب تو وہ لازمی طور پر وصیت کے شرعی مسائل کا پابند ہوگا ورنہ اسے اختیار ہوگا کہ وہ ان پر عمل کرے یا مقامی رواج کا پابند رہے۔ وصیت سے متعلق اسلام میں ایک مکمل قانون موجود ہے جس کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی جائداد کے ایک تہائی سے زیادہ حصے کی وصیت کرنے کا مجاز نہیں ہے تاکہ وراثت کے شرعی احکام نافذ ہو سکیں۔ ہندوستان کے بعض حصوں میں وصیت کے مقامی رواج ہیں جو شریعت سے متصادم ہیں۔ کیونکہ وہ ایسی کوئی پابندی عائد نہیں کرتے اور ان مقامات کے مسلمان بشرطیکہ وہ موپلا اور میمن نہ ہوں ان رواجوں کے اطلاق پر اصرار کر سکتے ہیں جس کا جواز شریعت ایکٹ ۱۹۳۷ء کی دفعہ ۳ میں موجود ہے۔

تبنیت (یعنی کسی کو بیٹا بنانے) سے متعلق مقامی رسوم کو بھی مسلمان اپنا سکتے ہیں۔ اگر وہ اس مسئلے میں شریعت کی پیروی نہ کرنا چاہیں۔ اسلام میں منہ بولے بیٹے کی کوئی قانونی یا شرعی حیثیت نہیں ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص کسی کو بیٹا بنالے تو اسلامی قانون کی نظر میں ان دونوں میں کوئی ایسا رشتہ قائم نہ ہوگا جو حرمت نکاح اور حقوق وراثت کو لازمی قرار دے۔ البتہ اگر مقامی رواج کے مطابق تبنیت کی قانونی حیثیت مسلم ہو اور وہ شخص شریعت کے بجائے اس رواج کے اطلاق کا خواہش مند ہو تو عدالتیں اسی کو نافذ کریں گی۔

مہر سے متعلق ایکٹ

اودھ لاز ایکٹ ۱۸۷۶ء دفعہ ۵ اور جموں و کشمیر مسلم مہر ایکٹ ۱۹۲۰ء دفعہ ۲

ریاست جموں و کشمیر اور اودھ میں مہر سے متعلق مقامی قوانین ہیں جن کے مطابق اگر کسی نکاح نامے میں مذکور مہر مسمّی کی رقم شوہر کی مالی حالت کے اعتبار سے غیر معمولی طور پر زیادہ ہو تو عدالت کو اس میں ضروری تخفیف کرنے کا اختیار ہوگا۔

تنسیخ نکاح ایکٹ ۱۹۳۹ء

علماء کی تائید سے مرکزی مجلس قانون ساز کے رکن محمد احمد کاظمی مرحوم نے ایک بل پیش کیا جس کی بنیاد پر تنسیخ نکاح ایکٹ ۱۹۳۹ء پاس ہوا۔ اس کے متن کا خلاصہ حسب ذیل ہے :

(۱) ہر مسلمان عورت کو حق ہوگا کہ وہ شوہر کی گم شدگی، نفقہ یا دیگر حقوق زوجیت کی عدم ادائیگی، سزائے قید مستقل نامردی، جنون، جذام یا کسی جنسی بیماری میں ابتلاء یا اس کی طرف سے بے رحمی کے سلوک کی صورت میں اس کے ساتھ اپنے نکاح کے فسخ کے لیے عدالت سے ڈگری حاصل کرے (۱)

(۲) مندرجہ بالا حالات کے علاوہ "خیار البلوغ"(۲) یا شریعت کے کسی اور مسئلے کی بنیاد پر بھی مسلمان منکوحہ کے نکاح کو فسخ کرنے کا عدالت کو اختیار ہوگا۔

(۳) اگر کوئی مسلمان عورت تارک اسلام ہو جائے تو اس سے اس کا نکاح خود بخود فسخ نہیں ہوگا (۳) البتہ ایسا کرنے کے بعد وہ مذکورہ بالا بنیادوں میں سے کسی پر اپنا نکاح عدالت کے ذریعہ فسخ کرا سکتی ہے۔

وقف علی الاولاد ایکٹ ۱۹۱۳ء

۱۹۱۳ء کا جواز مسلم اوقاف ایکٹ وقف علی الاولاد کو قانوناً وقف صحیح قرار دیتا ہے۔ یہ ایک وضاحتی قانون ہے جس کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ ۱۸۸۶ء میں اس وقت کی اعلیٰ ترین عدالت نے ایک مقدمے کے فیصلے کے دوران

---

(۱) بے رحمی کے سلوک کی مثالیں ایکٹ کے مطابق یہ ہیں کہ شوہر بیوی کو شدید جسمانی گزند پہنچائے، خود بدکرداری کی زندگی گزارے یا بیوی کو اس کے لیے مجبور کرے، بیوی کی ذاتی املاک خرد برد کرے، اُسے احکام شریعت کی پابندی سے منع کرے یا ایک سے زیادہ بیوی ہونے کی صورت میں احکام قرآنی کے مطابق ان کے ساتھ مساوی سلوک نہ کرے (۲) اس مسئلہ کے مطابق پندرہ سال سے کم عمر کی لڑکی کا نکاح اگر اس کے ولی نے کر دیا ہو تو وہ ۱۸ سال کی عمر تک پہنچنے سے قبل اس کے فسخ پر اصرار کر سکتی ہے بشرطیکہ صحبت نہ ہوئی ہو۔

(۳) اگر یہ مسلمان منکوحہ اصل پہلے کسی مذہب کی پیروی کرتی تھی بعد میں مسلمان ہو کر شریعت کے مطابق نکاح کیا تھا اور اب پھر اپنے پرانے مذہب کو اختیار کر رہی ہے تو اس صورت میں ترک اسلام پر اس کا نکاح خود بخود ساقط ہو جائے گا۔

وقف علی الاولاد کو شرعاً ناجائز قرار دیا تھا جب کہ قدیم فقہاء کی رائے اس کے جواز کے حق میں تھی۔ اس فیصلے کے خلاف علامہ شبلی نعمانیؒ اور دیگرا کابر نے احتجاج کیا اور آخر کار حکومت نے ۱۹۱۳ء کا وقف ایکٹ پاس کر کے اوقاف علی الاولاد کو صریحاً جائز قرار دیا۔ (۴)

اسپیشل میرج ایکٹ ۱۹۵۴ء

یہ ایکٹ ہر شخص کو خواہ وہ کسی بھی مذہب کا پیرو ہو، یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ اپنے مذہبی پرسنل لا کے بجائے اس ایکٹ کے تحت شادی کرے یا اپنے موجودہ نکاح کو اس ایکٹ کے تحت رجسٹر کرالے۔ دونوں صورتوں میں وہ اپنے مذہبی پرسنل لا کے ازدواج اور وراثت سے متعلق احکام کا پابند نہ ہوگا بلکہ اس پر ایکٹ مذکورا ور ۱۹۲۵ء کے "ہندوستانی وراثت ایکٹ" کا اطلاق ہوگا۔

(اسپیشل میرج ایکٹ کے تحت مثال کے طور پر بیوی اپنے شوہر کے نصف جائداد کی حق دار ہو جاتی ہے)

نوٹ: یہ تمام معلومات ان کی عبارتوں کے ساتھ پروفیسر طاہر محمود انڈین لا انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کی کتاب "مسلم پرسنل لا کے تحفظ کا مسئلہ" سے ماخوذ ہیں۔ حاشیے بھی اسی کتاب سے لیے گئے ہیں۔

تنسیخ زمینداری ایکٹ ۱۹۵۰ء

یو۔پی میں زمینداری کی تنسیخ کے بعد ۱۹۵۰ء میں یہ ایکٹ پاس ہوا ہے۔ اس سے مسلمان بھی مستثنیٰ نہیں ہیں۔ بلکہ ان پر بھی یہ ایکٹ نافذ ہے۔ اس ایکٹ کی دفعہ ۱۷۱ وراثت سے متعلق ہے۔ اس میں زمین، کاشت اور باغات کی وراثت کے سلسلے میں جو ضابطے بنائے گئے ہیں ان میں کے چند یہ ہیں:

(۱) اگر میت کی اولاد ذکور موجود ہو خواہ وہ بیٹا ہو یا پوتا یا پوتے کا بیٹا تو تنہا وہی میت کے ترکہ کی تمام زمینوں، کاشتوں اور باغوں کا مالک ہوگا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان میت کے تمام شرعی ورثہ کو بیٹا یا پوتا محروم کر دے گا۔

---

(۴) بریوی کونسل کا وہ فیصلہ کینیا میں اب بھی قانون کا درجہ رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں مصر میں بھی اوقاف علی الاولاد کو ختم کر دیا گیا ہے۔

(۲) اگر میت کی اولاد ذکور موجود نہ ہو تو میت کی بیوی (بیوہ) تمام زرعی جائداد کی تنہا مالکہ ہوگی۔ بشرطیکہ وہ عقد ثانی نہ کرے۔

(۳) اگر اولاد ذکور بھی نہ ہو، میت کی بیوی بھی نہ ہو تو میت کا باپ مالک ہوگا۔

(۴) اگر باپ بھی زندہ نہ ہو تو میت کی غیر شادی شدہ لڑکی مالک ہوگی۔

(۵) اگر یہ بھی نہ ہو تو میت کا بھائی مالک ہوگا۔

(۶) بھائی بھی نہ ہو تو غیر شادی شدہ بہن مالک ہوگی۔

(۷) اگر یہ بھی نہ ہو تو میت کی شادی شدہ لڑکی مالک ہوگی۔

(۸) یہ بھی نہ ہو تو نواسہ۔

(۹) نواسہ بھی نہ ہو تو بھتیجا مالک ہوگا۔

اسی طرح اس میں ۱۵ ضابطے ہیں ——— اس ایکٹ کا نہ فیضی صاحب نے اپنے مقالے میں ذکر کیا ہے اور نہ طاہر محمود صاحب نے اپنی کتاب "مسلم پرسنل لا کے تحفظ کا مسئلہ" میں ذکر کیا ہے۔ اس ایکٹ کی بنیاد شریعت ایکٹ ۱۹۳۷ء کی دفعہ ۲ میں موجود ہے جس میں کہا گیا ہے کہ: "زرعی اراضی کی وراثت سے متعلق مقدمات پر مسلم پرسنل لا کا اطلاق نہ ہوگا"۔

وراثت سے یتیم پوتے کی محرومی کا مسئلہ

(سید احمد قادری)

مسلم پرسنل لا کے اجماعی اور متفق علیہ مسائل میں سے ایک مسئلہ وراثت سے یتیم پوتے کی محرومی کا مسئلہ ہے۔ زید کا کوئی بیٹا اس کی زندگی میں وفات پاگیا ہو اور زید کی وفات کے وقت اس کے دوسرے بیٹے زندہ موجود ہوں تو زید کے وفات پائے ہوئے بیٹے کا بیٹا یعنی زید کا پوتا، زید کے ترکے میں سے حصہ نہیں پائے گا۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر تیرہ سو برس تک پوری امت مسلمہ متفق رہی ہے، کیونکہ قرآن، احادیث اور اجماع صحابہؓ کی وجہ سے یہ مسئلہ اتنا متیقن اور قطعی ہے کہ اس میں کسی مسلمان کے لیے اختلاف کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ لیکن جب یورپ کے لشکر، اس کی تہذیب اور اس کے قوانین تمدن و معاشرت مسلمان ملکوں میں فاتحانہ داخل ہوئے تو یورپ کے دانشوروں اور مستشرقین نے اسلام کے قانون وراثت میں بھی وسوسہ اندازی شروع کی۔ انھوں نے وراثت سے یتیم پوتے کی محرومی کو ظلم و زیادتی کہنا شروع کیا اور اس کا اتنا زبردست پروپیگنڈا کیا کہ یورپ زدہ مسلمان اس سے متاثر ہو گئے اور انھوں نے بھی یہ سوچنا شروع کیا کہ یتیم پوتے کو وراثت سے محروم کر دینا صحیح نہیں ہے۔ ان کا یہ کوئی سوچا سمجھا فیصلہ نہیں ہے بلکہ یورپ کی اندھی تقلید نے ان کے ایمان کو مضمحل اور ان کی عقل کو مفلوج کر دیا ہے وہ یہ سوچنے پر بھی آمادہ نہیں کہ اگر اسلام کے ایسے قطعی احکام بھی ظالمانہ اور غلط ہوں تو خود اسی دین کے عادلانہ اور صحیح ہونے کی بنیاد کیا ہو گی اور اگر یہ سمجھا جائے کہ تیرہ سو برس تک صحابہ کرام سے لے کر تمام ائمہ دین نے اسلام کے قانون وراثت کو غلط سمجھا اور اس کا صحیح فہم اب ان مسلمانوں کو حاصل ہوا ہے تو یہ بات بھی انتہائی غیر معقول ہو گی بلکہ اس صورت میں اسلام کا کوئی قانون اپنی جگہ سلامت باقی نہیں رہے گا۔ ادھر دس بیس برسوں میں اسلامی شریعت کے ماہر علمائے حق نے اس مسئلے پر بھی بہت کچھ لکھا ہے لیکن اسلامی قانونِ وراثت میں مداخلت پر اصرار

کہنے والے نہ اس مسئلے کی توضیح کو سمجھنے پر آمادہ ہیں اور نہ اس کا کوئی معقول جواب دینے پر تیار ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں ان پانچ مسلمہ اصولوں پر یقین باقی نہیں رہا ہے جن کا ذکر میں نے اس مقالے کی پہلی قسط کے آغاز میں کیا ہے۔ (پہلی قسط اکتوبر ۷۱ء کے شمارے میں شائع ہوئی ہے)

سب سے پہلی بات

اس مسئلے کو سمجھنے اور اس کو حل کرنے کے لیے ہر عقل مند اور منصف مزاج شخص کو سب سے پہلے اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ میت کے ترکے کو تقسیم کرنے کے لیے کوئی اصول ضرور ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ میراث کی تقسیم الل ٹپ تو نہیں کی جاسکتی۔ پھر یہ بھی سوچنا چاہیے کہ تقسیم کے اصول کہاں سے حاصل کیے جائیں۔ آیا صرف اپنی عقل سے حاصل کیے جائیں یا رواج سے یا اس کے لیے وحی الٰہی کی رہنمائی کو بھی ضروری قرار دیا جائے؟ اگر صرف عقل پر اعتماد کیا جائے تو انسان کی عقلیں مختلف ہیں اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کی مختلف قوموں میں تقسیم میراث کے مختلف اصول اور طریقے رائج ہیں بلکہ ایک ملک کے اندر بھی اس کے مختلف طریقے پائے جاتے ہیں۔
آخر ہم کس قوم کی عقل پر اعتماد کریں اور کیوں کریں؟ اور اگر ہم صرف اپنی عقل پر اعتماد کریں تو کیا یہ بات صحیح اور قرین انصاف ہوگی کہ ہم اپنی عقل سے گھڑے ہوئے اصول ان لوگوں پر بھی مسلط کرنے کی کوشش کریں جن کی عقلیں ان اصولوں کو غلط سمجھتی ہیں؟ یہی سوال کسی ملک کے رواج کے بارے میں بھی پیدا ہوتا ہے بلکہ ایک ملک کے اندر بھی مختلف رواج پائے جاتے ہیں تو کیا کسی ایک رواج کو ان تمام لوگوں پر عائد کرنا صحیح ہوگا جو اسے غلط سمجھتے ہیں یا کسی دوسرے رواج پر عمل پیرا ہیں؟ یہاں آکر خود ہماری عقل یہ فیصلہ کرتی ہے کہ وہ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ اس سے بلند کوئی رہنمائی ضروری ہے۔ ہم مسلمان اس پر ایمان لائے ہیں اور اس پر یقین رکھتے ہیں کہ وہ رہنمائی وحی الٰہی کی رہنمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر نقص، عیب، نفسانیت، عصبیت اور جانب داری سے پاک ہے۔ اس کا علم بے کراں اور اس کی حکمت کامل اور بے پایاں ہے۔ وہ انسانوں کا خالق ہے اور اپنی مخلوق کی ضروریات اور اس کے نفع نقصان کا صحیح علم رکھتا ہے۔ مخلوق کی عقل خود اپنے نفع و نقصان کے علم میں غلطی کرتی ہے لیکن اللہ کا علم ہر غلطی سے پاک ہے۔ ہم اپنے اس عقلی اور ایمانی فیصلے کی بنیاد پر تقسیم میراث کے اصول اور اس کا قانون اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی تشریحات سے حاصل کرتے ہیں۔ انسانوں کا خالق چونکہ انسانی عقل کے نقص سے پاک ہے اس لیے اس نے اپنے مومن بندوں کے لیے ترکے

کی تقسیم کا جو قانون نازل کیا ہے اس پر عمل پیرا ہونے کی اتنی تاکید کی ہے جتنی تاکید دوسرے معاشرتی احکام میں کم ملتی ہے اسی کے ساتھ ساتھ اس حکم کے ذیل میں اس کی بھی صراحت کی گئی ہے کہ قانون میراث کے تمام مصالح و منافع کو تمہاری عقلیں پوری طرح سمجھ نہیں سکتیں۔ ترکے میں اولاد اور والدین کے حصے بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے

آباؤکم و ابناؤکم لا تدرون ایھم اقرب لکم نفعا فریضۃ من اللہ ان اللہ کان علیما حکیما ٥ (النساء: ۱۱)	تم نہیں جانتے کہ تمہارے ماں باپ اور تمہاری اولاد میں سے کون بلحاظ نفع تم سے قریب تر ہے۔ یہ حصے اللہ نے مقرر کر دیے ہیں اور اللہ یقیناً سب حقیقتوں سے واقف ہے اور ساری مصلحتوں کو جاننے والا ہے۔

آیت کے اس ٹکڑے میں تین باتیں پوری صراحت و وضاحت سے کہی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ تمہاری عقل اور تمہارا علم ناقص ہے تم نہیں جانتے کہ بیٹیوں اور باپوں میں تمہارے لیے زیادہ نفع بخش کون ہیں اور اس لحاظ سے کس کو کتنا حصہ ملنا چاہیے۔ دوسری یہ کہ یہ حصے اللہ کے مقرر کردہ ہیں اور تیسری یہ کہ اللہ علیم و حکیم ہے اس نے اپنے علم اور اپنی حکمت کی بنیاد پر یہ حصے مقرر کیے ہیں۔ تمہارے علم و فہم کو اس کے مقابلے میں کوئی حیثیت و نسبت حاصل نہیں ہے۔

قانون وراثت پر عمل کرنے کی تاکید ہی کا ایک رخ یہ ہے کہ اطاعت کرنے والے مسلمانوں کو جنت کی خوش خبری دی گئی ہے اور خلاف ورزی کرنے والے مسلمانوں کو عذاب جہنم کی وعید سنائی گئی ہے۔

"یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدود ہیں اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کریگا اللہ اس کو جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے" اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی مقرر کی ہوئی حدوں سے نکل جائے گا اس کو اللہ دوزخ میں ڈالے گا جہاں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہوگا۔"

(النساء: ۱۳-۱۴)

ان آیتوں کو پڑھ کر اور سمجھ کر بھی کوئی مسلمان یا مسلمانوں کا کوئی گروہ تقسیم وراثت میں اپنی من مانی کرتا

چاہتا ہے اور قانون سازی پر اتر آیا ہے تو اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کا ایمان ختم ہو چکا اور اس کی عقل خدا کے نافرمانوں کی غلام ہو گئی ہے ۔

اسلامی قانون وراثت کے چند بنیادی اصول

قرآن کی آیات اور تشریحی احادیث سے ہمیں جو بنیادی اصول ملتے ہیں وہ یہ ہیں :-

۱۔ وراثت کا استحقاق مورث کی موت کے بعد پیدا ہوتا ہے ۔ اس کی زندگی میں کسی شخص کو اس کے مال و اسباب میں حق وراثت حاصل نہیں ہوتا ۔

اسلامی قانون وراثت کا یہ ایک اہم اصول ہے جس پر مسلمانوں کے تمام فقہی مذاہب متفق ہیں اسلامی شریعت میں میراث کا قصہ شروع ہی ہوتا ہے کسی شخص کی موت کے بعد اس کی زندگی میں اس کی زندگی میں اس کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ قرآن کریم میں مسائل میراث سے متعلق جتنی آیتیں ہیں وہ سب میت کے چھوڑے ہوئے مال کو وراثت قرار دیتی اور اسی کی تقسیم کے احکام بیان کرتی ہیں ۔ ان آیتوں نے اس بنیادی اصول کو پوری طرح واضح کر دیا گیا ہے ۔ ایک جگہ کہا گیا ہے :-

> مردوں کے لیے اس مال میں سے حصہ ہے جو والدین اور قریب ترین رشتہ داروں نے چھوڑا ہو اور عورتوں کے لیے اس مال میں سے حصہ ہے جو والدین اور قریب ترین رشتہ داروں نے چھوڑا ہو ۔ (النساء : ۷)

ایک جگہ موت کی صراحت کے ساتھ کہا گیا ہے :-

> "اگر کوئی شخص مر جائے اور اس کے کوئی اولاد نہ ہو اور اس کی ایک بہن ہو تو جو کچھ اس نے چھوڑا ہے اس کا نصف بہن کے لیے ہے" (النساء ۔ ۱۷۶)

اسی طرح آیت میراث میں بار بار تَرَكَ (وہ چھوڑ مرے) تَرَكْتُمْ (تم چھوڑ مرو) تَرَكْنَ (وہ عورتیں چھوڑ مریں) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں ۔ انہیں آیات کی بنا پر وراثت کے لیے ترکہ کی اصطلاح نکلی ہے اور ترکہ اسی مال کو کہتے ہیں جو کوئی شخص چھوڑ کر مر جاتا ہے ۔ یہ نہیں بلکہ انہیں آیات میراث میں یہ بھی ہے کہ میت کا ترکہ اس کی وصیت پوری کرنے اور اس کا دین ادا کرنے کے بعد تقسیم کیا

جائے گا۔

یہ تقسیم ترکہ میت کی وصیت کی تعمیل کے بعد جو اس نے کی ہو یا قرض ادا کرنے کے بعد جو اس کے ذمے ہو عمل میں آئے گی (النساء: ۱۱)

اس سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کے مرتے ہی وارثوں کو اس کے مال پر قبضہ کر لینے کا حق نہیں ہے۔ وصیت اور قرض کی صورت میں یہ عین ممکن ہے کہ میت کے مال میں سے انہیں کچھ نہ ملے۔ انہیں آیات میراث میں بعض ایسی آیتیں بھی ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ کسی مسلمان کی زندگی میں کوئی اس کا وارث نہیں ہوتا۔

وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَالَةً	اور اگر میت ایک ایسا مرد یا عورت
أَوِ امْرَأَةٌ وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ	ہو جس کے نہ باپ ہو نہ بیٹا مگر اس کے بھائی
وَاحِدٍ مِنْهُمَا السُّدُسُ	یا بہن (اخیافی) ہو تو ان میں سے ہر ایک
(النساء: ۱۲)	کا چھٹا حصہ ہے

ترجمہ ہی سے معلوم ہو گیا کہ کلالہ اس مرد یا عورت کو کہتے ہیں جس کی موت کے وقت نہ اس کا باپ زندہ ہوا ور نہ کوئی اولاد موجود ہو۔ یہ آیت کریمہ واضح کرتی ہے کہ کسی کی زندگی میں کوئی اس کا وارث نہیں ہوتا کیونکہ بیٹے کی زندگی میں باپ اس کا وارث ہوتا تو پھر کوئی شخص کلالہ ہوتا ہی نہیں۔ اس صورت میں بیٹے کی وفات کے بعد باپ کا حصہ اس کے وارثوں میں تقسیم ہوتا۔ اسی طرح اس صورت میں بھی کوئی شخص کلالہ نہ ہوتا جب اس کی زندگی میں اس کی اولاد مر گئی ہوتی۔ حالانکہ قرآن صراحت کرتا ہے کہ اگر کوئی شخص مر جائے اور اس کی کوئی اولاد موجود نہ ہو تو وہ کلالہ ہے۔

قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلَالَةِ	کہو، اللہ کلالہ کے بارے
إِنِ امْرُؤٌ هَلَكَ لَيْسَ لَهُ وَلَدٌ وَلَهُ	میں تمہیں فتویٰ دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص مر جائے
أُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ	اور اس کے کوئی اولاد نہ ہو تو جو کچھ اس نے
(النساء: ۱۷۶)	چھوڑا ہے اس کا نصف بہن کے لیے ہے

آپ احادیث کا بھی پورا ذخیرہ ڈھونڈ لیں کوئی ایک حدیث میں ایسی نہیں ملے گی جس میں کسی کی زندگی میں اس کی میراث کا کوئی سوال پیدا ہوا ہو، بلکہ آپ دیکھیں گے کہ وراثت کے سارے مسائل کسی

کی موت کے بعد ہی پیدا ہوتے ہیں یہاں تک کہ عربی زبان میں حقیقی معنے کے لحاظ سے وراثت اور میراث کے الفاظ اس مال و جائداد ہی کے لیے بولے جاتے ہیں جو کوئی شخص اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے یہ دونوں الفاظ لفظ ترکہ کے مترادف ہیں۔ ابوداؤد میں ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے کہ میرے پاس قبیلہ ازد کے ایک شخص کی میراث ہے اور مجھے اب تک کوئی ازدی نہیں ملا کہ وہ میراث میں اس کے حوالے کر دیتا۔ کتاب الفرائض کی اس حدیث میں میراث کا لفظ ترکے کے معنے میں استعمال ہوا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فیصلہ فرمایا کہ بچہ جب پیدا ہونے کے بعد روئے (یعنی اس میں زندگی کی کوئی علامت پائی جائے) پھر مرجائے تب وہ وارث ہوگا۔ (ابوداؤد بحوالہ جمع الفوائد)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی بچے کے وارث بننے کی شرط یہ ہے کہ وہ ماں کے پیٹ سے زندہ پیدا ہو۔ اگر مردہ پیدا ہوا تو وراثت سے محروم ہوگا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فیصلہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ کوئی بچہ ماں کے پیٹ میں کسی کا وارث نہیں ہوتا۔

فرض کیجیے، کسی کی بیوی حاملہ تھی اور بچہ ماں کے پیٹ کے اندر زندہ موجود تھا لیکن اس کے پیدا ہونے سے چند دن پہلے اس کے باپ کا انتقال ہوگیا اور اس کے بعد جب وہ پیدا ہوا تو مردہ پیدا ہوا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کے مطابق وہ بچہ اپنے باپ کی وراثت نہیں پائے گا۔ یہ واضح ثبوت ہے اس بات کا کہ اولاد اپنے باپ کی زندگی میں اس کی وارث نہیں ہوتی بلکہ باپ کی وفات کے بعد اس سطح زمین پر اس کا زندہ وجود (خواہ کتنے ہی مختصر عرصے کے لیے کیوں نہ ہو) ضروری ہے۔

اس مسلمہ اصل کی اتنی تفصیل دو وجوہ سے پیش کی گئی ہے ـــ ایک یہ کہ مسئلۂ زیر بحث سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ اور دوسری یہ کہ ہندوستان میں رہنے کی وجہ سے بعض مسلمانوں کے ذہن ہندوانہ قانون وراثت سے متاثر ہوگئے ہیں۔

۲۔ اسلامی قانون وراثت کا دوسرا بنیادی اصول یہ ہے کہ میت کے مال میں حصہ پانے کی بنیاد اس سے قریب ترین قرابت ہے۔ نہ محض قرابت اس کی بنیاد ہے اور نہ وارثوں کی ضرورت و احتیاج اس کی بنیاد ہے۔

سورۂ نساء کی آیت ۷ میں اس اصول کی صراحت کی گئی ہے:-

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِمَّا	مردوں کے لیے اس مال میں حصہ ہے جو
تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ	والدین اور قریب ترین رشتہ داروں نے چھوڑا
وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِمَّا تَرَكَ	ہو اور عورتوں کے لیے اس مال میں حصہ ہے جو
الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا	والدین اور قریب ترین رشتہ داروں نے
قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا	چھوڑا ہو۔ تھوڑا ہو یا بہت۔ یہ حصہ (اللہ کی
مَفْرُوضًا ۔	طرف سے) مقرر ہے۔

اس آیت میں صراحت ہے کہ مرد اور عورتیں اپنے والدین اور قریب ترین رشتہ داروں کے ترکے میں حصہ پائیں گے۔ معلوم ہوا کہ میت کے ترکے میں حصہ پانے کی بنیاد اس سے قریب ترین رشتہ ہے۔ یہ بنیادی اصول بیان کرنے کے بعد اللہ تعالےٰ نے آگے کی آیتوں میں قریب ترین رشتہ رکھنے والوں کے حصے خود متعین کر دیے ہیں ــــــ احادیث نبوی اسی بنیادی اصول کی تشریح کرتی ہیں۔

(۱) عن ابن عباس قال	(متفق علیہ)	ابن عباس رضا سے روایت ہے کہ
قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ		رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ذوی الفروض
وسلم الحقوا الفرائض باھلھا		کو ان کے حصے دو۔ پھر جو باقی رہ جائے وہ
فما بقی فھو لاولی رجل ذکر		میت کے قریب ترین مرد رشتہ دار کا ہوگا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ذوی الفروض کے حصے دینے کے بعد جو کچھ بچے گا وہ میت کے قریب ترین عصبہ کا ہوگا۔ اس میں صرف مرد کی صراحت اس لیے ہے کہ اصلاً عصبہ مرد ہی ہوتا ہے ــــ عورت بذاتِ خود عصبہ نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی میت کا کوئی بیٹا موجود نہ ہو، صرف بیٹیاں ہوں تو وہ ذوی الفروض میں داخل ہو جاتی ہیں جن کے حصے خود اللہ نے مقرر کر دیے ہیں۔

(۲) حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ سعد بن ربیع کی بیوی ان کی دو بیٹیوں کو لیکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور کہا، یا رسول اللہ، یہ سعد بن ربیع کی بچیاں ہیں ان دونوں کے والد آپ کے ساتھ غزوۂ احد میں شریک تھے اور وہاں شہید ہو گئے ان دونوں کے چچا نے سعد کے پورے مال پر قبضہ کر لیا اور ان کے لیے کچھ نہیں چھوڑا اگر ان دونوں

کے پاس کچھ مال نہ ہوگا تو ان کی شادی کس طرح ہوگی۔ آپؐ نے فرمایا اس معاملے میں اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمائے گا چنانچہ اس کے بعد آیت میراث نازل ہوئی۔ آپؐ نے ان دونوں لڑکیوں کے چچا کو پیغام بھیجا کہ سعد کی دونوں بیٹیوں کو دو ثلث (دو تہائی) مال دیدو اور ان دونوں کی ماں کو ثمن (آٹھواں حصہ) دو۔ اس کے بعد جو کچھ بچے وہ تمہارا ہے۔"

(احمد، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ بحوالہ مشکوٰۃ)

چونکہ ان لڑکیوں کے چچا سعد کے قریب ترین عصبہ تھے، کوئی دوسرا قریب ترین عصبہ موجود نہ تھا اس لیے اصحاب الفروض کو دینے کے بعد باقی مال انہیں کو دیا گیا۔

(۳) حضرت علی رضہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا ہے کہ سگے بھائی بہن وارث ہوں گے۔ (ان کی موجودگی میں) سوتیلے بھائی بہن وارث نہ ہوں گے۔ (ترمذی)

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اگر میت کے ورثہ میں سگے بھائی بہنوں اور سوتیلے بھائی بہنوں کے سوا اور کوئی وارث نہ ہو تو اس کے وارث سگے بھائی بہن ہوں گے۔ سوتیلے بھائی بہن نہ ہوں گے۔ اس لیے کہ میت کے قریب ترین عصبہ سگے بھائی بہن ہیں۔ ان کی موجودگی میں کچھ دور کے عصبہ محروم ہوں گے ـــ یہ تین احادیث بھی "اقربیت" کے اصول کی توضیح کے لیے کافی ہیں۔

۳۔ عصبہ میں تقسیم ترکہ کا اصولی ضابطہ قرآن نے لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ (مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے) مقرر کیا ہے۔

ذوی الفروض یا اصحاب الفرائض ان رشتہ داروں کو کہتے ہیں جن کے حصے اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیے ہیں اور عصبہ میت کے اس رشتہ دار یا رشتہ داروں کو کہتے ہیں جو اصحاب الفرائض کو دینے کے بعد بچے ہوئے کل مال کے مستحق ہوتے ہیں۔ میت کے عصبہ میں قریب ترین عصبہ اس کی اولاد ہے اور آیت میراث میں سب سے پہلے اولاد ہی کی حصہ رسدی کا قاعدہ بیان کیا گیا ہے:۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اسلامی قانون وراثت کے تین اصول یا ضابطے ہیں۔

(۱) کوئی شخص کسی کی زندگی میں اس کا وارث نہیں ہوتا۔

(۲) میت کے مال میں حصہ پانے کی بنیاد میت سے قریب ترین رشتہ ہے۔

(۳) عصبہ میں مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے اس لیے کہ شریعت نے مرد پر اخراجات کی وہ بہت سی ذمہ داریاں عائد کر دی ہیں جو عورتوں پر عائد نہیں کی ہیں۔ مرد پر اپنی بیوی کا مہر بھی واجب ہے اس کا نان نفقہ بھی واجب ہے۔ اپنے بچوں کی کفالت بھی واجب ہے اور ان کی تعلیم و تربیت کے اخراجات و انتظامات بھی واجب ہیں عقل و انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اگر اس کو کسی کی وراثت میں کچھ مل رہا ہو تو اس کا حصہ عورتوں سے زیادہ ہونا چاہیے۔

مسئلہ زیر بحث پر غور کیجیے قرآن اور احادیث سے ثابت شدہ ان مسلّمہ اصولوں کو سامنے رکھ کر غور کیجیے کہ دادا کی اپنی اولاد کی موجودگی میں یتیم پوتے کو کس اصول کے تحت دادا کے ترکہ میں حصہ مل سکتا ہے؟ پہلے اصول کے تحت جب یتیم پوتے کا باپ ہی وارث نہ ہو سکا تو سگے چچا کی موجودگی میں اپنے دادا کا وارث کس طرح ہوگا؟ فرض کیجیے کہ زید کے تین لڑکے تھے عمر، بکر اور خالد — بکر اپنا ایک بیٹا ماجد چھوڑ کر اپنے باپ کی زندگی میں مرگیا۔ زید کی وفات کے وقت عمر اور خالد، زید کے بیٹے موجود ہیں اور اس کا پوتا ماجد موجود ہے ظاہر ہے کہ جب اس کا باپ ہی وارث نہ رہا تو عمر اور خالد کی موجودگی میں ماجد، زید کا وارث نہیں ہو سکتا۔

دوسرے اور تیسرے اصول کے تحت بھی ماجد کو حصہ نہیں مل سکتا کیونکہ عمر اور خالد، زید کے قریب ترین عصبہ ہیں وہ زید کی بلا واسطہ اولاد ہیں اور ماجد اولاد کی اولاد ہے زید کی طرف عمر اور خالد کی نسبت بلا واسطہ ہے اور ماجد کی نسبت بکر کے واسطے سے ہے۔ قریب ترین عصبہ کی موجودگی میں کچھ دور کے رشتہ دار کو زید کی وراثت نہیں مل سکتی۔ کھلی بات ہے کہ ان مسلّمہ اصولوں کو توڑے بغیر جن کی سزا جہنم کا عذاب ہے، ماجد کو زید کی وراثت میں حصہ دار نہیں بنایا جا سکتا — یہ کہنا کہ قرآن و احادیث کی رو سے یتیم پوتا اپنے سگے چچا کی موجودگی میں اپنے باپ دادا کی وراثت سے محروم نہیں ہوتا، درحقیقت یہ کہنا ہے کہ قرآن کو (نعوذ باللہ) نہ رسول اللہ سمجھ سکے، نہ ان کے صحابہ۔ یہ اتنی نامعقول اور بے ہودہ بات ہے کہ مسلمان تو مسلمان کوئی انصاف پسند غیر مسلم بھی اسے صحیح نہیں سمجھ سکتا۔ کہنے والے یہ بات ناواقف مسلمانوں کو دھوکا دینے کے لیے کہتے ہیں۔

اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اسلامی قانون وراثت کی خلاف ورزی کر کے جو لوگ یتیم پوتے کے مصنوعی ہمدرد بنے ہوئے ہیں کیا وہ کوئی معقول بات بھی کہتے ہیں اور کیا انسانی عقل اسے قرین انصاف سمجھ سکتی ہے؟

صرف عقل کی روشنی میں سوچیے

اسلامی اصولوں کو چھوڑ کر، سگے چچا کی موجودگی میں یتیم پوتے کو وارث بنانے کی ایک صورت یہ ہوسکتی ہے کہ دادا کی زندگی میں اس کے متوفی باپ کو حقیقی وارث تسلیم کرلیا جائے اور پوتے کو اپنے باپ کا قائم مقام مان کر اس کو اپنے باپ کا حصہ دلوایا جائے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ حضرات اس غیر اسلامی اصول کو سنجیدگی کے ساتھ تسلیم کرنے کے لیے تیار ہیں؟ اگر یہ اصول مان لیا جائے تو کسی شخص کی زندگی میں صرف اس کا بیٹا ہی حقیقی وارث نہ ہوگا بلکہ اس شخص کا باپ، اس کی ماں، اس کی بیٹی، اس کی بیوی، اس کے بھائی بہن سبھی اس کے حقیقی وارث ہوجائیں گے اور اس شخص کی وفات کے بعد ان سب کے ورثہ کو قائم مقام مان کر اس کے ترکے میں حصہ دار بنانا ہوگا لیکن جہاں تک راقم الحروف کا علم ہے یہ حضرات اس کو تسلیم نہیں کرتے تو پھر یہ کون سی معقول اور منصفانہ بات ہوگی کہ صرف یتیم پوتے کو اپنے متوفی باپ کا قائم مقام مان کر اس کو اپنے باپ کا حصہ دلوایا جائے۔ لیکن مثال کے طور پر یتیم نواسے کو حصہ نہ دلوایا جائے، یا میت کی بیوی کے یتیم بھائی کو حصہ نہ دلوایا جائے۔ مثلاً زید کی زندگی میں اس کا ایک بیٹا، ایک بیٹی اور اس کی بیوی یہ سب مر گئے، اس کے بعد زید کا انتقال ہوا اب زید کا ایک زندہ بیٹا موجود ہے۔ اس کے علاوہ اس کا یتیم پوتا، یتیم نواسا اور یتیم سالہ موجود ہے اگر قائم مقامی کے اصول پر پوتا اپنے باپ کا حصہ لے گا تو نواسہ اپنی ماں کا اور سالہ اپنی سگی بہن کا حصہ کیوں نہیں لے گا؟ جبکہ زید کی زندگی میں جس طرح اس کا بیٹا اس کا وارث ہوگیا اسی طرح اس کی بیٹی اور بیوی بھی وارث ہو کر مریں۔ آخر یتیموں کی ہمدردی کی یہ کون سی قسم ہوگی کہ مثال کے طور پر ان یتیموں میں سے صرف ایک یتیم کو حصہ دلوایا جائے اور اگر زید کے ماں باپ کے ورثہ کو بھی سامنے رکھیے تو زید کے ترکے کی تقسیم کتنی دلچسپ اور عجیب وغریب ہوگی — بات در اصل یہ ہے کہ یتیم پوتے کی ہمدردی تو ایک بہانہ ہے۔ ان حضرات کا اصل مقصد اسلامی قانون وراثت کو ختم کرنا ہے۔ اس کے بعد کتنی ہی نامعقول صورتیں پیدا ہوں وہ سب ان کو گوارا ہیں۔

یتیم پوتے کو وراثت دلوانے کی دوسری صورت یہ ہے کہ اس کے باپ کو اس کے دادا کی وفات کے بعد زندہ فرض کیا جائے۔ یہ صورت پہلی صورت سے بھی زیادہ نامعقول ہے اس لیے کہ اولاً تو ان سب رشتہ داروں کے بارے میں جو اس کے دادا کی زندگی میں مر گئے تھے یہی فرض کرنا پڑے گا، ثانیاً

[illegible] کا اس کے بعد اس کی موت کے بعد اس

وہ زندہ رہتا ہے۔ تو وارث وہ خود ہوگا نہ کہ اس کا بیٹا کوئی بھی ہوشمند آدمی اس
کے بارے میں پاگل پن کے سوا اور کیا فیصلہ کرے گا لیکن یتیموں کے یہ ہمدرد شریعت
سے یہ "پاگل پن" مسلط کرنا چاہتے ہیں۔

دو سوال

جو لوگ یتیم پوتے کو ہر حال میں دادا کی وراثت دلانا چاہتے ہیں وہ
انسانیت کے بڑے ہمدرد بنکر یہ کہتے ہیں کہ اگر اس کو حصہ نہ دلوایا جائے
تو اس بے بس اور بے کس کی کون کفالت کرے گا اور اس کی ضروریات کس طرح پوری ہوں گی۔
یہ لوگ یہ بات اس مفروضے پر کہتے ہیں کہ گویا ہر دادا اپنے پیچھے ایک بڑی جائداد چھوڑ جاتا
ہے اگر یتیم پوتے کو اس کی وراثت نہ دلوائی جائے تو وہ غریب بچہ کیوں مر جائے گا۔ حالانکہ
واقعات حال یہ ہے کہ کم سے کم ہندوستان میں ۸۰ فیصدی ایسے دادا مرتے ہیں جو اپنے پیچھے اتنا
بھی نہیں چھوڑ جاتے کہ خود ان کے اپنے بیوی بچوں کا خرچ چل سکے بلکہ بہت سے ایسے بھی ہوتے ہیں
جن کے کفن دفن کا انتظام بھی ان کے عزیزوں کو اپنے مال سے یا دوسروں کی مدد سے کرنا پڑتا
ہے میں ان حضرات سے دریافت کرتا ہوں کہ ایسی صورت میں جو کثیر الوقوع ہے یتیم پوتے کی کفالت
کون کرے گا اور اس کی ضروریات کس طرح پوری ہوں گی؟ ——— دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا اسلامی
شریعت نے اس کا کوئی انتظام نہیں کیا ہے۔ کیا اس نے یتیم پوتے کو واقعی بے بس اور بے کس چھوڑ دیا
ہے اور کیا علماء نے اس انتظام کی طرف اشارات نہیں کیے ہیں۔ یہ حضرات اس پر غور کیوں
نہیں کرتے؟ ان کا مقصد یتیم پوتے کی کفالت ہے یا اسلامی قانون وراثت کی شکست و ریخت؟
اسلام نے یتیم پوتے کی کفالت کے لیے وراثت کی بے اصول اور غلط تقسیم کو پسند نہیں کیا ہے
بلکہ اس نے اپنے متوازن اور معتدل اصولوں کو برقرار رکھتے ہوئے اس کے انتظامات کیے ہیں۔
میں اختصار کے ساتھ یہاں ان انتظامات پر گفتگو کروں گا۔ میرے سامنے صرف اصولی باتیں ہوں گی
اور تفصیلات سے قطع نظر کرنا پڑے گا۔

کفالت کے شرعی انتظامات

(۱) یتیم کی کفالت اس کے قریب ترین رشتہ داروں
پر واجب ہے۔

اسلامی شریعت نے یتیم کی کفالت کے لیے سب سے پہلے اس کے قریبی رشتہ داروں کو ذمہ دار قرار دیا ہے۔ مثلاً زیر بحث کو سامنے رکھ کر دیکھیے کہ یتیم پوتے کے جو چچا اسلامی قانون وراثت کے تحت اپنے باپ کی میراث پا رہے ہیں، وہی اپنے یتیم بھتیجے کے ولی ہوں گے اور اگر وہ محتاج اور غریب و تنگدست ہو تو اس کی کفالت ان پر واجب ہوگی اور اگر وہ کسی اور ذریعے سے صاحبِ جائداد اور مالدار ہو تو اس کی جائداد اور مال کی حفاظت اور اس بچے کے کھانے پینے اور اس کی تعلیم و تربیت کا انتظام ان پر واجب ہوگا۔

اسلام نے کسی بھی یتیم بچے کو بے کس و بے بس نہیں چھوڑا ہے بلکہ سب سے پہلے اس کے قریبی رشتہ داروں کو اس کا ذمہ دار قرار دیا ہے اور اگر قریبی رشتہ دار موجود نہ ہوں تو دور کے رشتہ داروں کو اس کی کفالت کا ذمہ دار قرار دیا ہے اور اگر شاذ و نادر یہ صورت پیش آئے کہ اس کا کوئی رشتہ دار موجود نہ ہو یا خود مفلس ہو تو پھر مسلمانوں کا بیت المال اس بچے کی کفالت کا ذمہ دار ہوگا۔ فقہائے امت نے اس حکم کے لیے قرآن و حدیث دونوں سے استدلال کیا ہے۔ سورۃ البقرہ کی آیت ۲۳۳ کو سامنے رکھیے، اس کا ترجمہ یہ ہے:

"اور مائیں اپنے بچوں کو ان لوگوں کے لئے پورے دو سال دودھ پلائیں جو پوری مدت دودھ پلوانا چاہتے ہوں اور بچہ والے کے ذمہ بچوں کی ماؤں کا دستور کے مطابق کھانا اور کپڑا ہے۔ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے۔ نہ کسی ماں کو اس کے بچے کے سبب سے نقصان پہنچایا جائے اور نہ کسی باپ کو اس کے بچے کے سبب سے، اور اسی طرح کی ذمہ داری وارث پر بھی ہے۔"

اس آیت میں اس صورت حال کا حکم ہے جب کسی شیر خوار بچے کی ماں سے اس کے باپ کا تعلق منقطع ہو چکا ہو۔ اس صورت میں باپ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے شیر خوار بچے کے دودھ پلوانے کے اخراجات برداشت کرے اور اگر بچے کے باپ کی وفات ہو جائے تو یہی ذمہ داری اس بچے کے ہونے والے وارث پر عائد ہوگی۔ اس آیت کا ٹکڑا یہ ہے:

وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَٰلِكَ — اور اس طرح کی ذمہ داری وارث پر بھی ہے

امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، قتادہ اور ابن ابی لیلیٰ رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت میں وارث سے مراد ہر وہ شخص ہے خواہ وہ عورت یا مرد جو اس بچے کی وفات کے بعد اس کی وراثت

پانے کی اہلیت و استحقاق رکھتا ہو۔ ان سب ہونے والے وارثوں پر اس بچے [illegible] واجب ہے اور انھیں اس کے اخراجات برداشت کرنے پر مجبور کیا جائے گا [illegible] حدیثوں سے استدلال کیا ہے۔

(۱) نسائی میں طارق کی حدیث ہے کہ میں مدینہ اس وقت پہنچا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر لوگوں سے خطاب فرما رہے تھے۔ آپ فرما رہے تھے کہ دینے والا ہاتھ بلند ہوتا ہے تم ان لوگوں پر خرچ کرو جن کی کفالت تم کر رہے ہو، اپنے ماں باپ پر خرچ کرو، بھائی بہن پر خرچ کرو۔ پھر اس کے بعد ہر قریب تر رشتہ دار پر خرچ کرو۔

(۲) امام احمد، ابو داؤد اور ترمذی نے معاویہ بن حیدہ قشیری سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا۔ میں کس کے حقوق ادا کروں۔ آپ نے فرمایا اپنی ماں کے حقوق۔ میں نے پوچھا پھر کس کے۔ آپ نے فرمایا اپنی ماں کے حقوق۔ میں نے پوچھا پھر کس کے حقوق ادا کروں۔ آپ نے فرمایا اپنے باپ کے حقوق ادا کرو پھر جو تم سے قریب تر رشتہ رکھتا ہو اس کے حقوق ادا کرو۔

(۳) صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے فرمایا اپنے اہل وعیال پر خرچ کرنے کے بعد جو کچھ بچے وہ اپنے اہل قرابت پر خرچ کرو۔ (۱)

ان حدیثوں کی وجہ سے امام احمد وغیرہ یہ کہتے ہیں کہ وارث بچے کا محرم ہو یا نہ ہو اور اس کا عصبہ ہو یا نہ ہو، اس پر بچے کے اخراجات واجب ہوں گے۔ امام ابو حنیفہ کا قول بھی یہی ہے مگر وہ یہ کہتے ہیں کہ بچے کی کفالت اس رشتہ دار پر واجب ہے جو اس کا محرم بھی ہو[2]۔ ایک قول یہ ہے کہ وارث سے مراد بچے کے وہ رشتہ دار ہیں جو اس کے عصبہ ہوں لہذا بچے کے عصبات اس کے اخراجات برداشت کرنے پر مجبور کیے جائیں گے۔ مثلاً دادا، چچا، بھتیجا، چچا زاد بھائی۔ امام بغوی نے کہا ہے کہ یہ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا قول ہے اور اسی کو ابراہیم نخعی، حسن بصری، مجاہد، عطا اور سفیان ثوری نے اختیار کیا ہے[3]۔ ان جزوی اختلافات سے قطع نظر قدر مشترک یہ ہے کہ یتیم بچے کے قریبی رشتہ دار

---

[1] فتح القدیر جلد ۳ ص ۳۵۰ مطبوعہ مصر [2] محرم ان رشتہ داروں کو کہتے ہیں جن سے نکاح [illegible] حرام ہو جیسے چچا، بھتیجی، ماموں، بھانجی اور بھائی بہن وغیرہ [3] تفسیر مظہری جلد ۱ ص [illegible]

بچوں کی کفالت واجب ہے

ہمارے ملک کے بیشتر فقہائے احناف کا مسلک یہ ہے کہ ہر محرم رشتہ دار کا نفقہ واجب ہو بشرطیکہ وہ محتاج بچہ ہو یا محتاج بالغ عورت ہو یا ایسا بالغ مرد ہو جو محتاج ہو اور کسی مرض کا شکار ہو یا اندھا ہو دوسرے صاحبِ مال رشتہ داروں پر واجب ہے [1]

مال دار ہونے کا معیار صاحبِ نصاب ہونا ہے یعنی ہر وہ شخص جب اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کرنا فرض ہو وہ مال دار ہے۔ امام محمد کا قول یہ ہے کہ اگر کسی کی روزانہ یا ماہانہ آمدنی ہو تو اسے مال دار اس وقت سمجھا جائے گا جب اہل و عیال پر خرچ کرنے کے بعد کچھ بچ رہے۔

لفظ نفقہ کا اطلاق فقہ کی اصطلاح میں کھانے کپڑے اور مسکن پر ہوتا ہے [2] جیسا کہ اوپر لکھا گیا اگر قریبی رشتہ دار موجود نہ ہوں تو دور کے رشتہ دار ذمہ دار قرار دیے جائیں گے۔ فقہ حنفی کی کتابوں میں اس کی بھی تصریح ہے۔

وفی القنیۃ یجبر الابعد — دور کے رشتہ دار مجبور کیے جائیں

اذا غاب الاقرب — گے جب قریبی رشتہ دار غائب ہوں [3]

اگر کسی بچے کا باپ مر گیا ہو تو اس بچے کے اخراجات کا قریبی رشتہ داروں پر واجب ہونا تو ثابت ہے ہی اس کے ساتھ ہی فقہائے احناف نے اس کی صراحت کی ہے کہ باپ کے محتاج ہونے کی صورت میں بھی مال دار رشتہ داروں کو اس کے بچوں کی کفالت کرنی ہوگی۔

اگر باپ کی کمائی بچوں کی کفالت کے لیے کافی نہ ہو یا وہ کام نہ ملنے کی وجہ سے بے کار ہو تو قریبی رشتہ دار ان بچوں کی کفالت کریں اور جب باپ مال دار ہو جائے تو وہ اس سے اپنی خرچ کی ہوئی رقم وصول کر لیں اور جوامع الفقہ میں ہے کہ اگر باپ کے پاس مال نہ ہو اور مثلاً بچوں کی ماں یا ماموں یا چچا مال دار ہو تو ان میں جو مال دار ہوگا اسی کو ان بچوں کی کفالت پر مجبور کیا جائے گا۔ پھر جب باپ مال دار ہو جائے تو وہ اپنی رقم وصول کر لیں [4]

[illegible] یتیم بچے کی یا دوسرے محتاج و معذور رشتہ داروں کی کفالت واجب ہے [illegible]

---

[1] ہدایہ باب النفقہ [2] در مختار [3] فتح القدیر بحوالہ القنیہ [4] فتح القدیر

صرف سورۃ البقرہ کی آیت ۲۳۲ ہی نہیں ہے بلکہ اس کی دلیل یہ بھی ہے کہ اسلامی شریعت نے قریبی رشتہ داروں کے درمیان صلہ رحمی کو فرض اور قطع رحم کو حرام قرار دیا ہے۔ فقہائے احناف نے اپنی کتابوں میں اس دلیل کی طرف بھی اشارات کیے ہیں ـــــ

صلہ رحمی کی تاکید و ترغیب اور رشتہ کاٹنے کی مذمت وحرمت میں قرآن کی جتنی آیتیں اور ذخیرۂ احادیث میں جتنی حدیثیں ہیں اگر میں ان سب کو جمع کروں تو وہ ایک مستقل مقالہ بن جائیں گی اور ابھی ماہنامہ زندگی میں راقم الحروف کا ایک طویل مقالہ "صلہ رحمی" کے عنوان سے شائع بھی ہو چکا ہے۔ قرطبی نے اپنی تفسیر میں صلہ رحمی کے واجب ہونے پر پوری امت کا اتفاق نقل کیا ہے۔ کیونکہ اس پر کتاب وسنت کی قطعی دلیلیں قائم ہیں۔

یتیم پوتے کی کفالت کا یہ ہے وہ پہلا انتظام جو اسلامی شریعت نے کیا ہے۔ اگر یتیم پوتے کو ہر حال میں دادا کی وراثت دلوانے کی کوشش کرنے والے حضرات یہ کہیں کہ اس پر مسلمانوں کا معاشرہ عمل نہیں کر رہا ہے اور اس کی بھی کوئی صورت نہیں ہے کہ اس پر انہیں مجبور کیا جا سکے تو میں جواب میں کہوں گا کہ اے حضرات اپنی کوشش کا رخ بدل دیجیے۔ اسلامی قانون وراثت میں خلل ڈالنے کی کوشش ترک کر کے آپ کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ مسلمانوں پر لاگو کیا جانے والا مسلم پرسنل لا میں جو دفعہ وراثت سے متعلق ہے اس میں یہ اضافہ کیا جائے کہ اگر کسی شخص کا محتاج اور ضرورتمند یتیم پوتا موجود ہو تو اس کا ترکہ پانے والی اولاد اس یتیم پوتے کی کفالت کی ذمہ دار ہوگی۔

وصیت

محتاج اور ضرورتمند یتیم پوتوں بلکہ تمام ایسے رشتہ داروں کی کفالت اور ان کی مالی امداد کے لیے جو میت کے ترکے سے حصہ نہ پا رہے ہوں، اسلامی شریعت میں وصیت کا قانون موجود ہے۔ مدینہ منورہ کے ابتدائی دور میں جبکہ آیت میراث نازل نہیں ہوئی تھی جاہلیت کے دور کے لیے مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ اپنے والدین اور دوسرے قریبی رشتہ داروں کے لیے اپنے مال میں وصیت کر کے اس دنیا سے رخصت ہوں۔ فرمایا گیا ہے:۔

جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ پہنچے اور وہ کچھ مال چھوڑ رہا ہو تو تم پر فرض کیا گیا ہے والدین اور قرابت مندوں کے لیے دستور کے مطابق وصیت کرنا۔ خدا سے ڈرنے والوں پر یہ حق ہے۔ (البقرہ: ۱۸۰)

جاہلیت کا قانون یہ تھا کہ میت کے بالغ بیٹے اس کے پورے ترکے پر قبضہ کر لیتے تھے۔ اسلام نے اس قانون کو ختم کرنے کے لیے پہلے وصیت کا یہ حکم دیا۔ یہ حکم دو شرطوں کے ساتھ مشروط تھا۔ ایک یہ کہ موت کا وقت جب قریب آ پہنچے تو وصیت کی جائے اور دوسری یہ کہ مرنے والا کچھ مال چھوڑ رہا ہو۔ پھر جب سورۂ النساء میں آیت میراث نازل ہو گئی اور اللہ تعالیٰ نے خود ہی میت کے والدین اور دیگر رشتہ داروں کے حصے مقرر کر دیے تو وارثوں کے حق میں جبری [illegible] وصیت منسوخ ہو گئی اب وراثت پانے والوں کے حق میں وصیت نہیں کی جا سکتی لیکن ترکہ نہ پانے والوں کے حق میں یا دوسرے امور خیر کے لیے وصیت منسوخ نہیں کی گئی ہے جیسا کہ آیت میراث میں کئی جگہ کہا گیا ہے کہ میت کا ترکہ اس کی وصیت پوری کرنے کے بعد تقسیم کیا جائے گا۔ مورث اپنے کتنے مال میں وصیت کر سکتا ہے اس کی مقدار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تہائی مال مقرر کی ہے۔ کوئی مسلمان اپنے ثلث (تہائی) مال سے زیادہ کی وصیت نہیں کر سکتا اور اس پر تمام ائمۂ دین کا اتفاق ہے کہ غیر وارث قرابت مندوں کے لیے تہائی مال میں وصیت کرنا جائز اور بعض حالات میں مستحب ہے۔ بلکہ بعض صحابہ کرامؓ اور متعدد فقہا و علماء سے منقول ہے کہ وہ تہائی مال میں وصیت کو واجب کہتے ہیں۔ تفسیر مظہری میں لکھا ہے کہ زہریؒ، ابوبکر حنبلی اور بعض اصحاب الظواہر سے مروی ہے کہ وہ غیر وارث قرابت داروں کے لیے وصیت کو واجب کہتے تھے۔ ظاہریہ یعنی امام ابوداؤد ظاہری کے پیرووں کا عام مسلک یہ ہے کہ وہ تہائی مال میں وصیت کو فرض قرار دیتے ہیں۔ علامہ ابن حزم نے اپنی کتاب محلّی میں تو یہاں تک لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص وصیت کیے بغیر مر جائے تو اس کا تہائی مال غیر وارث رشتہ داروں میں تقسیم کیا جائے گا۔ تفسیر ابن کثیر میں وصیت کے واجب ہونے کا قول عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، حسن بصریؒ، مسروقؒ، طاؤسؒ، ضحاکؒ، مسلم بن یسار، سعید بن جبیر، علاء بن زیاد، ربیع بن انس اور قتادہ رحمہم اللہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

اس مختصر تفصیل سے بھی معلوم ہوا کہ وصیت کے اس قانون سے ہر اس رشتہ دار کی مالی مدد کی جا سکتی ہے جو میت کے ترکے میں حصہ نہ پا رہا ہو خواہ وہ میت کا یتیم پوتا ہو یا پوتی، نواسہ ہو یا نواسی یا کوئی اور رشتہ دار۔

اگر مسلمانوں نے وصیت کے اس حکم پر عمل کرنا چھوڑ دیا ہے تو اس کی گنجائش بھی موجود ہے کہ

یتیموں کی کفالت بیت المال کے [illegible]

بیت المال میں زکوٰۃ کا جو مال ہوتا ہے نادار یتیم اس کے مستحق قرار دیے گئے۔ اس کے علاوہ خمس میں بھی ان کے حقوق کا حصہ مقرر کیا گیا ہے۔

اور جان رکھو کہ جو مال غنیمت جو کچھ ہو اس میں پانچواں حصہ اللہ، رسول کا، اہل قرابت کا، یتیموں کا اور مسکینوں کا اور مسافروں کا ہے۔ (الانفال: ۴۱)

اس آیت کے علاوہ ذیل کی احادیث بھی اس کی دلیل ہیں کہ یتیم و نادار بچوں کی کفالت بیت المال کے ذمہ ہے:-

"بخاری و مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے کوئی قرض چھوڑا ہو جو اس کے مال سے ادا نہ ہو سکتا ہو یا نادار بچے چھوڑے ہوں تو ان کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔ دوسری روایت میں ہے کہ جس نے مال چھوڑا ہو وہ اس کے وارثوں کا ہے اور جس نے محتاج ذریت چھوڑی ہو تو اس کی ذمہ داری ہم پر ہے۔"[1] احادیث میں "ضیاعاً" اور "کلاً" کے الفاظ ہیں اور کفالت کی ذمہ داری کے لیے کسی حدیث میں "الیّ" کسی حدیث میں "الینا" کسی میں "الی اللہ" اور کسی میں "الی اللہ و رسولہ" کے الفاظ ہیں۔ لفظ "ضیاعاً" کی تشریح ترمذی میں یہ ہے:-

ومعنى من ترك ضياعا يعني عيالا ليس لهم شيء	آپ کے قول میں ضیاعاً سے مراد وہ بچہ ہے جس کے پاس کچھ نہ ہو۔

اور لفظ "الیّ" کی تشریح یہ ہے:-

فالیّ يقول انا اعوله و انفق عليه[2]	حضورؐ کے فرمان "الیّ" کا مطلب یہ ہے کہ میں اس کی کفالت کروں گا اور اس پر خرچ کروں گا۔

---

[1] مشکوٰۃ

[2] ترمذی، کتاب الفرائض

حدیث کے لغت مجمع البحار میں "ضیاع" کے معنے "عیال" لکھے ہیں۔ اسی طرح "کل" کی تشریح بھی ذریت اور عیال سے کی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان مال چھوڑ گیا ہو تو وہ اس کے وارثوں کا ہے اور اگر وہ نادار ذریت چھوڑ کر مرا ہو تو اس کی کفالت میرے ذمے ہے۔

اس حدیث کے پہلے ٹکڑے کا مطلب یہ ہے کہ وراثت کا قانون اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے اس لیے میت کا مال اسی کے مطابق اس کے وارثوں میں تقسیم ہوگا۔ حکومت یا مسلمانوں کے بیت المال کا اس میں کوئی حق نہیں ہے اور دوسرے ٹکڑے کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان نادار ذریت و عیال چھوڑ کر مرا ہو تو ہم اس کے کفیل ہوں گے۔

اس حدیث کے تمام الفاظ کو سامنے رکھنے کے بعد واضح ہو جاتا ہے کہ یہ بات حضور نے اپنی ذاتی و شخصی حیثیت میں نہیں فرمائی تھی بلکہ ایک سربراہ مملکت کی حیثیت سے فرمائی تھی اس لیے مسلمانوں کا بیت المال ذمہ دار ہے کہ ایسے نادار و محتاج بچوں کی کفالت کرے۔

امام بخاری نے یہ حدیث صحیح بخاری کی کتاب النفقات میں بھی درج کی ہے۔ اس کی توجیہ بیان کرتے ہوئے حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں لکھا ہے:

واراد المصنف بادخاله فی	اس حدیث کو ابواب النفقات میں
ابواب النفقات الاشارة الی	درج کر کے مصنف نے یہ اشارہ کیا ہے کہ
ان من مات ولہ اولاد ولم یترک	اگر میت کی اولاد ہو اور ان کے لیے اس
لہم شیئا فان نفقتہم یجب	نے کچھ نہ چھوڑا ہو تو ان کا خرچ مسلمانوں
فی بیت مال المسلمین	کے بیت المال پر واجب ہے۔

یہ ذمہ داری بیت المال پر اس وقت عائد ہوگی جب وہ بچے نادار و محتاج ہوں اور ان کے ایسے رشتہ دار بھی موجود نہ ہوں جن پر ان کی کفالت شرعاً واجب ہوتی ہے۔ محتاج ہونے کی شرط تو خود لفظ ضیاع میں موجود ہے جس کے معنے ہی نادار و محتاج کے ہیں۔ ذمہ دار اہل قرابت کے موجود نہ ہونے کی شرط اسی معنے کی ایک دوسری حدیث میں ہے جس میں آپ نے فرمایا ہے وانا مولی من لا مولی لہ نیز انا وارث من لا وارث لہ یعنی جس کا کوئی حامی و مددگار نہ ہو اس کا حامی و مددگار

میں ہوں اور جس کا کوئی وارث نہ ہو اس کا وارث میں ہوں ۔ یہ الفاظ ابوداؤد کی روایت میں ہیں ۱
ان الفاظ سے دو باتیں واضح ہوئیں ۔ ایک یہ کہ آپ نے جو کچھ فرمایا وہ اپنی شخصی حیثیت میں نہیں فرمایا بلکہ اسلامی حکومت کے ایک ضابطے کے طور پر فرمایا تھا کیونکہ جس کا کوئی وارث نہ ہوتا آپ شخصی طور پر اس کے وارث نہ تھے بلکہ اس کی میراث بیت المال میں داخل کی جاتی تھی اور اب قیامت تک کے لیے یہی ضابطہ ہے ۔ ان الفاظ سے دوسری بات یہ واضح ہوئی کہ جن نادار بچوں کی کفالت کرنے والا اور ان کا وارث بننے والا کوئی نہ ہو انہیں کی ذمہ داری بیت المال پر ہوگی ۔

اس آخری انتظام کے بارے میں بھی اگر کوئی یہ کہے کہ ہندوستان میں مکمل اسلامی شریعت نافذ نہیں ہے اور نہ مسلمانوں کا کوئی سرکاری بیت المال ہے ۔ اس لیے یہ انتظام بھی قابلِ عمل نہیں تو میں عرض کروں گا کہ پھر یہ نہ کہیے کہ قصور اسلامی شریعت کا ہے بلکہ اس کا اعتراف کیجیے کہ قصور ہمارا اور آپ کا ہے ۔ ہم سب کی کوشش کا اصل میدان یہ ہونا چاہیے کہ اس ملک میں ایک ایسی فضا ہموار کی جائے جس میں مکمل اسلامی شریعت نافذ ہو سکے اور دوسری بات میں یہ عرض کروں گا کہ سرکاری بیت المال موجود نہ ہونے کے باوجود مسلمان اگر چاہیں تو ایسا فنڈ قائم کر سکتے ہیں جو نادار یتیم بچوں کی کفالت میں مدد بہم پہنچا سکے ۔

کسی کے صرف یتیم پوتے ہی نہیں، بلکہ ہر یتیم و نادار بچے کی کفالت کے لیے جن شرعی انتظامات کا اس مقالے میں ذکر کیا گیا وہ یہ ہیں :۔

۱۔ قریبی رشتہ داروں پر اپنے خاندان کے نادار و یتیم بچوں کی کفالت واجب ہے ۔
۲۔ قریبی رشتہ دار موجود نہ ہوں تو دور کے رشتہ داروں پر ان کی کفالت واجب ہے ۔
۳۔ وراثت سے محروم بچوں کو اسلام کے قانون وصیت سے مالی مدد پہنچائی جائے ۔
۴۔ آخری چارۂ کار کے طور پر مسلمانوں کا بیت المال ان کی کفالت کا ذمہ دار ہے ۔

مرد کا حقِ طلاق

سیّد احمد قادری

مرد کا حق طلاق بھی مسلم پرسنل لا کے ان مسائل میں ہے جو قرآن و حدیث سے ثابت ہیں اور جن پر پوری امت مسلمہ کا اجماع ہے۔ مرد کے حق طلاق کا مفہوم یہ ہے کہ صرف مرد ہی اپنی بیویوں کو طلاق دے سکتے ہیں، بیویاں اپنے شوہروں کو طلاق نہیں دے سکتیں۔ اس اجماعی مسئلہ پر بھی مستشرقین اعتراض کرتے ہیں۔ اور ان کی تقلید میں ان سے مرعوب مسلمان بھی معترض ہوتے ہیں۔ ان کا ایک اعتراض یہ ہے کہ ایک طرف اسلام، انسانی مساوات کا داعی بنتا ہے اور دوسری طرف صرف مردوں کو طلاق دینے کا حق دیتا ہے، عورتوں کو نہیں دیتا۔ یہ بات مساوات کے خلاف ہے۔ ہم اس اعتراض کے جواب میں کئی باتیں ان کے غور و فکر کے لیے پیش کرتے ہیں:۔

(۱) یہ صحیح ہے کہ اسلام مساواتِ انسانی کا قائل ہے لیکن اس کا مدعا کیا ہے؟ اس کا مدعا یہ ہے کہ وہ نسل نسب، زبان اور رنگ کی بنیاد پر انسانوں کے درمیان تفریق نہیں کرتا۔ کوئی شخص یا گروہ کسی دوسرے شخص اور گروہ کے مقابلے میں محض اس بنا پر اسلام کی نظر میں معزز و مکرم نہیں ہو سکتا اور نہ اس کے کچھ مخصوص حقوق ہو سکتے ہیں، کہ وہ کسی خاص نسل یا نسب یا زبان یا رنگ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی نظر میں دنیا کے تمام انسان ایک انسانی جوڑے۔ آدم و حوا۔ کی ذریت ہیں اس لیے انسان ہونے کی حیثیت سے سب برابر ہیں۔ اسلام کے نظریۂ مساواتِ انسانی کا مدعا یہ نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے کہ انسانوں کے درمیان ان کی صفات، خصوصیات، اخلاق و کردار اور صلاحیتوں کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے اور ان تمام چیزوں کے لحاظ سے بھی سارے انسان برابر ہیں بلکہ اسلام، ایمان اور کفر، توحید اور شرک، تقویٰ اور فسق، نیکوکاری اور بدکاری، حسن خلق اور بداخلاقی، بغاوت اور وفاداری، اطاعت اور نافرمانی کے لحاظ سے انسانوں کے درمیان فرق کرتا ہے۔ اس کے نزدیک مومن اور کافر، متقی اور فاسق

مساوی نہیں ہیں ـــــــــــ اسی طرح مسئلہ زیر بحث میں اسلام کے نظریہ مساوات انسانی کا مدعا یہ نہیں ہے کہ وہ مرد اور عورت کی دو صنفوں کے درمیان جو طبعی اور پیدائشی فرق پائے جاتے ہیں، انھیں تسلیم نہیں کرتا اور وہ دونوں صنفوں کو ہر لحاظ سے مساوی الدرجہ قرار دیتا ہے وہ اس طرح کے مساواتِ انسانی یا مساواتِ مرد وزن کا ہرگز قائل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ان دونوں صنفوں کے درمیان بعض حقوق اور بعض فرائض میں تفریق کی ہے اور ان کی تفصیلات قرآن، احادیث، اجماع اور امت مسلمہ کے تعامل میں موجود ہیں اسی کے ساتھ ساتھ اس نے عورتوں کو انسانی معاشرے میں عزت واحترام کا جو مقام عطا کیا ہے اور انھیں جو حقوق دیئے ہیں وہ اپنی جگہ بے نظیر اور بے مثال ہیں۔ اگر کوئی چاہے تو یہ اعتراض کرسکتا ہے کہ اسلام مردوں اور عورتوں کو ہر لحاظ سے مساوی قرار نہیں دیتا۔ لیکن یہ اعتراض نہیں کرسکتا کہ وہ ایک طرف مساوات انسانی کا مدعی ہے۔ اور دوسری طرف صرف مردوں کو حق طلاق دیتا ہے۔ عورتوں کو نہیں دیتا۔ یہ اعتراض اسلام کے نظریہ مساواتِ انسانی سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔

(۲) معترضین کو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ کیا یورپ کے دانش وروں اور ماہرین قانون نے جو مساوات مرد وزن کا نعرہ لگاتے ہیں اور صرف مردوں کے حق طلاق پر اعتراض کرتے ہیں۔ عورتوں کو طلاق دینے کا حق دے دیا ہے ؟ نہیں دیا ہے ! انھوں نے ان دونوں کے درمیان مساوات پیدا کرنے کی یہ شکل وضع کی ہے کہ مردوں کو بھی حق طلاق چھین کر عدالت کے کسی جج یا منصف کے حوالے کر دیا ہے۔ اسلام پر ان کا اعتراض اس وقت درست ہو سکتا تھا جب وہ عورتوں کو بھی مردوں کی طرح طلاق دینے کا حق دے دیتے لیکن جب انھوں نے ایسا نہیں کیا تو پھر کس منہ سے اسلام پر اعتراض کرتے ہیں ؟۔ پھر یہ کہ انھوں نے مساوات پیدا کرنے کی جو شکل وضع کی ہے اس نے خاندان اور معاشرے سے ظلم وناانصافی اور خرابیوں کو کم نہیں کیا ہے بلکہ بے حد بڑھا دیا ہے۔

(۳) ایک سوال یہ ہے کہ اگر مرد اور عورت کے درمیان ہر لحاظ سے کامل مساوات ہے تو پھر مہر کی ادائیگی اور عورت کے نان ونفقہ کی ذمہ داری صرف مردوں پر کیوں ہے ؟ اسی طرح پیدا ہونے والی اولاد کے اخراجات اور ان کی کفالت کی ذمہ داری مردوں پر کیوں ہے ؟ ان دونوں کے درمیان اس عدم مساوات کے لیے معترضین کے پاس کونسی معقول دلیل ہے ؟ اس کو پیش کرنا چاہیے۔ معترضین نہ صرف اس عدم مساوات کے قائل ہیں بلکہ مرد پر طلاق کی صورت میں بھی یہ ذمہ داری عائد کرتے ہیں کہ وہ مطلقہ عورت کی زندگی بھر کفالت کرے یا کم سے کم اس کے عقد ثانی تک اخراجات برداشت کرے، آخر مردوں پر اس سراسر ظلم کی وجہ کیا ہے ؟ ایک طرف مرد

اور عورت کے درمیان کامل مساوات کا دعویٰ کرنا اور دوسری طرف مرد پر اس ظلم کو روا رکھنا کس منطق کی رو سے صحیح ہے ؟

(۴) اب میں اس غلط اعتراض سے ہٹ کر یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اسلام نے صرف مردوں کو حق طلاق کیوں دیا ہے، عورتوں کو کیوں نہیں دیا ہے۔ اس کی کئی وجہیں ہیں۔ ایک وجہ یہ ہے کہ طبعی اور پیدائشی طور پر مردوں میں صبر و تحمل، بردباری، مصلحت اندیشی اور کسی کام کے انجام پر غور و فکر اور سوجھ بوجھ کی صفات عورتوں کے مقابلہ میں زیادہ ہوتی ہیں، اور یہ بھی کہ وہ مشکلات اور تکلیف دہ حالات کا مقابلہ عورتوں سے زیادہ کر سکتے ہیں، اس لیے طلاق دینے کا حق صرف انھیں کو دیا گیا۔ اگر یہ حق عورتوں کو بھی دے دیا جاتا تو طلاق کی تعداد میں بے حد اضافہ ہو جاتا اور خاندان کی چولیں ڈھیلی ہو جاتیں۔ اس کی ایک دلیل وہ تجربہ بھی ہے جو یورپ اور امریکہ میں ہو رہا ہے۔ حالانکہ وہاں بھی عورتوں کو بطورِ خود طلاق دینے کا حق نہیں ہے۔ اس کے باوجود طلاق کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔ حد یہ ہے کہ وہاں عورتیں اس بنا پر بھی طلاق حاصل کرنے کے لیے مقدمہ دائر کرتی ہیں کہ نیند کی حالت میں ان کے شوہروں کے منہ سے خراٹے کی آواز بلند ہوتی ہے۔ یورپ اور امریکہ میں نکاح اور طلاق ایک مذاق بن کر رہ گئے ہیں۔

مردوں ہی کو حق طلاق دینے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ بیوی کے مہر، اس کے نان و نفقہ اور گھر کے اخراجات کی ذمے داری صرف انھیں پر ہے۔ ان کی بیویوں پر نہیں ہے۔ اگر عورت کو طلاق دینے کا حق دے دیا جاتا تو محض معمولی باتوں پر مشتعل ہو کر وہ اپنے شوہر کو طلاق دے ڈالتی اور مزے سے مہر کی رقم اور شوہر کی ہبہ ہوئی قیمتی اشیاء لے کر رخصت ہو جاتی۔ شوہر کو مہر بھی دینا پڑتا، عدت کی مدت میں عورت کے اخراجات بھی برداشت کرنے پڑتے اور عورت کو تحفتہً دی ہوئی اشیاء اور دوسرے سامان کا نقصان بھی اٹھانا پڑتا۔ اس کے برعکس عورت سب کچھ لے کر چلی جاتی اور عقد ثانی کر کے نئے مہر اور نئے سامان کی مالک بنتی۔ ظاہر ہے کہ یہ بات مرد پر ظلم و زیادتی ہوتی اور اسلام اس کو کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ کیونکہ وہ دونوں کے ساتھ انصاف کرتا ہے۔ اس کے احکام یکطرفہ نہیں ہوتے ——— مرد جب اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے تو ان تمام نقصانات کو سامنے رکھ کر دیتا ہے اور یہ عام طور سے اسی وقت ہوتا ہے جب وہ اپنی بیوی کی بد مزاجی اور شرارتوں سے عاجز آ جاتا ہے۔

تیسری وجہ ہے اور یہی وجہ اللہ تعالیٰ کے علم و حکمت پر ایمان رکھنے والوں کے لیے کافی ہے کہ مرد کو حق طلاق اور عورت کو حق خلع اس علیم و حکیم ہستی نے عطا فرمایا ہے جو ان دونوں صنفوں کے مصالح کا علم رکھتا ہے اور جس

کے علم و حکمت میں کسی نقص اور کمی کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔

ایک اور اعتراض

بعض مغرب زدہ مسلمان، اسلام کے قانونِ طلاق پر یہ اعتراض بھی کرتے ہیں کہ اسلامی شریعت نے مرد کو بلا وجہ طلاق دینے کا حق بھی دے دیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مرد بغیر کسی وجہ کے اپنی بیویوں کو تین طلاقیں دے کر ان کی زندگیاں برباد کر دیتے ہیں۔ اسی طرح کے ایک مقدمہ کا فیصلہ کرتے وقت ایک نام نہاد مسلمان جج صاحب آپے سے باہر ہو گئے اور انھوں نے مرد کے حقِ طلاق کو اپنے فیصلے میں وحشیانہ قرار دیا اور اس پر پابندی لگانے کی رائے پیش کی ہے۔ اس اعتراض کے جواب میں بھی کئی باتیں عرض کرتا ہوں:

(۱) قرآن اور احادیث کے مطالعے سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی شریعت نے طلاق کو آخری چارۂ کار کے طور پر استعمال کرنے کی ترغیب دی ہے اور حدیثِ رسولؐ میں طلاق کو ابغض المباحات یعنی جائز چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح اسلامی شریعت نے بیک وقت تین طلاقیں دینے کو گناہ قرار دیا ہے۔ اگر یہ صحیح ہو کہ کچھ لوگ اپنی بیویوں کو بلا وجہ طلاق دیتے ہیں تو وہ اپنے حق و اختیار کا بے جا استعمال کرتے ہیں اور جو لوگ بیک مجلس تین طلاقیں دے ڈالتے ہیں وہ معصیت کے مرتکب ہوتے ہیں اس لیے اسلامی شریعت پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔

(۲) یہ دعویٰ خود قابلِ تحقیق ہے کہ لوگ اپنی بیویوں کو بلا وجہ بھی طلاق دیتے ہیں۔ بلا وجہ طلاق دینا ایک بات ہے، اور طلاق کی وجہ نہ بتانا دوسری بات ہے۔ میاں بیوی کے تعلقات کی جو نوعیت ہے اس کے لحاظ سے بعض اوقات طلاق کی وجہ نہ بتانا صرف یہی نہیں کہ معقول ہو سکتا ہے بلکہ شریفانہ طرزِ عمل یہی ہو سکتا ہے کہ طلاق کی وجہ نہ بتائی جائے۔ ہو سکتا ہے کہ طلاق کی وجہ نہ بتانے کو بلا وجہ طلاق سمجھ لیا گیا ہو۔ اس کے علاوہ طلاق کے بعض اسباب ایسے ہو سکتے ہیں کہ تجدد پسند لوگ اسے سبب قرار نہ دیں حالانکہ وہ شرعاً طلاق کا ایک صحیح سبب ہو، مثلاً کوئی عورت پنج وقتہ نماز نہ پڑھتی ہو اور شوہر کی کوشش کے باوجود اس کے لیے آمادہ نہ ہو تو شرعاً اس سے علاحدگی حاصل کرنے کی پوری گنجائش موجود ہے۔

(۳) بیک وقت تین طلاقیں دے ڈالنے کے جو کچھ واقعات پیش آتے ہیں ان کی بڑی وجہ جہالت اور ناواقفی ہے۔ ناخواندہ لوگ جانتے ہی نہیں ہیں کہ طلاق دینے کا صحیح طریقہ کیا ہے بلکہ یہ تصور عام ہو گیا ہے کہ کم سے کم

تین بار طلاق کا لفظ بولے بغیر طلاق واقع ہی نہیں ہوتی۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ مسلمانوں میں بعض ایسے وکیل بھی پائے جاتے ہیں جو اپنے موکل کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ طلاق دینا ہی ہو تو تین طلاقیں دو، ایک طلاق دینے کا کیا فائدہ؟ بیک وقت طلاق دینے کی دوسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ طلاق دینے والے غصے کی حالت میں طلاق دیتے ہیں اور اپنی زبان پر قابو نہیں رکھتے وہ طلاق طلاق طلاق کی گردان شروع کر دیتے ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے غصے سے بے قابو ہو کر لوگ قتل تک کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں۔

(۴) سوال یہ ہے کہ جہالت کی وجہ سے یا غصے کی حالت میں بیک وقت تین طلاقوں کے تکلیف دہ اور بعض حالات میں تباہ کن واقعات پیش آتے ہیں خواہ ان کا فیصد تناسب کتنا ہی کم کیوں نہ ہو اس کے تدارک کی کیا تدبیر ہو؟

______ اس کی ایک تدبیر وہ ہے جس کی وکالت یورپ کے قانون سے مرعوب مسلمان قانون دان اور تجدد پسند حضرات کرتے ہیں، یعنی یہ کہ مرد سے طلاق دینے کا حق و اختیار سلب کر لیا جائے اور اس پر پابندی عاید کر دی جائے وہ کسی جج یا مصالحتی بورڈ کی اجازت کے بغیر طلاق دے ہی نہ سکے۔ یہ تدبیر کئی وجوہ سے بالکل غلط اور مسلمانوں کے لیے ناقابل قبول ہے:۔

(الف) اگر بعض افراد اپنے حق و اختیار کا غلط استعمال کرتے ہیں تو ان کے بے جا استعمال کی وجہ سے خود اس حق و اختیار کو قابلِ مذمت قرار دینا اور تمام افراد سے اس حق و اختیار کو سلب کر لینا بالکل غلط اور انتہائی نامعقول بات ہے۔ اور دنیا میں کوئی بھی نہ اسے صحیح سمجھتا ہے اور نہ اس پر عمل کرتا ہے۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں انسانوں کو بہت سے حقوق و اختیارات حاصل ہیں لیکن کم ہی ایسے لوگ ہیں جو ان حقوق و اختیارات کو ہمیشہ صحیح طور پر استعمال کرتے ہوں اور کبھی ان کا بے جا استعمال نہ کرتے ہوں۔ ججوں سے لے کر ان کے چپراسیوں تک اور وزرائے اعلیٰ سے لے کر ان کے کلرکوں تک کتنے ایسے ہیں جو اپنے اختیارات کو بے جا استعمال نہیں کرتے؟ ______ نام کے مسلمان وہ جج صاحب جنہوں نے اسلامی شریعت کے قانون طلاق کو وحشیانہ قرار دے کر اس پر پابندی عائد کرنے کی رائے دی ہے۔ کیا کبھی انھوں نے اپنے اختیارات کو بے جا استعمال نہیں کیا ہے۔ بے جا استعمال کی ایک مثال تو یہی ہے کہ انھوں نے اپنے فیصلے میں شریعت کے ایک قانون کو وحشیانہ قرار دیا ہے۔ یہ اپنے اختیار کو بے جا استعمال کرنے کی گھناؤنی مثال ہے۔ تو کیا وہ جج صاحب اس پر راضی ہیں کہ صرف ان کے ہی نہیں بلکہ تمام ججوں کے اختیارات چھین لیے جائیں؟ اگر حقوق و اختیارات کو بے جا استعمال کرنے کی وجہ سے انھیں چھینا شروع کیا جائے تو دنیا میں شاید ہی کسی کے پاس کوئی حق و اختیار باقی رہے۔

(ب) مردوں سے حقِ طلاق چھین لینے کا مقصد یہ بتایا جاتا ہے کہ اس سے طلاقوں کی تعداد کم ہو گی اس کا فی صد تناسب گھٹے گا اور بہت سے گھر برباد ہونے سے بچ جائیں گے اس لیے طلاق کا معاملہ عدالت کے حوالہ کر دینا چاہیے۔ مرد یا عورت جو بھی طلاق کی ضرورت محسوس کرے اور ان میں سے جو بھی اپنے شوہر یا اپنی بیوی سے علیحدگی حاصل کرنا چاہے وہ عدالت کے پاس جائے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ یہ تدبیر اپنے مقصد میں سخت ناکام ہے۔ یورپ اور امریکہ یا جہاں کہیں بھی یہ قانون نافذ کیا گیا ہے وہاں طلاقوں کی تعداد کم ہونے اور ان کا فیصد تناسب گھٹنے کے بجائے بے حد بڑھ گیا ہے اور بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ بے شمار گھر برباد ہو رہے ہیں اور خاندانوں کا شیرازہ منتشر ہوتا جا رہا ہے۔ اور اب وہاں خصوصیت کے ساتھ عورتیں نکاح ہی سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ ابھی حال میں ایک رپورٹ شائع ہوئی ہے جو برطانیہ کے محکمۂ اعداد و شمار نے مرتب کی ہے یہ رپورٹ ۱۹۷۱ء سے ۱۹۸۰ء تک دس برسوں کی ہے۔ اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ برطانیہ میں وہ شادیاں جو طلاق پر ختم ہوئیں ان کی تعداد دس برسوں میں ۱۵ ہزار سے بڑھ کر ۷۰ ہزار ہو چکی ہے۔ طلاق میں یہ اضافہ نتیجہ ہے اس "قانونی اصلاح" کا جو طلاق کے معاملے میں کی گئی ہے۔ اس کے برعکس مسلمان جس ملک میں بھی آباد ہیں ان کے معاشرے میں طلاق کا فی صد تناسب یورپ اور امریکہ سے بہت کم ہے۔

جو لوگ اسلام کے قانونِ طلاق میں "اصلاح" کر کے اسے یورپ کے قانونِ طلاق کے مطابق کرنا چاہتے ہیں وہ یہ سب کچھ پڑھتے اور دیکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کو اسلام کے قانونِ طلاق و خلع کو ناقص، فرسودہ، یہاں تک کہ وحشیانہ کہتے ہوئے بھی شرم نہیں آتی۔ یہ مسلمان معاشرے اور مسلمان عورتوں کے ساتھ ہمدردی نہیں بلکہ کھلم کھلا دشمنی ہے۔

(ج) مسلمان اس تدبیر کو اس لیے بھی قبول نہیں کر سکتے کہ مردوں کو طلاق کا حق اور عورتوں کو خلع کا حق ان کے سپریم کورٹ۔ اللہ تعالیٰ۔ نے دیا ہے۔ کسی انسان کو اس کا اختیار نہیں کہ اسے چھین لے۔

(۵) بیک وقت تین طلاقیں دے کر جو لوگ معصیت کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اس کے تدارک کے لیے اسلامی اصولوں کی روشنی میں ذیل کی تدابیر اختیار کی جانی چاہئیں۔

(الف) جس طرح عام مسلمانوں کو نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے مسائل بتانے اور سمجھانے کے لیے مختلف ذرائع استعمال کیے جاتے ہیں۔ مثلاً وعظ کی مجلس، اخبارات و رسائل، کتابیں، چھوٹے کتابچے اور دو ورقے، ——— ٹھیک اسی طرح مسلمان مردوں اور عورتوں کو طلاق اور خلع کے مسائل سمجھانے اور بتانے کے لیے

ان حرام ذرائع کو استعمال کرنا چاہئے۔ مسلمانوں کے درمیان یہ علم پوری طرح پھیلا دینا چاہیے کہ بیک وقت تین طلاقیں دے ڈالنا گناہ ہے اور اللہ و رسول کے نزدیک سخت ناپسندیدہ حرکت ہے۔ اس لیے ہر مسلمان کو اس گناہ سے بچنا چاہیے۔ ان کو بتانا چاہیے کہ ایک طلاق سے بھی علیحدگی ہو سکتی ہے اور ہو جاتی ہے اس لیے بیک وقت تین طلاقیں دے ڈالنا بڑے درجے کی حماقت بھی ہے جس کا خمیازہ صرف میاں بیوی ہی کو نہیں بلکہ ان کے خاندانوں کو بھی بھگتنا پڑتا ہے۔

(ب) اسلامی شریعت نے زوجین (میاں بیوی) کے جو حقوق متعین کیے ہیں ان کا علم بھی ناخواندہ یا کم پڑھے لکھے مسلمانوں کو بہت کم ہے۔ اسے بھی پھیلانے کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر مردوں کو یہ بتانا چاہیے کہ بیوی کی حیثیت لونڈی اور خادمہ کی نہیں ہے، اور عورتوں کو بتانا چاہیے کہ شریعت نے جائز امور میں شوہر کی اطاعت واجب کی ہے۔ ان کو شوہر کا احترام ملحوظ رکھنا چاہیے۔ شوہر سے گستاخی اور زبان درازی بہت ناپسندیدہ بات ہے ان کی بدمزاجی اور زبان درازی لبا اوقات طلاق کا سبب بن جاتی ہے۔

جس طرح نماز روزے کی تبلیغ کی جاتی ہے اگر ان باتوں کی تبلیغ بھی کی جاتی رہے تو مجھے یقین ہے کہ مسلمانوں میں طلاق کی تعداد، موجودہ تعداد سے بھی کم ہو جائے گی۔

(ج) اسلامی تعزیرات کے اصول کو سامنے رکھ کر بیک وقت تین طلاقیں دینے والے مردوں کے لیے کوئی جسمانی یا مالی سزا بھی تجویز کی جا سکتی ہے۔

(د) علمائے احناف اس پر بھی غور کر سکتے ہیں کہ مسئلہ طلاق سے ناواقفیت کی حالت میں دی ہوئی تین طلاقیں، ایک شمار کی جا سکتی ہیں یا نہیں۔ اس تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ اسلامی قانونِ طلاق کو بدل ڈالنے کے بجائے، صحیح طور پر اس کے نفاذ کی کوشش کی جانی چاہئے۔

عدّت کے درمیان نکاح حرام ہے

اور عقدِ نکاح باندھنے کا فیصلہ اس وقت تک نہ کرو جب تک کہ عدت پوری نہ ہو جائے خوب سمجھ لو کہ اللہ تمہارے دلوں کا حال تک جانتا ہے، لہٰذا اس سے ڈرو۔

(البقرہ: ۲۳۵)

تعدّدِ ازدواج

چند سوالات اور اُن کے جوابات

(سید احمد قادری)

اسلامی ریسرچ سرکل مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے زیرِ اہتمام ۱۴ - ۱۵ ستمبر ۱۹۶۸ء کو مسلم پرسنل لا کے موضوع پر ایک سنجیدہ اور باوقار سمینار منعقد ہوا تھا اور یونیورسٹی یونین ہال میں اس کی متعدد نشستیں ہوئی تھیں۔ یہ مقالہ اسی سمینار میں پڑھا گیا تھا۔

مسلم پرسنل لا کے جس معاشرتی قانون پر سب سے زیادہ اعتراضات کیے جاتے ہیں وہ تعدّدِ ازدواج کی اجازت کا قانون ہے۔ آج سے دس بیس سال پہلے اس پر اعتراض کی نوعیت یہ تھی کہ اس کو رجعت پسندی اور ہوس رانی کا نام دیا جاتا تھا۔ عام طور سے مستشرقین اور عیسائی پادریوں نے اس کی ایسی شرمناک تصویر کشی کی تھی کہ جدید تعلیم یافتہ مسلمان اس کو پڑھ کر ندامت سے سر جھکا لیتے تھے لیکن خود یورپ کے معاشرے (جہاں یک زوجگی کا قانون رائج ہے) کی تباہ حالی اور تعدّدِ ازدواج پر اعتراض کے معقول جوابات سے جلد ہی یہ طلسم ٹوٹنے لگا۔ یہ دیکھ کر مستشرقین اور ان سے متاثر افراد نے اپنے اعتراض اور حملے کا انداز بدل دیا۔ اب قرآن کی متعلقہ آیتوں کی بالکل نئی اور نرالی تعبیر و تشریح کی جارہی ہے اور تعدّدِ ازدواج کی اجازت کو ایسی شرط کے ساتھ مشروط کیا جارہا ہے جس کا وجود نہ قرآن میں ہے، نہ احادیث میں، نہ فقہ میں اور نہ چودہ سو سالہ تعامل میں۔

اب جس طرح اس مسئلے پر گفتگو کی جارہی ہے وہ ذیل کے چار سوالات سے ظاہر ہے۔ یہی سوالات الفاظ بدل بدل کر پیش کیے جاتے ہیں۔ اگر ان سوالات کے قابلِ فہم اور معقول جوابات دے دیے جائیں

تو اس مسئلے کی نوعیت اور اس کی شرعی اہمیت آپ سے آپ واضح ہو جائے گی۔ میں نے اس سیمینار کے لیے بھی مختصر طریقہ اختیار کرنا مناسب سمجھا ہے وہ چار سوالات یہ ہیں۔

چار سوالات

۱۔ سورۃ النساء کی آیت ۳ آیت ۲ کے بعد ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آیت ۳ بھی یتیموں ہی سے متعلق ہے۔ آیت ۳ کو اس روشنی میں پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ "نکاح کرو اپنی پسندیدہ عورتوں سے دو یا تین یا چار" کا تعلق بھی اسی طور سے یتیم عورتوں ہی سے ہے اس لیے غیر یتیم عورتوں کو اس میں داخل کرنا ٹھیک نہیں معلوم ہوتا بہتر یہ ہے کہ اس آیت کے بجائے کوئی ایسی آیت پیش کی جائے جو واضح طور پر عام عورتوں کے بارے میں ہو۔

۲۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ جنگ میں بہت سے مسلمان مرد شہید ہو گئے تھے اور ان کی یتیم لڑکیوں اور بیواؤں کا مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ اسی لیے اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے ان یتیم لڑکیوں اور بیواؤں سے چار تک شادی کی اجازت دی گئی تھی۔ تعدد ازدواج کی عام اجازت نہ تھی۔

۳۔ اس آیت میں عدل کے معنے کیا ہیں؟ اس کے معنے "زن و شوہر کے فرائض" بیان کرنا جیسا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں۔ خاص عدالتی معاملات میں کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا۔ اس کے بارے میں کیا کچھ اور متعین باتیں کہی گئی ہیں۔

۴۔ مساوی حقوق کا مطالبہ کرنے والی عورتوں کا مطالبہ یہ ہے کہ ان کو بھی دو یا دو سے زیادہ شوہروں سے نکاح کا حق ملنا چاہیے۔ ان عورتوں کے لیے ہمارے پاس کیا جواب ہے؟ کیا مسلمان عورتیں یہ مطالبہ کر سکتی ہیں؟

ان سوالات کے جوابات سے پہلے چند اصولی باتیں پیش کرنا انتہائی ضروری ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان اصولی باتوں کو نہ جاننے یا پیش نظر نہ رکھنے کی وجہ سے ان لوگوں کی سمجھ میں بھی بات نہیں آتی جو خلوص کے ساتھ اس مسئلے کی شرعی حیثیت سمجھنا چاہتے ہیں۔

قرآن فہمی کے چند اہم اصول

ایک مخلص مسلمان کے لیے قرآن حکیم کی آیتوں کے صحیح معنے و مفہوم اور ان سے ثابت شدہ احکام کو جاننے کے لیے جن اصولی باتوں کو تسلیم کرنا ضروری ہے وہ یہ ہیں۔

۱۔ قرآن کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جو لکھی لکھائی ایک بار دنیا میں نازل کر دی گئی ہو بلکہ ۲۳ سال کی مدت میں اللہ کے آخری رسول سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر تھوڑا تھوڑا اور رفتہ رفتہ حسب موقع بتدریج نازل ہوتی رہی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ آیات کے پس منظر اور مواقع نزول کی تحقیق کر لی جائے۔

۲۔ رسول خدا کے ذمے صرف یہی کام نہ تھا کہ آپ لوگوں کو قرآن کی آیتیں پڑھ کر سنا دیں بلکہ اللہ کی طرف سے آپ اس بات کے بھی ذمہ دار تھے کہ نازل شدہ احکام و قوانین کی اپنے قول و عمل سے تشریح کریں اور اس لحاظ سے آپ کی حیثیت آخری اتھارٹی کی تھی کسی شخص کے لیے نہ شرعاً جائز ہے اور نہ عقلاً کہ وہ آپ کے عمل اور آپ کی توضیح سے ہٹ کر کسی آیت کے معنی و مفہوم یا کسی عمل کی تعیین کرے۔

۳۔ آپ کے بعد صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تشریح و توضیح کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ اس کو نظر انداز کرنا کسی طرح صحیح نہیں۔ قرآن ان کی زبان میں نازل ہوا ہے اور انھوں نے براہ راست حضور سے تعلیم حاصل کی اور حضور کی تربیت و نگرانی میں قرآن کے احکام پر عمل کیا۔ وہ قرآن کے مخاطب اول تھے اور یہ بات بالکل غلط ہوگی کہ ان کے عمل اور ان کی تشریح و توضیح کو پس پشت ڈال دیا جائے۔

۴۔ صحابۂ کرام رضی کے بعد جن لوگوں نے قرآن و حدیث اور اسلامی قانون کا علم حاصل کرنے میں اپنی زندگیاں کھپائیں اور اس میں مہارت حاصل کی ہے ان کی تفسیروں، تشریحوں اور آراء کا اتباع کرنا ضروری ہے۔ ہر معقول آدمی تسلیم کرتا ہے کہ کسی قانونی مسئلے میں اسی شخص کی رائے معتبر ہوگی جو اس قانون کا علم اور اس میں مہارت رکھتا ہو۔ ظاہر ہے کہ قرآن کا قانون اس سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔

۵۔ قرآن میں متعدد احکام ایسے بھی ہیں جن کی حیثیت جدید احکام کی نہیں ہے بلکہ صرف اصلاح کی ہے یعنی پہلے سے جو احکام رائج تھے قرآن نے ان میں اصلاحات کر دی ہیں اور غلط آمیزشوں سے انہیں پاک کر دیا ہے۔

۶۔ اوپر کے اصولوں سے یہ بات آپ سے آپ نکلتی ہے کہ قرآن کوئی ایسی کتاب نہیں ہے

کو جن کے احکام و قوانین کی اب تک توضیح نہ ہوئی ہو یا جن پر عمل نہ کیا گیا ہو بلکہ یہ کتاب اپنے پیچھے ایک لمبی اسلامی تاریخ رکھتی ہے۔ اس کتاب میں صراحتہً جن احکام و قوانین کا ذکر ہے ان کی توضیح اور عملی تطبیق و تعیین عہد رسالت ہی میں مکمل ہو چکی ہے اور بہت سے احکام ایسے ہیں جو ہمیشہ سے اجماعی اور مسلمہ چلے آ رہے ہیں۔

ان چار اصولوں میں سے کوئی ایک اصل بھی ایسی نہیں ہے جو غیر معقول اور ناقابل فہم ہو۔ انہیں اصولوں کی روشنی میں ہم مذکورہ بالا سوالات کے مختصر جوابات پیش کر رہے ہیں۔

پہلے سوال کا جواب

سورۂ النساء کی آیت ۲ میں جو کچھ کہا گیا ہے، اس کا ترجمہ یہ ہے:۔

"یتیموں کے مال ان کو واپس کر دو۔ اچھے مال کو برے مال سے نہ بدلو اور ان کے مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھا جاؤ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔"

اس آیت کے بعد زیر بحث آیت ۳ ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:۔

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا	اور اگر تم یتیموں کے ساتھ بے انصافی
فِی الْیَتَامٰی فَانْکِحُوْا مَا	کرنے سے ڈرتے ہو تو جو عورتیں تم کو پسند
طَابَ لَکُمْ مِنَ النِّسَاءِ	آئیں ان میں سے دو دو تین تین چار چار سے
مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَاِنْ	نکاح کر لو لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ان کے
خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَۃً	ساتھ عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی
اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ	کرو، یا ان عورتوں کو زوجیت میں لاؤ جو
ذٰلِکَ اَدْنٰی اَلَّا تَعُوْلُوْا	تمہارے قبضے میں آئی ہیں بے انصافی سے
(النساء، آیت ۳)	بچنے کے لیے یہ زیادہ قرین صواب ہے

اس آیت میں بیان کردہ تعدد ازدواج کے مسئلے کو صحیح طور پر نہ سمجھنے والوں کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ اس کو تعدد ازدواج کے جواز کی دلیل سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ اصلاً پہلے سے جائز تعدد ازدواج کو چار عورتوں تک محدود کر دینے کی دلیل ہے۔ یہ ایک ثابت شدہ تاریخی حقیقت ہے کہ عرب میں ہمیشہ سے تعدد ازدواج کا قانون رائج تھا اور وہاں کے باشندے بیک وقت چار سے زیادہ شادیاں

بھی کرتے تھے کسی کسی کے پاس تو بیک وقت آٹھ آٹھ دس دس نکاحی بیویاں ہوا کرتی تھیں۔ یہ
ان کے نزدیک عیب کی نہیں بلکہ فخر کی بات سمجھی جاتی تھی۔ البتہ اس پر عمل کرنے میں ان کے اندر دو
بہت بڑی خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ ایک یہ کہ وہ بیویوں کے درمیان عدل نہیں کرتے تھے اور دوسری
یہ کہ جب کثیر التعداد بیویوں کا خرچ ان سے نہیں چلتا تھا تو اپنے زیر سرپرستی یتیم بچوں اور بچیوں
کے مال پر دست درازی کرنے لگتے تھے۔ اس کے علاوہ یتیم بچیوں پر ظلم ڈھانے کے کچھ اور طریقے بھی
انھوں نے ایجاد کر لیے تھے سورۃ النساء کی اس آیت نے تعدد ازدواج کے جائز حق اور رائج قانون
میں دو بنیادی اصلاحیں کر دیں۔ ایک اصلاح یہ کی کہ تعدد ازدواج کو چار میں محدود کر دیا۔ اب کوئی
مسلمان بیک وقت چار سے زیادہ بیویاں نہیں رکھ سکتا تھا، دوسری اصلاح اس نے یہ کی کہ اس
نے بیویوں کے درمیان عدل کرنے کی کڑی شرط لگا دی۔

ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ کوئی آسمانی شریعت ایسی نہیں ہے جس میں تعددِ ازدواج کی اجازت نہ ہو
سب کو معلوم ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیک وقت دو بیویاں تھیں۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ
حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کے پاس بیک وقت ایک سے زائد بیویاں تھیں۔ اس سے معلوم
ہوا کہ عرب میں تعددِ ازدواج کا جو قانون رائج تھا وہ ان کا اپنا من گھڑت نہ تھا بلکہ آسمانی شریعت
سے ماخوذ تھا البتہ اس میں انھوں نے خرابیاں پیدا کر دی تھیں اسلامی شریعت نے ان کو ختم کر کے
اس کی اصلاح کر دی۔

اس حقیقت کو سامنے رکھنے کے بعد سوال نمبر ۱ کا جواب معلوم کر لینا مشکل نہیں ہے۔ اس سوال کا جواب
معلوم کر لینا مشکل نہیں ہے۔ اس سوال کا حاصل یہ ہے کہ سائل کے نزدیک یہ آیت صرف یتیم عورتوں سے
متعلق ہے اور چونکہ اس آیت کو وہ تعدد ازدواج کے جواز کی دلیل بھی سمجھتے ہیں اس لیے ان کے نزدیک
تعدد ازدواج کا حکم صرف یتیم عورتوں سے متعلق ہو جاتا ہے۔ عام عورتوں سے اس کا تعلق باقی نہیں
رہتا۔ اسی لیے انھوں نے عام عورتوں سے بیک وقت متعدد نکاح کے جواز کے لیے کسی دوسری آیت
کا حوالہ طلب کیا ہے۔

اوپر کی تفصیل سے یہ معلوم ہو چکا کہ اس آیت کو تعددِ ازدواج کے جواز کی دلیل سمجھنا غلط ہے
یہ آیت اس کو جائز کرنے کے لیے نہیں اتری بلکہ جواز کو محدود کرنے کے لیے نازل ہوئی ہے جو چیز

پہلے سے جائز ہوا اور اس کو ناجائز نہ قرار دیا گیا ہو اس کے جواز کی دلیل طلب کرنا کہیں سے صحیح ہے سائل کا یہ سمجھنا بھی صحیح نہیں ہے کہ آیت صرف یتیم عورتوں سے متعلق ہے۔ ہم آگے اس کی تفصیل پیش کر رہے ہیں اور اگر تھوڑی دیر کے لیے اس کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوگا کہ یتیم لڑکیوں سے نکاح کرنے کے ضمن میں تعدد ازدواج کی تحدید کا حکم نازل ہوا ہے اس سے اصل مسئلے پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اس آیت کے حکم میں عام عورتیں داخل نہیں ہیں تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ چار تک کی پابندی صرف یتیم لڑکیوں کے ساتھ مخصوص ہو جائے گی۔ عام عورتوں کے بارے میں کوئی پابندی عائد نہ ہوگی۔ عام عورتوں سے بیک وقت چار سے بھی زیادہ نکاح کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ ہم مطالبہ کریں گے کہ وہ قرآن کی کسی ایسی آیت کا حوالہ دیں جو عام عورتوں سے نکاح پر چار کی پابندی عائد کرتی ہو یا کسی ایسی آیت کا حوالہ دیں جس میں عام عورتوں سے بیک وقت ایک سے زیادہ نکاح کرنا جائز قرار دیا گیا ہو۔ کیا قرآن میں ایسی آیتیں موجود ہیں؟

صحیح بات یہی ہے کہ یہ آیت پہلے سے جائز تعدد ازواج کی تحدید اور اس کو عدل کے ساتھ مشروط کرنے کے لیے نازل ہوئی تھی عام ازیں کہ متعدد نکاح یتیم لڑکیوں سے کیے جائیں یا عام عورتوں سے۔ یہی اس آیت کا اصل مقصود ہے۔

مزید وضاحت کے لیے میں یہاں ایک اور حکم کی مثال پیش کرتا ہوں جس کا نکاح سے لازمی تعلق اور تعدد ازواج کے حکم سے اس کو قریبی مشابہت حاصل ہے۔ سورۂ البقرہ کی آیت ۲۲۹ کو سامنے رکھیے اس کا پہلا ٹکڑا یہ ہے:۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمْسَاكٌ	طلاق دو بار ہے، پھر یا تو دستور کے
بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ	مطابق بیوی کو روک لیا جائے یا اچھے طریقے
بِاِحْسَانٍ	سے اس کو رخصت کر دیا جائے۔

سوال یہ ہے کہ کیا یہ آیت جواز طلاق کی دلیل ہے؟ اگر کوئی شخص سمجھے کہ اصلاً و بالذات یہ طلاق کو جائز قرار دینے کے لیے اتری تھی تو وہ غلط سمجھے گا۔ صحیح بات یہ ہے کہ طلاق کا قاعدہ بھی تعدد ازواج کی طرح عرب میں رائج تھا اور اسی کی طرح غیر محدود بھی تھا۔ وہاں کے لوگ جس بیوی سے ناخوش

پہ جاتے اس کو طلاق دیتے رہتے اور رجوع کرتے رہتے، اس کی کوئی تعداد مقرر نہ تھی اس طرح اس بیوی سے نہ خود تعلق قائم رکھتے اور نہ اسے آزاد کرتے کہ وہ کسی دوسرے سے نکاح کرسکے وہ ان کے پھندے میں پھنسی تڑپتی رہتی۔ قرآن کی اس آیت نے رجعی طلاق کی تعداد مقرر کرکے ظلم کا یہ دروازہ بند کر دیا۔ اس نے حکم دیا کہ رجعی طلاق صرف دو بار ہے اور اس کے بعد کی آیت ۲۳۰ نے بتایا کہ تیسری طلاق کے بعد رجوع کا حق ختم ہوجائے گا۔ طلاق کی تعداد صرف تین تک محدود کردی گئی۔ مفسر ابن کثیر نے ابن جریر، ابوداؤد، نسائی، ترمذی اور دوسرے محدثین کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ۔

ابتدائے اسلام میں طلاق کا معاملہ یہ تھا کہ کوئی شخص جس قدر چاہتا طلاق دیتا اور پھر عدت کے درمیان رجوع کرلیتا۔ چنانچہ قبیلۂ انصار کے ایک شخص نے غصے میں اپنی بیوی سے کہا کہ میں نہ تیرے ساتھ رات بسر کروں گا اور نہ تجھے آزاد کروں گا۔ تجھے طلاق دوں گا اور عدت میں رجوع کرلوں گا اور اسی طرح کرتا رہا ہوں گا ان کی بیوی فریاد لیکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئیں اور اس کی خبر دی اس کے بعد سورۂ البقرہ کی آیت الطلاق مرّتان نازل ہوئی۔ اللہ نے رجعی طلاق کی تعداد دو تک محدود کردی اور تیسری طلاق کے بعد رجوع کرنے کا حق ختم کردیا۔[1]

اس سے معلوم ہوا کہ عرب میں غیر محدود طلاق کا جو قاعدہ رائج تھا قرآن کی اس آیت نے اس میں اصلاح کردی۔ ٹھیک یہی معاملہ تعدد ازدواج کا بھی ہے۔ میں نے اس کو پھیلا کر اس لیے لکھا ہے کہ جو لوگ سورۂ النساء کی آیت ۳ کے بارے میں یہ سمجھتے ہیں کہ وہ تعدد ازدواج کی اجازت دینے کے لیے نازل ہوئی تھی ان کی غلط فہمی دور ہوجائے

آیت کی مستند تفسیریں

اب ہم یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ساڑھے تیرہ سو برس تک کسی ایک شارح قرآن اور عالم دین نے بھی اس آیت کو صرف یتیم لڑکیوں کے ساتھ مخصوص نہیں کیا ہے اور نہ وہ ایسا کرسکتے تھے اس آیت کی صرف تین تفسیریں ایسی ہیں جن کو قدیم مفسرین نے ترجیح دی ہے۔ ایک تفسیر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے ان سے ان کے بھانجے حضرت عروہ بن الزبیر نے اس آیت کی تفسیر پوچھی تھی، جواب میں انھوں نے فرمایا:۔

---

[1] اسمٰعیل بن کثیر متوفی ۷۷۴ھ تفسیر القرآن العظیم جلد ۱ صفحہ ۲۷۳ مطبوعہ مصر

اے بھانجے! یہ اس یتیم لڑکی کے بارے میں ہدایت ہے جو اپنے ولی (جن سے نکاح جائز ہو مثلاً چچا زاد بھائی) کی نگرانی میں ہوتی تھی وہ اس کے مال میں شریک ہوتا تھا پھر اس لڑکی کے مال و جمال کی طرف رغبت ہوتی تھی اور وہ اس سے نکاح کرنا چاہتا تھا لیکن اس کا مہر ادا کرنے میں انصاف نہیں کرتا تھا اور اس کو اتنا مہر نہیں دیتا تھا جتنا کوئی دوسرا شخص دیتا تو اس آیت نے اس ظلم سے روک دیا اور ان پر پابندی عائد کی کہ وہ ان یتیم لڑکیوں سے اس شرط کے ساتھ نکاح کر سکتے ہیں کہ انہیں ان کا پورا مہر دیں اور ان پر ظلم نہ کریں، اور اگر انہیں اندیشہ ہو کہ وہ انصاف نہیں کر سکیں گے تو دوسری عورتوں سے جو انھیں پسند ہوں نکاح کرلیں ان یتیم لڑکیوں سے نکاح نہ کریں۔[1]

حضرت عائشہ رضہ کی یہ تفسیر امام بخاری، مسلم، نسائی، بیہقی اور دوسرے محدثین نے بھی روایت کی ہے۔ اس تفسیر میں حضرت عائشہ رضہ کے نزدیک "الیتامیٰ" کے لفظ سے یتیم لڑکیاں مراد ہیں اور "النساء" کے لفظ سے عام عورتیں مراد ہیں۔ آیت کی غرض یتیم لڑکیوں کے سرپرستوں کو یہ حکم دینا ہے کہ اگر تمہیں ان یتیم لڑکیوں کے ساتھ نکاح کرنے میں بے انصافی کا اندیشہ ہو تو ان سے نکاح نہ کرو، بلکہ دوسری عورتوں سے نکاح کرلو۔ اس ضمن میں غیر محدود تعدد ازواج پر پابندی عائد کر کے چار تک اس کی تحدید کر دی گئی ہے ان کے نزدیک آیت کے پہلے ٹکڑے کا تعلق یتیم لڑکیوں سے ہے اور فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ کا تعلق عام عورتوں سے ہے۔ اس تفسیر کو مفسرین کی اکثریت نے اختیار کیا ہے۔ اس مستند تفسیر سے معلوم ہوا کہ تعدد ازواج کے حکم کا تعلق عام عورتوں ہی سے ہے۔

اس آیت کی دوسری تفسیر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور ان کے شاگرد حضرت عکرمہ سے منقول ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ

> جاہلیت کے زمانے میں ایک مرد دس اور اس سے بھی زیادہ عورتوں سے نکاح کرتا تھا اور آپس میں وہ کثرت ازواج پر فخر کرتے تھے اور جب اپنا مال ختم ہو جاتا تھا تو اپنے زیر نگرانی یتیموں کے مال پر ہاتھ صاف کرتے تھے اس پر اللہ نے نکاح کیلئے

---

[1] ابوجعفر محمد بن جریر طبری۔ جامع البیان فی تفسیر القرآن ج ۴ ص ۱۵۵ مطبعہ مصر

چار چار سے شادی کر سکتے ہو اور لونڈیاں رکھ سکتے ہو بشرطیکہ تمہارے معاملات درست ہو جاتے ہیں اور تم یتیموں پر ظلم کرنے لگتے ہو تو اب تم ایک سے چار تک نکاح کر و اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ اس کے بعد بھی تم یتیموں کے مال میں عدل نہیں کر سکو گے تو ایک ہی عورت سے نکاح کر یا لونڈی پر اکتفا کر و۔[1]

اس تفسیر میں حضرت ابن عباس کے نزدیک "الیتامیٰ" سے یتیم لڑکے اور لڑکیاں مراد ہیں اور "النساء" سے عام عورتیں مراد ہیں۔ اس تفسیر سے بھی معلوم ہوا کہ تعدد ازواج کے حکم کا تعلق عام عورتوں ہی سے ہے۔ امام رازی نے اسی تفسیر کو ترجیح دی ہے۔

اس آیت کی تیسری تفسیر حضرت سعید بن جبیر، قتادہ اور دوسرے مفسرین سے منقول ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ جاہلیت میں بھی عرب کے لوگ یتیموں کے مال میں ناجائز تصرف کو پسند نہ کرتے تھے لیکن عورتوں کی ان کے نزدیک کوئی وقعت نہ تھی اور ان کے ساتھ ناانصافی عام تھی وہ دس دس شادیاں کر لیتے تھے اور بیویوں کے درمیان عدل نہ کرتے تھے۔ اس آیت میں کہا گیا کہ جس طرح تم یتیموں کے ساتھ ظلم کرنے سے ڈرتے ہو اسی طرح عورتوں پر ظلم کرنے سے ڈرو اور اس ظلم سے بچنے کے لیے ایک سے چار تک نکاح محدود کر لو اور اگر پھر بھی ظلم کا اندیشہ ہو تو بس ایک نکاح پر اکتفا کرو یا لونڈیوں سے فائدہ اٹھاؤ۔[2]

پہلی دو تفسیروں اور اس تفسیر میں فرق یہ ہے کہ ان مفسرین کے نزدیک اس آیت میں یتیموں کے بارے میں کوئی حکم نہیں ہے بلکہ یہ آیت عام عورتوں کے حقوق سے متعلق ہے۔ یہ اصلاً و بالذات اس لیے نازل ہوئی ہے کہ غیر محدود تعدد ازواج کے رواج کو بند کرے اور بیویوں کے درمیان ناانصافی کو روک دے۔ اس تفسیر کو ابن جریر اور دوسرے مفسرین نے اختیار کیا ہے۔ پہلی دو تفسیروں کے لحاظ سے یتیم لڑکیوں پر ظلم کی ممانعت کے ضمن میں غیر محدود تعدد ازواج کو محدود کیا گیا ہے۔ ان تفسیروں کے درمیان کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ تعدد ازواج کے حکم کو صرف یتیم لڑکیوں کے ساتھ مخصوص کرنا ہر لحاظ سے غلط ہے۔

---

[1] ابو جعفر محمد بن جریر طبری۔ جامع البیان فی تفسیر القرآن ج ۲ ص ۱۴۴ مطبوعہ مصر

[2] ایضاً ص ۱۴۵ مطبوعہ مصر

اب عملی پہلو پر نظر ڈالیے تو آپ دیکھیں گے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے آج تک صحابہ کرام، تابعین، علماء، فقہاء اور عامۃ المسلمین عام عورتوں سے بھی بیک وقت ایک سے زیادہ نکاح کرتے چلے آ رہے ہیں اور کبھی کسی کے تصور میں بھی نہ آیا کہ تعدد ازواج کی اجازت صرف یتیم لڑکیوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ کیا کوئی مسلمان اس کا خیال بھی کر سکتا ہے کہ عہد رسالت سے آج تک کسی مسلمان نے سورۂ النساء کی آیت ۳ کا صحیح مطلب نہیں سمجھا۔

دوسرے سوال کا جواب دوسرے سوال کا جواب بھی پہلے سوال کے جواب میں موجود ہے۔ لیکن یہ سوال بھی مختلف انداز میں دہرایا جاتا ہے۔ اس لیے الگ سے بھی اس کا جواب دینے کی ضرورت ہے —— اس سوال کا جواب یہ ہے کہ سوال میں جو بات کہی گئی ہے وہ بالکل من گھڑت ہے۔ نہ قرآن کے الفاظ میں اس کا کوئی اشارہ ہے، نہ احادیث میں یہ بات ملتی ہے، نہ تاریخ میں اور نہ قدیم مفسرین کے ذخیرۂ تفسیر میں۔ آیت کے اس شان نزول کا کوئی نشان ملتا ہے۔ یہ بات کسی وجہ سے بالکل بے معنے ہے۔

(۱) یہ سوال بھی اس غلط فہمی کا نتیجہ ہے کہ آیت ۳ تعدد ازواج کی اجازت دینے کے لیے نازل ہوئی تھی۔ اوپر تفصیل گذر چکی کہ آیت تعدد ازواج کی تحدید کے لیے نازل ہوئی تھی نہ کہ اسے جائز قرار دینے کے لیے۔ تعدد ازدواج پہلے ہی سے جائز تھا اور اسلام نے کبھی اس کو ناجائز نہیں قرار دیا۔

(۲) یتیم لڑکیوں کا وجود ان کے آباء کے قتل ہی پر موقوف نہیں ہے بلکہ ان کی طبعی موت کی وجہ سے بھی لڑکیاں یتیم ہو جاتی ہیں عرب کے لوگ صرف ان یتیم لڑکیوں پر ظلم نہیں کرتے تھے جن کے باپ جنگ میں مارے جائیں بلکہ ان پر بھی ستم ڈھاتے تھے جن کے باپ بستر پر طبعی موت مر جاتے تھے۔ اس آیت نے ہر قسم کی یتیم لڑکیوں پر ظلم کو روکا ہے اور ایک قدیم تفسیر کے مطابق جیسا اوپر گذر چکا ہے۔ آیت عام عورتوں پر ظلم کو روکنے کے لیے نازل ہوئی تھی۔

(۳) آیت کے دو جملوں میں شرط کا استعمال ہوا ہے ایک "وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ" میں اور دوسرے "فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً" میں پہلے جملے کی شرط کا تعلق اس مسئلے سے ہے کہ اگر یتیم لڑکیوں کے سرپرستوں کو اندیشہ ہو کہ وہ ان سے نکاح

کے ساتھ انصاف نہیں کر سکیں گے تو پھر انہیں ان سے نکاح نہ کرنا چاہیے۔ اس شرط کا تعلق تعدد ازدواج سے بالکل نہیں ہے کیونکہ کسی ایک یتیم لڑکی سے نکاح بھی عدل کی شرط کے ساتھ مشروط ہے اگر اس کا ولی اس کے ساتھ عدل نہیں کر سکتا تو پھر اس سے نکاح نہ کرنا چاہیے۔ اس ظلم سے بچنے کے لیے کہا گیا ہے کہ دوسری بہت سی عورتیں موجود ہیں اس لیے ولی اس لڑکی کے ساتھ نکاح کرنے پر مجبور نہیں ہے ــــ دوسرے جملے کی شرط کا تعلق ان یتیم لڑکیوں سے نہیں ہے جن کا ذکر پہلے جملے میں کیا گیا ہے بلکہ دوسری عورتوں اور تعددِ ازدواج سے ہے یعنی اگر کوئی شخص ایک بیوی کی موجودگی میں کسی دوسری عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہے تو اسے اپنے دل کو ٹٹول کر اطمینان کر لینا چاہیے کہ وہ دونوں میں عدل کر سکے گا یا نہیں، عام ازیں کہ وہ دوسری عورت کنواری ہو، بیوہ ہو، کسی دوسرے گھر کی یتیم لڑکی ہو یا اس کا باپ زندہ ہو۔ اب کچھ لوگوں نے غلط فہمی سے یا ناواقف لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے پہلے جملے کی شرط کو تعدد ازدواج کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ حالانکہ اس کا اس مسئلے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

(۴) اس پوری آیت کو تعدد ازدواج سے متعلق کرنے والوں نے یہ بالکل نہیں سوچا کہ اس کا آیت کے مفہوم اور خود ان کے اپنے مقصد پر کیا اثر پڑے گا۔ اب آیت کا مفہوم یہ ہو گیا کہ جن یتیم لڑکیوں کے ساتھ تمہیں بے انصافی کا اندیشہ ہو انہیں یتیم لڑکیوں میں سے چار تک نکاح کرو۔ اب غور کیجیے جن لڑکیوں کے ساتھ انصاف نہ کرنے کا اندیشہ ہو انہیں کے ساتھ ایک نہیں بلکہ چار نکاح کر لینے سے یہ اندیشہ دور کس طرح ہو جائے گا۔ اور یہ نکاح ناانصافی کا علاج کیسے بن جائے گا ـــ من گھڑت تفسیر سے مقصد پر جو اثر پڑے گا وہ یہ ہے کہ تعدد ازدواج کا حکم مشروط ہے اس شرط سے کہ معاشرے میں (جنگ کے نتیجے میں) یتیم لڑکیوں اور بیواؤں کی کثرت ہو گئی ہو اور ان کے مسئلے کو حل کرنا ہو اور پھر آگے تعدد ازدواج کا حکم ایک دوسری شرط کے ساتھ مشروط ہے وہ یہ کہ نکاح کرنے والے کو یہ اطمینان حاصل ہو کہ وہ بیویوں کے درمیان عدل کرے گا، ورنہ اس کو ایک ہی بیوی سے نکاح کرنا چاہیے یعنی یتیم لڑکیوں اور بیواؤں کی کثرت کی وجہ سے ضرورت تو یہ ہے کہ ایک مرد متعدد لڑکیوں اور بیواؤں سے نکاح کرے تاکہ ان کا مسئلہ حل ہو سکے مگر ساتھ ہی ایک ایسی شرط اور قید لگا دی کہ اب بہت کم لوگ اس پر آمادہ

ہوسکیں گے کہ متعدد یتیم لڑکیوں اور بیواؤں سے نکاح کریں لہذا ان کی کثرت کا مسئلہ حل نہیں ہو گا گویا آیت کے پہلے ٹکڑے میں اللہ نے مسئلے کا حل بتایا اور پھر خود آخر میں اس حل کو ختم کر دیا اور مسئلہ لاینحل کا لاینحل رہ گیا۔ مغربی تہذیب سے مرعوب لوگوں کے نزدیک یہی آیت تعدد ازواج پر پابندی بھی لگاتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ معاشرے میں یتیم لڑکیوں اور بیواؤں کی کثرت کے مسئلے کو حل بھی کرتی ہے۔ یہ ہے وہ اعلیٰ درجے کا مفہوم جسے ساڑھے تیرہ سو سال تک کوئی مفسر نہیں سمجھ سکا ہے۔ قرآن کی آیتوں کو ناقابل فہم اور بے معنے بنا دینے کی یہ عجیب و غریب کوشش ہے

تیسرے سوال کا جواب

سوال ۳ میں پوچھا گیا ہے کہ آیت زیر بحث میں "عدل" کے معنے کیا ہیں؟ جواباً عرض ہے کہ اس میں عدل کے معنے یہ ہیں کہ بیویوں کے درمیان رات بسر کرنے میں ان کے کھانے کپڑے میں رہائشی مکان میں اور ان کی دیگر ضروریات پوری کرنے میں مساوات برتی جائے۔ اگر مثال کے طور پر کوئی شخص اپنی ایک بیوی کے ساتھ دو دن قیام کرتا ہے اور دوسری کے ساتھ ایک دن قیام کرتا ہے یا اپنی ایک بیوی کو کھانے کپڑے کے لیے ماہانہ سو روپیے دیتا ہے اور دوسری کو پچاس روپیے یا اس نے ایک بیوی کو کشادہ اور آرام دہ مکان دے رکھا ہے اور دوسری کو تنگ اور تکلیف دہ تو وہ بیویوں کے درمیان عدل نہیں کر رہا ہے، بلکہ ناانصافی کر رہا ہے اور اگر ان تمام چیزوں میں ان کے درمیان برابر برابر سلوک کر رہا ہے تو وہ عدل کی شرط پوری کر رہا ہے اگر شوہر اپنی بیویوں کے درمیان عدل نہ کر رہا ہو تو مظلوم بیوی کو حق ہے کہ وہ اپنا مقدمہ قاضی کے پاس لے جائے اور اگر شکایت صحیح ثابت ہو تو قاضی کے لیے ضروری ہے کہ وہ شوہر کو عدل پر مجبور کرے۔

اسلامی شریعت کے ماہرین نے بیویوں کے درمیان عدل کو فرض قرار دیا ہے اور یہ بھی بیان کیا ہے کہ اس معاملے میں عدل کے معنے کیا ہیں۔

ان الرجل لا تخلوا اما ان
یکون لہ اکثر من امراۃ واحدۃ واما
ان کانت لہ امراۃ واحدۃ فان کان
لہ اکثر من امراۃ واحدۃ فعلیہ العدل

کسی شخص کی یا تو ایک سے زیادہ
بیویاں ہوں گی یا صرف ایک ہوگی اگر ایک
سے زیادہ بیویاں ہوں تو ان کے
درمیان عدل کرنا واجب ہے اور عدل کے

بينهن في حقوقهن من القسم والنفقة والكسوة وهو التسوية بينهن في ذلك حتى لو كانت تحته امرأتان حرتان او امتان يجب عليه ان يعدل بينهما في المأكول والمشروب والملبوس والسكنى والبيتوتة[1]

یعنے یہ ہیں کہ وہ ان کے حقوق یعنی باری نفقہ اور لباس میں مساوات برتے یہاں تک کہ اگر اس کے پاس دو آزاد بیویاں ہوں یا دو کنیز بیویاں ہوں تو اس پر واجب ہے کہ ان دونوں کے درمیان کھانے پینے لباس مکان اور شب باشی میں عدل کرے

اس عبارت سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ متعدد بیویوں کے درمیان عدل واجب ہے اور دوسری یہ کہ عدل کے معنے کیا ہیں۔ وجوب عدل کی دلیل میں انھوں نے سورۃ النساء کی اسی آیت کو پیش کیا ہے جو زیر بحث ہے وہ لکھتے ہیں:۔

اللہ نے دو دو تین تین چار چار بیویوں سے نکاح کا حکم دینے کے بعد یہ فرمایا ہے کہ اگر تم کو خوف ہو کہ عدل نہ کر سکو گے یعنی اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ بیویوں کے درمیان شب باشی اور اخراجات میں مساوات نہ برت سکو گے تو پھر ایک ہی عورت سے نکاح کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر عدل واجب نہ ہوتا تو پھر ایک بیوی پر اکتفا کی ہدایت نہ کی جاتی۔ پھر آخر میں اللہ نے فرمایا کہ یہ بات ظلم سے بچنے کے لیے زیادہ قرین صواب ہے۔ جب بیویوں کے درمیان ظلم حرام ہوا تو اس کے مقابل کی چیز یعنی عدل واجب ٹھیرا۔[2]

عدل کی اتنی تاکید ہے کہ مختلف سن و سال اور حیثیت و حال رکھنے والی بیویوں کے درمیان بھی شب باشی کی تقسیم میں مساوات ضروری قرار دی گئی ہے۔ علامہ کاسانی لکھتے ہیں:۔

ويستوي في القسم البكر والثيب والشابة والعجوز والقديمة والحديثة والمسلمة والكتابية[3]

اور باری کی تقسیم میں کنواری بیوہ، جوان، بوڑھی، پرانی، نئی، مسلمان اور کتابیہ (اہل کتاب) بیویاں برابر ہیں۔

---

[1] کاسانی المتوفی ۵۸۷ھ بدائع الصنائع جلد ۲ صفحہ ۳۳۲ مطبوعہ مصر

[2] ایضاً

[3] ایضاً

البتہ محبت اور میلانِ طبع میں مساوات برتنا چونکہ انسان کے بس میں نہیں ہے اس لیے اس معاملے میں شریعت نے مساوات کو ضروری نہیں قرار دیا ہے اور اس کی صراحت سورۃ النساء کی آیت ۱۲۹ میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ قرآن نے اللہ تعالیٰ کے اس کلی قانون کا بھی اعلان کیا ہے کہ وہ کسی پر ایسی تکلیف (ذمہ داری) نہیں ڈالتا جو اس کی طاقت سے باہر ہو۔

چوتھے سوال کا جواب جو مسلمان عورتیں مغربی تہذیب پر فریفتہ ہوگئی ہیں ان میں سے کوئی عورت مردوں پر تعدد ازدواج کا دروازہ بند کرنے کی دھن میں تو شاید اپنے لیے چند شوہروں کا مطالبہ کرسکتی ہے ورنہ کسی شریف عزت دار اور باحیا مسلمان عورت کی طرف سے اس طرح کے مطالبے کا خیال کرنا بھی مشکل ہے۔ ایسی عورتوں کے لیے ہمارے پاس جواب یہ ہے کہ اسلامی شریعت میں اس کی کوئی گنجائش موجود نہیں ہے۔ اس شریعت کی نظر میں یہ فعل خاندان اور معاشرے کی بنیاد ڈھا دینے کے مترادف ہے۔ اسلام نسب اور خاندان کے تحفظ پر اس قدر زور دیتا ہے کہ اس نے اس میں بگاڑ پیدا کرنے والے ہر رخنہ کو بند کر دیا ہے۔ اسی سورۃ النساء میں جس کی آیت ۳ پر بحث کی گئی متعدد عورتوں کو مردوں پر حرام قرار دیا گیا ہے۔ ان محرمات میں ایک عورت وہ بھی ہے جس کا نکاح کسی دوسرے سے ہو چکا ہو۔

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ (۲۴) اور تم پر حرام کی گئی ہیں وہ عورتیں جو شوہر والی ہیں

اور یہ حرمت اس درجے پر پہنچی ہوئی ہے کہ جن عورتوں کے شوہر وفات پا جائیں یا جن کو طلاق دے دی گئی ہو ان سے عدت کے درمیان بھی نکاح باطل ہے جب تک ان کی عدت پوری نہ ہو جائے کوئی مرد ان سے نکاح نہیں کرسکتا اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اگر عدت کے درمیان نکاح کی اجازت دے دی جائے تو نسب میں اختلاط کا اندیشہ ہے۔ دین اسلام کے بیسیوں احکام کسی صحیح اور متعین نسب کے ثبوت پر موقوف ہیں۔ اگر یہ نہ ہو تو وہ سب احکام معطل ہو کر رہ جائیں گے اس سوال کے جواب میں اتنا اشارہ کافی ہے ان احکام کو یہاں پیش کرنا غیر ضروری ہے۔

کہا جاسکتا ہے کہ مرد کو متعدد بیویوں کی اجازت دینا اور عورت کو متعدد شوہروں کی اجازت نہ دینا عورتوں پر زیادتی اور مساوات کے خلاف ہے لیکن تھوڑے غور و تامل سے معلوم ہو جاتا ہے کہ

یہ تفریق نہ عورتوں پر زیادتی ہے اور نہ مرد و عورت کے درمیان معقول مساوات کے خلاف ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ نکاح کے معاملے میں عورت اور مرد کے درمیان یہ تفریق انتہائی معقول اور عورتوں پر احسان ہے۔

عورت اور مرد کے طبعی حالات، رجحانات اور جنسی ضروریات میں مساوات نہیں ہے، نہ مرد کو ہر مہینے میں حیض کا خون آتا ہے، نہ وہ نو مہینے بچے کو اپنے پیٹ میں لیے پھرتا ہے اور نہ وہ چالیس دنوں تک نفاس میں مبتلا رہتا ہے اور نہ وہ عورت کی طرح منفعل اور مفعول ہے کیا کوئی عورت مطالبہ کر سکتی ہے کہ ان معاملات میں بھی مرد اور عورت میں مساوات ہونی چاہیے۔ اس طبعی تفاوت کے باوجود اگر مرد پر یک زوجگی کی پابندی عائد کر دی جائے تو یہ صورت پیش آ سکتی ہے، آتی ہے اور آ رہی ہے کہ اس کی نکاحی بیوی تو ایک ہو لیکن آشنا عورتیں اور داشتائیں متعدد ہوں۔ کیا کوئی شریف عورت اس کو پسند کرے گی کہ باضابطہ نکاح کے ذریعے تو اس کے شوہر کا تعلق کسی دوسری عورت سے نہ ہو لیکن بدکاری کے ذریعے وہ جس سے چاہے تعلق پیدا کرتا پھرے؟ جب تک کوئی عورت اپنی فطرت کو مسخ نہ کرے وہ دوسری صورت پسند نہیں کر سکتی۔ فطرت کو مسخ کرنا یہ ہے کہ عفت و عصمت کی اخلاقی قدر اس کے نزدیک بے معنی ہو جائے۔ اس کے علاوہ یہ بھی دیکھا گیا ہے اور دیکھا جا رہا ہے کہ مرد اپنے مالی وسائل کا بہت بڑا حصہ اپنی داشتاؤں پر صرف کر دیتا ہے اور نکاحی بیویوں کے حصے میں بہت کم آتا ہے۔ اس لحاظ سے بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی عورت اپنے شوہر کی دوسری بیوی پر اس کی داشتہ کو کیوں ترجیح دے گی یا ترجیح دیتی ہے۔

اسلام نے زنا کو حرام اور بوقت ضرورت دو تین چار تک نکاح کو حلال قرار دیا ہے پھر اس نے بیویوں کے درمیان عدل کو ایک ضروری شرط کی حیثیت دی ہے اس طرح اس نے بدکاری اور اس راہ میں اسراف مال کا دروازہ بند کر کے ذمہ دارانہ تعلق کا دروازہ کھول دیا ہے۔ مغربی تہذیب نے اس کے برعکس عورت و مرد کی رضامندی کی شرط پر زنا کا دروازہ کھول کر ذمہ دارانہ تعلق کا دروازہ بند کر دیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ مسلمان عورتیں کس معقول بنیاد پر اسلام کے قانون کو ناپسند اور غیر اسلامی قانون کو پسند کریں گی البتہ اگر وہ اسلامی قدروں کو ناپسند کرنے لگی ہوں

تو بات اور ہے۔
عورتوں پر دو دو تین تین اور چار چار شوہروں کو حرام قرار دے کر بھی اسلام نے ان پر کوئی
زیادتی نہیں کی ہے کوئی عورت اس کا مطالبہ سمجھ بوجھ کر نہیں کرسکتی۔ اگر اس کی اجازت ہو تو لازمی
طور سے یہی ہوگا کہ عورت حقیقی معنے میں کسی کی بیوی نہ بن سکے گی اور اس سے جو اولاد پیدا ہوگی
وہ بھی فی الواقع اپنی ماں کے سوا اور کسی کی اولاد نہ ہوگی —— شوہر اور بیوی کے درمیان مودت
رحمت، تقدس، احترام، ذمہ داری اور ایک دوسرے کے لیے وجہ سکون بننے کا جو رشتہ قائم ہوتا ہے
وہ چند شوہری کی صورت میں لازماً ختم ہوکر رہے گا اور کسی انسانی معاشرے کی صحیح تعمیر و تشکیل کا
امکان ہی باقی نہ رہے گا۔ کیا کوئی عورت سلامتی ہوش و حواس کے ساتھ ان سب چیزوں کی قربانی
کو اپنے لیے انصاف قرار دے سکتی ہے؟
واقعہ یہ ہے کہ چند شوہری کا مطالبہ (اگر کسی عورت نے واقعی یہ مطالبہ کیا ہو) اپنے پیچھے تمرد
اور نری جذباتیت کے سوا کوئی معقول بنیاد نہیں رکھتا۔
اوپر کی تفصیل سے واضح ہوا کہ مسلمانوں کو عدل کی کڑی شرط کے ساتھ بیک وقت

شرعی حیثیت ایک سے زیادہ نکاح کا حق اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے۔ یہ مسلمانوں کا اپنا
بنایا ہوا کوئی قانون نہیں بلکہ اللہ کی دی ہوئی مکمل شریعت کا ایک جز ہے۔ مسلمان اپنے اس حق کو
حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے آج تک استعمال کرتے آرہے ہیں۔ اس میں مداخلت بلاشبہ مداخلت
فی الدین ہوگی۔ اگر مسلمانوں کی کوئی حکومت یا غیر مسلموں کی کوئی ریاست طاقت کے بل پر مسلمانوں کے
لیے یک زوجگی کا قانون نافذ کرے تو یہ ایک صریح ظلم ہوگا اور مسلمان ایک دینی و مذہبی فریضے کے
طور پر اس کی مزاحمت کریں گے۔

نوٹ:
ماہنامہ زندگی اکتوبر ۷۰ء میں میرا مقالہ (مسلم پرسنل لا کے مسائل عقل انسانی اور
وحی الٰہی کی روشنی میں) شائع ہوا ہے۔ اس مقالے میں تعدد ازدواج کے تقریباً تمام پہلوؤں
پر گفتگو کی گئی ہے۔ (سید احمد قادری)

مہاراشٹر اسمبلی میں تعدد ازدواج پر پابندی عائد کرنے کا بل

ایک سے زائد شادی پر پابندی عائد کرنے کی غرض سے ایوت محل کے رہنے والے کانگریسی ممبر مسٹر علی حسن ممدانی نے ۲۳ر نومبر ۶۲ء کو ایک مسودۂ قانون (L.A.BiLL No, Lxxi of 1962) مہاراشٹر لیجسلیٹو اسمبلی میں پیش کیا تھا، بل کا مکمل ترجمہ درج ذیل ہے:-

مسلمانوں میں دوزوجگی روکنے کیلئے مسودۂ قانون

اغراض ومقاصد:- تعدد ازدواج کی اگرچہ مسلم پرسنل لا کے تحت اجازت دی گئی ہے لیکن وہ عملاً ترک کر دیا گیا ہے اور مسلم رائے عامہ یک زوجگی کی مؤید ہے۔ مسودۂ قانون کی غرض اسی مقصد کو حاصل کرنا ہے ضمناً اس کا مقصد مسلمان خواتین کو بھی سہولت بہم پہونچانا ہے۔ جن کے خاوند اس بل کے نفاذ کے وقت ایک سے زیادہ بیویاں رکھتے ہوں۔

ہرگاہ کہ مسلمانوں میں دوزوجگی کو روکنا ضروری ہے۔ اس لئے جمہوریہ ہند کے تیرھویں برس مندرجہ ذیل قانون نافذ کیا جاتا ہے:-

(۱) (الف) یہ قانون مہاراشٹر قانون انسداد دوزوجگی برائے مسلمان ۶۲ء کہلائے گا۔

(ب) اس کا اطلاق پوری ریاست مہاراشٹر پر ہوگا۔

(۲) اس قانون کا اطلاق صرف مسلمانوں پر ہوگا۔

(۳) اس قانون کی اصلاحات میں جب تک کہ کوئی بات مضمون یا متن کے متضاد نہ ہو مقصد یہ ہے۔

(الف) دوزوجگی کی شادی

دوزوجگی کی شادی کا مطلب بیوی یا شوہر کا اپنے زوج کی موجودگی میں نکاح کرنا ہے۔ بشرطیکہ ایسے مرد یا عورت کی اس کی بیوی یا شوہر سے نکاح کو کسی با اختیار عدالت نے ناجائز قرار نہ دیا ہو یا خلع نہ کرا دی ہو یا وہ رسم و رواج کے اعتبار سے جائز نہ ہو۔ اسمیں وہ شادی شامل نہیں ہے جو کسی نے اپنے زوج کی زندگی میں اس وقت کی ہو جب کہ متعلقہ زوج سات سال تک مسلسل مفقود الخبر ہو اور اس کی زندگی کے بارے میں کوئی خبر نہ سنی گئی ہو۔ البتہ ایسے شخص کو اپنی شادی سے پہلے واقعات کی صحیح صورتِ حال سے اُس مرد یا عورت کو واقف کر دینا ہو گا جس سے اس کی شادی ہو رہی ہے۔

(ب) مسلم سے وہ شخص مراد ہے جو مذہب اسلام کا ماننے والا ہو۔

(ج) نابالغ سے وہ شخص مراد ہے جس کی عمر ۱۶ سال سے کم ہے۔

(۴) عام اس سے کہ کوئی قانون یا رسم و رواج اس کے منافی ہو دوزوجگی کی شادی باطل قرار دی جائے گی۔ (الف) اگر وہ اس قانون کے نفاذ کے بعد اس ریاست میں انجام دی گئی ہو (ب) اگر وہ شادی اس قانون کے نفاذ کے بعد ریاست کی حدود سے باہر انجام پائی ہو مگر زوجین میں سے ایک یا دونوں اس ریاست میں رہتے ہوں۔

(۵) عام اس سے کہ قانون تنسیخ نکاح مسلمین ۱۹۳۹ء قانون ۸ ۱۹۳۹ کی دفعہ ۲ میں کوئی امر موجود ہو۔ ایک عورت جس کی مسلم قانون کے تحت شادی انجام پائی ہو اس بات کی حقدار ہو گی کہ اس قانون کے نفاذ کے وقت اس کے شوہر کی ایک سے زیادہ بیوی موجود ہو تو وہ خلع حاصل کر سکتی ہے۔

(۶) عام اس سے کہ کوئی قانون رسم یا رواج اس سے متضاد ہو۔ اگر نابالغ کے علاوہ کوئی فرد ایک زوج کی موجودگی میں دوسری شادی کرتا ہے یا کرتی ہے جو (دفعہ ۴ کی رو سے باطل ہے) اس پر مقدمہ چلا کر سات سال تک کی سزا دی جا سکتی ہے۔ نیز جرمانہ بھی کیا جا سکتا ہے۔

(۷) جو شخص بھی اس ریاست میں دوسرے نکاح کی رسم انجام دے گا یا اس میں اعانت کرے گا اس پر مقدمہ چلا کر کسی بھی نوع کی سزا دی جا سکتی ہے جس کی مدت ۶ ماہ تک ہو اور اس پر جرمانہ بھی کیا جا سکتا ہے الا یہ کہ وہ اس بات کا ثبوت پیش کرے کہ اس کے پاس یہ یقین کرنے کے معقول وجوہ موجود تھے۔

کہ یہ نکاح دوسرا نہیں ہے۔

(۸) (الف) جب کوئی نابالغ دوسری شادی کرے جو دفعہ ۴ کی رو سے باطل ہے تو جو شخص اس نابالغ کا نگراں ہو خواہ وہ والدین میں سے ہو یا سرپرست یا کوئی اور، نیز قانونی طور پر ولی ہو یا نہ ہو ایسی شادی کو انجام دینے کے سلسلے میں اقدام کرنے یا اسے انجام دینے کی اجازت دینے یا غفلت و تساہل سے ایسی شادی کو روکنے میں ناکام رہنے پر، اس پر مقدمہ چلا کر کسی بھی نوع کی سزا دی جا سکتی ہے جس کی مدت ۱ ماہ تک ہو سکتی ہے یا جرمانہ کیا جا سکتا ہے یا سزا اور جرمانہ دونوں۔

(ب) اس دفعہ کے تحت سمجھا جائے گا۔ (الّا یہ کہ اس کے خلاف ثبوت بہم پہونچایا جائے) کہ جہاں کسی نابالغ کی دوسری شادی انجام پائی ہے جو دفعہ ۴ کی رو سے باطل ہے اسے نابالغ کا سرپرست خواہ وہ والدین میں سے ہو یا سرپرستوں میں سے یا قانونی یا اس کے علاوہ ولی ہو اپنی غفلت سے نکاح کو روکنے میں ناکام رہا ہے۔

(۹) ہر درخواست جو اس قانون کی دفعہ ۵ کے تحت دی جائے اسے ایسے ڈسٹرکٹ کورٹ میں جس کے دائرۂ اثر میں جائے نکاح واقع ہو یا جہاں خاوند اور بیوی رہتے ہوں یا آخر میں رہتے تھے پیش کیا جائے گا۔

(۱۰) عام اس سے کہ کوئی امر ضابطہ فوجداری ۱۸۹۸ء میں شامل ہو دفعات ۶ - ۷ یا ۸ کے تحت ہر الزام کی سماعت پریسیڈنسی میجسٹریٹ یا جوڈیشل میجسٹریٹ کی عدالت میں ہوگی۔

(۱۱) اس قانون کے تحت آنے والی تمام خلاف ورزیاں قابلِ سماعت قرار دی جائیں گی۔"

یتیموں کی جانچ

اور یتیموں کو بالغ ہونے تک کام کاج میں مصروف رکھو، پھر اگر ان میں عقل کی پختگی دیکھو تو ان کا مال ان کے حوالے کر دو۔ اور اس خوف سے کہ وہ بڑے ہو جائیں گے۔ اس کو فضول خرچی اور جلدی میں نہ اڑا دینا۔

(النساء آیت ۶)

پروفیسر آصف فیضی

اسلامی قوانین کی اساس کو سمجھنے کے لیے پیغمبر اسلام کی زندگی کے آخری دس سال یعنی پہلی ہجری سے دس ہجری تک کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مکّہ اور مدینہ کے شہر نبی کریمؐ کی اطاعت قبول کر چکے تھے۔ اسلام نے دین کی حدود سے آگے بڑھ کر ریاستی نظام کی صورت اختیار کر لی تھی جس کے لیے قوانین، اصول اور نظم و نسق کی ضرورتیں پیش آئیں۔ چنانچہ حکم الٰہی کے مطابق، رسول اللہ قانون سازی کی طرف متوجہ ہوئے۔ اسلام میں قانون سازی کا کام دو طرح سے انجام پایا۔ بقولِ طیب جی اس عمل کے دوران میں ایک طرف قرآنی آیات ترمیم و تنسیخ کا کام کرتی رہیں اور دوسری طرف خود آنحضرتؐ کی زندگی کے نمونے سے "سنّت" کی تشکیل ہوتی رہی، جو اسلامی زندگی کی آئینہ بردار ہے۔ اس طرح اسلام سے پہلے کی روایات اور قوانین (جو اس وقت رائج تھی) کے بعض پہلوؤں پر ان دونوں اثرات یعنی قرآن اور سنّت نے اپنا کام کیا۔

۱۱ سے ۴۰ ہجری کا زمانہ خلفائے راشدین کا عہد تھا۔ اس دَور میں قرآن مجید کے احکام اور سنّتِ نبویؐ کا اطلاق اور ان کی تاویل پیغمبرِ اسلام کی بتائی اسپرٹ ہی میں کی جاتی تھی۔ خصوصاً حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ دین اور قانون، دونوں کے عظیم المرتبہ معلّم تھے۔

۴۰ سے چوتھی صدی ہجری (یعنی [illegible]) کے دوران میں نہ تو پیغمبر اسلام تھے اور نہ آپ کے صحابہ کرامؓ میں سے کوئی ایسا تھا جس سے رشد و ہدایت حاصل کی جا سکتی۔ علما نے بڑی احتیاط سے پیغمبرِ اسلام کی تعلیمات کو یکجا کیا اور زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ان کا اطلاق کیا۔ حضرت معاذؓ

کے بارے میں مشہور حدیث ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فقہ کے مسائل یعنی قانون میں عقلی استدلال کی وجہ سے کتنی لچک پیدا ہو گئی تھی۔ روایت ہے کہ جب رسول اللہؐ نے حضرت معاذؓ کو ایک صوبے کا گورنر اور قاضی (منصف) بنا کر بھیجنے کا فیصلہ کیا تو ان سے دریافت فرمایا:[1]

"تم کس طرح مقدموں کے فیصلے کرو گے؟"

"احکامِ الٰہی کے مطابق یا رسول اللہ۔"

"اور اگر ان میں تمہیں رہنمائی نہ ملے؟"

"تو پھر سنتِ نبویؐ کے مطابق۔"

"اور جو ان میں بھی تمہیں رہنمائی نہ ملے؟"

"تو پھر میں اپنی عقل کے مطابق فیصلہ کروں گا۔"

یہ سن کر رسول اللہؐ نے فرمایا: "حمد و ثنا ہو اس خدائے قدوس کی جس نے اپنے نبیؐ کے پیام رساں کو اس نعمت سے نوازا جو اس کے نبی کو پسند ہے۔"

اس مثال سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بنی اُمیّہ کے دَور میں قانون کے بارے میں کیا زاویۂ نظر ہو گا۔ اسلام دور دراز ملکوں تک پھیل چکا تھا۔ جہاں دارالقضاہ کے قاضیوں کو نہ رسول اللہؐ کی ہدایت حاصل تھی نہ صحابہ کرامؓ کی صحبت نصیب تھی۔ اس لیے ان کے فیصلوں کا دار و مدار زیادہ تر عقلی استدلال اور قیاس پر رہا اور اس طرح "اصولِ قانون" نے بڑھتے بڑھتے ایک مستقل "قانونی نظام" کی شکل اختیار کر لی۔ اسی دوران میں اہلِ تشیع نے بھی اپنی روایات جمع کیں جو اب چار کتابوں پر مشتمل ہیں:

۱۔ کلینی کی کافی۔

۱۔ لم تقضی قال بما فی کتاب اللہ قال ان لم تجد فی کتاب اللہ

قال اقضی بما قضی به رسول اللہ قال فان لم تجد ما قضی به رسول اللہ

قال اجتهد برای قال علیه السلام الحمد للہ الذی وفق رسول

رسول اللہ لما یرضی به رسوله۔

(۲) ابن بابویہ کی من لایحضرہ الفقیہ۔

(۳) استبصار۔

(۴) طوسی کی تہذیب الاحکام اور استبصار۔

پھر وقت کے ساتھ عرب میں اہل سنت کے قوانین کے چار مسالک حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی قائم ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی مشرق میں امام جعفر صادقؒ کی تعلیمات کی بنیاد پر ایک اور مسلک کا وجود عمل میں آیا جو "اثنا عشری" کہلاتا ہے۔

حنفی مسلک نے مشرقی ایشاء، ترکی، مصر اور ہندوستان میں مالکی مسلک نے شمالی افریقہ میں رواج پایا۔ امام شافعیؒ اسلام کے بہت بڑے فقیہہ مانے جاتے ہیں۔ ان کا مسلک مصر، سوڈان اور کئی دوسرے افریقی ممالک میں، عرب کے سواحل، جنوبی ہندوستان اور جنوبی مشرقی ایشیا میں پھیلا۔ امام حنبلؒ کے پیرو مرکزی عرب تک محدود رہے۔ اثنا عشری مسلک کے ماننے والے عراق اور ایران میں پھیل گئے۔ اور اب ہندوستان میں بھی پہنچ گئے ہیں۔ فاطمی خلفا نے ایک مختصر سی جماعت مصر میں قائم کی تھی جو اپنا وطن چھوڑ کر یمن میں پناہ گزیں ہوئی اور اب مغربی ہندوستان میں "بوہرہ جماعت" کی حیثیت سے آباد ہے۔

سب سے پہلے اسلامی فقہ کے اصول کی تدوین امام شافعیؒ نے کی۔ اس فقہ کے چار سرچشمے ہیں: قرآن، سنت، اجماع اور قیاس۔ قرآن میں اللہ کا حکم راست پہنچتا ہے۔ سنت کو وحی کا درجہ حاصل نہیں ہے۔ یوں تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک بشر تھے۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ آپ انسان کامل تھے۔ وقت اور حالات کے پیش نظر آپ کے اقوال اور احوال کو یکجا کرنے سے نظام حیات کا جو خاکہ بنتا ہے اس سے انسانیت کے ایک مکمل معلم کی شخصیت اُبھرتی ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ آپ کے ہر عمل اور قول پر غور کیا جائے، اُسے سمجھا جائے، اس کی توضیح کی جائے اور اس پر عمل کیا جائے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ قانون کا اصلی مقصد انسان کو ایسے قواعد و ضوابط سے منسلک کرنا ہے۔ جن کی پابندی سے اس کی زندگی میں مثالی کردار پیدا ہو۔

اب ان احکام کی باری آتی ہے جو انسان کے بنائے ہوئے ہیں۔ زندگی کے بعض معاملات سے متعلق اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے کوئی واضح ہدایت نہیں ہے۔ ایسی صورت میں جن

قوانین پر فقہاء کرام کی رائے متفق ہے، ان کو " اجماع " کہا جاتا ہے۔ اجماع کی بحث میں حصہ لینے والے فقہا کے لیے خاص شرائط کا پورا کرنا ضروری تھا۔ جب نہایت ممتاز فقہاء آپس میں اختلاف رائے کے باوجود کوئی رائے پیش کرتے تو یہ " قیاس " کہلاتا۔ کسی ایک بہت ہی مشہور فقیہہ کی رائے بھی اسلام میں قانون کا درجہ پا سکتی تھی۔ اس کو بھی " قیاس " کہا جاتا تھا۔ چنانچہ عقل انسانی کے ذریعے طے کیے ہوئے مسئلے بھی یعنی اجماع اور قیاس اسلامی قانون کے اجزاء قرار پائے۔ یہی وجہ ہے کہ امام شافعیؒ نے فقہ کی یہ تعریف کی ہے کہ یہ وہ نظام قانون ہے کہ جو قرآن، سنت، اجماع اور قیاس کی بنیادوں پر قائم ہے۔ اسلامی قانون کے یہی " اصول اربعہ " مانے گئے ہیں۔ قانون کی شکل کو پھر دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک " اصول " اور دوسرا " فروع " قرآن مجید کی آیات کی تاویل احادیث کے ضعیف یا صحیح ہونے کا فیصلہ کرنا " اجماع " اور " قیاس " کی قدر و قیمت جانچنے کے جو طریقے مقرر ہوئے وہ سب " اصول " ہیں اور اصول سے جو عملی طور پر استدراک ہوتا رہا اس کو " فروع " کہتے ہیں۔

اسلامی قوانین کا دائرہ چوتھی صدی ہجری سے چودھویں صدی ہجری (۱۰۰۰ء سے ۱۹۲۴ء) تک وسیع ہوتا چلا گیا۔ اصولوں کی ترتیب اور قوانین سازی کے بعد ان میں استقلال پیدا کرنے کا کام بھی اسی دور میں ہوا۔ اسلامی حکومت اب عالمگیر نوعیت اختیار کر چکی تھی اور اس کا انحطاط بھی شروع ہو گیا تھا۔ سترھویں صدی میں ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا (حنفی مسلک) چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ اسی طرح دولت عثمانیہ (حنفی مسلک) کو انیسویں صدی میں " یورپ کا مرد بیمار " کہا جاتا تھا۔ اس دور میں " تقلید " کو فروغ ہوا۔ دوسرے الفاظ میں " اجتہاد " کا دروازہ بند کر کے صرف اسلاف کے اصولوں کو بلا چون و چرا اور بلا حجت تسلیم کر لینا مناسب سمجھا گیا۔ گیارھویں صدی میں یہی " سد باب الاجتہاد " تھا۔ اس کا جہاں یہ فائدہ پہنچا کہ قوانین میں قطعیت آ گئی وہیں یہ بھی ہوا کہ جدید تشریحات اور نئی تاویلوں کی گنجائش باقی نہیں رہی۔

۱۹۲۴ء میں ترکی جمہوریت کے جنم کے ساتھ ہی " خلافت " کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد مسلمانوں کا نہ کوئی مسلمہ مذہبی پیشوا رہا، نہ ایسی کوئی مسلمہ جماعت رہی جس کا فتویٰ سب کے لیے حکم کے طور پر قابل تسلیم ہوتا۔ یہاں سے اسلامی قوانین کا پانچواں دور شروع ہوتا ہے۔ اب اسلامی فقہ قانونی نظام کے بجائے صرف اخلاقی اصول کی شکل اختیار کر لیتی ہے کیونکہ کوئی قانون اس وقت تک

قانون نہیں کہلا سکتا جب تک اس کے نفاذ کے لیے کوئی طاقت بھی اس کی پشت پر نہ ہو اب تو نہ خلیفۂ وقت تھا نہ کوئی امام وقت۔

انیسویں اور بیسویں صدی میں پہنچ کر فقہ اسلامی دو نہایت اہم اثرات سے متاثر ہوئی۔ اولاً تو اس پر بیرونی قوانین اثر انداز ہوئے۔ شمالی افریقہ میں فرانسیسی، ہندوستان میں برطانوی اور مشرقی ایشا میں ولندیزی اثر، انھیں کے نتیجے میں دوسرا اثر رونما ہوا، یعنی قانون سازی کا۔ جہاں کہیں ایسا محسوس ہوا کہ مروجہ قانون عدل یا سہولت میں مانع ہو رہا ہے۔ وہاں عدل، نصفت اور "ضمیر صادق" کے مغربی اصول پر عمل کیا گیا اور اگر اس سے بھی آگے بڑھنے کی ضرورت پیش آئی تو کوئی دفعہ وضع کی گئی یا مروجہ قانون میں ترمیم کی گئی۔

مذکورہ بالا معروضات کی روشنی میں اب دیکھنا چاہیے کہ ہندوستان میں انیسویں اور بیسوی صدی میں کیا ہو رہا تھا۔

ہندوستان

ہندوستان ایک سکولر (غیر مذہبی) ریاست ہے۔ جس میں ہر مذہب کو مساوی حقوق حاصل ہیں۔ دستور ہند کسی ایک مذہب یا دھرم کو سرکاری طور پر تسلیم نہیں کرتا۔ ہر شخص کو (دفعہ ۲۵ کے مطابق) اپنے دین پر قائم رہنے، اس پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ و اشاعت کا حق حاصل ہے۔ سپریم کورٹ کے ایک فیصلے کے مطابق "مذہب" کی تعریف میں صرف شخصی طور پر اس پر ایمان لانا ہی نہیں بلکہ مذہبی طور طریقے پر عمل کرنا بھی شامل ہے۔ دستور ہند کا منشاء ہے کہ عام طور پر قانون، سے مراد وہ قانون ہے جو دستور کی منظوری کے وقت مروج تھا (دفعہ ۳۷۲ الف) چنانچہ اس لحاظ سے ہندوستان نہ تو "دارالحرب" ہے نہ "دارالسلام" بلکہ یہ ایک دارالحیاد (غیر جانب دار) ہے جس میں قوانین مذہب کی بنیاد پر نہیں بلکہ ریاست کی پالیسی کے مطابق بنائے جاتے ہیں۔

برطانوی دور میں ہندوستان میں "محمڈن لا" کا اطلاق مسلمانان ہند پر ایک پالیسی کے ماتحت کیا گیا تھا۔ اس میں شریعت کی پابندی کا التزام نہ تھا۔ پالیسی یہ تھی کہ بعض معاملات میں یعنی وراثت شادی، ذات پات اور مذہبی رسوم کے معاملے میں مسلمانوں کو ان کے شرعی قوانین کا پابند رکھا جائے اور ہندوؤں کو ان کے دھرم کے مطابق۔ ان کے علاوہ ایسے بھی قوانین تھے جو کچھ رسم و رواج کے

مطابق یعنی "عدل، نصفت اور ضمیر صادق" کے اصول کے مطابق جاری کیے گئے تھے اور کچھ ایسے قوانین بھی تھے جو یک قلم منسوخ کر دیئے گئے تھے۔ جیسے:-

۱۔ منصف کا مسلمان ہونا ضروری نہیں سمجھا گیا۔

۲۔ غلامی کے قوانین منسوخ کیے گئے۔

۳۔ زنا کی سزا موت یا سنگساری برقرار نہیں رکھی گئی۔

۴۔ کسی مسلمان کے لیے سود لینا یا دینا غیر قانونی نہیں رہا۔

۵۔ چور کے ہاتھ نہیں کاٹے جاتے ہیں۔

۶۔ شراب کا پینا یا سور کا گوشت کھانا جرم نہیں ہے۔

۷۔ مسلمان اور غیر مسلم قانونی طور پر اپنا مذہب تبدیل کیے بغیر آپس میں شادی بیاہ کر سکتے ہیں اور اسپیشل میریج ایکٹ ۱۹۵۴ کے مطابق ان کی اولاد جائز اور وراثت کی حق دار ہے۔

۸۔ اسپیشل میریج ایکٹ ۱۹۵۴ کے تحت مسلمان عورت اور مرد کے نکاح کو رجسٹریشن کے ذریعہ سول میریج میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اور

۹۔ مذکورہ رجسٹریشن کے بعد ایک مسلمان اپنی بیوی اور اولاد میں سے جسے چاہے شرعی وراثت سے زیادہ حصے کا حق دار قرار دے سکتا ہے۔

۱۰۔ مذکورہ رجسٹریشن کے بعد وراثت کے مذکورہ قانون کے سوا باقی تمام معاملوں میں ایک مسلمان اسلام پر قائم سمجھا جائے گا اور پرسنل لا کی دوسری شقوں کا اس پر حسب معمول اطلاق ہوگا۔

۱۱۔ اگر کسی مسلمان نے اپنی زندگی کا بیمہ کرایا ہے تو وہ اسے بلا شرط یا مشروط طریقے پر انشورنس ایکٹ ۱۹۳۸ کے تحت جس شخص کو چاہے اپنی پالیسی کے لیے نامزد کر سکتا ہے (یہ بات شریعت اسلامی (پرسنل لا) میں جائز نہیں ہے)۔

اس طرح یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جس قانون کو ہم "محمڈن لا" کہتے ہیں وہ زمانے کی رفتار اور حوادث کے ساتھ بہت بدل چکا ہے۔ لیکن سب سے اہم اور بنیادی نکتہ یہ ہے کہ شریعت کے قوانین کا نفاذ امیر، یعنی خلیفہ یا امام وقت کے ذریعے ہوا کرتا تھا، لیکن ہندوستان میں مسلمانوں کے

پرسنل لا کو ملک کے دستور میں جگہ ہی گئی ہے۔ اور اس کا نفاذ صدر جمہوریہ کرتا ہے، نہ کہ کوئی مسلمان خلیفہ یا امیر۔

ایک مشترکہ سول کوڈ، کسی مذہبی اصول کے ماتحت نہیں بلکہ ایک پالیسی کے ماتحت بنایا جاتا ہے۔ اگر ہندوستان ایک جمہوری ریاست ہے اور پارلیمانی جمہوریت میں اکثریت کی رائے ملک کی رائے مانی جاتی ہے لیکن حکومت نے تمام فرقوں کے احساسات اور مذہبی جذبات کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ پالیسی اختیار کی ہے کہ وہ کسی خاص فرقے کے معاملات میں اس وقت تک دخل نہیں دے گی جب تک خود اس فرقے کے افراد کسی تبدیلی کا مطالبہ نہ پیش کریں۔ مثلاً کشمیر میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے ایک رواجی قانون یہ ہے کہ بیٹیوں کو غیر منقولہ متروکہ جائیداد میں حصہ نہیں ملتا۔ یہ شریعت کا قانون نہیں، بلکہ ایک قدیم رواج ہے لیکن اب تک وہاں کسی نے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ اس رواجی قانون کو بدل کر شریعت کا قانون وراثت نافذ کیا جائے۔ اس سے پہلی بات ثابت ہوتی ہے کہ حکومت ایسے معاملے میں دخل نہیں دیتی۔ ہاں، اگر لوگ خود ایسے قانون میں تبدیلی چاہتے ہیں تو وہی اس کا مطالبہ بھی کریں۔

"مسلم پرسنل لا" (مسلمانوں کا شخصی قانون)

۱۹۳۷ء کے شریعت ایکٹ نمبر ۲۶ میں "مسلم پرسنل لا (شریعت) ایکٹ" کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔ "مسلم پرسنل لا" وہ اسلامی سول قوانین ہیں جو شخصی طور پر ہندوستان میں مسلمانوں پر نافذ کئے گئے ہیں اور "اسلامی" قوانین وہ اصول ہیں جو فقہائے اسلام نے شریعت یا فقہ کے نام سے رائج کئے اور جن میں بیرونی عناصر کی گنجائش نہیں ہے۔ مسلم پرسنل لا کے مآخذ چار ہیں۔ (۱) شریعت یا فقہ (۲) مقننہ کے بنائے ہوئے قوانین۔ (۳) فیصلوں کی نظیریں۔ (۴) عام رواج۔ جب عدالت میں کوئی مسئلہ پیش ہوتا ہے تو پہلے ہم مشہور اور مستند کتابیں دیکھتے ہیں۔ پھر قانونی نظیروں سے رجوع کرتے ہیں، اور اگر ضرورت ہو تو بعض کلاسیکی کتابوں مثلاً "ہدایہ" یا "فتاویٰ عالمگیری" یا "شرائع" سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ قانونی پیروی میں ہمارا عمل یہ ہے کہ ہم طیب جی، ملا، ولسن یا امیر علی کی تصنیفات سے رجوع کرتے ہیں۔ اس کے بعد ہم ان مقدمات پر غور کرتے ہیں جن کا ذکر ان مصنفوں نے کیا ہے یا جو ہم نے خود نوٹ کئے ہیں۔ ہم یہ بھی جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ مقدمے کا تعلق وقف ایکٹ بابت ۱۹۱۳

یا شریعت ایکٹ بابت ۱۹۳۷ یا مسلم فسخ نکاح ایکٹ بابت ۱۹۳۹ یا اسپیشل میرج ایکٹ بابت ۱۹۵۴ سے متعلق ہے یا نہیں۔ بعض مقدموں میں قانونِ وراثت، قانونِ رجسٹری، قانونِ میعاد یا قانونِ رسوم عدالت (اسٹامپ) سے بھی تعلق ہوتا ہے۔ ان تمام کوششوں کے باوجود ہماری تلاش کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو تو ہم کسی ماہر قانون سے مستند قانونی کتابوں کے متن کی تشریح چاہتے ہیں۔ مثلاً ہدایہ یا شرائع الاسلام (از نجم الدین حلی ۶۷۷ھ م ۱۲۷۷ء) یا فتاویٰ عالمگیری (۱۱۰۰ھ) یا دعائم الاسلام (قاضی نعمان، قاضی فقیہہ ۳۶۳ھ م ۹۷۴ء) سے رجوع کرتے ہیں۔ شاذ و نادر ہی ایسا موقع آتا ہے کہ کسی وکیل کو کوئی اصول، دلیل یا مثال معلوم کرنے کے لیے کسی عالم دین سے مشورہ کرنا پڑتا ہو۔ قرآن مجید اور احادیث سے رجوع کرنے کی ضرورت سب سے آخر میں پیش آتی ہے، وہ بھی شاید اس وقت جب کوئی منصف اپنی رائے کو تقویت پہنچانے کی خاطر اصل عربی متن کا حوالہ دینا چاہتا ہو یا کوئی جج بنیادی اصول کی خود ہی تحقیق کرنا چاہتا ہو جسٹس محمود اور سر شاہ سلیمان اکثر ایسا کرتے تھے۔ جسٹس محمود ہندوستانی عدالت کے بہترین ججوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ موجودہ صورتِ حال میں اب اس طریقۂ کار کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہمارے سامنے فیصل شدہ مقدموں کی نظیریں اتنی بڑی تعداد میں موجود ہیں کہ ان سے ہم اپنی ضرورت بہ آسانی پوری کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں پریوی کونسل کے زمانۂ حال کے ایک جج لارڈ ڈلوی کی یہ رائے ہے کہ کسی عدالت کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ اس قسم کے مسئلوں کو حل کرنے کے لیے وہ بلند پایہ اور قدیم مفسرین کی رائے کے خلاف قرآن مجید کی آیتوں کے معنی اپنے مطلب کے مطابق نکالنے کی کوشش کرے۔

ہماری عدالتوں میں جو فیصلے سند کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں، ان کو چار قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ جن میں مسلم لا، اور انگلش لا، ایک ہی ہیں۔

۲۔ جن میں مسلم لا میں انگلش لا کے لحاظ سے ترمیم ہوتی ہے۔

۳۔ جن میں قدیم رسم و رواج کی وجہ سے مسلم پرسنل لا، میں تبدیلی ہوتی ہے۔

۴۔ جن میں مقننہ (مجلسِ قانون ساز) کے ذریعے مسلم پرسنل لا، میں ترمیم یا تنسیخ ہوئی ہے۔

اس وقت ان چار قسموں کی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن اس بحث سے یہ بات صاف طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی شریعت یا فقہ اور ہندوستان میں مسلم پرسنل لا میں کتنا بُعد ہے

اس لیے آیاتِ قرآنی، احادیثِ نبوی یا ائمہ کرام مثلاً امام جعفر صادقؓ، امام ابوحنیفہؒ امام مالکؒ امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے ارشادات کا آزادانہ استعمال کرکے اصلی تصفیہ طلب امر کی طرف سے عدالت کی توجہ ہٹانے کے لیے قانونِ خداوندی کا واسطہ نہیں دینا چاہیے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس عالم نے بھی، چاہے وہ مشرق کا ہو یا مغرب کا، اسلامی قوانین کے شاندار ورثے کا مطالعہ کیا ہے اس بات پر متفق ہے کہ ہر زمانے اور ہر ملک میں شریعت ایک مستقل موضوعِ مطالعہ رہی ہے، اور وقتاً فوقتاً اس کی تنقیح اور تصریح بھی ہوتی رہی ہے اور چونکہ یہ ان کی کوشش، حالات اور زمانے کی پابند تھی۔ اس لیے تشنہ رہی اور یہ عمل ہر ملک اور ہر زمانے میں یکساں نہیں رہا۔ چنانچہ عثمان مخلّہ (حنفی) نہایت وثوق سے کہتا ہے "یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ قانون کی شرطیں زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں"

یہاں یہ بحث فضول ہوگی کہ اگر کسی قانون کے قاعدے میں جس کا اطلاق ہندوستان کی عدالتوں میں ہوتا ہے، ترمیم یا تبدیلی کی جائے تو خدائی قانون میں مداخلت ہے۔ عام طور پر ایسی حجت، شخصی مناظرانہ یا سیاسی اغراض کی خاطر کی جاتی ہے نہ کہ روحانی مقاصد کی خاطر۔ جب انسانی ضمیر کھلی ناانصافی کے خلاف حرکت میں آتا ہے تو ہم ہندوستان کے مسلمانوں کا فرض یہ ہو جاتا ہے کہ اس کا حل تلاش کریں اور اپنے قانون دوسرے ممالک کے قوانین سے اس طرح ہم آہنگ کریں کہ ان لوگوں کے ساتھ عدل ہوسکے جو اس سے محروم ہیں۔

مسلم لا کا نفاذ جس طریقے پر ہندوستان میں کیا جارہا ہے۔ اس سے یہ اُن کا پرسنل لاء بن گیا ہے۔ یعنی اس کا اطلاق مسلمانوں اور صرف مسلمانوں پر ہوتا ہے۔ اس لیے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان میں قانون کے لحاظ سے مسلمان کون ہے؟ اس کا جواب یہ ہے:

"جو شخص اپنے کو مسلمان کہتا ہے، وہ مسلمان کہلائے گا" اسلام کا مدعا ہے کہ ایک خدا پر ایمان لانا اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت کا اقرار کرنا۔ یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ایمان خلوص پر مبنی ہونا چاہئے نہ تو دکھاوے کے لیے اور نہ کسی قانون سے گریز کرنے کی خاطر۔ عدالتوں کو اس مسئلہ کی دینی نزاکتوں میں نہ الجھنا چاہئے اور نہ الجھ سکتی ہیں۔ یہ اصول سب سے پہلے امیر علی نے ہندوستانی عدالتوں میں طے کیا اور اب یہ اصول تسلیم بھی کیا جاچکا ہے۔

"مسلمان" کون ہے، یہ جان لینے کے بعد دیکھنا چاہئے کہ کس مسلک کے پرسنل لاء کا ہندوستان

علیہ کے مسلک کے قانون کا اطلاق ہوتا ہے ؟ اس بحث کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:
یہاں عام قیاس قانونی یہ ہے کہ فریقین حنفی ہیں اور ان پر حنفی فقہ کا اطلاق ہوتا ہے۔
(۱) اگر کسی مقدمے میں مسلمان فریقین کا ایک ہی مسلک ہو تو اسی مسلک کی شریعت کا اطلاق کیا جائے گا۔
(۲) اگر فریقین میں مذہب کا اختلاف پایا جاتا ہو یا دونوں ایک ہی مسلک سے تعلق نہ رکھتے ہوں تو پھر مدعا علیہ کے مسلک کے قانون کا اطلاق کیا جائے گا۔ مثلاً اگر شوہر سنی اور بیوی شیعہ ہو اور مقدمہ شوہر کی طرف سے بیوی کے خلاف دائر کیا گیا ہو تو اس مقدمے کا فیصلہ شیعی شریعت کے لحاظ سے کیا جائیگا۔ اور اگر مقدمہ شوہر کے خلاف بیوی نے دائر کیا ہے تو سنی شریعت کے مطابق عمل ہوگا۔
(۳) اگر کوئی شخص ایمان داری سے اپنا مذہب بدلتا ہے یا اسلام کے ایک مسلک کے بجائے دوسرے مسلک کا پابند ہو جاتا ہے تو اس کا پرسنل لا بھی اس کے ساتھ بدل جائے گا۔ مثلاً اگر ایک سنی عورت پچاس سال کی عمر کو پہنچ کر شیعہ مسلک قبول کر لیتی ہے تو پچاس برس کی عمر سے وفات تک اس پر شیعہ قوانین کا اطلاق ہوگا۔
(۴) اگر کوئی مسلمان مرتد ہو جائے یا کوئی دوسرا مذہب اختیار کر لے تو اس کی وفات کے بعد اس کے ترکے کی تقسیم اس مذہب کے قانون کے مطابق ہوگی، جس پر وہ مرا۔ اسی اصول پر اس حالت میں بھی عمل ہوگا۔ جب ایک سُنی، شیعہ فرقے میں داخل ہو کر وفات پائے یا شیعہ، سُنی مسلک قبول کرنے کے بعد وفات پائے۔
یہ سارے اصول سادہ اور واضح ہیں۔ سوائے اس کے کہ عدالت کو کسی مقدمے میں اس امر کا تصفیہ کرنا ہو کہ مذہب یا مسلک کی تبدیلی نیک نیتی سے ہے (ایک رئیس ہر دوسرے سال شیعہ سے سنی اور پھر سنی سے شیعہ بن جاتے تھے)۔
اب ہم بالاختصار ایسے قوانین کا ذکر کرتے ہیں جو ہندوستان کے مسلمانوں پر اثر انداز ہوتے ہیں:
(۱) غلامی ـــــ ۱۸۴۳ کے ایکٹ کی رو سے اس کا انسداد ہو چکا ہے۔ اس لیے یہ اسلامی قانون کہ کنیز کے بطن سے اس کے آقا کی جو اولاد باقاعدہ شادی یا اس کے بغیر پیدا ہو وہ جائز سمجھی جائے گی اور جس

حقوق اسے حاصل ہوں گے، ہندوستان میں قابل نفاذ نہیں ہے۔

(۲) ارتداد —— جو مسلمان اپنا مذہب بدلتا ہے، اسلام کی رو سے مرتد کہلاتا ہے۔ شرع کی رو سے مرتد اپنے مسلم والدین کی وراثت سے پوری طرح محروم ہو جاتا ہے اور بعض حالات میں تو وہ سزائے موت کا مستوجب ہو جاتا ہے لیکن ۱۸۵۰ کے قانون کی رو سے یہ قاعدہ منسوخ کر دیا گیا۔ مثلاً فرید کے دو بیٹے زید اور بکر ہیں اگر زید عیسائی ہو جائے تو بھی وہ اپنے باپ کے ترکے کا وارث تسلیم کیا جائے گا اور اس کا حصہ اسی اصول کے مطابق متعین ہو گا جس کا اطلاق اس کے باپ پر ہوتا تھا (یعنی مسلم پرسنل لا کے مطابق)۔

(۳) قانون تعزیرات —— ہندوستان میں اسلامی قوانین تعزیرات کی جگہ تعزیرات ہند کا نفاذ ۱۸۶۰ میں ہوا۔ یہ قانون لارڈ میکالے نے تیار کیا تھا۔

(۴) عدالت عالیہ (ہائی کورٹ) —— ۱۸۶۱ میں ہر پریسی ڈنسی شہر جیسے کلکتہ، بمبئی، مدراس میں عدالت عالیہ کا قیام عمل میں آیا۔ ہر ایسا شخص ہائی کورٹ کا جج مقرر ہو سکتا ہے جو قانونی تعلیم اور ضروری تجربے کا حامل ہو۔ اس طرح یہاں اسلامی فقہ کا یہ اصول ترک کر دیا گیا کہ مسلمانوں کے مقدمات کا فیصلہ صرف ایک مسلمان جج (قاضی) ہی کر سکتا ہے۔

(۵) شہادت —— اسلامی اصول شہادت کو ترک کر کے اس کی جگہ ۱۸۷۲ء میں قانون شہادت ہند کو نافذ کیا گیا جو ایک انگریز جج جسٹس اسٹیفن کا تیار کیا ہوا ہے۔ چنانچہ ایسے اصول کہ مسلمانوں کے خلاف صرف ایک مسلمان کی گواہی قابل قبول ہو سکتی ہے۔ یا یہ کہ زنا کے اثبات کے لیے چار چشم دید گواہوں کی شہادت ضروری ہے، متروک ہو گئے۔

(۶) وقف علی الاولاد —— ۱۹۱۳ء کے وقف ایکٹ سے مسلمانوں کو وقف علی الاولاد کی بعض ایسی وضعات دوبارہ مل گئیں جو پریوی کونسل نے مسترد کر دی تھیں۔ اس فیصلے پر مسلمان بہت برہم ہوئے تھے، اور اسی احتجاج کی بنا پر یہ وقف ایکٹ نافذ ہوا۔

(۷) شریعت ایکٹ —— بعض ایسے رسوم و رواج جو شریعت کے منافی تھے اور صدیوں کے عمل اور پابندی کی وجہ سے قانونی حیثیت رکھتے تھے، ۱۹۳۷ء کے شریعت ایکٹ کے تحت منسوخ ہو گئے، اور شادی، طلاق، وراثت وغیرہ کے لیے مسلمان اپنے فرقے کے قوانین کے پابند قرار دیے گئے۔

(۸) فسخ نکاح —— حنفی مسلک کے لحاظ سے مسلمان عورت کو اپنے نکاح کے فسخ کرانے کا

حق نہیں ہے خواہ اس کا شوہر بین طور پر قصوروار کیوں نہ ثابت ہو جائے ؟ لیکن مالکی فقہ کے مطابق چونکہ اس معاملے میں عورت کی پوزیشن بہتر ہے اس لیے اس کا اطلاق ہر مسلک کی مسلم عورت پر ــــــ شیعہ اور سنی، دونوں فرقے کی عورتوں پر کر دیا گیا۔ یہ قانون سازی میں دلیرانہ اقدام تھا۔ اسی اصول کو وسعت دے کر دوسرے معاملات کو بھی سلجھایا جا سکتا ہے جیسا کہ میں آگے چل کر تجویز کروں گا۔

(۹) بیمے کی مشروط نامزدگی ــــــ اسلامی قانون، بیمے کی پالیسی کی مشروط نامزدگی کی اجازت نہیں دیتا۔ ایک مسلمان کو اس کے پرسنل لا کے تحت یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ اپنی پالیسی کو اس شرط کے ساتھ اپنی بیوی کے نام کر دے کہ اگر اس کی زندگی میں اس کی پالیسی کی میعاد پوری ہو جائے تو وہ خود اس کی منفعت کا حق دار ہوگا۔ انشورنس ایکٹ ۱۹۳۸ء کی دفعہ ۳۸ (۷) کے تحت یہ دقت دور کر دی گئی اور اب مسلم اور غیر مسلم دونوں اپنی پالیسی کو مشروط طور پر نامزد کر سکتے ہیں۔ اس قاعدے سے مسلمانوں کو بہت بڑا فائدہ پہنچا، حالانکہ شریعت اسلام کی رُو سے جان کا بیمہ جائز نہیں ہے اور چونکہ اس کا منافع دراصل سود ہے، اس لیے یہ عمل حرام ہے۔

(۱۰) سول میریج ــــــ اسپیشل میریج ایکٹ ۱۹۵۴ء کی رو سے مسلم اور غیر مسلم اپنا مذہب تبدیل کیے بغیر آپس میں شادی کر سکتے ہیں، ایسی شادی طلاق کے ذریعے فسخ نہیں ہو سکتی ہے اور وراثت کے لیے خاص قانون بن گیا ہے جس کی رو سے بیوی کو مسلم پرسنل لاء کے مقابلے میں زیادہ حقوق حاصل ہیں۔

اسلامی طریقے سے کیے گئے نکاح کو بھی رجسٹرڈ کرانے کی اجازت ہے۔ مثلاً ایک ساٹھ برس کا مسلمان ہے جو اوسط درجے کی آمدنی رکھتا ہے اور اس کی بیوی اور بچے بھی ہیں۔ اب اگر وہ اپنے نکاح کو رجسٹر کر دے تو اس کے مرنے پر اس کی بیوی لازمی طور پر اس کی نصف جائداد کی مالک بن جائے گی۔ متوفی کے ترکے میں یہ حصہ اس حصے سے کہیں زیادہ ہے جو اسے "مسلم پرسنل لا" کے تحت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ اگر شوہر چاہے تو وہ اپنی ساری جائداد وصیت کے ذریعے اپنی بیوی کے نام چھوڑ سکتا ہے۔

میرے علم میں کئی ایسی مثالیں موجود ہیں، جن میں مسلمانوں نے اپنے نکاح کا رجسٹریشن بھی کرایا۔ ایک حیثیت سے یہ مفید طریقہ ہے جس میں دو مختلف قوانینِ وراثت میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ "پرسنل لاء" کے عوض دوسرے قانون کے انتخاب کرنے کی یہ آزادی کسی بھی مذہب کے

غیر شادی شدہ افراد کو حاصل ہونی چاہئے۔ مثلاً ایک مسلمان 'علی' ۱۹۲۰ء میں فاطمہ سے نکاح کرتا ہے اس کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ ۱۹۶۰ء میں علی اپنے نکاح کو اسپیشل میرج ایکٹ ۱۹۵۴ء کی دفعہ ۱۵ کی رو سے رجسٹر کرالیتا ہے اور وصیت کرتا ہے کہ اس کی جائداد کا نصف حصہ اس کی بیوی کو دیا جائے اور بقیہ جائداد اس کے بچوں میں مساوی طور پر تقسیم کر دی جائے۔ یہ وصیت قانون کی رو سے بالکل جائز ہوگی۔ اس کے مطابق عمل کرنے سے بیوی کے حق میں اضافہ ہو جائے گا۔ موجودہ مسلم پرسنل لا کے تحت بیوہ اپنے شوہر کی جائداد میں سے صرف آٹھویں حصے کی حق دار ہوتی ہے۔ حنفی اور فاطمی شریعت کے ماتحت ایک بیوہ اپنے شوہر کی املاک میں سے کسی حصے کی دعوے دار نہیں ہو سکتی ہے۔

ہمارے معاشرے کے حالات کے پیش نظر یہ ماننا پڑے گا کہ شرعی قانون کے مقابلے میں تقسیم جائداد کا یہ اصول بہتر اور مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مجوزہ اصلاحات

ان صفحات میں مسائل کا جو فوری حل پیش کر رہا ہوں اس میں کسی ایسے نئے پرسنل لا (شخصی قانون) کی تجویز نہیں ہے جو شادی، طلاق اور وراثت کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہو۔ ایسے قانون کی منظوری میں بہت زیادہ وقت، محنت اور روپیہ صرف ہوگا۔ اس کے بجائے معاشرے کی فوری ضروریات کو پیش نظر رکھ کر سادہ قسم کا قانون منظور کر لینا چاہیے۔ اس کا نام "پرسنل لا (متفرق دفعات) ایکٹ" ہو اور اس میں حسب ذیل امور اور مسائل کی گنجائش رکھی جائے۔

(۱) اصل متنوں کی تاویل : پریوی کونسل نے ایک عام اصول یہ طے کر دیا ہے کہ "عدالت کے لیے یہ نامناسب ہوگا کہ وہ قرآنی آیات کی ایسی تاویل کرے جو متقدمین اور مستند مفسرین کی تاویل کے خلاف ہو۔" یہ اصول اس وقت طے ہوا تھا جب جسٹس امیر علی نے قرآن مجید کی ایک آیت کی تفسیر اپنی رائے سے کی تھی اسی طرح حدیث کی تاویل کا معاملہ بھی ہے۔ متقدمین، محدثین اور فقہا رسول اللہ ؐ کی سنت کے مطالعے سے جو نتیجے اخذ کر چکے ہیں اس کے برخلاف ایسے معاملات میں جدید فقہاء کا نئے وضع کردہ قاعدوں کا تسلیم کرنا نہایت خطرناک ہوگا۔

لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ متقدمین فقہاء نے قرآنی آیات اور احادیث کی صحیح تاویل کی ہے موجودہ عدالت کے لیے ان کے خلاف کرنا مناسب نہ ہوگا۔ یہی اصول موجودہ زمانے میں ان تمام معاملات

کے بارے میں مروج ہے جن سے متعلق کسی قانون ساز جماعت نے باضابطہ قوانین منظور نہیں کیے ہیں، لیکن اس اصول سے رونما ہونے والی کوئی ناانصافی اگر پارلیمنٹ کے سامنے لائی جائے تو بلاشبہ پارلیمنٹ مناسب قوانین وضع کرکے اس کا انسداد کرے گی۔

لیکن متقدمین فقہا میں رائے کا اتفاق نہ ہو تو اس صورت میں کیا ہوگا؟ جسٹس شاہ محمد سلیمان کا خیال ہے کہ ایسی حالت میں جج کو حق حاصل ہے کہ وہ مختلف آراء میں جسے بھی مناسب اور عدل سے قریب تر سمجھتا ہے اسے قبول کرلے۔ اس بحث میں آراء کا اختلاف صرف ایک مسلک کے لیے محدود رکھا گیا ہے۔ جسٹس سلیمان کا اصول ان حدود سے باہر دوسرے مسلک کے فقہا کی رائے یا تاویل قبول کرلینے اور ان میں انتخاب کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لیے ایک جج کو یہ اختیار تو ہے کہ وہ حنفی مسلک کے مختلف فقہا کی مختلف آراء میں سے کسی ایک کو قبول کرلے لیکن وہ کسی اثنا عشری فقیہ کی تاویل قبول نہیں کرسکتا ہے۔ بعض لوگوں نے جسٹس سلیمان کے اصول میں اتنی لچک پیدا کردی ہے کہ اختلاف آراء صرف مختلف سنّی فرقوں کے فقیہوں کی حد تک ہو تو بھی ان میں سے کوئی ایک رائے قبول کی جاسکتی ہے۔ مسلمانوں کے فسخ نکاح قانون ۱۹۳۹ کے مطابق مالکی مسلک کے اصول کا اطلاق سارے مسلمانوں پر کیا گیا ہے، خواہ وہ سنّی ہوں یا شیعہ۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایک معاملے میں ہندوستان کے سارے مسلمان مالکی قانون کے تابع کیے جاسکتے ہیں تو اس اصول کو اور وسعت کیوں نہیں دی جاسکتی ہے؟ میری گزارش یہ ہے کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ قانون کے ذریعے حسب ذیل دفعہ منظور کی جائے: "اگر کسی ایک مسلک سے تعلق رکھنے والے مسلمان کے بارے میں یہ محسوس ہو کہ اس کے مسلک کے قانون کے مطابق فیصلہ کرنے سے عدل، انصاف اور ضمیر صادق کے اصول مجروح ہوتے ہیں تو عدالت کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ اسلامی قوانین میں سے (جن میں سنّی اور شیعہ دونوں شامل ہوں گے) کسی ایک مسلک کے قاعدے کے مطابق فیصلہ کرے۔" مثلاً نشے کی حالت میں یا کسی جبر کے ماتحت طلاق دیئے جانے پر بھی حنفی مسلک کے اکثر فقہا کے نزدیک طلاق ہوجاتی ہے لیکن شافعی، اثنا عشری یا فاطمی مسلک کے مطابق نہیں ہوتی۔ اگر ہم مسلم پرسنل لا کے لیے مجوزہ اصول تسلیم کرلیں تو پھر اس خاص حالت میں حنفی مقدمے میں بھی شافعی مسلک کے اصول کی گنجائش نکل آتی ہے جو عدل، انصاف اور ضمیر صادق سے زیادہ قریب ہے۔

اس قسم کی مثالیں پیش کرنا غیر ضروری ہے کیونکہ فقہا کی کتابوں میں مختلف عنوانات کے تحت بے شمار

ایسی مثالیں نکل آئیں گی۔ مسلم فسخ نکاح کے قانون کو وسعت دے کر اس کے دائرے میں مختلف مسالک کو شامل کرنے کی تجویز کی تائید جسٹس امیر علی اور جسٹس عبدالرحیم نے بھی کی ہے اور ایسا کرنا مناسب ہے اور عملی طور پر ممکن بھی۔

(۲) تعدد ازدواج :۔ قرآن مجید (سورہ ۴ آیت ۳) میں ایک سے زیادہ بیویوں کے بارے میں جو حکم ہے وہ سادہ لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے :۔

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَۃً اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ ذٰلِکَ اَدْنٰٓی اَلَّا تَعُوْلُوْا ۝	اور اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ تم یتیموں کے باب میں انصاف نہ کر سکو گے تو جو عورتیں تمھیں پسند ہوں ان سے نکاح کر لو۔ دو دو سے خواہ تین تین سے خواہ چار چار سے لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی پر بس کرو یا جو تمہاری کنیز تمہاری ملک میں ہو، اس میں زیادتی نہ ہونے کی توقع قریب تر ہے۔

اسی حکم کو سادہ الفاظ میں یوں سمجھا جا سکتا ہے :

۱۔ صرف ایک بیوی کرو، لیکن
۲۔ اگر تم ان کے مابین عدل کر سکتے ہو تو چار بیویاں کر سکتے ہو۔

جب کوئی شخص دوسری یا تیسری بیوی کرے تو کوئی فقیہ اس عمل کو ناانصافی قرار دے کر خلاف شرع قرار نہیں دے سکتا ہے کیونکہ یہ ناانصافی تو دوسری یا تیسری بیوی کرنے کے کچھ عرصے کے بعد ہی معلوم ہو سکتی ہے۔ اگر پہلی بیوی یہ محسوس کرے کہ اس کے شوہر کے سلوک یا التفات میں یکسانیت نہیں رہی یا وہ عدل نہیں کر رہا ہے تو پھر ان عورتوں کے ساتھ انصاف کیے جانے کی کون سی تدبیریں اختیار کی جانی چاہئیں ؟۔ تعدد ازدواج کے سلسلے میں الہ آباد کے ہائی کورٹ کے جسٹس ڈھون کی رائے یہاں دہرانا ضروری معلوم ہوتا ہے :

ایک مسلمان شوہر دوسری بیوی کرنے کے بعد اپنی پہلی بیوی کے خلاف حقوق زوجیت کی بحالی کا دعویٰ کرتا ہے۔ اگر عدالت شہادت پر غور کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ شوہر کے سلوک کے پیش نظر بیوی کو اس کے ساتھ رہنے پر مجبور کرنا بیوی کے ساتھ ناانصافی ہو گی تو عدالت کو چاہیے کہ مدعی یعنی شوہر

کے مطالبے کو رد کر دے۔

جسٹس ٹھوکن کی رائے میں ہندوستان میں جس طرح "محمڈن لا" یعنی اسلامی قوانین کا نفاذ ہوا ہے اس کے تحت تعدد ازدواج برداشت تو کیا جا سکتا ہے لیکن اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی جا سکتی اور نہ اس کے تحت شوہر کا یہ بنیادی حق ہے کہ وہ ہر حالت میں اپنی پہلی بیوی کو دوسری بیوی کے ساتھ اپنے حرم میں رہنے پر مجبور کرے۔ ایک مسلمان شوہر کو یہ قانونی حق تو ہے کہ وہ ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری بیوی کرے لیکن اس کے بعد اگر شوہر کسی دیوانی عدالت میں اپنی پہلی بیوی کے خلاف یہ دعویٰ کرے کہ وہ اپنی مرضی کے خلاف اس کے ساتھ رہے ورنہ وہ سخت سزا، جیسے ضبطی جائداد کی مستوجب ہوگی تو بیوی کی طرف سے اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ کیا عدالت از روئے نصفت بیوی کو شوہر کے مطالبۂ مجامعت کو منظور کرنے پر بھی مجبور کر سکتی ہے؟ ایسی صورت میں وہ حالات جن میں دوسری شادی ہوئی، متعلقہ اور ضروری امور ہو جاتے ہیں، جن کی بنا پر اس بات کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ پہلی بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کرنا ہی ظلم تھا یا نہیں۔ اب اس امر کا بار ثبوت شوہر پر ہوتا ہے کہ دوسری بیوی کرنے سے نہ تو اس کی پہلی بیوی کی کوئی توہین ہوئی ہے اور نہ اس پر کوئی ظلم ہوا۔ لیکن قابل اعتبار صراحت کی عدم موجودگی میں عدالت یہی قیاس کرے گی کہ موجودہ حالات کے پیش نظر شوہر کے دوسری بیوی کرنے سے پہلی بیوی پر ظلم ہوا ہے اور عدالت کا بیوی کو اس کی مرضی کے خلاف اپنے شوہر کے ساتھ رہنے پر مجبور کرنا خلافِ نصفت ہوگا۔ لہٰذا حکم ہوا کہ مقدمہ بدنیتی پر مبنی ہے، اس لیے خارج کیا جاتا ہے۔

اس مقدمے کے حسبِ ذیل نتیجے نکلے ہیں :

الف : ہندوستان میں ایک مسلمان شوہر کا ایک سے زیادہ بیوی رکھنے کا حق "بنیادی حق" نہیں ہے۔

ب : تعدد ازدواج کی اجازت قانون بالکراہ دیتا ہے۔ اور ایسی صورت میں عام طور پر قیاس ہوتا ہے کہ پہلی بیوی پر ظلم ہو رہا ہے اور اس قیاس کی تردید کا بار ثبوت پوری طرح شوہر پر ہوتا ہے۔

مشرق وسطیٰ کے سارے ممالک میں یہ نکتہ بہت سی قانونی اور فقہی بحثوں کا عنوان بنا رہا۔ چنانچہ مراکش، تونس، شام، ترکی اور ایران میں اس کے تدارک کی مختلف تدبیریں کی گئی ہیں (جن کی تفصیل اینڈرسن اور کولسن کی تصنیفات میں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں)۔

ہندوستان میں جو حالات ہیں ان کے پیش نظر تدارک کی دو تجویزوں پر غور کیا جاسکتا ہے : (۱) پہلی یہ شادی کے موقع پر ایک ایسا معاہدہ کیا جائے جس میں دوسری شادی کی صورت میں مواخذہ کی وضاحت ہو، (۲) اگر ایسا کوئی معاہدہ نہ ہو تو پھر سنگاپور کے نمونے پر ایک عدالت مصالحت سے دوسری شادی سے قبل رجوع کیا جائے اور دوسری شادی کی اجازت حاصل کی جائے۔ ایسی عدالت کی اجازت کے بغیر اگر دوسری شادی ہو تو اس کو قانون تعزیرات کے تحت جرم قرار دیا جائے اور پہلی بیوی کو طلاق لینے کا مستحق قرار دیا جائے۔

اب دونوں صورتوں کی تھوڑی سی تفصیل پر غور کرنا چاہیے :

الف : جہاں معاہدہ (کابین نامہ) مروّج ہو۔

مسلم پرسنل لا کا یہ قابل لحاظ اصول ہے کہ نکاح کے وقت فریقین ایک تحریری معاہدے کے ذریعے چند شرائط پر اتفاق کر کے انھیں قانونی حیثیت دے سکتے ہیں۔ اس معاہدے میں ایک دفعہ یہ بھی رکھی جاسکتی ہے کہ کن حالات میں بیوی کو طلاق لینے کا حق حاصل ہوگا۔ ان حالات میں مسلم فسخ نکاح ایکٹ ۱۹۳۹ء کی دفعہ ۲ کے حالات بھی شامل ہوں گے۔ اسی دفعہ میں یہ بھی شامل ہو کہ طلاق لینے کی صورت میں بیوی کو حق ہوگا کہ وہ اپنے نان نفقے کے لیے عدت کے اختتام سے نکاح ثانی یا اپنی وفات تک دعویٰ کر سکتی ہے۔ اگر نان نفقہ کا حق شوہر کی آمدنی کے ایک تہائی حصے تک مقرر کر دیا جائے تو مناسب ہوگا۔

واضح ہو کہ عدت کی مدت تک اگر عورت حاملہ ہے تو وضع حمل تک، اس کی کفالت کی پوری ذمہ داری شوہر پر ہوگی۔ بعض صورتوں میں یہ مناسب ہوگا کہ حضانت کی مدت تک نابالغ بچوں کی کفالت کے لیے رقم مقرر کر دی جائے۔

اس قسم کے معاہدے کا ہندوستان کے بعض شہروں میں رواج ہے۔ اس کا ایک خاص فارم، جیسے بڑے تجربہ کار ماہر قانون نے تیار کیا ہے جو مسلم پرسنل لا کے تحت باقاعدہ ہونے کے علاوہ ہر طرح مفید اور قابل عمل ثابت ہوا ہے۔

ب : جہاں معاہدے نامے کا رواج نہ ہو۔

مصالحت کی کارروائی

اگر نکاح کے وقت ان شرائط کے ساتھ معاہدہ نہ کیا گیا ہو جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ تو حسب ذیل

کارروائی کرنے کی تجویز پیش کی جاتی ہے جس کی بنیاد قرآن مجید کی سورہ ۴ کی آیت ۳۵ ہے۔

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا۔

(سورۃ النساء: ۳۵)

اور اگر تمھیں دونوں کے درمیان کشمکش کا علم ہو تو تم ایک حکم مرد کے خاندان سے اور ایک حکم عورت کے خاندان سے مقرر کردو۔ اگر دونوں کی نیت اصلاح حال کی ہوگی تو اللہ دونوں کے درمیان موافقت پیدا کردے گا۔ بیشک اللہ بڑا علم رکھنے والا ہے، ہر طرح باخبر ہے۔

اگر ایک شخص شادی کرنے کے کچھ عرصے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ اس کی بیوی بانجھ ہے یا مسلسل خرابی صحت کا شکار ہے یا میاں بیوی میں طبیعت اور مزاج کا شدید اختلاف ہے یا اور کوئی ایسی معقول وجہ ہے جس کی بنا پر وہ شخص دوسری بیوی کرنا چاہے تو اس کی اس وقت تک اجازت نہیں ہونی چاہیے جب تک وہ مصالحت کی کارروائی مکمل نہ کرلے۔ اس کے لیے ایک عدالت قائم ہونا چاہیئے۔ بڑے بڑے شہروں میں عدالتِ خفیفہ (اسمال کازیز کورٹ) کے کسی جج کو یا کسی اور قانون داں حاکم کو حکومت ایسی عدالت کا جج مقرر کرسکتی ہے جس کے ساتھ فریقین کا ایک ایک نمائندہ ہو اور یہ "عدالت مصالحت" ان تینوں پر مشتمل ہو۔ ان مصالحت کنندگان کو گواہوں کی طلبی، شہادت کی قلم بندی اور فیصلے کرنے کا اختیار ہوگا۔ اس عدالت کا پہلا فرض فریقین میں مصالحت کرانا ہوگا اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو شوہر کو اس کی پہلی بیوی کے نان نفقے اور بچوں کی کفالت کی ذمہ داری قبول کرنے پر دوسری شادی کرنے کی اجازت دے سکتی ہے۔

یہ طریقہ کار سہل اور قابلِ عمل بھی ہے۔ اس سے خرچ اور وقت بہت بچ سکتا ہے۔ ساری کارروائی معقول فضا میں انجام پائے گی جس میں فریقین کی دشواریوں کا بھی لحاظ ہوگا۔ اور قرآن مجید کی ہدایت کے مطابق انھیں ایک دوسرے سے زیادہ قریب لانے کی کوشش بھی ہوگی۔ ایسی عدالتیں سنگاپور، ملیشیا کی کئی ریاستوں، انڈونیشیا اور سیلون میں پائی جاتی ہیں۔ ان کی بدولت طلاق اور نکاح ثانی دونوں معاملوں میں بہت کمی ہوگئی ہے۔ میری گذارش ہے کہ ان ملکوں اور بعض عرب ملکوں کی مثالیں سامنے رکھتے ہوئے انھیں کے خطوط پر ہم بھی قوانین منظور کروالیں۔

میری دوسری تجویز " تہری طلاق " سے متعلق ہے، لیکن اس سے پہلے عرب ملکوں اور ہمارے یہاں کی شادی کے بارے میں سماج کے مروجہ طریقوں پر غور کرنا بھی ضروری ہے۔ مشرق وسطیٰ میں ایک مطلقہ عورت نہایت آسانی سے نکاح ثانی کر لیتی ہے اور بیوہ سے نکاح ثانی کرنا بہت اچھا سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ اس طرح بیوہ کی کفالت کا انتظام ہو جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں بیوہ " منحوس " ہستی سمجھی جاتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ تصور بھی قائم ہے کہ یہ " سبز قدم " دوسرے شوہر کو بھی " کھا جائے گی "۔ اس طرح مطلقہ عورت کے ماتھے پر ایسا کلنک کا ٹیکہ لگ جاتا ہے جس کی وجہ سے کوئی شخص اس کے ساتھ شادی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ جہاں ایسے رسم و رواج ہوں وہاں تو بیوہ اور مطلقہ عورتوں کی کفالت کا معقول قانونی انتظام بھی ضروری ہے۔ پہلی بیویاں، دوسری بیویوں (سوکنوں) کے ساتھ جو سلوک کرتی ہیں، ان کی دردناک داستانیں اتنی عام ہیں کہ ان کے اعادے کی یہاں چنداں ضرورت نہیں۔

(۳) " تین طلاقیں " ۔ ہر سنی مسلمان عورت کے سر پر، جس کا نکاح حنفی مسلک کی رو سے ہوا ہو۔ طلاق کی ننگی تلوار لٹکتی رہتی ہے۔ حنفی شریعت جیسی ہندوستان میں رائج ہے، اس کی رو سے ایک شخص اپنی بیوی کو بلا کسی سبب کے بھی بیک وقت تین بار " میں تم کو تین طلاقیں دیتا ہوں " کہہ کر اسے طلاق دے سکتا ہے، اور وہ طلاق اسی وقت نافذ ہو جائے گی۔ یہاں اس مسئلہ کی تاریخی تفصیلات میں جانے کا موقع نہیں ہے، لیکن اس سے اتنی بات ظاہر ہوتی ہے کہ :-

(۱) تین طلاقوں کا قاعدہ بدعت بھی ہے اور مکروہ بھی، اور یہ طریقہ شیعہ، اثنا عشری یا فاطمی شریعت میں ناجائز ہے مگر حنفی شرع میں جائز مانا گیا ہے۔

(۲) یہ صورت بعض تاریخی حالات کے تحت بہت بعد میں پیدا ہوئی اور یہ اپنی اصلی شکل کی اسپرٹ کے خلاف ہے۔

اس بارے میں میری گزارش ہے کہ جب کہ یہ صورت جو قانون کی اسپرٹ کے خلاف ہے جو بعد کے حالات کی پیداوار ہے اور جس پر عمل درآمد سے ناانصافی ہوتی ہے تو پھر مناسب قانون سے اس ناانصافی کے دروازے کو ہمیشہ کے لیے بند کر دینا چاہئے۔ اور یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ جب کبھی ایسی طلاق دی جائے تو اس معاملے کو فوراً مصالحتی عدالت کے سامنے پیش کرنا چاہیے۔ یہ عدالت پہلے تو فریقین میں باہمی مصالحت کی کوشش کرے گی اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر شوہر کو صرف ایک طلاق دینے کی اجازت دے گی۔ فقہا کے

تو ایک ایسی طلاق "طلاق السنۃ" کہلاتی ہے۔ چنانچہ قانون میں اس مقصد کے لیے جو دفعات رکھی جائیں ان میں حسبِ ذیل کی گنجائش ہوگی:۔

(الف) جب کوئی فریقِ نکاح، عدالت کے سامنے یہ ثابت کرے کہ شوہر نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دینے کا اظہار کردیا ہے تو عدالت اس طلاق کو منسوخ قرار دے کر خود بقیہ مقدمے کی سماعت کی کارروائی شروع کرے گی۔

(ب) فریقین اور ان کے گواہوں کی شہادت سننے کے بعد عدالت اعلان کرے گی کہ فریقین میں صلح ہوچکی ہے۔ ایسی صورت کے بعد کسی مزید کارروائی کی ضرورت نہیں۔ یا پھر

(ج) شوہر کے کسی معقول سبب پیش کرنے پر شوہر کو سنّت کے مطابق صرف ایک طلاق دینے کا اختیار دے گی۔

(د) اس اعلان کے بعد مصالحتی عدالت یہ بھی فیصلہ کرے گی کہ کن شرائط پر طلاق دی جائے گی، جیسے (۱) مہر کی ادائی (۲) متاع الطلاق (طلاق کا ہرجانہ) کی ادائی (۳) مطلّقہ کی کفالت کے لیے تاحیات یا نکاحِ ثانی تک ایک رقم کی ادائی۔

(ہ) یہ حکم دیتے وقت عدالت میاں بیوی کی مالی حیثیت، سماج میں ان کا مقام (خاص طور پر بیوی کا) اور دوسرے ایسے حالات کا لحاظ رکھے گی جو انصاف پر مبنی اور مناسب ہوں۔

مذکورہ بالا ضمنی دفعہ (د) کی متاع الطلاق کی ادائی کی تجویز میری ہے جو میں نے فاطمی اور مالکی فقہ کی بنیاد پر پیش کی ہے۔ اس کا اصول یہ ہے کہ شوہر مطلّقہ بیوی کو مہر کے علاوہ ایک رقم بطور ہرجانہ ادا کرتا ہے۔ اس اصول کی بنیاد قرآن مجید کی یہ آیت ہے:

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً وَّ مَتِّعُوهُنَّ عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ۔ (قرآن سورہ بقرہ آیت ۲۳۶)	تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم ان بیویوں کو جنھیں تم نے نہ ہاتھ لگایا اور نہ ان کے لیے مہر مقرر کیا طلاق دیدو۔ وسعت والے کے ذمہ اس کی حیثیت کے لائق ہے اور تنگی والے کے ذمے اس کی حیثیت کے لائق (یہ) خرچ شرافت کے موافق ہو (اور یہ) واجب ہے خوش معاملہ لوگوں پر۔

اس بدیہی اور واضح آیت کی تاویل فقہا نے مختلف طور سے کی ہے اور ان میں سے اکثر نے " متاعاً بالمعروف "
کے حکم کو نظر انداز کر دیا ہے۔ صرف فاطمی اور مالکی مسلک میں اس کی ادائی لازمی قرار دی گئی ہے۔ یہاں یہ امر قابلِ
غور ہے کہ اس حکم شریعت کی پابندی ہندوستان کے وہ بوہرے بھی نہیں کرتے جو فاطمی شریعت کے تابع ہیں۔
اس مسئلے کی اساس اس پر قائم ہے کہ مہر کی رقم شادی سے متعلق ہے۔ اس کی ادائی تو لازمی ہے ہی۔ لیکن
طلاق کی صورت میں مطلقہ عورت زوجگی کا جو مقام کھوتی ہے، اس لیے اس کا ہرجانہ بھی شوہر کو ادا کرنا ضروری ہے
اگر بیوی طلاق کے معاملے میں بے قصور ہو تو پھر یہ ذمے داری اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

ہرجانے کی جو تجویز فاطمی اور مالکی شرع کے مطابق میں نے پیش کی ہے اسے قانونی شکل دے کر
اس کا اطلاق ہر مطلقہ مسلمان عورت پر کیا جانا چاہیئے اور اسے مصالحتی عدالت کے صوابدید پر نہیں چھوڑنا چاہیئے۔
اس طرح اُن بدقسمت مسلمان عورتوں کے حقوق کی بڑی حد تک حفاظت ہو سکے گی جن سے بعض کو بے قصور
بھی طلاق دی جا سکتی ہے۔

(۴) طلاق کا طریقہ :- ایک طلاق

جب کسی مسلمان کا اپنی بیوی کو طلاق دینے کا ارادہ ہو تو اسے پہلے مصالحتی عدالت میں درخواست پیش
کرنی چاہیئے۔ اس عدالت کی اجازت کے بغیر کوئی طلاق جائز نہیں مانی جائے گی۔ طلاق حاصل کرنے کے لیے
وجوہ پیش کیے جانے پر اگر مصالحتی عدالت ان کی معقولیت سے پوری طرح مطمئن ہو جائے اور اس کی رائے
ہو کہ طلاق کے لیے معقول وجوہ ہیں تو پھر وہ حکم دے گی کہ :

(الف) شوہر صرف " احسن " طلاق دے سکتا ہے۔

(ب) شوہر مہر ادا کرے۔ شوہر پر مہر کی ادائی لازم ہو گی۔

(ج) مطلقہ بیوی کو شوہر " متاع الطلاق " (ہرجانہ) بھی ادا کرے گا۔

(د) فریقین کی سماجی حیثیت اور مالی حالت کے پیشِ نظر شوہر اپنی مطلقہ بیوی کو، جب تک وہ
زندہ رہے یا وہ نکاح ثانی کرے، کفالت کی رقم ادا کرتا رہے گا۔

(ہ) شادی سے جو اولاد ہوئی ہو اس کی سرپرستی اور حضانت کا پورا انتظام کیا جائے۔

(۵) حین حیاتی مفاد : ہندوستان میں حنفی مسلک کے قوانین کا جس طور پر نفاذ ہو رہا ہے اس کی رُو سے
ایک مسلمان کو، کسی دوسرے شخص کو حین حیاتی مفاد دینے میں کافی دقتوں اور پیچیدگیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

مثلاً الف کہتا ہے کہ: اگر میں ایک گاؤں میں اپنی زمین ب کو حین حیاتی مفاد کے لیے دے چکا ہوں اور بعد میں دستاویز کے ذریعے اسی کو ج کے نام ہبہ کرنا چاہتا ہوں تو اس حین حیاتی مفاد کا قیام مشتبہ ہو جاتا ہے ہو سکتا ہے کہ ساری جائداد قطعی طور پر ب ہی کی ملکیت میں آجائے۔

لیکن اگر الف نے کسی ہوشیار قانون داں سے مشورہ کیا ہوتا تو وہ یوں کہتا "میں اپنی پوری جائداد ج کو دیتا ہوں، لیکن ب کو اس جائداد سے مستفید ہونے کا حین حیاتی حق دیتا ہوں"۔ اس قسم کا ہبہ غالباً جائز قرار دیا جائے گا۔ مختصر طور پر صورتِ حال یوں ہے:

الف : ایک حنفی مسلمان اپنی حیات میں مناسب الفاظ کے ذریعے ہر قسم کی جائداد کو حین حیاتی مفاد میں بدل سکتا ہے۔

ب : شیعہ، اثنا عشری یا فاطمی مسلک میں بھی یہ صورت ممکن ہے۔

ج : لیکن یہ قانون دشوار گزار اور پیچیدہ ہے۔ "حین" اور "منافع" میں واضح طور پر فرق نہ کرنے سے صورتِ حال بدل سکتی ہے۔ اس پیچیدگی کو دور کرنے کی غرض سے قانون کو یہ شکل دینا مناسب ہوگا۔

"کوئی مسلمان اپنی ہر قسم کی جائداد کے معاملے میں حین حیاتی مفاد کسی شخص کے حق میں قائم کر سکتا ہے جو واقف کی موت کے ساتھ ختم ہو جائے گی اور اس کے بعد جائداد اس شخص کے حوالے کر دی جائے گی جسے واقف نامزد کر چکا ہو اور جو واقف کی وفات کے وقت خود بقیدِ حیات ہو۔

اس قسم کی اجارہ داری، وصیت کے ذریعہ یا ہبہ کے ذریعے قائم کی جا سکتی ہے۔ بشرطیکہ اس مفاد پر عمل کرتے وقت وہ شخص بقیدِ حیات ہو جس کے حق میں مفاد قائم کیا گیا ہو یا وصیت کے مطابق ایسا مفاد قائم کیا گیا ہو۔

(۱۴) محروم الارث کا حصہ : ایک سادہ مثال ملاحظہ ہو۔

ایک حنفی مسلمان کی وفات کے وقت اس کے دو بیٹے الف اور ب زندہ ہیں، لیکن تیسرا بیٹا ج باپ کی حیات ہی میں فوت ہو چکا ہے جس کا ایک بیٹا د زندہ ہے۔ چونکہ باپ کے مرتے وقت الف اور ب بقیدِ حیات ہیں۔ اس لیے باپ کی جائداد کے پورے وارث بھی دونوں قرار پائیں گے۔ تیسرے بیٹے ج کی اولاد د کو کوئی حصہ نہیں ملے گا۔ کیونکہ دادا کی حیات میں باپ کے انتقال کی وجہ سے پوتا محروم الارث ہو جاتا

ہے۔ دادا اپنی زندگی میں پوتے کے حق میں وصیت کرکے اس ناانصافی کا تدارک کر سکتا ہے لیکن ایسا کرنا ہمیشہ ممکن نہیں ہوتا ہے اور اس صورت میں محروم الارث اولاد شدید قسم کی ناانصافی کا شکار ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان نے اس قانون کو یکسر بدل دیا ہے۔ اب وہاں ایسا قانون رائج ہے جس کے تحت محروم الارث اولاد اتنے ہی حصے کی حق دار ہوگی جو اس کے باپ (یا ماں) کو بقید حیات ہونے کی صورت میں ملتا۔ اس قسم کا قانون عام حالات کے تحت کارآمد ہو سکتا ہے لیکن اس میں وہ گنجائش نہیں ہے جو اسلامی قوانین کا خاصہ ہے۔

میری گزارش ہے کہ اس مقصد کے لیے حسب ذیل قاعدے بنائے جائیں۔

(الف) کوئی شخص مرتے وقت محروم الارث اولاد یا اس اولاد کے وارث چھوڑے تو اس کے ترکے کی تقسیم اس طرح کی جائے گی جیسے محروم الارث کے مورث زندگی میں اپنے ورثے کے حق دار ہوئے اور ان سے محروم الارث ورثا نے حصہ حاصل کیا۔

(ب) ترکے کی تقسیم اسلامی قاعدے یعنی نرینہ اولاد کو دو حصے کے حساب سے کی جائے گی۔ دوسرے الفاظ میں ایسے قانون کا مطلب یہ ہوگا کہ ہر محروم الارث اپنے متوفی باپ یا ماں کے قائم مقام کی حیثیت اسلامی قاعدے کے مطابق اپنے متوفی باپ (دو حصے) یا متوفی ماں (ایک حصہ) کا حصہ حاصل کرے گا۔

اس قاعدے سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اس کا اطلاق صرف ان ورثا پر کیا جا سکتا ہے جو براہِ راست وارث قرار پاتے ہوں۔

(۷) <u>وراثت کے قانون کا اطلاق</u>: پہلے یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ اگر ایک شادی شدہ مسلمان جوڑا اپنے نکاح کو اسپیشل میرج ایکٹ بابت ۱۹۵۴ کے تحت رجسٹر کرا دے تو وہ ہندوستانی قانونِ وراثت کے پابند ہوں گے۔

ہندوستانی قانون وراثت میں اس کا لحاظ رکھا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص چاہے تو اپنے پرسنل لا کے بجائے اپنے آپ کو اس ایکٹ کا پابند کر سکتا ہے۔ میری گزارش ہے کہ اگر ہندوستانی قانونِ وراثت میں شادی شدہ جوڑوں کے لیے اس بات کی گنجائش رکھی گئی ہے تو پھر غیر شادی شدہ افراد یا بیوہ یا وہ رنڈوے (جن کی بیوی فوت ہو گئی ہو) اس حق سے کیوں محروم کیے جاتے ہیں؟ اگر وہ چاہیں تو ان کو پرسنل لا سے نکل کر اپنے آپ کو ہندوستانی قانونِ وراثت کا پابند کرنے کا اعلان کرنے کا اختیار ہونا چاہیئے۔ ایسا کرنا قانونی اعتبار سے بھی جائز ہوگا اور انصاف، اصول یا اس ملک کے کسی اور قانون کے خلاف بھی نہ ہوگا۔ مثلاً الف ایک غیر شادی شدہ

مسلمان ہے، خاصی دولت کا مالک ہے اور کافی عمر کو پہنچ چکا ہے۔ اس کے کئی دُور کے رشتے دار ہیں جو اس کی طرف کوئی التفات کرتے ہیں اور نہ ان میں سب یکساں طور پر حاجت مند ہیں۔ اب یہ ہو سکتا ہے کہ الف اپنی جائداد ان میں سے کسی ایک کو ترجیح دے کر اس کے نام چھوڑنے کا خواہش مند ہو۔ مسلم پرسنل لا کے مطابق وہ اس کا مجاز نہیں ہے لیکن اگر اسے یہ اختیار حاصل ہوتا کہ وصیت کے ذریعے اپنی جائیداد کو اپنے ورثا میں جس تناسب میں چاہے تقسیم کر سکتا، تو وہ ان میں سے ہر ایک کی ضرورت اور حاجت مندی کا لحاظ رکھ کر ایسا کرتا۔ یہ عمل مناسب اور نصفت کے مطابق ہے۔

خاتمۂ کلام :

مسلم پرسنل لا میں جب کسی ترمیم کا سوال پیدا ہوتا ہے تو اس کی مخالفت میں سب سے بڑی دلیل یہی پیش کی جاتی ہے کہ شریعت، دین اسلام کا جزو لاینفک ہے۔ اس لیے اس میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں ہے۔ شریعت کی پابندی قانونی حیثیت سے فرض ہے اور اخلاقی حیثیت سے لازمی ہے۔ اس لیے اس میں قطع و برید نہیں کی جا سکتی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً تو ہندوستان میں مسلم پرسنل لا کے نام سے جو قانون مروج ہے اسے "شریعت" کا درجہ دینا ہی غلط ہے۔ یہ پرسنل لا غیر دینی ہے جسے دستور ہند نے (جو "اسلامی" نہیں، "غیر دینی آئین" ہے) رائج کیا ہے۔ یہ دستور ہندوستان میں صرف مذہب اسلام ہی کو سچا مذہب تصور نہیں کرتا ہے۔ آج جو کچھ پرسنل لا میں پایا جاتا ہے اس کا صرف ایک جزو اسلامی شریعت سے مطابقت رکھتا ہے۔ ورنہ وقتاً فوقتاً اس میں جو تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا اصلی مقصد یہی ہے کہ ملک میں ہر شہری کے لیے یکساں قانون ہوں۔

دوسری بات یہ بھی یاد رکھنی چاہیے کہ بدلتے ہوئے سماجی حالات سے نئے نئے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ان کی وجہ سے عدل و انصاف کے طریقۂ کار میں بھی تبدیلیاں کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید کا حکم ہے کہ انسان کو اپنے آپ، اپنے والدین اور اپنے عزیز و اقربا کے معاملات میں بھی پورے طور پر عدل اور نصفت کا سلوک کرنا چاہئے (سورہ ۴ آیت ۱۳۵) چنانچہ شریعتِ اسلام کی یہ تعلیم ہے کہ انسان ہمیشہ عدل اور انصاف کا متلاشی رہے۔

تیسری بات یہ بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ ان اسلامی ممالک میں بھی جن میں شہریوں کی اکثریت دینِ اسلام کو مانتی ہو، تجارتی اور ثقافتی اثرات کے تحت سماجی انقلاب آ چکا ہے۔ شمالی افریقہ میں فرانسیسی اور مشرقی

وسطی میں انگریزی تعلیم نے وہاں کے تعلیم یافتہ طبقے کے ذہن کے کچھ نئے گوشے ابھارے ہیں اور خصوصاً عورتوں کے حقوق کے معاملہ میں خاص انصاف برتا جانے لگا ہے۔ یورپ میں عورت اب صرف شوہر کی مطیع و فرمانبرداری نہیں رہی بلکہ اس کی مددگار اور رفیق حیات ہے اس لیے تعدد ازدواج کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ جنسی بے راہ روی تو ساری دنیا کا مسئلہ ہے۔ اس کے باوجود مغربی تہذیب سے جتنے بھی ممالک متاثر ہیں ان میں ایک بیوی رکھنے کی پابندی ہے۔ ان ملکوں نے عورتوں کی حیثیت بہتر بنانے کے لیے قوانین وضع کیے ہیں۔ اور اس لحاظ سے یہ اقدام رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ہے۔ کیونکہ رسول اللہؐ نے عرب جیسے ملک میں جہاں عورتوں کو کوئی حقوق نہیں تھے، انھیں نہایت معقول حقوق عطا کرکے ایک سماجی انقلاب پیدا کر دیا تھا۔

جہاں انصاف ہونا چاہیئے وہاں نیا قانون وضع کرنا کوئی بدعت نہیں ہے، لہٰذا موجودہ حالات میں اپنے قوانین میں اصلاحات کی طرف قدم بڑھانے میں کوئی بُرائی نہیں ہے۔

اس سلسلے میں بعض سیاسی اعتراضات بھی پیش کیے جاتے ہیں، اس کا جواب تو یہی ہے کہ سیاست کا جواب سیاست داں ہی دیں۔ قانون کے ماہرین اپنا کام کریں۔ البتہ ایک بات صاف ہے کہ جب تک خود مسلمان اس معاملے میں آگے نہیں بڑھیں گے، حکومت اپنی طرف سے کوئی قدم نہیں اُٹھائے گی اور ابھی ایک اہم اقلیت (مسلمانوں) کی مرضی کے بغیر مشترکہ سول کوڈ کو نافذ کرنے کی کوئی تجویز نہیں ہے۔

اوپر کی بحث سے مسلم پرسنل لا کے سلسلے میں جو دقتیں سامنے آئی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) ہم ایک ہی مسلک کی شریعت اور اسی کی تاویلات سے بندھے ہوئے ہیں۔

(۲) جب کوئی شخص اپنی پہلی بیوی کی مرضی کے بغیر دوسری شادی کر لیتا ہے تو ہم پہلی بیوی کے لیے داد و انصاف کا کوئی راستہ نہیں کھولتے۔

(۳) ہم ان عورتوں کا کوئی تحفظ نہیں کرتے جن کے سروں پر ہر وقت "تین طلاقوں" کی تلوار لٹکتی رہتی ہے۔

(۴) اور نہ ہم کسی معصوم مطلقہ عورت کی کفالت (جب تک وہ نکاح ثانی نہ کر لے) کا کوئی انتظام کرتے ہیں۔

(۵) ہم نے حین حیاتی حقوق کے قانون کو پیچیدہ اور دشوار بنا دیا ہے۔

(۶) ہم نے محروم الارث اشخاص کی کفالت کا لحاظ نہیں رکھا ہے۔

(۷) ہم غیر شادی شدہ اشخاص کو اس حق سے محروم رکھتے ہیں کہ وہ وصیت کے ذریعے اپنی جائداد کا معقول حصہ کسی خاص شخص کی ضرورت کا لحاظ کرتے ہوئے اس کے نام کر جائیں۔

ان امور سے متعلق جو قانونی اصلاحات تجویز کی جا رہی ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) جہاں کہیں کسی ایک مسلک کی شریعت کا کسی ... سے ناانصافی ہو وہاں کسی دوسرے اسلامی مکتب خیال کے مسلک کے لحاظ سے انصاف حاصل کرنا چاہیئے۔

(۲) کسی شخص کو مصالحتی بورڈ کی اجازت حاصل کیے بغیر پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسرا نکاح کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔

(۳) ایک مجلس میں تین طلاقیں دے کر اسے نافذ کرنا، قانوناً موقوف کر دینا چاہیے اور مصالحتی کارروائی کا ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہیے جس سے بیوی اور بچوں کی حفاظت ہو سکے۔

(۴) طلاق کے ساتھ ہی نان و نفقے کی ادائی کی ذمے داری عائد کی جانی چاہیے۔

(۵) حین حیاتی مفاد کے قانون کو سادہ اور سہل بنایا جائے۔

(۶) براہ راست محروم الارث ہونے والی اولاد اور ان کی اولاد کو بھی اپنے مورث کے ترکے کا حق دار تسلیم کرنا چاہیے۔

(۷) ایک غیر شادی شدہ مرد یا لاولد عورت کو حق ہونا چاہیے کہ وہ وصیت کے ذریعے اپنی جائداد اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق جسے چاہے بخش دے۔

یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ میری یہ معروضات اس سلسلے میں حرف آخر کا درجہ نہیں رکھتی ہیں اور بھی کئی دوسری صورتیں ہیں جن پر غور و خوض کیا جا سکتا ہے لیکن ابتداء سادہ طریقے سے "مسلم پرسنل لا (متفرقات امور) ایکٹ" سے کی جا سکتی ہے۔ تجربے اور مطالعے کے بعد پھر مسلمانوں کے لیے ایک مفصل پرسنل لا وضع کیا جا سکتا ہے۔ غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ (ان تجویزوں کے علاوہ جو میں نے پیش کی ہیں) ہمارے لیے تین اور راستے کھلے ہیں۔

الف:۔ حالات بدستور قائم رہیں: میری گزارش ہے کہ یہ ناانصافی ہوگی۔ اس لیے میں اس کے خلاف ہوں۔

ب: ایک مفصل پرسنل لا وضع کیا جائے جو نکاح، طلاق اور وراثت کے قوانین پر مشتمل ہو ایسی

کوشش میں وقت، محنت اور روپیہ بہت صرف ہوگا۔ اس لیے میں اس کا بھی مخالف ہوں۔

ج : ایک مشترکہ سول کوڈ کا نفاذ : اگرچہ دستور ہند میں اس کی گنجائش رکھی گئی ہے، لیکن مسلمان اس کے بالکل خلاف ہیں۔ اس عمل سے ان کے دلوں کو چوٹ لگے گی اور وہ بڑی شدت سے اس کی مخالفت کریں گے۔ اس سے ایک نقصان اور یہ بھی ہوگا کہ جو معمولی اور ضروری قسم کی اصلاحات ممکن ہیں، وہ بھی رہ جائیں گی۔

میں نے جو تجویزیں اصلاحات سے متعلق پیش کی ہیں (۱) وہ کم وقت میں بہ آسانی قانونی شکل میں آسکتی ہیں (۲) ان سے مسلمانوں کی موجودہ اہم ضرورتیں پوری ہوجائیں گی (۳) عورتوں اور بچوں کے ساتھ انصاف ہوگا (۴) اس طرح مزید اصلاحات پر غور و فکر کرنے کی فضا تیار ہوسکے گی (۵) اور اس طرح مسلمان دنیا پر یہ ثابت کردیں گے کہ وہ بھی اپنی آبادی کے نصف حصے یعنی عورتوں اور بچوں کے ساتھ حق و انصاف کے معاملے میں غافل نہیں ہیں۔

نوٹ : پروفیسر تھری اے فیضی صاحب کا یہ مقالہ پہلے "اسلام اور عصر جدید" جامعہ ملیہ دہلی میں شائع ہوا تھا اور پھر بمبئی سے وہاں کے آٹھ عدد مسلمانوں کی طرف، "ضروری التماس" کے ساتھ بہت اچھے کاغذ پر شائع کیا گیا تھا۔ زندگی کے اس خاص نمبر میں وہ مقالہ پورا کا پورا اسی پمفلٹ سے لیا گیا ہے۔ ہم نے پہلے ہی طے کیا تھا کہ ان لوگوں کے خیالات بھی شائع ہونے چاہئیں جو مسلم پرسنل لا میں بنیادی تبدیلیوں کے خواہش مند ہیں تاکہ ان حضرات کی بھی پوری بات اس خاص نمبر کا مطالعہ کرنے والوں کے سامنے رہے اور وہ یہ معلوم کرسکیں کہ یہ لوگ کیا دلائل دیتے ہیں اور کس بنیاد پر بنیادی تبدیلیوں کے خواہش مند ہیں۔ چونکہ جناب آصف فیضی صاحب بہت اونچی علمی ڈگریاں رکھتے ہیں اور اپنی ترقی پسندی میں معتدل بھی سمجھے جاتے ہیں اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ انھیں کا یہ طویل مقالہ شائع کیا جائے۔

پروفیسر صاحب نے جن دلائل اور معلومات کے ساتھ اپنا یہ مقالہ مرتب کیا ہے اس کا ایک محدود اور مختصر جائزہ مولانا محمد برہان الدین سنبھلی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے اپنے ایک مقالے میں پیش کیا تھا۔ میری فرمائش پر مولانا نے اپنے مقالے کا مسودہ مجھے بھیج دیا اور وہ اس نمبر میں شائع کیا جارہا ہے۔ اس مختصر جائزے سے بھی یہ واضح ہوگا کہ پروفیسر صاحب کا دینی علوم اور اسلامی تاریخ میں مبلغ علم کیا ہے اور یہ حضرات کتنی جرأت کے ساتھ انتہائی غلط باتیں لکھتے چلے جاتے ہیں۔

مولانا عامر عثمانی مدیر ماہنامہ تجلی دیوبند نے بھی اس مقالے کا مفصل جائزہ، تجلی مارچ، اپریل ۱۹۷۲ء میں پیش کیا ہے اور وہ بھی اہل علم کے حلقے میں پسند کیا گیا ہے۔ اس مختصر نوٹ میں فیضی صاحب کے مقالے کا جواب دینا نہیں ہے بلکہ صرف یہ بتانا ہے کہ وہ کس بنیاد پر قرآن کے منصوص احکام میں بھی ترمیم و اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔

پروفیسر صاحب کا مقالہ پڑھنے کے بعد میرا احساس یہ ہے کہ اس نے یہ بات پوری طرح واضح کر دی ہے کہ مسلم پرسنل لا میں بنیادی تبدیلیاں چاہنے والے لوگ کس بنیاد پر اس میں "اصلاحات" تجویز کرتے ہیں۔ وہ بنیاد یہ ہے کہ ان حضرات کو اسلام کے پیش کردہ اصول عدل پر یقین باقی نہیں رہا۔ بلکہ یہ لوگ عدل، نصفت اور "ضمیر صادق" کے مغربی اصولوں پر ایمان لے آئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ایک جگہ پروفیسر صاحب نے بے جھجک پوری صراحت کے ساتھ تقسیم میراث کے اسلامی اصول کے مقابلے میں انسان کے وضع کیے ہوئے اصول کو بہتر اور مناسب قرار دیا ہے۔

وہ اسلامی فقہ پر انیسویں اور بیسویں صدی کے دو نہایت اہم اثرات" بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

> " جہاں کہیں ایسا محسوس ہوا کہ مروجہ قانون، عدل یا سہولت میں مانع ہو رہا ہے وہاں عدل، نصفت اور" ضمیر صادق" کے مغربی اصولوں پر عمل کیا گیا اور اگر اس سے بھی آگے بڑھنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو کوئی نئی دفعہ وضع کی گئی یا مروجہ قانون میں ترمیم کی گئی " (پمفلٹ ص ۸)

جناب آصف نہ صرف یہ کہ عدل، نصفت اور ضمیر صادق کے مغربی اصولوں کو پسند کرتے ہیں بلکہ فرانسیسی، برطانوی اور ولندیزی اقتدار نے مسلمان ملکوں میں جن اسلامی قوانین کو ختم کیا یا ان میں ترمیم کر کے ان کی جگہ نئے قوانین نافذ کیے وہ ان سب کو " اسلامی فقہ" پر نہایت اہم اثر قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک وہ قوانین اب اسلامی فقہ کا جز بن گئے ہیں۔ حالانکہ دنیا بھر کے علماء اور مسلم عوام اس کے خلاف احتجاج کرتے اور اسے صریح ظلم قرار دیتے آرہے ہیں ——— ہندوستان کے مسلمانوں کو پروفیسر صاحب نے جو نسخہ یا حکم دیا ہے وہ یہ ہے:

> " جب انسانی ضمیر کھلی ناانصافی کے خلاف حرکت میں آتا ہے تو ہم ہندوستان کے مسلمانوں کا فرض یہ ہو جاتا ہے کہ اس کا حل تلاش کریں اور اپنے قانون دوسرے ممالک کے قوانین سے اس طرح ہم آہنگ کریں کہ ان لوگوں کے ساتھ عدل ہو سکے جو اس سے محروم ہیں" (پمفلٹ ص ۱۳)

ان دوسرے ممالک کے نام تو انھوں نے نہیں لیے لیکن ظاہر ہے کہ اس سے ان کی مراد وہی ممالک ہو نگے جنھوں نے مذکورہ بالا مغربی اصول کے تحت قانون سازی کی ہوگی تاکہ مظلوموں کو وہ عدل مل سکے جسے مغربی دانشور عدل قرار دیتے ہیں۔ پروفیسر صاحب کا مقالہ جس محور پر گردش کرتا ہے وہ یہ ہے کہ جب برطانیہ نے، فرانس نے، ہالینڈ نے اور فلاں ملک نے اور فلاں ملک نے اسلامی قوانین اور مسلم پرسنل لا میں یہ اور یہ تبدیلیاں کر دی ہیں تو اب اگر اس میں مزید تبدیلیاں کر دی جائیں گی تو کون سی زمین پھٹ پڑے گی اور کون سا آسمان ٹوٹ پڑیگا۔ پروفیسر صاحب کی خدمت میں عرض ہے کہ مغربی اقتدار یا مغرب پرستیں کے اقتدار نے ڈنڈے کے زور سے جو تبدیلیاں کی ہیں انھیں مسلمانوں کے ضمیر نے کبھی قبول نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کریں گے، ان تبدیلیوں کو مزید تبدیلیوں کے لیے دلیل بنانا ہمارے نزدیک کسی مخلص مسلمان کا کام نہیں ہو سکتا۔

جیسا کہ اوپر اشارہ گزرا، پروفیسر صاحب نے ایک جگہ لگی لپٹی نہیں رہنے دی ہے۔ اور پوری صراحت کے ساتھ انسان کے وضع کیے ہوئے قانون کو شرعی قانون کے مقابلے میں بہتر اور مناسب کہا ہے۔ وہ اسپشل میرج ایکٹ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> مثلاً ایک مسلمان علی ۱۹۲۰ میں فاطمہ سے نکاح کرتا ہے۔ اس کے دو بیٹے اور بیٹیاں ہیں۔ ۱۹۶۰ میں علی اپنے نکاح کو اسپشل میرج ایکٹ ۱۹۵۴ کی دفعہ ۱۵ کی رو سے رجسٹرڈ کرا لیتا ہے، اور وصیت کرتا ہے کہ اس کی جائداد کا نصف حصہ اس کی بیوی کو دیا جائے اور بقیہ جائداد اس کے بچوں میں مساوی طور پر تقسیم کر دی جائے۔ یہ وصیت قانون کی رو سے بالکل جائز ہوگی۔ اس کے مطابق عمل کرنے سے بیوی کے حق میں اضافہ ہو جائے گا۔ .... ہمارے معاشرے کے حالات کے پیش نظر یہ ماننا پڑے گا کہ شرعی قانون کے مقابلہ میں تقسیم جائداد کا یہ اصول بہتر اور مناسب معلوم ہوتا ہے۔ (پمفلٹ ص ۱۷)

پروفیسر صاحب نے کتنی صفائی کے ساتھ شرعی قانون کے مقابلہ میں دوسرے قانون کو بہتر اور مناسب قرار دیا ہے۔ اس اظہار سے ایمان و اسلام پر کوئی حرف آیا ہے یا نہیں، اس سے قطع نظر یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ پروفیسر صاحب جیسے لوگوں اور ان مسلمانوں کی راہیں بالکل الگ ہیں جو اللہ تعالے کے نازل کردہ قوانین کو انتہائی عادلانہ اور ناقابل ترمیم و تنسیخ سمجھتے ہیں۔ صاحب مقالہ کے نزدیک سنت رسول کو وحی کا درجہ حاصل نہیں ہے اور جو وحی ہے اس کا حال یہ ہے کہ اس کے قوانین بھی اب (نعوذ باللہ) ناقص اور غیر مناسب ہیں

اوران سے عدل و نصفت کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ اب غور فرمایئے کہ ہم مسلمانوں کے پاس کیا رہ گیا اور ہم ان حضرات کو کس سند اور کس دلیل سے جواب دیں ؟ انھیں خیالات اور کارناموں کی وجہ سے جناب آصف فیضی صاحب کو یہ شرف و اعزاز حاصل ہوا ہے کہ :۔

" آصف علی اصغر فیضی کو حال ہی میں جرمنی کی انجمن مستشرقین کا رکن منتخب کیا گیا ہے جو دنیا کے ۲۰۰ ماہرین شرقیات کی رکنیت تک اپنا دائرہ محدود رکھتی ہے۔"

(قومی آواز، لکھنؤ ۲۴ ستمبر ۷۱ء)

پروفیسر صاحب کو یہ اعزاز مبارک ہو، لیکن ان کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ ابھی ہم ہندوستانی مسلمانوں کے سینوں میں ایمان کی شمع بجھی نہیں ہے اور ہمارے نزدیک ، نکاح ، طلاق ، خلع اور میراث وغیرہ کے جن احکام کی قرآن و احادیث میں صراحت ہے وہ دینِ اسلام کے ٹھیک ویسے ہی جز ہیں جیسے نماز و زکوٰۃ اور روزہ و حج کے احکام ، اس لیے ہم ان منصوص احکام میں " ترمیم و اصلاح " کو اپنے دین میں مداخلت اور صریح ظلم سمجھتے ہیں خواہ یہ مداخلت اور ظلم کوئی غیر مسلم حکومت کرے یا کوئی نام نہاد مسلم حکومت ۔

پروفیسر فیضی اور ان جیسے لوگ ـــــ جن کے نزدیک سنّت رسول کو وحی کا درجہ حاصل نہیں ہے اور جن کے نزدیک خود کتاب اللہ کے بعض احکام بھی اوٹ آف ڈیٹ اور ناقص ہو چکے ہیں ـــــ اپنے خیالات مسلمانوں میں پھیلانے اور انھیں دھوکا دینے کے لیے جگہ جگہ احادیث اور آیاتِ قرآنی کے بالکل من گھڑت معنی و مفہوم بیان کر کے انتہائی غلط استدلال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کے احتجاج کے جواب میں ان میں سے بعض لوگوں نے اب یہ کہنا بھی شروع کر دیا ہے کہ " شریعت ایکٹ ". برطانوی سرکار کا بنایا ہوا ہے اس لیے اس میں ترمیم کرنا دینِ اسلام میں مداخلت نہیں ہے ، میں سمجھتا تھا کہ مسلمانوں کو اس طرح کا مغالطہ حمید دلوائی جیسے لوگ دے رہے ہیں۔ لیکن پروفیسر صاحب کا یہ مقالہ پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس معاملہ میں استادی کا مقام انھیں کو حاصل ہے وہ اپنے مقالے کے " خاتمۂ کلام " میں لکھتے ہیں:

" مسلم پرسنل لا میں جب کسی ترمیم کا سوال پیدا ہوتا ہے تو اس کی مخالفت میں سب سے بڑی دلیل یہی پیش کی جاتی ہے کہ شریعت ، دینِ اسلام کا جز و لاینفک ہے اس لیے اس میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں ہے۔ شریعت کی پابندی قانونی حیثیت سے فرض ہے اور اخلاقی حیثیت سے لازمی ہے ، اس لیے اس میں قطع و برید نہیں کی جاسکتی ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً تو ہندوستان میں مسلم پرسنل لا کے

"... نام ہے جو قانون مروجہ کا ہے اسے "شریعت" کا درجہ دینا ہی غلط ہے۔ یہ پرسنل لا غیر دینی ہے جسے دستور ہند نے (جو "اسلامی" نہیں "غیر دینی آئین" ہے) رائج کیا ہے"

(پمفلٹ ص ۲۹)

فیضی صاحب نے یہ جو لکھ دیا ہے کہ دستور ہند نے اس پرسنل لا کو رائج کیا ہے تو اس سے غالباً ان کا مقصد یہ ہوگا کہ دستور ہند نے اقلیتوں کو جو حقوق دیئے ہیں ان کے تحت مسلم پرسنل لا کو باقی رکھا گیا ہے ورنہ پروفیسر صاحب واقف ہیں اور اسی مقالے میں پہلے خود بھی لکھ چکے ہیں کہ شریعت ایکٹ، ۱۹۳۷ء میں پاس ہوا تھا۔ کھلی بات ہے اس وقت دستور ہند کا کوئی وجود نہ تھا۔ ان کا یہ کہنا کہ مروجہ مسلم پرسنل لا یا شریعت ایکٹ ۱۹۳۷ء کو شریعت کا درجہ دینا ہی غلط ہے، ایک مغالطہ ہے جو شاید ہی کسی کو متاثر کر سکے۔ عقل و فہم رکھنے والا کوئی بھی مسلمان ۱۹۳۷ء کے اس ایکٹ کو شریعت کا درجہ نہیں دیتا بلکہ جن شرعی احکام کے تحفظ اور مسلمانوں کو قانوناً ان کا پابند بنانے کے لیے شریعت ایکٹ پاس کرایا گیا تھا۔ مسلمان ان شرعی احکام و قوانین کو دین اسلام کا جز اور شریعت اسلامی کا لازمی حصہ سمجھتے ہیں۔

مثال کے طور پر میراث میں بیٹے کو دو حصے اور بیٹی کو ایک حصہ دینا شریعت کا قانون ہے اور اس میں ترمیم کرنے یا اسے بدلنے کو وہ شریعت میں مداخلت قرار دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ نکاح، طلاق، خلع، میراث وغیرہ کے احکام خدا کے دیئے ہوئے ہیں کسی انگلستانی یا ہندوستانی سرکار کا عطیہ نہیں ہیں۔ مسلم پرسنل لا میں بنیادی تبدیلی کے لیے راستہ ہموار کرنے میں فیضی صاحب کو اس طرح کی وکیلانہ منطق اور مغالطہ انگیزی سے فائدہ نہیں پہنچے گا۔

جناب آصف علی فیضی صاحب کے اس مقالے کا جواب جناب قاضی عدیل عباسی صاحب وکیل (بستی) نے بھی لکھا ہے۔ ان کا طویل جوابی مقالہ ترجمان دہلی کے مسلم پرسنل لا نمبر میں شائع ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ فیضی صاحب کے مقالے کی غلطیاں صرف علماء ہی نے محسوس نہیں کی ہیں بلکہ وکلاء نے بھی محسوس کی ہیں۔ فیضی صاحب نے اجماع اور قیاس تک کی تعریفیں بالکل من گھڑت کی ہیں۔ ان کی تمام غلطیوں کو واضح کیا جائے تو ایک کتاب تیار ہو جائے۔

"مسلم پرسنل لا" پر فیضی صاحب کا مقالہ

ایک محدود اور مختصر جائزہ

(از مولانا برہان الدین سنبھلی، استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

ہندوستان میں مسلمان گفتنی و ناگفتنی اسباب کی بنا پر جن مسائل سے دوچار ہیں ان میں "پرسنل لا" میں تبدیلی کا خطرہ غالباً سب سے زیادہ اہم ہے۔ مسئلے کی اہمیت اور کچھ دوسری وجوہ ...... کی بنا پر آئے دن اخبارات، رسائل کانفرنسوں اور دوسرے ذرائع سے "مسلم پرسنل لا" میں تبدیلی ہونے، نہ ہونے کی ضرورت وافادیت پر اظہار خیال کیا جاتا رہتا ہے۔

اسی سلسلے کی کڑی، ہندوستان کے مشہور دانشور اور قانون داں پروفیسر آصف، فیضی صاحب کا مضمون بھی ہے جس کا ترجمہ پچھلے دنوں ـــ اسلام اور عصر جدید، دہلی ـــ میں شائع ہوا ہے اور بعض حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا اور پسند کیا گیا۔ غالباً موصوف کی شخصی اہمیت اور مضمون کی خاص نوعیت کے پیش نظر ان کے بعض قدر دانوں نے اسے "مسلم پرسنل لا" کے نام سے الگ بھی شائع کر دیا ہے۔

چند روز پہلے ہمیں بھی اسے دیکھنے کا موقع ملا۔ مضمون نگار نے قانونی اور دوسری حیثیتوں سے مسئلے پر بحث کرنے کے علاوہ قرآن کی آیات اور فقہاء کے اقوال سے بھی حصول مدعا کی کوشش کی ہے یہی حصہ ہمارے لیے سب سے زیادہ دلچسپی اور توجہ سے پڑھنے کا تھا۔ مگر طالب علمانہ انداز نظر سے دیکھنے کے بعد یہ حقیقت سامنے آئی کہ موصوف سے قرآن مجید کی آیات سے استدلال اور فقہاء کی صراحتوں سے استشہاد کرتے وقت نہ صرف یہ کہ ان کے مفہوم سمجھنے میں لغزشیں ہوئیں بلکہ ائمہ کے اقوال اور ان کی آراء نقل کرنے میں بھی شدید قسم کی فرو گذاشتیں ہو گئیں۔ اس لیے علمی دیانت کا تقاضا بلکہ فریضہ معلوم ہوا کہ ان کی نشان دہی

کی جائے تاکہ غلط فہمی دور ہو جائے اور جن ذہنوں میں وہ چیز یں اثر انداز ہو گئی ہیں ان کو نظر ثانی کا موقع مل جائے۔

بس یہی احساس ہے جس کی بنیاد پر یہ گذارشیں پیش کی جا رہی ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ محترم فیضی صاحب ان حقائق کے سامنے آ جانے کے بعد اپنے مضمون پر نظر ثانی کر لیں گے، یا پھر اس خلش کو دور کرنے کی طرف توجہ دیں گے۔

فی الحال صرف اسی فریضے کی ادائیگی پیش نظر ہے۔ نفس مسئلہ (پرسنل لا میں تبدیلی) پر اس وقت نہ رائے زنی مقصود ہے اور نہ اس کے حسن و قبح سے بحث کرنا ہے۔ کیونکہ وہ ایک طویل الذیل اور مستقل موضوع ہے۔ تھوڑے وقت اور محدود مطالعہ سے اس پر کچھ لکھنا مسئلے کو سلجھانے کے بجائے الجھانے کا باعث بھی ہو سکتا ہے۔ آئندہ خدا نے توفیق دی تو اصل مسئلے پر بھی روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی۔ وما توفیقی الا باللہ۔

۱۔ فیضی صاحب نے مطلقہ عورت کو شوہر کی طرف سے مختلف مدوں میں (مثلاً مہر کفالت کے لیے تاحیات یا عقد ثانی تک) ایک رقم ادا کرنے کی تجویز پیش کرتے ہوئے (متاع الطلاق (طلاق کا ہرجانہ) کی ضرورت بھی ظاہر کی ہے اور اس پر اس طرح استدلال کیا ہے۔

> "مذکورہ بالا ضمنی دفعہ (د) کی متاع الطلاق کی ادائی کی تجویز میری ہے جو میں نے فاطمی اور مالکی فقہ کی بنیاد پر پیش کی ہے۔ اس کا اصول یہ ہے کہ شوہر مطلقہ بیوی کو مہر کے علاوہ ایک رقم بطور ہرجانہ ادا کرتا ہے ـــــ اس اصول کی بنیاد قرآن مجید کی یہ آیت ہے۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ	تم پر کوئی گناہ نہیں، کہ تم ان بیویوں کو
النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا	جنھیں تم نے نہ ہاتھ لگایا اور نہ ان کے لیے
لَهُنَّ فَرِيضَةً وَمَتِّعُوهُنَّ عَلَى	مہر مقرر کیا طلاق دے دو۔ وسعت والے
الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ	کے ذمے اس کی حیثیت کے لائق ہے اور تنگی
مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى	والے کے ذمے اس کی حیثیت کے لائق (یہ)
الْمُحْسِنِينَ ۝	خرچ شرافت کے موافق ہو (اور یہ) واجب ہے
(البقرۃ: ۲۳۶)	خوش معاملہ لوگوں پر

اس بدیہی حکم اور واضح آیت کی تاویل فقہاء نے مختلف طور پر کی ہے اور ان میں سے اکثر نے "متاعا بالمعروف" کے حکم کو نظر انداز کر دیا ہے۔ حضرت فاطمی اور مالکی مسلک میں بھی اس کی ادائگی لازمی قرار دی گئی ہو گی۔

(صفحہ ۲۵ سطر ۴ تا ۱۵)

اس طویل اقتباس کا حاصل تین چیزیں ہیں۔

۱۔ آیت مذکورہ سے ہر قسم کی مطلقہ کے لیے متاع الطلاق کا وجوب ثابت ہو رہا ہے۔

۲۔ اکثر فقہاء نے اسے نظر انداز کر دیا

۳۔ حضرت فاطمی اور مالکی مسلک میں اس کی ادائی لازمی قرار دی گئی ہے۔

اب آیئے دیکھیں کہ ان دعاوی میں کتنی صداقت ہے؟

الفاظِ آیت میں غور کرنے سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ "مَتِّعُوهُنَّ" کا حکم ان مطلقہ عورتوں کے ساتھ مخصوص ہے جن کا نکاح کے وقت نہ تو مہر مقرر ہوا تھا، اور نہ ان سے عملاً تعلق زوجیت ہی قائم ہوا آیت کے الفاظ مالم تمسوھن اولم تفرضوا لھن" خاص طور سے قابل لحاظ ہیں۔ مضمون میں بھی اس حصے کا ترجمہ یہ کیا گیا ہے۔ "جنھیں تم نے ہاتھ نہ لگایا اور نہ ان کے لیے مہر مقرر کیا"۔ اسی طرح مستند اردو ترجمے کا جو قرآن مجید چاہیے دیکھ لیجیے، سب میں یہی ملے گا (ان میں چاہے تھوڑا بہت الفاظ کا فرق ہو) کہ بغیر مہر مقرر کیے اور بغیر ہاتھ لگائے جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہے صرف ان کے لیے حکم ہے نہ کہ تمام مطلقہ عورتوں کے لیے۔[1]

تمام قدیم عربی تفسیروں میں بھی یہی ملتا ہے۔ مثلاً مشہور مفسر علاء الدین علی الخازن لکھتے ہیں:[2]

ای لم تمسوھن ولم تفرضوا لھن فریضۃ یعنی ولم تعینوا لھن صداقا ولم توجبوہ علیکم ...... فنفی اللہ الحرج والجناح عنہ اذا کان الفراق اردحمن الامساک ..... اذا تزوج امراۃ ولم یفرض لھا مہرا ثم طلقھا قبل المسیس یجب لھا علیہ المتعۃ وبہ قال الشافعی و ابوحنیفۃ واحمد وقال مالک المتعۃ مستحبۃ

---

[1] مثلاً دیکھیے ترجمان القرآن مولانا آزاد ج ۱ ص ۲۸۳، بیان القرآن مولانا تھانوی ج ۱ ص ۱۳۱

[2] تفسیر خازن ج ۱ ص ۱۵۱

آیت کا یہی تفسیر تھوڑے سے فرق سے تقریباً ہر معتبر تفسیر کی کتاب میں ملتی ہے[1] ان سب کا مفہوم یہی ہے کہ اگر کسی عورت کو بغیر مہر مقرر کیے اور بغیر ہاتھ لگائے طلاق دے دی گئی تو اس کی دل شکنی کے تدارک کے طور پر شوہر کو کچھ ضرور دینا چاہیے۔ اپنی استطاعت کے مطابق تاکہ دل شکنی کی یک گونہ تلافی ہو جائے۔

(وان کان فی ھذا انکسار لقلبھا ولھذا امر اللہ تعالیٰ بامتاعھا وھو تعویضھا عما فاتھا) (ابن کثیر)

وجوب متعہ کے سلسلے میں ائمہ کا مسلک اور آیت کا یہی مفہوم تقریباً ہر تفسیر میں ملتا ہے کہ اس صورت میں متعہ (طلاق کا ہرجانہ[2]) شوہر پر واجب ہے لیکن کن ائمہ کے نزدیک؟ (نہایت حیرت کی بات یہ ہے کہ صرف فیضی صاحب کے بیان کردہ) امام مالکؒ کے نزدیک نہیں بلکہ ان کے علاوہ تمام ائمہ یعنی ابوحنیفہؒ، شافعیؒ، احمدؒ کے نزدیک گویا فیضی صاحب نے جن ائمہ پر آیت کو نظر انداز کر دینے کا الزام لگایا تھا انہی کے یہاں سب سے زیادہ آیت کی رعایت نکلی اور جن کے بارے میں انھوں نے وجوب کا دعویٰ کیا تھا ان کے یہاں بظاہر سب سے کم رعایت ملتی ہے (نظر انداز انھوں نے بھی نہیں کیا) یعنی امام مالک کے یہاں متعہ صرف مستحب ہے۔ یہ تصریح خود اُن کے شاگرد نے براہ راست انھی سے ہی نقل کی ہے۔ دیکھیے عبدالرحمٰن بن القاسم سحنون التنوخی کو جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

سحنون نے سوال کیا۔ (قلت) ارایت ھذہ التی طلقھا زوجھا قبل ان یدخل بھا ولم یفرض لھا صداقا لم لا یجبرہ مالک علی المتعۃ وقال اللہ تبارک وتعالیٰ فی ھذہ بعینھا وجعل لھا المتعۃ فقال لا جناح علیکم ان طلقتم النساء ... (قال) قال مالک انما خففت عندی فی المتعۃ ولم یجبر علیھا المطلق فی القضاء فی رای لانی اسمع اللہ تعالیٰ

---

[1] مثلاً دیکھیے تفسیر بیضاوی سورہ بقرہ ص۱۵۵ مطبع مجتبائی دہلی، ابن کثیر ص۲۸۵ ج۱ ص۲۸۶، احکام القرآن لابن العربی ص۹۱، ۹۲ ج۱، موضع الذکر کے بیان آیت کی تفسیر میں دو قول اور ملتے ہیں لیکن جمہور کے قول کو ہی ظاہر قرار دیا ہے۔ دیکھیے ص۱۰۹،
[2] فقہی اصطلاح میں اسی کو متعہ کہتے ہیں۔ یہاں اس لفظ سے نکاح کی مخصوص قسم جو منسوخ ہو چکی ہے مراد نہیں ہے

يقوله حقا على المحسنين وحقا على المتقين فلذلك خففت فلم يقض بها[1]

سحنون نے عبدالرحمن بن القاسم (تلمیذ امام مالک) سے سوال کیا کہ امام مالک ایسی عورت کے لیے متعہ کو لازم کیوں قرار نہیں دیتے کہ جس کے بارے میں قرآنی آیت نے متعہ کا حکم دیا ہے (اور پھر آیت تلاوت کی) عبدالرحمن نے جواب دیا۔ امام مالک نے فرمایا ہے کہ میرے نزدیک متعہ کے حکم میں تخفیف اس لیے ہو گئی ہے کہ آگے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "یہ متعہ ان لوگوں پر ہے جو اچھا برتاؤ کرنے والے ہیں"۔ (ہر شخص پر نہیں ہے)

ابن رشد مالکی نے امام مالک کے استدلال اور ان کی بیان کردہ آیت کی توجیہ وضاحت کے ساتھ بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں

"واما مالك فانه حمل الامر بالمتعة على الندب لقوله تعالى في اخر الاية (حقا على المحسنين) اى على المتفضلين المتجملين وما كان من باب الاجمال والاحسان فليس بواجب[2] (یعنی متعہ کا حکم آیت میں لازمی اور وجوبی نہیں معلوم ہوتا، بلکہ حسن اخلاق اور مروت کے طرز کا معلوم ہوتا ہے۔ لہذا یہ واجب نہیں ہونا چاہیے)

ان سے قبل انہی کے چچا صاحب "المنجد"[3] کے بیان کے مطابق) اور ان کے ہم نام "ابن رشد (اول) اس اعتراض کا جواب دے چکے ہیں کہ دراصل امر تو وجوب کے لیے آتا ہے۔ پھر امام مالک نے یہاں وجوب کیوں نہیں مراد لیا۔ فرماتے ہیں:۔

"فمتعوهن" امر بالمتاع والامر على الوجوب مالم يقترن به قرينة تصرفه عن الوجوب الى الندب وقد اقترن به قرائن تدل على ان المراد به الندب من ذالك تخصيصه بها المحسنين من غير المحسنين[4] (امر وجوب کے لیے اس وقت آتا ہے جب کوئی قرینہ اس کے خلاف نہ ہو، اور یہاں ایسے قرائن

---

[1] المدونة الكبرى ص ۲۵ ج ۲ [2] بداية المجتهد ص ۹۷ ج ۲ مطبعة الاستقامة، مصر
[3] المنجد معجم لاعلام الشرق والغرب ص ۲۱۷ [4] المقدمات ص ۲۵ ج ۲

موجود ہیں منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ متعہ کا حکم محسنین کے ساتھ خاص کر دیا گیا ہے۔

(یعنی ہر ایک کے لیے نہیں ہے)

بہر حال امام مالکؒ کے مسلک میں کوئی بھی ایسا قول نہیں ملتا کہ جس سے وجوب کا پتہ چلتا ہو۔ تو معلوم فیضی صاحب نے یہ کہاں سے اخذ کیا۔ موصوف حوالہ دے دیتے تو اچھا ہوتا۔

اوپر کی سطروں میں جیسا کہ امام مالکؒ کا مسلک صرف دوسروں کے نقل کرنے سے نہیں بلکہ خود امام کے قول اور ان کے مقلدین کے نقل کرنے سے معلوم و متعین ہو چکا ہے اسی طرح دوسرے ائمہ کا مسلک بھی ان کے مقلدین کے بیان اور اقوال میں ملتا ہے، مفسر خازن شافعی المسلک ہیں۔ انھوں نے امام شافعی کا قول وجوب ہی نقل کیا ہے جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے۔ اب دیکھیے حنفی مسلک کی سب سے مشہور اور مستند کتاب ہدایہ میں امام ابوحنیفہؒ کا کیا مسلک بیان کیا گیا ہے؟

ولو طلقها قبل الدخول فلها المتعة لقوله تعالیٰ "ومتعوهن على الموسع قدره وعلى المقتر قدره" ثم هذه المتعة واجبة رجوعاً الى الامر وفيه خلاف مالك[1] اگر ایسی عورت کو (کہ جس کا مہر مقرر کیا گیا ہو) دخول سے پہلے ہی طلاق دے دی تو اس کے لیے شوہر پر متعہ ہے، اللہ تعالیٰ کے حکم کی بنا پر۔ (اور آیت ذکر کی) اور یہ متعہ واجب ہے آیت میں امر کی بنا پر، اور اس میں صرف امام مالکؒ کا اختلاف ہے۔

ہدایہ کے شارح محقق ابن ہمامؒ نے اس عبارت کے بعض حصوں کی شرح بھی کر دی ہے جس سے اور وضاحت ہو گئی۔ دیکھیے فرماتے ہیں:۔

قوله هذه المتعة اى متعة المطلقة قبل الدخول التى لم يفرض لها مهر فى العقد واجبة عندنا وعند الشافعى واحمد ..... وقوله رجوعاً الى الامر ..... هو قوله تعالىٰ "وَمَتِّعُوهُنَّ" عقيب قوله "لا جناح عليكم"[2]

غور فرمایئے، تمام ائمہ اور ان کے متبعین اسی آیت سے استدلال کرتے ہوئے متعہ کا حکم دے رہے ہیں اور یہ "متعوهن" کا تقاضا ہے۔ کیونکہ صیغہ امر ہی کا ہے (متاعاً بالمعروف کا نہیں جیسا کہ فیضی صاحب سمجھتے ہیں)

لہ ہدایہ اولین ص۳۲۵ ج۲ حنفی مسلک کی تمام کتابوں میں یہی ملتا ہے۔ ۲ہ فتح القدیر ص۔۔۔ ج۲ مطبع نولکشور لکھنؤ

حنفی فقیہ ابن نجیم نے احناف کا مسلک یعنی وجوب متعہ بیان کرنے کے بعد امام مالک کے استدلال اور ان کی توجیہ کا جواب بھی دیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

لها المتعة ان لم یسم شیئا .... ثم هذه المتعة واجبة رجوعا الی الامر ولا یکون لفظ المحسنین قرینة صارفة الی الندب لان المحسن اعم من المتطوع والقائم بالواجب مع ما انضم الیه من لفظ حقاً وعلی[1]

(متعوهن میں امر وجوب ہی کے لیے ہے اور لفظ "المحسنین" ایسا قرینہ نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے امر کا اصل تقاضا (وجوب) نظر انداز کر کے اسے مستحب پر محمول کیا جائے کیونکہ "محسن" ضروری اور مستحب دونوں قسم کے کام کرنے والوں پر بولا جا سکتا ہے۔ مزید برآں یہ کہ آیت میں حقًّا" اور "علی" بھی ہے (جس سے وجوب کے پہلو کو مزید تقویت پہنچتی ہے)

خلاصہ کلام یہ کہ ائمہ ثلثہ کے یہاں اسی آیت کی بنا پر اس مطلقہ کے لیے جس کا آیت میں ذکر ہے متعہ واجب ہے۔ اس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ ان حضرات میں سے کسی نے بھی آیت کو نظر انداز نہیں کیا (بشمول امام مالک بلکہ ان کے بارے میں ایسا سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ ایسی بدگمانیاں اسی ذہن میں راہ پا سکتی ہیں جو ائمہ کا مرتبہ شناس نہ ہو اور ان کے بارے میں صحیح معلومات نہ رکھتا ہو

۴۔ فاضل مضمون نگار تحریر فرماتے ہیں:۔

"حنفی اور فاطمی شریعت کے ماتحت ایک بیوہ، اپنے شوہر کی املاک میں سے کسی حصے کی دعویدار نہیں ہو سکتی۔" (ص سطر ۶)

فاطمی شریعت کے بارے میں ہماری معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس لیے ہم محترم فیضی صاحب کے "فاطمی شریعت" کے پیش کردہ کسی بھی مسئلے پر اظہار خیال سے معذور ہیں۔ لیکن حنفی مسلک (نہ کہ شریعت) کیونکہ شریعت تو صرف نبی ﷺ کی طرف منسوب کی جاتی ہے کسی فقیہ یا مجتہد کی طرف نہیں کے بارے میں وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ نہ صرف حنفی بلکہ شافعی، مالکی اور حنبلی کسی بھی امام کے یہاں یہ قول نہیں مل سکتا کیونکہ بیوہ کا شوہر کی ہر قسم کی متروکہ چیزوں میں حصہ دار ہونا قرآن کی نص صریح سے ثابت ہے۔ اور خود فیضی صاحب

[1] البحر الرائق ص ۱۵۲ ج ۳

بھی اپنے اس مضمون میں زیر بحث عبارت سے متصل قبل اس کا اعتراف کر چکے ہیں کہ "موجودہ مسلم پرسنل لا کے تحت بیوہ شوہر کی صرف آٹھویں حصہ کی حق دار ہوتی ہے"۔ اس لیے ہم پورے طور پر نہیں سمجھ سکے کہ جج یہ کیا بات فرما گئے ؟ یہ عبارت پڑھ کر لکھنے والے کے بارے میں یہ تاثر قائم ہو جانا لازمی ہے کہ شرعی قوانین کے مطالعہ کی اس نے زحمت نہیں اٹھائی کیونکہ ان کے خیال میں (جیسا کہ الفاظ سے ظاہر ہو رہا ہے) "حنفی اور فاطمی مسلک کے مطابق بیوہ اپنے شوہر کی مملوکہ اشیاء میں جج یا منصف کے یہاں اپنے حق وصول کرنے کا دعویٰ نہیں کر سکتی ہے"

حالانکہ تمام فقہی شہادتیں اس کے بالکل برخلاف ہیں بلکہ ہمیں تو حنفی فقہ کی ایسی کتاب کہ جس کے مطابق طویل مدت تک ہندوستان کی عدالتوں کی فیصلے ہوتے رہے ۔ اس میں ایسی نظیریں بھی ملتی ہیں ۔

رجل ادعی علی امراۃ انہ تزوجھا	ایک شخص نے ایک عورت کے بارے میں
وانکرت ثم مات الرجل فجاءت	یہ دعوے کیا کہ میں اس سے نکاح کر چکا ہوں اور
تدعی میراثھا فلھا المیراث ،	وہ عورت منکر ہے (مگر اس کے باوجود) اس مدعی
ھکذا فی المحیط [1]	شخص کے مرنے کے بعد وہ عورت میراث کا دعویٰ
	کرتی ہے تو اس کو میراث کا حق ہے ۔

غور کیجیے ! عورت ایک شخص کی زندگی میں اس کی بیوی ہونے سے انکار کرتی ہے مگر اس کے مر جانے کے بعد منصف یا جج کے یہاں اسی شخص کے مال میں اس کی بیوی ہونے کی بنیاد پر دعویدار بنتی ہے تو حنفی فقہ کے مطابق اسے مقررہ حصہ دلوا دیا جائے گا ۔ کیونکہ مرنے والے نے تو خود کو، اس عورت کا شوہر کہا تھا، لہٰذا اس کا اقرار معتبر مان لیا گیا ۔

اور سنیے !

ولوادعیا نکاح امراۃ ..... واقاما البینۃ فمات احدھما فاقرت المراۃ بنکاح المیت صح اقرارھا ویقضی لھا بالمھر والمیراث [2]

یہ صورت عورتوں کے حقوق کی رعایت پر پہلی صورت سے بھی زیادہ واضح طور پر دلالت کرتی ہے ۔ ایک عورت کے بارے میں دو دعوے دار ہیں اور ہر ایک یہ کہتا ہے کہ اس عورت کا مجھ سے نکاح

[1] عالمگیری ص ۴۲ جلد رابع مطبعۃ الکبریٰ الامیریہ بولاق مصر اشاعت ۱۳۱۰ھ
[2] ایضاً ص ۹۴

ہوتا ہے ..... اور دو قلیل نے گواہ بھی پیش کر دیے۔ ابھی فیصلہ نہ ہو پایا تھا کہ ایک مدعی دنیا سے چل بسا۔ اب عورت اس مرنے والے سے نکاح ہو چکنے کا اقرار کر لیتی ہے تو حنفی فقہ کی رو سے اس عورت کو متوفی کی بیوی مان کر مہر اور ترکہ دونوں چیزیں ملیں گی۔

یہاں یہ بات ذکر کر دینا بھی بے محل نہ ہوگا کہ زوجہ، ان ورثہ میں سے ہے جو کبھی ترکے سے محروم نہیں ہو سکتے۔ فقہ حنفی کی شہرۂ آفاق کتاب اب جس پر تمام تر اکثر فتاوی کا مدار ہے یعنی درمختار میں ہے۔ ولا یحرم ستۃ من الورثۃ بحال البتۃ الاب ..... والزوجان ...الخ

واقعہ یہ ہے کہ زوجہ کسی بھی وارث سے، شریعت کی نظر میں کم اہمیت نہیں رکھتی، بلکہ اسے کچھ امتیاز بھی حاصل ہے۔ مثلاً یہ حکم ہے کہ تمام ورثہ میں اس کا حصہ پہلے لگایا جائے [۲]

ترکہ کی تقسیم و حصص کی حکمتوں پر حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے بڑا حکیمانہ کلام کیا ہے۔ اس کے لیے دیکھیے حجۃ اللہ البالغہ [۳]

عام طور پر یہی مشہور ہے کہ زوجہ کو شوہر کے مال میں سے صرف آٹھواں حصہ ملتا ہے، حالانکہ یہ بات اپنے اندر جزوی صداقت رکھتی ہے۔ کیونکہ آٹھواں حصہ شوہر کے اولاد ہونے کی صورت میں ملتا ہے ورنہ چوتھا حصہ ملتا ہے۔ آیت میں اس کی صراحت موجود ہے، بلکہ پہلے اسی صورت کا ذکر ہے۔ (وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَمْ يَكُنْ لَكُمْ وَلَدٌ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ) [۴]

۳۔ تین طلاقوں کے بارے میں تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

۱۔ تین طلاقوں کا قاعدہ بدعت بھی ہے اور مکروہ بھی اور یہ طریقہ شیعہ اثنا عشری یا فاطمی شریعت میں ناجائز ہے، مگر حنفی شرع میں جائز مانا گیا ہے۔

۲۔ یہ صورت بعض تاریخی حالات کے تحت بہت بعد میں پیدا ہوئی (صلا۔ ۳۴ء)

---

[۱] درمختار مطبوعہ برحاشیہ شامی ج ۵ ص ۴۹۷

[۲] ایضاً صفحہ ۴۹۷ جلد ۵۔ اصل عبارت ہے:۔ ثم یبدأ بذوی الفروض مقدما الاربعۃ اور یہ بات مسلمات فن میں سے ہے کہ ترکے کی تقسیم میں ذوی الفروض مقدم ہوتے ہیں دیکھیے سراجی صلا (فیبدأ باصحاب الفرائض)

[۳] حجۃ اللہ جزء ثانی صلاا، ۱۱۹، مکتبہ رشیدیہ دہلی [۴] سورہ نساء آیت ۱۲ پارہ ۴

بیک وقت تین طلاقوں کے ناپسندیدہ ہونے پر ہمیں اتفاق ہے اور اکثر فقہاء نے اسے ناجائز کہا ہے مگر کسی فعل کا ناجائز ہونا اور بات ہے اور اس کا اثر انداز ہونا علیحدہ بات۔ اگر موصوف کا حنفی شرع میں جائز مانا گیا ہے سے یہ مطلب ہے کہ تین طلاقوں کو امام ابو حنیفہؒ مؤثر مانتے ہیں تو یہ خیال صحیح ہے مگر اس میں امام صاحب منفرد نہیں ہیں بلکہ بلا استثناء تمام ائمۂ اربعہ اور جمہور علماء یہی فرماتے ہیں جیسا کہ علامہ محی الدین نووی شارح مسلم فرماتے ہیں:۔

من قال لامرأتہ "انت طالق ثلثاً" فقال الشافعی ومالک وابو حنیفۃ واحمد وجماھیر العلماء من السلف والخلف یقع الثلاث[1]

اور اگر جائز کا مطلب وہ ہے جو عام طور پر لیا جاتا ہے یعنی ناجائز و حرام کا مقابل، تب امام ابو حنیفہ کی طرف یہ نسبت غلط ماننی پڑے گی۔ کیونکہ تمام حنفی علماء کا مسلک یہی ہے کہ بیک وقت تین طلاقیں دینا بدعت اور گناہ ہے۔ (اگرچہ طلاقیں تین ہی پڑ جاتی ہیں) فقہ کی تمام مستند کتابوں میں یہ مسئلہ ملتا ہے مثلاً ہدایہ میں ہے:۔

"وطلاق البدعۃ ان یطلقھا ثلاثا بکلمۃ واحدۃ او ثلثا فی طھر واحد فاذا فعل ذالک وقع الطلاق وکان عاصیا[2]

طلاق بدعت یہ ہے کہ یکبارگی تین طلاقیں دی جائیں، یا ایک طہر میں تین مرتبہ طلاق دی جائے اگر ایسا کر لیا تو یہ طلاقیں پڑ جائیں گی اور گنہگار ہوگا۔ یہی بات امام مالک بھی فرماتے ہیں۔ جیسا کہ ابن رشد المالکی نقل کرتے ہیں:۔

"لا یجوز عند مالک ان یطلقھا ثلثا فی کلمۃ واحدۃ فان فعل لزمہ[3]

امام مالکؒ سے براہ راست بھی ان کے شاگرد یہی نقل کر رہے ہیں۔

"(قال) سحنون قلت لعبد الرحمن بن القاسم ھل کان مالک یکرہ ان یطلق الرجل امراتہ ثلث تطلیقات فی مجلس واحد (قال) یکرھہ اشد

[1] شرح مسلم للنووی ص۴۷۸ ج۱

[2] ہدایۃ اولین ص۳۵۵ ج۲ و بدائع ص۹۶ ج۳

[3] المقدمات ص۴۰۲ ج۲ و بدایۃ المجتہد ص۶۱ ج۲

المکرامیۃ (قلت) فان هو طلقها ثلٰثا او عند کل طهر واحدۃ حتی طلق ثلٰثا ایلزمہ ذلک فی قول مالک (قال) نعم[1]

امام شافعی اور امام احمد رحمہ اللہ کے یہاں تین طلاقیں بیک وقت دینا حرام نہیں ہے بلکہ نامناسب اور خلاف اولیٰ ہے اور یہی سب نے نقل کیا ہے۔ مثلاً نووی کہتے ہیں:۔

اما جمع الثلاث دفعۃ فلیس بحرام عندنا لکن الاولیٰ تفریقها وبہ قال احمد وابو ثور وقال مالک والاوزاعی وابو حنیفۃ واللیث هو بدعۃ[2]

خود امام شافعی "الام" میں فرماتے ہیں:۔

(قال الشافعی) ---- ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذ لم یعب الطلاق الذی هو ثلٰث دلیل علی ان الطلاق بید الزوج ما ابقی منہ ابقی لنفسہ وما اخرج منہ اخرج من ید لا یلزمہ غیر محرم علیہ کما لا یحرم علیہ ان یعتق رقبۃ[3]

امام شافعیؒ کا مطلب یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکمل طلاق کو جو تین طلاقوں پر مشتمل ہوتی ہے معیوب نہیں قرار دیا۔ یہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ طلاق کا معاملہ پورے طور پر شوہر کے اختیار میں ہے پس وہ (تین میں سے) جتنی چاہے دے دے، جتنی چاہے باقی رکھے۔ اس میں حرام ہونے کا کوئی سوال نہیں جس طرح اپنے غلام کو آزاد کرنا حرام نہیں (حالانکہ یہاں بھی اپنی چیز اپنے ہاتھ سے کھو دی)۔

غور فرمائیے کہ کتابچہ میں پیش کردہ بات سے حقیقت کتنی مختلف ہے۔ اس صورت حال کے بارے میں فاضل مقالہ نگار تحریر فرماتے ہیں کہ "بعض تاریخی حالات کے تحت بعد میں پیدا ہوئی" اچھا ہوتا اگر موصوف وہ تاریخی حالات پیش فرما دیتے۔ عبارت کا مطلب الفاظ سے یہی نکل رہا ہے کہ تین طلاقیں دینے کا رواج، یا بیک وقت دی گئی تین طلاقوں کا مؤثر ہونا زمانۂ نبوت کے بعد کی پیداوار ہے حالانکہ ان دونوں (تین طلاقوں کا دینا، اور ان کا مؤثر ہونا) قسم کے واقعات کا ثبوت زمانۂ نبوت میں بھی ملتا ہے اور صحابہ کرام کے دور میں بھی۔

امام بخاریؒ نے اس موضوع پر مستقل باب قائم کیا ہے "باب من اجاز طلاق الثلاث"

---

[1] المدونۃ ص ۶ ج ۲ [2] شرح مسلم للنووی ص ۴۷۸ ج ۱ [3] کتاب الام للامام الشافعی ص ۱۲۲ تا ۱۲۳ ج ۵

اس کے تحت دو حدیثیں ذکر کیں۔ پہلی حدیث کے آخر میں ہے۔ "فطلقها ثلاثاً" دوسری حدیث اس طرح ہے:۔

"ان رجلاً طلق امرأته ثلاثاً فتزوجت فطلق فسئل النبی صلی اللہ علیہ وسلم اتحل للاول قال لا حتی یذوق عسیلتها کما ذاق الاول"[1]

مفہوم:۔ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں۔ پھر اس مطلقہ نے ایک دوسرے شخص سے نکاح کیا۔ اس نے بھی طلاق دے دی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ اس عورت کا پہلے شوہر سے نکاح ہو سکتا ہے یا نہیں؟ آپ نے فرمایا اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک یہ دوسرا شوہر اس عورت سے اسی طرح لطف اندوز نہ ہولے جس طرح پہلا شوہر ہوا تھا

دوسری جگہ بخاری میں ایک اور حدیث اسی مضمون کی موجود ہے[2] اس مضمون کی احادیث امام مالک اور امام شافعی کے یہاں بھی ملتی ہیں۔ اور مؤخر الذکر نے تو "کتاب الام" میں پورے دو صفحے کے اندر اس مضمون کی احادیث جمع کی ہیں۔ تفصیں وہاں دیکھ لی جائے[3] اور امام مالک نے بھی اس مضمون کی احادیث "موطا" میں نقل کی ہیں[4]

بعض اہل علم کو مسلم کی ایک روایت سے غلط فہمی ہوئی ہے۔ حالانکہ مسلم کے مشہور شارح محی الدین نووی نے اور ان کے علاوہ دیگر بہت سے علماء نے روایت کا صحیح محمل بتا دیا ہے۔ یہاں کسی پہلو کو ترجیح دینے یا نہ دینے کی بحث نہیں ہے۔ بس ایک بات اس سلسلے میں ذکر دینا شاید نامناسب نہ ہو، وہ یہ کہ اس روایت (مسلم کی روایت) کے راوی حضرت عبداللہ بن عباس ہیں۔ اگر اس روایت کا وہی مفہوم ہوتا جو استدلال کرنے والے اخذ کرتے ہیں تو راوی اس کی مخالفت کیوں کرتے۔ موطا امام مالک میں موجود ہے کہ ایک شخص نے ان سے کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دے دی ہیں۔ اب آپ کی کیا رائے ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس نے فرمایا کہ اس پر تین طلاقیں پڑ گئیں اور رشتہ نکاح منقطع ہو گیا۔ تو نے اللہ کی کتاب سے مذاق کیا اور ان ہی سے دوسرے شخص نے آ کر تین طلاقیں دینے کا ذکر کیا اس کو بھی ایسا ہی جواب دیا۔

(احکام القرآن للجصاص)

---

[1] بخاری ص۷۹۲ ثانی مطبوعہ مکتبہ رحیمیہ دیوبند　　[2] بخاری جلد ثانی ص۷۹۹

[3] دیکھیے "کتاب الام" جلد خامس ص۱۲۲ تا ۱۲۴　　[4] موطا امام مالک ص۲۰۰

ان کے علاوہ بکثرت صحابۂ کرام سے تین طلاقوں کا معتبر ماننا ثابت ہے۔ ابوبکر جصاص نے احکام القرآن میں اور ملا علی قاری نے مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں ان روایات کو جمع کر دیا ہے، جن میں حضرت عمرؓ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ، حضرت عثمان بن عفانؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت ابوہریرہؓ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ شامل ہیں۔ (مرقاۃ ص۲۹۳ تا ۲۹۶ و احکام القرآن ص۳۸۸ تا ۳۹۱)

مرقاۃ میں یہ واقعہ بھی موجود ہے کہ حضرت حسن بن علی (سبط نبی) رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی شہبا کو تین طلاقیں دیں[1] اس تفصیل کے بعد یہ سمجھ میں آجاتا ہے کہ جن علماء نے اس مسئلے پر اجماع نقل کیا ہے انھوں نے کوئی غلطی نہیں کی، کیونکہ اس واضح اکثریت کے بعد اگر کسی کا قول اس سے مختلف ملتا ہے تو اسے ناقابل اعتنا سمجھنا ناانصافی نہیں سمجھی جاسکتی۔ بنابریں ابن نجیم مصری نے ٹھیک ہی فرمایا۔

لا حاجة الى الاشتغال بالادلة على رد قول من انكر وقوع الثلاث جملة لانه مخالف للاجماع كما حكاه فى المعراج ولذا قالوا لو حكم حاكم بان الثلاث بفم واحد واحدة لم ينفذ حكمه لانه لا يسوغ فيه الاجتهاد لانه خلاف لا اختلاف[2]

جو لوگ بیک وقت تین طلاقوں کے پڑ جانے کا انکار کرتے ہیں ان کے رد میں دلائل پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں، کیونکہ یہ بات اجماع کے خلاف ہے۔ اسی بنا پر فقہاء نے کہا ہے کہ اگر کسی جج نے یہ فیصلہ دے دیا کہ ایک وقت میں دی جانے والی طلاقوں کو ایک ہی سمجھا جائے گا تو اس کا فیصلہ نافذ نہ ہوگا، کیونکہ یہ ایسا مسئلہ نہیں ہے کہ اس میں اجتہاد کی گنجائش ہو اور اس لیے بھی کہ اسے علمی اختلاف نہیں کہا جاسکتا، بلکہ مخالفت (کہنا ہی مناسب) ہے۔

ایک اہم سوال

زمانۂ حال کے "دانشوروں" کی طرف سے عام طور پر یہ مشورہ دیا جایا کرتا ہے کہ تین طلاقوں کا اختیار ختم کر دینا چاہیے چنانچہ زیر بحث "مضمون" میں بھی یہی بات ان الفاظ میں کہی گئی ہے:۔

(الف) جب کوئی فریق نکاح، عدالت کے سامنے یہ ثابت کرے کہ شوہر نے اپنی بیوی کو تین

[1] مرقاۃ جلد سادس ص۲۹۳ تا ۲۹۶ مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان

[2] بحر الرائق جلد ثالث ص۲۵۷

موقعیں ہونے کا اظہار کر دیا ہے تو عدالت اس طلاق کو منسوخ قرار دے کر خود بقیہ مقدمے کی
سماعت کی کارروائی شروع کرے گی۔ (ص۲۴ سطر ۱۵ تا ۱۷)

معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کی مسئلے کے صرف قانونی پہلو پر ہی نظر ہے۔ اخلاقی بالفاظ صحیح مذہبی رخ کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ واضح بات ہے کہ ہر مسلمان رشتہ ازدواج کو محض قانونی نہیں سمجھتا، بلکہ شرعی سمجھتا ہے۔ آئندہ بالفرض پارلیمنٹ میں یہ قانون پاس ہو جاتا ہے (لا قدر اللہ) اور اس کے مطابق عدالتیں تین زبانی طلاقوں کو کالعدم قرار دے دیتی ہیں، تو چلیے مان لیا کہ قانوناً یہ شخص اور یہ عورت میاں بیوی ہی رہے مگر مذہباً ان کا یہ رشتہ قطعاً ٹوٹ چکا ہے (یہاں قضائے قاضی کے ظاہراً و باطناً نافذ ہونے کی بحث بھی نہیں چھیڑی جا سکتی کیونکہ وہ اختلاف اس صورت میں ہے جبکہ قاضی کا فیصلہ شرعی تقاضوں کے مطابق ہوا ہو۔ ایسا نہیں ہے کہ کوئی بھی قاضی کسی بھی طرح کا فیصلہ کر دے وہ بھی نافذ ہو جائے گا اور خاص اس مسئلے میں تو بحر الرائق کا حوالہ بھی اوپر گذر چکا ہے کہ کسی قاضی کے فیصلہ کر دینے سے بھی وہ نافذ نہ ہوگا) اب بتلایئے کہ مذہب کے پابند حضرات کس طرح یہ گوارا کر لیں گے کہ وہ مسلسل یا تو فعل حرام میں مبتلا رہیں یا پھر مخصوص تعلقات سے مجتنب رہیں۔ سوچیے اس صورت میں کیا عورت کا بھلا ہوگا اور کیا اس کی زندگی کے دن خوشگوار طور پر گذر سکیں گے اور اس طرح کیا قانوناً نکاح کا قائم رہنا کیا خود عورت ہی کے لیے — جس کی بظاہر خیر خواہی کی غرض سے یہ پاپڑ بیلے گئے — وبال جان نہ ہو جائے گا؟ کیونکہ اب وہ نہ کسی دوسرے شخص سے نکاح کر سکتی ہے اور نہ پہلے ہی شوہر سے زوجیت کا عملی تعلق شرعاً قائم کر سکتی ہے — ان لوگوں سے تو بحث نہیں جو اخلاق و مذہب کی حیثیت کی پرواہ نہیں کرتے کہ ان کے لیے بہت سی راہیں کھلی ہوئی ہیں — مسئلہ دراصل ان کا ہے جو مذہب سے رشتہ رکھے ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ابھی ایسے لوگوں کی تعداد ہندوستان میں بھی معتد بہ حد تک باقی ہے۔

۴۔ فاضل مضمون نگار کا کہنا ہے:۔

"قرآن میں اللہ کا حکم راست پہنچا ہے سنت کو وحی کا درجہ حاصل نہیں ہے۔"

(ص۶ سطر ۲۰، ۲۱)

اگر ترجمے کی خامی سے کہنے والے کی مراد بدل نہیں گئی ہے اور واقعتہً وہ یہی فرمانا چاہتے ہیں جو الفاظ بول رہے ہیں، تو اس پر یہ عرض کرنا شاید بے جا نہ ہوگا کہ موصوف نے سنت کے بارے میں ایک ایسی بات کہہ دی جو تمام اہل حق (خواہ وہ کسی بھی مکتبۂ فکر سے متعلق ہوں) کے مسلمہ عقیدے سے بالکل مطابقت نہیں رکھتی اور صریح نص قرآنی کے بھی خلاف ہے۔ قرآن مجید کی سورۂ النجم آیت ۴ پارہ ۲۷ میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں نہایت صراحت کے ساتھ کہا گیا ہے :-

مَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ	نہ آپ اپنی خواہش نفسانی سے باتیں
هُوَ اِلَّا وَحْیٌ يُّوْحٰى	بناتے ہیں۔ ان کا ارشاد خالص وحی ہے
	جو ان پر بھیجی جاتی ہے۔

اسی لیے اصول فقہ کی کتابوں میں وحی کی دو قسمیں ملتی ہیں۔ (۱) متلو (۲) غیر متلو پہلی قسم یعنی وحی متلو قرآن کریم ہے اور دوسری قسم یعنی وحی غیر متلو حدیث ہے۔ اصول فقہ کی تمام بنیادی کتابوں میں یہ تفصیل دیکھی جا سکتی ہے۔[۱]

عالمگیری عہد کے ممتاز فاضل (اور بقول مشہور عالمگیر کے استاذ) ملا احمد جیون، فخر الاسلام بزدوی سے نقل کرتے ہیں :-

ان الوحی نوعان ظاهر وباطن فالظاهر ما ثبت بلسان الملك او باشارته او بالالهام والباطن ماينال بالاجتهاد ولعله لم يذكر المنام..... لانه داخل فی الالهام ۔[۲]

غور فرمائیے! فخر الاسلام بزدوی نبی علیہ السلام کے الہام وخواب، بلکہ اجتہادات تک کو وحی میں داخل کر رہے ہیں۔ اور حقیقتہً لفظ "وحی" میں اس کی پوری گنجائش ہے[۳] قرآن کریم کے انداز بیان سے بھی ہر قسم کے کلام کا وحی ہونا معلوم ہوتا ہے۔ ہاں علماء نے خالص امور دنیا (مثلاً درختوں پر زیادہ پھل لانے

---

[۱] مثلاً دیکھیے نور الانوار ص۸، النامی شرح حسامی ص۷، کشف الاسرار ص۹، غایۃ التحقیق شرح حسامی ص۵ نولکشور لکھنؤ۔ [۲] تفسیرات احمدیہ ص۳۲۵ [۳] راغب اصفہانی نے مفردات میں وحی کے معنے یہ لکھے ہیں۔ اصل الوحی الاشارۃ السریعۃ..... ويقال للكلمة الالهية التى تلقى الى انبيائه وحی و ذلك اضرب (مفردات القرآن ص۵۳۶)

کی تدبیروں کے سلسلے میں یہ کہا ہے کہ وہ کلام وحی نہیں ہوتا، اسی طرح اس میں بھی اختلاف کیا ہے کہ اجتہاد (بغیر وحی) کے ذاتی رائے سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے یا نہیں، گویا وحی کے دائرے کے باہر اگر کوئی کلام تھا تو بس انہی دونوں قسموں کا۔ باقی تمام تر وحی ہے۔ خاص طور پر دینی ہدایات کے بارے میں تو سب ہی یہ فرماتے ہیں کہ آپ وحی سے ہی لوگوں کو فتویٰ دیتے تھے۔ مثلاً حنبلی المسلک عالمی شہرت رکھنے والے عالم حافظ شمس الدین ابن القیم (م ۷۵۱ھ) فرماتے ہیں:۔

وکان یفتی عن اللہ بوحیہ المبین[1] (نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے وحی کے ذریعے ہی فتویٰ دیا کرتے تھے)

ان کے علاوہ مشہور حنفی عالم ملا علی قاری شارح مشکوٰۃ نے مرقاۃ میں متعدد جگہ نبیؐ کے کلام کا وحی ہونا مختلف پیرایوں میں بیان کیا ہے دیکھیے مرقاۃ ص ۲۳ و ص ۲۴ و ص ۲۲۳ جلد اول

اس صدی کے مشہور مفسر وفقیہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے اس آیت کا ترجمہ کرتے ہوئے بریکٹ میں تفسیر اس طرح کی ہے:۔

ان کا ارشاد نری وحی ہے جو ان پر بھیجی جاتی ہے خواہ الفاظ کی بھی ہو جو قرآن کہلاتا ہے خواہ صرف معانی کی ہو جو سنت کہلاتی ہے (بیان القرآن ج ۱۱ ص ۶۵)

بہر حال سنت بھی وحی ہی ہے۔ اگرچہ قرآن کی وحی سے تھوڑی مختلف جیساکہ مولانا تھانویؒ نے وضاحت فرمائی۔ علاوہ ازیں عصر حاضر کے مشہور شامی فاضل شیخ معروف الدوالیبی ایک موقعے پر جمہور علماء کا استدلال ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔ ان کتاب وا لسنۃ وحی من اللہ تعالیٰ (المدخل ص ۲۷ الطبعۃ الثانیۃ)

۵۔ کتابچہ کی ص ۱۵ سطر ۲۲ پر عبارت ملتی ہے:۔

"نشے کی حالت میں یا کسی جبر کے تحت طلاق دیے جانے پر بھی حنفی مسلک کے اکثر فقہاء کے نزدیک طلاق ہو جاتی ہے لیکن شافعی، اثنا عشری یا فاطمی مسلک کے مطابق نہیں ہوتی"

اس سلسلے میں یہ عرض کرنا ہے کہ جبر (اکراہ) کی حالت میں طلاق کا پڑ جانا تو واقعی صرف حنفی مسلک میں ہے لیکن نشے کی حالت میں (اگر وہ حرام چیز کے استعمال سے ہوا ہے) طلاق امام ابو حنیفہ کے مسلک

---

[1] اعلام الموقعین جلد اول ص ۱۲ — [2] ہدایہ اولین ج ۲ ص ۳۳۸

[3] الام جلد ۵ ص ۲۳۵ مطبوعۃ المطبعۃ الکبریٰ الامیریہ بولاق مصر ۱۳۲۲ھ

کی طرح امام شافعیؒ اور امام مالک کے یہاں بھی پڑ جاتی ہے۔ اس وضاحت کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ مضمون کی عبارت مذکورہ سے بظاہر دونوں (جبر، نشہ) صورتوں میں امام شافعیؒ کے یہاں طلاق نہ پڑنا معلوم ہو رہا ہے۔ حالانکہ نشہ کے بارے میں امام شافعی نے اپنی کتاب "الام" میں فرمایا ہے :-

لا تسقط المعصية بشرب الخمر	شراب پینے یا کسی اور نشہ آور چیز کے
والمعصية بالسكر من النبيذ عنه	پینے سے نشے کی معصیت، نہ کوئی فریضہ ساقط
فرضا ولا طلاقا ؎	کرتی ہے، نہ طلاق کی اہلیت

یعنی نشہ (اگر حرام چیز سے ہو) کی حالت میں آدمی غیر مکلف نہیں ہو جاتا بلکہ مکلف ہی رہتا ہے۔ اس لیے تمام ذمہ داریوں کا اہل ہے اور اس کے اقوال و افعال موثر ہیں۔ کم سے کم فرائض اور طلاق کے بارے میں (جس طرح صحیح الدماغ شخص) نشے کے بارے میں یہی مسلک امام مالک کا بھی ہے۔ دیکھیے سحنون نے نقل کیا ہے :- " قلت ايجوز طلاق السكران (قال) طلاق السكران جائز ؎

ان صراحتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حالت نشہ میں طلاق کا پڑنا تنہا امام ابوحنیفہؒ کا مسلک نہیں بلکہ دیگر ائمہ کا بھی ہے۔

سردست ان چند فقہی فروگذاشتوں کی نشاندہی پر اکتفا کیا جا رہا ہے حالانکہ مضمون میں ابھی بعض اور فقہی تعبیرات نقد سے رہ گئی ہیں جو محل نظر ہیں۔ آئندہ صفحات میں بعض تاریخی مسامحات کی طرف اشارات پیش کیے جا رہے ہیں۔ زیادہ تفصیل کا نہ موقع ہے نہ چنداں ضرورت۔

۲۔ فیضی صاحب انکشاف فرماتے ہیں کہ :-

" ہم سے چوتھی صدی ہجری (یعنی سنہ ۱۰ھ) کے دوران نہ تو پیغمبر اسلام تھے اور نہ آپ کے صحابہ کرام میں سے کوئی ایسا تھا جس سے رشد و ہدایت حاصل کی جا سکتی "

سنہ ۱۰ھ سے چوتھی صدی ہجری تک (بلکہ قیامت تک) پیغمبر اسلام کا نہ ہونا تو مسلم ہے لیکن کیا سنہ ۱۰ھ کے بعد صحابہ میں کوئی اس مرتبے کا باقی نہیں رہا تھا جس سے رشد و ہدایت حاصل کی جاتی — آیئے اس بارے میں مختصراً تاریخ کا جائزہ لیا جائے۔

؎ الام جلد ۵ ص۲۳۵ مطبوعۃ المطبعۃ الکبری الامیریہ بولاق مصر ۱۳۲۲ھ

؎ المدونۃ جلد ۲ ص۱۲۸

حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ (م ۷۵۱ھ) کی جلالت شان اور تبحر علمی سے کون اہل علم ناواقف ہوگا۔ موصوف نے اپنی ممتاز ترین تصنیف "اعلام الموقعین" میں فقہائے صحابہ کی جن سے رشد و ہدایت حاصل کی جاتی تھی تین قسمیں بیان کی ہیں۔ رشد و ہدایت حاصل کرنے کو فقہی اصطلاح کے مطابق فتویٰ دینے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

قسم اول، جن حضرات سے بکثرت فتاویٰ حاصل کیے جاتے تھے (مکثرین) قسم دوم (متوسطین) قسم سوم (مقلین)

پہلی قسم میں سات صحابہ کے نام لیے ہیں — (۱) عمر بن الخطابؓ (۲) علی بن ابی طالبؓ (۳) عبداللہ بن مسعودؓ (۴) عائشہ ام المومنینؓ (۵) زید بن ثابتؓ (۶) عبداللہ بن عباسؓ (۷) عبداللہ ابن عمرؓ۔

صحابۂ کرام میں یہ حضرات گویا شرحبیل اور رشد و ہدایت کے منارہ تھے۔ علامہ ابن حزمؒ کے بیان کے مطابق ان میں سے ہر شخص کے فتاویٰ کا ایک ضخیم مجموعہ تیار ہو سکتا ہے۔ وکان المکثرون منهم سبعة۔ قال ابو محمد ابن حزم ویمکن ان یجمع من فتوی کل واحد منهم سفر ضخم[۱]

اگر تاریخ سے جواب مانگا جائے کہ ان میں سے کتنے حضرات ۱۱ھ کے بعد تک بقید حیات رہے تو وہ ہمیں بتائے گی کہ یہ حضرات اتنی مدت تک باقی رہے۔

۱۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ م ۱۷ رمضان ۵۷ھ یا ۵۸ھ یعنی ۱۱ھ کے بعد کم سے کم ستره سال علم و ہدایت کی روشنی پھیلاتی رہیں

۲۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ م ۷۳ھ یعنی ۱۱ھ کے بعد دس بیس نہیں پورے ۶۲ سال علوم و معرفت کے دریا بہاتے رہے۔

۳۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ م ۶۸ھ یعنی ۱۱ھ کے بعد تھوڑے نہیں پورے ۵۷ سال علوم و معرفت کا دریا بہاتے رہے۔

۴۔ حضرت زید بن ثابتؓ م ۴۵ھ یعنی ۱۱ھ کے بعد ۳۴ سال سرچشمہ ہدایت بنے رہے۔

---

[۱] مجموعة الحاوی الارواح واعلام الموقعین لابن القیم جلد ۱ ص ۱۳ مطبعة النیل مصر والمدخل للدوالیبی ص ۸۵ الطبعة الخامسة

ان حضرات کی سوانح اور ان کے اصل کارنامے یہاں بیان کرنا مقصود نہیں تفصیل کے لیے الاصابۃ، الاستیعاب، اور بہت سی کتابیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ اس وقت ہمیں صرف یہ دکھانا ہے کہ ۴۰ھ کے بعد صف اول کے فقہائے صحابہ کی اکثریت (سات میں سے چار) باقی رہی۔

فقہائے صحابہ کی دوسری قسم متوسطین کی ہے یعنی جن کے فتاوی نہ بہت زیادہ ہیں نہ بہت کم۔ اس زمرے میں ابن قیمؒ نے بیس صحابہ کے نام لیے ہیں

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ۔ ام سلمہؓ۔ انس بن مالکؓ۔ ابو سعید الخدریؓ۔ ابوہریرہ۔ عثمان بن عفانؓ عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ۔ عبداللہ بن الزبیرؓ۔ ابو موسی الاشعریؓ۔ سعد بن ابی وقاصؓ۔ سلمان فارسیؓ۔ جابر بن عبداللہ۔ معاذ بن جبلؓ۔ طلحہؓ۔ زبیر۔ عبدالرحمن بن عوف۔ عمران بن حصینؓ۔ ابوبکرہؓ عبادۃ بن الصامت۔ معاویہ بن ابی سفیانؓ

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ان بیس میں سے ۴۰ھ کے بعد یہ حضرات باقی رہے۔

۱۔ انس بن مالکؓ م ۹۱ھ یعنی ۴۰ھ کے بعد ۵۱ سال تک اسی عالم آب و گل میں موجود رہے۔

۲۔ ابوبکرہؓ م ۴۹ھ 〃 ۹ 〃 〃

۳۔ جابر بن عبداللہ م ۷۴ھ 〃 ۳۴ 〃 〃

۴۔ سعد بن ابی وقاص م ۵۵ھ 〃 ۱۵ 〃 〃

۵۔ ابو سعید خدری م ۷۴ھ 〃 ۳۴ 〃 〃

۶۔ ام سلمہؓ م ۵۹ھ 〃 ۱۹ 〃 〃

۷۔ عبداللہ بن عمرو بن العاص م ۵۵ھ 〃 ۱۵ 〃 〃

۸۔ عمران بن حصینؓ م ۵۲ھ 〃 ۱۲ 〃 〃

۹۔ معاویہ بن ابی سفیان م ۶۰ھ ۲۰ 〃

۱۰۔ ابو موسی الاشعری م ۵۲ھ ۱۲ 〃

۱۱۔ عبداللہ بن الزبیرؓ م ۷۳ھ ۳۳ 〃

۱۲۔ ابوہریرہؓ م ۵۷ھ، ۵۸ھ یا ۵۹ھ یعنی ۴۰ھ کے بعد کم از کم ۱۷ سال تک بقید حیات رہے۔ [1]

[1] ان صحابہ کے احوال مع سنین وفات اس موضوع کی ہر کتاب میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ہم نے یہ سنین وفات شیخ ولی الدین ابی عبداللہ محمد الخطیب صاحب مشکوۃ کی "الاکمال فی اسماء الرجال" سے لیے ہیں۔ حروف تہجی کی (باقی اگلے صفحہ پر)

غور فرمائیے طبقۂ ثانیہ (متوسطین) کی بھی اکثریت (بتیس میں سے بارہ ۱۲) سنہ ۴۰ھ کے بعد تک موجود رہی۔ یہ بیان کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ متوسطین کی اس فہرست کے علاوہ بھی بہت سے ممتاز صحابہ و صحابیات اس وقت رشد و ہدایت کی ضیا پاشی کر رہے تھے۔ مثلاً حضرت ابو مسعود انصاری (متوفی ۴۰ھ کے بعد) ام المومنین حضرت حفصہؓ (م ۴۵ھ) حضرت عبد اللہ بن سلام (م ۴۳ھ) حضرت حنینؓ اور ام المومنین حضرت میمونہ (م ۵۱ھ) رضی اللہ تعالیٰ عنہا و عنہم اجمعین۔ پھر نہ معلوم کس طرح یہ لکھ دیا گیا اور کیونکر یہ باور کیا جائے "سنہ ۴۰ھ کے بعد صحابہ میں سے کوئی رشد و ہدایت کا اہل باقی نہیں رہا" ہاں! اگر خلفائے اربعہ یا حضرت علی کے علاوہ خاکم بدہن کسی بھی صحابی کو منصب ارشاد و ہدایت کا اہل نہ سمجھنے کی جسارت کی جائے تو یہ بات درست ہو سکتی ہے۔ (واضح رہے کہ آخری خلیفہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر ۱۸ رمضان ۴۰ھ کو حملہ ہوا اس کے تین دن بعد جام شہادت نوش کیا) اب اگر محترم شیفی صاحب کی عبارت کا یہی مطلب لیا جائے تو یہ بے جا بات نہ ہوگی!

اور دیکھیے! نہ صرف تاریخ — کہ جس کی عبارتیں اس درجہ قابل اعتماد نہیں ہوتیں جتنی کتب حدیث کی، بلکہ حدیث اور صحیح احادیث کی کتابوں میں ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ شروع اموی دور میں اجلہ تابعین کے علاوہ ممتاز صحابہ بھی موجود تھے اور وہ نہ صرف قاضیوں کو بلکہ خلیفہ تک کو برملا خلاف شرع حتیٰ کہ خلاف سنت کاموں پر ٹوک دیتے تھے، اور خلیفہ بہت سی کمزوریوں کے باوجود ان کی بات برداشت کر لیتا تھا اور سزا دینا تو کجا، غصہ کا اظہار بھی نہیں کرتا تھا بلکہ بات مان بھی لیتا تھا۔ اموی دور کے بدنام ترین خلیفہ مروان — کہ جس پر لعنت بھیجنا بھی بعض حلقوں میں کار ثواب سمجھا جاتا ہے — کے بارے میں صحیح مسلم میں ایک واقعہ یہ ملتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ (مشہور صحابی) نے مروان سے کہا کہ تم نے سودی لین دین کو رواج دے رکھا ہے۔ مروان بہت چونکا (کیونکہ سود کی ظاہری تمام شکلیں اس وقت بھی رائج نہ تھیں) اور کہا کہ میں نے تو ایسا نہیں کیا۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ تم نے "صکاک" کی بیع کو جائز کر رکھا ہے (صک — وہ کاغذی دستاویز یا چک جس سے سالانہ غلہ حاصل کیا جاتا ہے اور حکومت کی طرف سے مستحقین کو وہ کاغذ سند کے طور پر دیا جایا کرتا تھا) اور پھر حدیث سنائی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غلہ پر قبضہ ہو جانے سے پہلے اس کی فروختگی سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ مروان نے سرکاری اعلان جاری کر دیا کہ آئندہ وہ کاغذی دستاویزیں (صکاک) نہیں فروخت کی جا سکیں گی۔ پھر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۲) ترتیب سے اس میں صحابہ و تابعین کے مختصر احوال و سنین وفات موجود ہیں۔

رپورٹر اپنا مشاہدہ بتلاتے ہیں کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ حکومت کے کارندے ان دستاویزوں کو (فروخت ہوتا دیکھتے تو) لوگوں کے ہاتھوں سے چھین لیتے تھے۔ الفاظ حدیث بھی پڑھ لیجیے ۔

عن ابی هریرة انه قال لمروان احللت بیع الربا فقال مروان ما فعلت فقال ابو هریرة احللت بیع الصکاک وقد نهی رسول الله صلی الله علیه وسلم عن بیع الطعام حتی یستوفی فخطب مروان الناس فنهی عن بیعها قال سلیمان فنظرت الی حرس یاخذونها من ایدی الناس [1]

دیکھا آپ نے کہ مروان نے حضرت ابوہریرہ رضؓ سے حدیث سنکر فوراً حکم کی تعمیل کی۔ حالانکہ حدیث میں صریحی طور پر "صکاک" کی خرید و فروخت سے نہیں منع کیا گیا ہے بلکہ صکاک کی بیع سے ایسی صورت پیدا ہو جاتی تھی کہ جو حدیث میں بیان کردہ ممانعت کے دائرے میں آجاتی ہے ۔ چنانچہ مروان جیسے اموی خلیفہ نے بلا بحث کیے بات مان لی ۔

مروان ہی سے متعلق خطبۂ عید کے بارے میں ایک اور واقعہ بھی حدیث کی تمام معتبر کتابوں میں ملتا ہے کہ جب اس نے عید کا خطبہ (بجائے نماز بعد کے) پہلے دینا شروع کر دیا تو حضرت ابو سعید خدری نے مجمع عام میں ٹوکا بلکہ اس کا دامن اور ہاتھ پکڑ کر منبر کی طرف جانے سے روکا [2] اسی طرح جب وہ منبر پر بیٹھ گیا تو ایک دوسرے صحابی نے (ابومسعود انصاریؓ) کھڑے ہو کر ڈانٹتے ہوئے کہا۔ الصلوٰۃ قبل الخطبة (میاں! نماز تقریر سے پہلے پڑھو) [3]

اس پر بھی مروان نہ غصہ ہوا نہ ان میں سے کسی کو سزا دی اگرچہ اس نے ان کی بات نہیں مانی ۔

یہاں مروان یا کسی اموی خلیفہ کی کمزوریوں کی نہ پردہ پوشی مقصود ہے اور نہ دورِ اموی کی تعریف و تحسین، بلکہ دکھانا صرف یہ ہے کہ اس دور میں بھی حق بات کہنے والے باقی تھے اور بغیر نتائج کی پرواہ کیے ہوئے کلمۂ حق کہتے تھے اور وہ دور ایسا تاریک نہیں تھا جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے ۔ اس مضمون میں

[1] صحیح مسلم جلد ثانی صہ کتب خانہ رشیدیہ دہلی

[2] بخاری جلد اول ص۱۳۱ فجبذت بثوبہ مسلم جلد اول صفحہ ۲۹ وافا اجرہ نحو الصلوٰۃ

[3] تفصیلی واقعہ کے لیے دیکھیے فتح الملہم شرح مسلم جلد اول ص۳۲۵

ایسی ہی تصویر پیش کرنے کی یا یہ الفاظ کوشش کی گئی ہے ...... "فاضل مضمون نگار کو نہ رسول اللہ کی ہدایت حاصل تھی نہ صحابہ کرام کی صحبت نصیب تھی" ص۶۰

۷۔ فاضل مضمون نگار فقہ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"سب سے پہلے اسلامی فقہ کے اصول کی تدوین امام شافعیؒ نے کی ؟ ص۱۹۱ (۲)

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ یہاں تاریخی تفصیلات پیش کرنے کا ارادہ نہیں ہے بلکہ صرف اشارات کر دینے پر اکتفا کریں گے چنانچہ اسی کے مطابق چند باتیں عرض کی جاتی ہیں۔

تقریباً تمام تذکرہ نگار یہ لکھتے ہیں کہ امام شافعیؒ کی ولادت ۱۵۰ھ میں ہوئی اور صحیح قول کے مطابق امام ابوحنیفہؒ کا یہی سال وفات ہے، اور یہ بات مسلم ہے کہ امام ابوحنیفہؒ مجتہد مطلق تھے اور کسی بھی مجتہد کے لیے اصول اجتہاد کے بغیر چارہ کار نہیں تو لامحالہ ماننا پڑے گا کہ امام ابوحنیفہؒ کے پیش نظر ضرور کچھ اصول تھے جو انھوں نے خود وضع کیے یا کسی اور کے وضع کیے ہوئے اپنا لیے — گویا اس طرح یہ بات خود ہی ثابت ہو جاتی ہے کہ امام شافعیؒ کے عالم وجود میں آنے سے قبل ہی اصول فقہ وضع ہو چکے تھے۔ اب رہا تدوین کا سوال، اس بارے میں بھی امام ابوحنیفہؒ کے ہمنوا اور مقلد نے نہیں بلکہ ایک سخت ناقد خطیب بغدادیؒ نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے :۔

ابو یوسف اول من وضع الکتب فی اصول الفقہ علی مذھب ابی حنیفۃ واملی المسائل ونشرھا .... وھوا فقہ اھل عصرہ ولم یتقدمہ احد فی زمانہ[1]

یعنی امام ابویوسفؒ یعقوب بن ابراہیم (امام ابوحنیفہ کے ممتاز شاگرد) پہلے شخص ہیں کہ جنھوں نے سب سے پہلے حنفی اصول فقہ میں کتاب تصنیف کی اور مسائل لکھوائے اور ان کی اشاعت کی ... اور وہ اپنے زمانے کے تمام لوگوں سے بڑھ کر فقیہ تھے اور ان کے زمانے میں کسی کی پیش نہ جا سکی۔

ایک اور شافعی متبحر عالم علامہ ابن حجر مکی (حافظ ابن حجر عسقلانی کے علاوہ ایک دوسرے ممتاز عالم) نے امام حنیفہؒ کے حالات کے اندر اپنی نہایت قابل قدر کتاب "الخیرات الحسان فی ترجمۃ ابی حنیفۃ النعمان" میں امام صاحب کے بارے میں لکھا ہے

---

[1] رد المحتار للعلامہ ابن عابد الشامی ص۳۴ جلد ا مکتبہ نعمانیہ دیوبند

اول من دوّن الفقہ ورتبہ ابواباً وکتباً علی نحو ما علیہ الیوم و
تبعہ مالک فی موطاہ ومن کان قبلہ انما کانوا یعتمدون علی حفظہم
وھو اول من وضع کتاب الفرائض وکتاب الشروط[1]

وہی سب سے پہلے فقہ کو مدون کر کے "ابواب" اور "کتابوں" میں اس طرح ترتیب دینے والے ہیں کہ جیسی آج (کتابوں میں ملتی) ہے اور امام مالکؒ نے بھی انہی کی نقل اپنی کتاب "موطا" میں کی ہے ان سے پہلے علماء اپنی یادداشت پر ہی بھروسہ کیا کرتے تھے اور امام ابوحنیفہؒ نے ہی سب سے پہلے ترکہ و شروط کے مسائل یکجا کیے (اور ان کو "کتاب الفرائض" کا نام دیا گیا)۔

خطیب بغدادیؒ اور ابن حجر مکیؒ کے بیانات سے یہ نتیجہ نکلا کہ ابتدائی طور پر فقہ کے اجمالی اصول ـــ اور بعض موضوع پر تفصیلی ـــ سب سے پہلے امام ابوحنیفہؒ نے خود مرتب و مدون کیے لیکن اس کو پوری بسط و تفصیل کے ساتھ دیگر تمام علماء سے پہلے امام ابو یوسفؒ نے مرتب کر کے پیش کیا۔ اس وقت امام شافعیؒ تو غالباً تحصیل علم میں ہی لگے ہوئے تھے اور فقیہ و مجتہد کے منصب اعلیٰ پر بعد میں پہنچے۔ اس میں ان کی خداداد صلاحیتوں کے علاوہ جن چیزوں کا حصہ ہے ان میں امام محمد (تلمیذ رشید امام ابوحنیفہؒ) کی کتابوں کو نمایاں حیثیت حاصل ہے جیسا کہ امام موصوف نے خود اعتراف کیا ہے۔

ما صرت فقیہا الا بکتب محمد بن الحسن[2]

امام شافعیؒ کے مختصر سوانح حیات اور تحصیل علم کی روداد حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ "اخبار الاخیار" جیسی عظیم تاریخی کتاب کے مصنف نے پیش کی ہے اور اس سے بھی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اولیت اور تقدم کا شرف تدوین و تالیف کے اعتبار سے بھی ـــ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے شاگردوں (امام ابو یوسفؒ، امام محمد) کو ہی حاصل ہے۔

شاہ صاحب نے اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ کے مقدمہ کے طور پر بعض محدثین کے حالات بھی (فارسی زبان میں) تحریر فرمائے ہیں۔ اسی میں امام شافعیؒ کا تعارف پیش کیا ہے۔ یہاں خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے۔
امام شافعیؒ کا ابتدائی زمانہ مکہ معظمہ میں گذرا وہیں سات سال کی عمر میں قرآن مجید اور دس سال

[1] رد المحتار للعلامہ ابن عابد الشامی صفحہ ۳۵ جلد ۱ مکتبہ نعمانیہ دیوبند

[2] ایضاً

کی عمر میں موطا امام مالک حفظ کرلی اور وہیں فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۵ سال کی عمر میں علمائے زمانہ نے ان کو فتویٰ دینے کی اجازت عطا کردی۔ اس کے بعد مدینہ طیبہ جاکر مدت دراز تک امام مالک کی خدمت میں مستقل رہے اور جو کچھ ان کے پاس تھا وہ اس مدت میں حاصل کرلیا۔ اس کے بعد بغداد گئے اور وہاں دو سال ٹھہرے اور اپنی سب سے پہلی کتاب وہاں تصنیف کی ("و" کتاب قدیم خود را آنجا تصنیف نمود") امام محمد نے ان کی قوت حفظ کی تعریف کرتے ہوئے ایک واقعہ بتایا کہ وہ (امام شافعی) امام ابوحنیفہ کی "کتاب اوسط" مجھ سے مانگ کر لے گئے اور صرف ایک دن رات میں زبانی یاد کرلی [1]

ان تصریحات کے علاوہ ماضی قریب کے محقق اور زبردست عالم مولانا عبدالحیؒ فرنگی محلی اپنی مشہور تصنیف عمدۃ الرعایۃ (حاشیہ شرح وقایہ) کے مقدمہ میں امام ابوحنیفہ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:۔

انہ اول من فرّع فی الفقہ والّف وصنّف [2]

(امام ابوحنیفہ ہی سب سے پہلے فقہی مسائل کو دلائل سے اخذ کرنیوالے ہیں اور اس موضوع پر تصنیف کرنے والے ہیں) ان چند حقیقتوں کے سامنے آجانے کے بعد فیضی صاحب کی یہ تحقیق کہ "سب سے پہلے اسلامی فقہ کے اصول کی تدوین امام شافعیؒ نے کی" محل نظر معلوم ہونے لگتی ہے۔

آخری بات

اوپر کے صفحات میں چند گذارشیں اہل علم اور خاص طور پر محترم فیضی صاحب کی توجہ کے لیے پیش کی گئی ہیں۔ کہنے کے لیے اور بھی بہت سی باتیں تھیں جو اس موقع پر کہی جاتیں تو نامناسب نہ ہوتا مگر خوف طوالت مانع ہے لیکن آخر میں ایک بات کہے بغیر رہا نہیں جاتا، شکایت نہیں بلکہ تاثر کا اظہار ــــ کہ کسی مسلمان کی زبان و قلم کا ایسا انداز بیان ــ جس سے کھلے طور پر شریعت اور شرعی قوانین پر کما حقہ غور کیے بغیر ان کا استخفاف اور انصاف سے بعید ہونا۔ اس کے بالمقابل ـــ انسانی بالفاظ دیگر غیر شرعی قوانین کی برتری اور ان کا عدل و نصفت سے قریب تر ہونا ظاہر ہو رہا ہو۔ بھاتا نہیں، اور جی چاہتا ہے کہ کاش اس طرح کے موضوع پر قلم اٹھاتے وقت اسلام سے نسبت کرنے کے تقاضوں کو ـــ کم سے کم الفاظ کی حد تک تو ملحوظ رکھا جایا کرتا۔

---

[1] اشعۃ اللمعات ج ۱ ص ۱۵، ۱۶ مطبع نیج کمار لکھنؤ۔ [2] عمدۃ الرعایۃ ج ۱ ص ۷

مسلم پرسنل لا

میں مشکلات کا حل

جناب سید عزیز الشفیع ۔ بی ۔ سی ۔ ایس

آج سے چند ماہ قبل انڈین لا انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کی طرف سے ایک بڑے پیمانے پر مسلم پرسنل لا پر ایک سمینار منعقد کیا گیا جس میں ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے ججوں کے علاوہ ہندوستان کے مشہور مشاہیر و فضلا شریک تھے ۔ جناب پروفیسر اینڈرسن صاحب ڈائرکٹر آف انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانس اسٹڈیز جو لندن کے قانونی اسکول میں اسلامی لا کے ماہر پروفیسر بھی ہیں اور نہ صرف تمام اسلامی دنیا کا محض سیاسی نقطہ نظر سے نہیں بلکہ قانونِ شریعت کا بغور مطالعہ کرنے کے خیال سے گئے تھے ۔ وہ بھی اس میٹنگ میں شریک ہوئے ان حضرات نے اس سمینار میں مروجہ پرسنل لا کے مختلف پہلوؤں پر کافی روشنی ڈالی ۔ اس جلسے میں پہلی مرتبہ جمعیۃ علماء ہند اور مجلس کے نمائندوں کے علاوہ علی گڈھ یونیورسٹی کے لا فیکلٹی کے ڈین اور کچھ پروفیسر بھی شریک تھے ۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر نے اس جلسہ کا ایک تقریر کے ساتھ افتتاح کیا ۔ راقم الحروف کو بھی ایک مقالہ پڑھنے کے لیے مدعو کیا گیا تھا

جناب جسٹس کے جی آئنگر نے بنیادی حقوق کی دفعہ ۴۴ کے ماتحت عام سول کوڈ کو تمام لوگوں پر نافذ کرنے پر زور دیا ۔ جناب جسٹس گوکھلے نے جو وزیر قانون ہیں یہ بیان دیا کہ پرسنل لا میں اصلاحات سے پہلے ہماری سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ ہم رائے عامہ کو ہموار کریں اور اس کے بعد کوئی قدم اٹھائیں

پروفیسر اینڈرسن نے اس بات پر زور دیا کہ چونکہ اصلاحات کا معاملہ نہایت نازک ہے اور مسلمان پرسنل لا کو قانونِ الٰہیہ کا ایک اہم جزو خیال کرتے ہیں ۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ پہلے علماء کرام سے تبادلۂ خیال کیا جائے

اور ان کے تشیمے سے کوئی مثبت قدم اٹھایا جائے۔ اس قرار داد کے بعد اور بہت سے مقالے پڑھے گئے۔ اور یہ سیمینار دو دن کے بعد ختم ہوا لیکن افسوس ہے کہ باوجود بحث و مباحثہ کے کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا گیا اور صرف یہ تجویز باتفاق رائے منظور ہوئی کہ ایک اور بڑا کنونشن بعد مشورہ علماء دین بلایا جائے۔ اس کے بعد جمعیۃ علماء کے سالانہ اجلاس میں بھی یہ معاملہ زیر بحث آیا۔ صدر جمعیۃ علماء اور دیگر شرکاء اجلاس نے اس بات پر زور دیا کہ پرسنل لا چونکہ قانون الہیہ کا ایک اہم جزو ہے۔ اس میں ایک شوشہ کو بھی بدلنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ بہرحال یہ غنیمت ہوا کہ ایک کمیٹی مقرر کر دی گئی اور دارالعلوم دیوبند نے بھی ایک سوال نامہ اس کے اہم پہلوؤں پر غور کرنے کے لیے شائع کیا اور یہ بھی طے پایا کہ دریافت کیا جائے کہ دیگر مسلم ممالک میں اب تک کس قسم کی اصلاحات ہوئی ہیں اور آیا وہ شریعت کے مطابق ہیں یا نہیں؟ اور ہندوستان میں ان کا نفاذ کس طرح کیا جا سکتا ہے۔

مجھے اس امر سے اتفاق ہے کہ جہاں تک قانون الہیہ کا تعلق ہے اس میں کوئی شخص بھی اس کے خلاف رد و بدل کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا لیکن شاید علماء کرام کو یہ بخوبی علم نہیں ہے کہ مروجہ قانون شریعت جو عدالتوں میں رائج ہے اس کو بالکل مسخ کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ مثلاً شرع کے مطابق تمام مسلمان لڑکیوں کو اپنے باپ کی جائداد میں نصف حصہ لینے کا پورا حق ہے لیکن اس قانون نے کچھ ایسی شکل اختیار کر لی ہے کہ قانون شریعت کو نظر انداز کر کے رسم و رواج کو ترجیح دی جانے لگی اور اس طرح ہماری سیکڑوں مسلم بیٹیاں اودھ، کچھ، مدھیہ پردیش، کشمیر اور پنجاب میں رواجی قانون کی وجہ سے اپنے حصہ شرعی سے محروم کر دی گئیں۔ بات یہ ہوئی کہ جب بہت سے صاحب جائداد ہندو بھائی اسلام سے مشرف ہوئے اور چونکہ ان کے یہاں لڑکیوں کو وراثت میں کوئی حصہ دینے کا حق نہ تھا اس لیے انھوں نے اپنے رسم و رواج کو قائم رکھتے ہوئے شریعت کو نظر انداز کر دیا اور اس طرح مسلم لڑکیاں اپنے جائز شرعی حق سے محروم چلی آ رہی ہیں اور اب تو اس موضوع پر ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کی طرف سے بہت سے فیصلے ہو چکے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان فیصلوں کے ہوتے ہوئے اب اس کا کیسے تدارک کیا جا سکتا ہے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ ہندو صاحبان نے جن کے یہاں لڑکیاں اپنے باپ کی وراثت میں حصہ پانے کی مستحق نہیں تھیں اتنا بڑا قدم اٹھایا کہ لڑکیوں کو لڑکوں کے برابر حصہ دینا منظور کر لیا۔ ظاہر ہے کہ ہماری مسلمان ترقی یافتہ لڑکیاں اس قدم کے اٹھنے کے بعد متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ ابھی حال

ہماچل پردیش کے ایک اجتماع میں یہاں تک کہا گیا کہ اگر ان کے حقوق کی طرف توجہ نہ کی گئی تو وہ غیر مسلموں سے شادی کرنے میں دریغ نہ کریں گی

معلوم نہیں علمائے کرام کو اس کا بھی علم ہے کہ نہیں؟ کہ اسپشل میرج ایکٹ دفعہ ۳۰ کے تحت اگر میاں بیوی اپنی شادی کو رجسٹر کرالیں تو خاوند کو اپنی جائداد کا نصف حصہ بیوی کو دینا ضروری ہوجاتا ہے۔ ہمارے موجودہ پرسنل لا کے مطابق شوہر کی جائداد میں بیوی اولاد کے ہوتے ہوئے صرف آٹھویں حصہ کی حقدار ہوتی ہے اور بقیہ جائداد بچوں میں تقسیم ہوجاتی ہے۔ اپنے مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے بعض ترقی پسند بڑے گھرانے کی مسلم لڑکیاں اس نئے قانون سے فائدہ اٹھانے کے خیال سے شادی کرلیتی ہیں۔ ایک بڑی قباحت یہ ہے کہ سول میرج ایکٹ کے تحت مسلم اور غیر مسلم اپنا مذہب تبدیل کیے بغیر شادی کرسکتے ہیں۔ ایسی شادیاں اگرچہ ہماری شرع کے مطابق قابل قبول نہیں لیکن وہ اب کسی قانون کے ماتحت فسخ نہیں ہوسکتیں اور ایسی ترقی پسند لڑکیاں اس قانون کے ماتحت زیادہ حقوق حاصل کرلیتی ہیں۔ افسوس ہے کہ اس قسم کا رجحان بڑھتا ہی جارہا ہے۔ اس لیے اس کی روک تھام کے لیے خاص قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔ علماء کرام کا تو اب تک یقین ہے کہ چونکہ شریعت قانون الہیہ پر مبنی ہے اور اس کی ضمانت اور تحفظ بنیادی قانون میں محفوظ کردیا گیا ہے۔ اس لیے حکومت اس معاملے میں کوئی نیا قدم نہیں اٹھا سکتی علمائے کرام نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ راجہ اور نوابوں کو دی ہوئی قانونی مراعات یک قلم منسوخ کردی گئیں اور اب تو اس طرف بھی اشارہ کیا جارہا ہے کہ جو خصوصی حقوق اقلیتوں کے لیے محفوظ تھے وہ ترقی کی راہ میں حائل ہیں اور سیکولرزم کے منافی اس سلسلے میں فی الحال حکومت کیرالا ایک مثبت قدم اٹھانے کے لیے تیاری کررہی ہے۔ حال ہی میں مسلم یونیورسٹی کو بھی سیکولرزم کی بنا پر اس کا نشانہ بنایا گیا اور اقلیتی کردار کو ختم کردیا گیا۔

دراصل ایک بڑے گروہ کا خیال ہے کہ جب تک ایسے تحفظات اٹھا لیے نہیں جائیں گے ہندوستان ایک قومی دھارے میں نہیں آسکتا۔ اور نہ ترقی کرسکتا ہے۔

کثرت ازدواجی

جس طرح قانونی رسم و رواج کو وراثت کے معاملے میں شریعت پر ترجیح دی جانے لگی ہے اسی طرح کثرت ازدواجی کے متعلق بھی کافی شور و غل کیا جارہا ہے اور اس کی روک تھام کے لیے پوری کوشش کی جارہی ہے۔

پچھلے دنوں جسٹس دعون نے بھی ایک فیصلے میں یہ رولنگ دی ہے کہ اگرچہ شوہر کو شریعت کے مطابق دوسری بیوی کرنے کا حق ضرور حاصل ہے لیکن دراصل عملی طور پر وہ برابری کا سلوک نہیں کر سکتا۔ ایسی صورت میں پہلی بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کرنا اس پر سراسر ظلم ہے۔ عدالت کو یہ قیاس کرنے کا حق حاصل ہے کہ حالات کے پیش نظر شوہر کی دوسری شادی کرنے سے پہلی بیوی پر یقیناً ظلم ہوا ہے۔ اس لیے عدالت کی طرف سے پہلی بیوی کو اس کی مرضی کے خلاف اس کے شوہر کے ساتھ رہنے پر مجبور کرنا انصاف کے خلاف ہے اس فیصلہ کا لب لباب یہ ہوا کہ عدالت پہلی بیوی کو اس کی مرضی کے خلاف اپنے شوہر کے ساتھ رہنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ دوسرے لفظوں میں اس کے یہ معنے بھی لیے جا سکتے ہیں کہ مسلمان شوہر اپنی ضرورتوں اور مصلحت کی وجہ سے دوسری شادی کرنے کا مستحق نہیں ہے۔ معلوم نہیں کثرت ازدواج کو روکنے کے لیے صرف مسلمانوں پر کیوں پابندی لگانے کا زور دیا جا رہا ہے۔ حالانکہ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسٹیٹسٹکس کی طرف سے جو اعداد و شمار شائع ہوئے ہیں ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں ایک سے زیادہ شادی کرنے کا رواج صرف ۴۱۰۰ فی ہزار ہے اور غیر مسلموں میں ۷۰۰ فی ہزار۔ رپورٹ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مسلمان عموماً عمر رسیدہ عورتوں سے گھر چلانے کے خیال سے شادی کرتے ہیں اور غیر مسلم کم عمر عورتوں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

بہتر ہو گا کہ مسلمانوں میں ایک سے زیادہ شادی کرنے کا پس منظر معلوم کیا جائے۔ دراصل بات یہ ہے کہ جہاد کے زمانے میں بہت سی عورتیں بیوہ ہو گئیں اور یتیم بچوں کی پرورش کا سوال پیدا ہوا تو آنحضرت صلعم نے ایسی بیوہ اور بے باپ کے بچوں کا مستقبل سنوارنے کے لیے مسلمانوں کو اس بات کی اجازت دی کہ بیواؤں کو اپنے عقد میں لے لیں تاکہ یتیم بچوں کی پرورش ہو سکے۔

لیکن میرے علم میں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ دوسری شادی پہلی بیوی کو طلاق دے کر محض تفریح طبع یا حصول دولت کے لیے کی جاتی ہے اور پہلی بیوی اور اس کے بچوں کے مستقبل کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے اس لیے میرے خیال میں قانون میں اس اصلاح کی ضرورت ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کی دوسری شادی پر پابندی لگا دی جائے اور وہ دوسری شادی بلا اجازت عدالت یا مصالحتی بورڈ جس میں بیوی اور خاوند کے نمائندے موجود ہوں اور دوسری شادی کرنے والا جب تک اپنی ضرورت کو حق بجانب ہونے کا ثبوت نہ دے اس وقت تک دوسری شادی کی اجازت نہ دی جائے۔ مثلاً یہ کہ اس کی پہلی بیوی بانجھ ہے اور وہ اولاد سے محروم ہے یا اس کی صحت اس قدر خراب ہو چکی ہے کہ وہ گھر کا کام کاج کرنے اور انتظام

کے بالکل ناقابل ہے تو ایسی صورت میں عدالت یا مصالحتی بورڈ اجازت دے۔ ایسے بورڈ پاکستان اور دیگر اسلامی ممالک میں قائم کر دیے گئے ہیں۔ ہندوستان میں بھی اگر قانوناً ایسے مصالحتی بورڈ بن جائیں تو نہ صرف کثرت ازدواجی کو روک سکیں گے بلکہ پہلی بیوی کی فریاد اور مشکلات کو بھی سن سکیں گے۔

بیواؤں کی شادی

اسی طرح اگر کوئی شخص کسی بیوہ سے محض اس کے بچوں کو آباد کرنے کے خیال سے دوسری شادی کرنا چاہے، تو عدالت یا مصالحتی بورڈ کو انکار نہ کرنا چاہیے۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ اب تک ہندو خاندانوں میں بیواؤں کو منحوس خیال کیا جاتا ہے۔ ۶ عرصہ ہوا جب کہ میں بنارس میں مجسٹریٹ تھا، مجھے نوجوان بیواؤں کو دیکھ کر قلق ہوتا تھا جن کے سر منڈے ہوئے اور کپڑے پھٹے ہوئے ہوتے تھے اور انہیں گھر سے نکال کر پریشوں کے سپرد کر کے بنارس میں چھوڑ دیا جاتا تھا۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم خصوصاً نوجوان بیوہ عورتوں کو اپنی موجودہ سوسائٹی میں عزت کے ساتھ از سر نو جگہ دیں۔

مہر اور جہیز کا غیر معمولی مطالبہ

دوسرا اہم مسئلہ مہر اور جہیز کے غیر معمولی مطالبہ کا ہے جو ہندو مسلمانوں دونوں کو پریشان کیے ہوئے ہے۔ مسلمانوں میں مہر کا مطالبہ اس خیال سے منظور کر لیا جاتا ہے کہ یہ محض ایک رسمی چیز ہے اور اس کی ادائیگی کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ مہر اقرار نامہ کی ایک اہم شرط ہے جس کو دیر سویر ماننا ہی پڑتا ہے۔ عموماً یہ ہوتا ہے کہ شادی کے چند دنوں بعد مہر کو معاف کرنے کے لیے شوہر کی جانب سے بیوی پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا جاتا ہے اگر وہ جرأت سے کام لیکر مہر معاف نہ کرے تو اس پر زیادتیاں شروع کر دی جاتی ہیں۔ مجھے مقدمات کے دوران میں اس کا علم ہوا ہے کہ بیوی کے جہیز کا ناجائز استعمال اور خرد برد کرنے کی کوشش شروع ہو جاتی ہے اور اس کے زیورات کو بیچ دیا جاتا ہے اور اس بے چاری کو اف تک کرنے کا موقع نہیں دیا جاتا۔ اگر اس نے اپنے شوہر کی بدسلوکی اور طریقہ کار پر اعتراض کیا تو یہاں تک نوبت پہنچتی ہے کہ شوہر یک طرفہ طلاق دینے کے ترپ کو استعمال کرنے میں دیر نہیں لگاتا اور اسے ہمیشہ کے لیے برباد کر کے رکھ دیا جاتا ہے۔

میری تجویز یہ ہے کہ مہر ہمیشہ شوہر کی حیثیت کے مطابق ہونا چاہیے۔ اگر غیر معمولی طور پر زیادہ ہو تو عدالت کو اس بات کا اختیار ہونا چاہیے کہ وہ مہر کی رقم میں ترمیم کر سکے۔ اودھ میں ایک پرانا قانون اس کے

متعلق بنایا گیا ہے کیوں نہ اس کو دوسرے صوبوں میں بھی لاگو کیا جائے۔ پاکستان میں تو ایک ایسا قانون بنایا گیا ہے کہ جس کی رو سے جہیز تک کو پبلک میں دکھانا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ اس قسم کی شو اور اشتہار بازی سے ایسا ہوتا ہے کہ دوسرے لوگ بھی جہیز زیادہ سے زیادہ دینے کی کوشش کرتے ہیں اس لیے میرے خیال میں ایسا قانون اگر ہندوستان میں بھی لاگو کیا جائے تو یقیناً ہندو اور مسلمان دونوں کے لیے مفید ہوگا۔

میرے سامنے ایسے مقدمات بھی آئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ بعض شوہر نشے وغیرہ کی ضرورت پوری کرنے کے لیے اور کم آمدنی کی وجہ سے بیوی کے جہیز اور زیورات کو خرد برد کرنا شروع کر دیتے ہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض بیویاں اپنے شوہر کا چڑھاوا زیورات وغیرہ لے کر اپنے باپ کے گھر میں بیٹھ جاتی ہیں اور اس طرح مقدمہ بازی کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جہیز اور چڑھاوے کی فہرست نہ ہونے کی وجہ سے عدالت کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے میری تجویز یہ ہے کہ نکاح نامہ میں جہیز اور چڑھاوے کی پوری فہرست درج کی جائے اور ہندو صاحبان کے یہاں بھی کوئی ایسا کاغذ تحریر کیا جائے تاکہ اگر کوئی تنازعہ پیدا ہو تو عدالت کو ڈگری دینے میں کوئی دقت نہ ہو۔ قاضی اور پنڈت جو شادی کی رسم ادا کرتے ہیں وہ ایک رجسٹر رکھیں اور اس میں جہیز اور چڑھاوے کا اندراج کر دیں تاکہ وقت ضرورت کام آئے۔ جہاں تک جہیز کا تعلق ہے یہ وبا مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں میں پھیلی ہوئی ہے کیونکہ وہ زیادہ متمول ہیں۔ ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ نوجوان لڑکیاں جہیز نہ ہونے کی وجہ سے شادی نہ کر سکیں اور خودکشی کی نوبت آ گئی۔ آج کل پارلیمنٹ میں شہری اور دیہاتی جائداد پر پابندی لگانے کا قانون بنایا جا رہا ہے۔ تعجب ہے کہ ایسا کوئی قانون جس کے ذریعے جہیز وغیرہ پر پابندی لگائی جا سکے کیوں نہیں بنایا جاتا۔ ممبران پارلیمنٹ کا فرض ہے کہ وہ اس معاملے میں کوئی ضروری قدم اٹھائیں۔

اصلاحات

اب میں ان اصلاحات کا ذکر کروں گا جو بعض اسلامی ممالک میں اس سلسلے میں ہوئی ہیں تیونس اور البانیہ کا ذکر کرنا بے سود ہے جنہوں نے اسلامی تہذیب کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا ہے۔ اصلاحات کرنے والے ممالک نے قرآن شریف کی ان آیات کی بنیاد پر جس میں جملہ بیویوں کے درمیان انصاف اور برابری کا ...

میرا مشورہ یہ ہے کہ نکاح کے وقت نکاح کے علاوہ ایک اقرار نامہ لازمی طور پر عورت کے حقوق کو محفوظ رکھنے کے لیے تحریر کیا جائے کہ اس کا شوہر دوسری شادی کرنے کا مستحق نہیں ہوگا اور اگر وہ اپنی بیوی کی مرضی کے خلاف ایسا کرے گا تو اس کو بطور جرمانہ ایک بھاری رقم بیوی کو دینا پڑے گی ۔ اس قسم کے اقرار نامہ سے شوہر کے غیر محدود طلاق دینے کے اختیار کو روکا جا سکتا ہے ۔

کلام پاک کا بھی منشا یہ ہے کہ ایک طلاق بحالت پاکیزگی دی جائے اور دوسری طلاق بھی بحالت پاکیزگی دی جائے ۔ اس طرح ایک طلاق اور دوسری طلاق کے درمیان کافی وقفہ ہو جاتا ہے اور اس کا منشا بھی یہی ہے کہ شوہر خوب سوچ سمجھ کر تیسری طلاق کا اعلان کرے ۔ دراصل اس وقفے کو اس لیے رکھا گیا ہے کہ اگر شوہر اور بیوی میں کچھ محبت باقی ہو تو وہ عود کرائے اور شوہر اپنے ارادے سے باز آ جائے ۔ لیکن تعجب ہے کہ آج کل بیک وقت تین طلاق دینے کا رواج بڑھتا جا رہا ہے ۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ طریقہ ناپسند تھا ۔ آپ نے ایک مرتبہ یہ بھی فرمایا کہ اگر سہ طلاقیں بیک وقت ایک ہی مجلس میں دی جائیں تو وہ ایک ہی شمار کی جائے گی ۔ ایک دوسرے موقع پر جب اسی قسم کا ایک واقعہ آپ کے علم میں لایا گیا تو فرمایا کہ لوگوں نے میری زندگی ہی میں قانون الہیہ کو کھیل بنا لیا ہے ۔ قرآنی رکاوٹوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق اس قانون میں فوری اصلاح کی ضرورت ہے تاکہ بے کس عورتیں شوہروں کی ان زیادتیوں سے بچ جائیں ۔

طلاق سکران

اس کے علاوہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض اوقات شوہر نشہ کی حالت میں اپنی بیوی کو طلاق دے بیٹھتا ہے اور وہ طلاق بھی قطعی شمار کی جانے لگتی ہے ۔ حالانکہ بوقت طلاق شوہر کے ہوش و حواس قائم نہیں رہتے چھوٹے طبقے کے مسلمانوں میں اور بعض اونچے گھرانوں میں بھی نشہ خوری اور شراب کا رواج ہے ۔ نشہ سے جھگڑے پر اکثر و بیشتر بعض اوقات تعلقات ناخوشگوار ہو جاتے ہیں ۔ بے قصور عورتیں جو اپنے شوہر کی نشہ خوری سے بیزار ہو کر اعتراض کرنے لگتی ہیں ان کو اپنے شوہر کی طلاق دینے کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے ۔ اس قسم کی طلاق کو جو ہوش و حواس کی حالت میں نہ دی جائے ہرگز طلاق منعقد نہیں سمجھنا چاہیے ۔

دراصل طلاق کا بہر صورت مطالعہ کرنا ضروری ہے ۔ اگر شوہر کا مقصد طلاق دینا نہیں تھا اور وہ نشہ یا غصہ کی حالت میں ایسا کر بیٹھے تو ایسی طلاق کو ایک اعلان خیال کر کے شوہر کو رجوع کا اختیار ...

ہونا چاہیے۔

قانونِ وراثت

اسلامی قانون وراثت میں ورثاء کے حقوق کو تسلیم کیا گیا ہے لیکن اگر ایک شخص کے انتقال کے بعد صرف ایک بیٹا زندہ ہوا اور دوسرا باپ کی زندگی میں فوت ہو چکا ہوا اور اس کی اولاد بھی موجود ہو تو تقسیم میراث کے وقت مرحوم بیٹے کی اولاد کو کوئی حصہ نہیں پہنچتا ہے جس سے ان کی بڑی حق تلفی ہوتی ہے کہا جاتا ہے کہ باپ کو حق ہے کہ وہ ان کی حق تلفی کو دور کرنے کے لیے اپنی جائداد میں سے ان بچوں کے لیے کچھ حصہ وصیت کر دے لیکن یہ اختیاری ہے لازمی نہیں۔ ایک بیٹے کے انتقال کے بعد بسا اوقات اس کی اور دوسرے بیٹوں کی اولاد میں اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں۔ بیوہ اور دوسری بہوؤں میں کشیدگی ہو جاتی ہے۔ جب تک بیٹے کا باپ زندہ رہتا ہے وہ ان کے اختلافات کو دبانے کی کوشش کرتا ہے اور بیوہ اور بچوں کا مفاد اس کے دل میں رہتا ہے لیکن اس کے مرنے کے بعد مرحوم بیٹے کی بیوہ اور اولاد کے اختلافات کی وجہ سے وہ کس مپرسی کا شکار ہو جاتے ہیں اور ان کی کفالت کا کوئی ذریعہ باقی نہیں رہتا۔ چچا اپنی اخلاقی ذمہ داری سے، اپنی اولاد کے مفاد کے مدنظر بھائی کی اولاد سے غافل ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ قانونِ شریعت میں واضح اصلاح کی جائے اور مرحوم بیٹے کی اولاد کو دوسرے بیٹے کے مساوی حصہ دیا جائے۔ محض یہ کہنا کہ باپ کو وصیت کرنے کا حق ہے کافی نہیں۔ ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ مرحوم بیٹے کی بیوہ سے کسی وجہ سے ناراضگی پیدا ہو گئی تو اس سے اور اس کے بچوں سے بے اعتنائی شروع ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں وصیت کا کوئی امکان باقی نہیں رہ جاتا ضرورت اس بات کی ہے کہ مرحوم بیٹے کی اولاد کے لیے لازمی طور سے دوسرے بیٹوں کی طرح حصہ مقرر کر دیا جائے۔ پاکستان میں ایسا قانون بنا دیا گیا ہے۔

اسلامی قانون کے مطابق شوہر کے ترکے میں سے اولاد کے ہوتے ہوئے بیوہ کو صرف ⅛ حصہ ملتا ہے جو بعض اوقات کثیر اولاد ہونے کی وجہ سے برائے نام رہ جاتا ہے۔ قانون سول میرج ایکٹ کے تحت بیوی نصف حصہ پانے کی مستحق ہو جاتی ہے۔ اس لیے اگر بیوہ کا حصہ اتنا کم ہو کہ اس سے گزارہ نہ ہو سکے تو قانون میں اتنی لچک کی ضرورت ہے کہ اس کے گزارے کے مطابق اس کا حصہ بڑھایا جا سکے۔

اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر اور ہندوستان کے بنیادی حقوق کی بنا پر عورت کے دعاوی

جنسی اختلاف کی وجہ سے کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا ۔ اس نقطۂ نظر کو اسلامی قانون شرعی کی روشنی میں دیکھا جانا ضروری ہے کیونکہ اس کا اثر وراثت اور احکام نکاح اور طلاق پر بھی پڑتا ہے ۔ میرے خیال میں چونکہ لڑکی کو کافی جہیز دیا جاتا ہے اور وہ شادی کے بعد اپنے شوہر کی جائداد اور دولت میں حصہ دار ہو جاتی ہے اس لیے ہمارے مروجہ طریقہ کار سے ان پر کوئی خاص اثر نہیں پڑنا چاہیے ۔ بہرحال موجودہ زمانے کی روش کے مطابق اس معاملے پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے ۔

اوقاف

یہاں چند باتیں اوقاف سے متعلق کہنا چاہتا ہوں جن کا مجھے سابق سکریٹری وقف بورڈ کی حیثیت سے تجربہ ہوا ۔

ہمارے ملک میں مسلمانوں کے لیے بے شمار اوقاف ہیں ۔ بعض موقوفہ جائدادیں مالی طور پر نفع بخش نہیں ہیں ۔ میرے علم میں ایسی جائدادیں مالی طور پر نفع بخش نہیں ہیں ۔ میرے علم میں ایسی جائدادیں ہیں جن کا دو چار روپیہ ماہوار کرایہ چلا آتا ہے اور اوقاف کو اس کی دیکھ بھال اور مرمت میں اس سے زائد خرچ کرنا پڑتا ہے جس سے بجائے نفع کے وہ نقصان دہ ثابت ہوتی ہیں ۔ ایسی جائدادوں کا فروخت کرنا ضروری ہو جاتا ہے لیکن موقوفہ جائداد قانوناً واقف کی مرضی کے خلاف فروخت نہیں ہو سکتی ۔ مصر میں ایسا قانون بنا دیا گیا ہے کہ مساجد کے علاوہ غیر منفعت بخش جائدادیں فروخت کی جا سکتی ہیں ۔ کیوں نہ ہم بھی اپنے قانون میں ایسی ترمیم کریں جس سے بوجھ ہمارے سر سے اٹھ جائے ۔

ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ مختلف صوبوں میں الگ الگ وقف ایکٹوں کا نفاذ ہے ۔ جہاں تک ہمارے اترپردیش اور مغربی بنگال کی ریاستوں کا تعلق ہے مرکزی ایکٹ کا اطلاق ریاستی حکومتوں کی سفارش پر منحصر ہے ۔ کچھ ریاستیں مہاراشٹر اور گجرات میں مرکزی ایکٹ کے تابع ہیں ۔ میرے خیال میں یہ طریقہ کار غلط ہے وقف کی جائدادوں کا نظم و نسق یکساں مرکزی قانون کے تابع ہونا چاہیے ۔ ایک دوسرا مسئلہ وقف علی الاولاد کا ہے ۔ اس کی صراحت وقف ایکٹ میں ضروری ہے ۔ کیونکہ زیادہ تر موقوفہ جائدادیں بہت پرانی ہیں اور بہت سے لوگ ان پر ناجائز طریقے سے قابض ہو چکے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ ان جائدادوں کے متعلق معیاری سروے کرایا جائے اور سروے کا خرچہ وقف کی املاک سے وصول کیا جائے لیکن اگر وقف بورڈ ایسے اخراجات برداشت کرنے کے قابل نہ ہوں تو ریاستی حکومت ایسے اخراجات برداشت کرے

میرے خیال میں وقف کمشنر کو مزید اختیارات دیے جانے چاہئیں کہ وہ مقامی وقف بورڈ کے کاموں کا معائنہ کے بعد ایسی اصلاحات جو ضروری ہوں ان کو نافذ کر سکے۔ سنٹرل وقف کونسل کے اختیارات میں بھی جو اس وقت مشاورتی نوعیت کے ہیں اس کو مزید اختیارات دیا جانا مناسب ہوگا۔ اور یہ اختیارات قانونی طور پر دیے جانے چاہئیں۔

ایک سوال یہ بھی قابل غور ہے کہ آیا ریاستی بورڈ میں منتخب نمائندے ہوں یا نامزد۔ میرے خیال میں نامزدگی اگر مسلمانوں کے نمائندگان مجلس کی سفارش پر کی جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ متولیان موقوفہ جائدادوں سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان کے علیحدہ کرنے میں وقف بورڈ کو ملائم طریقے سے خود علیحدہ کرنے کا اختیار ہونا چاہیے۔

ایک بڑی مشکل آج کل وقف بورڈ کو اس بات کی درپیش رہتی ہے کہ موقوفہ املاک کے نادہند کرایہ داران کے خلاف قانونی کارروائی میں برسوں لگ جاتے ہیں جس سے علاوہ خرچ کے وقف کی آمدنی پر کافی اثر پڑتا ہے۔ میرے خیال میں اگر موقوفہ جائدادوں کے کرایہ کی وصولی کو رینٹ کنٹرول ایکٹ سے مستثنیٰ کرا لیا جائے تو وقف بورڈ اس دردسری سے بچ جائیں۔ سکریٹری یا کمشنر وقف بورڈ کو کرایہ کے بقایا وصول کرنے کا قانونی اختیار ملنا چاہیے جیسے کہ تحصیلدار کو سرکاری مطالبہ تقاوی وغیرہ وصول کرنے کا اختیار ہے۔

مصالحت

سورۂ نساء میں درج ہے کہ اگر شوہر اور بیوی کے درمیان کشاکش کا علم ہو تو ایک نمائندہ مرد کی طرف سے اور ایک عورت کی طرف سے قائم کرو اور دونوں کے درمیان مصالحت کرانے کی کوشش کرو تو اللہ تعالیٰ دونوں کے درمیان علم رکھنے والا اور ہر طرح واقف ہے اور وہ مصالحت کو اچھی نظر سے دیکھتا ہے۔ میں نے مصالحت کی بنا پر ایک یونیفارم کوڈ تیار کیا ہے جو بغرض ملاحظہ علمائے کرام اور دیگر ماہرین قانون کی خدمت میں پیش ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ مجوزہ یونیفارم کوڈ قانون الٰہیہ پر نظرثانی نہیں ہوگا نیز جو مسلمان شوہر اپنی بیویوں پر زیادتی کرتے ہیں اور طلاق وغیرہ کے اختیار کا ناجائز استعمال کرتے ہیں ان کی اس قانون سے روک تھام ہو سکتی ہے۔ یہ قانون ایسا ہے کہ غیر مسلموں پر بھی عائد کیا جائے تو قابل اعتراض نہیں ہو سکتا لیکن مسلمانوں کو تو اپنی بیویوں سے اچھے تعلقات رکھنا ضروری

سمجھتے ہیں۔

یونیفارم کوڈ

قطع نظر شریعت ایکٹ ۱۹۳۷ء اور ہندو میرج کوڈ کے یہ قانون بنایا جاتا ہے کہ مسلم اور غیر مسلم دونوں اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

دفعہ ۱ شادیوں کے جملہ تنازعات مثلاً شوہر کی بدسلوکی، جہیز کی خرد برد وغیرہ، ایک مصالحتی کمیٹی کے سامنے پیش کیے جائیں۔ اس مصالحتی کمیٹی میں ایک نمائندہ بیوی کی طرف سے ایک شوہر کی طرف سے ہو۔ اس کمیٹی کا صدر دونوں کی رضامندی سے مقرر کیا جائے لیکن اگر صدر کے تقرر پر اتفاق رائے نہ ہو سکے تو فریقین کو اختیار ہوگا کہ وہ نااتفاقی ہونے کی صورت میں ڈسٹرکٹ جج سے درخواست کریں کہ وہ کسی سینیر جج کو مقرر کر دیں جو فریقین کی شہادت کے بعد اپنا فیصلہ سنائے۔

دفعہ ۲ کوئی شخص دوسری شادی مصالحتی کمیٹی کی اجازت کے بغیر نہیں کرے اور دوسری شادی کی ضرورت کے لیے اپنی ضرورت کو ثابت کرنا ہوگا۔ مثلاً اس کی پہلی بیوی بانجھ ہے اور وہ اولاد سے محروم ہے، یا اس کی پہلی بیوی کی صحت اتنی خراب ہو چکی ہے یا فاطر العقل ہے اور گھر کی دیکھ بھال کرنے کے بالکل قابل نہیں ہے۔ تو مصالحتی کمیٹی اس کو دوسری شادی کرنے کی اجازت دے گی۔ بشرطیکہ وہ اپنی پہلی بیوی اور بچوں کے گزارے کا انتظام کرے۔

نوٹ: ۔ اس دفعہ سے دوسری یا تیسری شادی کرنے پر شرعاً کوئی پابندی عائد نہیں ہوتی اور مسلمانوں کا یہ حق قائم رہتا ہے لیکن اس سے پہلی بیوی بچوں کے مستقبل کا انتظام ہو جاتا ہے۔

دفعہ ۳ کوئی شخص اپنی بیوی کو بلا اجازت مصالحتی بورڈ بلا وجہ علیحدگی نہیں کرے گا اور علیحدہ کرنے سے پہلے اس کو یہ ثبوت دینا ہوگا کہ وہ اپنی بیوی کو کیوں علیحدہ کر رہا ہے۔

نوٹ: ۔ اس دفعہ کے تحت کوئی شخص خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان بیوی کو علیحدہ نہیں کر سکتا اور اس سے یہ بھی فائدہ ہے کہ تین طلاقیں ایک بار دینے کی رسم بھی ختم کی جا سکتی ہے چونکہ ہندوؤں میں طلاق کا رواج نہیں ہے اس لیے لفظ علیحدگی کو استعمال کیا گیا ہے۔

دفعہ ۴ تمام شادیوں کو جو مسلمانوں کے درمیان ہوں قاضی اپنے رجسٹر میں اور ہندوؤں کی شادی

پنڈت جو پھیرے کی رسم ادا کرائے وہ رجسٹر میں درج کرے گا جس میں جہیز اور چڑھاوے کی پوری تفصیل درج ہوتا کہ فریقین کو خرد برد کرنے کا موقع نہ ملے اور تنازعہ کے وقت عدالت کو سہولت حاصل ہو

نوٹ:۔ قاضی، پنڈت، پروہت ان کا تقرر گورنمنٹ یعنی ڈسٹرکٹ جج کی طرف سے ہوتا کہ اگر وہ کوئی غلط کام کریں تو ان کو برخاست کیا جا سکے۔

دفعہ ۵ کوئی شخص جو دوسری شادی بلا اجازت کرے گا وہ تین ماہ کی قید با مشقت اور ہزار روپیہ جرمانہ دینے کا مستحق ہوگا۔ عدالت کو یہ بھی اختیار ہوگا کہ وہ اس رقم میں سے جو مناسب سمجھے بیوی بچوں کو دلاوے۔ یہ طریقہ پاکستان اور کئی مسلم ممالک میں رائج ہے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے مذہب پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

نوٹ جناب سید عزیز الشفیع صاحب ایڈیشنل جج (فرسٹ کلاس) دہلی نے اپنا یہ مقالہ زندگی میں شائع کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ ان کے اس مقالے کی اشاعت کا مقصد بھی یہ ہے کہ مسلم پرسنل لا میں بنیادی تبدیلی چاہنے والوں کی پوری بات اور ان کے سوچنے کا انداز سامنے آجائے۔

جناب شفیع صاحب بھی ان لوگوں میں ہیں جو ایک طرف مذہب اور شریعت سے اپنا تعلق جوڑے رکھنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف مسائل کا حل، مذہب اور شریعت سے آزاد ہو کر پیش کرتے ہیں اور اپنے اس تضاد کو شاید محسوس بھی نہیں کرتے۔ وہ مقالے کی ابتدا میں لکھتے ہیں:۔

"مجھے اس امر سے اتفاق ہے کہ جہاں تک قانون الٰہیہ کا تعلق ہے اس میں کوئی شخص بھی اس کے خلاف رد و بدل کی جرأت نہیں کر سکتا۔"

لیکن جب وہ مسائل پر تفصیل سے گفتگو شروع کرتے ہیں اور تجاویز پیش کرنے لگتے ہیں تو انھیں اپنی یہ بات یاد نہیں رہتی چنانچہ وراثت کے مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے دادا کے ترکے سے یتیم پوتوں کی محرومی کو "ان کی بڑی حق تلفی" قرار دیا ہے اور صراحت کے ساتھ قانون شریعت میں واضح اصلاح کی تجویز پیش کی ہے۔ وہ یتیم پوتے کی وراثت کے مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اس لیے ضروری ہے کہ قانون شریعت میں واضح اصلاح کی جائے اور مرحوم بیٹے کی اولاد کو دوسرے بیٹے کے مساوی حصہ دیا جائے۔"

صاحب مقالہ نے یہ محسوس نہیں کیا کہ ایک طرف تو وہ یہ کہتے ہیں کہ قوانین شریعت میں رد و بدل کی جرأت نہیں کی جا سکتی اور دوسری طرف وہ شریعت کے ایک ایسے قانون میں رد و بدل کی جرأت کر رہے ہیں جس پر پوری امت مسلمہ متفق اور عامل رہی ہے اور انھوں نے یہ بھی محسوس نہیں کیا کہ اس قانون کو "بڑی حق تلفی" کہنے کی زد کہاں کہاں اور کس کس پر پڑتی ہے

اگر کسی مسلمان حکومت نے ڈنڈے کے زور سے اس قانون میں تبدیلی کی ہے تو اس کو دلیل بنانا کسی طرح معقول نہیں ہے۔ اس نے قانون شریعت میں رد و بدل کرنے کی وہ جرأت دکھائی ہے جب کہ اس کو قطعی طور پر کوئی حق حاصل نہیں ہے ـــــ یتیم پوتے کی وراثت کے مسئلے پر راقم الحروف کا مقالہ اسی نمبر میں شائع ہوا ہے۔ جناب شفیع صاحب سے درخواست ہے کہ وہ اس کا مطالعہ کریں ـــــ ان سے دوسری درخواست یہ ہے کہ جب وہ نکاح و طلاق سے متعلق مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لیے اسپیشل جج ہیں اور ان مسائل میں اصلاحات بھی تجویز کرتے ہیں تو انہیں کم سے کم ان مسائل سے متعلق قرآن، احادیث اور اسلامی فقہ کے احکام و دلائل کی واقفیت ہونی چاہیے اور اب تو اردو زبان میں اس کا وسیع ذخیرہ موجود ہے۔ وہ چونکہ جج ہیں اس لیے انہیں اس بات کا زیادہ احساس ہونا چاہیے کہ کسی چیز کی واقفیت کے بغیر اس پر رائے زنی کرنا یا فیصلہ دینا کوئی معقول روش نہیں ہے لیکن انھوں نے رائے زنی اور فیصلہ ہی میں نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف حدیث منسوب کرنے میں بھی اس کا خیال نہیں رکھا ہے۔ تین طلاقوں کی بحث میں لکھتے ہیں :۔

"انھوں نے (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے) ایک مرتبہ یہ بھی فرمایا کہ اگر سو طلاقیں بیک وقت ایک ہی مجلس میں دی جائیں تو ایک ہی شمار کی جائیں گی۔"

کسی کتاب کا حوالہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی ہے اور قطعی انداز میں حضور کی طرف ایک غلط بات منسوب کر دی گئی ہے۔ انھوں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ اگر واقعی یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہوتا تو ائمہ اربعہ ـــ امام ابوحنیفہ، مالک، شافعی، احمد رحمہم اللہ اور علمائے امت کی عظیم اکثریت بیک مجلس تین طلاقوں کو تین کیوں قرار دیتی ـــــ بلا شبہہ فقہ اسلامی میں ایک رائے یہ بھی ہے کہ بیک مجلس تین طلاقوں کو ایک قرار دیا جائے۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جو لوگ سرے سے حق طلاق چھین کر عدالت یا ثالثی بورڈ کے حوالے کرنا چاہتے ہیں وہ اس کی تائید کیوں کرتے ہیں اور یہ کہ وہ کیوں کر مسلک فقہ کی ترجمانی کرتے

کرسکتے ہیں ؟ جناب عزیز الشیخ صاحب کے علم میں یہ بات ہونی چاہیے کہ مسلمانوں کے کسی مسلک نے عورت کو بھی مرد سے حق طلاق طلب نہیں کیا اور جب وہ یہ تجویز پیش کر رہے ہیں کہ مصالحتی بورڈ کو مطمئن کیے بغیر کوئی مرد اپنی بیوی کو طلاق نہیں دے سکتا تو پھر اس سلسلے میں یک مجلس تین طلاقوں کی بحث چھیڑنا اور قرآن و حدیث کا نام لینا ایک مہمل اور بے معنی بات ہے یا نہیں ؟

طلاق کے سلسلے میں جو لوگ یہ نئی شریعت بنوانے کی خواہش رکھتے ہیں وہ یہ نہیں سوچتے کہ اس طرح کی پابندی کا صرف شوہر ہی پر ظلم نہیں ہوگی بلکہ اس کی بیوی پر بھی یہ پابندی آفت بن کر ٹوٹے گی۔ فرض کیجیے کہ شوہر اپنی ناپسندیدہ بیوی سے ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی تعلقات زناشوئی ترک کر دیتا ہے۔ اس صورت میں اس کی جوان بیوی کیا کرے ؟ اگر وہ بدکاری میں مبتلا نہ ہو بلکہ تھوڑی بے شرمی برداشت کرکے اسپیشل جج صاحب کی عدالت میں یہ دعویٰ دائر کرے کہ اس کے شوہر نے ترک تعلق کر رکھا ہے تو وہ کیا فیصلہ دیں گے ؟ کیا وہ شوہر کو مجبور کریں گے کہ اپنی بیوی سے تعلق زناشوئی قائم کرے۔ نیز یہ کہ وہ یہ فیصلہ آخر کس قانون کے تحت دیں گے ؟ اور شوہر کو کس طرح مجبور کریں گے ؟

مرد اپنی ناپسندیدہ بیوی کو طلاق بھی نہیں دے سکتا اور دوسری شادی بھی نہیں کر سکتا اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا نکلے گا کہ مرد بھی بدکاری میں مبتلا ہو اور عورت بھی —— مرد پر اس پابندی کا ایک نتیجہ اور بھی نکل سکتا ہے وہ یہ کہ مصالحتی بورڈ سے اجازت لیے بغیر وہ اپنی ناپسندیدہ بیوی کو ایک طلاق دے اور رجوع نہ کرے۔ یہاں تک کہ عدت گذر جائے۔ قانون الٰہی کے تحت اب وہ میاں بیوی نہیں رہے لیکن اس نئے قانون کی نظر میں وہ اب بھی میاں بیوی ہوں گے اور شوہر اس کو اپنے گھر سے علیحدہ نہیں کر سکتا۔ سوچیے کہ یہ صورت حال مسلمان معاشرے میں کتنی پیچیدگیاں اور خرابیاں پیدا کرے گی۔

اس کے علاوہ جناب جج صاحب کو یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ کیا ظلم و زیادتی کا ارتکاب صرف مرد ہی کرتے ہیں ؟ کیا عورتیں بالکل معصوم ہوتی ہیں ؟ کیا ایسی صورتیں پیش نہیں آتیں کہ بیویاں بغیر کسی شرعی اور معقول وجہ کے اپنے میکے میں بیٹھ رہتی ہیں اور شوہروں کی منت سماجت کے باوجود وہ شوہروں کے گھر نہیں جاتیں اس طرح وہ اپنے شوہروں کو طلاق کے بغیر ہی چھوڑ بیٹھتی ہیں۔ اس صورت حال کے لیے جج صاحب کے پولیٹیکل [illegible] کوئی دفعہ نہیں ہے۔ کیا نئی شریعت میں انصاف اور داد رسی صرف عورتوں کے لیے

ہے مگر ان کے سمجھ میں نہیں آرہی ہیں؟ ـــــ اسلام جس کا احترام شفیع صاحب بھی کرتے ہیں، مرد اور
عورت دونوں کے ساتھ انصاف کرتا ہے۔ اس کے قوانین یک طرفہ نہیں ہیں۔

اگر کچھ مرد ایسے ظالم ہیں کہ اپنی بیویوں کو بلا وجہ طلاق دیتے ہیں۔ مہر بھی ادا نہیں کرتے، مہر بھی ادا
نہیں کرتے اور ان کے جہیز بھی دبا بیٹھتے ہیں تو اس ظلم کا علاج یہ نہیں ہے کہ تمام مردوں سے حق طلاق سلب
کر لیا جائے، بلکہ علاج یہ ہے کہ اس ظلم کی تلافی کے لیے قوانین بنوائے جائیں اور انہیں سختی کے ساتھ
نافذ کیا جائے۔ اسلام نے یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔ ہمیں یہ نہیں معلوم کہ اسپشل جج صاحب کے اختیارات
کیا ہیں لیکن یہ معلوم ہے کہ اسلامی حکومتوں میں قاضی اس طرح کے ظلم کی تلافی کے لیے مکمل اختیارات رکھتے
ہیں۔ اگر وہ کہیں کہ ہندوستان میں قضاء شرعی موجود نہیں ہے تو میں عرض کروں گا کہ جج صاحب کے
لیے صحیح رویہ یہ ہوگی کہ قانون شریعت میں رد و بدل کی تجویز پیش کرنے کے بجائے جس کا حق کسی کو نہیں ہے
انہیں ایسی تجاویز پیش کرنی چاہییں جن سے مظلوموں کو خواہ وہ عورتیں ہوں یا مرد، انصاف مل سکے اور حکومت
سے مطالبہ کرنا چاہیے کہ وہ مسلم پرسنل لا سے متعلق مقدمات طے کرنے کے لیے اسپشل با اختیار عدالتوں کا انتظام
کرے اور اسلامی شریعت سے واقف مسلمانوں کو جج بنائے۔

جج صاحب نے یونیفارم کوڈ کا جو نمونہ پیش کیا ہے اس سے صرف ان لوگوں کو تقویت حاصل ہوگی
جو ہندوستان میں یکساں سول کوڈ کو نافذ کرنے کے لیے مہم چلا رہے ہیں۔

اپنے اس مقالے میں جج صاحب نے تعدد ازدواج کے بارے میں وہی کہانی دہرا دی ہے جو مغرب زدہ
لوگوں نے تیار کی ہے یعنی جہاد میں بہت مردوں کا شہید ہونا، ان کی بیویوں کا بیوہ ہونا اور یتیم بچیوں اور
بچوں کا مسئلہ پیدا ہو جانا اور اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے وقتی طور پر تعدد ازدواج کی اجازت ملنا۔

میرا مقالہ "تعدد ازدواج" اسی نمبر میں شائع ہو رہا ہے اس میں اس پر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے ـــ
اس مختصر نوٹ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جو لوگ اپنے آپ کو بہت ترقی پسند، وسیع الذہن اور روشن خیال سمجھتے
ہیں ان کا حال یہ ہے کہ ان کے کسی بے ثبوت دعوے کے لیے کوئی ثبوت طلب کیا جاتا ہے یا ان کی کسی بات
کا مدلل جواب دیا جاتا ہے تو وہ نہ کوئی ثبوت پیش کرتے ہیں اور نہ مدلل جواب کے بارے میں کوئی اظہار خیال
کرتے ہیں بلکہ وقفے وقفے سے اپنے بے ثبوت دعوے اور غیر معقول بات کو دہراتے رہتے ہیں ـــ اہل علم نے
اپنے متعدد مقالات میں یہ بتایا ہے کہ تعدد ازدواج سے متعلق آیت، تعدد ازدواج کی اجازت دینے کے لیے

نہیں اتری تھی کیونکہ تعددِ ازدواج تو پہلے ہی سے جائز اور رائج تھا لیکن اس کی کوئی حد مقرر نہ تھی۔ عرب
میں لوگ بیک وقت آٹھ آٹھ دس دس عورتوں سے نکاح کر لیتے تھے۔ اسی کثرت ازدواج کو محدود کرنے کے لیے
سورۂ نساء کی آیت ۳ نازل ہوئی اور اس نے پہلے سے جائز تعدد ازدواج کو چار تک محدود کر دیا۔

جو لوگ اس آیت کو بیواؤں اور یتیموں کے مسئلے سے جوڑتے ہیں وہ بالکل الٹی اور غلط بات کہتے ہیں
ان کے خیال میں عرب کے اندر تعددِ ازدواج کا رواج نہ تھا اور صرف ایک ہی بیوی جائز تھی جب بیواؤں اور
یتیم بچیوں کا مسئلہ پیدا ہوا تو اسے حل کرنے کے لیے وقتی طور پر مسلمانوں کو بیک وقت چار شادیاں کرنے کی اجازت
دی گئی۔ ان کا یہ خیال نہ صرف قرآن اور احادیث کے نصوص کی بنا پر بلکہ تاریخی طور پر بھی بالکل بے بنیاد
اور غلط ہے لیکن وہ اپنا غلط خیال دہراتے چلے جاتے ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ کسی افہام و
تفہیم کے لیے آمادہ نہیں ہیں بلکہ مغرب زدہ دانشوروں اور ججوں کی اندھی تقلید میں یا حکومت کو خوش
کرنے کے لیے تعدد ازدواج کو ایک برائی ثابت کرنے پر کمر بستہ ہیں۔ یہ ہے اس زمانے کی ترقی پسندی
وسیع الذہنی اور روشن خیالی جو ڈنڈے کے زور سے اپنی باتیں منوانے پر تلی ہوئی ہے۔

مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کی فضا تیار کرنے کے لیے ایک علوتر اور اختیار کی جا رہی ہے اور وہ یہ ہے
کہ علماء کے ذہن پر اثر ڈالنے کے لیے بڑے زور و شور سے کہا جا رہا ہے کہ عورتیں مظالم کا شکار ہیں وہ
مذہب سے بغاوت پر آمادہ ہیں بعض اونچے گھرانوں کی لڑکیاں اسپشل سول میرج ایکٹ کے تحت اپنی شادیاں رجسٹر
کرا رہی ہیں تاکہ اپنے شوہروں کی جائداد سے نصف حصہ پا سکیں مسلم پرسنل لا میں پہلے بھی تبدیلیاں ہو چکی ہیں
حکومت ملک میں یکساں سول کوڈ نافذ کرنا چاہتی ہے۔ زمانہ بہت بدل گیا ہے۔ حالات بہت بدل گئے ہیں
اور فلاں فلاں مسلم حکومتوں نے تبدیلی کر بھی دی ہے۔ اس لیے اے گروہ علماء! اس سے پہلے کہ حکومت کوئی
تبدیلی کرائے۔ آپ خود آگے بڑھ کر اپنے مسلم پرسنل لا میں بنیادی تبدیلیاں کر دینی چاہئیں۔ اس سے
قطع نظر کہ علماء کو اس کا حق ہے بھی نہیں۔ یہ شور و غل سن کر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے مسلم پرسنل لا کوئی
مرغ ہو کہ اگر اس کی گردن لوگ یونہی کاٹ دیں تو وہ حرام ہو جائے گا اور اگر علمائے کرام اپنے دست مبارک سے
بسم اللہ اللہ اکبر پڑھ کر ذبح کر دیں تو حلال ہو جائے گا۔ اسپشل جج صاحب نے بھی اپنے مقالے کی تمہید میں کچھ اسی طرح کا
نقشہ کھینچا ہے۔ ان لوگوں کو نہیں معلوم کہ علمائے حق کی اسلامی شریعت میں حیثیت کیا ہے۔ یہ لوگ شاید علماء
کو بھی پادریوں اور پنڈتوں کی طرح سمجھتے ہیں کہ وہ جب چاہتے ہیں مذہب کے احکام ہی منسوخ کر دیتے ہیں یا ان میں بھی
حسب منشا تبدیلی کر دیتے ہیں —

قضاءِ شرعی کا قیام ضروری ہے

سیّد احمد قادری

مسلمانوں کے عائلی مسائل کا صحیح اور شرعی حل قضاءِ شرعی کے قیام پر موقوف ہے۔ آج جن مسائل کے مجموعہ کو "مسلم پرسنل لا" کہا جاتا ہے وہ اسلامی شریعت کا جز ہیں اور شرعی امور و معاملات کے صحیح اور برحق فیصلہ و تصفیہ کے لیے دو باتیں لازمی ہیں۔ ایک یہ کہ فیصلہ اسلامی شریعت کے مطابق ہو اور دوسری بات یہ کہ فیصلہ کرنے والا مسلمان ہو۔ یہ دونوں ایسی شرطیں ہیں جن پر پوری امت مسلمہ متفق رہی ہے۔ علماء، فقہاء اور ائمہ دین میں سے کسی کو اس سے اختلاف نہیں ہے ——— ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت نے ایک طرف مسلم پرسنل لا کو باقی رکھا اور دوسری طرف شرعی عدالتیں توڑ دیں۔ ۱۸۶۴ء تک مسلمانوں کے شرعی معاملات کا فیصلہ مسلمان قاضی ہی کرتے تھے، اور ان کا انتخاب بھی علماء کی جماعت سے کیا جاتا تھا لیکن اس کے بعد قاضی کا منصب منسوخ کر دیا گیا اور مسلمانوں کے شرعی معاملات بھی عام انگریزی عدالتوں کے اختیار میں دے دیئے گئے اور جج یا کسی منصف کے مسلمان ہونے کی شرط بھی ختم کر دی گئی۔ ان دو بالکل متضاد باتوں سے جو پیچیدگیاں پیدا ہوئیں مسلم معاشرے میں جو خرابیاں رونما ہوئیں غیر مسلم ججوں کے غلط فیصلوں نے جو نظیریں قائم کیں، مسلم پرسنل لا کے مختلف مسائل و احکام کی جو غلط تعبیریں کی گئیں وہ ہمارے سامنے ہیں۔ ان کے علاوہ مسلم پرسنل لا سے متعلق بعض شرعی احکام سے نکل بھاگنے اور انگریزوں کے بنائے ہوئے قوانین کو اختیار کر لینے کے لیے متعدد دروازے کھول دیئے گئے۔ جب ہندوستان آزاد ہوا اور ہمارے اس ملک کا دستور بنا تو افسوس یہ ہے کہ اس میں بھی ایک ایسا تضاد اختیار کیا گیا جو ہمارے لیے مصیبت بنا ہوا ہے۔ یعنی ایک طرف تو اقلیتوں کو مذہبی، تہذیبی اور تعلیمی و لسانی آزادی عطا کی گئی ہے اور دوسری طرف رہنما اصول میں پورے ملک کے لیے یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے اور جدید ہی اس پر عمل بھی کیا جا رہا ہے، اس طرح دستور کی دفعہ ۴۴ ہمارے سر پر ایک لٹکتی ہوئی تلوار بن گئی ہے۔ ان کے

علاوہ اس سے بڑی مصیبت ایک اور ہے جس کی طرف ہم مسلمانوں نے بہت کم توجہ کی ہے اور جس کا اثر انا ہے گزیرہا یہ کہ نکاح، طلاق، خلع، وراثت، وصیت، وقف اور اسی طرح کے دوسرے دینی امور و معاملات میں فیصلہ کرنے کا مسلمان ہونا ایک لازمی اور شرعاً ناقابل تغیر شرط ہے جو ختم کر دی گئی ہے ہم پہلے اسی پر گفتگو کریں گے اس کے بعد اس مخمصے سے نکلنے کی تدبیریں پیش کریں گے۔

امام علاء الدین ابوبکر بن مسعود کاسانی متوفی ۵۸۷ھ نے اپنی بے نظیر فقہی تصنیف "بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع" میں نصب امام کی فرضیت پر مختصر مگر بہت جامع گفتگو کی ہے۔ ہم یہاں اس کا ترجمہ پیش کرتے ہیں:

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ نصب قاضی (قاضی مقرر کرنا) فرض ہے اس لیے کہ وہ قضاء یعنی شرعی امور و معاملات کے فیصلے کے لیے مقرر کیا جاتا ہے اور قضاء شرعی (دینی امور و معاملات کا شریعت کے مطابق فیصلہ کرنا) فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ (۱) (اے داؤدؑ ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے تو لوگوں کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلے کیا کرو) اور اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی مکرم علیہ افضل الصلوٰۃ والسلام کو حکم دیا ہے: فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ (۲) (تو جو حکم اللہ نے نازل کیا ہے اس کے مطابق ان کے درمیان فیصلہ کرو) اور قضاء کہتے ہی ہیں لوگوں کے درمیان برحق اور اللہ عزوجل کے نازل کیے ہوئے حکم کے مطابق فیصلہ کرنے کو ——— اس سے معلوم ہوا کہ قاضی مقرر کرنا فرض کی انجام دہی و اقامت کے لیے ہے لہٰذا وہ بھی بداہۃً اور لازماً فرض ہوگا۔ نصب قاضی کے فرض ہونے کی یہ بھی دلیل ہے کہ بلا اختلاف تمام اہل حق کے نزدیک امام اعظم (خلیفۃ المسلمین) کا تقرر مسلمانوں پر فرض ہے، اس لیے کہ اس پر تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہے اور اس لیے بھی کہ احکام کی تنفیذ، مظلوموں کی دادرسی، باہمی نزاعات (جو فساد کی جڑ ہوتے ہیں) کے تصفیہ اور دوسرے بہت سے ایسے مصالح کے لیے جن کی بجا آوری حکومت پر موقوف ہوتی ہے۔ امام اعظم کا تقرر ضروری ہے اور یہ بات معلوم ہے کہ تنہا ایک شخص ان ذمہ داریوں کو انجام نہیں دے سکتا اس لیے امام اعظم نائبین کا محتاج ہوتا ہے تاکہ وہ نیابۃً اس کی ذمہ داریاں انجام

[illegible]

میں، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسلامی مملکت کے مختلف حصوں میں قاضیوں کا تقرر کر کے انہیں وہاں بھیجتے تھے۔ آپ نے سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن اور عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کو مکہ میں قاضی مقرر کیا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ قاضی کا تقرر امام اعظم کے تقرر کے لوازم میں داخل ہے، لہذا یہ بھی نصب امام ہی کی طرح فرض ہوگا۔ اور امام محمدؒ نے اس کو فریضۂ محکمہ کہا ہے اس لیے کہ اس کے منسوخ ہونے کا کوئی احتمال نہیں ہے (۱)

ملک العلماء کاسانی کی اس مدلل بحث سے واضح ہوا کہ اصلاً مسلمانوں پر اپنے دنیوی معاملات کو درست رکھنے اور اپنے دینی امور و فرائض کو انجام دینے کے لیے امام اعظم (امیر المومنین) کا تقرر فرض ہے اور اس کے لازمی مقتضیات میں یہ بھی ہے کہ مسلمان قاضی مقرر کیے جائیں کیونکہ شرعی معاملات میں کسی غیر مسلم کا فیصلہ نافذ ہی نہیں ہوتا، علامہ کاسانی نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ جس طرح بچے یا پاگل کو قاضی بنانا جائز نہیں ہے اسی طرح کسی کافر کو بھی قاضی بنانا جائز نہیں ہے اور یہی صراحت درمختار میں ہے:

وقضاء کافر علی مسلم لاینفذ ابدا — کسی مسلمان پر کسی کافر کا فیصلہ کبھی نافذ نہیں ہوتا۔ (۲)

اسی طرح شرعی معاملات میں ملحدوں، زندیقوں اور نصرانیوں کا فیصلہ بھی صحیح نہیں ہے۔ علامہ شامی لکھتے ہیں:-

"فقہاء کے کلام سے ان قاضیوں کا حکم بھی ظاہر ہوا جو ملک شام کے علاقہ دروز میں مقرر کیے جاتے ہیں وہ یا تو فرقہ دروزیہ سے تعلق رکھتے ہیں یا نصرانی ہوتے ہیں اور مسلمانوں کے معاملات میں ان میں سے کسی کا فیصلہ بھی صحیح نہیں، کیونکہ فرقہ دروزیہ کا تو منافق اور زندیق کی طرح کوئی دین ہی نہیں اگرچہ وہ اپنے آپ کو مسلمان کہیں۔ (۳)"

اس سے آگے کی بات یہ ہے کہ ائمہ ثلاثہ۔ مالک، شافعی، احمد رحمہم اللہ کے نزدیک فاسق مسلمان بھی قاضی بننے کی اہلیت نہیں رکھتا اور اس کا فیصلہ بھی نافذ نہیں ہوتا۔ ائمہ احناف میں سے امام طحاوی نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ لیکن فقہ حنفی کا مفتی بہ قول یہ ہے کہ فاسق کا فیصلہ نافذ ہو جاتا ہے مگر فاسق مسلمان کو قاضی

---

(۱) بدائع ج ۷ ص ۲ مطبوعہ مصر۔ (۲) درمختار مع رد المحتار ج ۴ ص ۳۱۲ مطبوعہ مصر (۳) شامی ج ۴ ص ۳۴۳ مطبوعہ

مقرر کرنا صحیح نہیں ہے اور جو لوگ ایسا کریں گے وہ گناہ گار ہوں گے۔

فقہاء کی ان تصریحات کو دیکھئے اور پھر اس مصیبت پر نظر ڈالیے جس میں ہم مسلمان انگریزوں کے عہد سے مبتلا کر دیے گئے ہیں۔ اس وقت سے لے کر آج تک مسلمانوں کے سیکڑوں ہزاروں دینی امور و معاملات کے فیصلے غیر مسلم ججوں اور حاکموں نے کیے ہوں گے یہاں تک کہ انفساخ نکاح کے بھی ہزاروں مقدمات کا فیصلہ انھوں نے کیا ہوگا۔ تمام فیصلے جو انھوں نے ماضی میں کیے وہ شرعاً نافذ ہی نہیں ہوئے اور آئندہ بھی جو فیصلے وہ کریں گے، شرعاً نافذ نہ ہوں گے یہ اتنی بڑی مصیبت ہے کہ اس کے تصور سے بھی روح بے چین ہوتی ہے۔

کرنے کے کام

جیسا کہ علامہ کاسانی کے حوالے سے اوپر گزرا مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ امام اعظم (امیر المومنین) کا تقرر کریں لیکن یہ کوئی آسان کام نہیں ہے جو فوری طور پر انجام پا سکے، کیونکہ امام اعظم، اسلامی حکومت کے سربراہ کو کہتے ہیں اور اسلامی حکومت کا قیام ایک مشکل کام ہے اس لیے عبوری دور کے لیے ہندوستانی مسلمانوں کو دو کام بیک وقت شروع کرنے چاہئیں، ایک یہ کہ دستور کی دفعہ ۴۴ ختم کی جائے اور دوسری یہ کہ مسلم پرسنل لا سے متعلق مقدمات کا فیصلہ و تصفیہ کرنے کے لیے مخصوص عدالتیں قائم کی جائیں جن میں اسلامی شریعت سے واقف مسلمان جج مقرر کیے جائیں یا مسلمانوں کو ایسے دار القضاء قائم کرنے کی باضابطہ اجازت دی جائے جن کے فیصلے ملکی عدالتوں کے فیصلوں کی طرح قانونی تسلیم کیے جائیں، ملک کی عام عدالتیں مسلم پرسنل لا سے متعلق مقدمات قبول نہ کریں بلکہ انھیں دار القضاء کی طرف منتقل کر دیں ——— مسلمان ماہرین قانون کو اس طرح کے ایک بل کا مسودہ تیار کرنا چاہیے اور پھر تمام مسلمانوں کو اسے لوک سبھا میں پیش کرانے اور پاس کرانے کی کوشش شروع کر دینی چاہیے۔

میرا خیال ہے کہ شریعت ایکٹ ۱۹۳۷ء کو باقی رکھنے یا مسلم پرسنل لا میں تبدیلی نہ کرنے کی آواز بلند کرتے رہنا کافی نہیں ہے۔ اگر شریعت ایکٹ باقی بھی رہ جائے تو یہ مسلمانوں کے عائلی مسائل کا صحیح حل نہیں ہے۔ کچھ مغرب زدہ یا حکومت کے خوشامدی مسلمانوں کی طرف سے مسلم پرسنل لا میں تبدیلی و ترمیم کی آواز بھی صرف اس لیے بلند ہو رہی ہے کہ مخلص اور سچے مسلمان قضاء شرعی کے قیام کا مطالبہ لے کر نہیں اٹھے ہیں۔ جب وہ سنجیدگی اور عزم کے ساتھ یہ مطالبہ لے کر اٹھیں گے تو یہ صدائے بے ہنگام دب جائے گی یا بند ہو جائے گی۔ افسوس ہے کہ ماضی میں بھی مسلمانوں نے قضاء شرعی کے قیام کو سنجیدہ مسئلہ نہیں بنایا اور آج بھی ان کے مسائل کی فہرست سے یہ سب سے اہم مسئلہ غائب ہے۔ حالانکہ اس کا تعلق ان کے دین و مذہب اور آخرت

مسلمانوں، مسلم قائدوں اور علمائے کرام کو سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلہ پر غور کرنا چاہیئے۔ حکومت کے اقدامات اور اسلامی شریعت سے ناواقف ججوں کے فیصلوں سے شریعت ایکٹ پہلے ہی نیم جان ہو چکا ہے اور کچھ عرصے میں بالکل بے اثر ہو کر رہ جائے گا۔ اگر مسلمان، ہندوستان میں مسلمان بن کر رہنا چاہتے ہیں تو انھیں قضاء شرعی کے قیام کے لیے صرف کوشش ہی نہیں بلکہ ہر طرح کی قربانی کے لیے تیار رہنا چاہیئے۔

بعض اجتہادی مسائل میں غور و فکر اور اصلاح کا کام بھی اسی وقت مفید ہو سکتا ہے جب اسے اختیار کرنے اور نافذ کرنے کا کام مسلمانوں کے حوالے کر دیا جائے۔ لوک سبھا کے لیے یہ کام آسان ہے کہ وہ مسلم پرسنل لا سے متعلق مقدمات کے فیصلوں کا انتظام مسلمانوں کے حوالے کر دے لیکن یہ اس کے لیے بہت مشکل ہے کہ وہ اجتہادی مسائل کو سمجھے اور ٹھیک اسی طرح انھیں پاس کر دے جس طرح علما پیش کریں۔

(۲۷ نومبر ۷۲ء)

خلع

اور رخصت کرتے ہوئے ایسا کرنا تمہارے جائز نہیں ہے کہ جو کچھ تم انھیں دے چکے ہو اس میں سے کچھ واپس لے لو البتہ یہ صورت مستثنیٰ ہے کہ زوجین کو اللہ کے حدود پر قائم نہ رہ سکنے کا اندیشہ ہو۔ ایسی صورت میں اگر تمہیں یہ خوف ہو کہ وہ دونوں حدود الٰہی پر قائم نہ رہیں گے تو ان دونوں کے درمیان یہ معاملہ ہو جانے میں مضائقہ نہیں کہ عورت اپنے شوہر کو کچھ معاوضہ دے کر علیحدگی حاصل کر لے۔ یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں۔ ان سے تجاوز نہ کرو اور جو لوگ حدود الٰہی سے تجاوز کریں وہی ظالم ہیں۔

(البقرۃ: ۲۲۹)

Monthly "ZINDGI" Rampur Dec 72 Jan 73 Regd. No L 689

Delhi Art Press Delhi 6

اہنامہ
زندگی
رامپور

ماہنامہ

زندگی رامپور

مدیر:- سید احمد قادری

سالانہ چندہ		سالانہ چندہ
ہندوستان سے	15/=	ممالک غیر سے
پاکستان سے	15/=	۲ ڈالر
ششماہی		ہوائی ڈاک سے
ہندوستان سے	5/=	
پاکستان سے	5/=	
قیمت فی پرچہ	1/0	

جلد:- ۵۱ | جمادی الاولیٰ ۱۳۹۳ھ مطابق جولائی ۱۹۷۳ء | شمارہ:- ۱

اس دائرہ ◯ میں سرخ نشان کا مطلب ہے

کہ آپکی مدت خریداری اس شمارے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ اگر آپکی طرف سے چندہ بند کرنے یا رسالہ بند کرنے کے لیے خط نہ مل سکا تو اگلا پرچہ ان شاء اللہ تعالیٰ وی پی سے حاضر ہوگا۔ امید ہے کہ وی پی وقت پر وصول فرمائیں گے۔

منیجر زندگی، رام پور یوپی

مالک جماعت اسلامی ہند۔ ایڈیٹر سید احمد عروج قادری۔ پرنٹر پبلشر۔ احمد حسن۔ مطبع ناظم پریس بازار نصراللہ خاں رامپور
مقام اشاعت۔ دفتر زندگی رام پور یوپی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(سید احمد قادری)

سپریم کورٹ کے نئے چیف جسٹس کے تقرر اور تین سینیر ججوں کے استعفے نے ملک میں بجا طور پر ایک ہیجان پیدا کر دیا ہے۔ حکومت کا موقف یہ ہے کہ چیف جسٹس کے تقرر میں صرف یہ نہیں دیکھا جانا چاہیے کہ کون سینیر ہے۔ یہ کوئی قانون نہیں ہے کہ ہمیشہ محض سینیارٹی کی بنا پر چیف جسٹس مقرر کیا جائے۔ صدر جمہوریہ نے اپنے اختیار کو غلط استعمال نہیں کیا ہے۔ مستعفی ججوں اور ان کے ساتھ ملک کے ہزاروں وکلا اور دوسرے دانشوروں کا موقف یہ ہے کہ سینیر ججوں کو نظر انداز کر کے مسٹر رے کو چیف جسٹس مقرر کرنے میں حکومت نے اپنی سیاست کو سامنے رکھا ہے اور اس طرح عدلیہ کی آزادی اور اس کے وقار کو نقصان پہنچا ہے اور حکومت کا یہ تازہ اقدام دور رس نتائج کا حامل ہے۔ حکومت جو کچھ کہہ رہی ہے اگر وہ صحیح ہوتا تو ملک بھر میں اس کا اتنا شدید ردِ عمل نہ ہوتا۔ بیک وقت تین سینیر ججوں کا مستعفی ہو جانا بھی حکومت کے اقدام کی سنگینی ظاہر کرتا ہے۔ اگر بات اتنی ہی ہوتی کہ سینیر ہونے کا لحاظ نہیں کیا گیا تو سینیر جج اس پر احتجاج کرتے، لیکن اپنے بلند عہدوں سے الگ ہو جانے کا آخری اقدام نہ کرتے — یہ بات بھی سامنے ہے کہ پارلیمنٹ اور عدلیہ میں کچھ عرصے سے ایک کشمکش جاری تھی۔ اس پس منظر میں حکومت کا یہ تازہ اقدام اتنا سادہ نہیں ہے جتنا حکومت دکھا رہی ہے۔

مستعفی جج مسٹر ہیگڑے نے پریس کانفرنس اور سپریم کورٹ کے وکلا کی ایسوسی ایشن سے خطاب

کہتے ہوئے جو کچھ کہا ہے اور ریٹائرڈ چیف جسٹس نے جو بات کہی ہے اس نے اس مسئلے کو بہت اہم بنا دیا ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ برسرِ اقتدار پارٹی ہندوستان کو کلیت پسند نظام کی طرف جس تیزی سے ڈھکا رہی ہے، اگر اس کو روکا نہ گیا تو اس ملک میں جمہوریت اور انصاف کی خیر نہیں ہے۔ دنیا بھر میں اشتراکی نظام کی کامیابی کے جو نمونے ہمارے سامنے ہیں انہیں دیکھتے ہوئے یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ ہمارا ملک اس تجربے سے نہ گذرے گا اور موجودہ پارلیمانی جمہوریت کے سلسلے میں سوشلزم کامیاب ہو جائے گا۔ کسی ملک میں جمہوری نظام کا آخری سہارا وہاں کی عدلیہ ہوتی ہے۔ اگر یہ بھی حکومت کے زیر اثر آجائے تو قانون اور انصاف دونوں ہی بے معنے الفاظ بن جاتے ہیں۔ جمہوریت کے نام پر آمریت پورے ملک کو اپنے شکنجے میں کس لیتی ہے۔ شدید اندیشہ ہے کہ ہمارے ملک کا بھی یہی انجام نہ ہو۔

اشتراکی نظام کا فارمولا یہ ہے کہ ایک پارٹی کی آمریت پورے ملک کی آمریت بن جاتی ہے اور پارٹی کی آمریت مجلس عاملہ کی آمریت کے ماتحت ہوتی ہے اور مجلس عاملہ پر کسی فرد واحد کی ڈکٹیٹر شپ مسلط ہو جاتی ہے۔ اس طرح پورا ملک ایک شخص کی مرضیات کا تابع فرمان بن جاتا ہے۔

ہندوستان میں سرمایہ داری اور اشتراکیت کی کش مکش اب میدان میں آ چکی ہے۔ ان دونوں نظاموں کے حامی ایک دوسرے کو چیلنج دے رہے ہیں اور آنے والے انتخابات (اگر وہ اپنے وقت پر منعقد ہو سکیں) ایک بھیانک خواب کی صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ حکومت، اشتراکیت نوازوں کے ہاتھوں میں ہے اس لیے ان کا پلہ بھاری نظر آ رہا ہے ــــــ ہم نہ سرمایہ داری کے حامی ہیں اور نہ اشتراکیت کے۔ ہم اسلام کے متوازن نظام معیشت کی صحت و افادیت پر یقین رکھتے ہیں اور ہمارا خیال یہ ہے کہ جب تک اسلام کا نظام عدل رائج و نافذ نہ ہو، ہمارے ملک کے عوام کو نہ امن و سکون میسر آ سکتا ہے اور نہ ان کے حقوق انہیں مل سکتے ہیں۔ نظام سرمایہ داری انہیں غریب سے غریب تر کرتا ہے اور نظام اشتراکیت انہیں کولھو کے بیل بنا دیتا ہے۔ عیش و آرام، جاہ و منصب اور گوناگوں امتیازات دونوں ہی نظاموں میں صرف ان لوگوں کو حاصل ہوتے ہیں جو کسی نہ کسی طرح حکومت کے دروبست پر قابض ہو جاتے ہیں۔

افسوس یہ ہے کہ ہم مسلمان اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ اپنے ملک کو اسلامی نظام کی راہ پر لگا سکیں

اس لیے اگر ہندوستان کی موجودہ لولی لنگڑی جمہوریت بھی ختم ہوگئی تو ایک خاص پہلو سے جو ہمارے نزدیک بے حد اہم ہے اس کا سب سے زیادہ نقصان ہمیں پہنچے گا اور وہ پہلو یہ ہے کہ ہمیں آزادیٔ ضمیر، آزادیٔ اظہار رائے اور آزادیٔ تبلیغ دین حاصل ہے اور یہی وہ پہلو ہے جس کی بنا پر ہم اشتراکیت کے کلیت پسندانہ نظام کو دنیا کا بدترین نظام سمجھتے ہیں جو انسان کی یہ تینوں آزادیاں چھین لیتا ہے اور اسی پہلو سے ہم اسے اپنے ملک کے لیے بھی اور دنیا کے دوسرے ملکوں کے لیے بھی ناپسند کرتے ہیں۔

بعض اخبارات میں ہم نے پڑھا کہ مسلمانوں کو سوشلزم کی مخالفت نہیں کرنی چاہیے کیونکہ ان کے پاس کھونے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ اس طرح سوشلزم سے ان کو کچھ مل تو سکتا ہے، کچھ چھن نہیں سکتا۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ بات دینی پہلو کو نظرانداز کر دینے کی وجہ سے کہی گئی ہے۔ مسلمانوں کے پاس ان کا عقیدہ اور ان کا دین، دنیا کی تمام اشیاء سے زیادہ قیمتی ہے اور اشتراکیت اس کی دشمن ہے۔ یہ مسلمانوں سے جو کچھ چھیننے کی کوشش کر رہی ہے اور آئندہ بھی کرتی رہے گی اس کی قیمت کا اندازہ کوئی نہیں لگا سکتا۔

یہاں جمہوریت کو جو خطرہ لاحق ہے وہ بیرونی نہیں، بلکہ اندرونی ہے۔ حکمراں پارٹی اپنے آپ کو جمہوریت کا سب سے بڑا محافظ کہتی ہے لیکن اس کے عملی اقدامات اس کے قول کی نفی کرتے ہیں۔ جو سیاسی پارٹیاں سوشلزم کی مخالف ہیں اور بجا طور پر یہ الزام لگا رہی ہیں کہ حکمراں پارٹی جمہوریت کے لیے خطرہ بن گئی ہے خود ان کا اپنا عمل جمہوریت کا آئینہ دار نہیں ہے۔ جمہوریت کی بقا سے زیادہ انہیں اقتدار پر قبضہ جمانے کی فکر ہے۔ ان کے پاس سوشلزم کی طرح کوئی مثبت اور منظم نظریہ بھی نہیں ہے۔ حکمراں پارٹی کو اقتدار سے ہٹانا ہی ان کا اصل ہدف ہے۔ محض منفی جوش و خروش سے ملک کو کیا ملے گا؟ ان کا منفی رویہ سوشلزم کو تقویت تو پہنچا سکتا ہے کمزور نہیں کر سکتا۔ اس ملک میں کوئی ایسی موثر اور طاقتور پارٹی نہیں ہے جو خود عملی طور پر جمہوریت کی حامی ہو اور اسے باقی رکھنے کے لیے مخلصانہ جدوجہد کر رہی ہو۔

حکمراں پارٹی نے وحدہ خلافی کر کے مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس سے مسلمانوں کے جذبات کو سخت ٹھیس لگی ہے۔ اس سے فائدہ اٹھا کر متعدد مخالف کانگریس پارٹیاں ان مجروح جذبات پر اپنی ہمدردیوں کا پھایا رکھ رہی ہیں اور ان کے ووٹوں سے کانگریس کو شکست

دینا چاہتی ہیں۔ بالفرض اگر ایسا ہو بھی جائے تو اس سے نہ ملک کے مسائل حل ہوں گے اور نہ مسلمانوں کے مخصوص مسائل ــــ صورت حال کچھ ایسی ہے کہ لوگ کہتے ہیں، ہمارا ملک "جیست یاران طریقت بعد ازیں تدبیر ما" کے مخمصے میں پھنس کر رہ گیا ہے لیکن کیا واقعی ایسا کوئی مخمصہ موجود ہے ؟ میرا جواب نفی میں ہے۔ بہتر سے بہتر تدبیریں موجود ہیں لیکن ان تدبیروں پر عمل کرنے والے ناپید ہیں

ہر شخص جانتا ہے کہ کسی تدبیر کو بروئے کار لانے سے پہلے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہمارے ملک میں یا تو کمیاب ہیں یا نایاب۔ کسی بھی تدبیر کے کامیاب ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس پر عمل کرنے والوں میں خلوص ہو، ایثار ہو، جفاکشی ہو، محنت ومشقت برداشت کرنے کا جذبہ ہو دل اور زبان میں موافقت ہو اور قول وعمل میں مطابقت ہو۔ اس پہلو سے ملک کا جائزہ لیکر دیکھیے کہ اس کا حال کیا ہے ؟ حال یہ ہے کہ زبان کچھ کہتی ہے اور دل میں کچھ اور ہوتا ہے، قول کچھ ہوتا ہے عمل کچھ اور ــــ نیتاؤں اور لیڈروں کے دل ذاتی، خاندانی اور گروہی مفادات سے معمور رہتے ہیں اور ان کی زبانیں ملکی مفاد کے نعرے لگاتی ہیں۔ دل میں تعصب بھرا ہوتا ہے اور زبان اس کی مذمت کرتی ہے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کوئی تدبیر کامیاب نہیں ہوتی اور ملک کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ اور پھر بڑی معصومیت سے یہ سوال سامنے لا کھڑا کیا جاتا ہے کہ "جیست یاران طریقت بعد ازیں تدبیر ما"۔ ہمارے ملک کے رہنما جب تک اپنی یہ روش نہیں بدلیں گے کوئی تدبیر کامیاب نہیں ہوگی۔ یہاں مفید اور کارآمد تدابیر کی کمی نہیں ہے ان تدابیر پر مخلصانہ عمل کرنے والوں کی کمی ہے اور یہ ایسی کمی ہے جسے نہ بڑی صنعتیں دور کرسکتی ہیں اور نہ چھوٹی صنعتیں، نہ فولاد کے کارخانے اسے دور کرسکتے ہیں اور نہ المونیم کی فیکٹریاں۔ یہ کمی توحید اور آخرت کے عقیدے اور اس پر زندہ یقین سے دور ہوسکتی ہے لیکن اس پر غور کرنے کے لیے کوئی تیار نہیں ہے۔

―――― ۲ ――――

۵ رجون ۱۹۶۷ء کا دن موجودہ تاریخ کا ایک ایسا المیہ بن چکا ہے جو ہمیشہ نہیں تو کم سے کم اس وقت تک بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ پر یہودیوں کا قبضہ ایک کانٹا ہے جو مسلسل کھٹک رہا ہے اور اس وقت تک کھٹکتا رہے گا جب تک اسرائیل کا منحوس سایا اس پر سے ہٹ نہیں جاتا۔

ہم ہندوستان کے مسلمان مسجد اقصیٰ کی آزادی کے لیے جو تڑپ اپنے دلوں کے اندر رکھتے ہیں تو

یہ عربوں پر کوئی احسان نہیں ہے، کیونکہ وہ عربوں کا گھر نہیں بلکہ اللہ کا گھر اور تمام دنیا کے مسلمانوں کا قبلۂ اوّل ہے۔ اس کے علاوہ، عرب کے مسلمان ہوں یا عجم کے، وہ سب کے سب اسلام کے رشتے میں بندھے ہوئے ہیں۔ اس لیے ان میں سے کسی ایک کا غم درحقیقت سب کا غم ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں نے اپنی مجبوریوں کے باوجود اسرائیلی بربریت اور بیت المقدس پر اس کے غاصبانہ قبضے کے خلاف جو صدائے احتجاج بلند کی ہے اور اس سلسلے میں جو کوششیں کی ہیں اور کر رہے ہیں ان سے ہمارے عرب بھائی ناواقف نہیں ہیں۔ ہم انہیں یقین دلاتے ہیں کہ یہ کوششیں جاری رہیں گی۔ بیت المقدس، غزہ اور دوسرے عرب علاقوں کو اسرائیل کے پنجۂ ظلم سے چھڑانے کے لیے ہمارے بس میں جو کچھ ہے وہ کرتے رہیں گے۔

فلسطین کے اجڑے ہوئے عربوں کی نئی نسل جو مایوسی اور حرماں نصیبی کی فضا میں پل کر جوان ہوئی ہے کبھی کبھی سخت نادانی کی حرکتیں بھی کر گذرتی ہے۔ دنیا کی وہ طاقتیں جنھوں نے اسرائیل کو جنم دیا ہے اس پر تو شور مچاتی ہیں لیکن ان جلا وطنوں کو اپنے وطن واپس بھیجنے اور ان کو ان کے حقوق دلوانے کے لیے کچھ نہیں کرتیں۔ اس کے برعکس وہ اسرائیل کو قائم و دائم رکھنے کے لیے اسے ہر طرح مسلح کرتی رہتی ہیں۔ سلامتی کونسل کو اس نے مذاق بنا رکھا ہے لیکن ان کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی کیونکہ انہیں کی شہ پر اس نے امن عالمی ادارے کو بے وزن بنا دیا ہے۔

یہ طاقتیں جانتی ہیں کہ عرب حکومتیں متحد نہیں ہیں اس لیے اسرائیل کا کچھ بگڑ نہیں سکتا۔ لیکن یہ صورتِ حال کیا ہمیشہ باقی رہے گی ——؟ ہمیں یقین ہے کہ یہ صورتِ حال بدلے گی۔ عرب متحد ہوں گے، اور فلسطینی عربوں کو ان کے حقوق واپس ملیں گے۔

۲۲ مئی ۷۳ء

قرارداد اجلاس آل انڈیا فلسطین کانفرنس

منعقدہ دہلی مورخہ ۱۵ مئی ۱۹۷۳ء

ساری دنیا کے انصاف پسندوں کی اس معاملے میں دو رائیں نہیں ہیں کہ فلسطین کی اسرائیلی مملکت دنیا کی سامراجی حکومتوں کے ظلم و استبداد اور انسانیت کے بنیادی حقوق کے خلاف ایک سنگین جرم کی

علامت اور نہ صرف مشرق وسطیٰ بلکہ عالمی امن کے لیے ایک شدید خطرہ بن چکی ہے۔ اقوام متحدہ کے قیام کے بعد اس کے چارٹر میں تسلیم کردہ بنیادی انسانی حقوق کے خلاف سب سے بڑی کھلی اور گھناؤنی سازش اسرائیل کا قیام ہے۔ فلسطین کے لاکھوں اصلی باشندوں کو اپنے وطن میں قیام کے حقوق سے محروم کر کے غیر فلسطینی یہودیوں کے لیے جبر و قوت کے ذریعے ایک مصنوعی وطن بنانے کا دعویٰ کرنا انسانیت کی سخت توہین ہے جسے انسانیت کا ضمیر برداشت نہیں کر سکتا۔

انسانی آزادی اور جمہوریت کا گلا گھونٹ کر اور انسانیت کے مجرموں سے حربی امداد حاصل کر کے اپنے توسیع پسندانہ عزائم کے ساتھ اسرائیلی مملکت اپنے وجود کی حقیقت کو جتلانے کی کوشش میں لگی ہوئی ہے اس کے وجود کے خلاف کروڑوں عرب عوام کے سینوں میں شدید اضطراب اور نفرت و حقارت کے جذبات پائے جاتے ہیں وہ شدت سے اس دن کے منتظر ہیں جبکہ اسرائیلی مملکت کا سیاہ دھبہ انسانیت کے دامن سے دور ہو جائے۔

اسرائیلی مملکت نے اقوام متحدہ کی مخالفت قراردادوں اور قیام امن کی کوششوں کو ٹھکرا کر اپنی مجرمانہ ذہنیت کا ثبوت فراہم کر دیا ہے۔ وہ حق پر قوت کی برتری کو ثابت کرنا چاہتی ہے۔ یہ صورت حال ان سب لوگوں کے لیے بے حد شرمناک ہے جو دن رات بنیادی انسانی جمہوری حقوق اور عالمی امن کے قیام کا بین الاقوامی ڈھنڈورا پیٹتے ہیں لیکن اسرائیل کی حمایت میں فلسطینی اور عرب عوام کے جائز حقوق پر ڈاکہ ڈالنے میں حجاب محسوس نہیں کرتے۔

ظلم کا پرامن اور جمہوری طریقے سے اگر خاتمہ نہ ہو سکے تو جنگ ناگزیر ہے۔ بیت المقدس پر یہودیوں کے ناجائز قبضے نے تو ساری دنیا کے مسلمانوں میں اسرائیل کے خلاف شدید جذبہ پیدا کر دیا ہے اور وہ بارہا اس عزم کا اظہار کر چکے ہیں کہ بیت المقدس سے اسرائیلی قبضہ کو ختم کرنے کی جنگ میں جو کچھ ان کے بس میں ہوگا وہ ضرور کریں گے۔

آل انڈیا فلسطین کانفرنس جو مسلمانان ہند کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ اس کے بعد اس اہم اجلاس کے ذریعے نہ صرف مسلمانان ہند بلکہ ہندوستان کے تمام منصف، جمہوریت پسند اور انسانیت نواز شہری اسرائیل کے ناجائز وجود اور اس کی مجرمانہ سرگرمیوں اور توسیع پسندانہ عزائم کے خلاف شدید احتجاج کرتے اور مظلوم عرب عوام کو اپنی بھرپور تائید و حمایت کا یقین دلاتے ہیں اور حکومت ہند (باقی ۳۴ پر)

الزامِ جنون

(جناب محمد ذکی صاحب، لکچرار شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ)

پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام پر جہاں اور بہت سے الزامات لگائے گئے ہیں ان میں ایک الزامِ جنون بھی ہے، یہ الزام لگانے والے کون تھے؟ قرآن عزیز کے الفاظ میں۔

اِنَّهُمْ كَانُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ يَسْتَكْبِرُوْنَ ۙ وَيَقُوْلُوْنَ اَىِٕنَّا لَتَارِكُوْٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ ۝ ۲۳/۶	یہ وہ لوگ تھے کہ جب ان سے کہا جاتا "اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے" تو یہ گھمنڈ میں آجاتے تھے اور کہتے تھے "کیا ہم ایک شاعر مجنوں کی خاطر اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں۔

اور آپ کی رسالت کے بارے میں کہتے تھے۔

وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ (۱۴/۱)	اے وہ شخص کہ تجھ پر نصیحت اتری ہے تو (ہمارے خیال میں) یقیناً دیوانہ ہے۔

ان لوگوں سے جب کہا جاتا کہ مرنے کے بعد اللہ پھر زندہ کرے گا تو آپس میں کہتے:۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰي رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۙ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۝ اَفْتَرٰى عَلَي اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ ۲۲/۱	ہم بتائیں تمہیں ایسا شخص جو خبر دیتا ہو کہ جب تمہارے جسم کا ذرہ ذرہ منتشر ہو چکا ہوگا اس وقت تم نئے سرے سے پیدا کر دیئے جاؤ گے۔ نہ معلوم یہ شخص اللہ کے نام سے جھوٹ گڑھتا ہو یا اسے جنون لاحق ہے

ان لوگوں کے نزدیک اسلام کے تین بنیادی اصول (توحید و رسالت اور آخرت) اس درجہ خلاف عقل اور بعید از قیاس تھے کہ ان کی دعوت دینے والا بقول ان کے ایک مجنوں ہی ہو سکتا تھا کیا یہ بات عربوں ہی کے ساتھ مخصوص تھی؟ یا اس دعوت کا خاصہ ہی یہ ہے کہ جب، جہاں اور جس دور میں بھی دی گئی اس کا ایسا ردعمل ہوا ہے۔ قرآن اقدس کا اعلان ہے کہ

كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ۝ تف

یونہی ہوتا رہا ہے۔ ان سے پہلے کی قوموں کے پاس بھی کوئی رسول ایسا نہیں آیا جسے انھوں نے یہ نہ کہا ہو کہ یہ ساحر ہے یا مجنون۔

۵۲/۲

اس وقت ہمارا مقصد اس الزام کی تردید نہیں تحقیق کرنا ہے۔ یعنی یہ دیکھنا ہے کہ الزام لگانے والے کون لوگ تھے۔ معاشرے میں ان کا کیا مقام تھا اور اس کے بنیادی محرکات کیا تھے؟ آیئے دیکھیں انسانی تاریخ کے مختلف ادوار میں کس قسم کے "ہوشمندوں" نے انبیاءؑ کو "مجنوں" کہا ہے۔ ہم اس کی ابتدا تہذیب و تمدن کے قدیم ترین گہوارہ (یعنی عراق) سے کرتے ہیں جہاں اب سے ہزاروں سال پہلے نوح علیہ السلام نے اسلام کی دعوت دی تھی۔

یہ واقعہ ہے کہ ہم نے نوح کو اس قوم کی طرف (تبلیغ حق کے لیے) بھیجا تھا۔ اس نے کہا اے میری قوم اللہ ہی کی بندگی کرو۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں میں ڈرتا ہوں کہ ایک بڑے ہی (ہولناک) دن کا عذاب تمہیں پیش نہ آجائے[1]

۱۵/۹

نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے تین باتیں کہیں۔

۱۔ اللہ ہی کی عبادت کرو یعنی اپنے خالق اور پروردگار کے سامنے سر تسلیم خم کر دو۔ انتہائی عاجزی سے اس کی اطاعت کرو۔ سب سے زیادہ اسی سے محبت کرو۔ اسی کی انتہائی تعظیم کرو۔ اسی سے ڈرو، اور اسی سے امیدیں وابستہ رکھو۔

دوسری بات یہ کہی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ یہ شرک کی نفی تھی۔ یعنی جو خدا کا حق ہے وہ کسی کو نہ دو، کسی کو اس میں شریک کرو۔ کسی کو اس کا حق نہیں کہ اللہ کی ذات کے سوا کسی کو معبود ٹھہرائے

[1] ترجمہ حسب موقع "ترجمان القرآن" یا "تفہیم القرآن" سے لیا گیا ہے

اور نہ کسی دوسرے کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ان باتوں کا مطالبہ کرنے لگے جو صرف خدا کی ذات کے لیے مخصوص ہیں۔

اور تیسری بات یہ کہی کہ اگر تم اپنی موجودہ روش پر قائم رہے اور اپنے پروردگار کی اطاعت سے انحراف کرتے رہے تو اس بات کا ڈر ہے کہ عذاب الٰہی کی لپیٹ میں آجاؤ۔

اس اعلان کا قوم پر کیا ردِعمل ہوا؟

اس پر اس کی قوم کے سربرآوردہ لوگوں نے جواب دیا۔ ہمیں تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تم صریح گمراہی میں پڑ گئے ہو۔ (۱۵)

قوم کے بااثر اور "صاحب نظر" افراد نے نوح علیہ السلام کے بیان کی تردید کرتے ہوئے توحید کو گمراہی سے تعبیر کیا۔ ان کے نزدیک صحیح طریقہ یہ تھا کہ اللہ کے سوا بہت سے معبودوں کی بندگی کی جائے۔ لہٰذا اس صورت میں "عذاب الٰہی" سے ڈرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جس طریقے پر وہ چل رہے تھے وہی ان کے نزدیک صحیح تھا اور نوح علیہ السلام چونکہ اس کے مخالف تھے اس لیے ان کی نظروں میں راہِ حق سے بھٹک گئے تھے۔

یہ بااثر لوگ کون تھے؟ جن کے پاس دولت تھی، کثیر اولاد اور جتھے والے تھے، جو عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، جو عوام کے لیڈر، اور ان کے حکمران تھے یہ تو اسی نظام کو اچھا سمجھ سکتے تھے جس کی بدولت انہیں عروج حاصل ہوا تھا، وہ بھلا اس کے خلاف آواز کس طرح سن سکتے تھے۔

..........پھر بھی انھوں نے زیادہ سخت الفاظ استعمال نہیں کیے تھے۔ گویا بطور نصیحت یہ کہا تھا کہ تم غلط راستے پڑ گئے ہو۔ اس پر ——

نوح نے کہا۔ بھائیو! یہ بات نہیں ہے کہ میں گمراہی میں پڑ گیا ہوں۔ میں تو اس کی طرف سے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے، فرستادہ ہوں۔ میں اپنے پروردگار کا پیغام تمہیں پہنچاتا ہوں اور پند و نصیحت کرتا ہوں، اور اللہ کی طرف سے اس بات کا علم رکھتا ہوں جو تمہیں معلوم نہیں۔

نیز نوح نے کہا، کیا تمہیں اس بات پر اچنبھا ہو رہا ہے کہ تمہارے پروردگار کی نصیحت ایک ایسے آدمی کے ذریعے پہنچی جو تم ہی میں سے ہے؟ اور اس لیے پہنچی تاکہ (انکار و بدعملی کے نتائج سے) خبردار کردے اور تم برائیوں سے بچو اور رحمت الٰہی کے سزاوار ہو

نوح علیہ السلام نے قوم کے سرداروں کو سمجھایا کہ میں نے جو بات کہی ہے وہ اپنی طرف سے نہیں کہی' یہ میرا ذاتی نظریہ نہیں بلکہ پروردگار عالم کا پیغام ہے جو تمہیں پہنچا دیا' اسے قبول کرنے میں تمہارا بھلا اور رد کر دینے میں نقصان ہے۔ لیڈروں نے جب یہ سنا کہ نوح علیہ السلام رسالت کا دعویٰ کر رہے ہیں تو تعجب کا اظہار کیا اور شاید آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہوں گے اور کہتے ہوں گے۔ آپ کو رسول بنایا گیا ہے؟ بہرحال نوح علیہ السلام کی تقریر کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا اور توحید کی دعوت اور نوح علیہ السلام کو رسول ماننے سے انکار کر دیا۔

لیکن نوح علیہ السلام برابر لوگوں کو دعوت دیتے رہے' انہیں سمجھاتے اور ڈراتے رہے۔ اس کا کچھ اثر بھی ہوا' کچھ لوگوں نے دعوت قبول بھی کی۔ کن لوگوں نے؟ یہ وہ لوگ تھے جو پہلے ان سرداروں یا ان کی مرضی کے دیوتاؤں کی اطاعت و پرستش کیا کرتے تھے' جو ان کی خدمت اور غلامی کرتے تھے' جو ان کے محکوم اور زیر اثر تھے۔ یہ تو بندگی کے عادی تھے۔ انھوں نے یہی بہتر سمجھا کہ ان ظالم "معبودوں" کی پرستش کیوں کریں' کیوں نہ اس حاکم کی اطاعت کریں جو ساری [illegible] کا فرماں [illegible] ہے۔ یہ بے سروسامان' حق کے پرستار نوح علیہ السلام کے ساتھ لگے رہتے [illegible] یہ لوگ ساتھ تھے اور نوح علیہ السلام وعظ فرما رہے تھے اور لوگوں سے کہہ ر[illegible]

میں تمہیں (انکار و بدعملی کے نتائج سے) آشکارا' خبردار کرنے والا ہوں۔ اللہ کے سوا اور کسی کی بندگی نہ کرو۔ میں ڈرتا ہوں کہ تم پر عذاب کا ایک دردناک دن نہ آجائے اس پر قوم کے ان سرداروں نے جنھوں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی کہا: ہم تو تم میں اس کے سوا کوئی بات نہیں دیکھتے کہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی ہو اور جو لوگ تمہارے پیچھے چلے ہیں ان میں بھی ان لوگوں کے سوا کوئی دکھائی نہیں دیتا جو ہم میں کمینے ہیں اور بے سوچے سمجھے تمہارے پیچھے ہو گئے ہیں۔ ہم تو لوگوں میں اپنے سے کوئی برتری نہیں پاتے' بلکہ سمجھتے ہیں کہ تم جھوٹے ہو۔

پ۱۲

ادھر وہ سردار بھی تھے جنھیں اپنی دولت پر گھمنڈ اور لیڈری پر ناز تھا۔ نوح علیہ السلام کو ان لوگوں کے ساتھ دیکھ کر جنہیں وہ نیچ قوم اور ذلیل سمجھتے تھے۔ کہنے لگے کہ اے نوح تم جو اپنے آپ کو خدا کا رسول بتاتے ہو تو کس بنیاد پر؟ تمہارے اندر کون سی خصوصیت ہے جو ہم میں نہیں۔ اتنے بڑے خدا کے

رسول اور کوئی امتیازی نشان نہیں ہے چونکہ نوح علیہ السلام بھی ان سے کسی طرح کم نہ تھے۔ اس لیے ان کے بارے میں تو اور زیادہ نہ کہہ سکے متبعین کو لپیٹ لیا کہ یہ چند ذلیل لوگ تمہارے ساتھ لگ گئے ہیں [illegible] سوچے سمجھے، یہ کیا جانیں؟ کیا یہ بھی کوئی کامیابی ہے؟ ہمارے نزدیک تو تم سب جھوٹے ہو۔

نوح نے کہا۔ اے میری قوم کے لوگو! تم نے اس بات پر بھی غور کیا کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے ایک دلیل روشن پر ہوں، اور اس نے اپنے حضور سے ایک رحمت بھی مجھے بخش دی ہو (یعنی راہ حق دکھا دی ہو) مگر وہ تمہیں دکھائی نہ دے تو (میں اس کے سوا کیا کر سکتا ہوں جو کر رہا ہوں؟) کیا ہم جبراً تمہیں راہ دکھا دیں حالانکہ تم اس سے بیزار ہو۔ لوگو! یہ جو کچھ میں کر رہا ہوں تو اس پر مال و دولت کا تم سے طالب نہیں۔ میری خدمت کی مزدوری جو کچھ ہے، صرف اللہ پر ہے۔ اور یہ بھی سمجھ لو کہ جو لوگ ایمان لائے ہیں (وہ تمہاری نگاہوں میں کتنے ہی ذلیل ہوں مگر) میں ایسا کرنے والا نہیں کہ اپنے پاس سے انہیں ہنکا دوں۔ انہیں بھی اپنے پروردگار سے (ایک دن) ملنا ہے۔ (اور وہ ہم سب کے اعمال کا حساب لینے والا ہے) لیکن (میں تمہیں [illegible] طرح سمجھاؤں) میں دیکھتا ہوں کہ تم ایک جماعت ہو (حقیقت سے) جاہل۔ ا[illegible] لوگو! مجھے بتلاؤ اگر میں ان لوگوں کو اپنے پاس سے نکال باہر کر دوں (اور اللہ کی طرف سے مواخذہ ہو جس کے نزدیک معیار قبولیت ایمان و عمل ہے، نہ کہ تمہاری گڑھی ہوئی شرافت و رذالت) تو اللہ کے مقابلے میں کون ہے جو میری مدد کرے گا۔ (افسوس تم پر) کیا تم غور نہیں کرتے۔

یہ وضاحت تو متبعین کے بارے میں ہوئی، اپنے بارے میں فرمایا:۔

اور دیکھو میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں۔ نہ یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں۔ نہ میرا یہ دعویٰ ہے کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ جن لوگوں کو تم حقارت کی نظر سے دیکھتے ہو، اللہ انہیں کوئی بھلائی نہیں دے گا۔ (جیسا کہ تمہارا اعتقاد ہے) اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ جو کچھ ان لوگوں کے دلوں میں ہے۔ اگر میں (تمہاری خواہش کے مطابق) ایسا کہوں تو جو نہی ایسی بات کہی میں ظالموں سے ہو گیا۔ [12]

نوح علیہ السلام کی باتوں سے سرداران قوم کو تشویش ضرور ہوئی ہوگی۔ مثلاً انہوں نے عذاب الٰہی

سے ڈرایا تھا۔ وہ خوش حالی، دولت اور اقتدار کے نشے میں مست، سوسائٹی کو اپنے اشاروں پر چلانے والے سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان پر تباہی آسکتی ہے اور پھر کس قسم کی تباہی؟ اس عذاب سے نوح علیہ السلام کی کیا مراد تھی؟ وہ تو اپنے دیوتاؤں کی پرستش سے خوش حال تھے اور نوح علیہ السلام نے پروردگار عالم کی غلامی قبول کی تھی، مگر بظاہر کوئی کامیابی یا خصوصیت نظر نہیں آتی تھی۔ سرداران قوم جو حکمرانی جانتے تھے سرِ تسلیم خم کرنا انہیں عجیب سا معلوم ہوتا تھا اور وہ بھی ایک انہی جیسے آدمی کے کہنے سے جن دیوتاؤں کو وہ اپنی قسمت کا مالک سمجھتے تھے یا جن کی اتباع ان کے رگ و ریشے میں سرایت کر چکی تھی انہیں کس طرح چھوڑ دیتے۔ اس نئی تحریک کا انھوں نے جائزہ لیا ہے، کیا یہ کوئی سازش تھی ان کے خلاف انہیں کون سی نعمت ان کا پروردگار دینے والا تھا۔ کیا سب مل کر لیڈروں کا تختہ الٹ دینا چاہتے تھے؟ یا اور نہ جانے کس کس قسم کے خدشات ان کے دل میں ہوں گے۔ ممکن ہے کچھ کا اظہار بھی کر دیا ہو لیکن مستقبل کے بارے میں نوح علیہ السلام نے صاف صاف الفاظ میں لاعلمی کا اظہار کر دیا۔

لیڈروں کو بہرحال اس سے کچھ اطمینان ہوگا کہ نوح علیہ السلام کے ماننے والے چند ہی لوگ تھے اور وہ بھی کمزور قسم کے لوگ، جو بظاہر کوئی انقلاب نہیں لا سکتے تھے۔ پھر بھی یہ تحریک پھیل سکتی تھی اور عوام سرداروں کی غلامی سے آزاد ہو کر خدا کی غلامی میں جا سکتے تھے اور اگر یہ تعداد بڑھتی گئی تو لیڈروں کو محکوم کہاں سے ملتے؟ انہیں دولت کما کر کون دیتا؟ اس کی کچھ نہ کچھ فکر ضرور ہوئی ہوگی اور پبلک کو اس تحریک سے بچانے کی کوشش ضرور کی ہوگی۔ قرآن حکیم کے مندرجہ ذیل بیان سے ان کی اسی ذہنی کشمکش کا پتہ چلتا ہے۔ نوح علیہ السلام دعوت دے رہے تھے اور عذاب سے ڈرا رہے تھے۔ سرداروں کا بھی گذر ہوا۔

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف (ہدایت کے لیے) بھیجا تھا۔
اس نے کہا تھا: "بھائیو! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ کیا تم دنیا

لہ عجیب بات ہے پہلے اسلام اس لیے قبول نہیں کرتے تھے کہ یہ "جدید" مذہب تھا اور اس کے داعی "جدت پسندی" کے شکار سمجھے جاتے تھے اور آج اسلام کو اس لیے قبول نہیں کیا جاتا کہ یہ "قدیم" مذہب ہے اور اس کے ماننے والوں پر "قدامت پسندی" کا الزام لگایا جاتا ہے۔ حالانکہ اسلام جیسا تھا آج بھی ویسا ہی ہے۔

کے نتائج سے) ڈرتے نہیں۔ (۱۸/۲)

نوح علیہ السلام عذاب سے ڈراتے تھے اور عذاب کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا، پھر کیا ہوا:

اس کی قوم کے جن سرداروں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی، وہ یہ سنکر (لوگوں سے) کہنے لگے یہ آدمی اس کے سوا کیا ہے کہ تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہے۔ مگر چاہتا ہے تم پر بڑائی جتائے اگر اللہ کو کوئی ایسی ہی بات منظور ہوتی تو کیا وہ فرشتے نہ اتار دیتا؟ (وہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی کو اپنا پیامبر کیوں بنانے لگا؟) ہم نے اپنے اگلے بزرگوں سے تو کوئی ایسی بات کبھی سنی نہیں۔ کچھ نہیں یہ پاگل ہوگیا ہے۔ پس (اس کی باتوں پر کان نہ دھرو۔) کچھ دنوں تک انتظار کرکے دیکھ لو، اس کا انجام کیا ہوتا ہے (۱۵/۲)

قوم کے بیشتر افراد نے حضرت نوح علیہ السلام کی تعلیم اور آخرت کی بازپرس کی تکذیب ہی کی اور اپنے سرداروں کا ساتھ دیا۔

ان سے پہلے نوح کی قوم جھٹلا چکی ہے۔ انھوں نے ہمارے بندے کو جھوٹا قرار دیا اور کہا کہ یہ دیوانہ ہے اور وہ بری طرح جھڑکا گیا۔ (۲۷/۸)

بالآخر نوح علیہ السلام نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا۔

میرے رب، انھوں نے میری بات رد کردی اور ان (رئیسوں) کی پیروی کی جو مال اور اولاد پاکر اور زیادہ نامراد ہوگئے ہیں۔ ان لوگوں نے بڑا بھاری مکر کا جال پھیلا رکھا ہے انھوں نے کہا۔ ہرگز نہ چھوڑو اپنے معبودوں کو اور نہ چھوڑو وَدّ اور سُوَاع کو اور نہ یغوث اور یعوق اور نسر کو، انھوں نے بہت لوگوں کو گمراہ کیا ہے۔ (۲۹/۱۰)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں تو قوم کے سرداروں نے نوح علیہ السلام کو مجنوں کہا اور ان ہی کی اتباع میں قوم کے دوسرے افراد نے بھی یہی کہا۔ کس وجہ سے؟ کیا دعوت توحید کی بنا پر؟ سرداران قوم کے جوابات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں خدا کی عبادت پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ انہیں جو بات پسند نہیں تھی وہ دوسرے معبودوں کے سلسلے میں تھی۔ مدتوں سے جن دیوتاؤں کی وہ پرستش کرتے رہے تھے ان کا انکار انہیں بڑا گراں گذر رہا تھا۔ یہ دیوتا، یا معبود ممکن ہے مظاہر فطرت ہی میں سے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے قومی ہیرو کو مرنے کے بعد الوہیت کا درجہ دے دیا ہو۔ الوہیت کا

یہ مطلب نہیں کہ انہیں خدا کے وجود سے انکار تھا بلکہ ان کے دکھائے ہوئے راستے پر چل رہے تھے اور انہی کے اصولوں پر عمل کرتے رہے تھے اس کی پروا کیے بغیر کہ وہ صحیح تھے یا غلط، لیکن چونکہ ان کا مفاد اسی میں تھا اس لیے وہ ان کی اتباع کو ترک کرنے کے لیے کسی طرح تیار نہ تھے۔ نوح علیہ السلام کا یہ اعلان کہ اللہ کے سوا کوئی اطاعت و فرماں برداری کا مستحق نہیں۔ انہیں عجیب سا معلوم ہوا ہوگا۔ بالکل اسی طرح جس طرح ایک کمیونسٹ سے اگر کوئی یہ کہے کہ مارکس کے دکھائے ہوئے راستے پر مت جاؤ، اللہ کی بندگی کرو، ورنہ تم پر عذاب آجائے گا۔ تو وہ کہنے والے کی بات کو انتہائی مہمل سمجھتے ہوئے یہی کہے گا کہ اس شخص کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہے۔ ایک کمیونسٹ مارکس کو رد کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ جب بھی رائج الوقت نظام پر سخت تنقید کی جاتی ہے تو اسی قسم کا ردِعمل ہوا کرتا ہے۔ بعض اقدار اور اداروں (Institutions) کی اہمیت اس درجہ قلوب میں جاگزیں ہو جاتی ہے کہ ان کے خلاف کچھ کہا جاتا ہے تو ایسی ہی ناگواری ہوتی ہے۔ مثلاً ایک قوم جو صدیوں سے اپنے رہنماؤں کو عقیدت کے ساتھ مانتی رہی ہو، ان کا احترام کرتی رہی ہو، ان کے دکھائے ہوئے راستے پر چلتی رہی ہو، ان کے نام پر مٹ جانے کے لیے تیار ہو، اور انہی کی اتباع میں فلاح سمجھتی رہی ہو۔ اگر اس کے سامنے انہی میں سے کوئی شخص کھڑا ہو کر ان تمام رہنماؤں کے خلاف بولنے لگے تو ظاہر ہے قوم برہم ہو جائے گی۔ اور بعض لوگ اس شخص کو پاگل ہی سمجھیں گے، یا مثلاً ایک ایسا ملک جس میں برسوں سے یورپ کا جمہوری نظام قائم ہو، ساری قوم اسی کو بہترین نظام سمجھتی ہو۔ اس کے سامنے کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ یہ نظام باطل ہے، پارلیمنٹ کو کوئی اختیار حاصل نہیں کہ قانونِ الٰہی کے علی الرغم کوئی قانون بنائے تو قوم اس شخص کے بارے میں کیا فیصلہ کرے گی۔ یہ ظاہر ہے کہ کمیونسٹ سے کہا جائے کہ سرمایہ دارانہ نظام سب سے بہتر ہے تو پلٹ کر جو جواب وہ دے گا وہ سب جانتے ہیں۔

نوح علیہ السلام کی قوم کے سرمایہ دار اور برسرِ اقتدار قائدین جو عوام پر حکمراں تھے وہ اپنے ہی جیسے انسان کو رسول مان کر اس کی اطاعت کو حماقت تصور کرتے تھے۔ اپنی خوش حالی اور مستحکم پوزیشن کو دیکھ کر جب عذاب کی باتیں سنتے تو "پاگل کی بڑ" سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ نیچ لوگ بھی نجات و فلاح کے حقدار ہو سکتے ہیں۔ وہ نیچ لوگ جن کے ساتھ بیٹھنا بھی اپنی توہین سمجھتے تھے۔ چنانچہ ان پر طعن کرتے ہوئے کہا تھا:۔

کیا ہم تجھے نادانی لیں، حالانکہ تیری پیروی رذیل ترین لوگوں نے اختیار کی ہے۔ (۱۴/۱۰)

وہ ایسے نظام کا کب خیر مقدم کر سکتے تھے جو محکوموں کے لیے بھی فلاح کے دروازے اسی طرح کھول دے جس طرح سرمایہ داروں کے لیے کھلے ہوئے تھے۔ نیز اسلام کی دعوت کو وہ ایک "جدید" تحریک سمجھتے تھے اور خود کو قدامت پسند سمجھتے تھے، جب ہی تو انھوں نے کہا تھا:-

ہم نے اپنے اگلے بزرگوں سے کوئی ایسی بات کبھی سنی نہیں۔ (۲)

اس کش مکش کا فیصلہ اس طرح ہوا کہ جنھوں نے مجنون کہا تھا وہ خود نقشِ عبرت بنکر رہ گئے۔

پیغام وہی رہا، معاشرے بدلتے رہے۔ قومِ نوح کی ہلاکت کے بعد انسانی معاشرہ پھر توانائیوں کے ساتھ ابھرا (احقاف میں) یہ تھا عاد کا معاشرہ[1]

قومِ عاد اپنی جسمانی توانائی کے لیے مشہور تھی۔ اس نے تمدن کو بامِ عروج پر پہنچا دیا تھا۔ بلند و شاندار عمارتیں تعمیر کی تھیں اور جسے اپنی بے مثل طاقت و شوکت پہ ناز تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ظلم و تشدّد کے لیے بھی مشہور تھی اس کی طرف حضرت ہود علیہ السلام بھیجے گئے جنھوں نے وہی پیغام دیا جو ان سے پہلے نوح علیہ السلام دے چکے تھے، لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کی بری خصلتوں کے انجام سے بھی آگاہ کیا۔ فرمایا! اے برادرانِ قوم!

خدا کا یہ احسان یاد کرو کہ قومِ نوح کے بعد تمہیں اس کا جانشین بنایا اور تمہاری نسل کو زیادہ وسعت و توانائی بخشی۔ پس چاہیے کہ اللہ کی نعمتوں کی یاد سے غافل نہ ہو، تاکہ ہر طرح کامیاب ہو۔ (۸/۱۹)

اے میری قوم کے لوگو! اپنے پروردگار سے (اپنے قصوروں کی مغفرت مانگو اور (آئندہ کے لیے اس کی جناب میں توبہ کرو، وہ تم پر برستے ہوئے بادل بھیجتا ہے (جس سے تمہارے کھیت اور باغ شاداب ہو جاتے ہیں) اور تمہاری قوتوں پر نئی نئی قوتیں بڑھاتا ہے (کہ روز بروز گھٹنے کی جگہ اور زیادہ بڑھتے جاتے ہو) اور (دیکھو) جرم کرتے ہوئے اس سے منہ نہ موڑو (۱۲/۵)

یہ تمہارا کیا حال ہے کہ ہر اونچے مقام پر لا حاصل ایک یادگار عمارت بنا ڈالتے ہو اور بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے ہو، گویا تمہیں ہمیشہ رہنا ہے اور جب کسی پر ہاتھ ڈالتے ہو تو جبار بنکر ڈالتے ہو

[1] ان کی آبادیاں عمان سے لیکر حضرموت اور یمن تک پھیلی ہوئی تھیں۔

پس تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔　(۱۱/۱۹)

ایک جگہ ان کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے۔

تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارے رب نے کیا برتاؤ کیا اونچے ستونوں والے عاد ارم کے ساتھ جن کے مانند کوئی قوم دنیا کے ملکوں میں پیدا نہیں کی گئی تھی　(۱۴/۳۰)

ایک ایسے دور میں جب کہ تمدن اتنی بلندیوں پر تھا، ایک ایسے معاشرے میں جس کے لوگ اپنی قوت و شوکت اور مادی سروسامان پر نازاں تھے، دعوت اسلام کا کیا ردعمل ہوا۔ ہود علیہ السلام نے قوم سے خطاب کیا:۔

اے قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ کیا تم (انکار و بدعملی کے نتائج سے) نہیں ڈرتے۔ اس پر قوم کے سربرآوردہ لوگوں نے جنھوں نے کفر کا شیوہ اختیار کیا تھا کہا ”ہمیں تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تم حماقت میں پڑ گئے ہو اور ہمارا خیال یہ ہے کہ تم جھوٹ بولنے والوں میں سے ہو“

نیز کہا:۔

کیا تم اس لیے ہمارے پاس آئے ہو کہ ہم صرف ایک ہی خدا کے پجاری ہو جائیں اور ان معبودوں کو چھوڑ دیں جنھیں ہمارے باپ دادا پوجتے آئے ہیں۔ اگر تم سچے ہو تو وہ بات لا دکھاؤ جس کا ہمیں خوف دلا رہے ہو۔　(۱۶/ش)

اور آخر وہی بات کہی جو قوم نوح نے کہی تھی: ذہنی توازن بگڑ گیا ہے۔ بولے:۔

اے ہود! تو ہمارے پاس کوئی دلیل لیکر تو آیا نہیں (جسے ہم دلیل سمجھیں) اور ہم ایسا کرنے والے نہیں کہ تیرے کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں۔ ہم تجھ پر ایمان لانے والے نہیں ہم جو کچھ کہہ سکتے ہیں وہ تو یہ ہے کہ ہمارے معبودوں میں سے کسی معبود کی تجھ پر مار پڑ گئی ہے (اسی لیے اس طرح کی باتیں کرنے لگا ہے۔)　(۵/۱۲)

رسالت کے بارے میں بولے:۔

ہمارا رب چاہتا تو فرشتے بھیجتا، لہٰذا ہم اس بات کو نہیں مانتے جس کے لیے تم بھیجے گئے ہو“　(۱۶/۲۴)

عذاب کے سلسلے میں کہنے لگے :۔

یہ باتیں تو یونہی ہوتی چلی آئی ہیں اور ہم عذاب میں مبتلا ہونے والے نہیں (۱۹/۱۱)

مطلب یہ کہ نہ ہمارا دین نیا اور نہ یہ عذاب کی دھمکیاں نئی ۔ نہ عذاب آیا ان باتوں پر، نہ آئے۔ چنانچہ اسی یقین پر انھوں نے بھی اپنے سرداروں کی اتباع کی ۔

اور ہر متکبر و سرکش کے حکم کی پیروی کی (۱۲/۵)

کیوں ـــــ ؟ کیا ہود علیہ السلام کا پیغام ان کی طبیعت کے خلاف تھا؟ کیا اس سے ان کے "ذوق تعمیر" کو تقویت نہیں پہنچتی تھی؟ کیا یہ ان کو ظلم و استبداد پر نہیں اکساتا تھا؟ کیا یہ ان کے نشۂ غرور کو اور زیادہ نہیں چڑھاتا تھا؟ یقیناً نہیں ـــــ اگر ایسا ہوتا تو وہ ضرور قبول کر لیتے۔ بہرکیف یہ بھی صفحۂ ہستی سے مٹا دیے گئے ۔

قوم عاد کی عالیشان عمارتیں کھنڈروں میں بدل گئیں۔ ان کا تمدن برباد ہو گیا۔ ان کی جسمانی قوت انہیں ہلاکت سے نہ بچا سکی ــــ ان کے جانشین ایک قدم آگے بڑھے ۔ میدانوں میں شاندار عمارتیں بنائیں لیکن ذرا ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے چٹانیں تراش کر مکان بنائے کہ شاید یہ زیادہ محفوظ رہیں گے اور مکینوں کی حفاظت کر سکیں گے ۔ یہ تھے صالح علیہ السلام کی قوم کے لوگ[1] سوسائٹی کی باگ ڈور بڑے بڑے جتھوں والے سرداروں کے ہاتھوں میں تھی جو لوٹ مار کے لیے مشہور تھے۔ اتنے "مستحکم" معاشرے پر اسلام کی دعوت کا کیا اثر ہوا؟ وہی دعوت، وہی جواب :۔

قوم صالح کی سرگذشت :۔

اور (اسی طرح) ہم نے قوم ثمود کی طرف اس کے بھائی بندوں میں سے صالح کو بھیجا۔ اس نے کہا : اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ...... اور وہ وقت یاد کرو کہ خدا نے تمہیں قوم عاد کے بعد اس کا جانشین بنایا اور اس سرزمین میں اس طرح بسا دیا کہ میدانوں سے محل بنانے کا کام لیتے ہو اور پہاڑوں کو بھی تراش کر اپنا گھر بنا لیتے ہو (یہ اس کا تم پر احسان ہے) پس اللہ کی نعمتیں یاد کرو اور ملک میں سرکشی کرتے ہوئے خرابی نہ پھیلاؤ (پ ۸/۱۷)

[1] یہ لوگ عرب کے اس حصہ میں آباد تھے جو حجاز اور شام کے درمیان وادی القریٰ تک چلا گیا ہے ۔

ثمود نے رسولوں کو جھٹلایا۔ یاد کرو جبکہ ان کے بھائی صالح نے ان سے کہا۔ کیا تم ڈرتے نہیں؟ میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں، میرا اجر تو رب العٰلمین کے ذمے ہے۔ کیا تم ان سب چیزوں کے درمیان جو یہاں ہیں بس یونہی اطمینان سے رہنے دیے جاؤ گے۔ ان باغوں اور چشموں میں، ان کھیتوں اور نخلستانوں میں جن کے خوشے رس بھرے ہیں؟ تم پہاڑ کھود کھود کر فخریہ ان میں عمارتیں بناتے ہو۔ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ ان بے لگام لوگوں کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔ (۱۹/۱۲)

"اللہ کی بندگی کرو" اس سے قوم کو انکار تھا، نہ اس پر کوئی اعتراض لیکن "اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں" بس یہی بات وہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھی اور اتنی ہی بات مان لینے سے جو انقلاب ان کی زندگی اور سوسائٹی میں آتا اس سے واقف تھے۔ لہٰذا اس بات اور اس بات کے کہنے والے کو ماننے کے لیے وہ تیار نہ تھے۔

لوگوں نے کہا۔ "اے صالح! پہلے تو تو ایک ایسا آدمی تھا کہ ہم سب کی امیدیں تجھ سے وابستہ تھیں۔ پھر کیا تو ہمیں روکتا ہے کہ ان معبودوں کی پوجا نہ کریں جنھیں ہمارے باپ دادا پوجتے چلے آئے ہیں؟ (یہ کیسی بات ہے؟) ہمیں تو اس بات میں بڑا ہی شک ہے جس کی طرف تم دعوت دیتے ہو کہ ہمارے دل میں اترتی نہیں (۱۲/۱۹)

اور پھر وہی بات :-

تو محض ایک سحر زدہ آدمی ہے۔ تو ہم جیسے ایک انسان کے سوا اور کیا ہے۔ (۱۹/۱۲)

یعنی اپنے سرداروں کی بات تو نہ مانیں، آپ کی مان لیں، آپ کی نہ مانی تو ہم تباہ و برباد ہو جائیں گے آبائی دیوتاؤں کی پرستش آپ کے کہنے سے چھوڑ دیں؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے آپ پر جادو کر دیا ہے جس سے آپ کی عقل ماری گئی ہے اور ایسی بہکی بہکی باتیں کرنے لگے ہیں۔

لیکن اس دور میں اتنا فرق ہوا کہ ایک جماعت نے صالح علیہ السلام کی دعوت قبول کر لی۔ اس سے سرداران قوم کو ذرا تشویش ہوئی اور وہی پرانا حربہ استعمال کیا کہ کسی کے کہنے میں آ گئے۔ ان کا ایک مکالمہ :-

قوم کے جن بر سر آوردہ لوگوں کو (اپنی دولت و طاقت کا) گھمنڈ تھا۔ انھوں نے مومنوں سے کہا اور یہ ان لوگوں میں سے تھے جنھیں (افلاس و بے چارگی کی وجہ سے) کمزور و حقیر سمجھتے تھے۔ کیا تم نے سچ مچ کو معلوم کر لیا ہے کہ صالح خدا کا بھیجا ہوا ہے؟ (یعنی ہمیں تو ایسی کوئی بات اس میں دکھائی دیتی نہیں) انھوں نے کہا "ہاں، بے شک جس پیام حق کے ساتھ وہ بھیجا گیا ہے ہم اس پر پورا یقین رکھتے ہیں۔ اس پر گھمنڈ کرنے والوں نے کہا ـ "تمہیں جس بات کا یقین ہے ہمیں اس سے انکار ہے۔ ۷ ⁄ ۱

اور قوم نے یہی فیصلہ کیا کہ صالح علیہ السلام کی بات ماننا پاگل پن ہے۔

کہنے لگے ایک اکیلا آدمی جو ہم ہی میں سے ہے کیا اب ہم اس کے پیچھے چلیں۔ اس کا اتباع ہم قبول کر لیں تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ ہم بہک گئے ہیں اور ہماری عقل ماری گئی ہے۔ کیا ہمارے درمیان بس ایک یہی شخص تھا جس پر خدا کا ذکر نازل کیا گیا؟ نہیں، بلکہ یہ پرلے درجے کا جھوٹا اور برخود غلط ہے۔ ۵۴ ⁄ ۹

اس قوم کو صالح علیہ السلام سے ایک شکایت اور بھی تھی، وہ یہ کہ انھوں نے قوم کے اندر تفرقہ پیدا کر دیا تھا جو صریحاً قومی مفاد کے خلاف تھا۔ ہوا یہ کہ :۔

ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح ؑ کو (یہ پیغام دے کر) بھیجا کہ اللہ کی بندگی کرو تو یکایک وہ دو متخاصم فریق بن گئے۔ صالح ؑ نے کہا۔ اے میری قوم کے لوگو! بھلائی سے پہلے برائی کے لیے کیوں جلدی مچاتے ہو؟ کیوں نہیں اللہ سے مغفرت طلب کرتے؟ شاید کہ تم پر رحم فرمایا جائے۔ انھوں نے کہا :۔ ہم نے تو تم کو اور تمہارے ساتھیوں کو بدشگونی کا نشان پایا ہے۔ ۱۹ ⁄ ۱۹

یعنی ایک گروہ ایمان لے آیا اور ایک آبائی دین پر قائم رہا۔ گویا "قدامت پسندوں" اور "جدت پسندوں" میں کش مکش برپا ہو گئی (کیونکہ مخالفینِ صالح ؑ اسلام کو "جدید مذہب" والا کہتے تھے۔) اس پر مخالفینِ اسلام نے یہ الزام لگایا کہ "تمہاری یہ تحریک ہمارے لیے سخت منحوس ثابت ہوئی ہے۔ جب سے تم نے اور تمہارے ساتھیوں نے دینِ آبائی کے خلاف یہ بغاوت شروع کی ہے۔ ہم پر آئے دن کوئی نہ کوئی مصیبت نازل ہوتی رہتی ہے۔ کیونکہ ہمارے معبود ہم سے ناراض ہو گئے ہیں۔ دوسرا

مطلب اس قول کا یہ ہے کہ تمہارے آتے ہی ہماری قوم میں پھوٹ پڑگئی ہے۔ پہلے ہم ایک قوم تھے جو ایک دین پر مجتمع تھی۔ تم ایسے سبز قدم آئے کہ بھائی بھائی کا دشمن ہوگیا اور بیٹا باپ سے کٹ گیا اس طرح قوم کے اندر ایک نئی قوم اٹھ کھڑی ہونے کا انجام ہمیں اچھا نظر نہیں آتا۔" (تفہیم القرآن)

ایسا دین جو قومی وحدت کو پارہ پارہ کر دے، قوم کے مانے ہوئے معبودوں کو برطرف کر دے۔ صرف اللہ کی عبادت پر اصرار کرے۔ ان کے نزدیک صریحاً قومی مفاد کے خلاف تھا۔ پھر اپنا ہی ہونہار فرزند اس طرح قوم کی شان و شوکت کو خاک میں ملانے کے لیے اٹھ کھڑا ہو اور دعویٰ یہ کرے کہ میری مان لو تو کامیاب ہوگے، ان کے نزدیک پاگل پن تھا۔

بہرحال اس تصادم کا فیصلہ بھی صالح علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کے حق میں ہوا اور جو اپنی صنعت اور آہنی پناہ گاہوں پر نازاں تھے، صفحہ ہستی سے مٹ گئے اور ان کا تمدن خاک میں مل گیا

زمانہ گذرتا رہا اور بہت سی قومیں ابھرتی رہیں اور ڈوبتی رہیں یہی سلسلہ جاری رہا۔ ہر نوع کے تمدن پر دعوت اسلام کا یہی ردِعمل ہوتا رہا۔

کیا لا الٰہ الا اللہ پر ایمان کا صرف یہ مطلب ہے کہ نماز پڑھ لی جائے، یا اس کا اثر زندگی کے اور شعبوں پر بھی پڑتا ہے اور پورا معاشرہ اس سے متاثر ہونے لگتا ہے؟ اگر توحید و رسالت اور آخرت پر ایمان رکھنے والا طبقہ ملک میں کمزور پوزیشن میں ہو تو غالب طبقہ کیوں اسے مجبور کرتا ہے کہ اس کے مذہب یا نظامِ حیات کو قبول کرے، ورنہ وطن چھوڑ دے ـــــ؟ کیا اسلام قبول کر لینے کے بعد آبائی دین کی رعایت کرتے ہوئے دوسرے معبودوں کے احترام کی بھی گنجائش نکل سکتی ہے؟ اس قسم کے اور دوسرے سوالات کے جوابات ہمیں قوم شعیبؑ کی سرگذشت میں ملتے ہیں[1]

اور ہم نے (نبیائے) مدین کی طرف اس کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ اس نے کہا۔ اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں اور ناپ اور تول میں کمی نہ کیا کرو۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم خوش حال ہو (یعنی خدا نے تمہیں بہت کچھ دے رکھا ہے۔ بس کفرانِ نعمت سے بچو) میں ڈرتا ہوں کہ تم پر عذاب کا ایسا دن نہ آجائے جو سب پر چھا جائے گا

---

[1] یہ جزیرہ نمائے سینا میں عرب سے متصل آباد تھی۔

اور اے میری قوم کے لوگو! ناپ تول انصاف کے ساتھ پوری پوری کیا کرو۔ لوگوں کو ان کی چیزیں (ان کے حق سے) کم نہ دو۔ ملک میں شر و فساد پھیلاتے نہ پھرو۔ اگر تم میرا کہا مانو تو جو کچھ اللہ بچا دیا (کاروبار میں) بچ رہے اسی میں تمہارے لیے بہتری ہے اور دیکھو (میرا کام تو صرف نصیحت کر دینا ہے) میں کچھ تم پر نگہبان نہیں (کہ جبراً اپنی راہ پر چلا دوں) ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اور اے میری قوم کے لوگو! میری ضد میں آ کر کہیں ایسی بات نہ کر بیٹھنا کہ تمہیں بھی ویسا ہی معاملہ پیش آ جائے جیسا قوم نوح کو یا قوم ہود کو یا قوم صالح کو پیش آ چکا ہے۔ (۱۱/۹)

معاملات میں ایمانداری کی تلقین کرتے ہوئے حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا:۔

ملک کی درستگی کے بعد (کہ دعوت حق کے قیام سے ظہور میں آ رہی ہے) اس میں خرابی نہ ڈالو اگر تم ایمان رکھتے ہو تو یقین کرو اسی میں تمہارے لیے بہتری ہے۔ اور دیکھو ایسا نہ کرو کہ (دعوت حق کی اشاعت روکنے کے لیے) ہر راستے پر جا بیٹھو اور جو آدمی بھی ایمان لائے اسے دھمکیاں دے کر خدا کی راہ سے روکو اور اس میں کجی ڈالنے کے درپے ہو۔ خدا کا احسان یاد کرو کہ تم بہت تھوڑے تھے اس نے (امن و عافیت دے کر) تمہاری تعداد زیادہ کر دی اور پھر غور کرو جن لوگوں نے فساد کا شیوہ اختیار کیا تھا انہیں کیسا کچھ انجام پیش آ چکا ہے اور اگر ایسا ہوا ہے کہ تم میں سے ایک گروہ اس تعلیم پر ایمان لے آیا ہے جس کی تبلیغ کے لیے میں بھیجا گیا ہوں اور دوسرا گروہ جسے اس پر یقین نہیں تو (صرف اتنی ہی بات دیکھ کر فیصلہ نہ کر لو) صبر کرو۔ یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کر دے اور وہ بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ (۹/۱)

شعیب علیہ السلام کی قوم نے جواب دیا:۔

اے شعیب! کیا تیری یہ نمازیں (جو تو اپنے خدا کے لیے پڑھتا ہے) تجھے یہ حکم دیتی ہیں کہ ہمیں آ کر کہے۔ ان معبودوں کو چھوڑ دو جنہیں تمہارے باپ دادا پوجتے رہے ہیں یا یہ کہ تمہیں اختیار نہیں کہ اپنے مال میں جس طرح کا تصرف کرنا چاہو کرو۔ بس تم ہی ایک نرم دل اور راست باز آدمی رہ گئے ہو۔

یعنی تم اپنے خدا کی جتنی عبادت کرنی چاہو، شوق سے کرو لیکن کیا تمہاری نمازیں یہ بھی کہتی ہیں کہ دوسروں کو ان کی راہ سے ہٹاؤ اور اس راہ سے ہٹاؤ جس پر ان کے باپ دادا چلتے آئے ہیں؟ ہم اپنے

مال کے مالک تمہارا ہیں جس طرح چاہیں خریدیں۔ تم اپنے ناپ تول کی باتیں رہنے دو۔ معلوم ہوتا ہے، ساری دنیا میں صرف تم ہی ایک نیک اور خوش معاملہ آدمی رہ گئے ہو۔

ان کے وعظ و نصیحت کا جواب ملاحظہ ہو:۔

لوگوں نے کہا" اے شعیب! تم جو کچھ کہتے ہو، اس میں سے اکثر باتیں تو ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتیں اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ تم ہم لوگوں میں ایک کمزور آدمی ہو اگر (تمہارے ساتھ) تمہاری برادری کے آدمی نہ ہوتے تو ہم ضرور تمہیں سنگسار کر دیتے۔ تمہاری ہمارے سامنے کوئی ہستی نہیں۔ ۱۲/۹

متکبر سرداروں کی دھمکیاں۔

اس پر قوم کے سرداروں نے جنہیں (اپنی دنیوی طاقتوں کا) گھمنڈ تھا۔ کہا۔" اے شعیب! (دو باتوں میں سے ایک بات ہو کر رہے گی) یا تو تجھے اور ان سب کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں ہم اپنے شہر سے ضرور نکال باہر کریں گے، یا تمہیں مجبور کر دیں گے کہ ہمارے دین میں لوٹ آؤ" شعیب نے کہا" اگر ہمارا دل تمہارے دین پر مطمئن نہ ہو تو کیا جبراً مان لیں؟ قوم کے سرداروں نے جو شعیب کے منکر تھے (لوگوں سے کہا" اگر تم نے شعیب کی پیروی کی تو بس سمجھ لو۔ تم برباد ہوئے" ۹/۱

اور رسالت کے بارے میں قوم کا وہی الزام:۔

تو محض ایک سحر زدہ آدمی ہے اور تو کچھ نہیں ہے مگر ایک انسان ہم ہی جیسا اور ہم تو تجھے بالکل جھوٹا سمجھتے ہیں۔ اگر تو سچا ہے تو ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دے۔ ۱۹/۱۴

شعیب علیہ السلام کی قوم میں ایسے لوگ بھی تھے جو خود کو مسلمان سمجھتے تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ غیر اللہ کی عبادت بھی کرتے تھے اور اس کو اپنی دانست میں خدا پرستی کے خلاف نہیں سمجھتے تھے اسی پر شعیب علیہ السلام نے متنبہ کیا کہ اگر واقعی تم ایمان والے ہو تو صرف اللہ کی اطاعت کرو۔ دوسرا کوئی اطاعت کے قابل نہیں، نیز تجارت اور لین دین کے معاملے میں انصاف سے کام لو۔ دوسری بات بھی قوم ماننے کے لیے تیار نہیں تھی اور اس کو قوم کی معاشی تباہی کے مترادف سمجھتی تھی جس طرح اگر یہ کہہ دیا جائے کہ سودی کاروبار بند کر دو، تو لوگ پلٹ کر یہی کہیں گے کہ کیا تجارت ختم کر دیں؟ اسی طرح وہ لوگ یہ بھی نہیں سوچ سکتے تھے کہ لوٹ مار اور بے ایمانی تجارت اور معاشی حالت کو تباہ کر دیتی ہے

اب ایک اور قسم کے معاشرے پر توحید و رسالت کے اعلان کا ردِ عمل ملاحظہ ہو۔ عراق کے بعد قدیم تہذیبوں میں مصر کا نمبر آتا ہے۔ جہاں کے فراعنہ اور اہرام سے دنیا واقف ہے۔ جس دور میں مصری عروج پر تھے اور بنی اسرائیل کی پوری قوم کو غلام بنائے ہوئے تھے۔

اس دور میں بنی اسرائیل ہی سے حضرت موسےٰ علیہ السلام نے فرعون وقت کو خدا کا پیغام پہنچایا۔ تفصیل ملاحظہ ہو:۔

موسےٰ نے کہا: اے فرعون! میں اس کی طرف سے بھیجا ہوا آیا ہوں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ میرا فرضِ منصبی ہے کہ خدا کے نام سے کوئی بات نہ کہوں مگر یہ کہ سچ ہو۔ میں تیرے پروردگار کی طرف سے (سچائی کی) روشن دلیلیں لایا ہوں سو بنی اسرائیل کو (آئندہ اپنی غلامی پر مجبور نہ کر اور) میرے ساتھ رخصت کر دے۔ ۹/۳

یہ خطاب کس سے تھا؟ فرعونِ مصر سے جس کی شان و شوکت کے دور دور تک ڈنکے بج رہے تھے، جو نہ صرف مطلق العنان فرماں روا تھا بلکہ مصر کا معبود بنا ہوا تھا جس کے جبر و استبداد کے سامنے قوم بنی اسرائیل دم نہیں مار سکتی تھی جن کے بیٹوں کو وہ جب چاہتا ذبح کرا دیتا تھا۔ آج اسی مقہور قوم کا ایک بے سروسامان فرد فرعون کے دربار میں پوری قوم کی رہائی کا مطالبہ کر رہا ہے۔ یہ کسی مظلوم و محکوم قوم کی طرف سے میمورنڈم پیش نہیں کیا جا رہا تھا۔ رحم کی درخواست نہیں کی جا رہی تھی بلکہ خود اعتمادی اور وقار کے ساتھ مطالبہ کیا جا رہا تھا۔ اور یہی بات فرعون کو حیرت میں ڈال دینے کے لیے کافی تھی۔ چنانچہ اس نے موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ تو بتایئے کہ آپ کو بھیجا کس نے ہے؟ یہ پروردگارِ عالم کون ہے۔ اس کا ہماری حکومت اور بنی اسرائیل کی غلامی اور رہائی سے کیا تعلق؟

فرعون نے کہا "اور یہ رب العالمین کیا ہوتا ہے؟"

موسےٰ نے جواب دیا۔ آسمانوں اور زمین کا رب اور ان چیزوں کا رب جو آسمان و زمین کے درمیان ہیں۔ اگر تم یقین لانے والے ہو۔

فرعون نے اپنے گرد و پیش کے لوگوں سے کہا۔ "سنتے ہو؟"

موسےٰ نے کہا۔ "تمہارا رب بھی اور تمہارے ان آباء و اجداد کا رب بھی جو گذر چکے ہیں۔"

فرعون نے (حاضرین سے کہا: "تمہارے یہ رسول صاحب جو تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں، بالکل

ہی پاگل معلوم ہوتے ہیں (۱۹/۹ پ)

فرعون اتنی بات تو اچھی طرح جانتا تھا کہ بنی اسرائیل کے کسی بھی فرد کی اتنی ہمت تو ہو نہیں سکتی کہ اس طرح پوری قوم کی آزادی کا مطالبہ کر دے۔ آخر اس شخص کو بیٹھے بٹھائے یہ کیا سوجھی —— اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ یہ شخص خود کو پروردگار عالم کا رسول بتا رہا ہے اور یونہی عام آدمیوں کی طرح کھڑا ہے، نہ عمدہ لباس، نہ حشم و خدم، یہ کس قسم کے بادشاہ کا سفیر ہے؟ لیکن جب موسیٰ علیہ السلام نے رب العلمین کا تعارف کرایا تو فرعون کا ماتھا ٹھنکا۔ لیکن چونکہ مصری قوم نے خدا کے رسول کو نہ دیکھا تھا نہ عرصے سے اس بارے میں سنا تھا اس لیے فوراً تسلیم کر لینے کے لیے تیار نہ تھی اور صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فرعون نے موسےٰ علیہ السلام کی بات یہ کہہ کر اڑا دینی چاہی کہ یہ شخص تو بالکل پاگل ہے۔ کہیں قومیں اس طرح آزاد کرائی جاتی ہیں اور وہ بھی ہمارے پنجہ سے؟ اس کے بعد کا مکالمہ :-

موسےٰ نے کہا "مشرق و مغرب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا رب۔ اگر آپ لوگ کچھ عقل رکھتے ہیں۔

فرعون نے کہا: اگر تو نے میرے سوا کسی اور کو معبود مانا تو تجھے بھی ان لوگوں میں شامل کر دوں گا جو قید خانوں میں پڑے سڑ رہے ہیں۔

موسےٰ نے کہا اگرچہ میں لے آؤں تیرے سامنے ایک صریح چیز بھی؟" فرعون نے کہا "اچھا تو لے آ اگر تو سچا ہے۔"

(اس کی زبان سے یہ بات نکلتے ہی) موسےٰ نے اپنا عصا پھینکا اور یکایک وہ ایک صریح اژدہا تھا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ (بغل سے) کھینچا اور وہ سب دیکھنے والوں کے سامنے چمک رہا تھا۔ (۱۹/۶ پ)

فرعون کا مقصد یہ تھا کہ اگر واقعی کوئی پروردگار عالم بھی ہے اور موسےٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کی رہائی کے لیے بھیجا ہے تو اس کا ثبوت کیا ہے، جو کچھ موسےٰ علیہ السلام نے دکھایا اس نے فرعون کو چکر میں ڈال دیا۔ اب وہ موسےٰ علیہ السلام کو پاگل نہیں کہہ سکتا تھا۔ پھر کیا کہا اور کیوں —— ؟

فرعون اپنے گرد و پیش کے سرداروں سے بولا۔ "یہ شخص یقیناً ماہر جادوگر ہے۔ چاہتا ہے

کہ اپنے جادو کے زور سے تم کو تمہارے ملک سے نکال دے ۔ اب بتاؤ تم کیا حکم دیتے ہو (شعرا)
حقیقت یہ ہے کہ فرعون کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی تھی اور وہ اپنے اقتدار کے محل کو گرتے ہوئے دیکھ رہا تھا ۔ اس کی بدحواسی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ابھی تو خود کو معبود کہہ رہا تھا یا اب درباریوں کی طرف نظریں اٹھائے ان کے "حکم" کا منتظر تھا۔
اس پر فرعون کی قوم کے سرداروں نے آپس میں کہا "یقیناً یہ شخص بڑا ماہر جادوگر ہے ۔ تمہیں تمہاری زمین سے بے دخل کرنا چاہتا ہے[1] اب کہو کیا کہتے ہو۔ پھر ان سب نے فرعون کو مشورہ دیا کہ اسے اور اس کے بھائی (ہارونؑ) کو انتظار میں رکھو اور تمام شہروں میں ہرکارے بھیج دے کہ ہر ماہر فن جادوگر کو آپ کے پاس لے آئیں ۔ (۱۰۹)
ان سرداروں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا :۔
کیا تو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں اس طریقے سے پھیر دے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے اور زمین میں بڑائی تم دونوں کی قائم ہو جائے؟ تمہاری بات تو ہم ماننے والے نہیں ہیں۔ (۱۱/۱۴)
کہنے لگے کیا ہم اپنے ہی جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں؟ اور آدمی بھی وہ جن کی قوم ہماری بندی ہے ۔ (شعرا)

---

[1] یہ خیال عام ہے کہ لوگوں نے مذہب سے بہت زیادہ ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔ سیاسی تحریک ہو یا معاشی، اس پر مذہب کا رنگ چڑھا کر "مذہب خطرے میں ہے" کا نعرہ لگا کر لوگوں کو بے وقوف بنا لیا لیکن فرعون کی پالیسی اس کے برعکس تھی ۔ اس نے ایک خالص مذہبی تحریک کو سیاسی رنگ دے دیا ۔ موسیٰ علیہ السلام کا مقصد مصر میں رہ کر مصریوں کو اسلام کی دعوت دینا نہیں تھا، وہاں رہ کر بنی اسرائیل کو بھی یہ دعوت دینا نہیں چاہتے تھے ۔ اگر ایسا کرتے تو فرعون کہہ سکتا تھا کہ یہ مذہب کا ڈھونگ رچا کر بنی اسرائیل کو منظم کرنا اور مصریوں کا تختہ الٹنا چاہتے ہیں لیکن شروع ہی میں موسیٰ علیہ السلام نے کہہ دیا تھا کہ بنی اسرائیل کو ملک سے نکل جانے دے (تاکہ اسے خطرہ نہ ہو) بات دراصل یہ تھی کہ فرعون نہیں چاہتا تھا کہ بنی اسرائیل کی پوری قوم جو غلامی کے فرائض انجام دیتی تھی مفت میں ہاتھ سے نکل جائے اس نے اس کو سرکاری سے "قومی" مسئلہ بنا دیا ۔

انھوں نے کہا یہ کچھ نہیں ہے مگر بناوٹی جادو۔ اور یہ باتیں (توحید و رسالت اور آخرت کے بارے میں) تو ہم نے باپ دادا کے زمانے میں کبھی سنی ہی نہیں (۲۸/۳۶)

اب فرعون کی ہمت بندھی اور اپنی ہمنوائی کرتے دیکھ کر بولا:۔

اے اہل دربار! میں تو اپنے سوا تمہارے کسی خدا کو نہیں جانتا۔ ہامان ذرا اینٹیں پکوا کر میرے لیے ایک اونچی عمارت تو بنوا۔ شاید کہ اس پر چڑھ کر میں موسیٰ کے خدا کو دیکھ سکوں۔ میں تو اسے جھوٹا سمجھتا ہوں۔ (۲۸/۳۸)

اور ——

اپنے بل بوتے پر اکڑ گیا اور بولا یہ جادوگر ہے یا مجنون ہے۔ (۵۱/۳۹)

آیئے آخر میں پھر ایک بار ان اسباب کا جائزہ لے لیں جن کی بنا پر رسولوں کو مجنون کہا گیا ہے۔ نوح علیہ السلام اور تمام ہی انبیاء کرامؑ نے توحید، رسالت اور آخرت ایمان لانے کی دعوت دی ہے یعنی اسلام کے ان تین بنیادی اصولوں کی تعلیم تو سب ہی رسولوں نے دی ہے۔ اس لیے ہر دور کے مروجہ مذہبی نظام سے اس دعوت کا تصادم ہوا ہے اور ہمیشہ بااثر طبقے نے اس کی مخالفت کی ہے بلکہ اسے گمراہی سے تعبیر کرتے ہوئے رسولوں کو پاگل کہا ہے۔

نوح علیہ السلام کے عہد میں مذہبی انقلاب لانے کے علاوہ اس دعوت نے معاشرے کی تنظیم، مروجہ اقتدار (یعنی اونچ نیچ کے امتیاز) کو بھی چیلنج کیا۔ اس عہد میں اسی لیے نوح علیہ السلام کو پاگل کہا گیا۔

ہود علیہ السلام کو اس لیے مجنون کہا گیا کیونکہ اسلام کی دعوت دیتے ہوئے انھوں نے یہ بھی کہا کہ زندگی میں خوش حالی اور فارغ البالی اللہ کی طرف سے ہے۔ اس کی اطاعت اور فطری قوانین کی اتباع سے برکتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ نیز انھوں نے فن تعمیر میں غلو اور جبر و تشدد اور لوٹ مار وغیرہ کی ممانعت کی۔

صالح علیہ السلام نے آگاہ کیا کہ سنگ تراشی میں اس درجہ انہماک مناسب نہیں اس لیے پاگل کا خطاب ملا۔

شعیب علیہ السلام نے اس حقیقت کی وضاحت کی کہ توحید پر ایمان کا یہ مطلب ہے کہ غیر اللہ کی پرستش کا شائبہ بھی نہ رہے۔ نیز تجارتی لین دین میں ڈنڈی مارنا عذاب کو دعوت دینا ہے اس لیے انہیں پاگل کہا گیا۔

موسیٰ علیہ السلام کو مجنون اس لیے کہا گیا کہ انھوں نے فرعون کی فرعونیت کو چیلنج کرتے ہوئے ایک مظلوم قوم کی رہائی کا مطالبہ کیا تھا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ معاشرے میں تفریق پیدا کرنا، کمزوروں پر ظلم کرنا، انہیں انسانی حقوق سے محروم کرنا، اعمال کی باز پرس سے بے پرواہ ہو کر اپنی طاقت اور مادی وسائل پر گھمنڈ کرنا، لوٹ مار کرنا اور فساد پھیلانا، اپنی صلاحیتوں کو لاحاصل عمارات کی تعمیر میں صرف کرنا، پہاڑوں کو کاٹ کر اس میں پر تکلف رہائش گاہیں بنانا (اس خیال سے کہ بس یہیں رہنا ہے) تجارت میں بے ایمانی کرنا رہزنی اور ڈاکہ زنی کرنا، کمزور طبقوں اور قوموں کو غلام بنا لینا، ان کی طاقت کو کم کرنے کے لیے ان کے افراد کو قتل کرنا ـــ عقلمندی ہے اور اسلام کی دعوت دینا اس لیے پاگل پن ہے۔ کیونکہ اسلام ان تمام چیزوں کو مٹا دینا چاہتا ہے۔

یہی تمام حالات نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عہد میں جمع ہو گئے تھے۔ اس لیے آپ پر بھی یہی الزام لگایا گیا۔ اگر حقیقت یہ ہے کہ ہر دور میں اسلام کے سلسلے میں یہی الزام لگایا گیا ہے تو پھر یہ بات غور طلب ہے کہ داعیان اسلام پر اب یہ الزام کیوں نہیں لگایا جاتا؟ اسلام کی دعوت بدل گئی یا مخاطبین بدل گئے؟

محاسبۂ نفس

جو شخص اپنا ٹھیک ٹھیک حساب لگائے اور اپنی خوبیوں کو محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھے کہ وہ کن کمزوریوں خامیوں اور کوتاہیوں میں مبتلا ہے: وہ کبھی خود پسندی و خود پرستی کے مرض کا شکار نہیں ہو سکتا۔ اپنے گناہوں اور تصوروں پر کسی کی نگاہ ہو تو استغفار سے اس کو اتنی فرصت ہی نہ ملے کہ استکبار کی ہوا اس کے سر میں سما سکے۔ (اسلامی تزکیۂ نفس)

انسانی اخوّت اور ہمارا کام

(ملک حبیب اللہ صاحب)

بلا تکلف ہمارے کارکنوں کو اس حقیقت کا اعتراف کر لینا مناسب ہوگا کہ اپنے غیر مسلم بھائیوں سے ہمارے تعلقات و روابط بہت محدود ہیں۔ پھر جو ہیں بھی ان میں گرم جوشی اور گہرائی کا بڑی حد تک فقدان ہے۔ ہونا یہ چاہیے کہ ان سے ہمارے برادرانہ تعلقات وسیع پیمانے پر قائم ہوں جن کے پیچھے خلوص، بھائی چارہ، ہمدردی و دل سوزی اور نصح و خیر خواہی کا جذبہ کارفرما ہو۔

اس کے لیے ہمیں سب سے پہلے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک گہری نظر ڈال کر معلوم کرنا چاہیے کہ اپنے بندوں کے معاملے میں اللہ رب العلمین کا منشا کیا ہے؟ وہ اپنے وفادار بندوں سے کس طرز سلوک کا معاملہ کرتا ہے؟ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم بندگانِ خدا کے معاملے میں کیسے رہے؟ آپ نے اپنے پیرووں کو کس طرز سلوک کی تعلیم و تلقین فرمائی؟ اس کی روشنی میں ہمارے لیے بہت آسان ہوگا کہ ہم پورے انشراح صدر کے ساتھ ان سے مطلوبہ تعلقات جوڑیں اور بحال کریں۔ قرآن مجید میں ہے:-

> لوگو! اپنے رب سے ڈرتے رہو۔ جس نے تم کو ایک جان متنفس سے بنایا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا۔ ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیے۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو، جس کا آپس میں واسطہ دیتے ہو اور رشتوں سے خبردار رہو۔ اللہ تم پر نگراں ہے۔ (النساء)

مذکورہ آیت میں اللہ نے اپنے تمام بندوں کو دو باتوں کی سخت ترین تنبیہ فرمائی ہے۔ ایک اپنے رب سے ڈرنے کی، اور دوسرے انسانی رشتوں سے خبردار رہنے کی۔ پھر آخر میں آگاہ فرمایا ہے کہ دیکھو اللہ تم پر نگراں ہے۔ تمہارے حالات سے باخبر ہے۔ وہ دیکھ رہا ہے کہ تم اپنے رب سے کس

حد تک ڈرتے ہو۔ اور انسانی رشتوں سے کس درجہ خبردار رہتے ہو۔ ہمارے غیر مسلم بھائی انسانی رشتوں میں داخل ہیں انہیں مستثنیٰ ہرگز نہیں کیا جا سکتا۔ سورۂ لقمان میں مشرک والدین کے سلسلے میں جہاں ہدایت کی گئی ہے کہ شرک میں ان کی اطاعت نہ کرو' وہیں صاحبھما فی الدنیا معروفا کی تاکید فرمائی گئی ہے کہ (دنیا میں ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ) ہم دونوں انسانی رشتے میں بندھے ہوئے ہیں۔ ان کے ہم پر حقوق ہیں جس طرح ہم سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ ہم اپنے رب سے ڈریں اسی طرح ہم سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ ہم رشتوں کے حقوق سے خبردار رہیں۔ ہم سے ہرگز حق تلفی کا صدور نہ ہو' ورنہ ہم سے مواخذہ ہوگا۔

اور بندگی کرو اللہ کی۔ اس کے ساتھ کسی کومت ملاؤ اور ماں باپ' قرابت دار' یتیم' مسکین قرابت دار' ہمسایہ' اجنبی ہمسایہ' ساتھ کے رفیق' مسافر اور اپنے زیر دستوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔

پہلی آیت میں تقوے کے ساتھ رشتوں سے خبردار رہنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس آیت میں بندگی کے ساتھ حسن سلوک کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ ہمارے حسن سلوک کے مستحقین کی اس لمبی فہرست میں مسلم' غیر مسلم کا کوئی امتیاز نہیں رکھا گیا ہے۔

اے ایمان والو! رکوع کرو' سجدہ کرو۔ اپنے رب کی اور بھلائی کرو شاید کہ تم فلاح پاؤ (ترجمہ سورۂ الحج)

وہی مطالبہ ایک دوسرے انداز میں یہاں بھی کیا گیا ہے اور بھلائی کے کاموں میں کوئی امتیاز نہیں رکھا گیا۔

تم کہہ دو' اے میرے بندو جو یقین لائے ہو اپنے رب سے ڈرو جنھوں نے اس دنیا میں نیکی کی' ان کے لیے بھلائی ہے۔ (القصص)

اور بھلائی کر جیسا کہ اللہ نے تیرے ساتھ بھلائی کی۔ (القصص)

اس آیت میں اللہ نے اپنے بندوں کو ایک بلند تعلیم دی ہے۔ بندوں کو اپنے ساتھ اللہ تعالیٰ کے احسانات کو معیار بنا کر بندگانِ خدا کے ساتھ احسان کرنا چاہیے۔

کیا تیرے رب نے تجھے یتیم نہیں پایا تو ٹھکانا دیا اور راہ ہدایت سے ناآشنا پایا تو

ہدایت بخشی اور نادار پایا تو غنی بنا دیا۔ تو یتیم کو نہ دباؤ، سائل کو نہ جھڑکو اور اپنے رب کے احسانات کا تذکرہ کرتے رہو۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے تسلی کے موقع پر پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرمایا ہے اور اپنے احسانات کو یاد دلا کر وہی تعلیم فرمائی ہے کہ جس طرح تمہارے رب نے تمہارے ساتھ احسان فرمایا ہے اسی طرح تم رب کے بندوں کے ساتھ احسان کرو۔

اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں سے کتنا پیار ہے۔ وفادار بندوں کا تو کہنا کیا۔ بھٹکے ہوئے بندوں سے کتنی محبت ہے اس کا اندازہ ان آیات سے لگتا ہے۔

اے پیغمبر! کہہ دو۔ اے میرے بندو! جنھوں نے ہر بندگی سے تجاوز کر کے اپنی جانوں پر ظلم کر لیا ہے، اللہ کی رحمت سے آس نہ توڑو۔ بلا شبہ اللہ سب گناہوں کو معاف کر دے گا یقیناً وہ بہت معاف کرنے والا ہے۔ نہایت رحم والا ہے اور اپنے رب کی طرف واپس آجاؤ اور اس کے فرماں بردار ہو جاؤ اس سے پہلے کہ تم پر عذاب آجائے اور تم مدد نہ کیے جاؤ۔

( )

ایسا لگتا ہے کہ رب کی بے پایاں مغفرت و رحمت بھٹکے ہوئے پروردہ بندوں کی منتظر ہے ان کی جانوں پر انہیں کے ہاتھوں ظلم گوارا نہیں ہے۔ اپنے سایہ عاطفت میں لے لینے کے لیے بیتاب ہے۔ کس شفقانہ انداز میں تسلی دیتے ہوئے انہیں پکارا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے پروردہ بندوں سے کتنی محبت ہے؟ اسے جاننے کے لیے درج ذیل احادیث کا مطالعہ کیجیے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ کہتے ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ قیدی عورتیں آئیں۔ ان میں ایک عورت کی چھاتی سے دودھ بہہ رہا تھا وہ دوڑی پھر رہی تھی۔ جب قیدیوں میں سے کوئی بچہ پا لی مانگتا تو اسے اٹھا لیتی اور دودھ پلانے لگتی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم لوگوں سے فرمایا۔ کیا سمجھتے ہو۔ کیا یہ عورت اپنے بیٹے کو آگ میں پھینک دے گی؟ ہم لوگوں نے کہا نہیں۔ بشرطیکہ وہ نہ پھینکنے پر قادر ہو۔ آپ نے کہا اللہ اپنے بندوں پر اس سے کہیں زیادہ مہربان ہے۔ جتنا یہ اپنے بچے پر مہربان ہے۔ (ابوداؤد)

حضرت عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے کہ ایک آدمی آیا وہ چادر اوڑھے ہوئے تھا اس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی جسے چادر میں لپیٹے ہوئے تھا۔ اس نے کہا۔ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک جھاڑی سے گذرا تو میں نے اس میں چڑیا کے بچوں کی آواز سنی میں نے انہیں پکڑ لیا اور اپنی چادر میں رکھ لیا۔ اتنے میں ان کی ماں آئی۔ میرے سر پر منڈلانے لگی۔ میں نے چادر کھول دی وہ ان پر گر پڑی۔ میں نے اسے بھی چادر میں لپیٹ لیا۔ وہ یہ ہے۔ آپ نے فرمایا رکھو، اس نے رکھ دیا۔ ان کی ماں ان سے چمٹی ہی رہی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تمہیں بچوں کی ماں کی اپنے بچوں سے اس محبت پر تعجب ہوتا ہے۔ قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھے حق دے کر بھیجا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اس سے کہیں زیادہ مہربان ہے جتنا بچوں کی ماں اپنے بچوں پر مہربان ہے۔ انہیں لے جاؤ جہاں سے لائے ہو، وہیں رکھ آؤ ان کے ساتھ ان کی ماں بھی تھی، تو انہیں لیکر وہ آدمی چلا گیا۔

اللہ تعالیٰ کا کوئی بھولا بھٹکا بندہ جب توبہ کر کے واپس آجاتا ہے تو ارحم الراحمین کو اپنے پروردہ بندے کو پاکر کتنی خوشی ہوتی ہے؟ اسے درج ذیل حدیث میں دیکھیے۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے لوٹ آنے سے جب وہ اس کی طرف لوٹ کر آتا ہے اس سے کہیں زیادہ خوش ہوتا ہے۔ جتنا کہ تم میں کا کوئی آدمی، جب کہ اس کی سواری ایک چٹیل میدان میں اس سے بھاگ گئی اسی پر اس کے کھانے پینے کا سارا سامان تھا وہ اس کے ملنے سے بالکل مایوس ہو گیا۔ ایک درخت کے پاس آیا۔ اس کے سائے میں لیٹ گیا۔ وہ اپنی سواری سے ناامید ہو چکا ہے۔ وہ اسی حال میں ہے کہ اچانک سواری اس کے پاس آکر کھڑی ہو گئی اس نے اس کی نکیل پکڑ لی اور شدت خوشی میں بول اٹھا۔ "اے اللہ تو میرا بندہ، میں تیرا رب ہوں" شدت خوشی میں اس کی زبان سے الٹی بات نکل گئی۔ (مسلم)

ماں کی ممتا اور رب کی پروردگاری میں بڑی گہری مناسبت ہے۔ ماممتا میں بچے پر شفقت کا کیا عالم ہوتا ہے اور کسی گم شدہ بچے کو پالینے میں مسرت و خوشی کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ اسے ہم

جانتے اور محسوس کرتے ہیں اسی پر قیاس کر کے ہمیں سمجھنا چاہیے کہ پروردگار میں یہ کیفیات حقیقی اور بدرجہ اتم ہوتی ہیں۔

جب کوئی بندہ اللہ کی رحمت اور اس کے بندوں کے درمیان مزاحم بن کر کھڑا ہوتا ہے تو اس وقت اللہ تعالیٰ کے قہر و غضب کا کیا عالم ہوتا ہے؟ اس حدیث سے اس کا اندازہ لگائیے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ بنی اسرائیل میں دو آدمی تھے۔ ان میں باہم ایک دوسرے سے محبت تھی۔ ان میں کا ایک عبادت میں بہت کوشاں رہتا۔ دوسرا کہتا کہ میں گنہگار ہوں۔ عبادت گذار کہتا رہتا کہ اپنی اس روش سے باز آجاؤ۔ وہ کہتا کہ مجھے اور میرے رب کو اپنے حال پر چھوڑ دو۔ یہاں تک کہ اسے ایک دن ایسے گناہ میں آلودہ پایا جسے وہ بڑا سمجھتا تھا۔ کہا رک جاؤ۔ اس نے جواب دیا۔ مجھے اور میرے رب کو اپنے حال پر چھوڑ دو۔ کیا تم میرے نگراں بنا کر بھیجے گئے ہو؟ تو عبادت گذار نے کہا۔ اللہ کی قسم، اللہ تجھے کبھی نہیں بخشے گا اور نہ جنت میں داخل فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے پاس فرشتہ بھیجا، ان کی روح قبض کرلی۔ دونوں اس کے حضور پہنچے۔ گنہگار سے فرمایا۔ تو میری رحمت سے جنت میں داخل ہو جا۔ دوسرے سے فرمایا۔ کیا تجھ میں قدرت ہے کہ میری رحمت کو میرے بندے سے روک دے۔ کہا۔ اے آقا نہیں، فرمایا لے جاؤ اسے جہنم میں

اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے بندوں کے درمیان مزاحم ہونے والوں کا ایک کردار یہ ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ کے قہر و غضب کا مشاہدہ آپ نے کیا۔ اب دوسری طرف انبیاء کرام علیہم السلام کا کردار دیکھیے جنہیں پیغام ربانی کے لیے منتخب فرمایا ہے۔

فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَإِنَّهٗ مِنِّيْ	تو جس نے میری پیروی کی وہ تو میرا
وَمَنْ عَصَانِيْ فَإِنَّكَ غَفُوْرٌ	ہے اور جس نے میرا کہا نہ مانا تو تو بہت
رَّحِيْمٌ	بخشنے والا اور مہربان ہے۔

یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ اپنے رب سے دعا مانگ رہے ہیں۔ بندوں پر شفقت و دلسوزی کا کیا عالم ہے۔ نافرمان بندوں پر رب کی مغفرت و رحمت کو کس لطیف پیرایہ میں متوجہ فرما رہے ہیں۔

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ

اگر تو انہیں عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر انہیں معاف فرما دے تو تو ہی زبردست حکمت والا ہے

یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں اپنے رب کے حضور صفائی پیش کر رہے ہیں۔ بندوں سے قلبی لگاؤ کا یہ حال ہے کہ کتنے ادب کے ساتھ بندوں کی مغفرت پر رب کی صفات عزت و حکمت کو متوجہ فرما رہے ہیں

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ کہتے ہیں گویا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ رہا ہوں۔ آپ نبیوں میں سے ایک نبی کا حال بیان فرما رہے تھے۔ ان کی قوم کے لوگوں نے انہیں مارا، خون آلود کر دیا۔ وہ اپنے چہرے سے خون پونچھتے جاتے اور کہتے جاتے "اے اللہ میری قوم کے لوگوں کو بخش دے وہ جانتے نہیں"

(بخاری و مسلم)

میں تمہارے رب پر ایمان لے آیا مجھ سے سن لو حکم ہوا داخل ہو جا جنت میں۔ بولا کاش میری قوم والوں کو معلوم ہو جاتا کہ کس طرح میرے رب نے مجھے بخش دیا اور عزت والوں میں داخل فرما دیا۔

(یٰسین)

بپھری ہوئی قوم کے سامنے ایک بندہ خدا نے ببانگ دہل اعلان کر دیا۔ میں تمہارے رب پر ایمان لے آیا سن لو قوم نے اس کی پاداش میں اسے قتل کر ڈالا۔ رب کی جانب سے حکم ہوا جنت میں داخل ہو جاؤ۔ مرد مومن کے دل میں انتقام کی آگ نہیں بھڑکی، اس کا وہم بھی نہیں گذرا کہ قوم میری قاتل ہے اس پر اللہ کا غضب ٹوٹے۔ اس کے برخلاف جنت میں قوم کی خیر خواہی کا جذبہ کام کر رہا ہے۔ آرزو ہے اے کاش میری قوم والوں کو کسی طرح معلوم ہو جاتا کہ میرے رب نے مجھے کس طرح بخشا اور عزت والوں میں داخل فرما دیا تاکہ وہ بھی راہ اپنا کر وہ بھی سبب کی بخشش اور عزت کے حقدار بن جاتے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے وفادار، برگزیدہ بندوں کے قلوب کو کتنی وسعت اور بندوں کی محبت سے معمور فرما دیا ہے۔

مذکورہ تفصیلات کی روشنی میں ہمارے کارکنوں کو فیصلہ کر لینا چاہیے کہ ہم اپنے غیر مسلم بھائیوں سے وسیع پیمانے پر ایسے بے لوث روابط اور برادرانہ تعلقات قائم کریں گے جن کے پیچھے پاکیزہ جذبات

ہوں گے، ان کے دکھ درد میں ہاتھ بٹائیں گے اور مشترک امور و مسائل کو مل جل کر حل کرنے کی کوشش کریں گے۔

ہمارے تعلقات کا اظہار خوشی اور غم دونوں مواقع پر ہونا چاہیے۔ خوشی کے مواقع مثلاً پیدائش، شادی بیاہ وغیرہ ان مواقع پر ہمیں ان کی خوشی میں شریک ہونا چاہیے۔ حسب حیثیت ہدایا و تحائف پیش کرنا چاہیے۔ غم کے مواقع مثلاً موت، بیماری، ہنگامی حادثات وغیرہ، ان مواقع پر ہمیں ان کے غم میں شریک ہونا چاہیے۔ ہمدردی کے کلمات، جسمانی خدمت، مالی اعانت کی پیش کش کرنا چاہیے۔ (وہ مراسم جو اسلامی نقطہ نظر سے غیر صحیح اور ناپسندیدہ ہیں، ان میں عدم شرکت کی معذرت معقول انداز میں کی جانی چاہیے۔)

(بقیہ اشارات)

کے اس تاریخی موقف کو سراہتے ہیں کہ اس نے فلسطینی عوام اور مظلوم عربوں کی جدوجہد آزادی و خودمختاری کا انصاف کے تقاضوں کے پیش نظر ساتھ دیا ہے اور اس سے اپیل کرتے ہیں کہ ہمارے ان جذبات کو نہ صرف بین الاقوامی فورم تک پہنچائے بلکہ عربوں کی حمایت اور اسرائیل کے خلاف اپنی پالیسی کو زیادہ سے زیادہ موثر بنائے۔

خطبۂ استقبالیہ

(محترمہ راشدہ مدعو صاحبہ)

الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ الامین وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین

محترمہ صدر کانفرنس اور خواتین گرامی!

عروس البلاد بمبئی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ مسلم لا کے تحفظ کے مسئلے پر خواتین کی آواز اسی مقام سے بلند ہوئی۔ ۲۳ جنوری ۸۶ء کو بمبئی کی دو ہزار خواتین نے پہلی مرتبہ جمع ہو کر مسلم پرسنل لا پر اپنے جذبات و احساسات کا برملا اظہار کیا۔ اس وقت ناچیز نے خطبۂ صدارت پیش کرتے ہوئے عرض کیا تھا۔

میں نے اپنی تمام نااہلیتوں کے باوجود اللہ کا نام لیکر صدارت کی ذمہ داری کو قبول کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس امید پر کہ شاید قابل خواتین کے لیے یہ مہمیز کا کام دے سکے اور آج تو نہیں تو کل وہ دختران ملت جن کو اللہ نے تقریر و تحریر کی صلاحیتوں سے نوازا ہے اللہ کے دین اور اس کی شریعت کی حفاظت کی خاطر آگے بڑھیں گی اور آئندہ انشاء اللہ اس سے بہتر شکل میں پروگرام انجام دیا جاسکے گا۔

اللہ کا شکر ہے کہ اس کے بعد مسلم پرسنل لا کی حمایت میں خواتین کے اجتماعات کا سلسلہ شروع ہوا اور ملک کے مختلف گوشوں میں بڑے پیمانے پر خواتین کے جلسے منعقد ہوئے۔ ناگپور، پونا، ناندیڑ، پربھنی، جالنہ، کلیان، مالیگاؤں، جلگاؤں، حیدرآباد، احمدآباد، کانپور، لکھنؤ، الہ آباد اور کلکتہ کے جلسے خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان جلسوں کی کارروائیوں سے یہ بھی اندازہ ہوجاتا ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور قابل خواتین

نے اس کام میں نمایاں حصہ لیا ہے اور کافی اہم پارٹ ادا کیا ہے ۔ گویا بمبئی کا اجتماع اول اعلیٰ تعلیم یافتہ اور قابل خواتین کے لیے واقعی مہمیز کا کام دے گیا اور جو دعا اللہ تعالیٰ کے حضور کی گئی تھی اس کو اس نے شرف قبولیت بخشا ۔ فللہ الحمد والمنۃ ۔ یہ اسی کا فضل و احسان ہے کہ آج ہمیں اس شہر میں آل مہاراشٹر مسلم پرسنل لا خواتین کانفرنس منعقد کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے ۔ کتنا مبارک ہے یہ اجتماع اور کتنی حسین ہے یہ محفل ! اس کامیابی پر ہم اپنے رب کا ایک بار نہیں سو بار شکر ادا کرتے ہیں ۔

چار ماہ قبل یعنی ۲۷، ۲۸ دسمبر ۱۹۷۲ء کو بمبئی میں ایک آل انڈیا مسلم پرسنل لا کنونشن برائے تحفظ قانون شریعہ منعقد ہوا تھا جو مسلمانان ہند کا نمائندہ اور تاریخی کنونشن تھا جس میں ہر مکتبہ فکر اور ہر طبقہ و مسلک کے علماء اور دانشور حضرات نے شرکت کی تھی ۔ اس میں خواتین کی نمائندگی بھی ہوئی تھی ۔ البتہ انتظامی دشواریاں کے پیش نظر بیرون بمبئی کی خواتین کو شرکت کا موقع نہیں مل سکا تھا ۔ مسلم پرسنل لا کے مخالفین نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا اور یہ پروپیگنڈہ شروع کیا کہ خواتین کنونشن میں شریک نہیں تھیں ۔ اس لیے ان کے فیصلوں کو خواتین کی تائید حاصل نہیں ہے ۔

اس صورت حال کے پیش نظر خواتین کانفرنس کی ضرورت ابھر کر سامنے آگئی اور جماعت اسلامی مہاراشٹر نے اپنے میقاتی پروگرام کے پیش نظر جس میں پہلے ہی سے مسلم پرسنل لا کے سلسلے میں ریاستی سطح پر خواتین کی کانفرنس کا منصوبہ شامل تھا ۔ اس کے انعقاد کا فیصلہ کیا اور حلقہ کی مجلس شوریٰ نے ناچیز پر مجلس استقبالیہ کی صدارت کی ذمہ داری ڈالی ۔ اللہ کا نام لیکر کام کا آغاز کیا گیا اور مجلس استقبالیہ کی تشکیل ہوئی جو ۱۵ خواتین پر مشتمل ہے ۔ گویا ؏

ہم سفر ملتے گئے اور کارواں بنتا گیا

مجلس استقبالیہ کی رکنیت تعلیم یافتہ اور باشعور خواتین نے قبول کی اور کانفرنس کے کاموں سے گہری دل چسپی لی ۔

یہ کانفرنس اگرچہ جماعت اسلامی مہاراشٹر کے زیر اہتمام منعقد ہو رہی ہے لیکن حقیقۃً یہ مہاراشٹر کی مسلم خواتین کی نمائندہ کانفرنس ہے ۔ اس میں مہاراشٹر کے مختلف اضلاع سے مندوبہ خواتین (منتقسومینیہ) شریک ہوئی ہیں اور ہر مکتبہ فکر اور ہر جماعت و طبقہ کی خواتین شریک اجلاس ہیں

سنی، شیعہ، حنفی، شافعی، اہل حدیث، مقلد وغیر مقلد سبھی شریک ہیں۔ شرکا میں مسلم لیگ، جمیعۃ العلماء، تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی وغیرہ سے بھی وابستگی رکھنے والی خواتین ہیں اور ایسی خواتین بھی ہیں جن کا تعلق کسی جماعت سے نہیں ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ، مقررہ، مقالہ نگار خواتین نے بھی اس محفل کو زینت بخشی ہے۔ غرض یہ محفل کیا ہے ایک گلدستہ ہے جس میں رنگ برنگ کے پھول مہک اٹھے ہیں اور رونق افروز ہونے والیوں کی زبان پر ایک ہی نغمہ ہے ؏ جان بیٹا خلافت پہ دے دو۔

میں تمام شرکاء خواتین کی خدمت میں مبارک باد پیش کرتی ہوں کہ انھوں نے اس نازک اور اہم موقع پر دینی حمیت اور ملی بیداری کا ثبوت دیا اور خاص طور سے اپنی ان بہنوں کے لیے اجر جمیل کی دعا کرتی ہوں جنھوں نے سفر کی غیر معمولی صعوبتیں برداشت کرکے کانفرنس میں شرکت فرمائی اور اپنا نام اللہ کی راہ میں سفر کرنے والیوں (سائحات) میں لکھوا دیا۔ ان کے علاوہ ایسی بہنیں بھی ہیں جو کانفرنس میں شرکت کے لیے بے چین تھیں لیکن گوناگوں مجبوریوں کی بنا پر شریک نہ ہوسکیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر دے۔

خواتین کا مقام

اس کانفرنس کے انعقاد پر ممکن ہے کچھ لوگوں کو تعجب ہو کہ خواتین کانفرنس کیسی؟ اگر یہ حضرات آیت توبہ:-

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ	مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے
بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ	کے رفیق ہیں۔ نیکی کا حکم کرتے ہیں اور برائی
بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ	سے روکتے ہیں۔

کے مضمرات پر غور فرمائیں تو ان کو ہرگز تعجب نہ ہوگا۔ مسلم پرسنل لا کے تحفظ کی بات نیکی کا حکم کرنے اور یکساں سول کوڈ کی مخالفت برائی کو روکنے کے مترادف ہے۔ قرآن کریم نے امر بالمعروف ونہی عن المنکر صرف مومن مردوں ہی کا نہیں مومن عورتوں کا بھی وصف بتایا ہے۔ اس لیے اگر خواتین شرعی حدود میں رہ کر ایسی کانفرنسیں منعقد کرتی ہیں جبکہ ایسا کرنا حالات کا تقاضا بھی ہو تو اس میں حیرت واستعجاب کی بات کیا ہے؟ حقیقتاً عورت کا صحیح مقام وہ ہے جو کتاب وسنت نے اسے عطا فرمایا ہے، نہ کہ وہ مقام جو لوگ قدیم یا جدید نظریات یا اپنے مزاج اور رسم ورواج طور طریقوں کی بنا پر اسے دیں۔ ہماری آنکھیں نہ نئی

روشنی سے خیرہ ہوگئی ہیں اور نہ پرانی روشنی میں محصور۔ بلکہ ہم نے اسلام کی روشنی میں چلنے کا عزم کرلیا ہو۔ جو اللہ کی روشنی ہے جس کے مقابل میں کوئی روشنی' روشنی نہیں' بلکہ تاریکی ہی تاریکی ہے۔

اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُھُمْ — اللہ اہل ایمان والوں کا دوست ہو وہ
مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ (بقرہ ۷، ۲۵) — انہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہو۔

لوگوں نے غلط طور پر تاریکیوں کا نام روشنی رکھا ہو۔ ؎

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد — جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

دختران ملت کی طرف سے دنداں شکن جواب

ہمارے کرم فرما پوچھتے ہیں کہ آپ حضرات مسلم پرسنل لا کا راگ کیوں الاپ رہے ہیں۔ ہم ان سے پوچھنا چاہتی ہیں کہ آپ یکساں سول کوڈ کی رٹ کیوں لگا رہے ہیں؟ اگر آپ یہ رٹ بند کردیں اور مسلم پرسنل لا پر حملہ نہ کریں تو جھگڑا ہی نہ رہے گا لیکن اگر آپ کی طرف سے یہ سلسلہ جاری رہا تو آپ کو فرزندان ملت ہی کی طرف سے نہیں' دختران ملت کی طرف سے بھی دنداں شکن جواب کے لیے ہر وقت تیار رہنا چاہیے۔

یکساں سول کوڈ کے حامی یہ خیال کرتے ہیں کہ قومی اتحاد کے لیے یونیفارم (یکساں) سول کوڈ کا نفاذ ضروری ہے۔ اس کے بغیر ملک میں اتحاد اور یک جہتی کی فضا پیدا نہیں ہوسکتی۔ کوئی ان سے پوچھے کہ کیا اتحاد و یکجہتی کے لیے یکساں لباس (یونیفارم ڈریس) بھی ضروری ہے؟ اگر یکساں لباس اختلاف قومی یکجہتی میں مانع نہیں ہے تو شخصی قوانین (سول کوڈ) کا اختلاف قومی یک جہتی میں کیوں مانع ہونے لگا۔ پھر حقائق اور واقعات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ زبان کی بنیاد پر ہمارے ملک میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے اور اس مسئلے پر برابر ہنگامے برپا ہوتے رہتے ہیں۔ تو کیا یہ حضرات تمام زبانوں کو ختم کرکے ایک زبان کا نعرہ لگائیں گے؟ بہتر ہے کہ پہلے یکساں لسانی کوڈ (یونیفارم لینگویج کوڈ) بنائیں۔ اس کے بعد یکساں ... کوڈ) بنائیں۔ اس کے بعد یکساں سول کوڈ کی بات کریں۔ ہم ان سے کہنا چاہتی ہیں کہ ذرا عقل کے ناخن لیجیے جس کا سر جس سائز کا ہو اس کے لیے اسی سائز کی ٹوپی مطلوب ہے لیکن آپ پر یکسانیت پیدا کرنے کا خبط ایسا سوار ہے کہ ایک ہی سائز کی ٹوپیاں سب کو پہنانا چاہتے ہیں اور جب بہت سے سروں پر وہ فٹ نہیں ہو پاتیں تو آپ ان سروں کو چھیل کر ٹوپی کے برابر کر دینا چاہتے ہیں۔ آپ کا اصرار ہے کہ ٹوپیاں ایک ...

ایک سائز کی ہونی چاہییں اگرچہ ان کے لیے سر چھیلنا پڑیں ـــــ مالکم کیف تحکمون (تمہیں کیا ہو گیا ہے کیسے فیصلے کرتے ہو؟) فی الواقع اگر ان عقلمندوں کی بات مان لی جائے تو کسی کا سر سلامت نہیں ہے گا۔

وعدے اور یقین دہانیاں

حکومت کے ذمہ دار حضرات مسلم پرسنل لا کے مسئلے پر بیان دینے کا سلسلہ برابر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ حال ہی میں کانگریس پارلیمانی بورڈ نے اپنے بیان میں کہا کہ مسلم پرسنل میں کوئی مداخلت یا تبدیلی نہیں کی جائے گی۔ ہم ان بیانات کا خیر مقدم کرتی ہیں لیکن ساتھ ہی یہ واضح کرنا چاہتی ہیں کہ ذمہ داران حکومت کے بیانات پر تکیہ کرنا اور یہ خیال کرنا کہ مسلم پرسنل کا مسئلہ حل ہو گیا ہے، صحیح نہ ہو گا۔ کیونکہ ذمہ داران حکومت ایک طرف اس قسم کے بیانات دیتے رہتے ہیں اور دوسری طرف مسلم پرسنل لا کے خلاف شوشے چھوڑتے رہتے ہیں۔ ایک طرف کانگریس پارلیمانی بورڈ کا یہ بیان ہے اور دوسری طرف مسلم پرسنل کے خلاف کانگریسی وزیر عبدالرحمٰن صاحب انتولے کی مسلم پرسنل لا کے خلاف تقریر اور مہاراشٹر اسمبلی کی وہ سفارش ہے جو اس نے یک زوجگی کے قانون کے سلسلے میں مرکز سے کی۔ پھر علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کا معاملہ تو بالکل تازہ ہے ـــــ حکومت کے ذمہ داروں نے کیسے کیسے وعدے کیے تھے۔ لیکن بعد میں یہ سب وعدے طاق نسیاں ہو گئے اور مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو سرکاری کردار میں منتقل کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ لہٰذا مسلم پرسنل لا کے سلسلے میں مسز اندرا گاندھی اور ان کے ساتھیوں کا کیا اعتبار؟

ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

یہ وعدے اور یہ یقین دہانیاں ہرگز کافی نہیں ہیں۔ اگر حکومت واقعی مسلمانوں کے پرسنل کو ختم کرنا نہیں چاہتی تو وہ اس کی آئینی ضمانت دے۔ دستور کی دفعہ ۴۴ میں جو یکساں سول کوڈ سے متعلق ہے ترمیم ضروری ہے۔ اگر حکومت اپنے قول میں مخلص ہے تو وہ دستور کی مذکورہ بالا دفعہ کو یا تو ختم کردے یا اس میں ترمیم کر کے مسلمانوں کو اس سے مستثنیٰ قرار دے۔ پارلیمنٹ میں برسر اقتدار پارٹی کی بھاری اکثریت ہے، پھر دستور میں ترمیم کرنے سے وہ کیوں گریز کرتی ہے۔

جمہوریت کے علمبرداروں سے

جمہوریت کے علمبردار بتائیں کہ آج کا یہ اجلاس خواتین کا نمائندہ اجلاس نہیں ہے؟ اور کیا

ہزارہا خواتین کا یہ متفقہ فیصلہ جس کی پشت پر کروڑہا مسلم خواتین کی آواز ہے، کوئی وقعت نہیں رکھتا کیا مہرالنساء، نجمہ شیخ، مریم رفاعی اور بیگم عائشہ جیسی انگلیوں پر گنی جانے والی خواتین مسلمانوں کی نمائندگی کی ٹھیکیدار ہیں؟ آخر یہ کون سی جمہوریت ہے کہ ساڑھے تین خواتین کی آواز کو تو وزن دیا جائے لیکن ساڑھے تین کروڑ خواتین کی آواز کو بے وزن خیال کیا جائے۔ اقبالؒ نے ٹھیک ہی تو کہا تھا۔ ؎

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جمہوریت کے یہ علمبردار افراد کو نہ تولنا چاہتے ہیں اور نہ گننا، بلکہ ان کو کچلنا چاہتے ہیں تاکہ اپنی من مانی کر سکیں۔ یہ بدترین قسم کی فسطائیت ہے جو جمہوریت کا لبادہ اوڑھ کر سامنے آئی ہے۔

یکساں سول کوڈ کس طرح کے مسائل پیدا کرے گا

مسلم پرسنل لا کے مسئلے کو ناواقف لوگ محض تعدد ازدواج (ایک سے زائد شادی) کا مسئلہ خیال کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ اس کا تعلق پوری معاشرتی زندگی سے ہے۔ نکاح، محارم، طلاق، خلع فسخ، عدت، وراثت وغیرہ امور پرسنل لا کے دائرے میں آتے ہیں۔ ان امور کے سلسلے میں قرآن کریم میں صریح احکام بیان ہوئے ہیں اور ان کی تشریح احادیث صحیحہ میں ملتی ہے جس کو سنت کہا جاتا ہے۔ انسان کے خود ساختہ قوانین خواہ وہ یکساں سول کوڈ کی شکل میں ہوں یا کسی اور شکل میں، الٰہی قوانین سے ضرور ٹکرائیں گے۔ کیونکہ انسان جب ہدایت الٰہی سے بے نیاز ہو کر انسانی زندگی کے لیے قانون بنانے بیٹھے گا تو خواہشات کا شکار ہو گا اور اپنے محدود علم کی بنا پر الٹے سیدھے فیصلے کر بیٹھے گا جو اسے گمراہی کے راستے پر ڈال دیں گے۔ مثال کے طور پر قرآن کریم نے بعض رشتوں کو حرام ٹھہرایا ہے۔ یکساں سول کوڈ کی صورت میں محرموں کا یہ قانون بھی زد میں آئے گا اور جو رشتے حرام ہیں ان کو حلال اور جو رشتے حلال ہیں ان کو حرام ٹھہرایا جا سکے گا۔ اسی طرح اسلام نے مومن عورتوں کا نکاح صرف مومن مردوں سے جائز قرار دیا ہے لیکن یکساں سول کوڈ بین المذاہبی شادیوں کی راہ کھول دے گا اور مشرکین سے نکاح کو قانونی جواز حاصل ہو گا۔ قرآن حکیم نے مرد کو طلاق کا اختیار اور عورت کو خلع کا حق دیا ہے۔ یکساں سول کوڈ کی صورت میں طلاق کا اختیار مرد کے ہاتھ سے چھین کر عدالت کو

دیا جائے گا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ عورت کو بھی خلع کا حق باقی رہے گا۔ اس طرح نہ صرف یہ کہ احکام خداوندی کی خلاف ورزی ہوگی بلکہ اس کے ساتھ عورتوں کی پریشانی میں اضافہ ہی ہوگا۔ کیونکہ جب مرد کو طلاق دینے کا اختیار باقی نہیں رہے گا تو عورت خلع بھی حاصل نہیں کر سکے گی۔ اس کے لیے ایک ہی راستہ رہ جائے گا اور وہ عدالت کے چکر کاٹنے کا راستہ ہے جہاں ان نازک معاملات میں ثبوت مہیا کرنا کوئی آسان بات نہیں ہے اور اگر ناکافی شہادت کی بنا پر عدالت نے طلاق کی ڈگری نہیں دی تو اس عورت کا کیا بنے گا جو اپنے شوہر کے خلاف عدالت میں مقدمہ لے گئی تھی۔

ایک بات یہ بھی ہے کہ جن کو مساوات کا مالیخولیا ہوگیا ہے وہ عورتوں کو بھی طلاق کا حق دلوانا چاہتے ہیں۔ ہم ان سے کہنا چاہتی ہیں کہ اے مساوات کے دیوانو! اور اے یکساں سول کوڈ کے حامیو! اگر آپ عورتوں کو بھی طلاق کا اختیار دلوانا چاہتے ہیں تو ہم اپنے اس اختیار کو آج ہی استعمال کرتی ہیں اور وہ اس طرح کہ ہماری طرف سے یکساں سول کوڈ کو ایک نہیں ایک ہزار طلاقیں ہیں۔ اب اگر یہ کوڈ اپنی عدت پوری بھی کرلے تو اس کے حلال ہونے کی کوئی صورت نہیں ہے۔

تعددِ ازدواج کا مسئلہ

تعدد ازدواج کے مسئلے پر شاید مسلم پرسنل لا کے مخالفین یہ توقع رکھتے ہیں گے کہ خواتین اس کی ضرور مخالفت کریں گی۔ لیکن ہم ان پُر فریب باتوں میں آکر احکام شرع سے روگردانی کرنے والی نہیں۔ اس مسئلے پر علمی بحث کا تو یہ موقع نہیں ہے۔ البتہ ایک واقعہ سنانا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ ذکر ہے پاکستان کا اور مسئلہ ہے تعدد ازواج کا۔

"ایک پولس افسر ایک شخص کے گھر پہنچا اور کہا کہ آپ نے دوسری بیوی کرلی ہے جو قانوناً جرم ہے اس شخص نے جواب دیا۔ میری تو ایک ہی بیوی ہے۔ پولس افسر نے کہا۔ "پھر یہ کون ہے؟" اس نے کہا۔ "یہ تو میری داشتہ ہے" یہ سنکر پولس افسر ناکام لوٹ گیا" —— یہ ہے مغربی تہذیب کا فتویٰ کہ قانونی بیوی ایک سے زائد حرام' البتہ غیر قانونی بیویوں پر کوئی پابندی نہیں —— جو تہذیب اس قسم کی حماقتیں سکھلاتی ہو اس سے وہی لوگ مرعوب ہو سکتے ہیں جو اپنی دانش و بینش سے کام نہ لیتے ہوں۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ قوانین شرعیہ حکمت و دانائی اور عظیم مصالح پر مبنی ہیں۔ اس لیے کہ اس ہستی کے نازل کردہ ہیں جو علیم و حکیم ہے۔ جو لوگ خدا کے قوانین میں نقص ڈھونڈتے ہیں وہ خدا سے زیادہ

اپنے کو عقلمند خیال کرتے ہیں، ورنہ خدا کی باتوں کو غلط ٹھیراکر ان کی اصلاح کے درپے ہونے کے کیا معنے؟

مغربی تہذیب مسائل کا حل نہیں

ہم ان دلوائیوں، فیفیوں اور چھاگلاؤں سے پوچھنا چاہتی ہیں کہ جن قوموں نے اللہ کی ہدایت سے بے نیاز ہو کر معاشرتی قوانین وضع کیے وہ معاشرتی مسائل کو کہاں تک حل کر سکے ہیں حل تو کیا کرتے، مسائل کو الجھا یا ضرور ہے۔ مغربی اقوام کی معاشرتی زندگی کو دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ باوجود ترقی پسندی کے سماج کی نہ اخلاقی حالت سدھر سکی اور نہ ازدواجی زندگی پر خوش گوار اثرات مرتب ہو سکے۔ چنانچہ وہاں طلاق کی کثرت ہو گئی ہے اور ادنیٰ ادنیٰ بات پر مقدمات قائم ہونے لگے ہیں۔ مثلاً اخباری خبر کے مطابق ایک عورت نے اپنے شوہر کے خلاف اس بات پر مقدمہ قائم کیا کہ اس کا شوہر نیند میں خراٹے لیتا ہے جس سے اس کی نیند خراب ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں عصمت و عفت کے آبگینے کو جو جوہر نسوانیت ہے، مغربی تہذیب نے بالکل چکنا چور کر کے رکھ دیا ہے اور آج کے یہ ٹوٹے ہوئے شیشے پکار پکار کر کہہ رہے ہیں۔ ع

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

یہ اسلام ہی کے معاشرتی نظام کی برکات ہیں کہ ہمارا سماج اس گئی گذری حالت میں بھی دنیا کے دیگر سماجوں میں اخلاقی اعتبار سے کافی اونچا مقام رکھتا ہے اور جو گھناؤنا پن دوسری جگہ ہے اس سے الحمدللہ ہمارے گھر بڑی حد تک محفوظ ہیں۔ ہمیں اسلام کے معاشرتی نظام پر فخر ہے اور ہم اسکی دل و جان سے حفاظت کرنا چاہتی ہیں ویسے اسلام کی برکات سے معاشرہ اسی وقت بہرہ مند ہو سکتا ہے جبکہ وہ اس کو ایک مکمل نظام حیات کی حیثیت سے اپنائے اور تقویٰ اور خدا خوفی کے جذبات لوگوں کے دلوں میں پرورش پائیں۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ مرد و خواتین دونوں میں اسلام کا شعور بیدار کیا جائے۔ اسلام کے اخلاقی و معاشرتی نظام سے انہیں بخوبی روشناس کرا دیا جائے اس کی تعلیمات ان کے ذہن نشین کرائی جائیں اور وقت کے فتنوں سے انہیں بچانے کی کوشش کی جائے ساتھ ہی یہ آواز فضا میں گونجتی رہے کہ ع شریعت کل ہے مسلم پرسنل لا جزو لاینفک

اور اس میں حکومت کی مداخلت کو ہم ہرگز برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے دین کے لیے جینے اور مرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہماری حقیر خدمات کو قبولیت سے نوازے۔ آمین!

ربنا اتنا من لدنک رحمۃ وھیئ لنا من امرنا رشدا

روداد مرکزی مجلس شوریٰ جماعت اسلامی ہند

منعقدہ ۷ تا ۱۲ مئی ۱۹۷۳ء

الحمدللہ کہ مرکزی مجلس شوریٰ جماعت اسلامی ہند کا سالانہ اجلاس زیر صدارت جناب محمد یوسف صاحب امیر جماعت، مرکز جماعت اسلامی ہند بازار مفتی کفایت اللہ دہلی ۶ میں ۷ مئی ۱۹۷۳ء صبح ۱۰ بجے سے شروع ہوکر ۱۲ مئی ۷۳ء کی شب میں ختم ہوا۔

اجلاس کا آغاز مولانا سید حامد علی صاحب کی تلاوتِ کلام پاک سے ہوا۔ اس کے بعد محترم امیر جماعت نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

امیر جماعت کی تقریر

الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ خاتم النبیین وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ اجمعین ٥ اما بعد فقد قال اللہ تعالیٰ اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم۔ وقل لعبادی یقولوا التی ھی احسن اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ بَیْنَہُمْ اِنَّ الشَّیْطٰنَ کَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِیْنًا ٥

وقالَ رسول اللہِ صلی اللہُ علیہ وسلم من یضمن لی ما بین لحییہ وما بین رجلیہ اضمن لہ الجنۃ

معزز ارکان شوریٰ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے پھر ہمیں یہ موقع عنایت فرمایا کہ ہم اس کے دین کی جد وجہد کی خاطر جمع ہوئے ہیں۔ آیت اور حدیث جو میں نے آپ کو سنائی ہیں ہم سب کو اپنے سامنے رکھنا ہے۔ اس آیت اور حدیث میں ہمارے ہی لیے نہیں پوری امت کے لیے رہنمائی ہے۔ آیت میں دو قسم کے کردار پیش کیے گئے ہیں۔ ایک مومن کا کردار اور دوسرا مومنوں اور سارے انسانوں کے دشمن 'شیطان' کا کردار — مومن کا کردار یہ ہے کہ جب کوئی بات

کہتا ہے تو اس کا مقصد صلاح اور اصلاح ہوتا ہے۔ شیطان کا کردار یہ ہے کہ وہ انسانوں کے درمیان فساد ڈالنا چاہتا ہے۔ وہ یہ کوشش بھی کرتا ہے کہ اہل ایمان بھی آپس میں لڑتے جھگڑتے رہیں اور صلاح و اصلاح کے کام سے جو ان کی زندگی کا مقصد ہے غافل ہو جائیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے بہت پیارے انداز میں مومنین کو "میرا بندہ" کہکر یہ ہدایت کی ہے کہ وہ جو بات بھی کہیں وہ احسن ہونی چاہیے یعنی بہت عمدہ بات اور بہت اچھے طریقے سے۔ اس نے انہیں یہ بھی بتایا ہے کہ شیطان جو ان کا کھلا ہوا دشمن ہے ان کے مابین فساد کرانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ اہل ایمان شیطان کے اس کید سے متنبہ رہیں اور زبان کے استعمال میں احتیاط برتیں۔

حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بشارت دی ہے کہ جس شخص نے اپنی زبان اور اپنی شرمگاہ کو غلط استعمال سے محفوظ رکھا اسے جنت میں جگہ ملے گی۔ ایک اور روایت میں یہ وعید آئی ہے کہ جس نے زبان اور شرمگاہ کی حفاظت نہیں کی اس کا ٹھکانا دوزخ میں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس برے ٹھکانے سے محفوظ رکھے اور اس اصل ٹھکانے تک پہنچائے جو ہماری کھوئی ہوئی میراث ہے۔

ایجنڈا جیسا کہ آپ نے دیکھا ہے کافی طویل ہے۔ اس محدود وقت میں جو ہمارے پاس ہے ہمیں اس بات کی کوشش کرنی ہے کہ پورا ایجنڈا ختم ہو جائے۔ اس سلسلے میں ہمیں یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ جو بات ہم پیش کریں مختصر جامع اور موضوع سے متعلق ہو

زندہ قومیں جب اپنے معاملات پر غور کرتی ہیں تو وہ اپنا زیادہ وقت اس بات پر صرف نہیں کرتیں کہ ایسا ہوا ہوتا تو یہ نتیجہ نکلتا، یا یہ کہ ہم نے تو ایسا کہا تھا اور اب یہ ہو گیا۔ اس طرح کی باتیں اور تنقیدیں بھی کی جا سکتی ہیں اور کرنا بھی چاہیے تاکہ آئندہ غلطی سرزد نہ ہو۔ لیکن اس کے لیے الگ سے نشست رکھی جا سکتی ہے۔ البتہ جو معاملات آپ کے سامنے آئیں تو یہ دیکھنا چاہیے کہ اس وقت صورت حال کیا ہے اور اسے بہتر بنانے کے لیے ہم کیا کر سکتے ہیں۔ یہ دیکھنا چاہیے کہ ہم اس وقت کس چیلنج سے دوچار ہیں اور اس چیلنج کے مقابلے کے لیے ہمیں کیا کرنا ہے۔ اس طرح ہم انشاء اللہ ایجنڈے کو جلد از جلد ختم کر سکیں گے۔

ملک کے سنگین مسائل

آپ کو معلوم ہے کہ آج ملک میں تشدد، لاقانونیت، اضطراب، غذائی بحران اور دوسرے مختلف قسم کے مسائل موجود ہیں، حکومت نے جو غذائی پالیسی اختیار کی ہے وہ بھی آپ کے سامنے ہے بنیادی حقوق پر زد کس طرح پڑی ہے۔ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کا کس طرح تقرر ہوا ہے۔ مسلم یونیورسٹی مسلم پرسنل لا اردو اور دیگر مسائل کے سلسلے میں کیا ہو رہا ہے۔ یہ سب باتیں آپ کے علم میں ہیں۔ لیکن یہ سب صرف علامت Symptom کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اصل بیماری الحاد اور خدا سے بغاوت ہے جس کے یہ سب شاخسانے ہیں۔ ہم بہت پہلے سے یہ محسوس کرتے رہے ہیں کہ ملک کا دشمن نمبرا کمیونزم ہے۔ اب اپوزیشن پارٹیاں اور ملک کے دوسرے لوگ بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ ملک کا دشمن نمبرا کمیونزم ہے۔ خود کانگریس کے اندر جو فورم ہے ان میں سے ایک کا یہ خیال ہے کہ ارباب اقتدار ملک کو کمیونزم کی طرف لے جا رہے ہیں نئے چیف جسٹس کے تقرر کے موقع پر ملک کے کتنے ہی دانشوروں نے جو ابھی تک خاموش تھے اس بات کا برملا اظہار کیا ہے کہ ملک کمیونزم کی طرف بڑھتا چلا جا رہا ہے لیکن دقت یہ ہے کہ یہ لوگ کمیونزم کے خلاف جو محاذ بنا رہے ہیں اپنے پاس کوئی آئیڈیالوجی نہیں رکھتے جو کمیونزم کو مات دے سکے اور جہاں تک سرمایہ دارانہ نظام کا تعلق ہے وہ بجائے خود ایک فاسد نظام ہے۔ آئیڈیالوجی کا مقابلہ آئیڈیالوجی ہی سے کیا جا سکتا ہے نہ کہ کسی اور طریقے سے۔ کمیونزم کا سب سے بڑا حربہ توڑ پھوڑ اور لاقانونیت ہے۔ اگر اس کا مقابلہ دوسرے لوگ انہیں اوچھے ہتھیاروں سے کرنے لگیں تو اصلاح ہونے کے بجائے ملک میں فساد اور زیادہ بڑھ جائے گا۔ ہمارا یقین ہے کہ امت مسلمہ ہی کے پاس وہ آئیڈیالوجی ہے جو ملک کے مسائل کو صحیح طور سے حل کر سکتی ہے۔ یہ آئیڈیالوجی دنیا کے مختلف ادوار میں تجربے کی کسوٹی پر پرکھی جا چکی ہے اور اس کا اصلح اور ارفع ہونا تاریخ کے اوراق پر ثبت ہے۔ اگر امت مسلمہ ایک داعی گروہ کی حیثیت سے اٹھ کر اپنی آئیڈیالوجی کو قولاً اور عملاً پیش کرے تو امید ہے کہ ملک کو اس تباہی و بربادی سے بچایا جا سکتا ہے جس کی طرف ملک کے رہنما آنکھیں بند کر کے اسے لے جا رہے ہیں۔ ہماری تمنا اور کوشش ہے کہ امت مسلمہ داعی گروہ کی حیثیت سے اس ملک میں زندگی گذارے۔

پرسنل لا

اس سلسلے کی چھوٹی سی جھلک اور امید کی کرن اس امر کی نظر آتی ہے کہ بمبئی میں جو آل انڈیا

مسلم پرسنل لا کنونشن منعقد ہوا اس میں مختلف مکاتب فکر کے رہنما ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوئے اور انھوں نے مسلم پرسنل لا کے تحفظ کے لیے جد وجہد کرنے کا اعلان کر دیا۔ یہ ایک اچھی علامت ہے اور کارنامہ بھی، لیکن صرف پرسنل لا کی حفاظت سے کام نہیں چلے گا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جس طرح مسلمان دین وشریعت کے ایک جزء کو اپنے سینے سے لگانا چاہتے ہیں، اسی طرح وہ پورے دین کو اپنے سینے سے لگائیں ——— میں کیرلا اور مدراس کے دوروں کے موقع پر نیز مسلم پرسنل لا کے سلسلے میں جو اجتماعات منعقد ہوئے ان سب میں اس بات پر زور دیتا رہا ہوں کہ پرسنل لا کے تحفظ کے ساتھ ساتھ ہمیں دین کی تمام ہی تعلیمات پر چلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کے علاوہ مسلم پرسنل لا بورڈ کے ذمہ دار حضرات کے ساتھ اپنی گفتگوؤں میں بھی اس بات کو دہراتا رہا ہوں کہ اقامت دین صرف جماعت اسلامی کا نصب العین نہیں ہے اور نہ اس پر جماعت اسلامی کی اجارہ داری ہے۔ یہ تو ہمیشہ سے امت مسلمہ کا متفقہ اور مسلّم نصب العین رہا ہے۔

مسلم پرسنل لا اور خواتین

اس سلسلے میں ایک خوش آیند بات یہ ہے کہ مسلم خواتین میں بھی دینی شعور بیدار ہو رہا ہے چنانچہ ملک میں جگہ جگہ چھوٹے بڑے پیمانے پر مسلم پرسنل لا کی حمایت میں خواتین کے اجتماعات منعقد ہو رہے ہیں حال ہی میں بمبئی میں خواتین کا بہت بڑا اجتماع ہوا جس میں انھوں نے مسلم پرسنل لا کے تحفظ اور اتباع دین وشریعت کے سلسلے میں اپنے دوٹوک فیصلے کا اعلان کیا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مسلم پرسنل لا اور اقامتِ دین کی جد وجہد میں خواتین اپنا رول ادا کرنے کے لیے آگے بڑھ رہی ہیں۔

ہماری خواہش ہے کہ جس طرح حلقہ مہاراشٹرا اور بعض دوسرے حلقوں میں خواتین کے اجتماعات ہوئے ہیں اس طرح ملک کی ہر ریاست میں خواتین کے اجتماعات منعقد ہوں جن میں خواتین پر یہ واضح کیا جائے کہ شریعت اسلامیہ نے خواتین کو کیا حقوق دیے ہیں، کن فرائض کا پابند کیا ہے اور عائلی زندگی اور دین کی خدمت کے سلسلے میں ان کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔ میں تو یہ بھی عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ خواتین کا ایک وفد اسلامی حجاب اور اسلامی آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے محترمہ وزیر اعظم سے ملاقات کرے اور انھیں بتلائے کہ مسلم پرسنل لا اپنی حقیقی شکل میں کس طرح دوسرے قوانین پر فوقیت رکھتا ہے اور یہی نہیں بلکہ اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ کی ہدایت

سامنے رکھتے ہوئے انہیں یہ بھی بتائے کہ جو آئیڈیالوجی ملک میں رائج ہے وہ کس طریقے سے ملک کو تباہی کی طرف لے جارہی ہے اور انبیائی آئیڈیالوجی کو بھی ان کے سامنے پیش کریں تاکہ انہیں معلوم ہوسکے کہ مسلمان عورتوں میں بھی جو بیداری پیدا ہورہی ہے وہ اس بیداری سے مردوں کے دوش بدوش ملک وملت کی کس طرح خدمت کرنا چاہتی ہیں۔

عزیز رفقاء! اگر ہم اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے مردوں اور عورتوں دونوں میں دین کا شعور پیدا کرنے کے لیے زیادہ محنت وجاں فشانی سے کام لیں تو امید ہے کہ ملک کو ان مضرتوں سے آگاہ کرنے میں کامیاب ہوسکیں گے جو موجودہ آئیڈیالوجی کے تحت اس کو پیش آرہی ہیں اور آنے والی ہیں۔ ساتھ ہی ہم اس راستے کی نشان دہی کرسکیں گے۔ جو ملک کی مادی، اخلاقی اور روحانی ترقی کا ضامن ہو۔

معزز رفقاء! یہ کام ہے تو بڑا صبر آزما، لیکن کرنے کا کام یہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اپنی پالیسی اور پروگرام میں اپنی تربیت کے ساتھ دعوت وتبلیغ اور اسلام کی اشاعت کو اولین اہمیت دی ہے۔ دراصل یہی وہ کام ہے جو حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کرنے آئے تھے۔

عزیز رفقاء! ہم ہر لمحہ اس متاعِ گم گشتہ کی تلاش میں رواں دواں ہیں جس کو ہمارے دادا حضرت آدم علیہ السلام نے کھو دیا تھا۔ ہماری ساری جد وجہد اسی کھوئی ہوئی حیثیت کے حصول کے لیے ہے۔ یہ دنیا عارضی وچند روزہ ہے۔ آج ہم ہیں اور کل، پرسوں یا چند سال بعد ہم موجود نہیں رہیں گے۔ ہمارا جو قدم اٹھے نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ اللہ کی راہ میں اٹھے اور ہم ہر آن اس سے ہدایت واستطاعت کی توفیق طلب کرتے رہیں۔

رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔ رَبَّنَا اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ

سابقہ روداد کی خواندگی

امیر محترم کے افتتاحی کلمات کے بعد اوقات کی تعیین کی گئی اور ایجنڈے کے مطابق

شوریٰ کے دونوں اجلاس ... ستمبر ۷۲ء اور دسمبر ۷۲ء کی روداد کی خواندگی ہوئی۔

جماعت کی سالانہ رپورٹ

روداد سے فراغت کے بعد جماعت اسلامی ہند کی سالانہ رپورٹ (اپریل ۷۲ء تا مارچ ۷۳ء) پیش کی گئی جس میں یہ واضح کیا گیا تھا کہ شوریٰ کے فیصلوں پر کس طرح عملدرآمد ہوا اور پوری جماعت نے دوران سال موجودہ پروگرام کے تحت کیا کارگذاری انجام دی (جماعت کی یہ سالانہ رپورٹ ان شاء اللہ جلد ہی شائع کی جائے گی۔

مسلم یونیورسٹی پر قرارداد

اس کے بعد مسلم یونیورسٹی کے موجودہ حالات سامنے آئے اور غور و خوض کے بعد درج ذیل قرارداد منظور کی گئی۔

مرکزی مجلس شوریٰ جماعت اسلامی ہند کا یہ اجلاس علی گڈھ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی انتظامیہ کے حالیہ فیصلوں کو گہری تشویش کی نگاہ سے دیکھتا ہے جس کے ذریعے یونیورسٹی کے متعدد طلبہ اور چند اساتذہ کے خلاف تادیبی کارروائی کی گئی ہے۔ یہ اقدام بظاہر زیر تعلیم کی اس آگہی کا نتیجہ ہے جو لوک سبھا میں پہلے ہی دی گئی تھی اور جس پر یونیورسٹی کی انتظامیہ نے اب مہر تصدیق ثبت کی ہے۔

مجلس شوریٰ اس پر انتہائی افسوس کا اظہار کرتی ہے کہ مرکزی حکومت کے عندیہ کے مطابق یونیورسٹی کے ذمہ داروں نے حالات کو سلجھانے کے بجائے انہیں الجھانے کی پالیسی اختیار کی ہے یہ طرز عمل نہ تو یونیورسٹی کی انتظامیہ کی شایان شان ہے جس کا حقیقی منصب طلبہ کے تعلق سے شفقت و محبت و عفو و درگذر کا متقاضی ہے۔ نہ ان طریقوں سے خود احتسابی پیدا ہو سکتی ہے نہ حالات کے معتدل پر آنے کا وہ ماحول پیدا ہو سکتا ہے جس کے لیے بزعم خود وائس چانسلر نے یونیورسٹی کو دفعۃً بند کر دیا تھا ستم ظریفی یہ ہے کہ طلبہ کے اخراج کے لیے جن الزامات کا سہارا لیا گیا ہے وہ تمام تر اس واقعہ سے متعلق ہیں جو ۳ مارچ سے ۵ مارچ تک فیکلٹی آف سائنس کے ڈین کے خلاف احتجاج کے طور پر پیش آیا تھا اور جس کے متعلق طلبہ کی یونین ایگزیکٹیو نے تحریری طور پر اظہار تاسف کر لیا تھا اور معافی مانگ لی تھی۔

یہ عجیب انصاف ہے کہ ایک شخص کے خلاف احتجاج کو بہانہ بنانے پر اصرار ہے جبکہ طلبا خود اپنی بعض غلطیوں کے لیے معذرت خواہ ہیں ۔ اور یہ عجیب جمہوریت ہے کہ محض ایک فرد کے لیے نو ہزار طلبار کی زندگیوں سے کھیلا جا رہا ہے ۔

مجلس شوریٰ طلبار اور اساتذہ کے خلاف اس تمام کارروائی کو غیر منصفانہ، غیر جمہوری اور ملک و ملت کے لیے انتہائی مضر قرار دیتی ہے اور یہ سمجھتی ہے کہ اس طرز عمل کی پشت پر غالباً طلبہ سے اور مسلمانوں سے ان کے اس جرم کا انتقام لینا ہے کہ وہ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے سلسلے میں حکومت سے اپنا حق کیوں مانگتے ہیں !

مرکزی مجلس شوریٰ کا یہ اجلاس ان طلبار اور اساتذہ سے جو اس کارروائی کا شکار ہوئے ہیں پوری ہمدردی رکھتا ہے اور اسے یقین ہے کہ تمام غیر جانبدار اور انصاف پسند حلقے اس پر اپنی ناراضگی کا اظہار کریں گے ۔ یہ اجلاس ارباب حل و عقد سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ طلبار کی زندگیوں سے نہ کھیلیں اور یونیورسٹی کو اس انجام سے بچائیں جس کی طرف محترم وائس چانسلر اور وزیر تعلیم نہایت تیزی سے اسے لے جا رہے ہیں ۔

مجلس شوریٰ کو توقع ہے کہ طلبار اشتعال انگیزی کے ہر موقع پر اپنی مادر درس گاہ کے وقار کا خیال رکھیں گے اور نظم و ضبط اور سنجیدگی کو ہاتھ سے نہ جانے دیں گے جو عام طور پر اس وقت تک ان کی امتیازی خصوصیت رہی ہے ۔

آمد و صرف کی رپورٹ مع رپورٹ آڈیٹر

اس کے بعد سال گذشتہ (اپریل ۷۲ء تا مارچ ۷۳ء) کے بجٹ کی روشنی میں مرکزی بیت المال کے آمد و صرف کی رپورٹ مع رپورٹ آڈیٹر پیش کی گئی ۔ اور توضیح طلب باتوں کی وضاحت کی گئی ۔

آڈیٹر کا تقرر

جناب محمد عبدالحی صاحب نے جو اب تک جماعت کے آڈیٹر تھے اور اپنی صحت کی خرابی، نظر کی کمزوری اور نجی مصروفیات کی بنا پر اس ذمہ داری سے سبک دوشی کی خواہش کی تھی جسے منظور کر لیا گیا اور ان کی جگہ جناب احسان محمد خان صاحب علی گڈھ کو آڈیٹر مقرر کیا گیا ۔

مشاہرہ کمیٹی کی رپورٹ

ملک میں روز افزوں گرانی کے پیش نظر اجلاس شوریٰ نومبر ۷۲ء میں ایک مشاہرہ کمیٹی تشکیل دی گئی تھی جسے مشاہروں اور دیگر متعلقہ امور پر نظر ثانی کرنا تھی۔ اس کمیٹی کی رپورٹ شوریٰ میں پیش ہوئی اور غور و خوض اور بحث کے بعد متعدد فیصلے کیے گئے

کل ہند اجتماع

کل ہند اجتماع کا مسئلہ زیر غور آیا۔ مختلف پہلو سامنے آئے۔ طے ہوا کہ کل ہند اجتماع ان شاء اللہ نومبر ۷۴ء میں دہلی میں منعقد ہوگا۔ اجتماع کے ناظم جناب عبدالرزاق لطیفی صاحب ہوں گے۔

خصوصی اجلاس شوریٰ

الیکشن اور جماعت کی پالیسی وغیرہ سے متعلق موضوعات پر غور کرنے کے لیے مرکزی مجلس شوریٰ کا ایک خصوصی اجلاس ۱۰ ستمبر ۷۳ء سے بنگلور میں منعقد ہوگا۔

مقامی جماعتوں کا بجٹ

طے ہوا کہ پانچ ہزار سے زائد سالانہ آمدنی ہونے کی صورت میں مقامی جماعتیں لازماً اپنا بجٹ بنائیں اور جہاں رقم کے تحفظ کی اور کوئی قابل اطمینان صورت نہ ہو وہاں حساب بینک میں رکھا جائے۔

ارکانِ شوریٰ کے مشورے

جماعت کے رفقاءِ کار اور اس کے داخلی و خارجی حالات کے سلسلے میں ارکان شوریٰ نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا اور مختلف مشورے دیے جنہیں نوٹ کر لیا گیا۔

بجٹ

جماعت اسلامی ہند کا سال رواں (یکم اپریل ۷۳ء تا ۳۱ مارچ ۷۴ء) کا مجوزہ بجٹ پیش کیا گیا جسے مناسب ترمیم و اضافے کے بعد منظور کر لیا گیا۔ اس میں ۲۷ر۸۰۰/ کا خسارہ تھا جسے قرض لیکر اور رفقاء کی اعانتوں سے پورا کیا جاسکے گا۔

شرکاءِ اجلاس

درج ذیل ارکان شوریٰ شریک اجلاس ہوئے۔

۱۔ جناب ٹی کے عبداللہ مولوی (کیرلہ)	۲۔ جناب سراج الحسن صاحب (میسور)
۳۔ جناب عبدالعزیز صاحب (تامل ناڈو)	۴۔ جناب محمد عبدالرزاق لطیفی صاحب (آندھرا)

(۵) جناب محمد شفیع صاحب مونس (یوپی) (۶) جناب فضل الرحمن صاحب فریدی (الیکڈمو)

(۷) جناب مولانا سید حامد علی صاحب (مرکز) (۸) جناب سید حامد حسین صاحب (مرکز)

(۹) جناب محمد مسلم صاحب (دعوت) (۱۰) جناب مولانا صدر الدین صاحب (ادارہ تصنیف علیگڈھ)

(۱۱) جناب مولانا سید احمد عروج قادری صاحب (زندگی) (۱۲) جناب محمد عبد الحی صاحب (رامپور)

(۱۳) جناب شمس پیرزادہ صاحب (مہاراشٹر) (۱۴) جناب محمد یوسف صدیقی صاحب (مدیہ یدپی)

(۱۵) جناب انعام الرحمن خاں صاحب (مدھیہ پردیش) (۱۶) افضل حسین صاحب (قیم جماعت اسلامی)

مولانا ابو اللیث صاحب اصلاحی ندوی اپنی معذوریوں، جناب محمد نجات اللہ صدیقی صاحب علی گڈھ اپنی والدہ محترمہ کی شدید علالت، جناب عبد الفتاح صاحب (بنگال) بنگلا اشاعتی اسکیم میں غیر معمولی مصروفیات کی وجہ سے شریک اجلاس نہ ہوسکے۔

۱۲ مئی ۷۳ء نصف شب کے قریب دعا پر اجلاس برخاست ہوا۔

والسلام

افضل حسین قیم جماعت اسلامی ہند

۱۷ مئی ۷۳ء

تاریکیوں میں ایک چراغ

ماہنامہ مارگ دیپ رام پور

زیر ادارت: منظور فاخر، بی اے

- ہندی زبان میں اسلامی تعلیمات و افکار کی دل نشین تشریح
- پاکیزہ کہانیاں اور تعمیری نظمیں
- مارگ دیپ آپ کے دار المطالعہ و لائبریری کے لیے ایک ضروری میگزین
- مارگ دیپ ہندی داں ناظرین اور غیر مسلم دوستوں کو پیش کرنے کے لیے ایک گرانقدر تحفہ

صفحات میں اضافہ کے ساتھ۔ قیمت فی شمارہ ۵۰ پیسے، سالانہ زر اشتراک صرف ۵/=

اس پتہ پر بھیج کر طلب فرمائیں۔

منیجر مارگ دیپ، روشنی پبلشنگ ہاؤس، خسرو باغ روڈ، رامپور یوپی

سالانہ رپورٹ جماعت اسلامی ہند

حلقہ اترپردیش

جماعت اسلامی بے کم و کاست پورے دین اسلام کو قائم کرنے اور باطن سے لیکر ظاہر تک انسان کی پوری انفرادی و اجتماعی زندگی کو اللہ کی رضا اور اس کی ہدایت کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے ملک میں کام کر رہی ہے۔

اسلام افراد کے ظاہر و باطن کی اصلاح اور ان کی اخروی فلاح و نجات کا ضامن ہونے کے ساتھ مکمل اور بہترین نظام زندگی بھی ہے وہ انسانی سماج کے تمام پیچیدہ مسائل کو بحسن و خوبی حل کرتا اور بلا امتیاز رنگ و نسل تمام افراد، اصناف اور طبقات کے لیے عدل و قسط خیر و صلاح اور تعمیر و ارتقا کا بہترین سامان فراہم کرتا ہے۔ ہمارا ملک جن مسائل سے دوچار ہے اور ملک کے افراد جس فکری، اخلاقی، معاشرتی اور معاشی بحران میں مبتلا ہیں یقیناً اسلام ان کا بہترین اور موزوں حل ہے۔

اس مقصد کے لیے جماعت اسلامی حلقہ اترپردیش نے اپنے اخلاقی، تعمیری اور پرامن ذرائع سے کام لے کر اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق جو جد و جہد کی ہے اور اللہ کے فضل و کرم سے اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہو سکا افادۂ عام کے لیے اس کی رپورٹ پیش کی جاتی ہے۔

حلقہ اترپردیش گورکھپور، الہ آباد، لکھنؤ، بریلی، میرٹھ ۵ ڈویژنوں پر مشتمل ہے۔ ہر ڈویژن ایک ہمہ وقتی ناظم کے تحت ہے۔ گورکھپور اور میرٹھ ڈویژنوں میں ایک ایک ضلعی ناظم بھی ہیں گورکھپور ڈویژن کے ناظم ہمہ وقتی اور میرٹھ ڈویژن کے ناظم اعزازی ہیں۔ باقی ضلعوں میں بھی اکثر اعزازی ضلعی ناظم ہیں لیکن یہ ضلعی نظم ابھی پوری طرح موثر نہیں ہے۔ اس کے علاوہ شعبہ نشر و اشاعت اور مضرات کے لیے ایک ہمہ وقتی ناظم شعبہ طلبہ کے لیے ایک اعزازی ناظم ہیں،

اور شعبہ خواتین بھی ایک اعزازی ناظمہ کے تحت ہے۔ مقامی جماعتیں ۱۱۰ اور ارکان حلقہ ۱۹۲ ہیں جن میں مرد ارکان ۱۶۱ اور خواتین ارکان ۳۱ ہیں۔

شروع سال میں ارکان کی مجموعی تعداد ۱۶۲ تھی اور بحیثیت مجموعی ۳۰ ارکان کا اضافہ دورانِ سال میں ہوا۔

تنظیمی حلقہ نے جماعت کے چار سالہ پروگرام اور اپنی ضرورتوں اور حالات و وسائل کے پیش نظر ڈیڑھ سالہ پروگرام طے کیا ہے جو اکتوبر ۷۲ء سے نافذ ہوا اور مارچ ۷۴ء تک جاری رہے گا عملی سرگرمیوں اور ان کے نتائج کی تفصیل یہ ہے:۔

مسلمانوں میں کام

اصلاح و تربیت

مسلمانوں کو جہاں، جس درجے میں بھی دین سے لگاؤ ہے اور ان کی زندگی میں اس کا جتنا اثر پایا جاتا ہے اسے برقرار رکھنے اور پروان چڑھانے کی کوششوں کے ساتھ مسلمان مردوں اور عورتوں کی اصلاح و تربیت کے سلسلے میں کوشش کی گئی تا کہ ان کے اندر دین کا صحیح علم و شعور پیدا ہو، ایمانیات میں پختگی آئے اور وہ بدعات و خرافات سے اجتناب کریں۔ اسلامی عقائد و اقدار کے سلسلے میں ان کے شکوک اور تردد و تذبذب کا ازالہ ہو وہ نماز اور دیگر عبادات کا اہتمام کریں۔ ان کے اندر کی اخلاقی و معاشرتی خرابیاں دور ہوں اور اونچ نیچ، بے پردگی اور غیر ساتر لباس، نیز شادی، بیاہ اور دیگر مواقع سے متعلق غیر اسلامی اور مسرفانہ رسوم جیسی برائیوں سے ان کی زندگیاں پاک ہو جائیں، ان میں اسلامی کردار پیدا ہو، باہمی تعلقات درست ہوں، اسلامی اخوت کا رشتہ مضبوط ہو، ان کے مختلف مکاتب فکر اور جماعتیں ایک دوسرے سے قریب آئیں اور وہ دینی بنیاد پر متحد و منظم ہوں۔

اس مقصد کے لیے انفرادی اور بشکل وفود ملاقاتوں، تقریروں، خطابات عام اور تعلیم یافتہ اور منتخب افراد کو خطاب، مذاکراتی نشستوں، درس قرآن و حدیث، سیرت اور اسلامی لٹریچر کے مطالعہ اور امیر حلقہ اور نظماء کے دوروں سے جو اوسطاً سوا ستر ہ دن ماہانہ رہے، کام لیا گیا۔

مسلمان بچوں اور بچیوں کی دینی تعلیم و تربیت کے لیے ۱۱۱ دینی درس گاہیں قائم ہیں جن میں ۱۰۴ بچوں کے لیے اور ۷ بچیوں کے لیے ہیں۔ یہ درس گاہیں سال کے آغاز میں بچوں کی ۷۲ اور بچیوں کی ۵ تھیں۔ دوران سال بچوں کی ۳۲ درس گاہوں اور بچیوں کی دو درس گاہوں کا اضافہ ہوا جبکہ ڈیڑھ سالہ پروگرام اکتوبر ۷۲ تا مارچ ۷۴ء میں ۳۵ درس گاہیں قائم کرنی ہیں۔

ناخواندہ اور نیم خواندہ بالغ مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ۳۱ مراکز تعلیم بالغان ہیں جبکہ مارچ ۷۴ء تک ۹۵ مراکز قائم کر لینے ہیں۔ شروع سال میں ان مراکز کی تعداد ۲۵ تھی جو دوران سال بڑھتی گھٹتی رہی اور اب ۳۱ ہے۔

یتیموں، بیواؤں، معذوروں کے لیے ایک امدادی فنڈ قائم ہوا ہے۔ ڈیڑھ سالہ پروگرام کی رو سے یہ فنڈ ۴ مقامات پر قائم کرنا ہے

افلاس اور پسماندگی دور کرنے کے لیے گھریلو چھوٹی صنعتوں کے قیام اور روزگار کی فراہمی کی کوشش ۳ جگہ کی گئی ہے۔ لکھنؤ ڈویژن میں جبونت نگر اور اٹاوہ اور بریلی ڈویژن میں شہر بریلی میں کام ہونے لگا ہے۔ جہاں سلائی کڑھائی سکھائی جاتی ہے۔ مارچ ۷۴ء کے اختتام تک مجموعی طور سے ۱۶ جگہ ان صنعتوں کے قیام اور فراہمی روزگار کی مناسب تدبیریں کرنی ہیں۔

بلاسودی قرضوں کی اسکیم ۸ مقامات پر چل رہی ہے جن میں ککرالہ، بلاری اور لکھنؤ میں یہ اسکیم پہلے ہی چل رہی تھی۔ بھلسہ ضلع بارہ بنکی، کانپور، شاہ آباد ضلع شاہجہاں پور، فتح پور اور جونپور میں اسکیم کا اجرا پروگرام کے نفاذ کے بعد دوران ششماہی ہوا ہے۔

امداد باہمی کے دو فنڈ الہ آباد ڈویژن میں اور ایک فنڈ گورکھپور ڈویژن میں قائم ہیں۔ یہ تینوں فنڈ پروگرام کے نفاذ کے بعد ہی قائم ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ مقامی وسائل سے کم از کم سات فنڈ اور قائم کرنے ہیں تاکہ مجموعی تعداد ۱۰ ہو سکے ——— جائز حدود میں حکومت کی ترقیاتی اور امدادی اسکیموں اور رفاہی انجمنوں اور اداروں کا بھی تعاون حاصل کرنا ہے مگر اس سلسلے میں ابھی کوئی قابل ذکر کوشش عمل میں نہیں لائی جا سکی ہے۔

صفائی ستھرائی اور حفظان صحت کا اہتمام کرانے اور طبی سہولت بہم پہنچانے کی طرف بھی توجہ کی گئی۔ اب تک طبی سہولت دس جگہ بہم پہنچائی جا سکی ہے جن میں شہر بریلی شامل ہے جہاں پہلے ہی اس کا

اہتمام تھا۔ باقی ۹ مقامات مودا وان ضلع اناؤ اور بارہ بنکی میں ایک ایک جگہ اور شہر کانپور میں دو جگہ باقاعدہ انتظام ہوگیا ہے اور بلریا گنج (اعظم گڈھ) گورکھپور، بہرائچ اور لکھنؤ میں ضمنی طور پر بندوبست کیا گیا ہے۔ مارچ ۸۴ء کے اختتام تک یہ سہولت مجموعی طور سے چالیس مقامات پر فراہم ہوجانی چاہیے۔

۵۰ مسجدیں ہیں جنھیں آباد کرنے اور ان کا انتظام کرنے کے سلسلے میں کوشش جاری ہے۔ پیش نظر یہ ہے کہ وہ تعلیم و تربیت کا مرکز بن جائیں تاکہ بنیادی تعلیم سے کوئی چھوٹا بڑا محروم نہ رہے یہ کوشش دوسری قابل توجہ مساجد کے سلسلے میں جاری رکھنی ہے۔

پروگرام کے نفاذ کے وقت سے اب تک کی جد وجہد کا نتیجہ یہ ہے کہ پوری شش ماہی میں قابل لحاظ حد تک اصلاح و تربیت ۲۰۵ افراد کی ہوئی ہے جن میں ۱۱۳ مرد اور ۹۲ خواتین ہیں جبکہ مارچ ۸۴ء کے اختتام تک ۴۰۰ مسلمان مردوں اور عورتوں کی اصلاح و تربیت کی کوشش عمل میں لانی ہے۔

منتخب بستیوں اور محلوں میں کام

اصلاح و تربیت کی ہمہ جہتی اور پروگرام کے زیادہ سے زیادہ اجزاء زیر عمل لانے کے لیے حسب ذیل منتخب بستیوں پر خصوصی توجہ کی گئی ہے جہاں کچھ نہ کچھ ہونے لگا ہے۔

گورکھپور ڈویژن۔ بلریا گنج ضلع اعظم گڈھ میں لوگوں کو اصول صحت پر کاربند ہونے اور صفائی ستھرائی رکھنے کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ دو چار بار عملاً بھی صفائی ستھرائی کی گئی۔ طبی سہولت کا ضمنی انتظام ہے۔ لائبریری قائم ہے۔ مسجد کی دیکھ بھال کا انتظام ہے۔ بچیوں کا مدرسہ ہے اور بچوں کی تعلیم کے سلسلے میں جامعۃ الفلاح سے استفادہ کیا جاتا ہے۔

کریم پور۔ بچوں کی درس گاہ ہے تعلیم بالغان کا نظم ہے۔ مسجد کو تعلیم و تربیت کا مرکز بنایا گیا ہے شکرولی۔ نماز کی طرف سے بے توجہی تھی۔ مسجد کی تعمیر شروع کی گئی جو مکمل ہوگئی ہے اور نماز باجماعت کا اہتمام کیا جانے لگا ہے۔

لکھنؤ ڈویژن۔ کانپور کے محلہ بابو پوروہ میں لوگوں کے حالات اور ان کی ضروریات کا جائزہ لیا گیا۔ ایک فنڈ ہے جس سے ضرورتمندوں کی امداد کی جائے گی اور تدریجاً پروگرام کے مختلف اجزاء

زیر عمل لائے جائیں گے۔

موراواں ضلع اناؤ کے ایک محلہ میں طبی سہولت کا انتظام ہے۔ مستحقین کی امداد کی جانے لگی ہے۔ تعلیم بالغان کا مرکز ہے۔ قصبہ میں رفقاء کی زیر نگرانی دینی درس گاہ چل رہی ہے۔ لائبریری کا نظم ہے۔ غیر مسلمین میں بھی حق بات اچھی رفتار سے پہنچ رہی ہے۔ پیش نظر یہ ہے کہ آگے چل کر پورے ہی قصبہ کو ملی جلی منتخب بستی کی شکل دے دی جائے۔

الہ آباد ڈویزن — چک ہیبت پور ضلع فتحپور میں مسجد کو تعلیم و تربیت کا مرکز بنایا گیا ہے۔ نمازیوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا۔ مدرسہ قائم کیا گیا۔ مختلف معروف ذرائع سے کام لیکر لوگوں کو بری عادات سے باز رکھنے کی کوشش کی گئی۔ بہت سے لوگ جوے کی لت سے پرہیز کرنے لگے ہیں۔ نوجوانوں کی صورت و سیرت دونوں میں تبدیلی کے آثار ظاہر ہونے لگے ہیں۔ خواتین بھی اصلاح و تربیت کی طرف متوجہ ہو رہی ہیں اور بات سننے اور سمجھنے کی کوشش کرنے لگی ہیں۔

معروف پور ضلع جون پور میں پہلے ہی سے ایک بیج گو دام تھا جس کا نظم بہتر بنایا گیا۔ مدرسہ قائم کیا گیا ہے۔ اب تعلیم بالغان کے نظم، صفائی ستھرائی کے کام کی جانب توجہ دی جائے گی۔ گاؤں میں ایک گروپ کی طرف سے مخالفت کا اظہار بھی ہو رہا ہے جنہیں احسن طریقے سے سمجھانے اور قریب لانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

بریلی ڈویزن۔ ککرالہ میں درس گاہ ہے جس کے متصل محلہ میں تعلیم بالغان کا نظم ہے۔ بلاسودی قرض کی اسکیم جاری ہے۔ طبی سہولت کے لیے دو رفیق ڈاکٹروں نے ایک ایک گھنٹہ روزانہ فری ڈسپنسری کے لیے دینا طے کیا ہے۔ مقامی بیت المال سے حاجتمندوں کی حسب گنجائش امداد کی جاتی ہے۔ پیش نظر یہ ہے کہ آئندہ ایک الگ امدادی فنڈ قائم کیا جائے۔ لائبریری قائم ہے۔ طلبہ و خواتین کے پروگرام چلتے ہیں۔

ذکاتی محلہ بریلی میں بچوں اور بچیوں کی ایک درس گاہ ہے۔ علاج معالجہ کا انتظام ہے۔ طلبہ طالبات اور خواتین کی اصلاح و تربیت کے پروگرام چلتے ہیں۔ لائبریری قائم ہے، مسجد کی دیکھ بھال کا بھی نظم ہے۔ مسجد درس گاہ سے بالکل ملحق ہے جہاں اصلاح و تربیت کے مختلف پروگرام چلتے اور اجتماعات ہوتے رہتے ہیں۔ اس لیے مسجد کو تعلیم و تربیت کا مرکز بنانے کا مقصد حاصل ہے۔

لڑکیوں اور خواتین کو سلائی کڑھائی کا کام سکھایا جاتا ہے۔

میرٹھ ڈویژن۔ محلہ لوہاری سرائے نگینہ ضلع بجنور میں ناخواندہ نیم خواندہ بالغان کے دو مرکز ہیں۔ ایک تعلیمی مرکز طالبات کے لیے ہے۔ ایک اور مرکز ہے جہاں ایک خاتون آٹھ دس بہنوں کو دین کی باتیں سکھاتی ہیں۔ ایک شبینہ اسکول ہے جہاں دو معلمین بامعاوضہ کام کرتے ہیں۔ بچیوں کا بھی ایک جز وقتی مکتب قائم کیا گیا ہے جہاں ایک معلمہ اور ۲۱ طالبات ہیں۔ ہمارے مقامی رکن جماعت کے زیر نگرانی ایک سوسائٹی "فرینڈ سوسائٹی" کی تشکیل ہوئی ہے۔ سوسائٹی ۴ طالبات کو ماہانہ وظائف دیتی ہے۔

علی گڈھ مسلم یونیورسٹی ایریا کے انوار ہدیٰ کمپاؤنڈ میں صفائی ستھرائی اور مسجد کی دیکھ بھال کا نظم ہے جہاں دینی اصلاح و تربیت کا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے بچوں کا مکتب جاری ہے۔

شہر آگرہ میں غالب پورہ خورد اور غالب پور کلاں دو منتخب محلے ہیں جہاں مسلمانوں کے درمیان نزاعات دور کرانے کی کوشش کی گئی۔ تین جھگڑے بہت بڑے اور پیچیدہ تھے جو عدالت میں پہنچ گئے تھے ان میں مصالحت کرائی گئی۔ بچوں کی درس گاہ ہے جہاں تین اساتذہ تعلیم دیتے ہیں طلبہ، نوجوانوں اور خواتین کی اصلاح و تربیت کے پروگرام چلتے ہیں۔

یہ ۱۲ بستیاں اور محلے ہیں جہاں عملاً کچھ نہ کچھ کام ہونے لگا ہے۔ پروگرام کی رو سے جہاں یہ ضروری ہے کہ ان بستیوں میں اصلاح و تربیت کے پروگرام اپنے مختلف اجزاء کے ساتھ زیر عمل لائے جائیں وہیں مزید پندرہ محلوں اور بستیوں کو خصوصی توجہ کا مرکز بنانا ہے تاکہ ختم مارچ ۸۴ء تک کم از کم ۲۷ تک تعداد پہنچ جائے

متفق سازی

اپنے دینی و اصلاحی اور خدمت خلق کے کاموں میں عملی تعاون حاصل کرنے کے لیے دوران سال ۱۳۱ مردوں اور ۴۲۰ عورتوں کو باقاعدہ متفق بنایا گیا۔ شروع سال میں ان کی تعداد ترتیب ۳۱۹۳ اور ۱۶۹۱ تھی۔ اس طرح اب متفقین کی کل تعداد ۵۰۸۹ ہے۔

دوران سال متفق مردوں کے ۲۸ اور خواتین کے ۱۳ حلقے قائم ہوئے۔ مردوں کے ۴۷ اور

خواتین کے ۵۴ حلقے پہلے ہی سے قائم ہیں۔ اس طرح مردوں کے ۱۰۲ اور خواتین کے ۵۸ ملا کر کل حلقہ متفقین ۱۶۰ ہو گئے ــــ پیش نظر یہ ہے کہ قائم شدہ حلقے زیادہ سے زیادہ وسیع اور مستحکم ہوں اور مزید حلقے قائم کیے جاتے رہیں تاکہ متفقین کی اصلاح و تربیت اور جماعت کے دینی و اصلاحی اور خدمت خلق کے کاموں میں زیادہ سے زیادہ تعاون حاصل ہو سکے۔

طلبہ اور طالبات کے حلقے

طلبہ و طالبات کی دینی و اخلاقی تربیت، معاشرتی اصلاح کے اہتمام اور اسی مقصد کے پیش نظر کہ ہمیں ان پروگراموں کا ان کا عملی تعاون حاصل ہو، ان کے الگ الگ نئے حلقے قائم کرنے اور قائم شدہ حلقوں کو منظم اور مستحکم کرنے کی کوشش کی گئی۔ نظم و باقاعدگی کے لحاظ سے جو حلقے بہتر حالت میں ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

گورکھپور ڈویژن میں۔ گورکھپور، گونڈہ، لار ضلع دیوریا اور بڑیا گنج ضلع اعظم گڈھ

الٰہ آباد ڈویژن میں۔ الٰہ آباد فتحپور

لکھنؤ ڈویژن میں۔ کانپور، اٹاوہ، لکھیم پور، موراواں ضلع اناؤ، لکھنؤ اور رحیم آباد ضلع لکھنؤ

بریلی ڈویژن میں۔ بریلی، گکرالہ اور اجلی پور ضلع بدایوں اور شاہ آباد ضلع شاہجہاں پور۔

میرٹھ ڈویژن میں۔ آگرہ، میرٹھ، متھرا، مظفر نگر اور بلند شہر

یہ کل ۱۲ باقاعدہ حلقے ہیں ان کے علاوہ ۴۷ حلقے اور ہیں مگر نظم و باقاعدگی کے لحاظ سے ان کی حالت مزید توجہ کی طالب ہے۔ اس طرح طلبہ کے حلقوں کی مجموعی تعداد ۶۰ ہے جن میں چالیس حلقے وہ ہیں جو پہلے ہی سے قائم ہیں اور اپنا کچھ نہ کچھ کام کرتے رہے ہیں۔

پیش نظر مقصد کے لیے کام کرنے والی علیگڈھ کی ایک نیم آزاد اور رام پور کی ایک آزاد تنظیم سے بھی ربط رہا اور ان کا تعاون حاصل کرنے اور ان کے ساتھ تعاون کرنے کی کوشش جاری رہی۔ ڈیڑھ سالہ پروگرام کی رو سے طلبہ کی کم از کم ایک آزاد اور ۹ نیم آزاد مزید تنظیموں سے ربط پیدا کرنا ہے اور باہمی تعاون کی راہیں نکالنے کی کوشش کرنی ہے۔

ہمارا شعبہ طلبہ ایک اعزازی ناظم کے زیر نگرانی ہے۔ دوران سال میں گورکھپور ڈویژن میں ڈویژن کی سطح پر اور لکھنؤ اور بریلی اور میرٹھ ڈویژنوں میں نصف نصف ڈویژن کی سطح پر اجتماعات ہوئے

اور ناظم شعبہ کی نگرانی میں پروگرام چلائے گئے ۔ آئندہ ماہ مارچ کے ختم تک دوسرے ڈویژنوں میں بھی ایک ایک اجتماع ڈویژن کی سطح پر اور ایک ایک نصف ڈویژن کی سطح پر کرنا ہے توقع ہے کہ یہ تمام اجتماعات بھی ناظم شعبہ کی نگرانی میں منعقد ہوں گے ۔ ان شاء اللہ

طلبہ کے اجتماعات کی شرکت کے علاوہ ناظم شعبہ نے چند مقامات کا دورہ بھی کیا ۔ کہیں ایک بار اور کہیں دو بار اور کہیں اس سے زیادہ مرتبہ گئے اور کاموں کی دیکھ بھال کے مقامات حسب ذیل ہیں گورکھپور، گونڈہ، الہ آباد، مرزاپور، فتح پور، بنارس، کانپور، رام پور، آگرہ، متھرا، سہارنپور مظفر نگر، میرٹھ اور سنبھل ضلع مراد آباد

ناظم شعبہ کے علاوہ ان کے کچھ منتخب طالب علموں نے بھی اس کام میں معاونت کی اور مختلف مقامات پر جاکر وہاں کے کاموں میں مدد دی ۔ علیگڈھ کے طلبہ کی تنظیم کی طرف سے ایک کانفرنس کے انعقاد کا اعلان ہوا تھا جہاں مختلف علاقوں اور مقامات کے طلبہ کی شرکت متوقع تھی لیکن یونیورسٹی کے بند ہوجانے کی وجہ سے طلبہ کی تنظیم نے اپنی کانفرنس ملتوی کر دی جو ان شاء اللہ بعد میں کسی موزوں وقت پر بلائی جائے گی ۔

خواتین کے حلقے

خواتین میں دینی اخلاقی اور خدمت خلق کے کام انجام دینے اور انھیں رفتہ رفتہ تحریک کے قریب لانے کے لیے دوران سال ان کے تیرہ حلقوں کا نظم ہوا ۔ ۵۷ حلقے پہلے ہی قائم ہو چکے تھے ۔ اس طرح اب حلقہ ہائے خواتین کی مجموعی تعداد ۸۵ ہے ۔ جبکہ آئندہ ماہ مارچ کے اختتام تک کم از کم ساٹھ حلقوں کا نظم ہو جانا ضروری ہے ۔

یہ شعبہ بھی باقاعدہ ایک اعزازی ناظمہ کی زیر نگرانی ہے ۔ ناظمہ کی نگرانی میں بریلی ڈویژن میں بریلی گنگا اور بدایوں میں دو دو روزہ سہ روزہ خواتین کے تربیتی اجتماع ہوئے ۔ رام پور میں بھی ایک ایسا ہی اجتماع کیا جائے گا ۔ یہاں ناظمۂ شعبہ دینی تعلیم کے موضوع پر طالبات و معلمات اور خواتین سے خطاب کر چکی ہیں ۔

الہ آباد ڈویژن میں ڈویژن کی سطح پر ایک اجتماع الہ آباد میں ہوا ۔ اس کے علاوہ ناظمہ شعبہ نے ایک دورہ فتحپور کا بھی کیا ۔ (باقی صلا پر)

محترم امیر جماعت اسلامی ہند کا مکتوب

بنام وزیر اعظم ہند

جماعت اسلامی ہند۔ بازار مفتی کفایت اللہ دہلی ۶ ——— مورخہ ۲۱ مئی ۱۹۷۳ء

مادام! آداب

۱۹ مئی ۷۳ء کو سیتا پور میں آپ نے مسلمانوں کو مبینہ طور پر یقین دلایا ہے کہ حکومت ان کے پرسنل لا میں ترمیم و تبدیلی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی (ترمیم و تبدیلی کی یہ بات) محض اپوزیشن پارٹیوں کا گمراہ کن اور شر انگیز پروپیگنڈا ہے۔" ہندوستان ٹائمز

پیٹریٹ میں شائع ہونے والی ایک اور رپورٹ میں کہا گیا ہے "حکومت کی طرف سے اس اعلان کے باربار اعادے کے باوجود کہ وہ اس طرح کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی مسلمانوں میں جان بوجھ کر منصوبہ بند طریقے سے یہ غلط فہمی پھیلانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ حکومت ان کے پرسنل لا میں ترمیم کرنے جارہی ہے" مدر لینڈ کے مطابق آپ نے کہا ہے "مسلم پرسنل لا کو تبدیل نہیں کیا جائے گا۔ اور مسلمانوں کو اس ضمن میں کسی طرح کا کوئی خدشہ محسوس نہیں کرنا چاہیے۔" آپ نے مزید کہا ہے۔" پارٹی کے احمد آباد اجلاس میں میں نے جو وعدہ کیا ہے میں اس کی سختی کے ساتھ پابند ہوں۔"

ان رپورٹوں کی روشنی میں دو باتیں سامنے آتی ہیں

۱۔ یہ کہ حکومت مسلم پرسنل لا میں ترمیم کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی اور

۲۔ یہ کہ اپوزیشن پارٹیاں غلط پروپیگنڈہ کر رہی ہیں اور مسلمانوں میں غلط فہمیاں پھیلائی جارہی ہیں کیا میں اس ضمن میں آپ کو قانون کمیشن کے چیرمین ڈاکٹر گجیندر گدکر اور وزیر قانون مسٹر ایچ آر گوکھلے کے بیانات یاد دلانے کی جسارت کر سکتا ہوں؟ (ان بیانات کی روشنی میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ) اس معاملہ میں اپوزیشن پارٹیوں کو گھسیٹنا ناانصافی ہوگی۔

میں انتہائی ادب و احترام کے ساتھ یہ بھی عرض کروں گا کہ ممبئی کے آل انڈیا مسلم پرسنل لا کنونشن کا اہتمام کرنے والے رہنماؤں (۵،۶) ممتاز مسلمانوں (ناموں کی فہرست منسلک ہے) اور اس میں شرکت کرنے والے تمام مسلمانوں کے تعلق سے یہ تاثر دینا کہ وہ محض دوسروں کے ہاتھ کا کھلونا تھے۔ ان کی بصیرت فکر و فہم اور عزت نفس کی کھلی ہوئی اہانت کے مرادف ہے۔

امر واقعہ تو یہ ہے کہ مسلمانوں کے خدشات حقیقی ہیں۔ مسلمان اس اسلامی عقیدے کی وجہ سے متحرک ہیں کہ اگر وہ احکامات ربانی کے خلاف عمل کرتے ہیں تو وہ اس دنیا میں بھی نقصان اٹھائیں گے اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی خسارہ میں رہیں گے لیکن اگر وہ ان احکامات پر عمل کرتے ہیں تو انہیں اس دنیا میں مبعوث کیے جانے والے تمام انبیاء و صلحاء اور ان تمام شہداء کی ابدی معیت حاصل ہوگی جنھوں نے اللہ کی رضا کے حصول کے لیے اپنی جانیں قربان کی ہیں۔ علاوہ ازیں انہیں جنت نعیم میں اپنے اعزا و اقربا کا ابدی قرب نیز اللہ تبارک و تعالیٰ کا دیدار بھی ہمیشہ نصیب ہوتا رہے گا۔

یہی یقین و عقیدہ حال ہی میں جماعت اسلامی ہند کی دعوت پر ممبئی میں سات ہزار مسلم خواتین کے اجتماع اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا کنونشن کے فیصلوں کی غیر مشروط توثیق و تائید کا محرک بنا تھا۔ خواتین کے اس طرح کے تائیدی اجتماعات دوسرے مقامات پر بھی ہو چکے ہیں۔

ان اعلانات سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ مسلمانوں کے خدشات حقیقی نوعیت کے ہیں اور ان کی بنیاد حکومت سے وابستہ کچھ اصحاب کے بعض بیانات پر بھی ہے اور اس بات پر بھی کہ مسلمانوں کی شدید مخالفت کے باوجود اب تک حکومت کی طرف سے یہ اعلان نہیں کیا گیا ہے کہ مجوزہ متبنیٰ بل کا اطلاق ان پر نہیں ہوگا۔

کسی قول کی صداقت عمل سے پرکھی جاتی ہے اس لیے اگر حکومت اپنی نیت میں مخلص ہے اور میرا مقصد حکومت کی مذمت ہرگز نہیں ہے ـــــ تو اسے مزید وقت ضائع کیے بغیر یہ اعلان کرنا چاہیے کہ مجوزہ متبنیٰ بل کی دفعات کا اطلاق ہندوستانی مسلمانوں پر نہیں ہوگا۔ اس سے ان کے خدشات کا کم از کم ایک حد تک ازالہ ہو جائے گا۔

نیک خواہشات کے ساتھ آپ کا مخلص

(دستخط) محمد یوسف، امیر جماعت اسلامی ہند

مسلمانانِ ہند کے تعلیمی مسائل

ظفر احمد صدیقی سکریٹری دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش۔ صفحات ۵۲ قیمت ۵۰ پیسے۔ ناشر: دینی تعلیمی کونسل۔ ۹۹۔ گوئن روڈ لکھنؤ

ہندوستان میں تعلیم یافتہ مسلمانوں کا شاید ہی کوئی طبقہ ایسا ہو جو جناب ظفر احمد صدیقی سے ناواقف ہو موصوف مسلمانوں کے ان رہنماؤں میں سے ایک ہیں جن کا خلوص شک و شبہہ سے بالاتر ہے۔ اس وقت ہندوستان کے مسلمان جن پیچیدہ مسائل میں گھرے ہوئے ہیں ان میں سے شاید کوئی ایک مسئلہ بھی ایسا نہیں ہے جس کو حل کرنے کی کوشش میں موصوف آگے آگے نہ ہوں اور جہاں تک تعلیمی مسئلے کا تعلق ہے وہ چند گنے چنے ماہرین میں سے ایک ہیں۔

ان کا یہ کتابچہ پر معلومات اور مسلمانانِ ہند کے تعلیمی مسائل سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے بہت مفید ہے۔ انھوں نے پیش لفظ میں لکھا ہے:- "اس مضمون میں دورِ حاضر کے تعلیمی مسائل حکومت کی تعلیمی پالیسیوں اور ان کی خامیوں کا مجمل تذکرہ مع حوالہ جات کے کیا گیا ہے تاکہ ملتِ اسلامیہ کے فرزندوں کو یہ اندازہ ہو سکے کہ حالات کیا ہیں اور ان حالات میں ہماری کیا ذمہ داری ہے اور موجودہ حالات میں مسلمانوں کو اپنی نئی نسلوں کی صحیح تعلیم کے لیے کیا اقدام کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں کچھ تجاویز بھی پیش کی گئی ہیں"

کتابچہ کی ابتدا میں "تعلیم کے اثرات" کے عنوان سے یہ واضح کیا گیا ہے کہ انسانی زندگی بنانے یا بگاڑنے میں تعلیم کی اہمیت کیا ہے۔ اچھی تعلیم انسانی زندگی کو سنوارتی ہے اور بری تعلیم اسے بگاڑ کر رکھ دیتی ہے۔ انھوں نے اس سلسلے میں دنیا کے مشہور دانشوروں کے جو اقوال نقل کیے ہیں ان میں افلاطون کا یہ قول بھی ہے۔

"تعلیم کا اثر انسان پر اتنا پڑتا ہے کہ اگر اسے صحیح تعلیم و تربیت دی گئی تو اس میں فطری اور طبعی صفات نمودار ہوتی ہیں لیکن اگر انسان کو غلط تعلیم دی گئی تو انسان خطرناک درندہ یا جنگلی جانور بن جاتا ہے۔" (پرنسپلس آف ایجوکیشن ص۲)

افلاطون کے اس قول کی صداقت جانچنے کے لیے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہندوستان کا ہر شہر اس قول کا مصداق بنا ہوا ہے ۔۔۔ ہندوستان کی حکومت جس کلیت پسندانہ پالیسی پر چل رہی ہے اس کا ہدف تعلیم دا ہے بھی ہیں۔ موصوف نے حوالوں کے ساتھ اس پالیسی کو واضح کیا ہے۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے:-

کو ٹھاری کمیشن کی رپورٹ کا خلاصہ یہ ہے کہ اسکول یا تو سرکاری ہوں یا اسٹیٹ گورنمنٹ کی مرضی کے مطابق اور ان کے رحم و کرم پر ہوں ۔ اس صورت حال کا تقاضا کیا ہے؟ دراصل یہ کتابچہ اسی کا جواب ہے ۔

(بقیہ صفحہ ۶۰)

میرٹھ ڈویژن میں بھی ایک اجتماع مناسب وقت پر کیا جائے گا جو ڈویژن کی سطح پر ہوگا لکھنؤ ڈویژن میں ناظم شعبہ نے کانپور کے تربیتی پروگراموں میں بار حصہ لیا اور فتح گڈھ کا دورہ کیا ۔ اس ڈویژن میں ایک اجتماع ڈویژن کی سطح پر کیا جائے گا ۔ گورکھپور میں ڈویژن کی سطح پر ایک تربیتی پروگرام رکھنا تھا جو گذشتہ دنوں علاقہ کی فرقہ وارانہ فضا خراب رہنے کی وجہ سے ملتوی کیا جاتا رہا اب پیش نظر یہ ہے کہ ڈویژن میں تربیتی اجتماعات ضلعی سطح پر کیے جائیں ۔ خواتین میں کام کی اہمیت و وسعت کے پیش نظر ضرورت محسوس ہونے لگی ہے کہ ہر ڈویژن میں ناظم شعبہ کی معاونت کا باقاعدہ انتظام ہو ۔ الہ آباد ڈویژن میں انتظام ہو گیا ہے جہاں حسینہ خاتون صاحبہ گرونڈسی ضلع مرزا پور معاونت کر رہی ہیں ۔ انھوں نے الہ آباد، مرزا پور، بنارس اور مئو ضلع الہ آباد وغیرہ چند مقامات کا دورہ کیا اور خواتین کے کام کو دیکھا ۔

(باقی)

Monthly 'ZINDGI' Rampur, July 1973, Regd. No. [illegible]688

Only Title Printed at Shanker Press, Rampur

اگست سنہ ۱۹۷۳ع

ماہنامہ

زندگی رامپور

مدیر: سید احمد قادری

سالانہ چندہ
ہندوستان سے -/10
پاکستان سے -/10
ششماہی
ہندوستان سے -/5
پاکستان سے -/5
قیمت فی پرچہ -/1

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
دو ڈالر
ہوائی ڈاک سے

جلد ۵۱	جمادی الاخریٰ رجب ۹۳ھ مطابق اگست ۱۹۷۳ء	شمارہ: ۲

اس دائرہ ○ میں سرخ نشان کا مطلب ہے

آپکی مدت خریداری اس شمارے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ اگر آپکی طرف سے چندہ بند کرنے یا رسالہ بند کرنے کے لیے خط نہ مل سکا تو اگلا پرچہ ان شاء اللہ وی پی سے حاضر ہوگا۔ امید ہے کہ وی پی وقت پر وصول فرمائیں گے۔

منیجر زندگی رامپور یوپی

مالک و مہتمم اشاعت ایڈیٹر سید احمد صاحب قادری۔ پرنٹر پبلشر احمد حسن مطبع ناظم پریس باہر ناظر جنگ رامپور یوپی
مقام اشاعت دفتر زندگی رام پور۔ یوپی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(سید احمد قادری)

نظم و اجتماعیت

۲۶ مئی ۷۳ء کو دو ڈویژنوں (بریلی اور میرٹھ) کے اجتماع رامپور میں حدیث کا جو درس دیا گیا تھا اسے مرتب کرکے یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

رفقائے کرام و حاضرین مجلس! ہم اللہ تعالیٰ کے اس فضل و کرم پر اس کے شکر گذار ہیں کہ اس نے ہم سب کو ایک منظم اسلامی اجتماعیت کے ساتھ مل کر سرگرم عمل ہونے اور زندگی بسر کرنے کی توفیق عطا فرمائی ہے۔ اس کے باوجود یہ ضروری ہے کہ ہم ایک دوسرے کو اسلامی نظم و اجتماعیت کی دینی و شرعی اہمیت یاد دلاتے رہیں تاکہ ہمارا نظم اور ہماری اجتماعیت ڈھیلی نہ پڑے اس کو مزید استحکام حاصل ہوتا رہے۔ اس مجلس میں ایسے لوگ بھی موجود ہوں گے جو پہلی دفعہ ہمارے اجتماع میں شرکت کر رہے ہیں اور جنہیں اسلامی اجتماعیت اور جماعتی زندگی کی دینی اہمیت معلوم کرنے کی فرصت نہ ملی ہوگی۔ ہم اس سلسلے میں یہاں جو کچھ پیش کریں گے وہ اس موضوع پر ان کے مزید مطالعہ کے لیے ایک بنیاد کا کام دے سکتا ہے۔

ہر پڑھا لکھا آدمی یہ جانتا ہے کہ انسانوں کے کسی بھی مہذب معاشرے کے لیے نظم و اجتماعیت کو وہی حیثیت حاصل ہے جو انسانی جسم میں ریڑھ کی ہڈی کو ہوتی ہے۔ تہذیب و تمدن کی تمام ترقیاں اور دلآویزیاں نظم و اجتماعیت ہی کی مرہون منت ہیں۔ اگر یہ نہ ہو تو تہذیب و تمدن کی پوری عمارت

کھنڈر بن جائے اور انسانوں کا گروہ جانوروں کے ریوڑ کی صورت اختیار کر لے۔

یہ بات بھی معلوم ہے کہ "جماعت" یا اجتماعیت کسی بھیڑ یا ہجوم کا نام نہیں ہے بلکہ "جماعت" اس گروہ کو کہتے ہیں جو کسی خاص مقصد سے اکٹھا ہوا ہو، اس مقصد کے حصول کے لیے اس نے کچھ اصول متعین کیے ہوں، نظم و ضبط قائم رکھنے کے لیے کچھ قاعدے، ضابطے بنائے ہوں اور منظم جد و جہد کے لیے اپنا کوئی سربراہ مقرر کیا ہو۔

ہم جو حدیثیں آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں ان میں "الجماعۃ" کا لفظ بار بار آیا ہے۔ اس سے مراد وہ "جماعت" ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی میں بنی تھی اور جو خلفائے راشدین اور ان کے بعد تک قائم رہی لیکن پھر انتشار پیدا ہو گیا۔ مسلمان یہ بھول گئے کہ کس مقصد سے وہ "جماعت" بنے تھے اور وہ اصل چیز کیا ہے جس نے ان کی شیرازہ بندی کی تھی۔ وہ فرقوں اور گروہوں میں بٹ کر پارہ پارہ ہو گئے اور اب نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ بہت سے دیندار مسلمان بھی اسلامی نظم و اجتماعیت کے تصور سے خالی ہو گئے ہیں ـــــ ان حدیثوں میں "جماعت" سے الگ ہو جانے والوں یا اس "جماعت" میں شریک نہ ہونے والوں کے لیے جو وعیدیں ہیں ان کا تعلق بھی اسی "الجماعۃ" سے ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں بنی تھی۔ جماعت اسلامی ہند کو یہ غلط فہمی نہیں ہے کہ اس کی حیثیت اسی "الجماعۃ" کی ہے۔ البتہ وہ اس کی جد و جہد کر رہی ہے کہ مسلمانوں کا منتشر گروہ کتاب و سنت کے اصولوں پر مجتمع ہو کر "الجماعۃ" بن جائے۔ آگے آنے والی حدیثیں ہمارے لیے روشنی کا مینار ہیں جن سے اسلامی اجتماعیت کی دینی و شرعی اہمیت پوری طرح واضح ہوتی ہے۔

ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی خلافت و نیابت کا عظیم منصب سپرد کر کے اس دنیا میں بھیجا ہے اور اسلام زندگی کا مکمل نظام ہے جو پوری انسانی زندگی پر حاوی ہے۔ نظم و اجتماعیت کے بغیر نہ نیابت الٰہی کا حق ادا ہو سکتا ہے اور نہ اسلامی نظام زمین کے کسی بھی خطے پر قائم ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کتاب و سنت میں اس پر اتنا زور دیا گیا ہے اور اس کی اتنی تاکید کی گئی ہے جس سے زیادہ ممکن نہیں ہے۔

میں یہاں ارشادات رسول کی روشنی میں نظم و اجتماعیت کی دینی و شرعی اہمیت کے صرف

چند پہلو پیش کروں گا۔

(۱) مسلمانوں پر جماعتی زندگی بسر کرنا اور نظم وضبط کی پابندی کرنا فرض ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

عن ابن عمر فی حدیث مرفوع۔ علیکم بالجماعة وایاکم والفرقة (ترمذی جلد ۲)	حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم پر لازم ہے کہ جماعت کا دامن مضبوطی سے تھامے رہو اور تم پر لازم ہے کہ تفرقہ و انتشار سے دور رہو۔
عن الحارث الاشعری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امرکم بخمس بالجماعة والسمع والطاعة والہجرة والجہاد فی سبیل اللہ۔ (ترمذی واحمد بحوالہ مشکوٰة)	حضرت حارث اشعری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں جماعت کا، سننے اور اطاعت کرنے کا ہجرت کا اور اللہ کی راہ میں جہاد کا۔

"جماعت" کا حکم دینے کا مطلب وہی ہے جو اوپر کی حدیث میں ہے اور سمع وطاعت کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی جماعت کے امیر و سربراہ کے احکام سمع قبول سے سنے جائیں اور ان کی اطاعت کی جائے۔

ان دونوں حدیثوں سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں پر جماعتی زندگی بسر کرنا اور اپنے سربراہ (امیر) کے احکام کو سمع قبول سے سننا اور اطاعت کرنا فرض ہے۔ یہ محض مستحب و مستحسن چیز نہیں ہے بلکہ مسلمانوں پر اسے لازم قرار دیا گیا ہے۔

(۲) جماعت سے الگ ہو جانا اور امیر جماعت کی نافرمانی کرنا اسلام کے منافی ہے

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

عن الحارث الاشعری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ من خرج من الجماعة قید شبر	حضرت حارث اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ بلاشبہ جو شخص "جماعت" سے بالشت بھر بھی

فقد خلع ربقة الاسلام من عنقه الا ان یراجع (احمد و ترمذی بحوالہ مشکوٰۃ)

الگ ہوگیا، کوئی شک نہیں کہ اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال پھینکا الا یہ کہ وہ پھر جماعت میں واپس آجائے۔

عن ابی ھریرۃ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول من خرج من الطاعۃ وفارق الجماعۃ فمات مات میتۃ جاھلیۃ (مسلم ج ۲)

حضرت ابوہریرہ رضؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس شخص نے امیر کی اطاعت ترک کردی اور جماعت سے الگ ہوگیا پھر مرگیا تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔

عن ابن عباس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من رای من امیرہ شیئ یکرھہ فلیصبر فانہ لیس احد یفارق الجماعۃ شبرا فیموت الا مات میتۃ جاھلیۃ (متفق علیہ بحوالہ مشکوٰۃ)

حضرت ابن عباس رضؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جو شخص امیر میں کوئی ایسی بات دیکھے جو اسے ناگوار ہو تو اس کو صبر کرنا چاہیے کیونکہ جو شخص "جماعت" سے بالشت بھر بھی الگ ہوجاتا ہے پھر مرجاتا ہے تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوتی ہے۔

ان تین حدیثوں نے اس بات میں کوئی شک باقی نہیں چھوڑا کہ مسلمان پر جماعتی زندگی اور امیر جماعت کی اطاعت فرض ہے اور اس درجے کا فرض ہے کہ اگر کسی نے جماعتی زندگی ترک کردی اور اپنے امیر کی اطاعت سے منحرف ہوگیا تو اس کے معنے یہ ہیں کہ اس نے خود اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال پھینکا۔ علیحدگی کے ساتھ "بالشت بھر" کی قید بڑھا کر حضورؐ نے جماعت کے ساتھ جڑے رہنے کی فرضیت و اہمیت کو اس کی انتہائی حد تک پہنچا دیا ہے یعنی بالکل علیحدہ ہوجانا تو بڑی بات ہے کسی شخص کا بالشت بھر بھی علیحدہ ہوجانا منافیِ اسلام ہے۔ اسلامی نظم و اجتماعیت کے فرض ہونے کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہوگی؟

تیسری حدیث میں یہ جو فرمایا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے امیر میں کوئی ایسی بات دیکھے جو اسے ناپسند ہو تو اس کو صبر کرنا چاہیے" اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص محض اس بنا پر کہ امیر جماعت کی کسی

بات کے پسند نہیں ہے۔ جماعت سے علیحدگی اور امیر کی اطاعت سے انحراف اختیار نہ کرے ۔ سو۔ اگر کوئی مسلمان اسلامی اجتماعیت سے الگ ہو کر زندگی بسر کرے اور اسلامی جماعت کے امیر کی اطاعت کا عہد ہی نہ کرے تو نہ اس کی زندگی اسلامی زندگی ہوگی اور نہ اس کی موت اسلامی موت ہوگی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے :۔

عن عبد اللہ بن عمرؓ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول من خلع یدا من طاعة لقی اللہ یوم القیامة ولا حجة له ومن مات ولیس فی عنقه بیعة مات میتة الجاهلیة (مسلم شریف ج ۲)

عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ جس شخص نے امیر کی اطاعت ترک کر دی وہ قیامت کے دن اللہ سے اس حال میں ملے گا کہ اپنے بچاؤ کے لیے اس کے پاس کوئی دلیل نہ ہوگی اور جو شخص اس حال میں مر گیا کہ اس کی گردن میں امیر کی بیعت کا قلادہ نہ ہو تو وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔

اس حدیث میں دونوں باتیں جمع کر دی گئی ہیں یعنی اگر کوئی شخص اسلامی جماعت میں داخل تھا اس کے بعد امیر کی اطاعت سے منحرف ہو گیا تو یہ فعل بھی قابل مواخذہ ہے اور اگر کسی شخص نے جماعتی زندگی اختیار ہی نہ کی اور کسی اسلامی جماعت کے امیر کی اطاعت کا عہد ہی نہ کیا تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔

(۴) اسلام ... کی عارضی حالت میں بھی یہ گوارا نہیں کرتا کہ مسلمانوں کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا گروہ بھی غیر منظم اور منتشر رہے ۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :۔

عن ابی سعید الخدریؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا خرج ثلثة فلیومروا احدهم (ابوداؤد ج ۱)

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب تین افراد سفر پر نکلیں تو انہیں چاہیے کہ کسی ایک کو اپنا امیر بنا لیں

جس دین کی یہ تعلیم ہے آج اس کے ماننے والوں کا حال کیا ہے ؟

(۵) جماعت میں تفریق پیدا کرنے کو ایک ایسا جرم قرار دیا گیا ہے جس کی سزا قتل ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

عن عرفجة قال سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول من اراد ان یفرق امر هذه الامة وهی جمیع فاضربوه بالسیف کائنا من کان (مسلم شریف ج ۲)	حضرت عرفجہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا جو شخص اس جماعت کو جبکہ وہ متحد ہے منتشر کرنا چاہے اس پر تلوار چلاؤ خواہ وہ کوئی بھی ہو

اس حدیث سے بھی اسلامی اجتماعیت کی اہمیت پوری طرح واضح ہوتی ہے۔

(۶) اسلامی اجتماعیت اور غیر اسلامی اجتماعیت میں فرق

(الف) وہ رشتہ جو مسلمان افراد کو اسلامی جماعت بنانا اور انہیں تفرقہ وانتشار سے بچاتا ہے اللہ کا دین ہے۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا (آل عمران ۱۰۳)	اور اللہ کی رسی سب مل کر مضبوطی سے تھام لو اور پراگندہ نہ ہو

"اللہ کی رسی" سے مراد "اللہ کا بھیجا ہوا دین اسلام ہے جس طرح رسی متعدد چیزوں کے درمیان شیرازہ بندی اور انہیں ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کرتی ہے۔ اسی طرح اللہ کا دین مسلمانوں کی شیرازہ بندی کرتا اور انہیں ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کرتا ہے۔ اللہ کے دین پر عمل اور اس کی اشاعت و اقامت ہی وہ مقصد ہے جس سے اسلامی اجتماعیت پیدا ہوتی ہے۔ اگر کوئی جماعت اس مقصد کے لیے نہ بنی ہو تو وہ اسلامی اجتماعیت نہیں ہے۔

(ب) اسلامی اجتماعیت کو سرمایہ دارانہ جمہوریت اور اشتراکی آمریت سے بچانے والی چیز اللہ و رسول کی اطاعت اور ان کی اطاعت کی مخالف ہر دوسری اطاعت کا انکار ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

عن ابن عمر قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم السمع والطاعة	حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مسلمان پر امیر کے احکام

علی المرء المسلم فیما احب وکرہ مالم یؤمر بمعصیۃ فاذا امر بمعصیۃ فلا سمع ولا طاعۃ
(متفق علیہ بحوالہ مشکوٰۃ)

کی اطاعت فرض ہے خواہ وہ ناپسند کرے یا نہ کرے جب تک اسے کسی معصیت کا حکم نہ دیا گیا ہو اور جب اسے کسی معصیت کا حکم دیا جائے تو اس کی اطاعت نہیں کی جائے گی

عن علیؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا طاعۃ فی معصیۃ انما الطاعۃ فی المعروف
متفق علیہ بحوالہ مشکوٰۃ

حضرت علی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی معصیت میں کوئی اطاعت نہیں ہے، اطاعت تو بس معروف (نیکی) میں ہے۔

ان دونوں حدیثوں سے معلوم ہوا کہ اسلامی اجتماعیت، اللہ و رسول کی اطاعت کے ساتھ بندھی ہوئی ہے اگر وہ ان کے دیے ہوئے احکام کے خلاف کوئی قدم اٹھائے یا کوئی حکم دے تو نہ صرف یہ کہ اس کی اطاعت نہیں کی جائے گی بلکہ اگر وہ توبہ نہ کرے تو اسلامی اجتماعیت باقی نہیں رہے گی یہی چیز ہے جو اسلامی اجتماعیت کو دنیا کی دوسری تمام جماعتوں اور اجتماعیات سے ممتاز کرتی ہے۔

تقویٰ اور اعتصام بحبل اللہ

اے ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔ سب مل کر اللہ کی رسّی کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو۔ اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے۔ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اس نے تمہارے دل جوڑ دیے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے۔ تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے۔ اللہ نے تم کو اس سے بچا لیا۔ اس طرح اللہ اپنی نشانیاں تمہارے سامنے روشن کرتا ہے شاید کہ ان علامتوں سے تمہیں اپنی فلاح کا سیدھا راستہ نظر آجائے۔

(آل عمران: ۱۰۲-۱۰۳)

سنّتِ خلفاءِ راشدین

(جناب مولانا امین احسن اصلاحی)

مولانا اصلاحی نے حدیث سے متعلق چند سوالات کی توضیح کے لیے ایک مضمون لکھا تھا اسے پڑھکر ایک صاحب نے مولانا سے دریافت کیا تھا کہ سنت کو معلوم کرنے کے ذرائع میں آپ نے خلفائے راشدین کے تعامل کو بھی گنوایا ہے اور دلیل میں فرمودۂ نبوی "علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین" کو پیش کیا ہے۔ یہ قول کہاں سے ماخوذ ہے؟ اور آج کل "خلفاء راشدین" کی اصطلاح سے جن خلفاء کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے کیا خود آں حضرتؐ کا معہود ذہنی بھی یہی تھا نیز کیا خلفائے راشدین کے الفاظ اس دور میں اسی طرح مستعمل تھے؟ مولانا اصلاحی نے جو جواب دیا تھا اس نے بھی ایک مستقل مضمون کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ہم ذیل میں مولانا کا وہی مضمون نقل کر رہے ہیں۔

(ادارہ)

"علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین" محض کسی عبارت کا ایک ٹکڑا نہیں ہے، بلکہ یہ ایک طویل حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک حصہ ہے، جو احمد، ابو داؤد، ترمذی اور ابن ماجہ کے حوالے سے مشکوٰۃ کے باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ میں عرباض بن ساریہ سے بایں الفاظ نقل ہوئی ہے:

عن العرباض بن ساریۃ	عرباض بن ساریہ سے روایت ہے
قال صلی بنا رسول اللہ صلی اللہ	انھوں نے بیان کیا کہ ایک دن نبی صلی اللہ
علیہ وسلم ذات یوم ثم اقبل	علیہ وسلم نے ہمیں نماز پڑھائی۔ پھر حضور ہماری
علینا بوجہہ فوعظنا موعظۃ	طرف متوجہ ہوئے اور ایک نہایت مؤثر خطبہ

بليغة زرفت منها العيون و وجلت منها القلوب فقال رجل يا رسول الله كان هذه موعظة مودع فاوصنا فقال اوصيكم بتقوى الله والسمع والطاعة وان كان عبدا حبشيا فانه من يعش منكم بعدى فسيرى اختلافا كثيرا فعليكم بسنتى وسنة الخلفاء الراشدين المهديين تمسكوا بها وعضوا عليها بالنواجذ واياكم ومحدثات الامور فان كل محدثة بدعة وكل بدعة ضلالة۔

دیا جس سے آنکھیں اشک بار ہوگئیں اور دل کانپ اٹھے۔ مجھ سے ایک شخص بولا حضور یہ تو ایک وداعی خطبہ معلوم ہوتا ہے تو ہمیں کچھ وصیت کیجیے۔ حضورؐ نے فرمایا میں تمہیں اللہ سے ڈرتے رہنے اور اپنے صاحب امر کی بات ماننے اور اس کی اطاعت کرتے رہنے کی وصیت کرتا ہوں۔ اگرچہ تمہارا صاحب امر کوئی حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو۔ تم میں سے جو لوگ میرے بعد زندہ رہیں گے وہ اب اور تب میں بڑا فرق محسوس کریں گے تو تم میری سنت کی اور خلفاء راشدین مہدیین کی سنت کی پیروی کرنا، اون کو مضبوطی سے تھامنا اور دانت سے پکڑنا اور دین میں جو نئی باتیں گھسائی جائیں ان سے خبردار رہنا کیونکہ ہر ایسی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

اس حدیث میں دیکھ لیجیے "سنۃ الخلفاء الراشدین" کے الفاظ صاف موجود ہیں، بلکہ راشدین کے بعد ایک لفظ 'مہدیین' کا اضافہ بھی ہے۔ اس میں نہایت واضح الفاظ میں حضورؐ نے اپنی سنت کے ساتھ خلفائے راشدین کی سنت کا ذکر بھی فرمایا ہے اور اپنی سنت ہی کی طرح اس پر قائم رہنے کی وصیت فرمائی ہے۔

رہا یہ سوال کہ جس طرح آج خلفائے راشدین کا لفظ جب بولا جاتا ہے تو اس سے خلفائے اربعہ مراد ہوتے ہیں۔ اسی طرح جب حضورؐ نے یہ الفاظ استعمال فرمائے تو کیا اس وقت بھی لوگوں نے ان خلفائے اربعہ ہی کو سمجھا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کلام کی نوعیت ایک واضح اور قطعی حکم کی نہیں ہے،

بلکہ جیسا کہ خود حدیث سے واضح ہے ایک پیشین گوئی اور ایک وصیت کی ہے اور خلفائے راشدین سے یہاں متعین اور مخصوص اشخاص مراد نہیں ہیں، بلکہ آپ کے وہ جانشین مراد ہیں جو آپ کے بعد آپ کی امت کی زمام کار اپنے ہاتھوں میں سنبھالیں گے اور حضور ہی کے طریقے پر اپنے فرائض انجام انجام دیں گے۔ اس لفظ کے اندر وہ تمام خلفائے راشدین داخل ہیں جو آپ کی امت کے اندر پیدا ہوئے یا آئندہ پیدا ہوں گے اور حکومت کے فرائض صحیح اسلامی طریق پر انجام دیں گے۔

اگر کسی کو یہ گمان ہو کہ حضور کے ذہن میں اپنے بعد کسی خلافت کے قیام یا خلفائے کسی سلسلے کا کوئی تصور نہیں ہو سکتا تھا تو ہمارے نزدیک یہ گمان بالکل غلط ہے۔ اول تو آپ جس دین حق کے داعی تھے وہ دین کوئی رہبانیت کا دین نہیں تھا کہ وہ کسی سیاسی نظام کے تصور سے بالکل خالی ہو بلکہ اس کے برعکس وہ روز اول ہی سے ایک اجتماعی اور سیاسی نظام کے تقاضوں کے ساتھ نمودار ہوا تھا۔ خود حضور کی زندگی ہی میں اس نے عملاً ایک مکمل سیاسی نظام کی حیثیت اختیار بھی کر لی تھی اور اس نظام کے اصول و مبادی قرآن میں بھی بیان ہو گئے تھے اور خود حضورؐ نے بھی ان کی وضاحت فرما دی تھی۔ ثانیاً حضور کو آپ کی امت کے مستقبل کا پورا نقشہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلے ہی دکھا دیا گیا تھا۔ چنانچہ متعدد حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس امت کو اپنی اجتماعی زندگی میں جن مراحل اور جن انقلابات سے گزرنا تھا اس کے بہت سے پہلو آپ کے علم میں تھے۔ آپ جانتے تھے کہ آپ کے بعد مسلمانوں میں کس قسم کا نظام قائم ہو گا۔ اس کے بعد کیا انقلاب ہو گا اور پھر اس انقلاب کے بعد کیا حالات پیش آئیں گے۔ حد یہ ہے کہ خلفائے اربعہ میں سے جس جس کو جس جس طرح کے حالات پیش آنے تھے حضورؐ نے ان کی طرف بھی اپنی پیشین گوئیوں میں اشارات فرمائے ہیں۔ ہم یہاں بعض حدیثیں نقل کرتے ہیں جن سے اندازہ ہو سکے گا کہ آپ اپنے بعد قائم ہونے والے نظام کی نوعیت سے بھی باخبر تھے اور ان انقلابات سے بھی واقف تھے جن سے اس نظام کو سابقہ پیش آنا تھا۔

عن عبیدۃ و معاذ بن	ابو عبیدہ اور معاذ بن جبل راوی ہیں
جبل عن رسول اللہ صلی اللہ	کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ
علیہ وسلم قال ان ھذا الامر	اس نظام کا آغاز نبوت اور رحمت کی شکل
بدء نبوۃ ورحمۃ ثم یکون خلافۃ	میں ہوا ہے۔ اس کے بعد یہ خلافت اور

ورحمة ثم ملكا عضوضا	رحمت کی صورت اختیار کرے گا۔ پھر ایک
ثم كائن جبرية وعتوا و	مستبد شاہی بن جائے گا۔ پھر قہر و جبر اور
فسادا في الارض يستحلون	فساد فی الارض بنکر رہ جائے گا۔ لوگ ریشم
الحرير والفروج والخمور	زنا اور شراب کو جائز کر لیں گے۔ اس کے
يرزقون على ذالك وينصرون	باوجود انہیں روزی بھی ملتی رہے گی اور
حتى يلقوا الله۔ رواه البيهقي	یہ فتوحات بھی حاصل کرتے رہیں گے یہاں تک
في شعب الايمان (مشكوة باب تغير الناس)	کہ یہ اللہ کے ہاں حاضر ہوں۔

ایک دوسری حدیث میں بعد کے انقلابات اور ادوار کی تفصیل اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان ہوئی ہے ملاحظہ ہو:۔

عن حذيفة قال قال رسول	حذیفہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی
الله صلى الله عليه وسلم تكون النبوة	اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں نبوت باقی
فيكم ما شاء الله ان تكون ثم	رہے گی جب تک اللہ اس کا باقی رہنا چاہے
يرفعها الله تعالى ثم تكون خلافة	پھر اس کو اللہ تعالیٰ اٹھالے گا۔ اس کے
على منهاج النبوة ما شاء الله	بعد نبوت کے طرز پر خلافت قائم ہوگی اور
ان تكون ثم يرفعها الله تعالى ثم	وہ قائم رہے گی۔ جب تک اللہ تعالیٰ چاہے گا
تكون ملكا عاضا فتكون ما شاء	پھر اللہ تعالیٰ اس کو اٹھالے گا۔ اس کے بعد
الله ان تكون ثم يرفعها الله تعالى	ایک مستبد سلطنت قائم ہو جائے گی اور وہ
ثم يكون ملكا جبرية فتكون ما	قائم رہے گی جب تک اللہ تعالیٰ چاہے گا۔ پھر
شاء الله ان تكون ثم يرفعها الله	اللہ تعالیٰ اس کو اٹھالے گا۔ پھر جبر و قہر
تعالى ثم تكون خلافة على منهاج	کی حکومت قائم ہوگی اور وہ قائم رہے گی
النبوة ثم سكت....	جب تک اللہ تعالیٰ کی مشیت ہوگی۔ پھر اللہ
رواه احمد والبيهقي في	تعالیٰ اس کو اٹھالے گا۔ اس کے بعد نبوت
دلائل النبوة	کے طریق پر پھر خلافت قائم ہوگی۔ یہاں تک

(مشکوٰۃ، باب الانذار والتحذیر) بیان کرنے کے بعد حضور خاموش ہو گئے ۔

اس حدیث میں خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے بعد پیدا ہونے والے بگاڑ کے بعد پھر ایک دورِ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کی پیشین گوئی ہے ۔ اس کا مصداق ہمارے سلف صالحین نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دَور کو قرار دیا ہے اور اس کے بعد حضور کے سکوت فرمانے سے بعض لوگوں نے یہ نتیجہ بھی نکالا ہے کہ اس کے بعد بھی بناؤ اور بگاڑ کے اس طرح کے دَور امت میں آتے رہیں گے ۔ چنانچہ تاریخ کی شہادت موجود ہے کہ اس کے بعد اچھے حکمران بھی پیدا ہوئے اور برے بھی پیدا ہوئے اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ اب یہ فیصلہ کر لیا جائے کہ آئندہ کبھی اس دنیا میں خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا دور نہیں آئے گا ۔ نہ نقل میں ہمیں کوئی چیز ایسی ملتی ہے جو اس کا دروازہ بند کرتی ہو اور نہ عقلاً اس کا آنا کسی طرح محال اور مستبعد قرار دیا جا سکتا ہے ۔

اسی مضمون کی ایک دوسری حدیث انہی حضرت حذیفہ سے مسلم و بخاری دونوں کے حوالے سے مشکوٰۃ کی کتاب الفتن میں اس طرح نقل ہوئی ہے ۔ حضرت حذیفہ فرماتے ہیں :۔

لوگ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خیر کی بابت پوچھا کرتے تھے لیکن میں فتنوں کی بابت سوال کیا کرتا تھا کہ مبادا کسی فتنہ سے سابقہ نہ پڑ جائے ۔ ایک مرتبہ میں نے حضور سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ ہم جاہلیت اور فتنہ کی تاریکی میں مبتلا تھے کہ اللہ نے ہمیں یہ (نبوت کی) نعمت بخشی ۔ کیا اس خیر کے بعد پھر بگاڑ پیدا ہوگا؟ آپ نے فرمایا ۔ ہاں ۔ میں نے عرض کیا کہ کیا اس بگاڑ کے بعد پھر خیر کا دَور بھی آئے گا ۔ آپ نے فرمایا ۔ ہاں ۔ لیکن اس خیر میں کچھ کدورت بھی ملی ہوئی ہوگی ۔ میں نے پوچھا ۔ اس کدورت کی نوعیت کیا ہوگی؟ آپ نے ارشاد فرمایا ۔ لوگ میری سنت اور میرے طریقے کے خلاف روش اختیار کریں گے ۔ ان سے معروف اور منکر دونوں طرح کی باتیں صادر ہوں گی ۔ میں نے دریافت کیا، کیا اس خیر کے بعد پھر شر کا ظہور ہوگا ۔ آپ نے فرمایا ۔ ہاں .... الخ

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ پر حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دَور سے متعلق یہ حقیقت بھی واضح تھی کہ اس دور میں اگرچہ خلیفہ تو راشد ہوگا لیکن وقت کے حکام اور عوام کی حالت شر کی کدورت سے پاک نہیں ہوگی ۔ ان کے اندر معروف اور منکر دونوں طرح کی باتیں پائی جائیں گی ۔

بعض احادیث میں خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے پہلے دَور کی مدت بھی حضورؐ نے متعین فرما دی چنانچہ مشکوٰۃ میں احمدؒ ترمذی اور ابو داؤد کے حوالے سے یہ روایت نقل ہوئی ہے۔

اَلخلافۃ ثلثون سنۃ ثم یکون ملکا — خلافت تیس سال قائم رہے گی اس کے بعد بادشاہی قائم ہو جائے گی۔

تاریخ سے ثابت ہے کہ حضورؐ کی یہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت ۲ سال رہی۔ حضرت عمرؓ نے ۱۰ سال خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ بالترتیب ۱۲ اور ۶ سال خلیفہ رہے۔ یہ کل ملا کر تیس سال ہوتے ہیں۔

ان احادیث سے یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ حضورؐ کا ذہن جیسا کہ عرض کیا گیا، نہ خلافت کے تصور سے خالی تھا اور نہ خلفاء کے تصور سے۔ آپ جس دین فطرت کو لیکر آئے تھے اس کے فطری تقاضوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ نیز جیسا کہ اوپر بیان ہوا آپ کے بعد جس طرح کا سیاسی واجتماعی نظام امت میں قائم ہونا تھا، اس کے اصول خود قرآن میں بھی بتا دیے گئے تھے اور ان کی تفصیلات خود حضورؐ نے بھی مختلف طریقوں سے لوگوں کو سمجھائی تھیں۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان تمام انقلابات کا مشاہدہ بھی کرا دیا تھا جو آپ کی امت کی اجتماعی وسیاسی زندگی میں پیش آنے والے تھے۔ یہاں تک کہ یہ بھی آپ پر واضح کر دیا گیا تھا کہ آپ کے بعد جو لوگ خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالیں گے وہ اس فرض کی ادائیگی میں کن صلاحیتوں کا ثبوت دیں گے اور ان کو کن کن مراحل سے گزرنا پڑے گا۔ اگر خوف طوالت مانع نہ ہوتا تو ہم یہ تفصیلات بھی یہاں پیش کر دیتے۔

جب یہ سب باتیں حضورؐ پر روشن تھیں تو اس بات پر کیوں تعجب کیا جائے کہ آپ نے علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین کے الفاظ کے ساتھ خلفاء کے دور کے ظہور میں آنے سے پہلے اس کا تعارف کرایا اور ان کی سنت کی پیروی کرنے کی مسلمانوں کو وصیت فرمائی

آپ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ عام مسلمانوں کا ذہن ان الفاظ کو سن کر ان سے تعین کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کی طرف نہیں منتقل ہو سکتا تھا۔ لیکن حضورؐ کے ارشاد میں نہ یہ تعیین پیش نظر ہے اور نہ یہ الفاظ اس تعیین کے متقاضی ہی ہیں اور نہ اصل وصیت کے نقطۂ نظر سے یہ تعیین کچھ ضروری ہے۔ عام مسلمانوں کا اس سے صرف اتنا سمجھ لینا اصل مقصد کے

لحاظ سے بالکل کافی تھا کہ آپ کے بعد امت کی ذمہ داریوں کو اٹھانے کے لیے خلفاء ہوں گے جن میں راشد بھی ہوں گے اور غیر راشد بھی اور ہمیں ان میں سے راشدین کی پیروی کرنی ہے اور غیر راشدین کے ساتھ شریعت کے مقرر کردہ حدود کے اندر معاملہ کرنا ہے۔

خلفاء راشدین کے تعامل کے سنت ہونے کا مفہوم

یہاں میں تھوڑی سی وضاحت اس بات کی بھی کر دینا چاہتا ہوں کہ خلفائے راشدین کے تعامل کے سنت ہونے کا مفہوم کیا ہے اور اس کو سنت کا درجہ دینے کی وجہ کیا ہے؟

میں نے اپنے اصل مضمون میں سنت اور حدیث میں جو فرق بیان کیا ہے وہ یہاں بھی ملحوظ رکھیے۔ میں نے بتایا تھا کہ حدیث تو ہر وہ قول یا فعل یا تقریر ہے جس کی روایت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کے ساتھ کی جائے لیکن سنت صرف وہی چیزیں ہیں جن کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر اہتمام و التزام کیا ہو، جن کی اہمیت کے ساتھ تاکید فرمائی ہو، جن کی حیثیت آپ کی زندگی میں معلوم و معروف حقیقت کی ہو، جن کو حضور نے انفرادی یا اجتماعی زندگی کے لیے ایک رویہ، ایک مسلک اور ایک پروگرام کی حیثیت سے لوگوں کے سامنے رکھا ہو اور اسی حیثیت سے ان پر عمل کیا اور کرایا ہو۔

اس حقیقت کو سامنے رکھنے کے بعد جب آپ خلفائے راشدین کی سنت کے معاملہ پر غور فرمائیں گے تو جہاں تک ان کے انفرادی اقوال و آرا کا تعلق ہے وہ ان کی سنت کی حیثیت نہیں حاصل کریں گے، بلکہ ان کی صرف وہی چیزیں سنت کی حیثیت حاصل کریں گی جو ان کے سامنے ایک مسئلہ کی حیثیت سے آئی ہوں اور انھوں نے ان پر وقت کے اہل علم وارباب حل وعقد سے مشورہ حاصل کر کے ان کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا ہو، یا بطور خود اپنے کسی فیصلہ یا اجتہاد کو نافذ کیا ہو اور ان کے زمانے کے اہل علم و تقویٰ نے اس کو بغیر کسی نکیر کے قبول کیا ہو اور وہ چیز معمول بہ بن گئی ہو۔

حضرات خلفائے راشدین کا عام طریقہ یہ رہا ہے کہ جب ان کے سامنے کوئی ایسا معاملہ آتا جس کے بارے میں قرآن یا سنت نبوی میں کوئی تصریح موجود نہ ہوتی تو اس میں اہل علم و تقویٰ سے مشورہ کرتے۔ مشورے کے بعد جب ایک بات طے کر لیتے تو وہ چیز سب کے نزدیک متفق علیہ بن جاتی۔ پھر اگر اس کو پورے ملک کے لیے ایک قانون کی حیثیت دے دینے کی ضرورت داعی ہوتی تو وہی چیز پورے ملک کے لیے ایک قانون کی حیثیت حاصل کر لیتی۔ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانوں میں اس کی بے شمار

مثالیں موجود ہیں۔ اسلام میں جو اجماع حجت مانا گیا ہے تو اس کی معیاری شکل بھی درحقیقت یہی ہے جو اوپر بیان ہوئی ہے۔ اس حقیقت کی طرف شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ازالۃ الخفاء میں اشارہ فرمایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"وتحقیق آنست کہ تا زمان حضرت عثمان اختلاف در مسائل فقہیہ واقع نمی شد۔ در محل اختلاف بخلیفہ رجوع می کردند وخلیفہ بعد مشاورت امرے اختیار می کرد وہماں امر مجمع علیہ می شد۔"

اور تحقیق یہ ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زمانے تک فقہی مسائل میں کسی مستقل اختلاف کی صورت پیدا نہیں ہونے پاتی تھی۔ اگر کوئی اختلافی مسئلہ سامنے آتا تو اس کے لیے خلیفہ وقت کی طرف رجوع کرتے۔ خلیفہ اپنے وقت کے اہل حل وعقد سے مشورہ حاصل کرنے کے بعد اس معاملہ میں کوئی پہلو اختیار کر لیتا اور وہی بات سب کے نزدیک متفق علیہ بن جاتی۔

میرے نزدیک سنت خلفاء سے مراد ان کے اسی طرح کے اجماعی فیصلے ہیں، نہ کہ ان کی انفرادی رائیں اب میں یہ بتاؤں گا کہ میں خلفائے راشدین کے اس طرح کے طے کردہ مسائل کو کیوں سنت کا درجہ دیتا ہوں۔ میرے نزدیک اس کے وجوہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ اس کی پہلی وجہ تو وہ حدیث ہے جو اوپر گزر چکی ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود خلفائے راشدین کی سنت کو سنت کا درجہ بخشا ہے اور اسی حیثیت سے مسلمانوں کو اس پر عمل پیرا ہونے کی ہدایت اور وصیت فرمائی ہے۔

۲۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اجماع ہمارے ہاں ایک شرعی حجت کی حیثیت رکھتا ہے اور اجماع کی سب سے اعلیٰ قسم اگر کوئی ہو سکتی ہے تو وہی ہو سکتی ہے جس کی مثالیں خلفائے راشدین کے عہد میں ملتی ہیں۔ اول تو یہ خیر القرون کے لوگوں کا اجماع ہے جن کی حق طلبی وحق کوشی ہر شبہ سے بالاتر ہے۔ ثانیاً اسی مبارک دور میں عملاً یہ شکل اختیار کی جا سکی کہ اگر کوئی مسئلہ پیش آیا تو اس میں وقت کے اہل علم اور صالحین کی رائیں معلوم کی گئیں اور پھر ایک متفق علیہ بات طے کر کے ایک خلیفہ راشد نے اس کو جاری ونافذ کیا اور سب نے اس پر بغیر کسی اختلاف واعتراض کے عمل کیا۔

۳۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ ابتدا سے خلفائے راشدین کے تعامل کو ملت میں ایک مستقل شرعی حجت کی حیثیت دی گئی ہے۔ سعید بن مسیب کی فقہ میں حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے فیصلوں کو ایک اصولی حیثیت

سے تسلیم کرلیا گیا ہے۔ اسی طرح ابراہیم نخعی کی فقہ میں حضرت علیؓ کے فیصلوں کو ایک مستقل جگہ حاصل ہے۔ یہی اعتماد ہر مسلمان کو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے فیصلوں پر ہے۔ اس لحاظ سے دیکھیے تو فقہ مالکی ہو یا فقہ حنفی، ہر ایک کے اندر خلفائے راشدین کے تعامل کو سنت ہی کی حیثیت سے جگہ دی گئی ہے۔

۴۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ دین کی تکمیل اگرچہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے ہوئی ہے لیکن امت کی اجتماعی زندگی میں اس کے مضمرات کا پورا پورا مظاہرہ حضرات خلفائے راشدین کے ہاتھوں ہوا۔ انہی کے مبارک دور میں اسلام کے تمام ادیان پر غلبہ کا قرآنی وعدہ پورا ہوا اور اسلامی شریعت کے بہت سے احکام کا انطباق زندگی کے معاملات میں عملاً متعین ہوا۔

اس پہلو سے خلفائے راشدین کا دور گویا عہد رسالت ہی کا ایک ضمیمہ ہے اور ہمارے لیے وہ پورا نظام ایک مثالی نظام ہے جو ان کے مبارک ہاتھوں سے قائم ہوا۔ پس اس دور میں جو نظائر قائم ہو چکے ہیں، وہ ہمارے لیے دینی حجت کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہمارے لیے ان سے انحراف جائز نہیں ہے۔ اس کلیہ سے اگر کوئی چیز مستثنیٰ ہو سکتی ہے تو صرف وہ چیز ہو سکتی ہے جو محض کسی وقتی مصلحت کے تحت انھوں نے اختیار فرمائی ہو۔

اسلام میں والدین کے فرائض

(مولانا سید جلال الدین عمری)

بعض مذاہب کا یہ رجحان رہا ہے کہ بیوی اور بچے انسان کی دینی اور روحانی ترقی میں رکاوٹ ہیں لیکن اسلام اس رجحان کا شدید مخالف ہے۔ اس کے نزدیک بیوی اور بچوں سے دور رہنا اور ان کے جائز مطالبات تک کو ٹھکرا دینا غیر فطری اور غیر اخلاقی رویہ ہے۔ خدا سے قرب اور روحانیت کے ارتقاء کے لیے یہ ہرگز ضروری نہیں ہے کہ ان سے کنارہ کشی اختیار کی جائے بلکہ ان سے صحیح تعلق اور ان کے حقوق کی ٹھیک ٹھیک ادائیگی ہی سے انسان خدا کو خوش کر سکتا ہے اور آخرت میں اس کی کامیابی ممکن ہے۔ اسی وجہ سے قرآن مجید نے بیوی اور بچوں کو انسان کے لیے بوجھ یا اس کی ترقی کی راہ کا سنگِ گراں نہیں قرار دیا بلکہ ان کو خدا کی بہت بڑی دین اور اس کے بہت بڑے احسان کی حیثیت سے ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ فرمایا:-

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ	اللہ نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس
اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ	سے جوڑے پیدا کیے اور تمہارے (ان)
بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ	جوڑوں سے تمہیں بیٹے اور پوتے عطا کیے
الطَّيِّبٰتِ	اور پاک صاف چیزیں کھانے کے لیے دیں

(النحل: ۷۲)

حضرت نوح علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اگر تم خدا کی عبادت کرو گے اور اس کے احکام پر چلو گے تو وہ تم کو مال و اولاد سے نوازے گا۔

وَيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ	بڑھا دے گا تمہارے اموال اور بیٹے

وَيُمْدِدْكُمْ بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ — اور تمہارے لیے باغات عطا کرے گا اور
اَنْهٰرًا ۝ (نوح) — تمہارے لیے نہریں بنا دے گا۔

بنو اسرائیل پر اللہ تعالیٰ اپنے احسانات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے:۔

وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ — تمہارے مالوں اور بیٹوں میں اضافہ
وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا (بنی اسرائیل) — کیا اور تمہاری تعداد بڑھا دی۔

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ اولاد انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کا ایک بہترین عطیہ ہے۔ اس لیے اس کو اس عطیہ کی قدر کرنی چاہیے اور اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اس سے نفرت اور بیزاری اس عطیہ کی ناقدری اور توہین ہے[1]

اولاد سے محبت بالکل فطری ہے۔ یہ محبت خدا کے پیغمبروں اور اس کے نیک بندوں میں بھی اسی طرح پائی جاتی ہے جس طرح کسی بھی دوسرے شخص میں پایا جانا ممکن ہے وہ اپنے بچوں کو چاہتے ہیں، ان سے پیار کرتے ہیں، ان کی خوشی سے خوش ہوتے ہیں، ان کی بیماری یا دکھ درد سے ان کو تکلیف ہوتی ہے ان کی جدائی ان پر شاق گذرتی ہے اور ان کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں۔ اس کی وجہ سے خدا سے

---

[1] احادیث میں آتا ہے کہ بچے کے پیدا ہونے کے بعد ساتویں دن عقیقہ کیا جائے اور اس کے سر کے بال اتار کر ان کے ہم وزن چاندی صدقہ وخیرات کی جائے۔ ایک حدیث میں ہے:۔

الغلام مرتهن بعقيقته يذبح — لڑکا اپنے عقیقہ کی وجہ سے رہن رہتا
عنه يوم سابعه و يسمى — ہے (اس لیے) ساتویں دن اس کی طرف سے
ويحلق راسه — جانور ذبح کیا جائے، اس کا نام رکھا جائے
ترمذی، ابواب الاضاحی، ابو داود کتاب الضحایا — اور اس کے سر کے بال اتروائے جائیں۔

حضرت حسنؓ کی ولادت پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہؓ سے فرمایا۔

احلقی راسه وتصدقی بزنة — اس کا سر منڈوا دو اور اس کے بال
شعره فضة (ترمذی: ابواب الاضاحی) — کے وزن کے برابر چاندی خیرات کر دو۔

یہاں ہم عقیقہ کی فقہی حیثیت سے بحث کرنا نہیں چاہ رہے ہیں بلکہ اس کے ایک مقصد کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے بہت سے مقاصد ہو سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہمارے خیال میں یہ اولاد کے عطا کرنے پر خدا کے احسان کا شکر اور خوشی کا (اظہار بھی ہے۔)

ان کا تعلق کمزور نہیں ہوتا بلکہ وہ باقی رہتا ہے۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ اس میں ترقی اور استحکام پیدا ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ کے بارے میں فرماتے ہیں:۔

"وہ تو میرے گوشت کا ٹکڑا ہے جس نے اسے ناخوش کیا اس نے مجھے ناخوش کیا۔" [1]

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ حضرت فاطمہ رض جب تشریف لاتیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (محبت سے) کھڑے ہو جاتے، ان کو لینے کے لیے آگے بڑھتے، ان کا ہاتھ پکڑ لیتے، اس کو بوسہ دیتے اور ان کو اپنی جگہ بٹھاتے۔ یہی حال حضرت فاطمہ رض کا تھا کہ جب آپ ان کے گھر تشریف لے جاتے تو وہ کھڑی ہو جاتیں اور آپ کو لینے کے لیے آگے بڑھتیں، دست مبارک پکڑ لیتیں، اسے بوسہ دیتیں اور اپنی جگہ بٹھاتیں [2]

حضرت زید غلام تھے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزاد کر کے اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔ ان سے آپ کی محبت کا یہ عالم تھا کہ حضرت عائشہ رض فرماتی ہیں کہ آپ میرے گھر تشریف رکھتے تھے۔ وہ کسی سفر سے واپس ہوئے اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ آپ اس وقت کپڑے اتار کر بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن ان کی آواز سنتے ہی برہنہ تن اپنی چادر کھینچتے ہوئے (بے تابی کے ساتھ) تشریف لے گئے اور ان کو سینہ سے لگا لیا اور بوسہ دیا۔ میں نے اس سے پہلے آپ کو اس حالت میں (کسی سے ملاقات کرتے) نہیں دیکھا۔ [3]

حضرت زید کے صاحب زادے حضرت اسامہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک زانوے مبارک پر مجھے اور دوسرے پر حضرت حسن کو بٹھا لیتے۔ ہمیں سینہ سے لگا لیتے اور فرماتے۔ اے اللہ مجھے ان سے محبت اور ہمدردی ہے۔ تو بھی ان سے محبت کر اور ان پر رحم فرما۔ [4]

حضرت حسن اور حضرت حسین کے بارے میں آپ نے فرمایا۔ "یہ دونوں تو اس دنیا میں میرے لیے دو گلاب کے پھول ہیں۔" [5]

---

[1] بخاری، کتاب المناقب، باب مناقب فاطمہ رض

[2] ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی القیام۔ ترمذی، ابواب المناقب، باب ماجاء فی فضل فاطمہ۔ ترمذی کی روایت کے الفاظ تھوڑے سے مختلف ہیں۔

[3] ترمذی، ابواب الاستیذان، باب ماجاء فی المعانقۃ والقبلۃ

[4] بخاری، کتاب الادب، باب وضع الصبی فی الحجر

[5] بخاری، کتاب المناقب، باب مناقب الحسن والحسین

براء بن عازب کہتے ہیں کہ میں نے حضرت حسن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دوش مبارک پر سوار دیکھا اور آپ فرما رہے تھے۔ اے اللہ! میں اس سے محبت کرتا ہوں تو بھی محبت فرما۔[1]

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے۔ پاس ہی منبر پر حضرت حسن بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ کبھی مجمع کو دیکھتے اور کبھی حضرت حسن کو، فرمایا کہ میرا یہ بچہ سردار ہے۔ مجھے امید ہے اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے دو جماعتوں میں صلح کرائے گا۔[2]

ایک مرتبہ آپ خطبہ دے رہے تھے کہ حضرت حسن اور حسین (اپنی کم سنی کی وجہ سے) لڑکھڑاتے ہوئے سامنے آگئے۔ آپ نے ان کو دیکھا تو خطاب روک دیا اور منبر سے اتر گئے۔ ان دونوں کو اٹھایا اور ان کو لے کر منبر پر تشریف لے گئے۔ فرمایا۔ اللہ نے صحیح کہا ہے کہ تمہارے مال اور اولاد فتنہ ہیں۔ میں نے ان کو اس حال میں دیکھا تو صبر نہیں کر سکا۔ اس کے بعد پھر آپ خطبہ دینے لگے۔[3]

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھانے کے لیے حجرے سے نکلے تو اپنی نواسی امامہ بنت ابی العاص کو لیے ہوئے تھے۔ جب جماعت شروع ہوئی تو آپ نے ان کو دوش مبارک پر بٹھا لیا جب آپ سجدہ کرتے تو انھیں اتار دیتے اور جب کھڑے ہوتے، تو دوبارہ اپنے کندھے پر بٹھا لیتے۔ اسی طرح آپ نے پوری نماز ختم کی۔[4]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صاحب زادہ کا نام نامی ابراہیم تھا۔ ان کو مدینہ کے کنارے رہنے والی ایک خاتون ام سیف دودھ پلاتی تھیں۔ حضرت انس کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کو دیکھنے کے لیے وہاں جایا کرتے تھے۔ ان کو اٹھاتے اور پیار کرتے۔ ان کا بہت کم سنی میں وہیں انتقال ہو گیا۔ انتقال کے وقت آپ موجود تھے۔ آپ ہی کے سامنے ان پر نزع کی کیفیت طاری تھی۔ آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ آپ نے فرمایا۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں، دل غمگین ہے لیکن زبان

---

[1] بخاری، کتاب المناقب، باب مناقب الحسن والحسین

[2] حوالۂ سابق

[3] ابو داؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب الامام یقطع الخطبۃ للامر یحدث۔ ترمذی۔ ابواب المناقب، مناقب ابی محمد الحسن بن علی الخ نسائی، کتاب الجمعۃ، باب نزول الامام عن المنبر الخ

[4] بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب اذا حمل جاریۃ صغیرۃ علی عنقہ

سے وہی بات نکلے گی جو اللہ کو پسند ہے۔ اے ابراہیم! ہم تمہاری جدائی سے مغموم ہیں۔[1]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینب کے ایک بچہ پر نزع کی کیفیت طاری تھی انھوں نے ایک شخص کے ذریعے آپ کو بلوایا۔ آپ نے فرمایا۔ جاؤ اس سے سلام کہو اور کہو کہ جو چیز اللہ ہم سے لے لے اس پر غمگین نہیں ہونا چاہیے اور جزع فزع نہیں کرنا چاہیے اس لیے کہ) وہ اسی کی ہے اور جو چیز وہ ہمیں دے وہ بھی اسی کی ملک ہے (اس میں وہ حسب مرضی تصرف کر سکتا ہے) ہر چیز کا اس کے نزدیک ایک وقت متعین ہے۔ کہو صبر کرے اور اللہ سے ثواب کی امید رکھے۔ قاصد نے جب یہ پیغام حضرت زینب تک پہنچایا تو انھوں نے قسم دلا کر کہا کہ آپ ضرور آئیں۔ آپ چند صحابہ کرام کے ساتھ تشریف لے گئے۔ تو بچہ کی سانس اکھڑ رہی تھی۔ آپ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ حضرت سعد نے (غالباً اس کو صبر و شکر اور توکل کے منافی سمجھا۔ اس لیے) پوچھا۔ حضور! یہ آپ کی آنکھوں سے آنسو کیسے جاری ہیں؟ آپ نے جواب دیا:۔

ھذہ رحمۃ جعلھا اللہ فی قلوب عبادہ وانما یرحم اللہ من عبادہ الرحماء[2]	یہ تو رحمت (کا جذبہ ہے) جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے سینوں میں رکھ دیا ہے۔ (واقعہ یہ ہے کہ) اللہ (بھی) اپنے بندوں میں سے ان ہی پر رحم فرماتا ہے جو دوسروں پر رحم کھاتے ہیں۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ جس وقت آپ کی صاحبزادی حضرت ام کلثوم کو دفن کیا جا رہا تھا آپ قبر کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے اور آپ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔[3]

ہجرت کے شروع کا واقعہ ہے کہ حضرت عائشہؓ بخار کی وجہ سے لیٹی ہوئی تھیں، حضرت ابوبکرؓ نے دیکھا اور محبت سے پوچھا، بیٹی کیا حال ہے؟ پھر ان کے گال پر بوسہ دیا۔[4]

---

[1] بخاری، کتاب الجنائز، باب قول النبیؐ انا بک لمحزونون۔ مسلم، کتاب الفضائل۔ باب رحمۃ الصبیان

[2] بخاری: کتاب الجنائز۔ باب قول النبیؐ یعذب المیت ببعض بکاء اہلہ الخ۔ مسلم، کتاب الجنائز

[3] بخاری: حوالہ مذکور

[4] ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی قبلۃ الخد

اس طرح کے واقعات حدیث کی کتابوں سے بہت سے جمع کیے جا سکتے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اولاد سے محبت اور ان سے قلبی لگاؤ نا جائز اور خدا سے تعلق کے منافی نہیں ہے، بلکہ قرآن و حدیث یہ بتلاتے ہیں کہ اس محبت کا نہ ہونا معیوب اور سنگ دلی کی نشانی ہے، جو خدا پرستی کے ساتھ کبھی جمع نہیں ہو سکتی۔

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن کو پیار کیا تو اقرع بن حابس نے جو اس وقت وہاں موجود تھے، کہا کہ میرے دس بچے ہیں، لیکن میں نے کبھی ان میں سے کسی کو پیار نہیں کیا۔ آپ نے بہت تعجب سے ان کو دیکھا اور فرمایا جو انسانوں پر رحم نہیں کرتا اس پر اللہ تعالیٰ بھی رحم نہیں فرماتا۔[1]

حضرت عائشہ رضا فرماتی ہیں کہ ایک بدو نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ لوگ بچوں کو پیار کرتے ہیں لیکن ہم نہیں کرتے۔ آپ نے فرمایا:-

لا املك لك اذا نزع الله	اگر اللہ نے تمہارے دل سے جذبۂ رحم
من قلبك الرحمة	نکال دیا ہے تو میرے بس میں نہیں ہے کہ
	تمہارے اندر یہ جذبہ پیدا کر دوں

خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت اولاد سے محبت کو غلط اور تقویٰ کے خلاف نہیں کہتے۔ ہاں جب یہ محبت اپنے حدود سے تجاوز کر جاتی ہے اور خدا سے غفلت اور اس کے دین سے دوری کا سبب بن جاتی ہے تو وہ اس پر تنقید کرتے ہیں۔ کیونکہ ایسی محبت ترقی کی راہ کی رکاوٹ ہوا اور اس کو کامیاب و بامراد ہونے نہیں دیتی۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ	اے ایمان والو تم کو تمہارے مال اور
اَمْوَالُكُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ	تمہاری اولاد اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دے اور
اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ	جو شخص اس طرح غافل ہو جائے تو ایسے ہی
هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (المنافقون)	لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔

قرآن مجید نے بار بار اور اسلوب بدل بدل کر بتایا ہے کہ انسان پر سب سے زیادہ حق اس کے

---

[1] بخاری، کتاب الادب۔ باب رحمۃ الولد وتقبیلہ ومعانقتہ۔ مسلم، کتاب الفضائل، باب رحمتہ الصبیان والعیال الخ

[2] بخاری، کتاب الادب " "

قریب ترین افراد کا ہے۔ یہ بات مکی سورتوں میں بھی کہی گئی ہے اور مدنی سورتوں میں بھی۔ ایک جگہ فرمایا

وَآتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ (الاسراء ۲۶) اور قرابت دار کو اس کا حق دو

ایک دوسری جگہ فرمایا :-

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى (البقرۃ) (نیک انسان صحیح معنی میں وہ ہے جس نے) اپنا مال اس سے محبت کے باوجود رشتہ داروں کو دیا۔

انسان کے قرابت دار بہت سے ہو سکتے ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ قریب اس کی اولاد ہے اس لیے اس کا حق ادا کرنا دوسرے قرابت داروں کے حقوق ادا کرنے سے زیادہ ضروری بھی ہے اور زیادہ اہم بھی۔ احادیث میں یہ حقیقت بہت واضح الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ و خیرات کی ترغیب دی تو ایک شخص نے کہا حضور (فرض کیجیے) میرے پاس ایک دینار ہے؟ (اس کو میں کہاں خیرات کروں؟) آپ نے فرمایا۔ اسے اپنی ذات پر صدقہ کرو۔ اس نے کہا۔ میرے پاس ایک اور دینار بھی ہے۔ آپ نے فرمایا۔ اسے اپنے بچہ پر صدقہ کرو۔ اس نے کہا میرے پاس ایک اور دینار بھی ہے۔ آپ نے فرمایا۔ اسے اپنی بیوی پر صدقہ کرو۔ اس نے کہا۔ میرے پاس ایک اور دینار بھی ہے۔ آپ نے فرمایا اسے اپنے خادم پر صدقہ کرو۔ اس نے کہا میرے پاس اس کے بعد بھی ایک اور دینار ہے۔ آپ نے فرمایا۔ اس کا مصرف تم خود اچھی طرح سمجھ سکتے ہو[1]

اس حدیث میں انسان پر عائد ہونے والے مالی حقوق کی ایک ترتیب بیان ہوئی ہے۔ اس پر سب سے پہلا حق خود اپنی ذات کا ہے۔ اس کے بعد بیوی بچوں کا حق اس پر عائد ہوتا ہے۔ پھر ان لوگوں کا حق اس

[1] ابوداؤد، کتاب الزکاۃ، باب صلۃ الرحم۔ نسائی، کتاب الزکوۃ الصدقۃ عن ظہر غنی۔ ابوداؤد کی روایت میں بیوی سے پہلے بچہ کا ذکر ہے لیکن نسائی اور بعض دیگر کتب حدیث میں پہلے بیوی کا بعد میں بچہ کا ذکر ہے۔ دونوں روایتیں چونکہ صحیح ہیں اس وجہ سے امام ابن حزم کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بات کو تین تین مرتبہ دہرایا کرتے تھے۔ اس لیے ممکن ہے کہ آپ نے کبھی بیوی کا ذکر پہلے کیا ہو اور کبھی بچہ کا ـــــ لہذا دونوں کے نفقہ کو ایک سی اہمیت دی جائے۔ کسی ایک کو دوسرے پر مقدم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

(المحلی ۱۰/ ۱۰۵)

پر عائد ہوتا ہے جو اس کے ماتحت ہیں اور اس کی خدمت کرتے ہیں۔ ان کے بعد حسب مراتب دوسروں کے حقوق اس پر عائد ہوتے ہیں۔ ایک اور حدیث میں ہے :۔

افضل الصدقة ماترك	بہترین صدقہ وہ ہے جس کے بعد بھی
غنی والید العلیا خیر من الید	غنا باقی رہے (اور آدمی کو کسی کا دست نگر
السفلی وابدا بمن تعول	نہ ہونا پڑے) اس لیے کہ اوپر کا ہاتھ (دینے
تقول المرأة اما ان تطعمنی	والا) نیچے کے ہاتھ (لینے والے) سے بہتر ہے
واما ان تطلقنی ویقول العبد	خرچ کا آغاز ان لوگوں سے کرو جن کا بوجھ
اطعمنی واستعملنی ویقول	تم پر ہے۔ ورنہ بیوی یہ کہے گی کہ یا تو مجھے
الابن اطعمنی الی من	کھلاؤ یا طلاق دے دو۔ غلام یہ کہے گا
تدعنی [1]	کہ کھلاؤ اور کام لو۔ بچہ یہ کہے گا کہ مجھے کھلاؤ
	کس کے حوالے مجھے کر رہے ہو۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات غلط ہے کہ آدمی اپنی بنیادی ضروریات کو نظر انداز کر کے اور بیوی بچوں اور متعلقین کو کس پرسی کے حال میں چھوڑ کر صدقہ و خیرات کرنے لگے اور وقت پڑنے پر دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانا شروع کر دے۔

ایک حدیث میں انفاق کی ترغیب دیتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ آدمی کے لیے بہتر بات یہ ہے کہ وہ اپنی زائد دولت کو خدا کی راہ میں خرچ کرے۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی واضح کر دی گئی ہے کہ اپنی اور متعلقین کی ضروریات کا خیال رکھنا اور اس کے لیے اپنی آمدنی کا ایک حصہ باقی رکھنا غلط اور ناپسندیدہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ ضروریات آدمی کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ اگر وہ ان کا لحاظ نہ کرے تو اسے دوسروں کا محتاج ہونا پڑے گا اور یہ سخت معیوب بات ہے۔

یا ابن آدم ان تبذل	اے آدم کے بیٹے! یہ تیرے حق میں بہتر
الفضل خیر لك وان تمسكه	ہے کہ تو زائد از ضرورت چیز کو خرچ کر دے
شر لك ولا تلام علی کفاف	اور یہ تیرے لیے برا ہے کہ تو اسے اپنے پاس

---

[1] بخاری، کتاب النفقات، باب وجوب النفقة علی الاہل والعیال

وابدأ بمن تعول واليد العليا خير من اليد السفلى [1]

روکے رکھے۔ ہاں اگر تو اپنی اور اپنے متعلقین کی حقیقی ضرورت کی حد تک اپنے پاس رکھ چھوڑے تو (یہ کوئی غلط بات نہیں ہے) اس پر تجھے ملامت نہیں کی جائے گی۔ خرچ کا آغاز ان لوگوں سے کر جن کی معاشی ذمہ داری تجھ پر آتی ہے (لیکن اسراف سے کام نہ لے اور یاد رکھ) اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے۔

اسلام کے نزدیک یہ بہت بڑا گناہ ہے کہ انسان اپنی معاشی ذمہ داریوں کو محسوس نہ کرے اور اپنے متعلقین کو اس حال میں چھوڑ دے کہ وہ غربت اور فاقہ کشی سے تباہ و برباد ہو جائیں۔ ایک حدیث میں ہے:۔

كفى بالمرء اثما ان يضيع من يقوت [2]

انسان (کی بربادی کے لیے) یہ گناہ کافی ہے کہ وہ ان لوگوں کو ضائع کر دے جن کے اخراجات کا وہ ذمہ دار ہے۔

یہی روایت ان الفاظ کے ساتھ بھی آئی ہے:۔

كفى اثما ان يحبس عن من يملك قوته [3]

یہ گناہ آدمی کے لیے کافی ہے کہ وہ جن کے معاش کا مالک ہے اس کو ان سے روکے رکھے۔

حدیث میں اس کی بہت وعید آئی ہے کہ کوئی عورت کسی دوسرے شخص سے ناجائز طور پر پیدا ہونے والے بچے کو اپنے شوہر کی طرف منسوب کر دے یا یہ کہ ایک شخص کسی بچہ کا فی الواقع باپ ہوتے ہوئے بھی اس کو اپنا بچہ تسلیم نہ کرے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

---

[1] مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب ان الید العلیا خیر من الید السفلی الخ

[2] ابو داؤد، کتاب الزکوٰۃ، باب فی صلۃ الرحم

[3] مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب فضل النفقۃ علی العیال الخ

ایما امرأۃ ادخلت	جو عورت کسی قوم کے اندر کسی ایسے بچہ
علی قوم من لیس منھم	کو داخل کر دے جو ان کا نہیں ہے تو اللہ
فلیست من اللہ فی شیئ ولن	تعالیٰ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے اور
یدخلھا اللہ الجنۃ وایما	اللہ اس کو ہرگز جنت میں داخل نہیں کرے گا
رجل جحد ولدہ وھو ینظر	اور جو شخص اپنے بچہ کا انکار کرے درآں حالیکہ
الیہ احتجب اللہ تعالیٰ منہ	وہ (محبت سے) اس کو دیکھ رہا ہو تو اللہ
وفضحہ علی رؤس الاولین	تعالیٰ اس سے پردہ کرلے گا اور اس کو سب
والآخرین [1]	اگلوں اور پچھلوں کے سامنے رسوا کرے گا۔

ایک عورت جب اپنے ناجائز بچہ کو کسی خاندان کا جزء بنا کر پیش کرتی ہے تو نہ صرف یہ کہ ان کے حسب و نسب کو بگاڑتی ہے بلکہ اس بچہ کی ان بہت سی ذمہ داریوں کے اٹھانے پر اس کو مجبور کرتی ہے جو فی الواقع اس پر عائد نہیں ہوتیں۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اپنی اولاد کا انکار کرتا ہے تو ایک طرف تو وہ معاشرے میں اس کو رسوا کرتا ہے، دوسری طرف اخلاق اور قانون نے ایک باپ کی حیثیت سے اس پر جو ذمہ داریاں ڈالی ہیں ان سے وہ دامن بچانا چاہتا ہے۔ اسلام کے نزدیک یہ بہت ہی گھناؤنا جرم ہے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے بہت سی سماجی اور معاشرتی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسلام یہ چاہتا ہے ایک شخص باپ ہے تو اپنی اولاد کی معاش، تعلیم و تربیت اور دیگر تمام ذمہ داریوں کو قبول کرے اور ان کو پورا کرنے کی کوشش کرے۔

انسان اگر اپنی اولاد کی خدمت کرتا ہے، ان کی حفاظت اور نگہداشت کرتا ہے، ان کے لیے دکھ درد اٹھاتا ہے، ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے لیے اپنی قوت و صلاحیت اور وقت اور مال کی قربانی دیتا ہے تو وہ اسلام کے نزدیک عام اصطلاحی معنوں میں دنیاداری میں مصروف ہے بلکہ بہت بڑا کارِ ثواب انجام دے رہا ہے۔ اسی وجہ سے اوپر کی کئی ایک حدیثوں میں بیوی اور بچوں پر انفاق کو ایسے صدقہ و خیرات سے تعبیر کیا گیا ہے جو دوسرے بہت سے صدقات سے افضل اور بہتر ہے اور جس پر انسان زیادہ سے زیادہ ثواب کی توقع کر سکتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے:

[1] ابوداؤد، کتاب الطلاق، باب التغلیظ فی الانتفاء

ما اطعمت نفسك فهو لك صدقة وما اطعمت ولدك فهو لك صدقة وما اطعمت زوجتك فهو لك صدقة وما اطعمت خادمك فهو لك صدقة [1]

تم نے اپنے آپ کو جو کھلایا وہ بھی تمہاری طرف سے ایک صدقہ ہے تم نے اپنے بچہ کو جو کھلایا وہ بھی تمہاری طرف سے ایک صدقہ ہے۔ تم نے اپنی بیوی کو جو کھلایا وہ بھی تمہاری طرف سے ایک صدقہ ہو اور تم نے اپنے خادم کو جو کھلایا وہ بھی تمہارے لیے ایک صدقہ ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے :-

افضل دینار ینفقه الرجل دینار ینفقه علی عیاله ودینار ینفقه الرجل علی دابته فی سبیل الله ودینار ینفقه علی اصحابه فی سبیل الله

انسان جو دینار خرچ کرتا ہے اس میں سب سے زیادہ فضیلت والا دینار وہ ہے جس کو وہ اپنے بچوں پر خرچ کرتا ہو (پھر) وہ دینار ہے جس کو وہ خدا کی راہ میں (جہاد کے لیے) اپنی سواری پر خرچ کرتا ہے (اس کے بعد) وہ دینار ہے جسے وہ خدا کے راستے میں اپنے ساتھیوں پر خرچ کرتا ہے۔

مشہور تابعی ابو قلابہ اس حدیث کو روایت کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے بیوی بچوں کا ذکر فرمایا اور واقعہ بھی یہی ہے کہ اس شخص سے زیادہ اجر و ثواب کا مستحق کون ہوگا جو اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں پر اپنا پیسہ خرچ کرتا ہے۔ تاکہ وہ کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائیں یا اللہ تعالیٰ اس مال سے ان کو فائدہ پہنچائے اور ان کو دوسروں سے بے نیاز کر دے [2]

حدیث میں آتا ہے کہ اگر آدمی خلوص کے ساتھ اپنی، اپنے بیوی بچوں کی اور اپنے ماں باپ کی

---

[1] رواہ احمد باسنا دجید (الترغیب والترہیب۔ الترغیب فی النفقۃ علی الزوجۃ والعیال الخ

[2] مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب فضل النفقۃ علی العیال الخ

ضروریات کی تکمیل کے لیے محنت و مشقت کرتا ہے تو یہ بھی خدا کی راہ میں جدوجہد ہے۔ چنانچہ کعب ابن عجرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے ایک شخص کا گذر ہوا تو اس کی توانائی اور چستی کو دیکھ کر صحابہ نے کہا کہ کاش یہ شخص راہِ خدا میں نکلتا اور اس کی قوت و صلاحیت میدان جہاد میں کام آتی۔ یہ سنکر آپ نے فرمایا کہ اگر یہ اپنے چھوٹے بچوں کے لیے دوڑ دھوپ کر رہا ہے تو یہ بھی خدا ہی کی راہ میں ہے۔ اگر یہ اپنے بوڑھے ماں باپ کے لیے دوڑ دھوپ کر رہا ہے تو یہ بھی خدا ہی کی راہ میں ہے اور اگر یہ اپنی ذات کے لیے دوڑ دھوپ کر رہا ہے تاکہ کسی سے اس کو سوال نہ کرنا پڑے تو یہ بھی خدا ہی کی راہ میں ہے۔ ہاں اگر یہ ریاکاری اور فخر کے جذبے کے ساتھ نکلا ہے تو اس کی ساری کوشش شیطان کے راستے میں ہوگی [1]

قرآن و حدیث کی ان تعلیمات کی بنیاد پر فقہا کا اس بات پر اجماع ہے کہ اولاد کا نان و نفقہ واجب ہے۔ اس کا نہ صرف یہ کہ ادا کرنا ضروری ہے بلکہ بر وقت ادا کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ اس میں تاخیر سے بچہ کی جان جانے کا اندیشہ ہے۔ ظاہر ہے کسی بھی شخص کو چاہے وہ باپ ہی کیوں نہ ہو اس بات کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ دوسروں کی زندگی سے کھیلے اور اس کی ہلاکت کا سبب بنے۔ اس لیے اسلامی ریاست باپ کو مجبور کرے گی کہ وہ بر وقت اپنی اولاد کا نفقہ ادا کرے۔ اگر نہ ادا کرے تو اس کو وہ قید بھی کر سکتی ہے۔ چنانچہ مبسوط میں ہے :۔

یجبر الرجل علی نفقۃ اولادہ الصغار [2]	اپنے چھوٹے بچوں کا نفقہ ادا کرنے پر آدمی کو مجبور کیا جائے گا

اسی بحث میں آگے لکھا ہے :۔

اذا امتنع الاب من الانفاق علی اولادہ الصغار یحبس فی ذالک .... ان النفقۃ لحاجۃ الوقت فهو بالمنع قد	اگر باپ اپنے چھوٹے بچوں کا خرچ نہ دے تو اس سلسلے میں اس کو قید کیا جائے گا ..... نفقہ حال کی ضرورت کی تکمیل کے لیے ہے۔ اگر وہ اس کو ادا کرنے سے انکار کرتا ہے

---

[1] رواہ الطبرانی ورجالہ رجال الصحیح (الترغیب والترهیب۔ الترغیب فی النفقۃ علی الزوجۃ والعیال
[2] السرخسی : المبسوط ۵/۲۲۲

یکون قاصدا الی اتلافہ	تو (گویا) وہ بچہ کو ختم کر دینا چاہتا ہے
والاب یستوجب العقوبۃ	اور باپ اپنے بچہ کو ختم کرنے کی کوشش کرے
الی اتلاف ولدہ[1]	تو وہ سزا کا مستحق ہوگا۔

جو شخص تندرست ہے اور کمانے کی طاقت رکھتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ کمائے اور اپنے ان بچوں کے اخراجات پورے کرے جو کم سنی یا کسی معذوری کی وجہ سے اپنا کوئی ذریعۂ معاش نہیں اختیار کر سکتے۔ ابو سلیمان الجمل شافعی کہتے ہیں۔

یجب علی الاصل الاکتساب	اصل (باپ) پر واجب ہے کہ وہ
نفقۃ فرعہ العاجز عن الکسب[2]	اپنی فرع (اولاد) میں سے جو کمانے سے عاجز ہے اس کے اخراجات کی تکمیل کے لیے کمائے

طاقت کے باوجود اگر کوئی شخص بچوں کے نفقے کے لیے دوڑ دھوپ نہ کرے تو حکومت کو حق ہوگا کہ اس کو حوالۂ زنداں کر دے۔ فقہاء نے صراحت کی ہے کہ باپ کے ذمے اولاد کا اگر کوئی قرض ہو اور وہ اس کو ادا نہ کرے تو اس کو قید نہیں کیا جائے گا لیکن نفقہ ایک ایسا قرض ہے کہ جس کے نہ ادا کرنے کی صورت میں اس کو قید بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ نفقہ کے نہ ادا کرنے سے اولاد کی ہلاکت کا خطرہ ہے لیکن کسی دوسرے قرض کے ادا نہ کرنے سے یہ خطرہ نہیں ہے۔ جب جان کا خطرہ نہیں ہے تو باپ کے ساتھ جہاں تک ممکن ہو رعایت کی جانی چاہیے اور اس کی زیادتیوں کو نظر انداز کرنا چاہیے۔ ابن ہمام لکھتے ہیں:۔

ان کان قادرا علی الکسب	باپ اگر کمانے کی قدرت رکھتا ہو تو
اکتسب فان امتنع عن الکسب	وہ کمائے گا (اور خرچ کرے گا) اگر وہ نہ
حبس بخلاف سائر الدیون	کمائے تو اس کو قید کر دیا جائے گا۔ برخلاف
ولا یحبس والد وان علا فی	دوسرے تمام قرضوں کے۔ باپ کو اور اس
دین ولدہ وان سفل الا فی	کے اوپر کے سلسلے کو (دادا، پردادا وغیرہ)

[1] السرخسی: المبسوط ۵/۲۲۴

[2] ابو سلیمان الجمل: حاشیہ الجمل علی شرح المنہج ۴/۵۱۰

النفقة لان الا متناع اتلاف ولا يحل للاب ذالك[1]

لڑکے اور پوتے (اور یہ سلسلہ نیچے جہاں تک پہنچے) کے قرض میں قید نہیں کیا جائے گا، نفقہ اس سے مستثنیٰ ہے۔ اس لیے کہ نفقہ نہ ادا کرنے سے بچہ تلف ہو جائے گا اور بچہ کو برباد کرنا باپ کے لیے جائز نہیں ہے۔

فقہاء نے یہاں تک لکھا ہے کہ جو شخص کمانے کے قابل نہ ہو اسے دوسروں سے مانگ کر بچوں پر خرچ کرنا چاہیے[2]۔ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا شرعاً سخت معیوب ہے لیکن یہی معیوب فعل اس وقت ضروری ہو جاتا ہے جب کہ بچہ کی جان بچانے کا سوال ہو۔

ویسے اگر صحیح معنے میں اسلامی ریاست قائم ہو تو اس بات کا امکان کم ہی ہے کہ کسی شخص کو اپنی معذوری اور معاشی تنگی کی وجہ سے اپنے اور اپنے بچوں کے لیے بھیک مانگنا پڑے۔ وہ ایک تو از روئے شرع اس کے قریب ترین رشتہ داروں کو اس کا نفقہ برداشت کرنے پر مجبور کرے گی لیکن اگر ان میں سے کوئی بھی اس حیثیت میں نہ ہو تو اسلامی ریاست خود اس کا اور اس کے متعلقین کا بوجھ اٹھائے گی۔ اسی وجہ سے بعض فقہاء نے لکھا ہے کہ کسی بھی مجبور شخص کو دوسرے کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہیں ہے، بیت المال سے اس کے اخراجات دیے جائیں گے[3]۔

---

[1] ابن الہمام: فتح القدیر ۳/ ۳۴۴

[2] ابن النجیم: البحر الرائق ۴/ ۲۰۱

[3] حوالۂ سابق

خطبۂ صدارت

(محترمہ قیصر بیگم نیازی صاحبہ)

محترم خواتین!

مسلم پرسنل لا کی تائید وحمایت میں ۲۷ ر ۲۸ ر دسمبر ۱۹۷۶ء کو عروس البلاد بمبئی میں جو عظیم الشان تاریخی کنونشن منعقد ہوا، اس پر میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتی ہوں اور مسلمانان بمبئی کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتی ہوں کہ ان کی کوششوں سے مسلمانوں کا نمائندہ اور تاریخی اجتماع منعقد ہو سکا۔ توقع تھی کہ اس کنونشن کے متفقہ فیصلے کے بعد مسلم پرسنل لا میں ترمیم وتبدیلی کی آوازیں آنی بند ہو جائیں گی لیکن شاید ریاست مہاراشٹر ہی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہاں مسلم عورتوں کے "ہمدرد" کچھ زیادہ ہی پلئے جاتے ہیں، چنانچہ ابھی پچھلے دنوں ان "ہمدرد نسواں" کی طرف سے جو کانفرنس بلائی گئی اس میں انھوں نے یہ مطالبہ کیا کہ "مسلم پرسنل لا نے ہندوستان کی ۳½ کروڑ مسلم خواتین کو ان کے حقوق سے محروم کر دیا ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کے اس ناکارہ اور انسانیت دشمن قانون (یعنی مسلم پرسنل لا) کو بدل دیا جائے اور یکساں سول کوڈ نافذ کیا جائے۔

اس چیلنج کا جواب بھی مہاراشٹر ہی سے ملنا چاہیے تھا۔ الحمد للہ بمبئی کی نیک دل خواتین نے اس تعلق سے اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کیا اور ایک عظیم کانفرنس کا انعقاد کر کے مسلم خواتین کے جذبات واحساسات کو محسوس کرایا جس کے لیے وہ میری اور تمام مسلم خواتین کی طرف سے مبارکباد کی مستحق ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ عورتوں کی مظلومیت کے نام پر مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کا شوشہ چھوڑا گیا ہے۔ اس کا جواب مسلم خواتین ہی بہتر طور پر دے سکتی ہیں۔ اس لحاظ سے مسلم پرسنل لا خواتین کانفرنس وقت کی آواز ہے جس میں شرکت ایک مقدس فرض کی ادائیگی سے کم نہیں ہے۔ میرے لیے یہ بات مسرت کا باعث ہے کہ اس

سعادت میں میں بھی اپنی دوسری بہنوں کے ساتھ شریک ہوں۔ اگرچہ کانفرنس کے ذمہ داروں نے کانفرنس کی صدارت کا فریضہ میرے ذمہ کیا ہے لیکن میں محسوس کرتی ہوں کہ اپنی علمی کم مائیگی کی بنا پر اس قابل ہرگز نہ تھی کہ اس عظیم الشان کانفرنس کا بوجھ اٹھا سکتی لیکن اب جبکہ یہ بوجھ ناتواں کندھوں پر ڈال دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کام میں میری مدد فرمائے اور مجھے آپ سب کے حسن ظن کا مستحق بنائے۔

مسلم پرسنل لا کیا ہے

عزیز بہنو! یہ آپ جانتی ہی ہیں کہ جس چیز کو مسلم پرسنل لا کہا جاتا ہے۔ وہ شریعت اسلامی کے وہ قوانین ہیں جن کا تعلق مسلمانوں کی معاشرتی زندگی سے ہے۔ یہ اگرچہ کل شریعت نہیں ہے لیکن شریعت اسلامی کا کافی اہم جزو ہے جو نکاح طلاق اور وراثت وغیرہ سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ انگریزوں کا بنایا ہوا قانون نہیں ہے، جیسا کہ مخالفین مغالطہ دیتے ہیں۔ بلکہ انگریزوں کے دور میں مسلمانوں کے اس مخصوص قانون کے لیے "مسلم پرسنل لا" کی اصطلاح وضع کی گئی اور ۱۹۳۷ء میں مسلم پرسنل لا (شریعت) اپلیکیشن ایکٹ نافذ کیا گیا جس کی رو سے عدالتوں کو اس بات کا پابند کر دیا گیا ہے کہ وہ نکاح، مہر، طلاق، خلع اور وراثت وغیرہ امور میں شرعی قوانین کے مطابق فیصلہ کریں۔ واضح ہوا ہوگا کہ مسلم پرسنل لا محض چار شادیوں کے قانون کا نام نہیں ہے بلکہ یہ تمام معاشرتی قوانین پر مشتمل ہے۔ اس کے تین اہم باب ہیں۔ نکاح، طلاق، اور وراثت، مناسب ہوگا کہ ان مسائل پر قدرے وضاحت کے ساتھ گفتگو کی جائے۔

نکاح

سب سے پہلے نکاح ہی کے مسئلے کو لیجیے۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے دنیا میں نوع انسانی کو جس مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اس کے لیے ازدواجی رشتہ کا قیام ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ اسلام نے اس معاملے کو جس نظر سے دیکھا ہے۔ اس کی مثال شاید ہی کہیں ملے۔ دنیا میں ازدواجی تعلقات کے تین طریقے رائج رہے ہیں۔ ان میں ایک طریقہ وہ ہے جن میں ایک مرد لاتعداد عورتوں سے تعلق قائم کرتا ہے جس کو کثرت ازدواج کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ دوسرا طریقہ ایک زوجگی کے جبری نفاذ کا ہے، جس میں مرد قانوناً ایک بیوی کا پابند ہوتا ہے لیکن ناروا طریقے اختیار کر کے غیر قانونی بیویاں رکھنے پر کوئی پابندی نہیں ہوتی اور تیسرا شریفانہ طریقہ وہ ہے جو شریعت اسلامیہ کا مقرر کردہ ہے۔ اس شرعی قانون کے ذریعے صحیح

بعض میں پہلی بار کثرتِ ازدواج پر پابندی عائد کی گئی ہے۔ البتہ بعض اہم مصالح کے پیشِ نظر عدل کی شرط کے ساتھ چار بیویوں کی اجازت دی گئی ہے۔ تاکہ مرد بے راہ روی سے بچیں اور صرف جائز راہوں پر اکتفا کریں۔ اگر یہ دروازہ بند کر دیا جائے تو سوسائٹی غلط راہوں پر جا پڑے گی۔ افسوس ہے کہ لوگ اخلاقی قدروں کو وزن نہیں دیتے۔ اسی لیے اسلام کے اصولِ معاشرت کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔

تعددِ ازدواج کا مسئلہ

مسلم پرسنل لا کے جس معاشرتی قانون پر سب سے زیادہ اعتراضات کیے جاتے ہیں وہ تعددِ ازدواج (چار بیویوں تک) کی اجازت کا قانون ہے۔ چنانچہ سورۂ النساء کی آیت ۳ کے حوالے سے بڑی بحث کی جاتی ہے۔ آیت یہ ہے:۔

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا	اگر تم یتیموں کے ساتھ ناانصافی کرنے سے
فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ	ڈرتے ہو تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں۔ ان میں
لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ	سے دو دو تین تین چار چار سے نکاح کر لو۔
وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا	لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ان کے ساتھ عدل
تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا	(انصاف) نہ کر سکو گے، تو پھر ایک ہی بیوی
مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ	کرو۔

اس آیت میں بیان کیے گئے تعددِ ازدواج کے مسئلے کو صحیح طور سے نہ سمجھنے والوں کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ اس آیت کو ایک سے زیادہ بیویوں کے لیے دلیل ٹھہراتے ہیں۔ حالانکہ اس کے ذریعے کثرتِ ازدواج پر پابندی عائد کر کے تعددِ ازدواج کو چار عورتوں تک محدود کر دیا گیا ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ عرب میں ہمیشہ سے تعددِ ازدواج کا قانون رائج تھا۔ وہاں کے باشندے غیر محدود تعداد میں شادیاں کرتے تھے۔ یہ ان کے نزدیک عیب کی بات نہ تھی فخر کی بات سمجھی جاتی تھی۔ سورۂ النساء کی اس آیت نے تعددِ ازدواج کے جائز حق اور رائج قانون میں دو بنیادی اصلاحیں کر دیں۔ ایک اصلاح یہ کہ تعددِ ازدواج کو چار میں محدود کر دیا اور دوسری اصلاح یہ کی کہ اس نے بیویوں کے درمیان عدل (انصاف) کی ایک کڑی شرط لگا دی۔

قرآن حکیم جس کو قیامت تک ایک ضابطۂ حیات کی حیثیت سے دنیا میں باقی رہنا ہے۔ اس میں

اس ضابطہ کار ہ جانا یہ بتاتا ہے کہ یہ قانون نہایت اہم مصالح کا حامل ہے ۔ بعض افراد اور قوموں کو
ایسے حالات سے واسطہ پیش آتا رہتا ہے جس میں اس اجازت سے فائدہ اٹھانا دین و اخلاق اور
انسانیت کے تحفظ کے لیے ناگزیر ہو جاتا ہے ۔ مثلاً کسی شخص کی بیوی دائم المریض ہو یا بانجھ ہو اور مرد اولاد
کی خواہش رکھتا ہو ۔ جنگ یا فسادات کی وجہ سے بھی بیوا ؤں کا مسئلہ پیدا ہو سکتا ہے اور ان کے لیے
رہائش ، نان و نفقہ اور عفت و اخلاق کا مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔ ایسی تمام صورتوں میں شریعت اسلامی
نے مرد اور عورت کے لیے جائز راستے کھلے رکھے ہیں تاکہ سوسائٹی غلط کاری کے عذاب سے محفوظ رہے
اس کے برعکس آج مغربی تہذیب کا نمونہ یہ ہے کہ مرد جتنی عورتوں سے چاہے آزاد تعلقات قائم کر سکتا ہے
لیکن نکاح ایک ہی عورت سے کر سکتا ہے ۔ مغربی تہذیب کے متوالوں کے نزدیک یہ صورت عین تہذیب
اخلاق اور عدل و انصاف کی ہے لیکن اگر کوئی شخص ایسی آوارگی اور آزادی کو پسند نہیں کرتا اور
ایک عورت کی موجودگی میں دوسری شادی کر لیتا ہے اور عورت اور اس کی اولاد کی تمام تر ذمہ داری
اپنے سر لے لیتا ہے تو مغرب زدہ اصحاب کے نزدیک عورتوں پر ظلم ہوتا ہے ۔

ایک بات یہ بھی سوچنے کی ہے کہ اگر دوسری شادی پر پابندی عائد کی گئی تو جو مرد اولاد نہ ہونے
وغیرہ وجوہ کی بنا پر دوسری شادی کے خواہشمند ہوں گے وہ دوسری شادی کی راہ کو کھلا نہ پا کر اپنی موجودہ بیوی
کو طلاق دے دیں گے تاکہ دوسری شادی کر سکیں اور ایک زوجگی کے قانون کی بھی پابندی ہو ۔ ایسی صورت
میں بتائیے کہ نقصان مرد کا ہو گا یا عورت کا ؟ جو لوگ ایک زوجگی کے قانون کی وکالت کرتے ہیں وہ عورتوں
کے حق میں ہرگز بہتر فیصلہ نہیں کرتے ، بلکہ عورتوں کے لیے مزید مشکل پیدا کر دیتے ہیں ۔

مسئلہ طلاق

اب طلاق کے مسئلے کو لیجیے بعض مغرب زدہ مسلمان اسلام کے قانون طلاق پر یہ اعتراض کرتے
ہیں کہ اسلامی شریعت نے بلا وجہ طلاق دینے کا حق بھی مرد کو دیا ہے ۔ اس کا نتیجہ ہے کہ مرد بغیر کسی وجہ کے اپنی
بیویوں کو تین طلاقیں دے کر ان کی زندگیاں برباد کر دیتے ہیں لیکن اگر آپ دیکھیں تو قرآن و حدیث کے
مطالعہ سے واضح طور پر یہ معلوم ہو گا کہ اسلامی شریعت نے طلاق کو آخری چارہ کار کے طور پر استعمال کرنے کی
ترغیب دی ہے ۔ اور حدیث رسولؐ میں طلاق کو جائز چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز قرار دیا گیا
ہے ۔ اس طرح اسلامی شریعت نے بیک وقت تین طلاقیں دینے کو گناہ قرار دیا ہے ۔ اگر کچھ لوگ اپنی بیویوں

کو بلا وجہ طلاق دیتے ہیں تو وہ حق و اختیار کا بے جا استعمال کرتے ہیں۔ قانون کا بے جا استعمال قانون کی خرابی پر نہیں، بلکہ قانون کی خلاف ورزی پر دلالت کرتا ہے۔

ویسے بلا وجہ طلاق دینا ایک الگ بات ہے اور طلاق کی وجہ نہ بتانا دوسری بات۔ شوہر اور بیوی کے تعلقات کی جو نوعیت ہوتی ہے اس کے پیشِ نظر بعض اوقات طلاق کی وجہ نہ بتانا صرف یہی نہیں کہ معقول ہو سکتا ہے بلکہ شریفانہ طرزِ عمل یہی ہو سکتا ہے کہ طلاق کی وجہ نہ بتائی جائے۔

اسلام نے طلاق دینے کا حق مردوں کو دیا ہے۔ لیکن نئی روشنی سے چکا چوند بصارت کو اس میں عورتوں پر ظلم نظر آتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ طلاق کا حق مردوں سے چھین کر عدالت کو دیا جائے۔ ان کے خیال میں ایسا کرنے سے طلاقوں کی تعداد کم ہوگی اور اس کا فی صد تناسب گھٹے گا۔ اور بہت سے گھر برباد ہونے سے بچ جائیں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ بالکل خیالی بات ہے۔ تجربہ یہ بتاتا ہے کہ یہ تدبیر اپنے مقصد میں سخت ناکام ہے۔ یورپ اور امریکہ کے علاوہ جہاں جہاں بھی یہ قانون نافذ کیا گیا، وہاں طلاقوں کی تعداد کم ہونے اور ان کا فیصد تناسب گھٹنے کی بجائے بے حد بڑھ گیا ہے اور بڑھتا ہی جارہا ہے۔ بے شمار گھر برباد ہو رہے ہیں۔ اور خاندان کا شیرازہ بکھرتا جارہا ہے۔ برطانیہ کے تازہ اعداد و شمار کے مطابق وہاں جو شادیاں طلاق پر ختم ہوئیں۔ ان کی تعداد گذشتہ دس برسوں میں ۱۵ ہزار سے بڑھ کر ۷۷ ہزار ہو چکی ہے۔ حد یہ ہے کہ وہاں عورتیں اس بنا پر طلاق حاصل کرنے کے لیے مقدمہ دائر کرتی ہیں کہ نیند کی حالت میں ان کے شوہروں کے منہ سے خراٹے کی آواز بلند ہوتی ہے۔ یورپ اور امریکہ میں نکاح اور طلاق ایک مذاق بن کر رہ گئے ہیں۔ طلاق میں یہ اضافہ نتیجہ ہے اس قانونی اصلاح کا جو طلاق کے معاملے میں کی گئی ہے۔ اس کے برعکس مسلمان جس ملک میں بھی آباد ہیں، ان کے معاشرے میں باوجود ناواقفیت کے طلاق کا فی صد تناسب یورپ اور امریکہ سے بہت کم ہے۔ اس کے باوجود اگر کوئی شخص اسلام کے قانونِ طلاق پر الزام زنی کرتا ہے تو اس کا ایک ہی مطلب ہے اور وہ یہ کہ وہ مسلم سوسائٹی اور ملکی سماج کو عیاشی کے اسی معیار پر لے جانا چاہتا ہے جہاں شادی ایک مذاق سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔

حقیقت یہ ہے طلاق کا اختیار مرد کے ہاتھ سے چھین کر عدالت کو دینا، عورتوں کے حق میں کچھ بھی مفید نہیں ہے، بلکہ عورتوں کے لیے زیادہ پریشانی کا موجب ہے۔ کون نہیں جانتا کہ عدالت سے انصاف حاصل کرنا کوئی آسان بات نہیں ہے، کجا کہ میاں بیوی کے آپس کے معاملات میں پھر عدالت

طلاق کے اختیار سے محروم ہو گا تو بیوی کو تنگ کر سکتا ہے اور اس کی زندگی کو اجیرن بنا کر رکھ سکتا ہے۔ اس لیے مرد کے ہاتھ سے طلاق کا اختیار چھین لینا مسئلہ کا حل نہیں ہے۔ بلکہ مسئلے کو اور زیادہ پیچیدہ بنانا ہے۔

وراثت کا مسئلہ

وراثت کے مسئلہ میں ایک بڑا اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ اسلام نے وراثت کی تقسیم میں مرد اور عورت کے درمیان انصاف نہیں کیا ہے۔ اعتراض کرنے والوں کے نزدیک مرد اور عورت دونوں کو برابر کا حصہ ملنا چاہیے۔ اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اسلام نے جن وجوہ کی بنا پر مرد کو عورت کے مقابلے میں دوگنا حصہ دلوایا ہے وہ عورت اور مرد کے دائرۂ کار کے لحاظ ہی سے کیا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اسلام نے عورت کے مہر اور نان ونفقہ کی ذمہ داری مرد ہی پر ڈالی ہے۔ نیز بچوں اور خاندان کی کفالت کا ذمہ دار بھی مرد ہی کو قرار دیا ہے۔ اس کے برعکس عورت پر اس طرح کی کوئی مالی ذمہ داری اسلام نے نہیں ڈالی ہے۔ اب مساوات کے نقطۂ نظر سے ہونا تو یہ چاہیے کہ عورتوں کو بھی مہر کی ادائیگی، نان ونفقہ اور بچوں کی کفالت میں برابر کا ذمہ دار ٹھہرا دیا جائے لیکن یہ بات وہ نہیں کہتے کیونکہ انہیں تو اسلام پر بہرحال اعتراض کرنا مقصود ہے۔ تعجب تو یہ ہے کہ تہذیب جدید کے بہی خواہوں نے عورتوں پر دوگنے فرائض کا جو بوجھ ڈال رکھا ہے کہ وہ گھر بھی دیکھیں اور معاشی کفالت بھی کریں تو اس میں انہیں ناانصافی اور ظلم نظر نہیں آتا۔ لیکن اسلام نے عورتوں کے دائرۂ کار میں ان کی فطرت کا لحاظ کر کے ان کی فرائض کی ادائیگی میں جو رعایتیں اور سہولتیں دی ہیں۔ اسی دائرۂ کار کے لحاظ سے ان کے حقوق بھی متعین کر دیے ہیں تو اس کو شریعت اسلامی کے ظلم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اسلام ۔ ایک مکمل نظام حیات

میری محترم بہنو! مذکورہ بالا مسائل کی وضاحت سے آپ کو اندازہ ہوا ہو گا کہ اسلام انسان کی صحیح رہنمائی کرتا ہے اور اس کی رہنمائی انفرادی زندگی کے لیے بھی ہے۔ اور اجتماعی زندگی کے لیے بھی۔ اسلام کا اصل مطالبہ یہ ہے کہ زندگی کے تمام معاملات اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہدایات کے تحت انجام دیے جائیں۔ جو شخص اسلام کو ذرا بھی جانتا ہے اسے معلوم ہے کہ مذہب کے بارے میں اسلام کا تصور وہ نہیں ہے جو دوسرے مذاہب والوں کا ہے۔ عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بس مذہب نام

ہے اس تعلق کا جو انسان اور خدا کے درمیان انفرادی زندگی کے مخصوص دائرے میں ہو۔ معاشرتی معاملات اور اجتماعی زندگی سے تعلق رکھنے والے مسائل اس کے دائرے سے باہر ہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ کچھ رسم و رواج اور کچھ اخلاق و عبادات کو ہی مذہب جانتے ہیں لیکن اسلام زندگی کو دین و دنیا کے دو خانوں میں تقسیم نہیں کرتا۔ اس کی نظر میں نہ معاملات مذہب سے الگ کوئی چیز ہیں اور نہ کاروبار، معیشت و سیاست ـــ وہ تو کہتا ہے کہ انسان کی پوری زندگی دین کے دائرے میں داخل ہے اور کسی مومن کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ دین کے کچھ اجزا کو لے اور کچھ کو ترک کرے۔ اس قسم کی حرکت پر سخت تنبیہ کی گئی ہے چنانچہ ارشاد ہے:۔

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ — کیا کتاب الٰہی کے ایک حصہ پر ایمان لاتے

وَ تَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ — ہو اور دوسرے کا انکار کرتے ہو۔

مسائل کا حل

قرآن و سنت نے جن معاملات کے سلسلے میں جو قوانین مقرر کیے ہیں ان میں تبدیلی کا حق غیر تو غیر، ساری دنیا کے مسلمانوں کو مل کر بھی حاصل نہیں ہے۔ پیش آمدہ مسائل میں اجتہاد کا مسئلہ تو اس کی گنجائش یقیناً موجود ہے لیکن یہ کام صرف انہی لوگوں کا ہے جو کتاب و سنت میں گہری بصیرت رکھتے ہوں اور جن کی زندگیاں متقیانہ ہوں۔ دنیا کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ کسی چیز کے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق اس فن کے ماہر کو ہے۔ اگر ایسا نہ ہوگا تو مختلف علوم و فنون کی تعلیم پر اربوں روپیہ خرچ کرنے کی کیا ضرورت تھی ـــ کیونکہ دیہات کے ہل چلانے والوں ہی کو مختلف شعبے سپرد کر دیے جاتے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جن لوگوں نے الحاد و بے دینی اور مغرب زدگی کے ماحول میں آنکھیں کھولیں اور اسلام کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ ایسے لوگ اجتہاد کرنے بیٹھ گئے ہیں۔

خرابی کہاں ہے؟

اب دیکھنا یہ ہے کہ واقعی خرابی کہاں پائی جاتی ہے۔ آیا خرابی قانون شریعت میں ہے جیسا کہ کچھ معترضین بتلاتے ہیں۔ یا سوسائٹی کے عمل میں ہے؟ اگر دیانت دارانہ جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ خرابی قانون میں نہیں، بلکہ سماج میں ہے۔ اس کے جہاں اور اسباب ہیں ان میں ایک بڑا سبب یہ ہے کہ لوگ شریعت کے بتلائے ہوئے ضابطے سے ٹھیک طور سے واقف نہیں ہیں۔ اس لیے عمل میں بھی کوتاہیاں ہوتی ہیں مثلاً

طلاق کے بارے میں شریعت نے واضح طور پر اس کے استعمال کا صحیح طریقہ بتایا ہے لیکن جہالت کا یہ عالم ہے کہ ایک شخص اٹھتا ہے اور چھوٹی باتوں کو ناگواری کی بنیاد بنا کر ایک ہی وقت میں تین تین طلاقیں دے ڈالتا ہے یہی حال عورتوں کے حقوق ادا کرنے کا ہے۔ اس کے بارے میں شریعت کے احکام موجود ہیں لیکن کبھی لوگ ناواقفیت کی بنا پر اور کبھی نفسانیت کی بنا پر عورتوں کی حق تلفی کرتے ہیں۔ اب کیا یہ سمجھنا صحیح ہوگا کہ انہیں ان حق تلفیوں سے روکنے کے لیے شریعت میں تبدیلی کی جائے؟ واقعہ یہ ہے کہ بگاڑ مردوں اور عورتوں دونوں کے اندر پیدا ہو گیا ہے اور جس طرح اسلام کے دوسرے احکام کی خلاف ورزی مرد و زن دونوں کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح معاشرتی معاملات میں بھی اسلام کی تعلیمات کی خلاف ورزی مرد و زن دونوں کرتے رہتے ہیں

خرابیوں کا علاج

اس لیے ان خرابیوں کو دور کرنے کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ مردوں اور عورتوں کو اسلام کے مقرر کیے ہوئے معاشرتی حقوق اور ذمہ داریوں سے واقف کرایا جائے اور اس پر عمل درآمد کے لیے ان کے اندر ایمان کی طاقت اور خدا خوفی کے جذبات پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ ہمارے نزدیک بہت سی خرابیاں اس لیے بھی پائی جاتی ہیں کہ لوگوں کا تعلق ایمان سے کمزور ہو گیا ہے۔ ان کے دلوں سے خدا کا واقعی خوف نکل گیا ہے۔ اس لیے اس طرح کی خرابیوں کا علاج صرف قانون سے یا شریعت میں ترمیم سے نہیں ہو سکتا — بقول ایک مفکر —— "اگر دل نہیں بدلیں گے تو ہزار تبدیلیوں کے بعد بھی معاشرتی ناانصافیاں جوں کی توں قائم رہیں گی، بلکہ ہو سکتا ہے کچھ بڑھ جائیں۔"

مثال کے طور پر چوری کرنا ہمارے ملکی قانون میں جرم ہے لیکن اس کے باوجود کچھ لوگ چوری کرنے لگتے ہیں —— لیکن کیا کبھی آپ نے سنا کہ چونکہ کچھ لوگ چوری اور لوٹ مار کرنے لگے ہیں۔ اس لیے قانون ہی کو ختم کر دینا چاہیے۔ یا کچھ لوگ قانوناً ممنوع ہونے کے باوجود شراب پینے پلانے لگے ہیں۔ اس لیے شراب بندی کا قانون ختم کر دیا جانا چاہیے۔ جب تک کوئی قوم یا حکومت حماقت پر اتر نہ آئے۔ اس طرح کے اقدامات کیسے کر سکتی ہے اور اگر کر دے تو یہ چیز سوسائٹی اور سماج کے حق میں کیسے مفید ہو سکتی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے قوم کے نام نہاد سماجی مصلحین اور مسلم خواتین کے مخصوص ہمدرد، انصاف کی لاٹھی الٹی گھمانا چاہتے ہیں۔ ہم ایسے تمام لوگوں سے کہہ دینا چاہتی ہیں کہ انصاف کے نام پر ظلم، آزادیٔ فکر و نظر کے نام پر جبر اور عقل کے نام پر اس احمقانہ روش کو روا رکھا گیا تو مسلم خواتین ڈٹ کر مقابلہ کریں گی۔

اسلام کا معاشرتی نظام ایک تحفہ

ہم یہ واضح کر دینا چاہتی ہیں کہ ہم کسی طبقہ و مذہب کے خلاف قوت کی مہم چلانا نہیں چاہتیں اور نہ اپنے سماجی نظام کو دوسرے فرقوں پر جبراً اور زبردستی لادنا چاہتی ہیں۔ ہمیں اپنی تہذیب، اپنے تصورحیات اور اپنے عائلی نظام پر فخر ہے اور ہم اس کو اپنے ہی لیے مفید اور کارآمد خیال نہیں کرتیں بلکہ تمام بنی نوع انسان کے لیے اسے فلاح و نجات کا ضامن سمجھتی ہیں۔

اس لیے ہمیں آگے بڑھنا چاہیے۔ اور اپنے خاندانی و معاشرتی نظام کی خوبیوں کا تحفہ اسے پیش کرنا چاہیے۔ ایمان ہمارا سرمایہ ہے اور یقین ہماری قوت ہے۔ یہ کانفرنس ہمارے اسی ایمان و یقین کا اظہار ہے۔ میری دعا ہے کہ مسلم پرسنل لا خواتین کانفرنس جو مسلم خواتین کی بیداری کی علامت بن گئی ہے۔ اسی عزم کی حامل بن جائے کہ اس قانون الٰہی کی افادیت کو ہم اپنے کردار و عمل سے اس طرح عام کریں جس طرح اللہ تعالیٰ کی دوسری نعمتیں انسانوں کے لیے عام ہیں۔

اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو اپنے دین کی حفاظت کرنے اور اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی زیادہ سے زیادہ توفیق عطا فرمائے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

انسانی اخوّت

اور ہمارا کام

(۲)

(ملک حبیب اللہ صاحب)

مل جل کر حل کرنے کی صورتیں

(۱) میدان کار کا تعین :۔ سب سے مقدم کام یہ ہونا چاہیے کہ اپنے کارکنوں کی تعداد اور صلاحیتوں کی مناسبت سے میدان کار متعین کر لیا جائے۔ اگر کسی جگہ پورے محلے یا پوری بستی کو میدان بنانا ممکن نہ ہو تو کارکن اپنے گھروں سے متصل چند گھروں کو منتخب کر لیں جن میں مسلم و غیر مسلم دونوں ہی شامل ہوں۔ آبادی کا یہ منتخب ٹکڑا چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا ہو سکتا ہو سکتا ہے۔ اس کا انحصار کارکنوں کی اپنی صلاحیت اور رغبت کار پر ہے۔ اگر کسی جگہ ہمارا ایک ہی کارکن ہو اور بہت معمولی صلاحیت رکھتا ہو تو وہ گھروں کے بجائے اپنے پڑوس میں افراد کا انتخاب کر کے اپنا میدان کار متعین کر لے

(۲) سروے رپورٹ مرتب کرنا :۔ اس کے بعد دوسرا اہم کام سروے کرنا ہے۔ محلہ، بستی یا آبادی کے منتخب ٹکڑے کا سروے کرنا ہو گا۔ طریقہ یہ ہو کہ مشترک امور و مسائل کی پوری فہرست سامنے رکھ لی جائے اس کی روشنی میں سروے کی ایک جامع رپورٹ مرتب کی جائے۔ یہ کام تعطیلات گرما میں اسکول و کالج کے مسلم و غیر مسلم طلبہ سے لیا جائے۔ تو زیادہ آسانی ہو گی۔ اگر کارکن فہرست کے جملہ امور کو ہاتھ میں لینے کی قوت و صلاحیت نہ پاتے ہوں تو ایسے مشکل امور کو مستثنیٰ کر کے سروے کریں کوشش کی جائے کہ ہاتھ میں لیے جانے والے توجہ طلب امور اعداد و شمار کی صورت میں سامنے آ جائیں۔ منفرد کارکن اپنی صلاحیت کے مطابق فہرست کے ایک یا چند امور کا انتخاب کرے اور منتخب فرد یا افراد سے مل کر انجام دہی میں لگ جائے

(۳) پروگرام بنانا : تیسرا اہم کام پروگرام بنانا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہونا چاہیے پہلے اپنے کارکنوں کی نشست کی جائے۔ آبادی کا منتخب حصہ اور اس کی سروے رپورٹ زیر بحث لائی جائے۔ مکمل کر تبادلۂ خیال

کیا جائے، کوشش کی جائے کہ گفتگو میں ہر کارکن حصہ لے۔ معمولی علم اور صلاحیت والے کارکن کی رائے کو بھی اہمیت دی جائے۔ ابتدائی اقدام کے لیے حل طلب امور و مسائل میں سے کسی ایک مسئلہ کا انتخاب کیا جائے۔ یہ مسئلہ افادیت کے لحاظ سے اہم ہو، زیر عمل لانے کے لحاظ سے آسان ترین ہو۔ مزید پیش قدمی کے لیے زینہ کا کام دے سکے۔ منتخب مسئلہ کے فیصلے سے ہر کارکن کو پوری طرح مطمئن کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس فیصلے کے بعد اسے بروئے کار لانے کی تدابیر متعین کی جائیں۔ کیا کیا وسائل درکار ہوں گے، کتنے سرمایہ کی ضرورت ہوگی۔ وسائل اور سرمایہ کی فراہمی میں اپنے کارکن کس قدر حصہ لے سکیں گے۔ وقت، مال اور جسمانی محنت کے لحاظ سے باہر سے آبادی کے کن کن افراد سے کس قسم کا تعاون متوقع ہے۔ تعاون دے سکنے والے افراد اور اقسام تعاون کی ایک جامع فہرست مرتب کر لی جائے۔ اس کے بعد ہر کارکن اپنے اپنے حلقۂ تعارف میں آبادی کے منتخب حصہ سے متعلق تعمیر و ترقی اور اصلاح و تربیت کی فضا بنانے کی بھرپور کوشش کرے اس دوران اگر ضرورت محسوس ہو تو باہری تعاون کی فہرست میں ترمیم کر لی جائے۔ کسی حد تک فضا بن جانے کے بعد ایک ملی جلی نشست کی جائے جو اپنے کارکنوں اور باہری متوقع معاونین پر مشتمل ہو۔ شرکائے نشست کو مختصر اور جامع انداز میں پوری اسکیم سے روشناس کرایا جائے۔ منتخب مسئلہ کو بھی بطور تجویز پیش کر دیا جائے۔ ان کی رہنمائی کے لیے مسئلہ کی اہمیت، افادیت بتائی جائے اگر اسے حل کرنے کا فیصلہ کیا جائے تو اس کی ضروریات ان کی فراہمی کے امکانات پر سرسری اظہار خیال کر کے ان سے چاہا جائے کہ وہ اپنی پوری قلبی آمادگی کے ساتھ باہمی مشورے سے اس مسئلے کو ہاتھ سے لینے کا فیصلہ کریں۔ اسے بروئے کار لانے کی تدابیر متعین کریں مطلوبہ وسائل و سرمایہ کا تخمینہ کریں۔ ان کی فراہمی کہاں کہاں سے کس کس شکل میں ہو سکتی ہے طے کرتے ہوئے ایک جامع پروگرام مرتب کریں۔ پھر اس مشترکہ پروگرام کو زیر عمل لانے میں اپنے کارکن پوری دلچسپی توجہ اور محنت سے کام کریں۔

(۴) دائرۂ اثر اور معلومات میں اضافہ کرنا: کارکنوں کو چاہیے کہ وہ رفتہ رفتہ اپنے پسماندہ لوگوں سے روابط کو مستحکم بنائیں۔ ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے، پسماندہ لوگوں میں خصوصیت کے ساتھ اپنے روابط کو مستحکم بنانے ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے میں بھائی چارہ اور انسانی مساوات کا مظاہرہ کریں۔ یتیموں، بیواؤں اور معذوروں کی دلجوئی و خدمت میں پیش پیش رہیں۔ مختلف مذہب، مسلک، پارٹی، تنظیم سے وابستہ افراد کے مابین رواداری کو فروغ دینے اور باہمی تعلقات کو خوشگوار بنائے رکھنے کی فکر رکھیں۔ امداد

رفاہی کاموں سے متعلق سرکاری و سماجی اداروں کی بیش از بیش معلومات فراہم کریں۔ ان سے متعلق متعلقہ
عملے سے قریبی ربط رکھنے کی کوشش کریں۔ دیہی ایریا کے کارکن خصوصیت کے ساتھ پنچایت سوسائٹی، بلاک
اسکول، اسپتال کے عملے سے اچھی طرح متعارف رہیں تاکہ امدادی کاموں میں حسب ضرورت ان سے تعاون
لے سکیں۔ اپنی ریاست اور ضلع کی حد تک سرکاری و سماجی اداروں سے متعلق تفصیلی معلومات کے لیے گورنمنٹ
کی جانب سے شائع شدہ لٹریچر بھی حتی الوسع فراہم کریں اور عام کارکنوں کے لیے ان کے مطالعہ کی سہولت پیدا
کریں۔ بے روزگاروں کو روزگار دلانے کے سلسلے میں اولین توجہ چھوٹے گھریلو روزگاروں پر دیں، مقصود یہ
ہو کہ آبادی کے لوگ بے روزگاری کی وجہ سے فاقہ کرنے اور بھیک مانگنے پر مجبور نہ ہوں۔ ناگزیر ضروریات
زندگی، مثلاً مکان، غذا، کپڑا، ابتدائی بنیادی تعلیم اور علاج معالجہ سے محروم نہ رہیں۔ ایسے روزگار جو کم
سرمایہ سے چلائے جا سکیں۔ ٹریننگ کی مدت کم ہو، خام مال کی فراہمی میں سہولت ہو، تیار شدہ مال
کے لیے مارکیٹ موجود ہو اس کے لیے سرکاری اداروں سے رہنمائی اور مدد لینے کے ساتھ ساتھ اپنے
طور پر بھی اپنے اپنے علاقوں کا اس پہلو سے جائزہ لیتے رہیں کہ ان کے یہاں کس خام مال کی پیداوار
زیادہ ہوتی ہے۔ اس سے سماجی ضرورت کی کیا کیا چیزیں تیار کی جا سکتی ہیں۔ اس کے لیے کم قیمت
کی مشینیں کہاں سے فراہم ہو سکتی ہیں۔ ٹریننگ کتنی مدت کی ہوگی اور کہاں مل سکے گی۔ مارکیٹ فراہم
کرنے میں کیا کیا آسانیاں اور سہولتیں ہیں وغیرہ۔

(۵) نمائندہ معاشرہ کی تعمیر کرنا:۔ کارکنوں کو اپنے اور مسلم گھروں کی اصلاح و تربیت پر اولین توجہ
دینی ہوگی اس کے لیے مسلمانوں میں کام کے ذیل میں جو امور و مسائل کی فہرست دی گئی ہے اس میں سے
مسلمانوں کے لیے مخصوص مسائل کو سامنے رکھ کر ان کے گھروں کا سروے کیا جائے اور مذکورہ طریقے پر کارکنوں
اور مسلمانوں پر مشتمل ایک مشترکہ جامع پروگرام بنا کر بروئے کار لانے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ غیر مسلموں کے
سامنے اسلام کے نمائندہ معاشرے کی ایک جھلک پیش کی جا سکے۔ یہ خصوصی پروگرام مسلم غیر مسلم کے مشترکہ
پروگرام کے نفاذ میں بڑی حد تک معاون و مددگار ثابت ہوگا۔

غلط فہمیوں کا ازالہ

(۱) آبادی میں کام کرتے وقت کارکنوں کا اس پہلو پر نگاہ رکھنا:۔ اپنی انفرادی و مجلسی گفتگو،
طرز عمل اور معاملات کے ذریعے عملاً غلط فہمی کے پردوں کو چاک کرتا چلا جائے۔ اپنی انفرادی و اجتماعی

شخصیت کو اس طرح کھلی کتاب بنا کر لوگوں کے سامنے رکھ دے کہ آپ سے آپ غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جائے اور اس موضوع پر مزید اظہارِ خیال کی ضرورت ہی نہ محسوس ہو۔ اس طرزِ عمل سے نہ صرف یہ کہ غلط فہمیوں کا ازالہ ہو گا بلکہ اسلام و تحریکِ اسلامی کا ایک خاموش و خوش آئند تعارف بھی ہو گا

(۲) مختصر کتابچوں کو ذریعہ بنانا: حسبِ ضرورت بدگمانیوں کے ازالے اور اسلام و تحریکِ اسلامی کا صحیح تعارف کے لیے اردو، ہندی، انگریزی اور مختلف علاقائی زبانوں میں مختصر کتابچے شائع کیے جائیں گے اور ان کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کی جائے گی۔ یہ کتابچے ان حقائق کے ترجمان ہوں گے جن کی شہادت ہمارے کارکن عملی میدان میں دے رہے ہوں گے۔ ان کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے لوگوں کے اذہان و قلوب آمادہ و تیار ہوں گے۔ اگر کچھ مخالفین جھوٹے پروپیگنڈوں کے ذریعے بدگمانیوں کو ہوا دینے کی کوشش کریں گے تو ہمارے کارکنوں کے علاوہ بہت سے خیر پسند غیر مسلم بھائی جھوٹ کی قلعی کھولنے کے لیے میدان میں موجود ہوں گے۔

(۳) اخبارات، رسائل، تصانیف، سمپوزیم اور سمینار کو ذریعہ بنانا: اسلام اور تحریکِ اسلامی کے خلاف پریس، تصانیف، پلیٹ فارم سے ناواقف افراد کے ذہنوں کو مسموم کرنے کی جو کوشش ہو رہی ہے ان کا ہر وقت نوٹس لیا جائے گا اور انہی ذرائع اور انہی سطحوں پر ان کا ازالہ کیا جائے گا۔

اسلام اور تحریکِ اسلامی کا صحیح تعارف

اسلام کے بنیادی افکار و اقدار سے غیر مسلم بھائیوں کو اس حد تک متعارف کر دینا پیشِ نظر ہے کہ اس کے درج ذیل نتائج و ثمرات بر آمد ہو سکیں۔

(۱) توحید اور زندگی میں اس کی صحیح قدر و قیمت کو وہ جان لیں۔

(۲) ہدایتِ الٰہی اور رسالتِ محمدی کی ضرورت و اہمیت ان پر واضح ہو جائے۔

(۳) آخرت کا تصور ان کے دل و دماغ میں اتر سکے۔

(۴) اسلام کے بارے میں یہ حقیقت ان پر اچھی طرح منکشف ہو جائے کہ وہ اللہ کا واحد دین ہے جو ہر دور اور ہر ملک میں انسانوں کے داخلی اصلاح، سماجی تعمیر و ترقی، مسائلِ زندگی کے حل، عدل و قسط کے قیام اور اخروی فلاح کے لیے آتا رہا ہے اور جو آج بھی ان مقاصد کے حصول کا ضامن ہے۔

اس کام کی انجام دہی کے سلسلے میں ہمارے کارکن سب سے زیادہ عملی شہادت کو اہمیت دیں گے۔

اس کی تائید و توثیق میں قولی شہادت یعنی پریس، تصانیف پلیٹ فارم سے بھی کام لیں گے۔

معاون سازی

(۱) ملکی مسائل: اس سے مراد وہ سنگین مسائل ہیں جن سے ملک بھی دوچار ہے اور ملت بھی۔ مثلاً فقر و فاقہ، مرض و جہالت، ظلم و ناانصافی، معاشی استحصال، اونچ نیچ، عدم رواداری، خدا ناشناسی، اخلاقی کمزوریاں اور آخرت سے غفلت وغیرہ۔ ان کے حل کے لیے عملی جد و جہد کی جائے گی نیز توحید اور وحدت بنی آدم کے تصور سے پیدا ہونے والی انسانی مساوات، بھائی چارہ، حقیقی آزادی، سچی جمہوریت اور سماجی و معاشی عدل کی قدروں کو فروغ دینے اور جان و مال کے تحفظ، عقیدہ و مذہب اور رائے و ضمیر کی آزادی اور دوسرے بنیادی حقوق کے تحفظ کے لیے رائے عامہ کو ساتھ لینے اور زیادہ سے زیادہ افراد اور جماعتوں کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی اور ان مقاصد کے لیے کام کرنے والے افراد اور جماعتوں کے ساتھ ان امور و مسائل میں تعاون بھی کیا جائے گا۔

سماج میں بڑھتی ہوئی مادہ پرستی، قومی اور گروہی عصبیتیں بھی اس میں شامل ہیں جہاں ممکن ہو گا غیر مسلموں سے مل کر ان کے تدارک کے پروگرام بنائے جائیں گے۔

کلیت پسندانہ اور آمرانہ رجحانات رکھنے والے حکومتی اقدامات اور تحریکیں بھی اس کے ذیل میں آتی ہیں ان پر گرفت کی جائے گی اور اس سلسلے میں متفقین کا تعاون حاصل کیا جائے گا۔

(۲) خدمت خلق: مشترک امور و مسائل کے وہ تمام کام اس میں شامل ہیں جن کے حل کے لیے ملی جلی آبادی میں مشترکہ پروگرام بنایا جائے گا۔

سماج کے ان مسائل کو حل کرنے اور خدمت خلق کے پروگراموں میں عملی تعاون حاصل کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ غیر مسلموں کو معاون بنانے کی کوشش کی جائے گی۔ ہر غیر مسلم جو معاون جماعت اسلامی ہند کا فارم پُر کرے، جماعت اسلامی کا معاون شمار کیا جا سکتا ہے۔

ہر حلقے کی چند منتخب ملی جلی آبادیاں اور محلوں پر خصوصی توجہ مرکوز کرکے مشترک امور و مسائل کے زیادہ سے زیادہ اجزا پر عمل درآمد کے لیے قوت صرف کی جائے گی اور کوشش کی جائے گی کہ اس کام میں زیادہ سے زیادہ غیر مسلم معاون بن سکیں۔

سالانہ رپورٹ جماعت اسلامی ہند

حلقہ اتر پردیش

(۲)

غیر مسلموں میں کام

غیر مسلم متعارف

اسلام کے بنیادی افکار و اقدار سے دوران سال ۷۰۲ غیر مسلم افراد متعارف کرائے گئے کوشش کی گئی کہ وہ توحید اور انسانی زندگی میں اس کی قدر و قیمت سے واقف ہو جائیں۔ ہدایت الٰہی اور رسالت محمدی کی اہمیت ان پر واضح ہو جائے اور آخرت کا تصور ان کے دل و دماغ میں جگہ پائے۔ اسلام کے بارے میں یہ حقیقت ان پر واضح کی گئی کہ وہی اللہ کا واحد دین ہے جو ہر دور اور ہر ملک میں انسانوں کی داخلی اصلاح، سماجی تعمیر و ترقی، مسائل زندگی کے حل عدل و قسط کے قیام اور اخروی فلاح کے لیے آتا رہا ہے اور آج بھی ان مقاصد کے حصول کا ضامن ہے۔ ڈیڑھ سالہ پروگرام کی رو سے اس طرح کم از کم تیرہ سو افراد کو متعارف کرا دینا ضروری ہے۔ جبکہ ۱۰۸۳ افراد آغاز سال سے پہلے ہی متعارف ہو چکے تھے اب غیر مسلم متعارفین کی مجموعی تعداد ۱۷۸۵ ہے۔ ان کے علاوہ ڈیڑھ سو سے زائد افراد اور ہیں جن سے قریبی ربط ہے۔

غیر مسلم بھائیوں کے سلسلے میں حسب حال یہ بھی ملحوظ رکھنے کی کوشش کی گئی کہ ان سے بے لوث روابط اور برادرانہ تعلقات قائم ہوں، ان کے دکھ درد میں ہاتھ بٹایا جائے اور عمومی فلاح و بہبود خدمت خلق اور بھلائیوں کے کاموں کے انجام دینے اور سب کی نظروں میں کھٹکنے والی برائیوں کو دور کرنے کے سلسلے میں عملی تعاون کی صورتیں پیدا ہوں، صفائی ستھرائی اور حفظان صحت کا اور طبی سہولتیں بہم پہنچانے کا اہتمام ہو معاشرتی خامیاں مثلاً اونچ نیچ اور چھوت چھات کا خاتمہ ہو، بھائی چارہ، انسانی مساوات اور رواداری

کو فروغ ملے اور باہمی تعلقات خوش گوار ہو جائیں۔ اس کے علاوہ اسلام اور تحریک اسلامی کے خلاف اخبارات، رسائل، تصانیف، سمپوزیم اور سمینار وغیرہ کے ذریعے ذہنوں کو مسموم کرنے کی جو کوششیں کی جا رہی ہیں ان کا بھی بروقت نوٹس لیا جائے اور مناسب ذرائع سے ان کے ازالے کی فکر کی جائے۔ شراب بندی کے سلسلے میں گاندھی شانت پرتسٹھان کے ذمہ داروں سے ربط رکھا گیا اور چیف منسٹر کو بھی خط کے ذریعے توجہ دلائی گئی۔

معاون سازی

مکمل مسائل کے حل اور خدمت خلق کے پروگرام میں عملی تعاون حاصل کرنے کے لیے غیر مسلموں کو معاون بنانے کی کوشش کی گئی۔ معاونہ فارم پر کرکے دوران ششماہی میں ۴۶ افراد معاون بنے جبکہ ڈیڑھ سالہ پروگرام کی رو سے یہ کوشش کرنی ہے کہ کم از کم ۱۳۰ غیر مسلم دوست معاون بن جائیں۔

ملی جلی منتخب آبادیوں اور بستیوں میں کام

غیر مسلموں میں کام سے متعلق زیادہ سے زیادہ اجزاء پر عمل درآمد کے لیے قوت صرف کرنے اور زیادہ سے زیادہ معاون بنا کر ان کا تعاون حاصل کرنے کے مقصد سے ملی جلی منتخب بستیوں کو خصوصی توجہ کا مرکز بنایا گیا ہے جن میں درج ذیل دو بستیاں وہ ہیں جہاں عملی طور پر بھی کچھ ہونے لگا ہے۔

گورکھپور ڈویژن میں جھکیا ضلع بستی میں امدادی فنڈ جمع کیا جانے لگا ہے تاکہ لوگوں کی ناگزیر ضرورتیں پوری کی جا سکیں۔ علاج معالجہ اور نادار بچوں کی تعلیم کا انتظام ہے۔ بچوں کی ایک باقاعدہ درس گاہ چل رہی ہے۔ پروگرام کے مختلف اجزاء کو سامنے رکھ کر صورت حال کا جائزہ لیا گیا ہے تاکہ انہیں بتدریج زیر عمل لایا جا سکے۔

میرٹھ ڈویژن۔ پیل مرڑا ضلع میرٹھ میں بچوں کی درس گاہ ہے، جو اچھی حالت میں چل رہی ہے۔ بستی کے لوگوں کو صفائی ستھرائی کے لیے آمادہ کیا گیا ہے۔ ناخواندہ اور نیم خواندہ بالغوں اور بچوں کی تعلیم کے لیے بھی باہمی مشورہ سے ایک نقشہ کار تیار کیا گیا ہے۔ قریبی کالج جہاں بستی کے کچھ بچے زیر تعلیم ہیں اس کی لائبریری میں مطالعہ کے لیے اسلامی اور اچھی بامقصد کتابیں رکھوائی گئی ہیں۔

جماعت کی پالیسی کی شق ۳-۴ کے تحت کام

اپنے دینی اور نظام رحمت کے داعی ہونے کے تقاضے کے احساس کو بیدار رکھنے اور بڑھانے کی کوشش

کی گئی پیش نظر یہ تھا کہ بلا لحاظ مذہب و ملت معذوروں اور بے کسوں کو سہارا ملے پس ماندہ طبقات اوپر اٹھیں، ارضی و سماوی آفات کے مارے ہوئے انسانوں اور مظلوموں کو امداد پہنچے اور دکھ درد میں اپنے بھائیوں کا ہاتھ بٹانے کا اجتماعی و انفرادی طور پر حسب استطاعت اہتمام ہو۔ ان کاموں میں دوسروں کا تعاون حاصل کیا جائے اور خیر پسند انسانیت کے ہمدرد افراد انجمنوں اور اداروں کے ساتھ اشتراک و تعاون کیا جائے یہ ضرورت بھی سامنے تھی کہ جب اور جس حد تک بھی مساوات اور بھائی چارہ، آزادی جمہوریت اور معاشی اور سماجی عدل کے فروغ کا موقع ملے، اپنا اسلامی اور انسانی فریضہ انجام دیا جائے ——— اہل ملک و ملت کو ان کی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلائی جائے تاکہ اس معاملے میں محنت و بندگی کی اہمیت ان پر واضح ہو جائے اور وہ معاشرے کو سہل انگاری، ذمہ داریوں کی ادائیگی میں کوتاہی اور کرپشن سے پاک کرنے کی ضرورت محسوس کرنے لگیں۔

عقیدہ و مذہب اور رائے و ضمیر کی آزادی کے سلسلے میں اس امر پر نگاہ رکھنے کی کوشش کی گئی کہ مقننہ یا انتظامیہ کے کسی اقدام کے نتیجے میں یہ چیزیں خطرے میں نہ پڑیں بنیادی حقوق بالخصوص زندہ رہنے کے حق پر دست درازی نہ ہونے پائے اور جان و مال کے تحفظ کے سلسلے میں حکومت سے اس کی ذمہ داریاں پوری کرانے کی کوشش عمل میں لائی جاتی رہے۔

اس پورے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے دوسرے معروف ذرائع کے ساتھ مختلف مقامات پر سمپوزیم کا نظم کیا گیا اور مجالس مذاکرہ منعقد کی گئیں۔ اس سلسلے میں "انسانیت کا سدھار کیسے ہو" کے موضوع پر اٹوا بانار ضلع بستی میں اور "مثالی معاشرہ میری نظر میں" کے زیر عنوان مورا واں ضلع اناؤ میں بھی مذاکرے ہوئے جو اپنی نوعیت و افادیت کے لحاظ سے قابل ذکر ہیں۔ ان دونوں مذاکروں میں آٹھ آٹھ اور دس دس تعلیم یافتہ غیر مسلم اصحاب نے بھی اظہار خیال کیا اور ان تمام نکات کی اہمیت و ضرورت کھل کر سامنے آئی جو جماعت اوپر ذکر ہوئے۔ دونوں جگہ شرکا کی تعداد بھی بہت اچھی تھی۔

جماعت کے مقامی بیت المالوں اور حلقہ کے بیت المال سے حسب موقع و گنجائش ناداروں اور حاجتمندوں کی اعانت کی گئی اور انہیں قائم شدہ امدادی فنڈ سے بھی امداد دی گئی ——— قوم پرستانہ جارحیت اور پولس اور پی اے سی کی زیادتی کے نتیجے میں متعدد مقامات پر لوگوں کا جانی و مالی نقصان ہوا۔ حالات کا جائزہ لے کر مظلومین و متاثرین کی ڈھارس بندھائی گئی اور حسب حال کہیں دوسرے افراد اور جماعتوں کے تعاون سے اور

کہیں خود اپنے طور پر انہیں ریلیف پہنچائی گئی۔ اس سلسلے میں درج ذیل مقامات قابل ذکر ہیں۔

علی گڈھ، فیروز آباد، بنارس، دادری ضلع بلند شہر، نوناری اور سجنی ضلع اعظم گڈھ، رانی منو ضلع جون پور، ناگرول ضلع سہارنپور، درگ جوت ضلع بستی، شہر گونڈہ اور راجا گر پور ضلع گونڈہ۔ اس سلسلے میں دیگر جماعتوں کے افراد سے بھی ربط رکھا گیا۔ چیف منسٹر کو خط لکھا گیا اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اعظم گڈھ سے ملاقات کی گئی اور گونڈہ کے احباب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ گونڈہ سے بھی ملتے رہے۔

اس سلسلے میں جماعت کے مستقل ریلیف فنڈ سے ۳ ہزار روپیہ اور حلقہ کی طرف سے تین سو پچاس روپیہ بنارس، دادری، نوناری، سجنی اور راجا گر پور میں صرف ہوئے۔

جماعت کی پالیسی شق ۵ کے تحت کام

پروگرام کی ہدایت یہ ہے کہ الحاد، مادہ پرستی، قومی اور گروہی عصبیتوں اور دین کو اجتماعی زندگی سے بے دخل کرنے والی تحریکوں مثلاً کمیونزم اور سرمایہ داری اور غیر اسلامی افکار و عقائد پر تنقید اور کلیت پسندانہ اور آمرانہ رجحانات رکھنے والے حکومتی اقدامات اور تحریکوں پر گرفت کی جائے ——— اور عوام پر مدلل طریقے سے واضح کیا جائے کہ دنیاوی فلاح و بہبود اور اخروی نجات دونوں کا انحصار زندگی کے انفرادی اور اجتماعی دونوں شعبوں میں ہدایت الٰہی کی اتباع میں مضمر ہے۔ رفقاء و تنظیم نے اس ہدایت کو ملحوظ رکھا اور اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے انفرادی گفتگوؤں اور خطابات و مذاکرات سے کام لیا ——— بلریا گنج ضلع اعظم گڈھ، لار ضلع دیوریا، اٹوا بازار ضلع بستی، بلرام پور ضلع گونڈہ، نانپارہ ضلع بہرائچ اور مرزا پور کے عام خطابات اور پرتاب گڈھ، الہ آباد، بھدوہی، بہرائچ اور سہارنپور میں تعلیم یافتہ لوگوں سے خطاب اس معاملے میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ گفتگوؤں اور خطابات کے موقع پر تعلیم یافتہ لوگوں کو اس ضمن میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون پر بھی توجہ دلائی گئی۔

مذہبی و تہذیبی مسائل

بچوں اور بچیوں کے آزاد پرائمری مکاتب کے قیام کے لیے مسلمانوں کو آمادہ کرنے کی کوشش کی گئی اور جیسا کہ مسلمانوں میں کام کے ذیل میں اوپر مذکور ہے۔ دوران سال میں بچوں کے ۲۲، بچیوں کے ۲ مکاتب قائم

ہوئے اور اب بچوں کے ۴۰۱ اور بچیوں کے ۵ ملاکر مکاتب کی کل تعداد ۹۰۱ ہے۔

سرکاری اسکولوں میں پڑھنے والے طلبہ کی دینی تعلیم و تربیت کے لیے دوران ششماہی بچیوں کا ایک جزوقتی مکتب قائم ہوا۔ شروع سال میں بچوں کے سات شبینہ جزوقتی مکاتب چل رہے تھے اس طرح اب جزوقتی مکاتب کی کل تعداد ۸ ہے۔

اساتذہ کی تدریسی تربیت کا گورکھپور، الہ آباد اور لکھنؤ ڈویژنوں کے لیے نظم آئندہ ماہ جون میں فیض آباد میں کرنا ہے۔ رہے بریلی اور میرٹھ ڈویژن تو ان کے لیے ان شاء اللہ کسی موزوں وقت پر بندوبست کیا جاسکے گا۔

مسلمانوں کے زیر انتظام اسکولوں اور کالجوں میں طلبہ اور طالبات کی دینی تعلیم و تربیت کے لیے مناسب نظم کی ضرورت بھی سامنے ہے اور ساتھ ہی یہ بات بھی کہ وہ خود اپنے اہتمام میں اسکول اور کالج قائم کریں اور چلائیں مگر اس سلسلے میں ابھی کوئی نتیجہ خیز کوشش عمل میں نہیں لائی جاسکی ہے البتہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد کے ایک گرلس جونیر ہائی اسکول کے نظم اور اس کی حالت کو درست کرنے کی کوشش کی گئی یہ گرلس اسکول اب ہمارے رفقائے مقامی کے زیر اہتمام چل رہا ہے۔

مسلم پرسنل لا کے تحفظ اور اس کے تحت مسلمانوں کے معاملات کے طے کیے جانے کی ضرورت و اہمیت مسلمانوں کے اور کہیں کہیں غیر مسلموں کے سامنے بھی واضح کی گئی۔ انفرادی گفتگوؤں کے علاوہ خطابات میں ضمناً اس موضوع پر اظہار خیال ہوا اور اصلاً بھی اس موضوع پر تقریریں اور مذاکرے کیے گئے۔ ایک مذاکرہ بریلی میں ناظمہ شعبہ خواتین کی صدارت میں خواتین کا بھی ہوا جہاں اس موضوع پر مقالے پڑھے گئے۔ پیش نظر یہ ہے کہ الہ آباد، کانپور، گورکھپور، بریلی، بدایوں اور آگرہ میں اس موضوع پر خواتین کے اجتماعات اور خطابات کرائے جائیں۔

اس دوران میں مسلم پرسنل لا پر جو کتابیں شائع ہوئیں اور زندگی و کانتی کے جو پرسنل لا نمبر نکلے ان کا اہتماماً مطالعہ کیا اور کرایا گیا۔ زندگی اور کانتی کے نمبر خاصی بڑی تعداد میں پھیلائے گئے۔ کانتی کا نمبر غیر مسلموں کی ایک معتدبہ تعداد کے مطالعہ میں بھی آیا۔

جب پارلیمنٹ میں حکومت کی طرف سے متبنیٰ بل پیش ہوا تو وزیر قانون کو ایک خط لکھا گیا جس میں بل پر تنقید کرتے ہوئے اسلام اور مسلمانوں کے موقف اور مسلمانوں کے احساسات و جذبات کا اظہار کیا گیا

اور مطالبہ کیا گیا کہ اس بل سے مسلمانوں کو مستثنیٰ کیا جائے۔

تربیت

اپنے وسائل و ذرائع قوت و صلاحیت اور مواقع و مہلت سے تحریک کو پورا فائدہ پہنچانے، مجوزہ پروگرام کو عملی جامہ پہنانے اور مفوضہ فرائض کو بحسن و خوبی انجام دینے کے مقصد کے پیش نظر کارکنوں میں حسب ذیل اوصاف کا پیدا کرنا اور پروان چڑھانا ہمارا مطلوب ہے۔

تعلق باللہ، ایمان کی پختگی، عبادات کی پابندی کا اہتمام، اوامر کی پابندی اور نواہی سے اجتناب اذکار و نوافل کا اہتمام، جذبۂ انفاق، کردار میں اسلام کا رنگ، تقویٰ، توبہ و استغفار، حقوق العباد کی ادائیگی، نصب العین سے گہرا لگاؤ، تحریک کے لیے عملی جد و جہد، ایثار و قربانی کا جذبہ، باہمی تعاون سے جد و جہد کرنے کی ضرورت کا احساس، کثرت رائے سے ہونے والے فیصلوں کا پورا احترام، نصح و خیر خواہی کا جذبہ، اخلاص و للّٰہیت، صبر و استقامت، مواسات و رحمت کا جذبہ، نظم جماعت کی پابندی سمع و طاعت، تنقید میں حدود کا پاس و لحاظ، تواصی بالحق و تواصی بالصبر، رفقائے کار کے لیے ہمدردی، غمگساری اور بھائی چارہ اس مقصد کے لیے قرآن و سنت، سیرت اور صالح لٹریچر کے مطالعہ کی طرف توجہ دی اور دلائی گئی۔ میرٹھ اور بریلی ڈویژنوں میں ہر رفیق اور ہر مقامی جماعت کے لیے حسب حال الگ مطالعہ کا نصاب مقرر کیا گیا اور کہیں کہیں باقی تین ڈویژنوں میں بھی ایسا ہی ہوا۔

اذکار و نوافل اور احتساب و استغفار کی ضرورت و اہمیت، قرآن اور حدیث کے درس، انفرادی ملاقاتوں اور تربیتی نشستوں میں سامنے آتی رہی لیکن عملی کامیابی بہت کم ہوئی ——— انفاق مال تحریک کے لیے عملی جد و جہد، رحمت و مواسات اور خدمت خلق کے کاموں میں حصہ لے کر بھی تربیتی مقصد حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس پہلو سے متعدد جگہ الحمد للہ حالت بہتر اور کہیں کہیں بدرجہ غنیمت ہے اور کچھ مقامات ایسے بھی ہیں جہاں مزید توجہ دینا ضروری ہے۔

امیر حلقہ اور نظماء نے حسب موقع و ضرورت رفقاء سے انفرادی ملاقاتیں کیں اور تربیتی مقصد ہی کے پیش نظر کہیں ارکان و متفقین کی ملی جلی اور کہیں ارکان کی الگ نشستیں منعقد کی گئیں۔

کچھ ضلعوں کو مستثنیٰ کر کے ماہانہ سہ ماہی ضلعی و ذیلی ضلعی یا بین ضلعی اجتماعات ہوئے۔ مرزاپور میں الہ آباد ڈویژن کے ارکان کا دو روزہ تربیتی اجتماع ہوا۔ باقی ڈویژنوں کو تین تین چار چار حصوں میں

تقسیم کرکے تربیتی پروگرام رکھے گئے اور تمام رفقاء کو موقع فراہم کیا گیا کہ وہ اپنے قریبی مقام پر پروگرام میں شریک ہوں اور اس سے استفادہ کریں۔

رامپور میں حلقہ کے نظماء کا ایک سہ روزہ تربیتی اجتماع ہوا۔ اس اجتماع میں امیر حلقہ اور نظماء کے علاوہ رامپور سے مولانا سید احمد صاحب عروج قادری، جناب محمد عبدالحی صاحب اور مولانا محمد یوسف صاحب اصلاحی شریک ہوئے اور مرکز سے مولانا حبیب اللہ صاحب اور ایک ایک روز کے لیے مولانا سید حامد علی صاحب اور محترم امیر جماعت نے شرکت فرمائی۔

ان تمام پروگراموں کا اگرچہ حسب توفیق فائدہ ہوا لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ حلقہ کے رفقاء اور مقامی جماعتیں اس کی صحیح اہمیت کو سمجھیں اور اپنے اور اپنے رفیقوں کے اندر وہ مطلوبہ صفات پیدا کرنے اور پروان چڑھانے کی پوری پوری کوشش کریں جو اوپر مذکور ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری غفلتوں اور کوتاہیوں کو معاف فرمائے اور تلافی مافات اور مسلسل آگے بڑھتے رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝

(ختم شد)

ہماری نئی مطبوعات

● مسلم پرسنل لا (انگریزی)

مسلم پرسنل لا پر علی گڈھ میں جو سمینار منعقد ہوا تھا، اس کی مکمل کارروائی اور مقالات پر کیے گئے مباحثے کی رپورٹ۔ صفحات ۲۰۰ سائز $\frac{23 \times 36}{16}$ قیمت ڈی لکس -/۸، پیپر بیک -/٦

● یکساں سول کوڈ اور مسلمان (اردو) مولانا صدرالدین اصلاحی

یہ مولانا کا دوسرا رسالہ ہے۔ پہلا رسالہ مسلم پرسنل لا دینی و ملی نقطۂ نگاہ سے پہلے ہی منظر عام پر آچکا ہے۔ آفسٹ کی طباعت -/٦٠

● بیمہ زندگی (اردو) نعیم صدیقی۔ قیمت ۹۰ پیسے۔ ● ستیہ سادھنا (ہندی) محمد فاروق خاں قیمت ۸۰ پیسے

مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی 110006

اسلام صرف ایک نظریہ نہیں

وہ عملی دستور بھی ہے

ڈاکٹر عبدالحلیم محمود، وزیر اوقاف وامور جامعہ ازہر (مصر)

ترجمہ: جناب فصیح الدین، دہلوی

موجودہ دور میں یہ بات بہت عام ہوگئی ہے کہ نئے نئے مسائل روز ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں اور اکثر یہ سوال ابھرتا ہے کہ ان نئے مسائل اور مشکلات کے بارے میں اسلام کا رویہ اور موقف کیا ہے۔ چونکہ لوگ عموماً اس قسم کے مسائل کے متعلق زیادہ گہرے طریقے پر واقف نہیں ہوتے، اس لیے صحیح جواب بھی حاصل نہیں کر پاتے۔

یہ سوال اس وقت عام ہے کہ بنکوں اور موجودہ طرز کی تجارتی کمپنیوں سے معاملہ کرنے کے بارے میں اسلام کی کیا رائے ہے۔ اور پھر یہ کہا جانے لگتا ہے کہ فقہ اسلامی جامد ہے وہ عصر حاضر کے مسائل کے متعلق کوئی رائے نہیں رکھتی اور ان مسائل کا حل تلاش کرنے سے قاصر ہے اور بات اجتہاد کے موضوع تک جا پہنچتی ہے کہ آیا اس دور میں اجتہاد مباح ہے یا غیر مباح، ممکن ہے یا ممکن نہیں۔ ہے۔ آیا اجتہاد انفرادی ہو یا اجتماعی۔ بہرحال لکھنے والوں نے اس مسئلے پر بہت کچھ لکھا ہے۔

اس وقت ہم ان مختصر سطور میں وہ چند اسباب پیش کرنا چاہتے ہیں جو موجودہ صورت حال کا باعث بنے اور جن کی بنا پر ہم اس مشکل اور پریشانی سے دوچار ہیں۔

مسلمان شریعت اسلامی پر، جیسا کہ کتب فقہ میں مفصل طور پر درج ہے، عمل پیرا تھے۔ اور ان کے تمام معاملات اسلامی قوانین کی بنیاد پر ہی انجام پاتے تھے، پھر استعماری طاقتیں عالم اسلام پر مسلط ہوگئیں اور انھوں نے معاملات کے لیے شریعت اسلامیہ کے بجائے وضعی قوانین مقرر کردیے۔ یہ وضعی قوانین انسانی عقل

کی پیداوار ہیں اور یورپ ان پرانہ منہ وسطی سے عمل پیرا ہے۔ سامراجی طاقتوں نے اپنی پوری کوشش سے ان قوانین کو اپنی محکوم رعایا پر مسلط کر دیا اور پورا عدالتی نظام اس کی بنیاد پر قائم کر دیا۔

پھر یونیورسٹیوں میں جب قانون کی تعلیم دینے کا مسئلہ آیا تو وہاں بھی یہی قانون مسلط کر دیا گیا چنانچہ مصر میں تمام قانونی اداروں میں نوے فی صد بلکہ اس سے بھی زیادہ انہی وضعی قوانین کی تعلیم رائج کر دی گئی۔ ان یونیورسٹیوں اور تعلیمی اداروں کو جو وسائل و ذرائع حاصل تھے، ان کی بنا پر یہ ہر شخص کا مطمح نظر اور امیدوں کا مرکز بن گئے۔ تعلیمی اداروں سے لیکر عدالتی نظام اور عملی زندگی کے ہر شعبہ تک اسی قانون کا تسلط ہو گیا اور زندگی کا ہر پہلو، اور معاملات کا ہر گوشہ یورپین ماحول میں رنگ گیا۔ شریعت اسلامی سکڑ کر صرف زندگی کے شخصی دائرے میں محدود ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ زندگی کا یہ گوشہ بہت ہی مختصر، محدود اور تنگ سا ہے۔

اسی گوشے کی، جس کو ہم نے شخصی زندگی کے گوشے سے تعبیر کیا۔ جامعہ ازہر کے اداروں میں تعلیم جاری رہی، اور شرعی عدالتیں بھی اس پر عمل پیرا رہیں اور یہ گوشہ چونکہ بالکل مردہ نہیں ہو گیا تھا لہٰذا اس میں حسب احوال تبدیلی، ترقی بھی ہوتی رہی۔ باقی قانون کے جتنے بھی پہلو تھے، وہ سب اسلام کی حدود سے دور ہو گئے اور یورپین قوانین وہاں نافذ رہے۔

سامراج ختم ہو گیا، عالم اسلام آزاد ہو گیا۔ لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ سامراجیت اور استعمار کے تمام نشانات اور آثار بھی مٹ جائیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ سامراج سیاسی طور سے ختم ہو گیا لیکن زندگی میں اس نے جو دوسرے اثرات چھوڑے تھے وہ بدستور اپنی جگہ باقی رہے اور ان کو ختم کرنے کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ تعلیمی اداروں اور عدالتوں میں وہی قدیم وضعی اور استعماری قوانین رائج ہیں۔ اگر یہ قوانین ختم ہو جاتے اور ان کی جگہ اسلامی قوانین لے لیتے تو موجودہ صورت حال پیش نہ آتی۔ اس وقت پورے عالم اسلام میں یہی وضعی قوانین رائج ہیں جن کو سامراجیوں نے رواج دیا تھا یعنی ہم ابھی تک قانونی، ذہنی، فکری اور عدالتی سامراج کی گرفت میں ہیں۔

یونیورسٹیوں اور تعلیمی اداروں نے اس سامراجی یادگار سے رہائی حاصل کرنے کی طرف کوئی توجہ نہیں کی اور اسی پرانے نہج پر تعلیم اور عدالتی نظام کا ڈھانچہ قائم رہا۔ اب دنیائے اسلام میں ایک نیا شعور پیدا ہوا اور اس احساس نے جنم دیا کہ ہم سامراج کی تمام باقی ماندہ چیزوں سے نجات حاصل کریں جیسا کہ

حال ہی میں لیبیا نے اعلان کیا کہ وہ اکثر اسلامی قوانین خاص طور پر فوج داری نظام لیبیا میں رائج کر رہا ہے اور
مصر کے موجودہ دستور میں بھی یہ دفعہ ہے کہ حکومت کا مذہب اسلام اور شریعت تمام قوانین کا منبع اور
بنیاد ہوگی۔ اس نئے شعور کا ٹکراؤ اس پرانے نظام سے ہوا اور یہ لازمی اور قدرتی امر ہے کہ ایک چیز
جس کو عرصے سے متروک کر دیا گیا اور ایک طرف ڈال دیا گیا اور عملی زندگی کے میدان سے اس کو بالکل
نکال دیا گیا ہو وہ اچانک بعض حالات سے ٹکرائے گی۔ بالکل یہی حال اس فقہ اسلامی اور موجودہ صورت
حال کا ہے۔ فقہ کو ایک عرصہ دراز سے متروک کر دیا گیا۔ اس بنا پر یہ مشکلات پیش آ رہی ہیں۔ اگر فقہ اسلامی
پر مسلسل عمل ہوتا رہتا تو اس وقت یہ ٹکراؤ کی شکل پیدا نہ ہوتی۔ لہٰذا فقہ اسلامی میں نئی روح پھونکنے اور
اس کو از سر نو زندہ کرنے اور موجودہ حالات کے مطابق بنانے کی واحد شکل یہی ہے کہ ہم اپنی روزمرہ کی عملی
زندگی میں اس کو اپنائیں، اپنی عدالتوں میں اس کو نافذ کریں اور وہی ہمارا دستور حیات ہو۔

جب شریعت اور فقہ ہماری عملی زندگی سے مربوط ہو جائے تو قدرتی طور پر اس میں تجدید ہوگی اور نیا
فکر جنم لے گا۔

اکثر لوگ اجتہاد کے معنی غلط سمجھتے ہیں۔ صحیح معنے میں اجتہاد کا دروازہ ایک دن بھی بند نہیں ہوا،
اور نہ اجتہاد کسی شخصی رائے کی ایجاد اور انفرادی فکر کا نام ہے۔ اجتہاد قرآن و سنت سے پوری طرح مربوط
ہے۔ اس کا تعلق ان دونوں سے ایسا لازمی ہے جو ختم نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہو تو وہ اجتہاد اسلامی اجتہاد
نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ اجتہاد یا تو ان قدیم مسائل میں ہوگا جو کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے
راشدین کے دور میں تھے۔ یا ان مسائل میں ہوگا جو بعد میں پیدا ہوئے۔ اگر اجتہاد قدیم مسائل میں ہے تو پورے
طور پر یہ کوشش ہونی چاہیے کہ یہ دیکھیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کا ان مسائل میں
کیا عمل تھا اور اس میں اپنی شخصی رائے کو دخل کرنے کی ادنیٰ سی بھی کوشش نہ ہونی چاہیے۔

اجتہاد ایک خالص علمی اور موضوعی مطالعہ ہے۔ اس میں ایجاد و اختراع کا کوئی دخل نہیں۔ اس لیے
جدید مسائل میں اجتہاد کے وقت مجتہد کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ وہ اس جدید مسئلے کو اسلام کے طے کردہ
کلی قواعد میں سے کسی ایک قاعدے سے مربوط کر کے اس کے ماتحت کرے۔ مجتہد کی ذمہ داری نہیں کہ وہ
اپنی طرف سے کسی بھی نئے پیدا شدہ مسئلہ کو حرام قرار دے دے، یا حلال قرار دے دے۔ اس کے برعکس
اس کا فرض یہ ہے کہ وہ مسئلہ کو کلی قواعد کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرے اور اس کا اسلامی حل نکالے۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کے علمی اور موضوعی اجتہاد کی کچھ شرطیں ہوں گی۔ ان شرطوں پر ہمارے ائمہ قدیم نے پوری باریکی اور دقیق بینی سے غور کر کے فیصلہ کیا ہے اور ان میں سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ قرآن کا مکمل کلی اور جامع مطالعہ ہو، سیرِ نبوی پر عبور رہا ہو اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلافت راشدہ کے دور میں جن قوانین پر عمل تھا، ان پر پوری بصیرت ہو۔

اسلام صرف ایک نظریہ ہی نہیں، بلکہ ایک عملی دستور ہے اور یہ دستور واقعہ کی شکل اختیار کر چکا ہے اور کئی صدیوں تک اس پر عمل ہوتا رہا ہے۔ اس لیے اگر کسی مسئلہ میں کوئی اختلاف ہو تو اس کو اس عملی کسوٹی پر پرکھا جا سکتا ہے جو دورِ نبوی اور خلافت راشدہ میں پیش آ چکی ہے۔

اجتہاد کی دوسری بنیادی شرط قدرتی طور پر عربی زبان کا علم اور اس پر عبور کامل ہے۔ ائمہ مجتہدین عربی زبان کے بڑے عالم اور ادیب تھے۔

اجتہاد کی ایک اور شرط یہ ہے کہ قرآن کی وہ آیات جو احکام سے متعلق ہیں اور وہ احادیث جن کا تعلق احکام سے ہے، ان پر عبور ہو۔ ان کے شان نزول اور پس منظر سے مجتہد پوری طرح واقف ہو اور اس کے سامنے خلافت راشدہ کے دور میں پیش آمدہ مسائل، رائج شدہ قوانین اور دوسرے احکامات ہوں۔ ان تمام امور پر کلی نظر کا ہونا ضروری ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی یہ ضروری نہیں کہ ہر وہ شخص جس میں یہ تمام شرائط مہیا ہوں وہ لازمی طور پر صحیح اجتہاد کرے گا اور ٹھیک نتیجہ تک پہنچ سکتا ہے اس لیے کہ عقلیں اور ذہن مختلف ہیں طبیعت اور رفتار ہر جگہ یکساں نہیں، کمال ذہنی ایک فطری ودیعت ہے۔ بہرحال ضرورت جس بات کی ہے وہ یہ کہ صحیح نہج پر تعلیم کا سلسلہ رائج ہو۔ اگر ایسا ہو تو یقیناً ماہرین اور ذی علم لوگوں کی ایک بڑی جماعت پیدا ہو سکتی ہے۔ اگر ہم نے اپنے نظام تعلیم کی اصلاح کر لی تو ہم اپنی عملی زندگی کو شریعت اسلامی کا بآسانی پابند کر سکیں گے۔

تصحیح

مئی ۷۳ء کے شمارے میں ص ۵ سطر ۳ میں آیت قرآنی میں "لَكُمْ" کا لفظ زائد چھپ گیا ہے "فَأَخْرَجَ بِهِ" صحیح ہے۔ لَكُمْ کا لفظ حذف کر دیا جائے۔

جون ۷۳ء کے شمارے میں ص ۳۶ پر جو آیتیں ہیں ان میں فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي کے بعد إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ غلط چھپ گیا ہے۔ وہاں وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ۝ ہونا چاہیے۔ (ادارہ)

چند تاثرات

(سید احمد قادری)

میں ڈیڑھ ماہ کی رخصت پر جب اپنے وطن پہنچا جو صوبہ بہار کا ایک دشوار گذار دیہات ہے تو ایسا محسوس ہوا جیسے یہاں زمانے کی رفتار رک گئی ہو یا قدیم اصطلاح میں یوں کہیے کہ آسمان کی گردش ٹھہر گئی ہو۔ یہاں نہ نعرے ہیں، نہ جلسے، نہ جلوس، نہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے مہذب طلبہ کی شورشیں ہیں، نہ سیاسی پارٹیوں کے ہنگامے، نہ بجلی ہے، نہ بجلی سے چلنے والی مشینوں کا شور، نہ کارخانے ہیں، نہ کارخانوں کا غلیظ دھواں — ہوا صاف ہے اور آسمان شفاف۔ یہاں نہ ویتنام ہے، نہ آئرلینڈ، نہ جنوبی افریقہ ہے، نہ مغربی ایشیا، نہ آندھرا ہے نہ تلنگانہ — نہ اردو ہے، نہ مسلم پرسنل لا اور نہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ — نہ پاکستان کے نوے ہزار قیدی ہیں نہ بنگلہ دیش۔ نہ برطانیہ کا جنسی اسکینڈل ہے، نہ امریکہ کا سیاسی اسکینڈل۔ یہاں یہ سب کچھ بھی نہیں، ہر طرف سکون ہے جو ہے کوئی کھیتی باڑی میں مشغول ہے کوئی کپڑے بننے میں، کوئی چھوٹی موٹی تجارت میں مصروف ہے کوئی ملازمت میں۔ ان لوگوں کو شاید اس کا احساس بھی نہیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ شری سورن سنگھ دورے پر گئے تو کیا اور شریمتی اندرا گاندھی وطن سے باہر نکلیں تو کیا۔ مسٹر بریژنیف ماسکو سے اڑ کر واشنگٹن پہنچے تو کیا۔ ان دوروں اور ملاقاتوں پر اخبارات کیسے کیسے اداریے لکھ رہے ہوں گے، ان پر کیسے کیسے تبصرے ہو رہے ہوں گے، مگر یہاں کچھ خبر نہیں۔ آج سے دس بیس سال پہلے تو یہاں سکوت و جمود کا یہ عالم تھا کہ میں یہ سطریں بھی نہیں لکھ سکتا تھا۔ اب ٹرانسسٹروں نے کامل سکوت میں کچھ خلل پیدا کر دیا ہے۔ میں نے مسز اندرا گاندھی کے دورے اور بریژنیف نکسن ملاقات کی خبر ٹرانسسٹر ہی سے سنی۔ اسی سے معلوم ہوا کہ یوپی میں ترپاٹھی جی کی وزارت ختم ہو گئی اور صدر راج نافذ ہو گیا۔ بہار میں مسٹر کیدار پانڈے مستعفی ہو گئے اور یہاں بھی صدر راج

ٹھہرا ہے۔

یہ سطریں اس وقت شائع ہوں گی جب ان واقعات پر ایک مدت گزر چکی ہوگی اور نئے واقعات ظہور میں آچکے ہوں گے۔ یہ ایٹم کا زمانہ ہے اور وقت کی حرکت تیز ہو گئی ہے۔ مگر ماہنامہ تو بہرحال ایک ماہ بعد ہی شائع ہوگا۔

کہا جاتا ہے کہ پی اے سی کی بغاوت نے تری پاٹھی کی وزارت کا تختہ الٹ دیا۔ یہ وہی پی اے سی ہے کہ فیروزآباد وغیرہ میں اس کے کارناموں سے خوش ہو کر مسٹر تری پاٹھی نے ایک سنگدلانہ اور متکبرانہ بیان دیا تھا۔ دنیا کے چند روزہ اور حقیر اقتدار کا نشہ بھی کتنا تیز ہوتا ہے۔ وزیر اعظم کے چند الفاظ کی شہ پا کر انھوں نے پی اے سی کو پوری چھوٹ دی تھی لیکن سیاست کی بساط پر اس شہ نے انہیں مات دے دی۔ ظلم کی حمایت، انسانیت کے خلاف ایک جرم ہے جس کی سزا کبھی کبھی مل کر رہتی ہے۔ خلاف توقع ان کو اپنے ظالمانہ بیان کی سزا بہت جلد مل گئی۔ وزیر اعظم کی نظر کرم بھی کام نہ آئی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ پنڈت بھی ہیں اور ظلم ہندو مذہب میں بھی ناجائز ہی ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں شاید یہ پہلی مثال ہے کہ اسمبلی میں اکثریت رکھتے ہوئے بھی کسی کابینہ کو اپنی موت کے پروانے پر خود دستخط کرنے پڑے ہوں۔

وزیر اعظم کے لیے بھی یہ بات سبق آموز ہے کہ ان کی پسند کے وزرائے اعلیٰ نے شاید کہیں بھی اپنی کارکردگی کا اچھا مظاہرہ نہیں کیا۔ اوپر سے مسلط کیے ہوئے لوگوں کا اکثر یہی حال ہوتا ہے۔ ان کے ساتھ کام کرنے والے ان سے مطمئن نہیں ہوتے اور اندرونی کشمکش حکومت کا بیڑا غرق کر دیتی ہے۔

بہار میں مسٹر کیدار پانڈے کے بعد جیسا کہ ریڈیو سے معلوم ہوا۔ پارٹی کا کوئی متفقہ لیڈر منتخب نہیں ہو سکا۔ اس لیے فیصلہ کیا گیا کہ وزیر اعظم کو لیڈر نامزد کرنے کا حق دے دیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ بہار کانگریس میں بظاہر دو گروپ پائے جاتے ہیں اور ممکن ہے کہ دو سے زیادہ بھی ہوں۔ تو جب کسی ایک پر متفق نہیں ہو سکے تو وزیر اعظم آخر کس طرح کسی ایسے لیڈر کو نامزد کریں گی جس پر سب کو اتفاق ہو اور جس سے سب مطمئن ہوں۔ لیڈر کا انتخاب وزیر اعظم کے حوالے کرنے کا اس کے سوا اور کیا مطلب ہے کہ اقتدا

کی رسہ کشی اپنی جگہ باقی ہے۔ جو شخص بھی نامزد کیا جائے گا وہ متفقہ نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسی کوئی نئی وزارت بن بھی گئی تو وہ کتنے دن چل سکے گی۔ بہار کی حکمراں کانگریس نے کسی لیڈر کا انتخاب نہ کر کے گویا خود ہی صدر راج کا فیصلہ کر دیا ہے۔

یہ ہے وزیر اعظم کی زندہ کی ہوئی اور ان کی رہنمائی میں بنی ہوئی کانگریس۔ اس نئی کانگریس سے یہ توقع پیدا ہوئی تھی کہ شاید اب مرکز میں بھی اور صوبوں میں بھی مستحکم حکومتیں قائم ہو جائیں گی اور ملک بدلتی ہوئی وزارتوں کے چکر سے نکل آئے گا لیکن یہ توقع پوری نہیں ہوئی۔ نئی کانگریس بھی ایک غبارہ ثابت ہوئی جس کی ہوا تیزی سے نکل رہی ہے۔ ریاستوں میں صدر راج کا تسلسل جمہوریت کے لیے ایک بڑا خطرہ ہے۔ یہ صدر راج آئندہ کسی وقت بھی آمرانہ نظام کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔ لوک سبھا میں حکمراں کانگریس کو مکمل اکثریت حاصل ہے۔ سپریم کورٹ کا قضیہ سب کے سامنے ہے۔ اگر وزیر اعظم کو اس کا یقین آگیا کہ آئندہ الکشن میں ان کی پارٹی اکثریت حاصل نہیں کر سکے گی تو ان کا انداز فکر کیا ہو گا؟ اس سوال میں جو بحران کروٹیں لے رہا ہے اس کو الفاظ میں ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں۔ جو چیز خود ظاہر ہو رہی ہو اس کے لیے الفاظ کا خرچ بے کار ہو گا۔

اگر اپوزیشن پارٹیاں اپنے ملک کی ترقی کے لیے کسی ایسے مفید پروگرام پر متفق ہوتیں جو سرمایہ داری اور اشتراکیت کی بے اعتدالیوں سے خالی ہوتا اور ساتھ ہی اس ملک کے مذہبی مزاج سے مطابقت رکھتا تو آنے والے خطرے سے بچا جا سکتا تھا لیکن وہ تو خود ہی بھانت بھانت کے پروگرام اور نظام لیے کھڑی ہیں۔ اور حکمراں کانگریس کو شکست دینے کے منفی مقصد کے سوا ان کے درمیان کوئی قدر مشترک نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ (پرابلم) ہے جس کا کوئی حل مستقبل قریب میں نظر نہیں آتا۔ بات یہ ہے کہ کسی خاردار درخت کی جڑ پر کلہاڑی چلانے کے بجائے اس کی شاخوں اور پتیوں کی کانٹ چھانٹ کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا نکل سکتا ہے کہ کچھ دنوں میں وہ درخت پہلے سے بھی زیادہ کانٹے پیدا کرے۔

افسوس یہ ہے کہ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ افراد کا انداز فکر بھی یہی ہے کہ جس شاخ سے انہیں تکلیف پہنچتی ہے اسے کاٹ ڈالنے کے لیے زور لگاتے ہیں لیکن جب وہ کٹ جاتی ہے تو اس جگہ پہلے سے زیادہ تکلیف دہ شاخ پیدا ہو جاتی ہے۔ تجربات کے باوجود ان کا یہ انداز فکر بدل نہیں رہا ہے بلکہ اور

مستحکم ہوتا چلا جا رہا ہے۔ یہ دوسرا مسئلہ (پرابلم) ہے جس کا کوئی حل مستقبل قریب میں نظر نہیں آتا۔ اسی انداز فکر کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ اپنے ملک میں موثر طاقت نہیں بن سکے۔ ان کے ہزاروں افراد ملک کی بہت سی سیاسی پارٹیوں میں بکھرے ہوئے ہیں اور ان کی جو الگ تنظیمیں ہیں وہ اتنی کمزور ہیں کہ انہیں کسی نہ کسی اکثریتی پارٹی کا سہارا لینا پڑتا ہے اور کوئی اکثریتی پارٹی ایسی موجود نہیں جو معمولی انسانی اخلاق و کردار کی حامل بھی ہو۔ کوئی پارٹی آج جو معاہدہ کرتی ہے وہ کامیاب ہو جانے کے بعد کل پوری بے شرمی کے ساتھ اسے توڑ ڈالتی ہے۔ اس طرح نہ بحیثیت مجموعی پورے ملک کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے اور نہ مسلمانوں کے مخصوص مسائل حل ہوتے ہیں۔

بہت سے دین دار مسلمان ہم سے پوچھتے ہیں کہ یہ ایک معمہ ہے آخر اس معمے کا حل کیا ہے؟ ہم ان سے کہتے ہیں کہ یہ کوئی ایسا معمہ نہیں ہے جس کا حل کسی بکس میں بند ہو۔ اس کا حل غور و فکر اور اپنا رویہ تبدیل کرنے پر موقوف ہے۔ ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ آپ اپنے دین کو تمام مسائل کا حل مانتے ہیں یا نہیں؟ اسے پوری زندگی کے لیے رہنما مانتے ہیں یا نہیں؟ آپ یہ تسلیم کرتے ہیں یا نہیں کہ اللہ نے اس دین کو تمام انسانوں کی دنیوی و اخروی فلاح کے لیے نازل کیا ہے؟ آپ یہ یقین رکھتے ہیں یا نہیں کہ اسی دین نے عرب جیسی سرزمین کے تمام مسائل حل کر دیے تھے۔ اگر آپ کا جواب اثبات میں ہو تو پھر غور کیجیے کہ اس دین کی امانت آپ کے پاس موجود ہے اس کے باوجود آپ کے مسائل کیوں حل نہیں ہو رہے ہیں، بلکہ اس پر غور کیجیے کہ پورے ملک کے مسائل کیوں حل نہیں ہو رہے ہیں؟ دو ہی صورتیں ممکن ہیں، یا تو اپنے دین کے بارے میں آپ کے دعوے غلط ہیں، یا آپ حل مسائل کی تدابیر اپنے دین سے اخذ نہیں کر رہے ہیں؟ اس سوال کا صاف اور سیدھا جواب دیجیے۔ اگر اور مگر سے جواب دیجیے اس سے معمہ حل نہیں ہوگا

قوتِ فکر و نظر ہوتی ہے پہلے مفلوج تب کسی قوم کی عظمت پہ زوال آتا ہے

جب آپ اپنے دین کے بارے میں اپنے دعووں کو غلط نہیں کہتے تو پھر دوسری ہی صورت متعین ہو جاتی ہے۔ واقعہ یہی ہے کہ آپ نے اپنے دین کی رسی اپنے ہاتھوں سے چھوڑ رکھی ہے۔ آپ یہاں وہاں اور ادھر ادھر سے تدابیر اخذ کر کے اپنے مسائل حل کرنا چاہتے ہیں اور جب وہ حل نہیں ہوتے تو سوال کرتے ہیں کہ اس معمے کا حل کیا ہے؟

اگر ہم اپنے دین کی رسی مضبوطی سے تھامے رہتے اور عملاً اپنے دین ہی کو رہنما بنائے رکھتے تو ہماری اجتماعیت سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوتی۔ بھانت بھانت کے افکار کا جنگل ہمیں گھیرے ہوئے نہ ہوتا۔ ذاتی و گروہی مفادات ہمیں ٹکڑے ٹکڑے نہ کرتے۔ ہم داعی ہوتے، مدعو نہ ہوتے۔ ہم ایک اصولی جماعت ہوتے، دوسری قوموں کی طرح محض ایک قوم نہ ہوتے۔ ہمارا ملک ہماری ضرورت محسوس کرتا، ہم سے اسے رہنمائی ملتی، روشنی ملتی۔ وہ ہمیں تمام انسانوں کا ہمدرد پاتا، ہماری دیانت و امانت، ہماری سچائی و راست بازی، ہماری پاک بازی و حق پرستی، باشندگان ملک کے لیے مثالی ہوتی اور پھر وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوتے کہ ہمارے اندر یہ خوبیاں کیوں ہیں اور ان کا سرچشمہ کہاں ہے۔ اس طرح وہ ہمارے دین کی طرف متوجہ ہوتے۔ انہیں معلوم ہوتا کہ دین اسلام کی تعلیم کے مطابق اس پوری کائنات کا بادشاہ صرف اللہ ہے اور دنیا کے تمام انسان اس کی رعیت اور محکوم ہیں۔ انہیں معلوم ہوتا کہ دنیا کے تمام انسان ایک آدم کی اولاد ہیں اور آپس میں بھائی بھائی ہیں انہیں معلوم ہوتا کہ یہ دنیا نہ ہمیشہ سے ہے اور نہ ہمیشہ رہیگی۔ تمام انسان اس میں آزمائشی زندگی بسر کر رہے ہیں اور اس امتحان کا نتیجہ آخرت میں نکلنے والا ہے۔ ہمیں اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ اپنے رب کی بندگی کریں اور اسی کی ہدایت کے مطابق اپنی پوری زندگی بسر کریں۔ یہی ہے ہمارا امتحان۔ انہیں معلوم ہوتا کہ یہی حقیقتیں، یہی عقیدے اور یقین کی یہی وہ نعمت ہے جس نے ہماری زندگیوں کو خوبیوں اور اچھائیوں سے بھر دیا ہے۔ اس کے بعد کیا یہ ممکن تھا کہ باشندگان ملک کا برتاؤ ہمارے ساتھ یہی ہوتا جو اس وقت ہے اور کیا یہ ممکن تھا کہ ہمارے دین سے ان کی ناواقفیت یہی ہوتی جو اس وقت ہے لیکن افسوس کہ اب یہ باتیں خود ہمارے درمیان اجنبی بنکر رہ گئی ہیں۔ کوئی انہیں دور کا راستہ کہتا ہے۔ کوئی اسے افیون قرار دیتا ہے اور کوئی انہیں محض ہوائی باتیں سمجھتا ہے۔ ہم اپنے جانتے کوئی قریب کا راستہ تلاش کر کے اس پر چل پڑتے ہیں بلکہ دوڑنے لگتے ہیں اور اسی دوڑ کو "عمل" سمجھتے ہیں۔ اسی کو "حقیقت پسندی" کہتے ہیں لیکن جب آنکھیں کھلتی ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس قریب کے راستے نے ہمیں منزل سے کچھ اور دور کر دیا ہے۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ　　پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

آپ جیسے دیندار مسلمان بھی اپنے قول و عمل کے تضاد پر غور نہیں کرتے اور دین کے بارے میں اپنے دعووں کا ثبوت پیش نہیں کرتے۔ یہی ہے وہ اصل معمہ جسے حل ہونا چاہیے۔ پھر زندگی کے تمام معمے حل ہو جائیں گے۔

———　(۲۹ جنوری ۱۹۸۲ء)

قانون شریعت کے مصادر اور نئے مسائل

مولانا منت اللہ رحمانی صفحات ۴۸ قیمت ۹۰ پیسے
ناشر: دار الاشاعت امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ۔ پھلواری شریف ضلع پٹنہ (بہار)

مولانا منت اللہ رحمانی صاحب کے ایک کتابچہ "مسلم پرسنل لا" پر جولائی ۷۲ء کے شمارے میں تبصرہ شائع ہو چکا ہے۔ اسی ذیل میں مولانا نے یہ دوسرا کتابچہ شائع کیا ہے۔ اس کتابچے کا پیش لفظ مولانا نظام الدین صاحب ناظم امارت شرعیہ نے لکھا ہے۔

فاضل مصنف نے کتابچے کی ابتدا میں قانون سازی پر اصولی بحث کی ہے اور تبصرہ نگار کے نزدیک یہی حصہ اس کتابچے کا سب سے اہم حصہ ہے۔ انھوں نے معقول و منقول دلائل سے ثابت کیا ہے کہ انسانی زندگی کے لیے قانون سازی صرف اس ذات برحق کا حق ہے جس نے انسانوں سمیت یہ پوری کائنات پیدا کی ہے جن آیات قرآنی سے انھوں نے استدلال کیا ہے ان میں إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ اور أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ کی آیتیں بھی ہیں۔ انھوں نے اس کی بھی صراحت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا امر و حکم ناقابل تقسیم اور ناقابل شرکت ہے لکھتے ہیں:۔

"یہ صورت حال کہ اوامر کا بعض حصہ خدا سے متعلق ہوا اور بعض حصہ کسی اور سے، کسی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ قرآن نے کہا ہے وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا اس کے حکم میں کوئی شریک نہیں جس طرح وہ تنہا پیدا کرنے والا ہے اور تنہا پوری کائنات کا مالک ہے اسی طرح حکم اور امر بھی صرف اسی کا حق ہے۔ (ص ۸)

اس اہم اصولی بحث کے بعد انھوں نے مصادر شریعت کا تعارف کرایا ہے۔ کتاب کے اس حصے پر تبصرہ نگار محض سرسری نظر ڈال سکا ہے۔ کتاب، سنت، اجماع۔ قیاس، اسلامی شریعت کے یہی چار مصادر

ہیں اور ان میں سے ہر ایک پر انھوں نے گفتگو کی ہے۔ اخیر میں کچھ اور مصادر کے عنوان سے انھوں نے "استحسان" "مصالح مرسلہ" اور "عرف" پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ان تمام چیزوں پر گفتگو کرنے میں اندازِ بیان بھی مختلف ہو سکتا ہے اور معلومات میں بھی کمی بیشی ہو سکتی ہے اصل چیز دیکھنے کی یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی جو کچھ لکھا گیا ہے وہ صحیح اور مفید ہے یا نہیں۔ تبصرہ نگار کے نزدیک یہ ایک مفید کتابچہ ہے اور اس سے استفادہ کرنا چاہیے۔ اجماع پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے یہ اہم اور ضروری نکتہ واضح کیا ہے کہ:۔

> " اجماع خود کتاب و سنت کی دلیل پر ہی مبنی ہوتا ہے۔ اجماع کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ماہرینِ شریعت نے قرآن و سنت کو سامنے رکھے اور اس سے استفادہ کیے بغیر جو کچھ اپنی رائے سے کہہ دیا ہو وہ اجماع ہے۔ دین میں جو بات بھی کتاب و سنت سے بے نیاز ہو کر کہی جائے گی وہ باطل ہے۔ (ص ۲۸)

اس نکتے پر نظر رکھنا ضروری ہے کیونکہ آج کل متجددین بھی "اجماع" کا نام بہت لیتے ہیں اور ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مسلمان دانشوروں کی کوئی کونسل جس بات پر بھی اتفاق کرلے اس کو "اجماع" کی حیثیت حاصل ہو جائے گی۔

کینسر وارڈ (دوسرا حصہ)

مترجم گوپال متل، جلیس عابدی۔ صفحات ۳٦۴ قیمت چار روپے
ناشر: نیشنل اکاڈمی۔ ۹۔ انصاری مارکیٹ۔ دریا گنج۔ دہلی (۱۱۰۰۰٦)

روسی ادیب الگزنڈر سولژے نتسن کے اس شاہکار ناول پر اس کو ۱۹۷۰ء کا نوبل پرائز دیا گیا تھا۔ اس ناول کے پہلے حصے پر ماہنامہ زندگی مارچ ۱۹۷۱ء کے شمارے میں تبصرہ شائع ہو چکا ہے۔ اب فروری ۱۹۷۳ء میں اس کے دوسرے حصے کا ترجمہ شائع کیا گیا ہے۔ ترجمہ پہلے حصے ہی کی طرح رواں اور دلچسپ ہے۔ روس میں جبر و قہر کا جو نظام رائج ہے اس کو سمجھنے کے لیے یہ ناول بھی ایک مستند ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نظام نے ضمیر و رائے کی آزادی تو سلب کر ہی لی ہے۔ اس کی کوشش یہ ہے کہ انسان کے ذہن کی آزادی بھی چھین لے لیکن یہ اس نظام کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس کا ایک ثبوت یہ ناول بھی ہے۔ اشتراکیت کی حمایت اور اس کی مدح سرائی میں سب سے زیادہ جس چیز کا پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے وہ مساوات اور عوام کی خوش حالی ہے۔ غریبوں اور مزدوروں کو اس کا سبز باغ دکھا کر

اس جال میں پھنسایا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ چند افراد کی ٹولی پورے ملک پر مسلط ہو جاتی ہے اور عوام سے سب کچھ چھین لیا جاتا ہے۔ وہ جس طرح نظام جاگیرداری میں رو رو کر زندگی بسر کرتے تھے اس نظام اشتراکیت میں بھی رو رو کر زندگی بسر کرتے ہیں۔

اس ناول میں ایک جگہ، ایک خبطی اور دیوانے کا کردار پیش کیا گیا ہے جو ریل کے ایک ڈبے میں داخل ہونے والوں کی قطار توڑ کر پہلے داخل ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک دوسرا شخص اس کو اس حرکت سے روکنے کے لیے اس کے پاس جا پہنچتا ہے اور اس کے کان کے قریب منہ کر کے چیخ کر کہتا ہے۔

"سن لے! میں بھی وہیں سے آیا ہوں" خبطی اچھل کر پلٹ پڑتا ہے اور اپنے کان کو سہلاتا ہے پوچھتا ہے "کہاں سے؟" دوسرا شخص بڑے نرم لیکن نپے تلے الفاظ میں جواب دیتا ہے "وہیں سے جہاں ننانوے روتے ہیں لیکن ایک ہنستا ہے"

اس جواب میں روس کے اشتراکی نظام کی پوری تصویر آگئی ہے۔

یہ دوسرا حصہ بھی پہلے حصے ہی کی طرح دلچسپ اور لائق مطالعہ ہے۔

تنقید اور معیار حق کا مسئلہ

صفحات ۳۲ قیمت ۲۰ پیسے۔ ناشر حلقہ متفقین جماعت اسلامی سہارنپور
ملنے کا پتہ:- مولوی عبدالرؤف صاحب مظاہری خان عالم پورہ سہارن پور۔ یوپی۔

دستور جماعت اسلامی ہند کے بنیادی عقیدہ جزو دوم کی دفعہ ۶ کی عبارت پر ایک زمانے میں بعض دینی حلقوں نے بہت شور مچایا تھا۔ یہ پمفلٹ اسی کے جواب میں ہے۔ جن لوگوں نے جماعت اسلامی کی مخالفت کو اپنا شیوہ بنا لیا ہے وہ اب بھی وہی باتیں کہتے رہتے ہیں جن کے مدلل اور معقول جوابات دیئے جا چکے ہیں۔ یہ پمفلٹ بھی اعتراض کا ایک مدلل جواب ہے اور اب بھی کارآمد ہے۔

اللہ کا شکر

شیخ سعدیؒ نے ایک بزرگ کو دیکھا کہ چیتے نے ان کو زخمی کر دیا ہے وہ ایک نہر کے کنارے پڑے ہوئے ہیں اور بار بار اللہ کا شکر ادا کر رہے ہیں۔ انھوں نے پوچھا کہ آپ بار بار کس چیز پر شکر ادا کر رہے۔ بزرگ نے جواب دیا۔ اس بات پر کہ مصیبت میں گرفتار ہوں، کسی معصیت میں نہیں۔
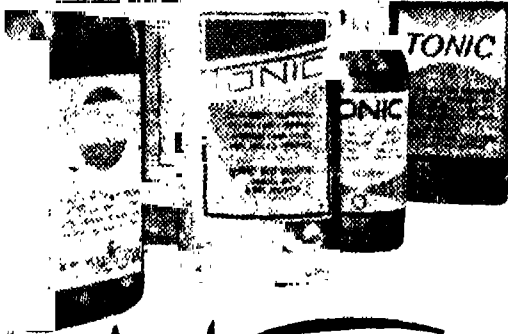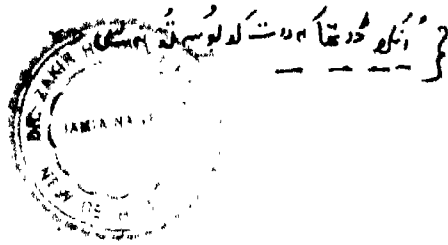
یہ اہم نہیں کہ کسی ٹانک کے اجزا کیا ہیں ۔ اہم بات یہ ہے کہ آپ کے جسم کو اس سے کیا ملتا ہے ؟

سِنکارا

آپ کے جسم کو بہت کچھ دیتا ہے

سنکارا میں ضروری وٹامنوں اور معدنی اجزا کے ساتھ ہی چودہ جڑی بوٹ
خاص کر شامل ہیں جن سے ہضم کی طاقت بہتر کام کرتی ہے اور جن کی مدد سے
آپ کا جسم سنکارا میں شامل وٹامنوں وغیرہ کو بہت تیزی سے جذب کر لیتا
اور آپ کی غذا صحیح طور پر اور تیزی سے جزو بدن ہو کر آپ کو بہت جلد قوت
حاصل ہوتی ہے ۔

ہمدرد

DL—4035 A-U

Only Title Printed at Shanker Press, Rampur

ماہنامہ

زندگی رامپور

(مدیر: سید احمد قادری)

سالانہ چندہ	
ہندوستان سے	-/۱۰
پاکستان سے	-/۱۰
ششماہی	
ہندوستان سے	-/۵
پاکستان سے	-/۵
قیمت فی پرچہ ایک روپیہ	

سالانہ چندہ

غیر ممالک سے

دو ڈالر

ہوائی ڈاک سے

جلد: ۵۱	شعبان المعظم ۱۳۹۳ھ مطابق ستمبر ۱۹۷۳ء	شمارہ: ۳

اس دائرہ ○ میں سرخ نشان کا مطلب ہے

کہ آپکی مدت خریداری اس شمارے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ اگر آپکی طرف سے چندہ بند کرنے یا رسالہ بند کرنے کے لیے خط نہ مل سکا تو اگلا پرچہ اخراجات وی پی سے حاضر ہوگا۔ امید ہے کہ وی پی وقت پر وصول فرمائیں گے۔ منیجر زندگی رامپور یوپی

مالک۔ دعوت ٹرسٹ۔ ایڈیٹر سید احمد عروج قادری۔ پرنٹر پبلشر۔ احسن۔ مطبع ناظم پریس۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

(سید احمد قادری)

زندگی، جون ۷۳ء کے رسائل و مسائل میں "دس سوالات" کے عنوان سے سوالات اور ان کے جوابات شائع ہوئے تھے اور سائل کو بذریعہ خط بھی جوابات بھیج دیے گئے تھے۔ جوابات پڑھ کر انھوں نے دوسرا خط لکھا ہے وہ خط اور اس کا جواب ذیل میں شائع کیا جا رہا ہے۔

خط

میں نے جو سوالات نقل کر کے بھیجے تھے وہ میں نے ایک دینی و مذہبی پرچے میں پڑھے تھے آپ کے جوابات عالمانہ اور انتہائی معقول ہیں مجھے کافی حد تک اطمینان حاصل ہوا

میں ایک روایتی مسلمان ہوں، مطلب یہ ہے کہ میں مسلمان کے گھر میں پیدا ہوا اس لیے مسلمان ہوں۔ اگر ہندو کے گھر میں پیدا ہوتا تو ہندو ہوتا اور آج صرف میرا ہی یہ حال نہیں ہے بلکہ مجھ جیسے کروڑوں کی تعداد میں روایتی مسلمان ہی بھرے پڑے ہیں۔ اسلام سے متعلق بہت سے شبہات میرے دل میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

میں روایت پرستی سے نکلنا چاہتا ہوں اور مجھے اس وقت کوئی مذہب اور کوئی تحریک اپیل نہیں کرتی البتہ کمیونسٹ نظریات مجھے اپیل کرتے ہیں اور معاش سے متعلق کمیونزم ہی کو غریبوں کا نجات دہندہ سمجھتا ہوں اور پھر کیوں نہ سمجھوں جب کہ اسلامی اصول و ضوابط اور نظریات کو ماننے والے اور اس کی صحت کے دعوے دار بہت کم لوگ ہیں جو اس کے قانون اور

تعابیلے پر صحیح معنوں میں عمل پیرا ہوں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ دنیا میں جتنی مسلم حکومتیں کہی جاتی ہیں۔ ان میں کوئی حکومت اسلامی اصول و نظریات پر عمل پیرا ہو۔ میں دیکھتا ہوں کہ مسلمان اور مسلمانی حکومتیں سب یورپ اور امریکہ کے مقلد ہیں جن اصول و نظریات کو انھوں نے اپنالیا ہے انہیں کو مسلمان بھی اپنائے ہوئے ہیں اور اسی پر فخر کرتے ہیں خواہ وہ اسلامی نظریات کے لیے سم قاتل ہی کیوں نہ ہوں۔ اگر مسلمان، اسلام کو ایک سچا مذہب سمجھتے ہیں تو اس کے بتائے ہوئے راستے پر کیوں نہیں چلتے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انہیں اسلام پر اعتقاد نہیں ا صحیح وہی نظریات ہیں جو یورپ اور امریکہ کے ہیں۔ میں اسی چکر میں پھنسا ہوا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنے لیے کون سا راستہ منتخب کروں۔

اپنے بڑے بھائی سے آپ کے جوابات پر گفتگو ہو رہی تھی تو انھوں نے کہا اگر کسی لڑکے کو جنگل میں چھوڑ دیا جائے تو وہ بڑا ہونے کے بعد انسان کی طرح بول سکے گا اور نہ کسی خدائی ہستی کو تسلیم کر سکے گا۔ انسان چونکہ بچپن ہی سے خدا اور رسول کا ذکر سنتا آتا ہے۔ اس لیے خدا کی ہستی کو ماننے پر اپنے کو مجبور پاتا ہے۔ ان کی یہ بات انسانی فطرت کو سامنے رکھتے ہوئے معقول نہیں معلوم ہوتی لیکن ان کی بات انسانی فطرت کو سامنے رکھتے ہوئے معقول نہیں معلوم ہوتی لیکن ان کی بات کا میں کوئی معقول جواب بھی نہیں دے سکا۔ میں تلاش حق کا جذبہ رکھتا ہوں۔ آپ کی بتائی ہوئی کتاب مذہب اور سائنس کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ اس طرح کی کچھ اور کتابوں کے بارے میں بھی مجھے لکھیے۔ ہو سکتا ہے کہ کبھی انہیں خرید کر یا کسی طرح پڑھنے کا موقع مل جائے۔

جواب

آپ نے اپنے بارے میں جس صاف گوئی سے کام لیا ہے اس سے دل متاثر ہوا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ تلاش حق کا جذبہ آپ کو حقیقی اسلام تک پہنچا کر رہے گا۔ حقیقی اسلام ہی میرے لیے، آپ کے لیے پوری دنیا کے لیے واحد راہ نجات ہے۔ خدا کرے ہم سب کو اس کی توفیق ملے کہ اپنے ایمان و اسلام کا جائزہ لیں اور موروثی مسلمان ہونے کے بجائے شعوری مسلمان بنیں۔

اللہ کا شکر ہے کہ دینی سوالات کے جواب میں، میں نے اختصار کے ساتھ جو کچھ لکھا تھا اس سے آپ کو

کافی حد تک اطمینان حاصل ہوا۔ آپ نے مسلمانوں اور مسلمان حکومتوں کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ بڑی حد تک صحیح ہے لیکن موجودہ حالت کی وجہ سے مایوس نہ ہونا چاہیے۔ مسلمانوں کے اندر بھی اپنے دین پر عمل کرنے کا احساس بڑھ رہا ہے اور مسلمان حکومتوں کی پالیسی بھی آہستہ آہستہ بدل رہی ہے سعودی حکومت تو ہمیشہ سے جب سے وہ قائم ہوئی ہے بہت سے اسلامی احکام پر عمل کر رہی ہے اور اب لیبیا کی حکومت بھی اس طرف اقدامات کر رہی ہے۔ دوسری مسلمان حکومتیں بھی اسلام کو بالکل نظر انداز کرنے کی پالیسی پر نظر ثانی کر رہی ہیں۔ اس کے علاوہ اصولی طور پر مسلمانوں کی بے عملی یا بد عملی کی وجہ سے خود اسلام کی حقانیت پر کوئی زد نہیں پڑتی۔ آپ کے علم میں یہ بات ہوگی کہ کسی چیز کا حق اور مبنی بر صحت ہونا اس پر موقوف نہیں ہے کہ لوگ اس پر عمل کر رہے ہیں یا نہیں۔ مثال کے طور پر اگر آج دنیا کے اکثر لوگ سچائی اور دیانتداری پر عمل نہیں کر رہے ہیں تو ان کے عمل نہ کرنے کی وجہ سے ان دونوں کے صحیح اور برحق ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا ـــــ اسی طرح کسی چیز کا باطل اور غلط ہونا اس پر موقوف نہیں ہے کہ لوگ اس پر عمل کر رہے ہیں یا نہیں۔ مثال کے طور پر اگر دنیا کے لاکھوں اور کروڑوں افراد جھوٹ اور بد دیانتی پر عمل کر رہے ہیں تو اس کی وجہ سے جھوٹ اور بد دیانتی کو صحیح اور برحق نہیں کہا جائے گا بلکہ یہ دونوں باطل اور غلط ہی رہیں گے۔ کہنے کی غرض یہ ہے کہ کسی چیز کا حق ہونا اس کے حق ہونے کے دلائل سے ثابت ہوتا ہے، خواہ اس پر کوئی عمل کرے یا نہ کرے۔ اسی طرح کسی چیز کا باطل ہونا اس کے بطلان کی دلیلوں سے ثابت ہوتا ہے خواہ اس پر کوئی عمل کرے یا نہ کرے۔ آج دنیا کے بہت سے مسلمان قولی و عملی تضاد میں مبتلا ہیں۔ زبان سے تو وہ یہی کہتے ہیں کہ اسلام ہی حق ہے لیکن عمل اسلام کے خلاف کرتے ہیں اس کو قولی و عملی تضاد کے سوا اور کیا کہا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ ان کے قولی و عملی تضاد کی وجہ سے اسلام پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ کیونکہ اس کا حق ہونا عقلی، شرعی، تاریخی اور تجرباتی دلائل سے ثابت ہے۔

حقیقی اسلام کو جاننے کا ماخذ اللہ کی کتاب اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ روایتی مسلمان اگر اس حقیقی اسلام سے انحراف کر رہے ہیں تو اس میں اسلام کا قصور کیا ہے؟ آپ کمیونزم کے معاشی نظام کو پسند کرتے ہیں اور اس کو غریبوں کا نجات دہندہ سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے اسلام کے معاشی نظام کا مطالعہ نہیں کیا ہے اور اس نظام نے غریبی کو مٹانے اور غریبوں کو اونچا اٹھانے کا جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ آپ کی نظروں سے اوجھل ہے۔ اگر آپ اس کا مطالعہ

کریں تو مجھے پوری امید ہے کہ آپ کمیونزم کے معاشی نظام کے مقابلے میں اسلام کے معاشی نظام کو کہیں زیادہ مفید معتدل و متوازن اور انسانی فطرت کے مطابق پائیں گے۔ آپ جس چکر میں پھنسے ہوئے ہیں اس سے نکلنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ حقیقی اسلام کو جاننے کی کوشش کیجیے۔ اس کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ تنہا یہی وہ راستہ ہے جو انسان کو دنیوی و اخروی فلاح کی منزل تک پہنچاتا ہے اور پھر آپ پورے یقین کے ساتھ اسی راستے پر چل پڑیں گے

زمانہ حاضر کے مسلمانوں کی بے عملی اور ان کے روایتی اسلام پر ایک اور پہلو سے غور کیجیے۔ یورپ اور امریکہ کے اصول و نظریات پر وہ اس لیے عمل پیرا نہیں ہیں کہ اسلام پر انہیں اعتقاد نہیں رہا اور وہ یورپ اور امریکہ ہی کے اصول و نظریات کو صحیح اور برحق سمجھتے ہیں۔ بلا شبہ کچھ لوگ ایسے ضرور ہیں کہ انھوں نے اپنے نام مسلمانوں جیسے رکھ چھوڑے ہیں حالانکہ فی الواقع وہ مسلمان نہیں ہیں انہیں چھوڑ کر تمام دنیا میں مسلمانوں کی اکثریت اب بھی اسلام ہی پر اعتقاد رکھتی ہے لیکن افسوس کہ وہ اسلام کی واقفیت نہیں رکھتی لے دے بس یہ اجمالی یقین حاصل ہے کہ اسلام ہی سچا دین ہے۔ یورپ اور امریکہ کے اصول و نظریات پر عمل پیرا رہنے کی ایک بڑی وجہ اسلام سے اس کی یہ جہالت بھی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ نفس اور شیطان اس پر غالب آگئے ہیں چونکہ یورپ کی تقلید میں نفس کو مزا ملتا ہے اس لیے مسلمان اس کی تقلید ترک کرکے اسلام کی تعلیمات پر عمل کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ مثال کے طور پر ہزاروں، لاکھوں مسلمان، شراب خوری و بدکاری میں مبتلا ہیں لیکن ان میں سے ۹۹ فیصدی لوگ اپنے آپ کو گنہگار ہی قرار دیتے ہیں کیونکہ عقیدۃً وہ شراب اور زنا کو حرام سمجھتے ہیں کتنی ہی چیزیں ایسی ہیں جنہیں انسان مضر سمجھتا ہے لیکن نفس کے غلبہ کی وجہ سے انہیں استعمال کرتا رہتا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ دنیا بھر میں یورپ اور امریکہ ہی کی تہذیب رائج ہے۔ اس تہذیب کو ہٹا کر اس کی جگہ اسلامی تہذیب کو رائج کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لیے بڑے حوصلے اور ہمت کی ضرورت ہے افسوس یہ ہے کہ اس وقت عام طور سے مسلمانوں میں یہ حوصلہ نہیں پایا جاتا اور ان کی ہمتیں پست ہوگئی ہیں وہ اپنی پست ہمتی ہی کی وجہ سے چلتے ہوئے دھارے میں بہے چلے جارہے ہیں حالانکہ اپنے دلوں میں یہ احساس رکھتے ہیں کہ جس نالے میں وہ بہہ رہے ہیں گندا ہے ــــــ ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ جیسا احساس

رکھنے والے لوگ ایمان میں اتریں اور مسلمانوں میں اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے کا حوصلہ پیدا کریں۔

آپ کے بھائی صاحب نے جو بات کہی ہے اس کا مقصد واضح الفاظ میں یہ ہے کہ خدا کا کوئی حقیقی وجود نہیں ہے (نعوذ باللہ من ذالک) بلکہ ایک مسلمان خدا اور رسول کو ماننے پر محض اس لیے مجبور ہے کہ وہ بچپن سے ان کا ذکر سنتا آتا ہے۔ اس کی دلیل کے طور پر انھوں نے یہ کہا ہے کہ اگر کسی بچے کو جنگل میں چھوڑ دیا جائے تو وہ بڑا ہو کر نہ انسانوں کی طرح بول سکے گا اور نہ کسی خدا کو تسلیم کرے گا۔ آپ نے بجا طور پر ان کے خیال کو غیر معقول قرار دیا ہے کیونکہ انسان کی فطرت خدا کے وجود کا اقرار کرتی ہے لیکن معلوم نہیں کیوں آپ ان کی بات کا معقول جواب نہیں دے سکے، حالانکہ ان کے خیال کی تردید خود اس بات میں موجود ہے جو انھوں نے کہی ہے۔ اس پر پہلا سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ بچہ بڑا ہو کر انسان کی طرح بول ہی نہ سکے گا تو پھر آپ کے بڑے بھائی کو یہ کیسے معلوم ہو گا کہ وہ کسی خدا کو تسلیم نہیں کرتا۔ انکار خدا کی جو دلیل اپنے جانتے انھوں نے دی ہے وہ تو خود ایک دعویٰ ہے جس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ یورپ اور امریکہ کے جو دانشور خدا کا انکار کرتے ہیں وہ اسی طرح کی بے دلیل باتیں کہتے ہیں۔ کسی شخص کا انسانوں کی طرح باتیں نہ کر سکنا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ سوچنے سمجھنے کی قوت اور عقل کی نعمت سے بھی محروم ہو گیا ہے۔ آخر انسانوں کی آبادی میں رہتے ہوئے بھی تو بہت سے لوگ پیدائشی گونگے ہوتے ہیں تو کیا آپ کے بھائی صاحب یہ سمجھتے ہیں کہ تمام گونگے انسان منکر خدا ہوتے ہیں؟ حالانکہ مشاہدہ یہ ہے کہ وہ خدا کے وجود کو بھی تسلیم کرتے ہیں اور کاروبار دنیا میں بہت سے بولنے والے انسانوں سے بھی زیادہ سمجھدار اور ہوشیار ہوتے ہیں۔ جو بچہ جنگل میں بڑا ہوا ہو وہ اگر باؤلا اور خبطی نہیں ہے تو اس کی فطرت اور عقل اس کو خدا کے وجود تک پہنچا دیتی ہے۔

آپ کے بھائی صاحب نے جو مثال دی ہے اس پر کوئی شخص یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ انسانوں کی طرح بولنے یعنی نطق انسانی کا کوئی حقیقی وجود نہیں ہے۔ بلکہ بچہ چونکہ اپنے ماں باپ اور گھر والوں کو انسانوں کی طرح بولتے سنتے آتا ہے اس لیے وہ بھی انسانوں کی طرح بولنے لگتا ہے۔ اگر اس کو جنگل میں چھوڑ دیا جائے تو وہ بڑا ہو کر انسانوں کی طرح بول نہیں سکے گا۔ کیا آپ کے بڑے بھائی صاحب اس دلیل کو ماننے کے لیے تیار ہیں اور کیا وہ تسلیم کرتے ہیں کہ نطق انسانی کا کوئی حقیقی وجود نہیں ہے۔

آپ کے بھائی صاحب نے یہ بھی نہیں سوچا کہ ایک مسلمان جس طرح بچپن سے خدا اور رسول کے اقرار کا ذکر سنتا آتا ہے اسی طرح خدا اور رسول کے انکار کا ذکر بھی سنتا آتا ہے اور آج تو دنیا کی دو بڑی حکومتیں خدا کا انکار کر رہی ہیں لیکن وہ اپنی جابرانہ طاقت اور پوری کوشش کے باوجود خود اپنے ملکوں کے باشندے کے دل و دماغ سے بھی مذہب کو کھرچ کر پھینک نہیں سکی ہیں۔ ان ملکوں کے بھی ہزاروں لاکھوں افراد خدا کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں۔ جہاں ہر طرف خدا کے انکار کا ذکر سننے میں آرہا ہے وہاں بھی خدا کا اقرار کرنے والے لوگ موجود ہیں اور کثیر تعداد میں موجود ہیں اس لیے آپ کے بھائی کا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ مسلمان چونکہ بچپن سے خدا اور رسول کا ذکر سنتے آتے ہیں اس لیے خدا و رسول کو ماننے پر مجبور ہیں۔

آپ اپنے بڑے بھائی صاحب سے یہ بھی پوچھیے کہ جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب میں اپنی رسالت کا اعلان کیا تھا تو اس اعلان سے پہلے تو کوئی بھی آپ کو رسول ماننے والا نہ تھا پھر لوگوں نے کس طرح آپ کو رسول مان لیا۔ کیا اس وقت بھی لوگ بچپن سے آپ کی رسالت کا ذکر سنتے آرہے تھے؟ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کے بھائی صاحب نے جو بات کہی ہے وہ کسی پہلو سے بھی صحیح نہیں ہے۔

حقیقت واقعہ یہی ہے کہ خدا کا اقرار انسان کی فطرت کے اندر موجود ہے۔ اس کے علاوہ وسیع کائنات اور خود انسان کے اپنے وجود میں خدا کے وجود کی اتنی دلیلیں موجود ہیں کہ کوئی شخص دھاندلی اور ضد سے تو اس کا انکار کر سکتا ہے معقولیت اور انصاف کے ساتھ اس کا انکار نہیں کر سکتا۔

حقیقی اسلام کو سمجھنے کے لیے قرآن مجید سے زیادہ مستند، مفید اور بہتر کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مدظلہ نے قرآن مجید کی تفسیر تفہیم القرآن کے نام سے لکھی ہے اور یہ چھ جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اردو میں اس سے بہتر اب تک کوئی تفسیر نہیں لکھی گئی ہے اور اسلام کو سمجھنے کے لیے اس سے بہتر کوئی کتاب اردو میں موجود نہیں ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ اگر آپ کو موقع مل جائے تو تفہیم القرآن کا مطالعہ ضرور کریں۔ یہ کتاب مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۶ سے مل سکتی ہے۔ اس کا تیسواں پارہ الگ سے بھی شائع کیا گیا ہے۔ اگر آپ فوری طور پر تفہیم القرآن کی مکمل جلدیں حاصل نہ کر سکیں تو پارۂ عم کی تفسیر منگا کر پڑھیں۔

(۲)

۲۸ جولائی ۷۳ء کو لکھنؤ میں گاندھی بھون کا افتتاح کرتے ہوئے صدر جمہوریۂ ہند مسٹر وی وی گری نے جو تقریر کی ہے وہ کئی پہلوؤں سے نئی اور انوکھی ہے۔ اگر عام احساس یہ ہے۔ جیسا کہ بعض اخبارات نے لکھا ہے کہ صدر کی وہ تقریر ایک غیر معمولی تقریر تھی تو یہ عام احساس اپنی جگہ درست معلوم ہوتا ہے۔ ہم اس تقریر کے چند اجزا یہاں نقل کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا:-

اس وقت ملک کو گزشتہ ۲۵ برسوں کے سب سے بڑے بحران کا سامنا ہے۔

لوگ دیہی علاقوں میں جا کر کام کرنے کے بجائے اسمبلی یا پارلیمنٹ کے ممبر یا وزیر بننے کی بھاگ دوڑ میں مصروف رہتے ہیں۔

انھوں نے ان ممبران اسمبلی پر بھی نکتہ چینی کی جو اپنا غلہ چھپائے بیٹھے ہیں اور اسے فروخت نہیں کر رہے ہیں۔ جب خود ممبران اسمبلی کا یہ حال ہو تو آپ دوسروں سے یہ کیسے توقع کر سکتے ہیں کہ وہ اپنا غلہ حکومت کے ہاتھ فروخت کریں گے۔

عوام کو یہ دیکھنا چاہیے کہ آئندہ انتخابات میں بددیانت سیاست داں کامیاب نہ ہونے پائیں۔

سیاسی پارٹیوں کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ ایسے لوگوں کو الکشن کے موقع پر ٹکٹ نہ دیں۔

دراصل سوال یہ ہے کہ ہم ایک قوم کی حیثیت سے گاندھی جی کے اصولوں پر پوری طرح عمل کر رہے ہیں یا نہیں؟

مذہب، زبان اور ذات پات کے نام پر ہونے والے تشدد آمیز واقعات کا اگر ہم خاتمہ نہیں کر سکتے تو ہمارا اپنے کلچر، روایات اور گاندھی جی کے ورثے کے متعلق باتیں کرنا کوئی معنے نہیں رکھتا۔

آج حالت یہ ہے کہ ہم قومی املاک کو جلا کر خاک کر دینے میں بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔

لکھنؤ یونیورسٹی میں چند ماہ قبل جو کچھ ہوا اس سے تمام مہذب شہریوں کے سر شرم سے جھک گئے۔

اگر یہی حالت رہی تو ملک میں ایک نئے سماجی نظام کے قیام سے متعلق ہمارے تمام منصوبے خاک میں مل جائیں گے۔

جب صدر جمہوریہ لکھنؤ یونیورسٹی کے واقعات کے تذکرے پر پہنچے تو انھوں نے لکھی ہوئی تقریر کو مختصر کر دیا اور طلبہ کی بے چینی، ملک کے معاشی مسائل اور بددیانتی، چور بازاری، ملاوٹ اور ذخیرہ اندوزی (باقی ص ۲۱)

از جے ایچ موبلی

نظریۂ افادیت

(افادیت کے بنتھمی نظریہ کی تحقیق اور قرآنی نظریۂ فطرت کا بیان)

یورپ کی تاریخ میں پندرھویں صدی سے لیکر بیسویں صدی کی ابتدائی دو دہائی تک کے زمانے کو مختلف اعتبار سے بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس سے پہلے تبدیلیوں کا دور کے زمانے کو اگر "دورِ تاریک" (DARK AGE) کہا جا سکتا ہے تو اس دور کو تبدیلیوں کے دور (AGE OF CHANGES) کا نام دینا نامناسب نہ ہوگا۔ پانچ سو سال کے اس مختصر عرصے میں ہونے والی حیرت انگیز اور تیز رفتار تبدیلیوں نے ماحول انسانی کو بالکل الٹ پلٹ دیا۔ صنعتی، تجارتی اور سائنسی میدانوں میں ہونے والے انکشافات اور اکتشافات نے جہاں انسان کی مادی زندگی کو متاثر کیا، وہیں پے درپے ایسے سیاسی، معاشی، معاشرتی و اخلاقی نظریات وجود میں آئے جنھوں نے فکری طور پر انسان کو بالکل نیا انسان بنا دیا۔ ان نظریات میں ہابس، لاک، اسپنسر وغیرہ کا نظریۂ انفرادیت (INDIVIDUALISM)، بنتھم، مل کا نظریہ افادیت (UTILITARIANISM)، ہیگل، کانٹ، فشٹے کا نظریہ مثالیت (IDEALISM)، مارکس کا فلسفۂ اشتراکیت (COMMUNISM)، ڈارون کا نظریہ ارتقاء۔ مگڈوگل کا جبلی اور فرائڈ کا جنسی نظریہ خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔

نظریۂ افادیت کا مطالعہ

ان تمام نظریات نے انسانی زندگی کے فکری و عملی گوشوں کو کسی نہ کسی شکل میں متاثر کیا اور اس اعتبار سے یہ تمام نظریات قابل مطالعہ ہیں لیکن ان میں نظریہ افادیت کے مطالعہ کو تین مختلف اعتبارات سے فوقیت حاصل ہے۔ اولاً یہ کہ اس نے اشیاء و اعمال کی نوعیت کے متعلق افراد کے فکری رخ کو ہی نہیں بدلا بلکہ ان کی روزانہ زندگی کو بہ نسبت دوسرے تمام نظریات کے زیادہ متاثر کیا۔ ثانیاً اس پر محققین نے

جو تنقیدیں کی گئی ہیں وہ عموماً ان پہلوؤں سے متعلق ہیں جو نظریہ میں ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ کوئی ایسی تنقید جو نظریہ کی بنیادوں پر حملہ آور ہو، اب تک نہیں ہو سکی جبکہ مذکورہ بالا دوسرے تمام نظریات پر مفکرین نے نقد و نظر کر کے ان کو جڑوں سے اکھاڑ پھینکا ہے۔ ثانیاً اس نظریے کی بنیاد پر بعد کے مفکرین نے فرد و جماعت کے تعلق، اختیارات و فرائض، جرم و سزا، حریت و مساوات کی جو واضح تشریحیں پیش کیں انہیں آج کی تمام جمہوری ریاستوں میں اساس کی حیثیت حاصل ہے۔

تحقیق کی ضرورت

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نظریہ افادیت ہو یا کوئی اور نظریہ، اس پر اب کچھ لکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی بھی نظریے پر کوئی طالب علم جب تحقیق کرنے کے لیے متعلقہ کتابوں پر نگاہ دوڑاتا ہے تو اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان نظریات کی تشریح و تنقید میں اتنا کچھ لکھا جا چکا کہ مزید لکھنے کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ اور اب تو یہ ایک عمومی تصور بن چکا ہے کہ ان کی تحقیق پر دوبارہ قلم اٹھانا تضییعِ اوقات اور بے فائدہ عمل ہے لیکن ایسا سوچنا صحیح نہیں ہے۔ اگر ہم تحقیق کے بامقصد ہونے کے قائل ہیں تو ہمیں دیکھنا ہوگا کہ اب تک جو تحقیقی کام ہوا ہے، کیا اس کا طریقہ تحقیق درست ہے؟ نیز محققین نے جو نتائج اپنی تحقیق سے اخذ کیے ہیں، کیا وہ شبہہ سے بالاتر ہیں۔ اگر محققین کا طریقۂ تحقیق درست نہ ہو تو ان کے تحقیقی نتائج کا بھی مشتبہ ہونا ایک لازمی بات ہے۔ اور اس طرح از سر نو تحقیق کا جواز پیدا ہوتا ہے۔

نظریہ کی تحقیق میں ایک فاش غلطی جو ہمارے پیش رو محققین سے ہوتی رہی ہے اور جسے آج کا طالب علم بھی عدم علم کے باعث نہیں سمجھ پاتا، یہ ہے کہ انھوں نے موضوعِ تحقیق اور طریقۂ تحقیق کے ناقابلِ انقطاع تعلق کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ایک محقق کا طریقۂ تحقیق زندگی کے دوسرے مسائل کے بارے میں اس کی مجموعی فکر کا ہی نتیجہ ہوتا ہے۔ مجموعی فکر اور طریقۂ تحقیق کا تعلق کل و جز کا تعلق ہے۔ اگر محقق کی مجموعی فکر غلط ہے تو اس کا طریقۂ تحقیق بھی غلط ہوگا اور نتیجتاً اس کے تحقیقی نتائج بھی مشتبہ ہو جائیں گے۔ ایک صحت مند اور بامقصد تحقیق کے لیے ناگزیر ہے کہ خود محقق فکرِ صحیح کا حامل ہو۔ کیونکہ ایسا ہی شخص صحیح رخ سے تحقیق کر کے درست نتائج اخذ کر سکتا ہے۔ واضح رہے کہ طریقۂ تحقیق سے میرا مطلب نظریہ کے مختلف حصص میں تعلق کی نوعیت کا تحقیقی فہم اور درست نتائج اخذ کرنے سے ہے نہ کہ اس راستے سے جس پر چل کر محقق قدم بہ قدم تحقیق کی منزلیں طے کرتا ہے۔

روایتی طریقہ

اب اگر ہم ان ہزاروں صفحات پر نگاہ ڈالیں جو ان نظریات کی تحقیق میں سیاہ کیے گئے ہیں تو ہم پائیں گے کہ تحقیق کا ایک مخصوص انداز ہے جس کی تقلید ہر محقق نے کی ہے۔ نظریہ کی ابتدا کا پس منظر، اس کا طریقہ مطالعہ، جزئیات کی شرح، پھر اس پر تنقید، یہ سارے مراحل جو ایک نظریہ کی تحقیق کے دوران پیش آتے ہیں، ان پر بحث کرنے کا ایک روایتی طریقہ ہے جس کی پیروی سبھی کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ روایتی طریقہ تحقیق انہیں نظریات کی پیداوار ہے۔ جن پر تنقید کر کے خود انہیں محققین نے رد کر دیا ہے اور جن کے صحیح ہونے کے وہ خود قائل نہیں ہیں۔ یعنی مادہ پرستی، خدا اور حیات بعد الممات وغیرہ سے انکار جن نظریات کی مشترک خصوصیات ہیں۔

یہ جان لینے کے بعد کہ ہمارے پیش رو محققین علم حقیقت سے ناآشنا تھے (جیسا کہ خود ان کا اعتراف ہے) ہم ان کے تحقیقی نتائج پر بھی اعتماد نہیں کر سکتے اور اس طرح اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ایک نئے زاویے سے ان کا دوبارہ مطالعہ کیا جائے نیز ایک جدید، خالص عقلی —— اسلامی طرز تحقیق کو جس کا ماخذ قیاسات اور فلسفہ کے ناپائدار اصنام نہ ہوں، بلکہ کائنات کے ٹھوس حقائق ہوں، استعمال میں لایا جائے اور درست نتائج اخذ کر کے بامقصد تحقیق کا حق ادا کیا جائے۔ پیش نظر کوشش اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

ایک مثال

یہ بات کہ صحت مند تحقیق ایک صحیح الفکر محقق ہی کر سکتا ہے ایک مثال کے ذریعے واضح کی جا سکتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک نظریے کے مطالعہ میں سب سے پہلا سوال جو سامنے آتا ہے، یہ ہے کہ وہ نظریہ وجود میں کیوں آیا —— یہ سوال ذرا وسیع کر دینے پر اس طرح ہو جاتا ہے کہ نظریات وجود میں کیوں آتے ہیں اور ان کی تبدیلیوں کا سبب کیا ہے —— اس کا ایک جواب مارکس اور اس کے متبعین دیتے ہیں ان کے مطابق ہر زمانے میں وسائل پیدائش ایک مخصوص معیار پر ہوتے ہیں اور یہی وسائل اس وقت کے سماجی تعلقات کو متعین کرتے ہیں۔ افراد کا نظریہ زندگی، تصور اخلاق، آداب معاشرت سبھی اس وقت کے ذرائع پیداوار سے ہم آہنگ ہوتے ہیں لیکن کچھ مدت کے بعد پیداوار کے یہ طریقے ترقی کر جاتے ہیں اور نظریہ زندگی وغیرہ سے ہم آہنگی ٹوٹ جاتی ہے جس سے معاشرے میں کشمکش اور بے چینیاں پیدا ہوتی

ہیں۔ ان بے چینیوں کو ختم کرنے اور سماجی تعلقات کو جدید طریقہ پیداوار سے دوبارہ ہم آہنگ کرانے کے لیے ایک نیا نظریہ وجود میں آتا ہے، جو پچھلے نظریہ سے اعلیٰ وارفع ہوتا ہے۔

دوسرا گروہ بھی نظریات کی تبدیلیوں کا سبب تقریباً یہی بتاتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ صنعتی اور زراعتی پیداوار کے دائرے کو ذرا وسیع کر دیتا ہے۔ اس کے مطابق تہذیبیں دو پہلو رکھتی ہیں۔ ایک مادی جس میں کسی خاص وقت کی ملیں، کارخانے، آلاتِ زراعت، سواریاں، سڑکیں اور مکان وغیرہ آتے ہیں اور دوسرا فکری پہلو جو اسی زمانے کے رسم و رواج، تصورِ اخلاق، نظریہ زندگی اور رہن سہن کے طور طریقوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ایک خاص وقت تک تہذیب کے ان دونوں پہلوؤں میں ارتباط و ہم آہنگی پائی جاتی ہے لیکن جلد ہی مادی زندگی میں ارتقا ہونے کے باعث یہ ارتباط قائم نہیں رہتا اور ایک "تہذیبی لنگ" (CULTURAL-LAG) کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ انتشار اور بے چینیوں کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ انتشار جیسے جیسے بڑھتا جاتا ہے ویسے ویسے ایک ایسے نظریہ کی ضرورت شدید تر ہوتی جاتی ہے جو تہذیب کے ان دونوں پہلوؤں میں مصالحت کرا سکے۔ ان حالات میں جو بھی نظریہ اس فرض کو قبول کرتا ہے وہ قابلِ احترام اور لائق استقبال ہوتا ہے۔

غلط توجیہات

اس طرح ان دونوں توجیہات میں ایک مشترک بات یہ ہے کہ نئے نظریے کے وجود میں آنے سے پہلے ہی حالات پیدا ہو چکے ہوتے ہیں یعنی نیا نظریہ نئے حالات کے پیدا ہونے کا سبب نہیں بلکہ اس کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اگرچہ اس پر طویل بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے تاہم ایک معمولی مثال کے ذریعے ان توجیہات کی غلطی کو واضح کیا جا سکتا ہے۔ آج سے تقریباً چودہ سو سال پہلے عرب کی تاریخ پر ہم نظر ڈالیں تو ہم دیکھیں گے کہ ایک شخص محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ذہنِ انسانی کو ایک بالکل نئے نظریہ سے روشناس کرا کے ایک ہمہ گیر انقلاب پیدا کیا۔ اب جب ہم ان عوامل کی تلاش میں نکلتے ہیں جن کا ذکر ہمارے مغربی مفکرین کرتے ہیں۔ یعنی اس وقت آلاتِ پیدائش کا ترقی یافتہ ہو جانا یا مادی زندگی کا معیار بلند ہو جانا، تو ہمیں دور دور تک ان باتوں کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔ جو بات ہمیں نظر آتی ہے وہ یہی ہے کہ اس وقت کا عربی معاشرہ جمود اور تاریکی میں گھرا ہوا تھا۔ توہمات کی پرستش، بے عملی نسلی و نسبی غرور وغیرہ عربوں کے امتیازی اوصاف تھے۔ لیکن اس نظریہ کے ظاہر ہونے اور عربوں کے

قبول کرنے کے بعد موجود ماحول میں ایک زلزلہ سا آ گیا اور عربوں میں وہ تمام صفات ظاہر ہونا شروع ہوگئیں جو کسی قوم کے ترقی یافتہ ہونے کی مظہر ہوتی ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ مذکورہ بالا دونوں توجیہیں خام فکری اور کوتاہ بینی کا نتیجہ ہیں اور حقائق سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں لیکن اس خام فکری یا کوتاہ بینی کو ہم غیر اہم سمجھ کر نظر انداز نہیں کر سکتے کیونکہ اسی کا سہارا لے کر ایک نئے نظریہ کے خواہ وہ عقلی اعتبار سے کتنا ہی غلط کیوں نہ ہو، درست اور قابل قبول ہونے کا جواز فراہم کیا جاتا ہے۔ اس کے مطابق ایک نیا نظریہ سماج کی ایک شدید ترین ضرورت کے تحت وجود میں آتا ہے اس لیے اس کا انکار رجعت پسندی اور گناہ ہے۔

اب ہم مختصر الفاظ میں یہ بتائیں گے کہ کوئی نیا نظریہ وجود میں کیوں آتا ہے اور ایک نئے نظریہ کے مطالعہ میں پس منظر کی حقیقی اہمیت کیا ہے۔

حقیقی سبب

فطرت انسانی کا جائزہ ہم ذرا گہرائی سے لیں تو پائیں گے کہ اس میں امن و سکون کی زندگی گذارنے کی ایک شدید خواہش ہے جس سے مجبور ہو کر وہ پیہم ان اصولوں کی تلاش میں رہتا ہے جن کے عملی انطباق سے وہ انفرادی و اجتماعی امن سے ہمکنار ہو سکے۔ اس فطرت کو بیدار کرنے میں جہاں متعدد عوامل کام کرتے ہیں وہیں سب سے اہم عامل اس وقت کی سماجی بے چینیاں ہوتی ہیں۔ یہ بے چینیاں معاشی، جنسی، اخلاقی، سیاسی کسی بھی میدان میں ہو سکتی ہیں۔ انہیں بے چینیوں کو محسوس کر کے ایک مفکر خرابیوں کی اصلاح کی طرف مائل ہوتا ہے ضمنی طور پر یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ یہ بے چینیاں بھی کسی غلط نظریے کے عملی انطباق سے یا صحیح نظریہ سے افراد کی غفلت کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ خرابیوں کی اصلاح کرنے کے لیے مفکر کے سامنے دو راستے ہوتے ہیں۔ ایک راستہ تو یہ ہے کہ وہ اس ذات کی طرف رجوع ہو جو اس کی ادنےٰ ترین ضروریات کو بھی پورا کرتی رہتی ہے اور دوسرا یہ کہ وہ خود اپنی عقل پر بھروسہ کرے۔

دوسری صورت میں مفکر رائج فکر کا بغور مطالعہ کرتا ہے۔ اس کی خامیوں کو متعین کر کے اس پر تنقید کرتا ہے۔ تنقید کے بعد یا تو وہ اسے بالکل رد کر دیتا ہے اور از سر نو ایک نیا فلسفہ مرتب کرتا ہے یا محض غلطیوں کی اصلاح پر اکتفا کرتا ہے۔ دونوں صورتوں میں وہ ایک نئے نام سے ایک نئے نظام حیات کی تعمیر کرتا ہے جس کے بارے میں اسے یقین ہوتا ہے کہ چونکہ اس نے پچھلے نظریہ کی تمام خامیوں کو دور کر دیا ہے اس لیے

یہ نیا نظریہ یقیناً مثبت و مفید نتائج پیدا کرے گا

پس منظر کی حقیقی اہمیت

لیکن وہ اس بات سے بے خبر رہتا ہے کہ جن حالات نے اس کو ایک نیا نظریہ وجود میں لانے کے لیے متحرک کیا ہے وہی اس کے فکری سفر میں ردعمل کے اثرات بھی دے رہے ہیں جن سے متاثر ہو کر وہ غیر شعوری طور سے راہ راست سے دور ہوتا جا رہا ہے یہ عملاً ناممکن ہے کہ عقل انسانی اپنے گرد پھیلے ہوئے نازک اور پیچ در پیچ حالات کے تاثر سے قطعی طور پر محفوظ رہ سکے۔ مذکورہ بات جہاں خالص عقلی طور پر ناقابل تردید ہے" وہیں پیہم تجربات نے بھی یہ ثابت کر دیا ہے کہ عقل کامل کا سہارا لیے بغیر جو بھی نظام حیات ترتیب دیا جائے گا وہ ادھورا ناقص اور نتائج کے اعتبار سے مضر ہو گا۔

اس طرح پس منظر چونکہ نئے نظریہ کے وجود میں لانے اور پھر اسے راہ راست سے دور لے جانے دونوں کا اہم سبب ہے۔ اس لیے ناگزیر ہے کہ کسی بھی نظریہ کے جس کے خدوخال انسان نے اپنی عقلی پروازوں سے متعین کیے ہوں۔ مطالعے سے پہلے ہم ان حالات کا مطالعہ کریں جن میں اس کی ابتدا ہوئی وہ پھلا پھولا اور اس کی تکمیل ہوئی۔

نظریہ افادیت بھی اس سے الگ نہیں ہے۔ اگر ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اس میں کتنا عنصر صداقت کا ہے اور کتنا گمراہی کا تو ہمارے لیے ناگزیر ہے کہ ہم تاریخ یورپ کے ان اوراق کو پلٹیں جن میں اس نظریہ کی پیدائش، ترقی اور تکمیل ہوئی۔ اس کے علاوہ اس مجموعی فکر کا بھی جائزہ ہمیں لینا ہو گا جو ان حالات یعنی بے چینیوں کی ذمہ دار تھی۔

اٹھارہویں صدی کا یورپ

اٹھارہویں صدی کے یورپ میں مذہبی اقتدار و اقدار سے بغاوت، انقلابی سائنسی انکشافات اور مفکرین سیاسی و معاشی کی کوششوں نے جس "مخلوط فکر" کو جنم دیا تھا اس کی بنیادی قدریں حسب ذیل تھیں

۱۔ تمام چھوٹے بڑے سماجی اداروں حتیٰ کہ حکومت کی بھی تمام جدوجہد اور سرگرمیوں کا مرکز و محور فرد ہے۔ فرد مقصود (END) ہے اور تمام چیزیں ذریعہ (MEANS)

۲۔ انسان فطری طور پر خود غرض ہے۔ اس کے ہر عمل کے پیچھے اس کی کوئی نہ کوئی غرض چھپی ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ رحم، قربانی اور نیکی وغیرہ جیسے جذبات نیک نامی کی خواہش کی پیداوار ہیں۔

۳۔ مذہب ایک انفرادی معاملہ ہے۔ کسی خاص مذہب کو ماننا یا نہ ماننا فرد کی مرضی پر منحصر ہے تاس لیے اس کی بنیاد پر کسی قسم کا استحصال غیر درست ہے۔

۴۔ کوئی ایسا اخلاقی اصول قابل تسلیم نہیں جس کا ماخذ فوق العقلی تصورات ہوں

۵۔ ریاست ایک معاہدے کے تحت وجود میں آتی ہے جس کا مقصد خود حفاظتی اور تحفظ آزادی وغیرہ ہیں اور اس طرح ــــ

(الف) اصل حکمران عوام ہیں۔ ایک حکومت کو جو بھی اختیارات حاصل ہیں وہ عوام کے ذریعے ہی مہیا کیے ہوئے ہیں۔

(ب) کوئی حکومت اگر اپنے فرائض پورے نہیں کرتی، یا اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کرتی ہو تو عوام کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس کو برطرف کر کے نئی حکومت تشکیل دیں۔

(ج) عوام کو مخصوص نظریہ رکھنے، اس پر عمل کرنے اور اس کو پھیلانے کا فطری حق حاصل ہے۔ حکومت کی مداخلت ان معاملات میں غلط ہے۔

(د) پورا حکومتی عملہ محکمہ پولس کی طرح ہے جس کا کام یہ ہے کہ افراد کے باہمی مفادات میں ٹکراؤ نہ ہونے دے۔

۶۔ معاشی میدان میں ہر شخص آزاد ہے۔ وہ ذاتی ملکیت رکھ سکتا ہے اور اس کو وسعت دے سکتا ہے۔ تجارت حکومت کی مداخلت سے قطعی طور پر آزاد ہونی چاہیے۔

بھیانک نتائج

اس مخلوط فکر[1] نے سماج میں بہت بھیانک نتائج پیدا کیے۔ فرد کی انفرادیت کو حد سے زیادہ اہمیت دی جانے لگی جس نے فرد و جماعت کے تعلقات میں اعتدال پیدا کرنے والی حدود کو توڑ دیا۔ خدا اور آخرت کے انکار سے فرد کی نگاہوں میں اخلاقی قدروں کی اہمیت کم بہت کم ہو گئی جس سے معاشرہ میں جنسی و اخلاقی بحران پیدا ہو گیا۔ معاشی دائروں میں آزاد تجارت اور بے قید مضاربت نے ایک نئے طبقے کو جنم دیا جس نے شخصی آزادی کی آڑ میں غریبوں، مزدوروں اور کسانوں کا استحصال شروع کر دیا۔

---

[1] یہ مخلوط فکر کسی ایک مفکر یا فلسفی کا فلسفہ نہیں تھی، بلکہ ایک آئینہ ہے جو اس وقت کے انگریزی معاشرے کے پڑھے لکھے ذہنوں کا عمومی رجحان کی عکاسی کرتا ہے

قومی ریاستوں کے وجود میں آنے کے باعث مفاداتی ٹکراؤ بھی پیدا ہوئے لگا اور جنگوں کے لیے فضا ہموار ہونا شروع ہوگئی۔ اس طرح زندگی کے ہر میدان میں بے چینیاں ہی بے چینیاں نظر آنے لگیں۔ ان بے چینیوں کو ختم کرنے اور خرابیوں کی اصلاح کا دعویٰ لیکر جو نظریہ اٹھا اسے ہم نظریۂ افادیت کے نام سے جانتے ہیں

افادیت کیا ہے

یہاں مختصر طور پر یہ جان لینا مفید ہوگا کہ افادیین لفظ افادیت سے کیا مراد لیتے ہیں۔ عام طور پر جو مطلب اس سے لیا جاتا ہے یہ ہے کہ کوئی شے ہماری زندگی میں کتنی مفید ہے اور اس طرح کتنی مسرت بخش۔ جو شے جتنی مفید ہوگی ہم اسے اسی قدر پسند کریں گے اور اس کے حصول کے لیے اتنی ہی جد و جہد کریں گے۔ اس کے برخلاف جو شے ہماری زندگی کے لیے جتنی نقصان رساں ہو سکتی ہے اسے ہم اسی قدر ناپسند کریں گے اور اس سے دور بھاگیں گے۔"

لیکن افادیت کا یہ تصور علمائے افادیت کے نزدیک بڑا محدود ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اگر لفظ افادیت کو وسعت نظر سے دیکھا جائے تو یہ ہماری وسیع تر مسرتوں کا نمائندہ ہو جاتا ہے۔ فرد کی زندگی کا انتہائی مقصود مسرتوں کا حصول ہے اور مسرت، افادیت میں مضمر ہے۔ افادیت انفرادی ارد میں خوشحالی کا پیغام پہنچا کر جب اجتماعی دائرے میں داخل ہوتی ہے تو زائد تر افراد کے لیے زائد تر راحت کی نقیب ہو جاتی ہے۔ وہ یہ جانتے ہوئے کہ فرد ایک سماجی جاندار ہے، اس کے سماجی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑتی اور اجتماعی پہلو سے بحث کرتی ہے۔

یہی وہ نظریہ تھا جس کی بنیاد پر مفکرین نے ریاسیات و اخلاقیات کی ایک نئی تشریح عوام کے سامنے رکھی۔ اگرچہ ایک مربوط فلسفہ کی صورت میں اس کی بنیاد انگلینڈ میں پڑی لیکن یہ کہنا بالکل غلط ہوگا کہ افادیت کا یہ تصور بالکل جدید ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے بعد جتنے بھی نظریات وجود میں آئے ان کے بنیادی تصورات غیر مربوط و غیر ترقی یافتہ شکل میں قدیم یونانی دانشوروں کی کتابوں میں ہم کو مل جاتے ہیں اور سچ پوچھیے تو یورپ کی اس نشاۃ ثانیہ کا حقیقی سبب بھی افلاطون و ارسطو کی وہ کتابیں ہیں جن سے استفادہ کرکے اہالیان یورپ نے خود کو اس جمود و تاریکی سے آزاد کیا جو ان پر سینکڑوں سالوں سے مسلط تھی۔ (یہ ایک الگ بات ہے کہ یہ آزادی بھی بالآخر غلامی ہی کی ایک دوسری شکل ثابت ہوئی۔) یہی کتابیں ان کے علمی ارتقا کا سبب اور پھر ان کے بنیادی تصورات

کا ماخذ و منبع نہیں۔

افادیت کے تصور کی جھلکیاں بھی ہمیں یونان کے ایپی کیورنیوں اور سوفسطائیوں کے افکار میں ملتی ہیں۔ قدیم ہندوستان کی تاریخ میں بھی ایسے گروہ ملتے ہیں جن کا خیال تھا کہ انسان کو آج کی مسرتوں کی طرف توجہ کرنا چاہیے حتیٰ کہ اگر قرض لیکر بھی گھی پینا پڑے تو اس سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔ ان کا کہنا تھا کہ کل جب ہمارے عناصر خمسہ اپنے اپنے منبع کی طرف لوٹ جائیں گے تب کون پوچھ تاچھ کرے گا لیکن زمانہ حال میں اس تصور کی بنیاد ڈالنے والا پہلا شخص رچرڈ کمبرلینڈ تھا بعد میں فرانس کے ہوتیمن نے زائد تر افراد کے لیے زائد تر مسرت کا اصول پیش کرکے اسے آگے بڑھایا لیکن اسے ایک منظم فلسفہ کی صورت دینے کا سہرا انگلینڈ کے جرمی بنیتھم کے سر ہے۔ بعد میں بنیتھم کے مقرب دوست جیمس مل اور پھر جیمس مل کے لڑکے جان اسٹوارٹ مل نے مزید تشریح و توضیح کرکے اسے وقت کا ایک ترقی یافتہ فلسفہ بنا دیا جان آسٹن کی قانونی کوششیں بھی اس نظریے کو مستحکم بنانے میں مددگار ثابت ہوئیں۔

مقبولیت کے اسباب

افادیت کا یہ نظریہ یورپ میں بہت مقبول ہوا۔ اس نے جہاں دانشور اور تعلیم یافتہ طبقہ کو متاثر کیا وہیں عوامی حلقوں میں بھی اسے حیرت انگیز مقبولیت حاصل ہوئی اس ہمہ گیر مقبولیت کا سبب کیا تھا اسے ہم ان حالات کے پس منظر میں بآسانی سمجھ سکتے ہیں جن سے اس وقت کا انگریزی معاشرہ دوچار تھا۔

جہاں تک دانشور طبقہ کا تعلق ہے وہ اس وقت دو چیزوں سے بہت پریشان تھا جس میں سے ایک تو وہ برائیاں تھیں جو سماج کے مختلف سیاسی، معاشی و معاشرتی دائروں میں پھوٹ پڑی تھیں جن میں دولت کا ارتکاز، غریبی و بے روزگاری میں تیزی سے اضافہ اور اخلاقی انارکی خصوصیت ہیں۔ دوسرا سوال جوان کو پریشان کر رہا تھا وہ یہ تھا کہ تصور جزا و سزا کے انکار کے بعد ہمارے اعمال کا معیار خیر کیا ٹھہرتا ہے؟ یہ سوال بہت اہم اور فوری جواب کا طالب تھا۔

یہ تو ناقابل تسلیم ہے کہ اس نظریے نے یورپ میں پھیلی ہوئی ہمہ گیر سماجی خرابیوں کی اصلاح کرنے میں واقعی کامیابی حاصل کی اور اسی طرح یہ بات بھی نہیں مانی جاسکتی کہ اعمال کے معیار خیر ٹھہرنے

لیکن کمیا اسٹ لے کی وہ حل طور پر درست تھی لیکن پھر بھی اس نے سوالات و مسائل کو حل کرنے کا دعویٰ کیا تھا۔ اسے آزمانے کے لیے ایک مدت درکار تھی اور کہا جا سکتا ہے کہ اہل دانش نے اس کی تمام خامیوں کو سمجھتے ہوئے بھی اسے قبول کیا۔ اس کے علاوہ اس نے فرد کی خالی انفرادیت پر کچھ نہ کچھ روک لگانے میں بھی کامیابی حاصل کر لی۔

عوامی مقبولیت

اس نظریہ کو عوامی مقبولیت اس لیے ملی کہ اس کے حاملین نے اپنی مساعی کو صرف کتابوں اور علمی مجالس تک ہی نہیں محدود رکھا بلکہ اسے ایک عوامی تحریک کی شکل میں بھی پھیلایا۔ افادیین سرگرم سیاسی کارکن ہوتے تھے۔ ان لوگوں نے نظام انتخاب، قوانین اور جرم وسزا وغیرہ کے مروجہ طریقوں میں اصلاح کی آواز اٹھائی اور اسے روبعمل لانے میں کامیاب بھی ہوئے۔ انھوں نے غریبوں، مزدوروں اور کسانوں کی زبوں حالی کی طرف بھی توجہ کی اور حکومت کو مجبور کیا کہ سرمایہ دار طبقہ ان کا جو استحصال کر رہا ہے اس پر روک لگائے۔

دانشوروں اور سادہ لوح عوام کے علاوہ تیرا۔ تاجر طبقہ تھا جس نے اس وقت کے انگریزی معاشرے میں متعدد عوامل کی وجہ سے کافی اہمیت حاصل کر لی تھی۔

تاجر طبقہ

اس وقت کے انگریزی معاشرے میں متعدد عوامل کی وجہ سے کافی اہمیت حاصل کر لی تھی سرمایہ دار تاجروں کا یہ طبقہ ملک کی معیشت پر پورا کنٹرول رکھتا تھا۔ اسی طبقہ نے انگلینڈ کے باہر جا کر سلطنت برطانیہ کو وسعت دی تھی اور اس طرح انگلینڈ کے قومی وقار اور تجارتی منافع میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔ اپنی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے یہ تاجر طبقہ زیادہ سے زیادہ سیاسی اختیارات کا طالب تھا۔ دوسری طرف انگلینڈ میں جو حکومت قائم تھی وہ اگرچہ عظیم انقلاب GLORIOUS REVOLUTION (۱۶۸۸ء) کے بعد بادشاہ کی مطلق العنانی سے آزاد ہو چکی تھی لیکن اب بھی اس پر رجعت پسند اور تبدیلیوں کے مخالف جاگیرداروں اور ڈیوکوں کا تسلط تھا۔ اس وقت کی پارلیامنٹ تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دینے میں بالکل ناکام تھی۔ نتیجہ میں پارلیامنٹ اور تاجروں میں ایک سرد جنگ چل رہی تھی۔

ان حالات میں افادیت کا نظریہ ان سرمایہ دار تاجروں کے لیے نعمت غیر مترقبہ تھا۔ انھوں نے اس کی معقولیت اور صحت کی بحث میں الجھے بغیر اسے شرف قبولیت بخشا۔ اس نظریے نے ایک طرف پاپائیت کے خلاف ان کی جد وجہد کو آسان بنا دیا تو دوسری طرف اس کی آڑ لیکر انھوں نے غریب مزدوروں اور کسانوں کو اور تیزی سے لوٹنا شروع کر دیا۔

ان وجوہ کے علاوہ چند ایسی خصوصیات بھی تھیں جو اس کو دوسرے ہم صف نظریات سے ممتاز کرتی تھیں نیز ایک متوسط ذہن کے لیے کشش کا باعث تھیں۔ ان خصوصیات کا مطالعہ کرنا بھی داخل موضوع ہوگا اور اس فلسفہ کی تفصیلات کو سمجھنے میں آسانی پیدا کرے گا۔ پہلی خصوصیات اس نظریہ کی یہ ہے کہ یہ ایک عملی فلسفہ ہے۔ اس سے پہلے کے فلسفے محض تصورات اور منطقی دلائل کے بوجھ سے لدے ہوتے تھے۔ ان فلسفوں نے سماجی اور سیاسی ماحول میں تبدیلی ضرور پیدا کی لیکن افراد کی عملی زندگی بہت حد تک ان کے اثرات سے دور تھی۔ فرد اب بھی کسی نہ کسی طرح مذہب کو فکری طور پر تسلیم کرتا تھا اور اپنے معمولات میں خدا کے بنائے ہوئے اصولوں اور اس کے ذریعے عائد کی گئی پابندیوں کا لحاظ رکھتا تھا۔ وہ برے کاموں کو کم از کم برا سمجھتا ضرور تھا اگرچہ اس میں موروثیت کا اثر غالب تھا۔ لیکن اس نظریہ نے ان ڈھیلی ڈھالی اخلاقی پابندیوں کو بالکل تتر بتر کر دیا۔ اب فرد کوئی کام کرنے سے پہلے خدا کے ذریعے متعین کردہ پیمانوں کی بجائے اس کی افادیت کو مدنظر رکھنے لگا۔ وہ قدریں جو اشیاء و اعمال کے اچھے یا برے ہونے کے لیے مستقل سمجھی جاتی تھیں اب ان کی جگہ عارضی افادیت و مضرت نے لی۔ یہ اصول کہ ہر عمل کے خوب و زشت کا فیصلہ نتائج کی بنیاد پر ہی کیا جانا چاہیے تاریخ فلسفہ میں نظریہ عملیت (PRAGMATISM) کے نام سے جانا جاتا ہے۔

مسرت ہی مقصود ہے

دوسری خصوصیت جو اس کو دیگر نظریات سے ممتاز کرتی ہے' یہ ہے کہ اس نے ذہن انسانی کی نفسیات تشریح کی۔ اس نے عمل انسانی کو ایک نہایت الجھے ہوئے ذہنی عمل MENTAL PROCESS کا نتیجہ بتایا۔ اس نے جہاں فرد کی انفرادیت کو اہمیت دی وہیں اس کی اجتماعی حیثیت سے غفلت نہیں برتی۔ یہ مانتے ہوئے کہ فرد کا سماج سے الگ کوئی وجود نہیں ہے۔ یہ قانونی پہلوؤں سے بھی بحث کرتا ہے۔ اس نظریے کے مطابق فرد کی مسرت ہی انتہائی مقصود ہے اور اس اصول کے پیش نظر یہ

حکومت کو مشورہ دیتا ہے کہ وہ صرف ایسے قانون بنائے جو فرد کی زندگی میں دکھ کی مقدار کم کرنے والے اور مسرت کی مقدار بڑھانے والے ہوں۔ اس طرح دوسرے نظریات کی بہ نسبت یہ نظریہ انفرادی اور اجتماعی مسرتوں سے زیادہ سیدھی اور واضح بحث کرتا ہے۔ مسرت ہی فرد کا مقصود اصلی ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ اس اصول کو پیش کر کے اس نے مسرتیت HEDONISM کو مزید استحکام بخشا۔

یہاں تک ہم نے نظریہ افادیت کی تاریخ و پس منظر جس میں اس کا جنم ہوا۔ اس کی خصوصیات اس کی مقبولیت کے اسباب سے بحث کی نیز اس کا ایک ہلکا سا خاکہ قاری کے ذہن میں بٹھانے کی کوشش کی۔ اب ہمارے سامنے جو کام رہ جاتا ہے۔ یہ ہے کہ ہم اس فلسفہ کو مفصل طور پر پیش کریں پھر اس پر نقد کر کے اس کی غلطیاں واضح کریں لیکن آگے بڑھنے سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ قارئین اس فلسفہ کے موجد جرمی بنیتھم کی سوانح سے واقف ہو جائیں اور اس سے اس مسئلے کو بھی جان لیں جس نے اس کو ایک نیا فلسفہ ایجاد کرنے کی ترغیب دی اور اس کے لیے محرک بنا۔

بنیتھم کی سوانح

بنیتھم ۱۵ فروری ۱۷۴۸ء کو لندن کے ہاونڈس ورچ محلہ میں ایک دولتمند اور وکالت پیشہ خاندان میں پیدا ہوا۔ اس کے والد کی خواہش تھی کہ اس کا بیٹا اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے کوئی اونچی سرکاری ملازمت حاصل کرے اور بظاہر ایسی کوئی چیز نہیں تھی جو اسے ایسا بننے میں رکاوٹ ڈالتی کیونکہ جہاں وہ معاشی طور پر خوشحال تھا وہیں ذہانت کی دولت سے بھی مالا مال تھا۔ اس کی خداداد ذہانت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے ۱۷۶۳ء میں صرف ۱۶ سال کی مختصر عمر میں بی اے پاس کر لیا۔ اس کے بعد اس نے ایم اے اور پھر قانون کے امتحانات امتیازی نمبروں سے پاس کیے لیکن وہ بجائے اس کے کہ آبائی پیشے کو اختیار کر کے وکیل بنتا یا کوئی اعلیٰ سرکاری ملازمت حاصل کرتا اس نے مروجہ قوانین کی اصلاح میں دلچسپی لینی شروع کر دی اور جلد ہی یہ دلچسپی اصلاح قوانین کی ہمہ گیر تحریک میں بدل گئی۔

تیرگی کا پیغامبر

بنیتھم طبعاً بہت محنتی اور اصول کا پابند شخص تھا۔ اس کی تحریری کاوشیں گیارہ جلدوں میں شائع ہوئیں۔ انگریزی لغت کو اس نے سب سے پہلے MAXIMUM, CODIFICATION, MINI

وغیرہ الفاظ سے روشناس کرایا۔ خود لفظ افادیت UTILITARIANISM اسی کا ایجاد کردہ ہے
بینتھم انگلینڈ کی تاریخ کے اس دور کی پیداوار تھا جب پوری انگریز قوم نام نہاد خود اعتمادی اور
خود پسندی کا شکار تھی۔ اس کا دور عقلیت کا دور AGE OF REASON تھا اپنی عقل پر کامل بھروسہ
مذہب اور خدا سے بے زاری اسے ورثے میں ملی تھی۔ حواس خمسہ کے ذریعے حاصل شدہ علم ہی حقیقی علم
ہے۔ یہ ایک ایسا اصول تھا جو اس سے پہلے کے دانشوروں کے لیے مسلمہ اور ہر شبہ سے بالاتر تھا۔ بینتھم
نے بھی ایک مصلح کی حیثیت اختیار کرنے کے لیے اس طریقہ کی آنکھ بند کرکے پیروی کی اور ایک ایسے تصور
کی بنیاد ڈالی جو اصلاح تو کیا کرتا اس نے بچے کھچے اخلاقی بندھنوں سے بھی انسان کو آزاد کر دیا۔ اس
نے معاشرے میں ایک ایسا بیج بویا جس کے تنے شاخیں ٹہنیاں سبھی خاردار تھیں۔ آج کے اہل دانش،
جس کی ایک شاخ کاٹتے ہیں تو متعدد خاردار شاخیں اس میں سے پھوٹ پڑتی ہیں
چوراسی سال تک عقل و دانش کی مصنوعی پھلجھڑیاں چھوڑنے کے بعد تیرگی کا یہ پیغامبر ۶ جون ۱۸۳۲ء
کو ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔

بینتھم کا مسئلہ

ہم مضمون کے ابتدائی حصہ میں ہی یہ بحث کر آئے ہیں کہ عموماً کسی نئے نظریے کے وجود میں آنے
کا سبب اس وقت کی بے چینیاں ہوتی ہیں جو ایک مفکر یا فلسفی کو خرابیوں کی اصلاح کی طرف مائل کرتی
ہیں۔ روسو نے انسانوں کو موجودہ نام نہاد تہذیب سے بغاوت کرکے فطری معاشرہ NATURAL
SOCIETY کی طرف لوٹنے کا جو مشورہ دیا تھا تو صرف اس لیے کہ اس وقت کا فرانسیسی معاشرہ
تصنع، غرور، عدم مروت، بے ضمیری اور دکھاوے وغیرہ جیسے عیوب کے بوجھ تلے دبا کراہ رہا تھا۔
میکیاولی نے مملکت کے بادشاہ کو اگر قانونی و اخلاقی حد بندیوں سے آزاد کیا تو اس کی معمولی وجہ یہی
تھی کہ اس نے ایک کمزور مملکت کی موجودگی میں ظاہر ہونے والے معاشرتی فسادات کا اپنی آنکھوں سے
مشاہدہ کیا تھا۔
بینتھم کا بھی خیال کوئی نیا فلسفہ دینے کا نہیں تھا۔ وہ تو معاشی، اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی اداروں
میں پھیلی ہوئی خرابیوں کی اصلاح کرکے سماج کو نئے سرے سے منظم کرنے کا خواہشمند تھا۔ اس وقت کا
انگریزی معاشرہ ایک گندہ تالاب تھا جس کا وجود خود پسندی، سیاسی و معاشی استحصال، رشوت خوری

بے رنگ و گاری وغیرہ کے جراثیم بھنبھنا رہے تھے ۔بنتھم عقل و دانش کے چھڑکاؤ کے ذریعے جراثیم کشی چاہتا تھا ۔ وہ ایک ایسے جاذب کی تلاش میں تھا جو تالاب کی تمام گندگیوں کو جذب کرلے اور صاف وستھرا صحتمند پانی چھوڑ دے ۔

بنتھم کا فلسفہ

بنتھم نے فطرت انسانی کا مطالعہ کیا اور بتایا کہ ہم اپنے معمولات کا ذرا گہرائی سے جائزہ لیں تو پائیں گے کہ ہم صرف انہی کاموں کو کرنے کی طرف مائل ہوتے ہیں جن سے ہمیں امید ہوتی ہے کہ وہ ہمیں فائدہ پہنچائیں گے ۔اس کے برعکس ان تمام کاموں سے کنارہ کشی اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن کے بارے میں علم ہو کہ نقصان پہنچائیں گے ۔ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا کہ کوئی شخص ان کاموں میں دلچسپی لے جو دو ٹوک انداز میں اسے نقصان پہنچانے والے ہوں اور ان اشیاء سے دامن بچائے جن کے بارے میں وہ جانتا ہے کہ وہ اس کی زندگی کے لیے مفید ہیں ۔مفید اشیاء کی طرف رغبت اور مضر اشیاء سے نفرت یہ فطرت انسانی ہے اور اس کی قوت سے بعید تر ہے کہ وہ اپنی اس فطرت سے بغاوت کرے ۔بنتھم کے مطابق کوئی شے یا عمل بذات خود اچھا یا برا نہیں ہوتا بلکہ اس کے استعمال سے پیدا شدہ نتائج ہی اس کے اچھے یا برے ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں ۔ ہر ایسا عمل جو انسانی زندگی میں مفید ہے اچھا ہے اور ہر وہ شے جو اپنے اندر ضرر مضمر رکھتی ہے بری ہے اس طرح اشیاء و اعمال کا معیار خیر و شر کوئی ماورائے عقل اخلاق اصول نہیں ، بلکہ اس کی افادیت و مضرت ہی ہے ۔

بنتھم فطرت انسانی کے متعلق مزید بتاتا ہے کہ وہ ہمیشہ انسان کو ایسے کاموں سے روکتی ہے جو اسے دکھ پہنچانے والے ہوں اور ہر وہ کام کرنے کی تحریک دیتی ہے جس سے اسے خوشی ہو ۔اس کے مطابق

> "قدرت نے پورے معاشرۂ انسانی کو دو مقتدر اعلیٰ قوتوں مسرت اور غم کے زیر اثر رکھ چھوڑا ہے ۔یہی قوتیں اس بات کا فیصلہ کرتی ہیں کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے اور ہم کیا کرنے والے ہیں "

یعنی انسان مسرت پرست ہے وہ خوشیوں کا جتنا دلدادہ ہے غموں سے اتنا ہی متنفر ۔مسرت ہی انتہائی مقصود ہے

انسان اپنی زندگی میں خوشیوں کی مقدار اتنی بڑھا دینا چاہتا ہے کہ پھر اس کی زندگی میں کوئی غم

نہ رہ جائے۔ زیادہ سے زیادہ مسرتوں کا حصول ہی اس کی تمام جد و جہد کا مرکز اور اس کی زندگی کا اعلیٰ ترین نصب العین ہے۔ اس کے ماورا جو بھی نصب العین افراد کے لیے تجویز کیا جاتا ہے وہ غلط ہے عارضی مسرتوں کے حصول کا اصل فطرت ہونا بنتھم کے نزدیک اس قدر مسلّم اور ناقابلِ تنقید و تردید ہے کہ اس پر مزید بحث کو وہ فضول سمجھتا ہے۔

انسان مسرت چاہتا ہے اور مسرت افادیت میں مضمر ہے یہی بنتھم کا اصل الاصول ہے جس کی بنیاد پر وہ اپنے فلسفۂ افادیت کی پوری عمارت اٹھاتا ہے۔ وہ کہتا ہے :-

افادیت کے نظریے سے ہمارا مفہوم اس نظریہ سے ہے جس کی بنا پر متعلقہ شخص کی مسرت میں اضافہ یا کمی ہوتی ہے اور جس کی بنیاد پر وہ اپنے اعمال کے صحیح یا غلط ہونے کا دعوےٰ کرتا ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں وہ مسرت بخش ہے یا مسرت کش — میرا یہ اصول ہر عمل کے لیے ہے اس لیے اس کا انطباق محض فرد کے انفرادی معاملات پر ہی نہیں، حکومتی کاموں (تمام قانونی) پر بھی ہونا چاہیے۔"

انبیاءِ کرام پر جدت پسندی کا الزام

(جناب محمد ذکی لکچرار شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ)

رسولوں پر جہاں اور بہت سے الزامات لگائے گئے ہیں وہاں ایک "جدت پسندی" کا الزام بھی ہے۔ یعنی جب بھی کسی رسول نے اسلام کی دعوت دی ہے مخاطبین نے یہی کہا ہے کہ تم قدیم اور روایتی نظام کے خلاف بغاوت کر رہے ہو اور اسے الٹ کر ایک "جدید" نظام ہم پر مسلط کر دینا چاہتے ہو۔ ہم کسی قیمت پر بھی ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ چنانچہ وہ آخری دم تک اپنے روایتی نظام کی حفاظت کرتے رہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ انبیاء کرام کے پیش کردہ نظام میں وہ کون سی چیزیں تھیں جنہیں ہر دور میں جدید سمجھا گیا ہے، اور کیوں؟

سب سے پہلے اور مشہور رسول جن کے ساتھ یہ معاملہ پیش آیا وہ حضرت نوح علیہ السلام تھے۔ ان کی بعثت دجلہ و فرات کے دوآبہ (موجودہ عراق) میں ہوئی۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں بیشتر مورخین کے نزدیک سب سے پہلے تہذیب و تمدن کی شمع روشن ہوئی۔[1] اس کا مطلب یہ ہوا کہ تاریخی اعتبار سے نوح علیہ السلام کی قوم سب سے پہلی مہذب و متمدن قوم تھی اور قرآن حکیم نے بھی دعوت کا آغاز نوح علیہ السلام کی ذات گرامی سے کیا ہے۔ اس طرح :-

ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا (اس ہدایت کے ساتھ) کہ اپنی قوم کے لوگوں کو خبردار کر دے قبل اس کے کہ ان پر ایک دردناک عذاب آئے۔ اس نے کہا۔ "اے میری قوم کے لوگو! میں تمہارے لیے ایک صاف صاف خبر کر دینے والا (پیغمبر) ہوں (تم کو آگاہ کرتا ہوں) کہ اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو اور میری اطاعت کرو، اللہ تمہارے گناہوں سے درگذر

[1] یہاں کی تہذیب کا کچھ حال ہم نے اپنی کتاب "مغربی تہذیب ـــ آغاز و انجام" میں پیش کیا ہے۔

فرمائے گا اور تمہیں ایک وقت مقرر تک باقی رکھے گا حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت جب آجاتا ہے تو پھر ٹالا نہیں جاتا۔ کاش تمہیں اس کا علم ہوتا۔" (نوح - ع ۱)

ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ اس نے کہا: اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارے لیے کوئی اور معبود نہیں ہے۔ کیا تم ڈرتے نہیں ہو۔ (المؤمنون ع ۲)

قوم نوح نے رسولوں کو جھٹلایا۔ یاد کرو جب کہ ان کے بھائی نوح نے ان سے کہا تھا "کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟ میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔ لہٰذا تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ میرا اجر تو رب العلمین کے ذمے ہے۔ پس تم اللہ سے ڈرو اور (بے کھٹکے) میری اطاعت کرو۔ (الشعراء ع ۶)

اس کے جواب میں حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے جن سرداروں نے ماننے سے انکار کر دیا تھا کہنے لگے کہ :-

"یہ شخص کچھ نہیں ہے مگر ایک بشر تم ہی جیسا، اس کی غرض یہ ہے کہ تم پر برتری حاصل کرے۔ اللہ کو اگر بھیجنا ہوتا تو فرشتے بھیجتا۔ یہ بات تو ہم نے کبھی اپنے باپ دادا کے وقتوں میں سنی ہی نہیں (کہ بشر رسول بن کر آئے) کچھ نہیں۔ بس اس آدمی کو ذرا جنون لاحق ہو گیا، کچھ مدت اور دیکھ لو" (شاید افاقہ ہو جائے)۔ (المومنون ع ۲)

سرداران قوم نے حضرت نوح علیہ السلام کے متعلق کہا کہ انھوں نے تو ایک بالکل ہی نئی بات سنا دی وہ یہ کہ اللہ نے انہیں اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے۔ ہم نے تو اس سے پہلے اس قسم کی کوئی بات سنی نہیں، نہ ہی ہمارے آبا و اجداد میں کبھی اس قسم کا کبھی چرچا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس "جدید" تحریک کے ذریعے لیڈر بننا چاہتے ہیں اور کچھ نہیں۔

دوسری بات جو انہیں بہت ناگوار گذری وہ یہ تھی کہ حضرت نوح علیہ السلام توحید کی دعوت دے رہے تھے یعنی ان کا کہنا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہی مالک حقیقی ہے کسی کام کا حکم دینا یا کسی فعل سے باز رکھنا اسی کا حق ہے۔ اس کے سوا کسی بھی انسان، گروہ، یا کسی دوسری مخلوق کو یہ حق حاصل نہیں کہ اپنی یا اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کرائے، یہ ظلم ہے اور اس کی سزا یقیناً ملے گی۔

اس ناگواری کا سبب یہ تھا کہ نوح علیہ السلام کی قوم نے خدا کے سوا بہت سے معبود بنا رکھے تھے

ان فرضی معبودوں کی محبت اور ان سے عقیدت ان کے قلوب میں رچ بس چکی تھی وہ اسی طریقِ عبادت
کو جو انہیں ورثے میں ملا تھا صحیح سمجھتے تھے اور دعوتِ توحید سے بدکتے تھے۔ اس طریقِ عبادت اور اس
پر قائم نظام سے قوم کے لیڈروں کا مفاد وابستہ تھا۔ ان لیڈروں کا جن کے پاس دولت کی فراوانی تھی
جنہیں اپنی اولاد کی کثرت اور مادی وسائل پر ناز تھا۔ انھوں نے قوم کو مختلف طبقات میں بانٹ رکھا
تھا اور ایک ایسا نظام وضع کیا تھا جس میں غریبوں کو انسانی حقوق سے محروم کر دیا گیا تھا اتنا ہی نہیں
بلکہ انہیں یہ بھی گوارا نہیں تھا۔ غریب اور کمزور انسان بھی خدا کے رستے پر چلیں اور ان کی "غیرت" یہ
ہرگز گوارا نہیں کرتی تھی کہ ایک ہی صف میں کھڑے ہو جائیں محمود و ایاز" اس کے برعکس نوح علیہ السلام
کا پیش کردہ نظام انصاف پر قائم تھا جس میں امیر و غریب اور شریف و رذیل کا کوئی امتیاز نہ تھا اور
جو بندوں کی خدائی کا سخت مخالف تھا۔ یہ نظام جب وقت کے مروجہ نظام سے ٹکرایا تو ایک ہنگامہ
برپا ہو گیا۔ ان سرداروں نے کہا:۔ کہ اے نوح ؑ!

"ہماری نظر میں تو تم اس کے سوا کچھ نہیں ہو کہ بس ایک انسان ہو ہم جیسے اور ہم دیکھ رہے
ہیں کہ ہماری قوم میں سے بس ان لوگوں نے جو ہمارے ہاں اراذل تھے، بے سوچے سمجھے تمہاری
پیروی اختیار کر لی ہے اور ہم کوئی چیز بھی ایسی نہیں پاتے جس میں تم لوگ ہم سے کچھ بڑھے ہوئے
ہو، بلکہ ہم تو تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں۔" (ہود۲)

انھوں نے حق کو اس ضد پر قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ غریبوں نے کیوں قبول کر لیا؟

انھوں نے جواب دیا۔ "کیا ہم تجھے مان لیں۔ حالانکہ تیری پیروی رذیل ترین لوگوں
نے اختیار کی ہے۔ نوح نے کہا۔ میں کیا جانوں کہ ان کے عمل کیسے ہیں۔ ان کا حساب تو
میرے رب کے ذمے ہے۔ کاش تم کچھ شعور سے کام لو۔ میرا یہ کام نہیں ہے کہ جو ایمان
لائیں ان کو میں دھتکار دوں۔ میں تو بس ایک صاف متنبہ کرنے والا آدمی ہوں۔ انھوں
نے کہا۔ اے نوح اگر تو باز نہ آیا تو پھٹکارے ہوئے لوگوں میں شامل ہو کر رہے گا۔
(اور یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ تجھ کو رجم کر دیا جائے گا یعنی پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا جائے گا۔ (الشعرا)

ساڑھے نو سو سال تک حضرت نوح علیہ السلام تبلیغ حق کرتے رہے بالآخر انھوں نے بارگاہ الٰہی میں عرض کیا:۔

اے میرے رب! میں نے اپنی قوم کے لوگوں کو شب و روز پکارا مگر میری پکار نے ان کے فرار
ہی میں اضافہ کیا۔ اور جب بھی میں نے ان کو بلایا تاکہ تو انہیں معاف کر دے۔ انھوں

نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور اپنے کپڑوں سے منہ ڈھانک لیے اور اپنی روش پر اڑ گئے اور بڑا تکبر کیا۔ پھر میں نے ان کو ہانکے پکارے دعوت دی۔ پھر میں نے علانیہ بھی ان کو تبلیغ کی اور چپکے چپکے بھی سمجھایا۔ میں نے کہا اپنے رب سے معافی مانگو بے شک وہ بڑا معاف کرنے والا ہے۔ وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا۔ تمہیں مال اور اولاد سے نوازے گا۔ تمہارے لیے باغ پیدا کرے گا اور تمہارے لیے نہریں جاری کر دے گا تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کے لیے تم کسی وقار کی توقع نہیں رکھتے[1] حالانکہ اس نے طرح طرح سے تمہیں بنایا ہے۔ کیا دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان تہہ بر تہہ بنائے اور ان میں چاند کو نور اور سورج کو چراغ بنایا اور اللہ نے تم کو زمین سے عجیب طرح اگایا پھر وہ تمہیں اسی زمین میں واپس لے جائے گا اور اس سے یکایک تم کو نکال کھڑا کرے گا اور اللہ نے زمین کو تمہارے لیے فرش کی طرح بچھا دیا تاکہ تم اس کے اندر کھلے راستوں پر چلو۔

نوح نے کہا۔ میرے رب انھوں نے میری بات رد کر دی اور ان (رئیسوں) کی پیروی کی جو مال اور اولاد پا کر اور زیادہ نامراد ہو گئے ہیں۔ ان لوگوں نے بڑا بھاری مکر کا جال پھیلا رکھا ہے۔ انھوں نے کہا۔ ہرگز نہ چھوڑو اپنے معبودوں کو اور نہ چھوڑو وَدّ اور سواع کو اور نہ یغوث اور یعوق اور نہ نسر کو۔ انھوں نے بہت لوگوں کو گمراہ کیا ہے اور تو بھی ان ظالموں کو گمراہی کے سوا کسی چیز میں ترقی نہ دے۔ (نوح ع ۱ و ۲)

پھر اس قوم کا جو حشر ہوا وہ دنیا جانتی ہے۔ اتنی طویل مدت تک ظاہر ہے کہ نوح علیہ السلام نے قوم کو ہر طرح سمجھایا ہوگا اس کی مزید تفصیل قرآن نے دوسرے مقامات پر بیان کر دی ہے۔ اس سے بہرحال اتنا واضح ہو جاتا ہے کہ نوحؑ نے اسلام کے تین بنیادی اصولوں کی دعوت دی تھی (۱) کلمۂ توحید کا اقرار (۲) رسالت (۳) آخرت پر ایمان۔ اور ان کی قوم ان باتوں کو ماننے کے لیے کسی طرح تیار نہ تھی دوسرے الفاظ میں ان کا نظام زندگی ان اصولوں کی ضد پر قائم تھا۔ یہ تو درست ہے لیکن ان کے اس الزام کی کیا حقیقت ہے کہ نوح علیہ السلام ایک "جدید" مذہب لانا اور اپنی قوم کو ایک نئی اور انجانی راہ پر لے جانا چاہتے تھے۔

---

[1] مطلب یہ ہے کہ دنیا کے چھوٹے چھوٹے رئیسوں اور سرداروں کے بارے میں تو تم یہ سمجھتے ہو کہ ان کے وقار کے خلاف کوئی حرکت کرنا خطرناک ہے مگر خداوند عالم کے متعلق تم یہ توقع نہیں رکھتے کہ وہ بھی کوئی باوقار ہستی ہوگا۔ اس کے خلاف تم بغاوت کرتے ہو۔ اس کی خدائی میں دوسروں کو شریک ٹھیراتے ہو۔ اس کے احکام کی نافرمانیاں کرتے ہو اور اس سے تمہیں یہ اندیشہ لاحق نہیں ہوتا کہ وہ اس کی سزا دے گا۔ (تفہیم القرآن)

قوم کا یہ استدلال شاید بالکل صحیح تھا کہ ان کے کان توحید و رسالت کی آوازے سے ناآشنا ہو چکے تھے اور غالباً یہ بھی صحیح تھا کہ ان کے آباء و اجداد بھی اس سے بے خبر رہے تھے لیکن کیا اس کا یہ مطلب سمجھ لیا جائے کہ پہلی بار اسلام کی تبلیغ حضرت نوح علیہ السلام نے کی اور ان سے پہلے انسان کی تاریخ میں کبھی بھی اس کی دعوت نہیں دی گئی۔ قرآن اس نظریہ کی تردید کرتا ہے اور بتاتا ہے انسان کا قدیم ترین مذہب اور زندگی کا فطری راستہ وہی تھا جس کی طرف نوح علیہ السلام بلا رہے تھے۔ اس کی تعلیم اس وقت دی گئی تھی جبکہ انسان نے اس دنیا میں قدم بھی نہیں رکھا تھا اور اسی فطری دین پر چلنے کا عہد لیا گیا تھا۔

اور اے نبی! لوگوں کو یاد دلاؤ وہ وقت جبکہ تمہارے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی نسل کو نکالا تھا اور انہیں خود ان کے اوپر گواہ بناتے ہوئے پوچھا تھا۔ "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟" انھوں نے کہا "ضرور، آپ ہی ہمارے رب ہیں، ہم اس پر گواہی دیتے ہیں" یہ ہم نے اس لیے کیا کہ کہیں تم قیامت کے روز یہ نہ کہہ دو کہ "ہم تو اس بات سے بے خبر تھے" یا یہ نہ کہنے لگو کہ "شرک کی ابتدا تو ہمارے باپ دادا نے ہم سے پہلے کی تھی اور ہم بعد کو ان کی نسل سے پیدا ہوئے، پھر کیا آپ ہمیں اس قصور میں پکڑتے ہیں جو غلط کار لوگوں نے کیا تھا

(الاعراف ع ۲۲)

اس کے بعد جب دنیا میں بھیجا گیا تو یہ تاکید کر دی گئی تھی :۔

ہم نے کہا کہ تم سب یہاں سے اتر جاؤ۔ پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے، تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے۔ ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا اور جو اس کو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے وہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں۔ جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ (البقرۃ ع ۴)

آدمؑ کی اولاد ایک عرصے تک اسی ہدایت پر کاربند رہی۔ پھر آپس کی ضد سے اختلافات رونما ہوئے۔ لوگ فطری راستے سے ہٹ کر دوسری راہوں پر چل پڑے۔

ابتدا میں سب لوگ ایک ہی طریقے پر تھے (پھر یہ حالت باقی نہ رہی اور اختلافات رونما ہوئے) تب اللہ نے نبی بھیجے جو راست روی پر بشارت دینے والے اور کج روی کے نتائج سے

ڈرانے والے تھے اور ان کے ساتھ کتاب برحق نازل کی تاکہ حق کے بارے میں لوگوں کے درمیان جو اختلافات رونما ہو گئے تھے ان کا فیصلہ کرے (اور ان اختلافات کے رونما ہونے کی وجہ یہ نہ تھی کہ ابتدا میں لوگوں کو حق بتایا نہیں گیا تھا۔ نہیں) اختلاف ان لوگوں نے کیا جنھیں حق کا علم دیا جا چکا تھا۔ انھوں نے روشن ہدایات پالینے کے بعد محض اس لیے حق کو چھوڑ کر مختلف طریقے نکالے کہ وہ آپس میں زیادتی کرنا چاہتے تھے۔ پس جو لوگ انبیاء پر ایمان لے آئے۔ انہیں اللہ نے اپنے اذن سے اس حق کا راستہ دکھایا جس میں لوگوں نے اختلاف کیا تھا۔ اللہ جسے چاہتا ہے، راہ راست دکھا دیتا ہے۔ (البقرہ ع ۲۶)

" ابتداء سارے انسان ایک امت امت تھے۔ بعد میں انھوں نے مختلف عقیدے اور مسالک بنالیے۔ (یونس ع ۲)

" مگر بعد میں لوگوں نے اپنے دین کو آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کر لیا۔ ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے اسی میں وہ مگن ہے۔ (المومنون ع ۴)

اس طرح قوم نوح بھی اس قدیم اور فطری راہ سے ہٹ چکی تھی۔ اس طرح جدت پسندی کا مظاہرہ تو دراصل نوح علیہ السلام کی قوم کے لوگ اور ان کے باپ دادا کر چکے تھے۔ اس کی تفصیل یہ بیان کی گئی ہے کہ :

آدم علیہ السلام سے لیکر زمانہ نوح علیہ السلام تک دس قرن[1] گذرے ہیں۔ اس امت میں سب لوگ اصول اسلام و توحید پر قائم رہے۔ پھر لوگ اصنام پرستی میں مبتلا ہو گئے۔ اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ صالحین جب مر گئے تو ان کے معتقدین نے ان کی قبروں پر مسجدیں بنالیں اور ان کی تصویریں بنا کر اس میں رکھنے لگے تاکہ انہیں دیکھ کر ان کی حالت اور عبادت کو یاد کرتے رہیں اور انہیں جیسے بننے کی کوشش کرتے رہیں۔ جب کچھ زمانہ گذر گیا تو ان تصویروں کے بجائے ان کے پتلے بنا دیے گئے۔ کچھ دنوں بعد ان پتلوں کا احترام کرنے لگے اور پھر پرستش کرنے لگے۔ ان پتلوں کے نام بھی انہیں صالحین کے نام تھے یعنی ود، سواع، یغوث، یعوق، نسر وغیرہ[2]

---

[1] قرن کا اطلاق تیس سال کی مدت پر بھی ہوتا ہے اور لوگوں کے ایک طبقہ پر بھی۔

[2] ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیرؒ (اعراف ع ۸)

ان تصریحات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نوح علیہ السلام کے ہمعصر لوگوں اور ان کے باپ دادا نے فطری اور آبائی دین کو ترک کر دیا تھا اور شرک و اصنام پرستی کی راہ اختیار کر لی تھی اور نوح علیہ السلام قدیم ترین نظام حیات یعنی اسلام کا احیاء کرنا چاہتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ نوح علیہ السلام قدامت پسند تھے نہ کہ "جدت پسند" جدید اور غیر اسلامی طریقے کے موجد قوم نوح علیہ السلام کے پیش رو تھے اور نوح علیہ السلام کی قوم کے لوگ اسی "جدید" راہ پر گامزن تھے۔ البتہ ان کی قوم کے سرداروں نے نوح علیہ السلام پر "جدت پسندی" کا الزام اس لیے لگایا کہ عوام مشتعل ہو جائیں اور نوح علیہ السلام کی پیروی سے باز رہیں۔

بہرحال وہ تمام لوگ جنھوں نے نوح علیہ السلام کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور شرک پر قائم رہے تھے، طوفان میں ہلاک کر دیے گئے اور ان کی جڑ کٹ گئی۔ صرف وہی لوگ باقی رہے جو نوح علیہ السلام پر ایمان لا چکے تھے۔ ارشاد ہے:-

> مگر انھوں نے اس کو جھٹلایا۔ آخر کار ہم نے اسے اور اس کے ساتھیوں کو ایک کشتی میں نجات دی اور ان لوگوں کو ڈبو دیا جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا۔ یقیناً وہ اندھے لوگ تھے۔
>
> (الاعراف ع ۸)

> "ہم کو (اس سے پہلے) نوح ؑ نے پکارا تھا تو دیکھو کہ ہم کیسے اچھے جواب دینے والے تھے۔ ہم نے اس کو اور اس کے گھر والوں کو کرب عظیم سے بچا لیا اور اسی کی نسل کو باقی رکھا اور بعد کی نسلوں میں اس کی تعریف و توصیف چھوڑ دی۔ سلام ہے نوح پر تمام دنیا والوں میں۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیا کرتے ہیں۔ درحقیقت وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔ پھر دوسرے گروہ کو ہم نے غرق کر دیا۔　　(الصّٰفّٰت ع ۳)

شرک اور اصنام پرستی کا دین تو غرق ہونے والوں کے ساتھ ہی ختم ہو گیا تھا اور جو لوگ نوح علیہ السلام کے ساتھ باقی بچے تھے وہ ظاہر ہے سب اسلام پر تھے۔ اس اعتبار سے ان کی نسل میں بھی اسلامی روایات ہی منتقل ہوئی ہوں گی لیکن یہاں بھی وہی صورت ہوئی جو آدم علیہ السلام کی نسل میں ہوئی تھی یعنی طوفان سے بچے ہوئے لوگ جب دنیا میں آباد ہوئے تو طوفان کی ہولناکیاں ان کے ذہن میں تازہ تھیں اس سے ابتدا میں تو اسلام پر ہی قائم رہے لیکن یہاں بھی جیسے وقت گزرتا گیا ان میں شرک کی روایات عود

کرائیں یہاں تک کہ لوگوں نے درس توحید کو بالکل فراموش کر دیا۔ یہی وہ دور تھا جبکہ ہود علیہ السلام نے ان لوگوں کو بھولا ہوا سبق یاد دلایا :۔

" اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ اس نے کہا " اے برادران قوم! اللہ کی بندگی کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔ پھر کیا تم غلط روی سے پرہیز نہ کرو گے؟

اس کا جواب قوم نے تقریباً وہی دیا جو قوم نوح علیہ السلام دے چکی تھی کہ :۔

کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہم اکیلے اللہ ہی کی عبادت کریں اور انہیں چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے آئے ہیں؟ " (الاعراف ع ۹)

انہوں نے کہا " کیا تو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں بہکا کر ہمارے معبودوں سے برگشتہ کر دے "

(الاحقاف ع ۳)

ان کا استدلال بھی وہی تھا کہ ہود علیہ السلام کی دعوت ان کے آبائی دین سے ٹکرا رہی تھی۔ قوم کے نقطہ نظر سے آبائی دین شرک تھا اور توحید کی دعوت " نئی " تھی۔ حالانکہ ان کا قدیم اور آبائی دین وہی تھا جس کی دعوت نوح علیہ السلام نے دی تھی جس پر وہ لوگ قائم تھے جو نوح علیہ السلام کے ساتھ طوفان سے بچے اور پھر دنیا میں آباد ہوئے تھے اور انہی کی نسل سے ہود علیہ السلام کی قوم تھی لیکن قوم ہود علیہ السلام اپنے قریبی آبار کے دین ہی کو قدیم اور آبائی دین تصور کر رہی تھی جو شرک تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ نہ تو نوح علیہ السلام نے کسی " جدید " مذہب کی دعوت دی اور نہ ہی ہود علیہ السلام نے جتنے انبیاء بھی آئے سب نے اسلام یعنی قدیم ترین مذہب کی دعوت دی ہے۔ اس اعتبار سے ان میں سے کوئی بھی جدت پسند نہیں تھا اور ان کے مخاطبین کا یہ خیال غلط تھا کہ وہ خود قدامت پسند اور انبیاء " جدت پسند " تھے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ شرک اور بت پرستی بھی نیا دین نہیں، اس کی جڑیں بھی ماضی میں دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ دونوں مذاہب قدیم ہیں۔

قرآن اقدس کے نقطہ نظر سے صورت حال یہ تھی کہ جب ایک قوم اسلام کے اصولوں پر کاربند ہو جاتی تھی تو بعد کی نسلیں ان کو چھوڑ کر شرک و بت پرستی میں مبتلا ہو جاتی تھیں خدا کے رسول آتے اور اسلام کی دعوت دیتے جو لوگ دعوت قبول کر لیتے ان کی آیندہ نسلوں میں پھر شرک پھیل جاتا تھا۔ صدہا سال تک یہی سلسلہ جاری رہا۔ اب رہا مخالفین انبیاء کا یہ دعویٰ کہ وہ اپنے آبائی دین پر قائم تھے اور اسے ترک کرنا گمراہی تصور

کرتے تھے تو اس کی حقیقت صرف یہ تھی کہ وہ اپنے ان باپ دادا کی پیروی کر رہے تھے جو گمراہ ہو چکے تھے ورنہ ان سب کا قدیم دین اسلام ہی تھا۔

نہ ستیزہ گاہ جہاں نئی نہ حریف پنجہ شکن نئے
وہی فطرت اسد اللّٰہی وہی مرحبی وہی عنتری

نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت تک "جدت پسندی" کا الزام لگایا جاتا رہا۔ حالانکہ سب ہی رسولوں نے قدیم ترین مذہب کا احیاء کیا ہے۔ چنانچہ ہود علیہ السلام کے بعد صالح علیہ السلام کو بھی یہی جواب دیا گیا:۔

اے صالح! اس سے پہلے تو ہمارے درمیان ایسا شخص تھا جس سے بڑی توقعات وابستہ تھیں۔ کیا تو ہمیں ان معبودوں کی پرستش سے روکنا چاہتا ہے جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے۔ تو جس طریقے کی طرف ہمیں بلا رہا ہے اس کے بارے میں ہم کو سخت شبہ ہے جس نے ہمیں خلجان میں ڈال رکھا ہے۔　　(ہود ع ۶)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ اور قوم سے پوچھا:۔

"یہ مورتیں کیسی ہیں جن کے تم لوگ گرویدہ ہو رہے ہو؟"

قوم کا جواب ملاحظہ ہو:۔

"ہم نے اپنے باپ دادا کو ان کی عبادت کرتے پایا ہے۔ اس نے کہا۔ "تم بھی گمراہ ہوا اور تمہارے باپ دادا بھی صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے" انھوں نے کہا۔ "کیا تو ہمارے سامنے اپنے اصلی خیالات پیش کر رہا ہے یا مذاق کرتا ہے؟ اس نے جواب دیا۔ "نہیں بلکہ تمہارا رب وہی ہے جو زمین اور آسمانوں کا رب اور ان کا پیدا کرنے والا ہے (الانبیاء ع۵)

حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کا جواب ....!

انھوں نے جواب دیا۔ اے شعیب کیا تیری نماز تجھے یہ سکھاتی ہے کہ ہم ان سارے معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے؟　　(ہود ع ۸)

فرعون اور اس کے سرداروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جواب دیا:۔

"کیا تو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں اس طریقے سے پھیر دے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو

پایا ہے اور زمین میں بڑائی تم دونوں کی قائم ہو جائے۔ (یونس ع ۸)

اور توحید و رسالت کی دعوت کے بارے میں کہنے لگے:

اور یہ باتیں تو ہم نے باپ دادا کے زمانے میں کبھی سنی ہی نہیں (القصص ع ۴)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد لگاتار رسول آتے رہے۔ ان سے پہلے بھی دنیا کے ہر خطہ اور بستی میں اللہ کے رسول آتے رہے تھے جن کی دعوت یہی رہی تھی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کے باوجود جب بھی کسی رسول نے توحید و رسالت کی دعوت دی، مخاطبین ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ یہ دعوت تو بالکل نئی ہے اس سے تو ہمارے باپ دادا بھی ناآشنا رہے ہیں۔ تمہیں بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا ہے کہ اتنے خداؤں کی پرستش ختم کر کے بس ایک ہی خدا کی عبادت کرتے اور اس کی طرف اوروں کو بلاتے ہو۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک دو نسل کے بعد ہی لوگ انبیاء کے لائے ہوئے دین کو فراموش کر دیتے تھے اور شرک و بت پرستی کا اس درجہ رواج و غلبہ ہو جاتا تھا کہ پھر توحید کی صدا بالکل "جدید" معلوم ہونے لگتی تھی۔ نوح علیہ السلام کے عہد سے پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت تک یہی صورت حال رہی۔ چنانچہ آپ کے مخاطبین نے وہی باتیں کہیں جو ان سے پہلے کے لوگ کہہ چکے تھے

منکرین کہنے لگے کہ یہ ساحر ہے، سخت جھوٹا ہے، کیا اس نے سارے خداؤں کی جگہ بس ایک ہی خدا بنا ڈالا؟ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ اور سرداران قوم یہ کہتے ہوئے نکل گئے کہ چلو اور ڈٹے رہو اپنے معبودوں کی عبادت پر۔ یہ بات تو کسی اور ہی غرض سے کہی جا رہی ہے۔ یہ بات ہم نے زمانۂ قریب کی ملت میں کسی سے نہیں سنی۔ یہ کچھ نہیں ہے مگر ایک من گھڑت بات۔ کیا ہمارے درمیان بس یہی ایک شخص رہ گیا تھا جس پر اللہ کا ذکر نازل کر دیا گیا؟ (ص ع ۱)

انکار کی وجہ؟ وہی تقلید آباء:-

• انسانوں میں سے کچھ لوگ ہیں جو اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی علم ہو، یا ہدایت، یا کوئی روشنی دکھانے والی کتاب۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ پیروی کرو اس چیز کی جو اللہ نے نازل کی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو اس چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا یہ انہی کی پیروی کریں گے خواہ شیطان ان کو

بھڑکتی ہوئی آگ ہی کی طرف کیوں نہ بلاتا رہا ہو۔ (لقمان ع۳)

ان سے جب کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو احکام نازل کیے ہیں ان کی پیروی کرو، تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اسی طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ اچھا اگر ان کے باپ دادا نے عقل سے کچھ بھی کام نہ لیا ہو اور راہ راست نہ پائی ہو تو کیا پھر بھی یہ انہی کی پیروی کیے چلے جائیں گے؟ (البقرہ ع۲۱)

ان قدامت پسندوں نے ذات گرامی صلی اللہ علیہ وسلم پر کھل کر "جدت پسندی" کا الزام لگایا۔ اہل مکہ کے مظالم سے تنگ آکر جب کچھ مسلمان ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے تو مکے کے لوگوں نے حبشہ کے فرماں روا کے پاس اپنے دو سمجھدار آدمی عبداللہ بن ابی ربیعہ اور عمرو ابن العاص کو بھیجا تاکہ وہ ان مسلمانوں کو پناہ نہ دے۔ ان دونوں اشخاص نے بادشاہ اور اس کے درباریوں کے سامنے حقیقت حال کا انکشاف ان الفاظ میں کیا،

ہم میں سے چند کم عمر بے وقوف چھوکروں نے اپنی قوم کا دین بھی اختیار نہیں کیا اور تمہارے دین میں بھی داخل نہیں ہوئے۔ بلکہ ایک نیا دین ایجاد کیا ہے جس سے نہ ہم واقف ہیں نہ تم۔ [1]

لیکن واقعات نے ثابت کر دیا کہ اسلام کوئی نیا دین نہیں، بلکہ انسان کا قدیم ترین دین ہے جس پر آدم علیہ السلام قائم تھے جس کی دعوت نوح، ہود، صالح، ابراہیم، لوط، شعیب، اسحاق، اسمٰعیل، یعقوب، یوسف، داؤد، سلیمان، موسےٰ و عیسےٰ علیہم السلام اور دنیا کے ہر خطہ میں خدا کے دوسرے بے شمار رسول دیتے رہے ہیں۔ لہٰذا "جدت پسندی" کا الزام لگانے والوں میں سے بیشتر نے اس فطری دین کو اسکی حقیقت سے قبول کر لیا اور اسلام کو غلبہ بھی حاصل ہو گیا۔ لیکن ایسا تو پہلے بھی ہو چکا تھا یعنی بعض انبیاء کے دور میں اسلام دوسرے تمام ادیان پر غالب آگیا تھا مگر کچھ عرصے بعد شرک و بت پرستی کا غلبہ ہو گیا۔ پھر اللہ نے دوسرا رسول بھیج دیا۔ یہی سلسلہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام تک قائم رہا۔

چونکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب کوئی نبی نہیں آئے گا اس لیے آپ کے بعد کبھی ایسا دور نہیں آیا کہ اسلام اس طرح مغلوب ہو گیا ہو کہ دنیا اس سے ناواقف ہو گئی ہو، بلکہ یہ بات تو سب ہی جانتے ہیں دنیا میں ہمیشہ ایک جماعت ضرور رہی ہے جس نے اسلامی تعلیمات کو زندہ رکھا ہے

[1] سیرت ابن ہشام (اردو ترجمہ) ۲۲۵

اور تسلسل و تواتر میں فرق نہیں آنے دیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کی چودہ سو سال کی تاریخ پوری صحت کے ساتھ محفوظ ہے اور آج دنیا میں کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ تو بالکل نیا مذہب ہے۔ ہم نے اپنے باپ دادا سے اس کے بارے میں کچھ نہیں سنا۔

پہلے تو لوگ اسلام کو اس لیے قبول نہیں کرتے تھے کہ ان کے نزدیک یہ "جدید" تھا، اور اس سے بھی عجیب تر عذر جو آج کل پیش کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اسلام ایک قدیم نظام ہے۔ اس کے ماننے والے "قدامت پسند" (Conservative, reactionary) ہیں اور ہم "جدت پسند" ہیں یعنی صورت حال الٹ گئی۔ اسلام وہی ہے جو نوح علیہ السلام کے زمانے میں تھا لیکن اب "عذر" بدل گیا اور اس پر الزام کی نوعیت میں بھی فرق آگیا، نہ ماننے والے یہ نہیں سوچتے کہ ان کا عذر کس حد تک معقول ہے؟

حقیقت تو یہ ہے کہ "محققین" کی ایک جماعت "قدامت پسندی" اور "رجعت پسندی" رجعت پسندی اور ترقی پسندی جیسی اصطلاحوں سے خود فریبی میں مبتلا ہے اور دوسروں کو بھی مبتلا کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ یہ جماعت دنیا کو باور کرانا چاہتی ہے کہ اس کے دامن میں جو کچھ ہے وہ "جدید" ہی جدید ہے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ اس کے پاس بھی جو کچھ ہے وہ "قدیم" ہی ہے، لیکن چونکہ انسانوں کا ایک بڑا طبقہ اس جماعت سے متاثر ہے اور اس فریب میں مبتلا ہو چکا ہے کہ واقعی ان کی جھولی میں "جدید" چیزیں ہیں اور وہی مفید بھی ہیں اس لیے ان "جدید" اقدار کی عظمت دل میں اچھی طرح جاگزیں ہو چکی ہے۔ اس کے تحفظ کے لیے دوسری اقدار کو "قدیم" کہہ دیا جاتا ہے تاکہ لوگ ان سے متنفر ہو جائیں اور "قدامت پسندی" کو جہالت و پستی کے مترادف سمجھنے لگیں۔

مناسب ہوگا اگر اس کی مزید وضاحت کر دی جائے۔ تاریخ رسالت کے آخری دور میں رسالت کا منصب بنی اسرائیل میں محدود ہو گیا تھا۔ ان میں خدا کے بہت سے رسول آئے اور یہ سلسلہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر آکر ختم ہو گیا۔ بلاشبہ عیسیٰ علیہ السلام نے اسلام کی دعوت دی لیکن جب وہ اس دنیا میں نہ رہے تو ان کے ماننے والوں نے ان کے لائے ہوئے دین کو بھلا کر مسخ کیا[1] اور حق و باطل کو اس طرح خلط ملط کر دیا کہ ایک فرق کرنا ناممکن ہو گیا بلکہ عیسیٰ علیہ السلام کا اسلام بالکل غیر اسلامی دین بن کر

[1] یہ ہمارا الزام نہیں بلکہ مغربی محققین کی تحقیق ہے۔ ملاحظہ ہو میری کتاب "مغربی تہذیب۔ آغاز و انجام" باب ۱ ص [illegible]

رہ گیا۔ آہستہ آہستہ پادری مذہب کے اجارہ دار بن گئے۔ انھوں نے عیسائیت کو اپنی اغراض کے سانچے میں ڈھال لیا، عیسائیوں کو لوٹا، شرمناک مظالم ڈھائے اور شرمناک جرائم کا ارتکاب کیا۔

ایک زمانے تک تو اس مذہب کے ماننے والے برداشت کرتے رہے لیکن جب عیسائیت کا بوجھ ناقابل برداشت ہوگیا تو کچھ لوگوں نے (بالخصوص لوتھر کی سرکردگی میں) عیسائیت کے خلاف علم بغاوت بلند کردیا اور بالآخر اسے الٹ کر رکھ دیا اور عیسائیت کے خلاف نفرت کی ایک لہر دوڑ گئی ہر وہ چیز جس کا تعلق مذہب یعنی عیسائیت سے تھا اس سے بیزاری پھیل گئی۔ مغربی اقوام نے پورے عزم کے ساتھ خود کو عیسائیت کے اثر سے آزاد کرلیا۔ ان کے نزدیک چونکہ عیسائی مذہب ایک قدیم نظام تھا اس لیے اس پر ایمان رکھنے والے ان کے نزدیک قدامت پسند تھے۔

عیسائیت کی جگہ کس نے لی؟ اس کی جگہ قدیم یونان و روم کے نظام نے لی یعنی عیسائیت کے مخالفوں نے قدیم یونان اور روم کے تمدن کو زندہ کیا اور اسے قبول کرلیا۔ اس کی ترویج و اشاعت کی اور زندگی کے ہر شعبے میں یونانیوں اور رومیوں کی پیروی کرنے لگے۔ یونان اور روم کا تمدن بھی قدیم تھا بلکہ ان کے نظریے کے مطابق عیسائیت سے بھی قدیم تھا۔ اس اعتبار سے تو یہ لوگ مروجہ عیسائیت کے ماننے والوں سے زیادہ قدامت پسند ہوئے لیکن انھوں نے دنیا کو باور کرا دیا کہ یہ "جدید" تمدن ہے۔ ہم "جدت پسند" ہیں اور دنیا نے مان بھی لیا۔

عیسائیت کے خلاف تحریک آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے صدیوں بعد شروع ہوئی تھی اس لیے ان جدت پسندوں نے اسلام کو بھی لپیٹ لیا اور اس کو "قدیم مذہب" کہہ کر رد کر دیا۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ یہ ہر قدیم روایت اور ہر قدیم نظام سے بے زاری ظاہر کرتے تھے[1] (حالانکہ خود ایک قدیم نظام پر چل رہے تھے)

ان واقعات سے اتنا تو بہرحال واضح ہو جاتا ہے کہ "قدیم و جدید" کی اصطلاحوں سے مغالطہ میں ڈالنے کا فن بھی بہت قدیم ہے۔ نوح علیہ السلام کی قوم سے لے کر آج تک ان اصطلاحوں سے ایک طبقہ بار بار فریب کھاتا اور دیتا رہا ہے۔ جب چاہا قدیم کو جدید اور جدید کو قدیم کہہ کر لوگوں کو مغالطہ میں ڈال دیا۔

[1] اس موضوع پر ہم نے مذکورہ بالا کتاب میں متعدد مقامات پر تفصیل سے بحث کی ہے، دیکھا جائے۔

تاریخ کا بے لاگ فیصلہ یہ ہے کہ اسلام کی راہ قدیم ترین راہ ہے۔ اس کی نشان دہی اس وقت کر دی گئی تھی جب کہ انسان نے ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا۔ اس لیے اسے "جدید" کہنا کسی طرح بھی درست نہیں، ہاں تاریخ کے ابتدائی دور میں اسلام سے کٹ کر جو راہ نکالی گئی تھی وہ اس وقت تو "جدید" ہی تھی لیکن بعد میں تمام غیر اسلامی راستے بھی قدیم ہو گئے۔ اگرچہ تفصیلات میں اختلاف ہوتا رہا۔ لہٰذا اسلام اور غیر اسلامی نظام ہائے حیات کو "جدید" کہنا یا سمجھنا خود فریبی اور فریب نظر کے سوا کچھ نہیں۔

جب سب ہی "قدامت پسند" ہیں تو اسلامی اور غیر اسلامی "قدامت" میں کیا فرق ہے؟

اس کا جواب وہ ہے جو سورۂ فاتحہ میں واضح کیا گیا ہے۔

ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔ ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا۔ جو معتوب نہیں ہوئے جو بھٹکے ہوئے نہیں ہیں۔

یعنی بنیادی اعتبار سے دو راستے ہیں نیک لوگوں کا (انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کا) جن پر خدا کا انعام ہوا ہے۔ دوسرا راستہ جو سیدھا نہیں، ان کا ہے جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا اور جو گمراہ ہو گئے۔

دونوں راستے قدیم اور ان پر چلنے والے "قدامت پسند" ہیں۔ دونوں کی "قدامت پسندی" میں یہی فرق ہے کہ ایک گروہ صالح آباء و اجداد کا اور دوسرا گروہ گمراہ آباء و اجداد کا پیرو ہے۔

تصویر کشی کا مسئلہ

(مولانا محمد ایوب اصلاحی، استاذ، مرکزی درسگاہ جماعت اسلامی ہند)

رام پور کے ایک اسلامی اردو ڈائجسٹ میں ایک انٹرویو شائع ہوا تھا اس میں مدارس عربی اور تصویر کے مسئلے پر بھی اظہار خیال کیا گیا تھا۔ ان دونوں پر اظہار خیال میں احتیاط نہیں برتی گئی اور انداز بیان نامناسب ہو گیا۔ اس کے علاوہ اس اظہار خیال میں بہت سی باتیں غلط بیان ہو گئی ہیں۔ مولانا ایوب صاحب نے انٹرویو کے ان دونوں اجزاء پر اپنے ایک طویل مقالے میں مفصل تنقید کی ہے بالخصوص تصویر کشی کے مسئلے پر محنت کر کے اچھی خاصی معلومات جمع کی ہیں اپنا وہ مقالہ انھوں نے زندگی میں اشاعت کے لیے عنایت کیا ہے ہم اس مقالے سے صرف تصویر سے متعلق حصہ شائع کر رہے ہیں۔ بعض الفاظ، جملے اور عبارتیں ہم نے حذف کر دی ہیں۔

ادارہ

تصویر سے متعلق انٹرویو دینے والے فاضل نے جو اظہار خیال کیا ہے اس کے چند اقتباسات یہ ہیں:

"اسلام میں فن تصویر کے بارے میں مختلف رائیں و مختلف رجحانات ہیں۔ قرآن میں تصویروں و مجسمہ سازی کے سلسلہ میں صرف ایک حکم ہے کہ

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ٥ (مائدہ آیت ۹۰)	اے ایمان والو! یہ شراب اور جوا، یہ آستانے اور پانسے، یہ سب گندے شیطانی کام ہیں ان سے پرہیز کرو امید ہے کہ تم کو فلاح نصیب ہوگی۔

"مفسرین کا خیال ہے کہ انصاب سے مراد پوجا کے بت ہیں یا بتوں کے رکھنے کے چبوترے۔ یہ دونوں نجس اور حرام ہیں۔ تصویریں انصاب کی گنتی میں آتی نہیں ہیں کیونکہ یہ نہ پوجا کے بت ہوتی ہیں اور نہ

آستانے، بلکہ زیادہ سے زیادہ مثل، تمثال یا تمثیل ہوتی ہیں۔ تمثیل بنانا اور بنوانا ایک پیغمبر کی سنت ہے اس لیے وہ حرام نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ قرآن شریف میں سورۂ سبا میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے ذکر میں آتا ہے:

يَعْمَلُونَ لَهُ مَا يَشَاءُ مِنْ — وہ اس کے لیے بناتے تھے جو کچھ وہ چاہتا

مَحَارِيبَ وَتَمَاثِيلَ وَجِفَانٍ — تھا اونچی عمارتیں تصویریں اور بڑے بڑے

(سورہ سبا آیت ۱۳) حوض۔ (ص ۳۲، ۳۳)

دیکھیے، اس لفظ تمثیل کا ترجمہ شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر، مولانا محمود الحسن، مولانا حفظ الرحمٰن اور شیعہ علما میں سے مولانا فرمان علی اور آقا مہدی الٰہی نے "تصویریں" کیا ہے اور مولانا اشرف علی تھانوی، ڈپٹی نذیر احمد اور احسان اللہ صاحبان نے "مورتیں" کیا ہے۔ تفسیر ابن کثیر میں اس کی تفسیر یہ بتائی گئی ہے کہ تماثیل کہتے ہیں تصویروں کو —— یہ تانبے کی تھیں اور بقول قتادہؓ مٹی اور شیشے کی تھیں۔ (ص ۳۳)

اس سے ظاہر ہے کہ حضرت سلیمانؑ تصویریں یا مورتیں بنواتے تھے۔ حضرت سلیمان شریعت موسوی کے ماننے والے تھے۔ اس لیے یہ بات یقینی کہ تماثیل نہ بت تھیں نہ تراشی ہوئی مورت جسے بندگی کی رسمیں بجا لانے کے لیے بنایا گیا ہو کیونکہ معبود بنانے کے لیے بت بنانا یا تصویر کھینچنا موسوی شریعت میں بھی حرام ہے" (ص ۳۳)

وہ تصویریں اور مورتیاں جو انصاب ہوں یا اصنام ہوں۔ ایسی ہی تصویروں کو حضور علیہ السلام نے اپنی پاک حدیثوں میں حرام قرار دیا ہے اور ایسی ہی تصویروں کے بنانے والوں پر لعنت فرمائی ہے۔ (ص ۳۴)

"..... جن مسلمان فقہاء نے تصویروں کو حرام بتایا ہے انھوں نے بعض احادیث کو اپنی بات کی دلیل قرار دیا ہے۔ مگر محققین نے ان احادیث کو موضوع قرار دے کر تصویر کشی کی اجازت دی ہے۔ محققین کے ایک گروہ نے درمیانی راہ اختیار کی ہے۔ انھوں نے تصویروں کی حرمت کے مخصوص اسباب پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ ان اسباب کے ختم ہو جانے سے وہ حرمت خود بخود ختم ہو گئی۔ اس بات کے ثبوت میں ان حضرات نے کہا ہے کہ اللہ کے رسولؐ اور ان کے پاک ساتھیوںؓ نے مالِ غنیمت میں ملی ہوئی تمثیلوں اور فن کے نمونوں کو ضائع نہیں کیا، بلکہ محفوظ رکھا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ [illegible] میں عراق میں حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں جو دینار بنائے گئے ان میں انسانی چہرے نقش تھے جیسے کہ خسرو اور قیصر کے سکوں میں ہوتے تھے۔ بنو امیہ کے دورِ بادشاہی میں حضرت معاویہ کے ٹکسالی دینار پر تلوار لیے ہوئے ایک

آدمی کی تصویر تھی جبکہ عباسی خلیفہ المتوکل علی اللہ کے سکے پر ایک اونٹ سوار کی تصویر تھی۔ المقتدر باللہ کے سکے پر بادشاہ کی ایک شبیہ تھی۔ (ص۳۴)

ڈاکٹر سعاد ماہر مصر کے ایک مورخ ہیں۔ انھوں نے "فن التصویر فی الاسلام" کے عنوان سے ایک مفصل مضمون لکھا تھا۔ اس میں فرانسیسی مستشرقین فادر لیمنس (Father lamens) پروفیسر کریزول (Prof creswell) اور آرنلڈ (Arnold) کے تحقیقی کاموں کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے ان تاریخی واقعات کا ذکر کیا ہے۔ سا مرنووی اور دوسرے فقہاء کے فتاویٰ میں فلوس اور درہم و دینار پر تصاویر کے ذکر کا سبب یہی تصاویر ہیں جن کو ائمہ نے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے بنو امیہ کے محلات میں انسانی تصویروں کے لاتعداد ڈیزائن آج بھی موجود ہیں۔ دور عباسی کے فن کا تو تاریخ میں نام ہے۔ اسی طرح فن تصویر کے مکتب تیموریہ، اور مکتب صفویہ کا نام اسلام کی تاریخ میں بہت نمایاں طور پر آتا ہے۔ (ص۳۵)

ڈاکٹر سعاد ماہر کے علاوہ ایک اور مصری عالم ہیں ڈاکٹر حسن ذکی۔ انھوں نے لکھا ہے۔ ابتدائی اسلام میں انسانی یا حیوانی تصاویر بنانا اس لیے نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا کہ اس عمل سے شرک کی پھر سے ابتدا نہ ہو جائے۔ غالباً اسی لیے حضورؐ سے احادیث منسوب کر کے بیان کر دی ہیں۔ ورنہ تصویروں کی حرمت اسلام کا کوئی بنیادی عقیدہ نہیں ہے۔ یہ قید مسلمانوں کو شرک سے روکنے کے لیے وضع کی گئی ہے لیکن جب مسلمانوں نے بتوں سے متعلق شرک کو خیر باد کہہ دیا تو یہ حرمت باقی نہیں رہی۔ (ص۳۵)

ایک اور مصری عالم ہیں جناب شیخ شاؤش، انھوں نے کہا ہے کہ تصویروں کی حرمت ہر حال، ہر موقع اور ہر ملک کے لیے ثابت نہیں ہے۔ تصویروں کی حرمت کا تصور اس لیے پیدا ہوا کہ یہ شرک اور بت پرستی کے جذبات کو فروغ دینے کا سبب بن سکتی ہیں ورنہ فن انسان کی فطرت میں ہے۔ فطرت کا انکار کر کے ہم اسلام کی کوئی خدمت نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اسلام دین فطرت ہے۔ انسان کو تصویر بنانے سے اس وقت سے لگاؤ رہا ہے جب وہ غاروں میں رہتا تھا۔ اسلام نے اس فن کے اخلاق بگاڑنے والے پہلو پر پابندی لگا کر اس کو جلو بخشا۔ ورنہ اگر تصویر حرام ہوتی تو قرآن اس کی حرمت کا اعلان کرتا اور اسلامی فن تصویر کی کوئی شے قطعاً وجود میں نہ آتی۔ تصویر کے معاملے میں بت بننے کا خوف بے بنیاد ہے۔ کیونکہ اسلامی فن تصویر کے اعلیٰ سے اعلیٰ نمونے بھی انصاب اور اصنام نہ بن سکے۔ (ص۳۵-۳۶)

ان اقتباسات کا تجزیہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ تصویر بنانے، بنوانے اور رکھنے کی علت و جواز کے بارے میں جو دعوے کیے گئے ہیں اور ان کے جو دلائل فراہم کیے گئے ہیں وہ یہ ہیں :۔

۱۔ پہلا دعویٰ یہ ہے کہ اسلام میں فن تصویر کے بارے میں متعدد رائیں اور مختلف رجحانات ہیں۔

۲۔ دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ تمثیل بنانا اور بنوانا ایک پیغمبر کی سنت ہے۔

۳۔ تیسرا دعویٰ یہ کیا گیا ہے کہ جو تصویریں اور مورتیاں انصاب یا اصنام ہوں انہی کو حضور نے حرام قرار دیا ہے۔

۴۔ چوتھا دعویٰ یہ کہ مسلم ان فقہاء نے تصویروں کو بعض احادیث کی بنا پر حرام قرار دیا ہے۔

۵۔ پانچویں دعوے میں کہتے ہیں کہ محققین نے ان احادیث کو موضوع قرار دیا ہے۔

۶۔ چھٹے دعوے میں یہ ثابت کیا ہے کہ محققین کے ایک گروہ نے درمیانی راہ اختیار کی ہے اور تصویروں کی حرمت کے جو اسباب بیان کیے ہیں اس سے اس کی حرمت خود بخود ختم ہو گئی۔

۷، ۸ ساتویں اور آٹھویں دعوے میں تاریخی ثبوت پیش کیے ہیں کہ خلیفہ ثانی، اموی اور عباسی دور خلافت میں سکوں پر انسانی تصویریں نقش تھیں۔

اس موضوع پر میں اپنا حاصل مطالعہ پیش کرنا چاہتا ہوں، جو ایک طالب علمانہ کوشش ہے اور جس سے شاید مسئلہ کی کچھ وضاحت ہو سکے۔

۱۔ پہلا دعویٰ

دعویٰ کیا گیا ہے کہ اسلام میں فن تصویر کے بارے میں متعدد رائیں اور مختلف رجحانات ہیں۔ ہم نے ان الفاظ کو پڑھ کر سمجھا کہ آگے بہت سی رائیں اور رجحانات پیش کیے گئے ہوں گے۔ لیکن معلوم ہوا کہ یہ جملہ ایک خبر کے طور پر لکھ دیا گیا ہے۔ یہ ایسا دعویٰ نہیں جو دلیل و ثبوت کا محتاج ہو۔ آگے کہا جاتا ہے کہ قرآن شریف میں تصویروں اور مجسمہ سازی کے سلسلے میں سورۂ مائدہ میں ایک حکم ہے کہ یا ایھا الذین اٰمنوا انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطٰن فاجتنبوہ لعلکم تفلحون (آیت ۹۰) ترجمہ اے ایمان والو! یہ شراب اور جوا، یہ آستانے اور پانسے، یہ سب شیطانی کام ہیں۔ ان سے پرہیز کرو۔ امید ہے کہ تم فلاح پاؤ گے۔

اس آیت کے تحت لکھا گیا ہے کہ "مفسرین کا خیال ہے کہ انصاب سے مراد پوجا کے بت ہیں یا بتوں

کے جو ترے۔ یہ دونوں نجس ہیں اور حرام ہیں۔ تصویریں انصاب کی گنتی میں آتی نہیں ہیں۔"

یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ آیت کو تصویروں اور مجسمہ سازی کے حکم پر کس قرینے سے محمول کیا گیا؟ کوئی اشارہ وکنایہ سیاق وسباق اس نتیجہ تک پہنچنے کی تائید میں ہے تو اس کی وضاحت کرنی چاہیے تھی۔ کیا یہ مفسرین اور ان کی کتب تفسیر بے نام ونشان ہیں کہ ان کے حوالے نہیں دیے گئے جو شخص اطمینان کے لیے ان کی طرف رجوع کرنا چاہے تو کس کتاب تفسیر میں تلاش کرے۔ تفسیروں میں جو کچھ ملتا ہے اس کا ماحصل یہ ہو کہ اس آیت میں جن چار چیزوں کو حرام کیا گیا ہے ان میں سے ایک ہے انصاب و مقامات، یا بت جہاں وہ غیر اللہ کی عبادت کرتے یا خدا کے ماسوا کے لیے اپنی قربانیاں کرتے تھے۔

سید معین بن سید صفی الدین کی تفسیر جامع البیان فی تفسیر القرآن (عربی) میں اتنا ہی ہے جو میں نے اوپر لکھا ہے (صفحہ ۱۰۱) اسی کے حاشیہ پر شاہ ولی اللہ (رحمہ اللہ) کا یہ قول منقول ہے:۔

وکما دلت ھذہ الآیۃ علی	اور یہ آیت جس طرح شراب کے حرام ہونے
تحریم الخمر دلت ایضا علی	پر دلالت کرتی ہے اسی طرح جوئے، آستانے
تحریم المیسر والانصاب والازلام	اور پانسے کے حرام ہونے پر دلالت کرتی ہے

اس سے معلوم ہوا کہ یہاں چار چیزوں کو قطعی طور پر حرام ہونے کا حکم بیان کیا گیا ہے۔ آستانوں کو اس لیے حرام قرار دیا گیا ہے کہ وہ غیر اللہ کی عبادت نذر و نیاز اور ان پر چڑھاوا چڑھانے کے لیے خاص کر لیے گئے ہیں۔ جو مفسرین یہ مانتے ہیں کہ اس آیت میں تصویر اور مجسمہ سازی کی حرمت کا حکم ہے ان کے نام اور ان کی کتابوں کے نام ظاہر کرنے سے آخر پرہیز کیوں ہے

۲۔ دوسرا دعویٰ

دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ تمثیل بنانا ایک پیغمبر کی سنت ہے۔ اس کے ثبوت میں سورۂ سبا کی یہ آیت پیش کی ہے۔

یَعْمَلُوْنَ لَہٗ مَا یَشَاۗءُ مِنْ	وہ اس کے لیے بناتے تھے جو کچھ وہ چاہتا
مَّحَارِیْبَ وَتَمَاثِیْلَ وَجِفَانٍ	اونچی عمارتیں تصویریں اور بڑے بڑے
الآیۃ ۱۳	حوض۔

اس کی دلیل کے طور پر لکھا ہے کہ "اس لفظ تمثیل کا ترجمہ تمام ...... (۹ علماء کے نام پیش کیے

رہیں) "تصویریں" "مورتیں" کیا ہے۔

"تمثیل" بنانا ایک پیغمبر کی سنت ہونے کے دعوے پر تو کچھ عرض کروں گا، پہلے تو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ موصوف سے اس آیت کا ترجمہ و تفسیر میں دو غلطیاں ہوئی ہیں۔ ایک تو یہ کہنا کہ لفظ تمثیل کا ترجمہ "صورتیں اور مورتیں" کیا گیا ہے۔ غلط ہے، اس لیے کہ قرآن مجید کی اس آیت میں 'تمثیل' نہیں ہے بلکہ 'تماثیل' ہے۔ معلوم نہیں موصوف نے تمثیل کو تماثیل کا واحد سمجھا ہے یا اس کے برعکس۔ ہمارے مدرسوں میں تو وہی پرانے لغت' لسان العرب' قاموس' جمہرۃ اللغۃ' اقرب الموارد وغیرہ اور طلبہ کی سہولت کے لیے' المنجد' مستعمل ہیں جو تماثیل کا واحد تمثال بتاتے ہیں تمثیل جو مصدر ہے جب بطور اسم استعمال ہوتا ہے تو اس کی جمع تمثیلات ہوگی۔

دوسری غلطی آیت کے ترجمہ میں ہوئی ہے۔ 'جفان' کا ترجمہ کیا ہے "بڑے بڑے حوض" حالانکہ جفان' جفنہ' کی جمع ہے جس کے معنے ہیں بڑا پیالہ' لگن۔

اب آیئے اس دعوے پر غور کیجیے کہ "تمثیل بنوانا ایک پیغمبر کی سنت ہے"۔ اس خطرناک غلط اندیشی اور غلط فہمی کی بنیاد یہ غیر معمولی خواہش ہی ہو سکتی ہے کہ تصویر کا بنانا' بنوانا اور رکھنا جائز ہی ہو جائے یہی وجہ ہے کہ اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے لیے تماثیل کے ترجمہ "صورتیں اور مورتیں" سے بھی سہارا لیا ہے جب کہ یہ دونوں صورت اور مورت' ہم معنے الفاظ جان دار ہی کی جانب تعبیر کے لیے خاص نہیں ہیں اور بائیبل سے بھی وہ آیت نقل کی ہے جس کو اپنے لیے مفید مطلب سمجھا۔ (تم اپنے لیے بت نہ بنانا اور نہ تراشی ہوئی مورت یا لاٹ اپنے لیے کھڑی کرنا اور نہ اپنے ملک میں شبیہ دار پتھر رکھنا کہ اسے سجدہ کرو احبار باب ۲۶' آیت ۱) حالانکہ بائیبل کا مطالعہ کرنے کے بعد اسے لکھا ہے تو انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ اس کے دوسرے ابواب کا بھی مطالعہ کر لیا ہوتا تو معلوم ہو جاتا کہ ایسی آیتیں بھی ہیں جو ثابت کرتی ہیں کہ شریعت موسوی میں بھی انسانی اور حیوانی تصویریں اور مجسمے اسی طرح حرام تھے جس طرح شریعت محمدیہ میں حرام ہیں۔ ان آیتوں کے تلاش کرنے میں زحمت تھی تو ہم انہیں پیش کیے دیتے ہیں۔ آپ پڑھنے کی زحمت گوارا کر لیں۔

"تو اپنے لیے کوئی تراشی ہوئی مورت نہ بنانا جو اوپر آسمان میں یا نیچے زمین پر یا زمین کے نیچے پانی میں ہے" خروج باب ۲۰' آیت ۴

"ایسا نہ ہو کہ تم بگڑ کر کسی شکل یا صورت کی کھودی ہوئی مورت اپنے لیے بنا لو جس کی شبیہ کسی مرد یا عورت یا زمین کے کسی حیوان یا ہوا میں اڑنے والے کسی پرند یا زمین پر رینگنے والے جاندار یا مچھلی سے جو زمین کے نیچے پانی میں رہتی ہے، ملتی ہو۔" استثنا باب ۴ آیت ۱۶-۱۸

موصوف کو یہ بھی تسلیم ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام شریعت موسوی کے ماننے والے تھے۔ ص ۲۳

اب ان دونوں باتوں کو ملا کر غور کیجیے کہ شریعت موسوی میں تصویر کھینچنا اور رکھنا حرام ہے اور سیدنا حضرت سلیمان علیہ السلام شریعت موسوی کے ماننے والے تھے تو کس بنیاد پر اس جلیل القدر پیغمبر کے بارے میں یہ بات باور کی جائے کہ وہ جس شریعت کے پیرو تھے اس کی ممانعت کے باوجود انسانی تصویریں بنوا کر اپنے محل سجاتے اور اپنا ذوق فطرت پورا کرتے رہے۔ کیا کسی پیغمبر کو آج کے ہم جیسے مسلمان سمجھ لیا گیا ہے جو کتنے ہی احکام شریعت کی خلاف ورزی کرتے رہتے ہیں اور زبان سے اسلام کے نام لیوا ہونے کا دعوے کرتے رہتے ہیں۔ کتنی بڑی بھول ہے کہ ایک پیغمبر کی شان نبوت مجروح کرتے وقت کوئی خلش محسوس نہیں ہوتی۔

لفظ تماثیل کا لغوی مفہوم

تماثیل، تمثال کی جمع ہے۔ تمثال ہر قسم کی تصویر کو کہتے ہیں۔ جاندار کی ہو، یا بے جان کی، جس کا ترجمہ 'صورت' کیجیے یا مورت، اب جبکہ یہ بات ثابت ہو گئی کہ 'تمثال' کا لفظ ہر قسم کی تصویروں کے لیے مستعمل ہے تو محتاط طریقہ اور اتنی بڑی غلطی سے بچنے کا تقاضا یہی تھا کہ اس کا وہ مفہوم متعین کیا جائے جو شریعت کے خلاف بھی نہ پڑتا ہو اور ایک جلیل القدر پیغمبر کی شان نبوت پر بھی حرف بھی نہ آتا ہو۔ محدثین و فقہاء کے اقوال سے اسی اصول تطبیق کی تائید ہوتی ہے۔ اس کے ثبوت کے لیے دو عبارتیں یہاں نقل کی جاتی ہیں۔

علامہ حافظ ابن حجر رح لکھتے ہیں :۔

.....یحتمل ان یقال ان التماثیل کانت علی صورة النقوش لغیر ذوات الارواح واذا کان اللفظ محتملا لم یتعین علی المعنی المشکل

یہاں یہ کہنے کی گنجائش ہے کہ وہ تماثیل بے جان چیزوں کے نقوش سے ہیں اور جب لفظ میں اس کی گنجائش ہو تو مشتبہ معنی و مفہوم پر وہ محمول نہ ہوگا۔ فتح الباری جلد ۱ ص ۲۹۹

دوسری عبارت مولانا شبیر احمد عثمانی رح کی یہ ہے :۔

"..... وھذا القول منہ صلی	..... آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد
اللّٰہ وسلم یشعر بان تصویر	اس امر کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ انسانوں کی
الآدمیین لم یکن جائزا	تصویر بنانا اگلی امتوں کی شریعتوں میں بھی حرام
فی شرائعھم ولو کان جائزا	تھا۔ اگر تصویر بنانا جائز ہوتا تو حضور اس
فیھا ما اطلق علیہ صلی اللّٰہ علیہ	عموم کے ساتھ نہ فرماتے کہ جس نے ایسا کیا وہ
وسلم ان الذی فعلہ شر الخلق	بدترین آدمی ہے۔ آپ کا یہ ارشاد اس بات
فدل علی ان فعل صور الحیوان	کی دلیل ہے کہ جان دار کی تصویر بنانا بدعت
فعل محدث احدثہ عباد الصور	ہے جس کو تصویر کے پجاریوں نے ایجاد کیا ہے
واما قولہ تعالی عند ذکر سلیمٰن	رہا حضرت سلیمان علیہ السلام کے ذکر کے موقع
علیہ السلام یعملون لہ ما	پر اللہ تعالیٰ کا یہ قول یعملون لہ ما یشاء
یشاء من محاریب وتماثیل	من محاریب تماثیل تو یہ کہا جا سکتا ہے
فیحتمل ان یقال ان التماثیل	کہ یہ تماثیل بے جان چیزوں کے نقوش ہوں
علی صورة النقوش لغیر ذات	اور جب لفظ میں احتمال ہو تو اس کو ایسے
الارواح واذا کان اللفظ	معنے پر محمول کیا جائے گا جو صحیح اور مرفوع
محتملا فیحمل علی ما یوافق	احادیث سے ہم آہنگ ہو۔
الاحادیث الصحیحۃ المرفوعۃ	(فتح الملہم جلد ۲ کتاب اللباس)

ان دلائل و توجیہات کے بعد قرآن مجید کے بیان سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جو تماثیل حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے بنائی جاتی تھیں وہ لازماً انسانی اور حیوانی تصویریں اور مجسمے ہوتے تھے

۳۔ تیسرا دعویٰ

تیسرے دعوے میں کہتے ہیں .... پس حرام ہیں وہ تصویریں اور مورتیاں جو انصاب ہوں یا اصنام ہوں۔ ایسی ہی تصویر والوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پاک حدیثوں میں حرام قرار دیا ہے اور ایسی تصویریں بنانے والوں پر لعنت فرمائی ہے۔ (ص۳۴)

موصوف کا یہ دعویٰ بھی صحیح نہیں ہے ۔ میں اس موقع پر طولِ بیان کے خوف سے صرف دو حدیثیں نقل کرتا ہوں جن سے معلوم ہوگا کہ یہ دعویٰ بے بنیاد ہے ۔

عن حذیفۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لعن المصور بخاری، کتاب البیوع وغیرہ	ابو حذیفہ رض کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تصویر بنانے والے پر لعنت فرمائی ہے ۔
عن جابر قال نھی رسول اللہ علیہ وسلم عن الصورۃ فی البیت ونھی ان یصنع ذالک	حضرت جابر رض بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ گھر میں تصویر رکھی جائے اور اس سے بھی منع فرمایا کہ تصویر بنائی جائے

یہ دونوں حدیثیں صحیح احادیث میں ہیں ۔ غور کیجیے ۔ پہلی حدیث میں 'مصور' اور دوسری میں 'صورت' کا لفظ ہے ۔ کیا مصور صرف بت بنانے والے اور صورت صرف بت کو کہتے ہیں ۔

۴، ۵ چوتھا اور پانچواں دعویٰ

کہا گیا ہے کہ "جن مسلمان فقہاء نے تصویروں کو حرام بتایا ہے انھوں نے بعض احادیث کو اپنی بات کی دلیل قرار دیا ہے ۔ مگر محققین نے ان احادیث کو موضوع قرار دے کر تصویر کشی کی اجازت دے دی ہے ۔" ص۳۷

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

یہ محققین کس دنیا کے رہنے والے، کس دیس کی پیداوار اور کس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جن کا اتہ پتہ صرف انٹرویو دینے والے فاضل ہی کو معلوم ہے اور جن کو صیغۂ راز میں رکھنے کا یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ اس سے پہلے بھی ایک موقع پر ایسی ہی رازداری برتی گئی ہے ۔

فقہاء و محدثین پوری احتیاط کے ساتھ روایت و درایت کے اصول پر اچھی طرح جانچ پرکھ کر احادیث سے مسائل نکالتے اور ان کو اپنی رائے کی دلیل قرار دیتے ہیں ۔ جن فقہاء نے نہیں، بلکہ تمام فقہاء نے اور صحابہ رض و تابعین رح نے جن بکثرت احادیث کی بنیاد پر تصویروں کے حرام ہونے کی رائے قائم کی ہے وہ سب صحیح احادیث ہیں ان کو موضوع قرار دینا انتہائی نادانی ہے ۔

۶ ۔ چھٹا دعویٰ

یہاں بھی درحقیقت دو دعوے کیے ہیں جن کے الفاظ یہ ہیں :۔ "محققین کے ایک گروہ نے درمیانی راہ اختیار کی ہے ۔ انھوں نے تصویروں کی حرمت کے مخصوص اسباب پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ ان اسباب کے ختم ہو جانے سے وہ حرمت خود بخود ختم ہوگئی ۔ ان حضرات نے کہا ہے کہ اللہ کے رسولؐ اور ان کے پاک ساتھیوںؓ نے مالِ غنیمت میں ملی ہوئی تمثیلوں اور فن کے نمونوں کو ضائع نہیں کیا بلکہ محفوظ رکھا ۔ ان کا کہنا ہے کہ ۱۸ھ میں عراق میں حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں جو دینار بنائے گئے تھے ان میں انسانی چہرے نقش تھے جیسے کہ خسرو اور قیصر کے سکوں میں ہوتے تھے ۔ بنو امیہ کے دربارِ شاہی میں حضرت امیر معاویہ کے ٹکسالی دینار پر تلوار لیے ہوئے ایک آدمی کی تصویر تھی ۔ عباسی خلیفہ المتوکل علی اللہ کے سکے پر ایک اونٹ سوار کی تصویر تھی ۔ المقتدر باللہ کے سکے پر بادشاہ کی شبیہ تھی ۔ (ص۳۷)

خط کشیدہ جملوں پر غور کیجیے ۔ اتنا بڑا دعویٰ کہ رسول پاکؐ اور اصحاب پاکؓ نے تمثیلوں کو محفوظ رکھا ۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ تو یہ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے یہاں تشریف لائے اور میں نے ایک پردہ لٹکا رکھا تھا جس میں تصویر تھی ۔ آپ کے چہرے کا رنگ بدل گیا ۔ پھر آپ نے اس کو لیکر پھاڑ ڈالا اور فرمایا قیامت کے دن ان لوگوں کو سخت ترین عذاب دیا جائے گا جو اللہ کے مثل تخلیق کی کوشش کرتے ہیں ۔ (مسلم جلد ۲ ص۲۰۱ مطبع علمی دہلی)

حضرت عمرؓ عیسائیوں کے کنیسوں میں تصویریں ہونے کی وجہ سے داخل ہونے سے پرہیز کرتے تھے اور آپ فرماتے ہیں کہ تمثیلوں اور فن کے نمونوں کو سینت کر رکھا ۔ آخر ان تاریخی واقعات کے حوالے کیوں نہیں پیش کیے جاتے جہاں سے یہ اخذ کیے گئے ہیں ۔ ہمیں تو سلف کی کتب احادیث و سیر میں کہیں اشارہ بھی نہیں ملتا ۔

۷، ۸ ساتواں اور آٹھواں دعویٰ

یہاں مختلف دورِ خلافت کے تاریخی شواہد کو اپنی بات کی دلیل قرار دیا ہے ۔ لکھتے ہیں ۔ ان کا کہنا ہے کہ ۱۸ھ میں جو دینار بنائے گئے تھے ان میں انسانی چہرے کے نقش تھے جیسے کہ خسرو اور قیصر کے سکوں میں ہوتے تھے ۔ (ص۳۷) حوالے سے یہاں بھی گریز کیا گیا ہے ۔ البتہ یہاں سے زمان و مکان کی نشان دہی کرتے ہیں جس سے حوالے تلاش کرنے میں آسانی ہوگئی ـــــ اس پر موصوف شکریہ کے مستحق

ہیں ــــ آیئے اسے اپنے اسلاف کے تاریخی ذخیروں میں تلاش کر کے دیکھیں۔ دورِ حاضر کے مشہور مورخ علامہ شبلی نعمانی ؒ نے مقریزی کی کتاب "النقود الاسلامیہ" کی ایک عبارت کا اردو میں تحت اللفظ ترجمہ دیا ہے کہ :۔

"جب امیر المومنین عمر رضؓ خلیفہ ہوئے اور خدا نے ان کے ہاتھ مصر و شام اور عراق فتح کیا تو انھوں نے سکوں کے معاملے میں کچھ دخل نہیں دیا..... اسی زمانہ ۱۸ھ میں اپنے سکے کے درہم جاری کیے جو نوشیروانی سکے کے مشابہ تھے۔ البتہ اتنا فرق تھا کہ حضرت عمرؓ کے سکوں پر الحمد للہ اور بعض پر محمد رسول اللہ اور بعض پر لا الہ الا اللہ وحدہ لکھا ہوتا تھا۔"

(الفاروق مطبوعہ یونین پرنٹنگ پریس حمیدیہ کتب خانہ دہلی ۱۳۱۶ء)

اموی دور کا حوالہ دیتے ہوئے کہا گیا ہے۔ "بنو امیہ کے دور بادشاہی میں حضرت معاویہ رضؓ کے ٹکسالی دینار پر تلوار لیے ہوئے ایک آدمی کی تصویر تھی۔" صـ۱۴۲ یہاں بھی تاریخ اور مورخ کا حوالہ دینے سے گریز کیا گیا۔ لیکن دَور کا پتہ دے دیا تھا اس لیے میں اس دَور میں جا پہنچا اور حضرت امیر معاویہ رضؓ، یزید اول، ابن معاویہ، معاویہ ثانی ابن یزید، حضرت عبد اللہ بن زبیر اور مروان بن حکم کے درباروں میں، خزانوں میں کہیں بھی انسانی تصویر دار سکہ میری نظر میں نہ آسکا ــــ حوالے اسی لیے دیے جاتے ہیں کہ مجھ جیسے کوتاہ نظر دیکھ لیں ــــ وہاں مسلمانوں کا اپنا سکہ نہ تھا، بلکہ رومی، ایرانی اور قبطی سکوں سے کام چلتا تھا۔ (ملاحظہ ہو تاریخ اسلام دوم صـ۱۲۹ مرتبہ شاہ معین الدین صاحب ندوی، مطبوعہ معارف پریس، اعظم گڈھ ۱۹۴۷ء) البتہ جب عبد الملک بن مروان کا دور آیا تو اس نے اسلامی سکہ جاری کیا۔ اس کی تفصیل علامہ عبد الرحمٰن بن خلدون مغربی نے بیان کی ہے۔ ان کی عبارت کا تحت اللفظ ترجمہ پڑھیے۔

"عبد الملک نے حجاج کو سکہ بنانے اور کھرے کھوٹے میں فرق رکھنے کا حکم دیا۔ جیسا کہ سعید بن مسیب اور ابو الزناد سے منقول ہے اور یہ ۷۴ھ اور مدائنی کے قول کی رو سے ۷۵ھ کا واقعہ ہے۔ پھر اس نے ۷۶ھ میں پورے حدودِ مملکت میں اسے رائج کرنے کا حکم دیا۔ اس پر اللہ احد اور اللہ الصمد لکھا ہوتا تھا۔ پھر یزید بن عبد الملک کے عہد خلافت میں ابن ہبیرہ عراق کا گورنر ہوا۔ اس نے سکے میں عمدگی پیدا کی۔ پھر خالد قسری نے اور زیادہ عمدہ بنوایا۔ اس کے بعد یوسف بن عمر نے (ایسا ہی کیا) ایک

قول یہ ہے کہ عراق میں سب سے پہلے ۷۶ھ میں مصعب بن زبیرؓ نے اپنے بھائی عبداللہ بن زبیرؓ کے حکم سے، جس وقت وہ حجاز کے خلیفہ ہو گئے۔ دینار و درہم بنوائے، ان کے ایک طرف برکۃ اللہ اور دوسری طرف اسداللہ، لکھا تھا۔ پھر حجاج نے ایک سال کے بعد ان میں تبدیلی پیدا کی اور ان پر الحجاج لکھا اور ان کا وزن اس وزن کے مطابق مقرر کیا جو حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت میں تھا۔۔۔۔

جب عبدالملک کو سکوں کے ـــــ دینار او درہم جو اس وقت رائج تھے ـــــ مسلمانوں کے معاملات میں کھوٹ سے محفوظ رکھنے کا خیال آیا تو اس کی مقدار اس کے مطابق متعین کی جو حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں مقرر تھی۔ اس نے لوہے کی مہر بنوائی اور اس پر جملے لکھے، تصویریں نہیں کیونکہ اہل عرب کے نزدیک کلام و بلاغت تعبیر کا قریب ترین اور سب سے زیادہ واضح طریقہ تھا۔ اسی کے ساتھ شریعت بھی تصویروں سے منع کرتی ہے۔ جب ایسا کیا جا چکا تو حکومت کے پورے عہد میں یہ (سکہ) رائج رہا۔ دینار و درہم دو گول شکلوں کے بنے تھے اور دونوں پر متوازی دائروں میں لکھا ہوتا تھا۔ ایک طرف اللہ کا نام لا الٰہ الا اللہ، الحمد للہ، آل نبی پر درود۔ دوسری طرف تاریخ اور خلیفہ کا نام۔ ایسا ہی عباسی، عبیدی اور اموی دور میں ہوتا رہا۔ رہے صنہاجہ تو انھوں نے کوئی سکہ نہیں بنایا۔ مگر آخر میں منصور صاحب بجایہ نے سکہ بنایا۔ اس کا تذکرہ ابن حماد نے اپنی تاریخ میں کیا ہے۔ جب موحدین کی حکومت آئی تو اس طریقے پر عمل کیا جو مہدی نے رائج کیا تھا کہ مربع شکل کا درہم بنایا جائے اور دینار کے بیچ دائرے میں ایک مربع شکل ہو اس میں ایک طرف لا الٰہ الا اللہ اور الحمد للہ اور اس کے دوسری طرف اس کا نام اور اس کے بعد کے خلفاء کے نام درج ہوں۔ (دیکھیے، مقدمہ ابن خلدون، مطبوعہ مصر ص ۲۲۶-۲۲۷)

اس سے آگے بڑھیے ـــ پوچھنے والے نے پوچھا "اس کا ثبوت کیا ہے؟" جواب سنیے ـــ ڈاکٹر سعاد ماہر مصر کے ایک مورخ ہیں۔ انھوں نے "فن التصویر فی الاسلام" کے عنوان سے ایک مفصل مضمون لکھا تھا۔ اس میں فرانسیسی مستشرقین فادر لیمنس (Father lemens) پروفیسر کریزول اور آرنلڈ (Arnold) کے تحقیقی کام کا حوالہ دیتے ہوئے ان تاریخی واقعات کا ذکر کیا ہے (ص ۳۵)

ان تاریخی واقعات سے اشارہ انہی واقعات کی طرف ہے جن کی حقیقت و اصلیت مستند تاریخی حوالوں سے اوپر پیش کی جا چکی۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ مصر کے مورخ ڈاکٹر سعاد ماہر ثانی

اور بڑے پایہ کے مورخ معلوم ہوتے ہیں کہ جس مصر سے اسلامی علوم میں سے ہر فن کی بہترین اور بعض نایاب کتابیں طبع ہو کر ساری دنیا میں پہنچ رہی ہیں وہاں ان کو اپنا مقالہ ترتیب دینے میں فرانسیسی مستشرقین کے تحقیقی کاموں سے مدد لینی پڑتی ہے جن کے مبلغ علم اور طرز تحقیق اور مقصد تحقیق سے اہل علم کا طبقہ ناواقف نہیں ہے[1] بات دراصل یہ ہے کہ جو لوگ مغربی تہذیب و ثقافت کے دلدادہ اور اہل مغرب کی ظاہر فریبیوں سے مرعوب ہیں وہ اس ثقافت کے فن تصویر کشی اور مجسمہ سازی کے لیے جس کو وہ تہذیب انسانی کا کمال اور اس کے لیے باعث فخر سمجھتی ہے سند جواز قرآن و حدیث اور اسلامی تاریخ میں ڈھونڈھتے پھرتے ہیں۔

[1] اسی مصر سے مسئلہ تصویر پر ایک ایسا رسالہ شائع ہوا ہے جس میں ائمہ اربعہؒ کے اقوال و آراء درج ہیں۔

رسائل و مسائل

ادائے امانت کی اہمیت

خط

عرض ہے کہ ماہنامہ زندگی مئی ۳، ۱۹۷۶ء اتفاقاً مطالعہ کے لیے دستیاب ہوا —— رسائل و مسائل کے صفحات میں 'نسیان کی وجہ سے امانت ضائع ہو جانے کا مسئلہ' کے عنوان سے جو جواب آپ نے فقہائے عظام کی روشنی میں دیا ہے اور اس کے حوالے بھی درج ہیں مجھے آپ کے اس جواب پر ایک علمی اشکال ہے جسے میں آپکی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ بغور فرماکر زندگی میں اس کا جواب عنایت فرمائیں تاکہ اگر مجھے غلط فہمی ہے تو اس کا ازالہ ہو جائے۔

اس میں شک نہیں کہ آپ نے ضیاع امانت بوجہ نسیان کے تاوان کے سلسلے میں جو دلائل فراہم فرمائے ہیں وہ بہت ہی ٹھوس اور وزن دار ہیں اور آپ کا یہ فرمانا بالکل بجا اور درست ہے کہ اگر بھول جانے کی وجہ سے حقوق اللہ اور حقوق العباد ساقط ہو جایا کریں ان کی قضا اور تاوان واجب نہ ہو تو ہزاروں حقوق طاق نسیاں کی زینت بن جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے تلاش و جستجو کے بعد ایسا جزئیہ لاکر پیش فرما ہی دیا ہے جو بظاہر سائل کے سوال کے مطابق ہے —— اور میں نے مذکورہ حوالہ جات کی طرف رجوع کیا تو وہ عبارت بھی مل گئی لیکن اے محترم! اس کے باوجود یہ اشکال ہے کہ علامہ ابوالحسن علی مرغینانیؒ نے لکھا ہے کہ الودیعۃ امانۃ فی ید المودع اذا ھلکت لم یضمنھا لقولہ علیہ السلام لیس علی المستعیر غیر المغل ضمان ولا علی المستودع غیر المغل ضمان ولان بالناس حاجۃ الی الاستیداع فلو ضمناہ لامتنع الناس

عن قبول الودائع فیتعطل مصالحہم (ہدایہ آخرین ص۲۷۲)

صاحب ہدایہ نے اپنے طرز خصوصی کی بنیاد پر دو دلیلیں ایک نقلی اور ایک عقلی پیش فرمائی ہے۔ دلیل نقلی کا ماحصل یہ ہے کہ امانت دار اگر غیر خائن ہے اور تعدی کے بغیر وہ شئے تلف ہوجائے تو اس کا ضمان نہیں ہے اور دلیل عقلی کا خلاصہ یہ ہے کہ لوگوں کو دوسروں کے پاس اپنی امانتیں رکھنے کی ضرورت پیش آتی ہے اگر ہر شکل و صورت میں تاوان ضروری ٹھہرایا جاتا رہے گا اور لوگوں کو زبردستی ذمہ دار بنایا جائے گا تو لوگوں کے مصالح معطل ہوجائیں گے۔ ضروریات زندگی اور تجارت و معیشت کا نظام تباہ ہوکر رہ جائے گا اور امانت قبول کرنے سے لوگ کترائیں گے اور اتحاد و اتفاق اختلاف میں بدل جائے گا یہی وجہ ہے کہ حضرات فقہاء نے حدیث مذکور اور مصلحت خفیہ پر عمیق نگاہ فرماکر یہ قاعدہ کلیہ بنایا ہے کہ وھی امانۃ فلا تضمن بالھلاک (ص۵۵ تنویر الابصار)

اب سوال یہ ہے کہ نسیان، تعدی میں داخل ہے یا نہیں؟ قابل غور بات ہے کہ جو انسان امانت دار، ہوشیار اور بیدار مغز ہوگا اور یادداشت میں ضعف نہ ہوگا اس سے اگر نسیان کا صدور ہوجائے گا تو تعدی میں کیسے شمار کیا جائے گا۔ ہاں جس کی عادت ہی نسیان و فراموشی کی بن گئی ہے اور اکثر و بیشتر وہ اس کا شکار رہتا ہو تو وہ یقیناً تعدی میں داخل ہوگا یہی وجہ ہے کہ فقہائے کرام نے ایسے حالات اور ایسی مثالوں میں ضمان لازم قرار دیا ہو اس لیے کہ اس نے اپنی کمزوری سے صرف نظر کرکے حفاظت امانت کا فریضہ انجام دیا ہی نہیں لہٰذا جو جواب آپ نے مرحمت فرمائے ہیں اس کا تعلق اس نسیان سے معلوم ہوتا ہو۔ انسان جس کا عادی ہوچکا ہو لیکن آپ نے اتفاقیہ فراموشی والی مثال کو عادت ثانیہ والی مثال پر چسپاں کردیا۔ کیونکہ یہ بات اگر نہ ہوتی تو وہ سائل یہ نہ کہتا کہ جب مجھے یاد آیا تو واپس لوٹ کر ڈبہ میں تلاش کیا مگر نہیں ملا۔ اور یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ نسیان صرف اختیاری ہی نہیں ہوتا ہو بلکہ غیر اختیاری بھی ہوتا ہو

اور آپ نے جو حقوق العباد کے عدم اسقاط کو قیاس فرمایا ہے حقوق اللہ کے عدم اسقاط پر تو یہ قیاس مع الفارق ہے۔ کیا صلوٰۃ و صدقہ فطر کی وہی حیثیت ہو جو ودیعت امانت

کی ہے؟ صلوٰۃ تو مسلم عاقل، بالغ پر فرض عین ہے کسی حالت میں معاف ہی نہیں، بغیر ادا کیے چارہ نہیں، کیا ودیعت بھی فرض عین ہے؟ حدیث میں ہے من ترك الصلوٰۃ متعمداً فقد کفر لیکن ودیعت کے بارے میں کہیں نہیں ملا من ترك الودیعۃ..... صدقہ فطر صاحب نصاب پر واجب ہے اور کیا ودیعت بھی؟ میں امید کرتا ہوں کہ اس کا تفصیل سے جواب مرحمت فرمائیں تاکہ غور کرنے کا موقع ملے آپ کا مشکور ہوں گا

جواب

میں یہاں رام پور میں موجود نہ تھا اس لیے جواب میں تاخیر ہوئی۔ محترم! آپ تو خود عالم دین ہیں۔ اگر ودیعت کے پورے باب پر ایک نظر ڈال لیتے تو ہدایہ اور تنویر الابصار کی ان عبارتوں سے جن کا حوالہ آپ نے اپنے خط میں دیا ہے کوئی علمی اشکال پیش ہی نہ آتا۔ میں نے جس وقت سائل کا جواب لکھا تھا اس وقت وہ عبارتیں میرے سامنے تھیں جو آپ نے مجھے لکھ بھیجی ہیں۔ ان عبارتوں اور فقہائے احناف کے قاعدۂ کلیہ کا تعلق اس بات سے ہے کہ ودیعت یا امانت اصلاً غیر مضمون ہیں۔ امانتدار کی کسی خیانت کے بغیر اگر کسی کی امانت تلف ہو جائے تو اس پر تاوان لازم نہیں آئے گا۔ اسی قاعدۂ کلیہ کے لیے صاحب ہدایہ نے حدیث بھی نقل کی ہے اور عقلی دلیل بھی دی ہے۔ ان عبارتوں کا تعلق اس بات سے نہیں ہے کہ کن چیزوں پر 'خیانت' کا اطلاق ہوگا اور کن چیزوں پر نہیں ہوگا۔ یہ بات ان جزئیات سے معلوم ہوتی ہے جو فقہاء نے اپنے قاعدۂ کلیہ کی روشنی میں مرتب کی ہیں۔ جس حدیث سے انھوں نے قاعدۂ کلیہ مستنبط کیا ہے اس میں اغلال (خیانت) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے' تعدی کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ آنجناب کو غور کرنا چاہیے تھا کہ جب حدیث میں تعدی کا لفظ نہیں ہے تو پھر تعدی کی صورت میں تاوان لازم قرار دینے کی دلیل کیا ہے؟ بات دراصل یہ ہے کہ فقہائے احناف نے قرآن و حدیث کے استعمالات کی روشنی میں خیانت (اغلال) کو وسیع معنے میں لیا ہے اس محدود معنے میں نہیں لیا ہے جو عام طور سے مشہور ہے

لوگ عام طور پر خیانت کے معنے یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی شخص کسی کی امانت واپس نہ کرے اس میں خرد برد کرے۔ بڑھیا چیز کو گھٹیا چیز سے بدل دے یا اسی طرح کی کوئی حرکت کرے لیکن عربی لغت اور قرآن و حدیث کے استعمالات میں خیانت کے معنے اس سے کہیں زیادہ وسیع ہیں۔ اسی اعتبار سے

فقہاء کے نزدیک امانت میں کسی قسم کی تعدی اور اس کی حفاظت میں غفلت اور کوتاہی بھی خیانت ہے یہاں تک کہ اگر امانت دار نے کوئی ایسا کام کیا جس سے امانت رکھنے والا راضی نہ ہو تو اس کو بھی انھوں نے خیانت ہی میں داخل کیا ہے اور امانت دار پر تاوان لازم قرار دیا ہے اور اسی بنیاد پر انھوں نے باب ودیعت کی جزئیات مرتب کی ہیں۔ اگر خیانت کو وسیع معنے میں نہ لیا جائے بلکہ صرف اس کے مشہور معنی میں لیا جائے تو ودیعت کے مسائل میں فقہ حنفی کی متعدد جزئیات کا اس حدیث سے بھی تصادم لازم آئے گا اور ان کے قاعدہ کلیہ سے بھی۔ میں ایک جزئیہ سے اس کو واضح کرتا ہوں۔

امانت دار نے امانت دار کی حفاظت بذات خود کرنے یا اپنے اہل وعیال کے ذریعے کرانے کے بجائے اس کو کسی اور کے حوالے کر دیا جبکہ وہ ایسا کرنے پر مجبور نہ تھا پھر وہ امانت اس دوسرے شخص کے پاس سے ضائع ہو گئی تو اس صورت میں اصل امانت دار اس کا ضامن ہوگا اور اس کو تاوان دینا پڑے گا سوال یہ ہے کہ تاوان کیوں لازم ہوگا ؟ امانت دار نے خیانت کے مشہور معنے کے لحاظ سے تو کوئی خیانت کی نہیں ہے بلکہ وہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے اس دوسرے شخص کے پاس وہ امانت اس لیے رکھ دی تھی کہ وہ مجھ سے زیادہ بہتر طور پر اس کی حفاظت کر سکتا تھا۔ تاوان کے لازم ہونے کے جو دلائل صاحب ہدایہ نے دیے ہیں ان میں کی پہلی دلیل یہ ہے کہ امانت رکھنے والا اپنے مال پر کسی دوسرے کے قبضے سے راضی نہ تھا کیونکہ امانت کے معاملے میں مختلف اشخاص کے قبضوں کے درمیان اختلاف ہوتا ہے یعنی مثال کے طور پر ایک شخص جو زید پر بھروسہ کرتا ہے ضروری نہیں کہ وہ بکر یا عمرو پر بھی بھروسہ کرے۔ معلوم ہوا کہ امانت دار نے چونکہ امانت رکھنے والے کی مرضی کے خلاف کام کیا اس لیے اس پر تاوان لازم ہوگا۔ کیونکہ امانت رکھنے والے کی مرضی واجازت کے بغیر دوسرے شخص کو امانت حوالے کر کے امانت دار نے جو تعدی کی ہے وہ بھی ایک قسم کی خیانت ہی ہے۔ اسی طرح فقہائے احناف نے امانت کی حفاظت میں کسی طرح کی غفلت کو بھی خیانت ہی قرار دیا ہے اور نسیان کی وجہ سے امانت کو تلف کر دینے کی صورت میں بھی انھوں نے تاوان اسی لیے لازم قرار دیا ہے کہ امانت دار نے حفاظت میں غفلت اور کوتاہی برتی۔

آپ نے نسیان کے بارے میں عادی اور غیر عادی ہونے کا جو فرق کیا ہے اس کا کوئی اشارہ بھی فقہ کی کتابوں میں موجود نہیں ہے۔ حالانکہ اگر بات یہی ہوتی تو اس کی صراحت ضروری تھی کہ اگر امانت دار کو نسیان کی عادت ہو تو تاوان لازم ہوگا اور عادت نہ ہو تو لازم نہ ہوگا۔ چونکہ

فقہائے احناف امانت کو غیر مضمون مانتے ہیں اس لیے یہ صراحت بالکل ضروری تھی اور جب انھوں نے اس کا اشارہ تک نہیں کیا ہے تو فقہ حنفی کے لحاظ سے عادی اور غیر عادی کا فرق کس طرح قابل تسلیم ہوگا۔ امانت دار کی جو صفات آپ نے لکھی ہیں اس سے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب کوئی شخص کسی کو اپنی کوئی امانت حوالہ کرے تو پہلے یہ تحقیق کرلے کہ وہ نسیان کا مریض ہے یا نہیں۔ اسی طرح کسی کی امانت اسی شخص کو قبول کرنی چاہیے جس کی یادداشت قوی ہو۔ کتب فقہ ان دونوں باتوں سے خالی ہیں۔ فقہا نے نہ امانت حوالہ کرنے والوں پر یہ پابندی عائد کی ہے اور نہ امانت قبول کرنے والوں پر۔

علاوہ ازیں آپ نے بھولنے والے کے اس قول کو کہ جب مجھے یاد آیا تو واپس لوٹ کر ڈبے میں تلاش کیا" اس بات کی دلیل بنایا ہے کہ اس کو بھولنے کی عادت نہ تھی۔ یہ پڑھ کر تعجب ہوا۔ کیونکہ یہ بات تو وہ شخص بھی کہے گا اور کہہ سکتا ہے جس کو بھولنے کی عادت ہو۔ کیا آپ کا خیال یہ ہے کہ اگر اس شخص کو نسیان کی عادت ہوتی تو یاد آنے کے بعد وہ واپس جاکر تھیلا نہ تلاش کرتا؟ پھر آپ نے یہ جو لکھا ہے کہ نسیان اختیاری بھی ہوتا ہے اور غیر اختیاری بھی تو یہ بھی آپ نے ایک عجیب بات لکھی ہے۔

محترم! نسیان ہمیشہ غیر اختیاری ہی ہوتا ہے۔ اپنے اختیار اور قصد سے کوئی شخص کوئی چیز نہیں بھولتا۔ نسیان کے ساتھ اختیار کا لفظ استعمال کرنا صحیح نہیں ہے۔ نسیان چونکہ غیر اختیاری چیز ہے اسی لیے آخرت کے مواخذہ سے انسان بچ جائے گا لیکن دنیا میں اس کی وجہ سے کسی کا حق تلف نہیں کیا جاسکتا۔

آپ نے حقوق العباد کو حقوق اللہ پر قیاس کرنے کو قیاس مع الفارق قرار دیا ہے اور متعدد سوالات کیے ہیں اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ آپ کے خیال میں نسیان کی وجہ سے چھوٹی ہوئی نماز کی قضا اس لیے لازم ہوتی ہے کہ نماز کو اللہ نے ہر عاقل بالغ مسلمان پر فرض عین قرار دیا ہے اس کو ادا کیے بغیر چارہ نہیں۔ بھول کر بھی کوئی نماز اگر چھوٹ جائے تو اس کی قضا واجب ہوگی لیکن کسی کی امانت قبول کرنے کو اللہ نے فرض عین قرار نہیں دیا ہے۔ نسیان کی وجہ سے اگر امانت تلف ہوجائے تو نماز پر قیاس کرکے اس کے تاوان کو واجب قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ اس سلسلے میں عرض ہے کہ آپ یہ بھول گئے کہ گفتگو کس مسئلے پر ہورہی ہے۔ کسی کی امانت قبول کرنا تو فرض نہیں ہے لیکن اگر کوئی قبول کرلے

تو اس کی پوری طرح حفاظت کرنا اور بے کم و کاست اس کے مالک کو واپس کرنا فرض ہو جاتا ہے اور گفتگو اسی مسئلے میں ہو رہی تھی کہ امانت قبول کرنے کے بعد امانت دار کی ذمہ داری کیا ہے۔ ادائے نماز کی فرضیت اور ادائے امانت کی فرضیت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جس خدا نے نماز فرض کی ہے اسی خدا نے امانتیں ادا کرنا بھی فرض قرار دیا ہے اور جس قرآن نے اللہ و رسول کے ساتھ خیانت ممنوع قرار دی ہے اسی قرآن نے امانتوں میں خیانت کو ممنوع قرار دیا ہے۔ آپ کی یاد دہانی کے لیے چند آیتیں نقل کی جاتی ہیں۔

(۱) فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُم بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ (البقرۃ: ۲۸۳)

پس اگر تم میں سے کسی کو کسی دوسرے پر اعتماد ہو تو جس کے پاس امانت رکھی گئی ہو وہ اس کی امانت ادا کرے اور اللہ سے جو اس کا رب ہے ڈرے۔

(۲) اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰى اَهْلِهَا (النساء: ۵۸)

اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں ان کے حوالے کر دیا کرو۔

(۳) يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (المائدۃ: ۱)

اے ایمان والو! اپنے قول و قرار کو پورا کرو۔

(۴) يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ (الانفال: ۲۷)

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیانت نہ کرو اور نہ اپنی امانتوں میں خیانت کرو اور تم جانتے ہو۔

آپ چونکہ عالم دین ہیں اس لیے میں ان آیات کی تشریح نہیں کرتا ان کے ترجموں ہی سے واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ادائے امانت کو کیا اہمیت دی ہے۔ آپ اس سے واقف ہیں کہ احادیث میں جس طرح ترک نماز کو کفر کہا گیا ہے اسی طرح امانت میں خیانت کو نفاق اور بے ایمانی قرار دیا گیا ہے۔ منافقین کی جو علامتیں بتائی گئی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے:۔

وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ۔

اور جب اس کو امانت دار بنایا جائے تو خیانت کرے۔

بیہقی کی ایک حدیث یہ ہے:۔

عن انس قلما خطبنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الا قال لا ایمان لمن لا امانۃ لہ ولا دین لمن لا عھد لہ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اکثر خطبوں میں فرمایا کرتے کہ جس میں امانت داری نہیں اس میں ایمان نہیں اور جس میں عہد کی پاسداری نہیں اس کا کوئی دین نہیں۔

صدقۂ فطر پر جو سوال آپ نے کیا ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ نے اصل مسئلے پر غور کرنے کی زحمت گوارا ہی نہیں کی ہے ورنہ یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ جس طرح صدقۂ فطر کی ادائگی ہر شخص پر واجب نہیں بلکہ صرف اس پر واجب ہے جو صاحب نصاب ہو اسی طرح ادائے امانت ہر شخص پر واجب نہیں بلکہ صرف اس پر واجب ہے جس نے کسی کی امانت اپنے پاس رکھی ہو۔ جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے۔ نماز، صدقۂ فطر اور ودیعت وامانت کے سلسلے میں سوالات مرتب کرتے وقت آپ کے ذہن سے یہ بات نکل گئی کہ اصل مسئلہ ہے کیا؟ ورنہ آپ اس سے ناواقف نہیں ہوں گے کہ ادائے امانت کا وجوب، صدقۂ فطر کے وجوب سے بڑھا بڑھا ہوا ہے

میں شکر گذار ہوں کہ آپ کے استفسار کی وجہ سے مجھے ادائے امانت کی اہمیت پر مختصر اظہار خیال کا موقع مل گیا۔ فقہائے احناف کے سامنے ایک طرف یہ چیز رہی ہے کہ لوگوں کو اپنے اموال دوسرے لوگوں کے پاس بطور امانت رکھنے کی ضرورت پیش آیا کرتی ہے اس لیے اگر ہر حال میں امانت دار کو اس کا ضامن قرار دیا جائے تو لوگ امانتیں قبول کرنے سے کترائیں گے اور اس طرح بہت سے لوگوں کو زحمتیں پیش آئیں گی۔ دوسری طرف ان کے سامنے یہ چیز بھی رہی ہے کہ امانت کی حفاظت میں غفلت اور کوتاہی کی صورت میں بھی امانت دار پر تاوان لازم نہ قرار دیا جائے تو بہت سے لوگوں کے کثیر اموال تلف ہو جائیں گے۔ اسی طرح انھوں نے انسان کی نفسیاتی کمزوریوں کو بھی اپنے سامنے رکھا ہے۔ پہلی چیز کے لحاظ سے انھوں نے قاعدہ بنایا کہ امانت و ودیعت اصلاً قابل ضمان نہیں ہیں۔ اگر امانت کی حفاظت میں کسی غفلت و کوتاہی کے بغیر وہ تلف ہو جائے تو امانت دار پر کوئی تاوان لازم نہیں آئے گا اور دوسری چیز کے لحاظ سے انھوں نے یہ طے کیا کہ امانت کی حفاظت میں خیانت یا زیادتیاں، غفلتیں اور کوتاہیاں ایسی ہیں کہ ان کی وجہ سے امانت ضائع ہو جائے تو امانت دار پر تاوان واجب ہوگا۔ انھوں نے اس بات سے بھی صرف نظر نہیں کیا کہ شیطان اور نفس ہر انسان کے ساتھ ہے۔ آج ایک شخص امین ہے لیکن کل اس سے خیانت کا ارتکاب ہو سکتا ہے۔

انبیائے کرام علیہم السلام کے سوا کوئی انسان معصوم نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ اگر ایک شخص سو پچاس روپیہ میں خیانت نہیں کرتا تو ضروری نہیں کہ وہ ہزار دو ہزار میں خیانت نہ کرے۔ ان باتوں کا لحاظ کرکے انھوں نے فتویٰ دیا ہے کہ نسیان کی وجہ سے اگر امانت ضائع ہوجائے تو امانت دار اس کا ضامن ہوگا۔ اس کی اصل علت تو یہی ہے کہ اس نے حفاظت میں غفلت برتی اور دوسری ضمنی علت یہ بھی ہے کہ کس طرح معلوم ہوگا کہ فی الواقع وہ بھول گیا تھا یا اپنے نسیان کو دوسرے کا مال ہڑپ کرنے کے لیے بہانہ بنا رہا ہے۔ نسیان ایک ذہنی عمل ہے اس لیے اس پر کوئی شہادت بھی طلب نہیں کی جاسکتی۔

جہاں تک راقم الحروف نے غور کیا ہے فقہائے احناف کا یہ فتویٰ پوری طرح معقول اور مبنی برحکمت ہے اور اس کی وجہ سے نہ حدیث کے خلاف کوئی بات لازم آتی ہے اور نہ ان کے قاعدۂ کلیہ پر کوئی زد پڑتی ہے۔

کرنیں مرکزی درس گاہ جماعت اسلامی ہند کے ناظم جناب سید منظور الحسن ہاشمی۔ بی اے (ڈپلو ایڈ) کی نگرانی اور اس درس گاہ کے تین اساتذہ جناب ابوالمجاہد زاہد۔ جناب سلیمان قاسمی، جناب عرفان خلیلی کی ادارت میں سالانہ میگزین کا یہ چوتھا شمارہ شائع ہوا ہے۔ گزشتہ تین شماروں پر زندگی میں تبصرے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ یہ چوتھا شمارہ پہلے تین شماروں سے بھی بہتر ہے۔

صفحات ۱۰۶۔ قیمت 1/50 پتہ مرکزی درس گاہ جماعت اسلامی ہند۔ رام پور۔ یوپی

حسب معمول اس میں سالانہ تعلیمی ہفتہ کی رنگا رنگ روداد جاذب نظر ہے۔ محترم ناظم درس گاہ کی تین نگارشات۔ ایک مقالہ "روسو یورپ کا ایک عظیم مفکر" ایک مزاحیہ فیچر، آل انڈیا بدعو کنونشن، ایک ڈرامہ "زلزلہ" شریک اشاعت ہیں۔ ایک مقالہ جناب محمد یونس عثمانی استاذ درس گاہ کا "ہمارا تابناک ماضی" کے عنوان سے اور ایک مقالہ مولانا سلیمان قاسمی صاحب کا سب سے اچھا قصہ کے عنوان سے اس میگزین کی زینت ہے۔

طلبہ نے عربی انگریزی اور ہندی میں جو تقریریں کی تھیں وہ بھی اس میں موجود ہیں ان کے علاوہ طلبہ کے چند مضامین بھی شائع کیے گئے ہیں۔ اس میں منظومات کا بھی ایک حصہ ہے۔ یہ سب چیزیں بڑے سلیقے سے ترتیب دی گئی ہیں۔ پورا میگزین قابل مطالعہ ہے۔

طلبہ کے جو مضامین اس میں شائع کیے گئے ہیں۔ مثلاً امام شافعیؒ اور غالبؔ وہ ان کے معیار تعلیم سے بہت اچھے محسوس ہوتے ہیں۔ تبصرہ نگار کا حقیر مشورہ ہے کہ اساتذہ کرام طلبہ کے مضامین پر اصلاح دینے میں ان کے معیار تعلیم کا ضرور خیال رکھیں۔

سراب سے حقیقت تک

تلخیص کرنے والے جناب شمس نوید عثمانی۔ صفحات ۹۴ قیمت 1/50

ناشر:۔ روشنی پبلشنگ ہاؤس خسرو باغ روڈ۔ رام پور۔ یوپی۔

زیر تبصرہ کتاب مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ کی کتاب "دنیا و آخرت" (تین حصے) کی تلخیص ہے جو جناب شمس نوید عثمانی صاحب نے کی ہے اور جناب منظور ناظر بی اے، ایڈیٹر ہندی ماہنامہ "مارگ دیپ" نے اپنے قائم کردہ روشنی پبلشنگ ہاؤس سے اس کو شائع کیا ہے۔ شمس صاحب نے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ مولانا تھانوی کی کتابوں پر ان کے ناشرین نے بھاری بھرکم قیمتوں کا بوجھ رکھ دیا ہے جس کو غریب لوگ اٹھا نہیں سکتے۔ دوسری طرف جو لوگ بہت مصروف ہیں وہ ضخیم کتابوں سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ اس لیے منظور ناظر صاحب نے یہ ارادہ کیا ہے کہ مولانا تھانوی کی ضخیم کتابوں کی تلخیص شائع کریں تاکہ قیمت بھی زیادہ نہ ہو اور مصروف لوگ بھی اس کو پڑھنے کے لیے وقت نکال سکیں۔ انھوں نے پیش لفظ میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس تلخیص میں اصل کتاب کی کوئی ضروری بات چھوڑی نہیں گئی۔ اس کے علاوہ مشکل الفاظ اور مشکل عبارتوں کی تشریح بھی کر دی گئی ہے، تاکہ کتاب عام فہم ہو جائے۔

افسوس یہ ہے کہ تبصرہ نگار کے پاس مولانا تھانویؒ کی اصل کتاب موجود نہیں ہے اس لیے شمس صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اسی پر اعتماد کرنا ہے۔ کتاب میں فہرست مضامین بھی دے دی گئی ہے جس سے استفادہ آسان ہو گیا ہے۔ مولانا تھانویؒ کی کتابیں بے حد مفید ہیں اور راقم الحروف نے بھی ان سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ امید ہے کہ یہ تلخیص بھی مطالعہ کرنے والوں کے لیے بہت مفید ثابت ہوگی۔

بقیہ اشارات

کے خلاف مہم چلانے پر زور دیا۔ اس کے بعد لکھی ہوئی تقریر کا باقی حصہ پڑھا۔ زبانی طور پر انھوں نے ریاستی گورنرز، ان کے مشیروں اور اعلیٰ سرکاری افسروں کو جو ہدایات دیں وہ یہ ہیں:۔

"افسروں کو دیہی علاقوں کا دورہ کرکے عوام کی مشکلات سے واقفیت حاصل کرنا اور انھیں دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

"جو لوگ ضروری اشیاء میں ملاوٹ کرتے ہیں ان کے خلاف کارروائی کی جانی چاہیے۔"

"جن کسانوں نے غلّے کے ذخیرے چھپا رکھے ہیں اور فروخت نہیں کرتے ان کو گرفتار کرکے جیل بھیج دینا چاہیے۔"

صدر جمہوریہ نے آخر میں کہا:۔

"گاندھی جی نے ہمیں جو راستہ دکھایا تھا اس سے بھٹک کر ہم دور جا پڑے ہیں۔ گاندھی جی کے آدرشوں سے محض زبانی ہمدردی سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا ہمیں اپنے خیال و عمل کے ذریعے ان کے پیغامات سے گہری وابستگی کا ثبوت دینا ہوگا۔

(قومی آواز، لکھنؤ، ۳۰ جولائی ۸۳ء)

بعض دوسرے اخبارات میں ہے کہ انھوں نے یہ بھی کہا:۔

"جب تک ذہن تبدیل نہ ہوں اس وقت تک صرف نیک خواہشات سے کوئی مفید کام انجام نہیں پاسکتا۔"

بعض اخبارات میں ہے کہ صدر جمہوریہ کی اس تقریر پر اخبارات کے سیاسی حلقوں کو حیرت بھی ہے اور سیاستدانوں پر شدید نکتہ چینی سے ان کو صدمہ بھی پہنچا ہے۔ یہ بھی خیال ہے کہ مسز اندرا گاندھی اور کانگریس کو خاص طور پر پریشانی ہوئی ہے کیونکہ نکتہ چینی میں انہیں کو براہ راست نشانہ بنایا گیا تھا۔ صدر نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا کہ مسز گاندھی کی بہترین کوششوں کے باوجود، گزشتہ انتخابات میں ان کی مطلوبہ اکثریت حاصل ہونے سے متوقع نتائج نہیں نکل سکے۔ یہ سوال بھی پیدا ہوا ہے کہ کیا صدر کو اس کا اختیار حاصل ہے کہ وہ براہ راست گورنر کے مشیروں اور سکریٹریوں کو یہ حکم دیں کہ ذخیرہ اندوزوں کو گرفتار کرلیا جائے۔ لکھنؤ کے ایک روزنامہ نے اپنے اداریے میں لکھا ہے:۔

صدر گری نے اس موقع پر مہاتما گاندھی کا عوام کو دیا ہوا ایک انتباہ یاد دلاکر نئی پود پر بڑا احسان کیا ہے جو گاندھی جی اور ان کی تعلیمات کو نہ سمجھتی ہے، نہ سمجھنا چاہتی ہے۔ گاندھی جی نے عوام کو جن خطرات کے خلاف انتباہ دیا تھا وہ یہ ہیں۔ سیاست جس کے کوئی اصول نہ ہوں ــــ دولت جو کام کیے بغیر ملے ــــ خوشی جو ضمیر کی آواز کو دبا کر حاصل کی جائے علم جو انسان کو کردار نہ دے سکے ــــ تجارت جس میں ایمان کا دخل نہ ہو ــــ سائنس جو انسانیت سے خالی ہو ــــ عبادت جس میں ایثار نہ ہو۔

گاندھی جی نے ان خطرات سے ۱۹۲۵ء میں آگاہی دی تھی اور آج کے معاشرے میں یہ ساتوں گناہ اپنے شباب پر نظر آتے ہیں اور صدر گری کا یہ کہنا حق بجانب ہے کہ اگر ان ساتوں بیماریوں کی مکمل بیخ کنی نہیں کی جاتی ہے تو ہم ایک قوم کی حیثیت سے زندہ نہیں رہ سکتے۔

ــــ قومی آواز، لکھنؤ ۳۱ جولائی ۸۳ء

ایک اہم اور نوٹ کرنے کی بات یہ ہے کہ صدر گری نے ایک خاص وقت میں لکھی ہوئی تقریر کا پڑھنا ترک کر کے بہت سی باتیں زبانی بھی کہی تھیں۔ صدر جمہوریہ اہم مواقع پر جو تقریر کرتے ہیں وہ پہلے سے لکھی ہوئی ہوتی ہے اور غالباً وزیر اعظم کی مرضی اس میں شامل ہوتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جو باتیں انہوں نے زبانی کہیں ان میں وزیر اعظم کی مرضی شامل تھی یا نہیں؟ اگر ان کی مرضی شامل تھی اور کسی مصلحت سے وہ لکھی نہیں گئیں تو پھر اس کا رخ اور نتیجہ کچھ اور ہوگا اور اگر ان کی مرضی اس میں شامل نہ تھی بلکہ ان کی خوشی و ناخوشی کی پروا کیے بغیر صدر نے بطور خود کہی تھیں تو پھر اس کا رخ کچھ اور ہو جاتا ہے اور اس کا نتیجہ کچھ اور نکلتا ہے اگر بعض اخبارات کا یہ لکھنا صحیح ہے کہ وزیر اعظم اور کانگریس کو اس سے پریشانی ہوئی ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ باتیں وزیر اعظم کے علم میں لائے بغیر کہی گئیں تو اس کا رخ مرکزی حکومت کی موجودہ پالیسی کے خلاف ہو جاتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صدر اور وزیر اعظم کے نقطہ نظر میں ہم آہنگی نہیں ہے۔ اگر واقعہ یہی ہو تو یہ چیز مسز اندرا گاندھی اور حکمراں کانگریس کے لیے ایک حادثے سے کم نہیں ہے۔ اس پس منظر میں صدر جمہوریہ کا یہ کہنا:۔

"گاندھی جی نے جو راستہ ہمیں دکھایا تھا ہم اس سے بھٹک کر دور جا پڑے ہیں۔"

دراصل اس راستے پر کھلا اعتراض ہے جس پر بھارت اس وقت گامزن ہے۔ کیونکہ گاندھی جی نے جو راستہ دکھایا تھا وہ مذہب سے بے نیاز نہ تھا اور معاشی و اقتصادی طور پر بھی وہ اشتراکی نظام کے قائل نہ تھے

صدر کی یہ تقریر اس لائق ہے کہ اس کا مطالعہ کیا جائے۔ انھوں نے ملک کی موجودہ صورت حال پر صحیح تبصرہ کیا ہے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں وہ بات بھی یاد دلائی ہے جو عموماً سرگرم عمل لوگوں کے ذہن سے نکل جاتی ہے۔ انھوں نے کہا:۔

"جب تک ذہن تبدیل نہ ہو اس وقت تک صرف نیک خواہشات سے کوئی مفید کام انجام نہیں پا سکتا۔"

کوئی بھی نظام حیات اور کوئی بھی تحریک ہو جب تک اس کی موافقت میں ذہنی انقلاب نہ آ جائے اور لوگ ذہناً و عقیدۃً اس سے مطمئن نہ ہو جائیں وہ کامیاب نہیں ہو سکتی اور اگر کسی طرح کچھ کامیابی حاصل ہو بھی جائے تو وہ چند روزہ ہوگی۔

یکم اگست ۷۳ء

Only Title Printed at Shanker Press, Rampur.

ماہنامہ
رامپور
JAMIA NAGAR
NEW DELHI-110025
5/(4)
اکتوبر ۱۹۷۳ء

ماہنامہ

زندگی رامپور

مدیر:- سید احمد قادری

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۲ ڈالر
ہوائی ڈاک سے

سالانہ چندہ
ہندوستان سے -/۱۵
پاکستان سے -/۱۵
ششماہی
ہندوستان سے -/5
پاکستان سے -/5
قیمت فی پرچہ -/۱

جلد:- ۵۱ | رمضان المبارک ۹۳ھ مطابق اکتوبر ۷۳ء | شمارہ:- ۴

اس دائرہ ○ میں سرخ نشان کا مطلب ہے

کہ آپ کی مدت خریداری اس شمارہ کے ساتھ ختم ہو گئی ہے براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ اگر آپ کی طرف سے چندہ یا رسالہ بند کرنے کے لیے خط نہ مل سکا تو اگلا پرچہ ان شاء اللہ وی پی سے حاضر ہوگا۔ امید کہ وی پی وقت پر وصول فرمائیں گے۔

منیجر زندگی رامپور یوپی

مالک۔ جماعت اسلامی ہند، ایڈیٹر سید احمد قادری، پرنٹر پبلشر احمد حسن، مطبع [illegible]
مقام اشاعت دفتر زندگی رامپور یوپی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(امیر جماعت اسلامی ہند)

امیر جماعت اسلامی ہند، جناب محمد یوسف صاحب کا یہ پیغام حلقہ یوپی کے ایک تربیتی اجتماع میں پڑھ کر سنایا گیا۔ یہ اجتماع ۲۵ اگست سے ۳۱ اگست ۷۳ء تک زالپور میں ہوا تھا۔ اس میں یوپی کے وہ منتخب کارکن شریک تھے جو غیر مسلموں میں تحریک اسلامی کا کام کر رہے ہیں۔

رفقاء عزیز! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

میں اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں اور آپ کو دلی مبارک دیتا ہوں کہ اللہ نے آپ کو اقامت دین کے اس عظیم مقصد کے لیے جمع ہونے کی توفیق دی جس کی انجام دہی کے لیے ہر دور میں اللہ کے برگزیدہ اور صالح ترین بندے آتے رہے۔

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (فاطر ۲۴) — ہر قوم میں (اللہ کی جانب سے) کوئی نہ کوئی آگاہ کرنے والا ضرور گذرا ہے

اللہ تعالیٰ نے اس مقصد کے لیے انبیاء علیہم السلام کے بھیجنے ہی پر بس نہیں کیا، بلکہ اپنی کتابیں بھی نازل کیں، تاکہ غافل اور گمراہ انسان گمراہی و کجروی کی مہلک تاریکیوں سے نکل کر حق کی روشنی میں آئیں اور دنیا میں حق و انصاف قائم ہو

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ — بے شک ہم نے اپنے رسولوں کو کھلی ہوئی نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب

وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ — اور (حق کی) میزان اتاری تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔ (حدید ۲۵)

دوسرے انبیاء علیہم السلام کی طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی غیر مسلموں میں بھیجے گئے۔ بعثت کے وقت آپ پوری دنیا میں واحد مسلمان تھے حتیٰ کہ اہل کتاب بھی اسلام سے پھر گئے تھے۔ تمام دنیا کی ہدایت کے لیے قرآن مجید کا نزول شروع ہوا۔ قرآن مجید کی آیتیں اور سورتیں مسلسل ۲۳ سال تک یکے بعد دیگرے غافل اور گمراہ انسانوں کو جھنجھوڑنے، انہیں اللہ کا سچا بندہ بنانے، اور جو لوگ دعوت حق قبول کر چکے تھے، ان پر احکام الٰہی واضح کرنے اور ان کو منظم کرنے کے لیے نازل ہوتی رہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں بندگان خدا تک پہنچاتے رہے۔

الٓرٰ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ (ابراھیم ۱۰)

الف لام ر۔ یہ کتاب ہے جو ہم نے تمہاری طرف اتاری ہے، تاکہ لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر (حق کی) روشنی میں لے آؤ۔ اپنے رب کے اذن سے، زبردست اور حمید خدا کی راہ کی طرف۔

بعثت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ساری عمر اور اپنی ساری طاقت بندگانِ خدا تک خدا کا پیغام پہنچانے میں لگا دی۔ اس راہ میں آپ کو جن لرزہ خیز مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جن جاں گسل مشکلات سے دوچار ہوئے اور جو عظیم قربانیاں آپ نے دیں وہ تاریخ کے صفحات میں تفصیل سے ثبت ہیں اور آپ ان سے بخوبی واقف ہیں۔ سچ فرمایا سب سے بڑے سچے انسان صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ مجھے اللہ کی راہ میں اتنی اذیتیں دی گئیں جتنی کسی بھی انسان کو نہیں دی گئیں۔ ان مشکلات و مصائب کے علی الرغم آپ زندگی بھر اس مقصد عظیم میں لگے رہے تاآنکہ آپ کی وفات سے قبل ہی نہ صرف عرب میں دین حق کی عظمت لوگوں کے دلوں میں بیٹھ گئی تھی اور وہ حلقہ بگوش اسلام ہو چکے تھے، بلکہ ایک نظام عدل اور اسلامی سٹیٹ کا قیام بھی عمل میں آچکا تھا نیز اس صالح سوسائٹی کے قول و عمل کے ذریعے گردوپیش کے ممالک میں اسلام کی دعوت پہنچ چکی تھی۔

دعوت حق کے نتیجے میں جن بندگان خدا نے ایمان و اسلام کی دولت پائی وہ مسلم کہلائے

اور وہ بھی اس مقصدِ عظیم کی انجام دہی میں لگ گئے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لگے ہوئے تھے اس راہ میں انھوں نے ہر طرح کی مصیبتیں جھیلیں اور ہر قسم کی قربانیاں دیں۔ پھر انہیں افراد کے مجموعہ اور تنظیم کا نام "امت مسلمہ" قرار پایا اور اللہ نے شہادت حق کو اس امت کا مقصدِ وجود قرار دیا۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً	اور اسی طرح ہم نے تم کو بہترین امت
وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى	بنایا تاکہ تم انسانوں کے سامنے (حق کے)
النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ	گواہ بنو اور رسول تمہارے سامنے (حق کے)
عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (بقرہ: ۱۴۳)	گواہ بنیں۔

یعنی امت مسلمہ کی تشکیل اس لیے ہوئی ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت میں آپ کے مشن کی تکمیل کرے۔ دنیا کے غافل و گمراہ انسانوں تک اپنے قول و عمل سے اسلام کا پیغام پہنچائے اور اپنی زندگیوں سے اسلام کا سچا نمونہ انفرادی و اجتماعی زندگی میں پیش کرے۔ یہ کام اس امت کو رہتی دنیا تک دنیا کے ہر گوشے میں کرنا ہے۔

رفقائے عزیز! جس ملک میں ہم اور آپ رہ رہے ہیں۔ اس ملک کی ہدایت، رہبری و رہنمائی کی ذمہ داری اس ملک کی امت مسلمہ پر ہے۔ اس ملک میں غیر مسلم بھائی عظیم اکثریت میں ہیں جو نہ صرف یہ کہ اسلام سے بے خبر ہیں۔ بلکہ اس کے بارے میں بہت سی غلط فہمیوں اور بدگمانیوں میں مبتلا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس نسخۂ شفا سے فائدہ اٹھانے کی طرف متوجہ نہیں ہو رہے ہیں جس میں سارے انسانوں کے جملہ امراض کا یقینی اور مکمل علاج ہے اور جو ان کے حکیم و دانا اور مہربان خدا نے ان کی صلاح و فلاح کے لیے نازل کیا ہے اور جو تمام انبیاء کرام اور دنیا کی تمام الہامی کتابوں کا نچوڑ اور خلاصہ ہے۔ جب تک ہم ان بندگان خدا کی غلط فہمیاں اور بدگمانیاں دور نہیں کرتے۔ ان تک ان کے رحیم، حکیم اور عادل خدا کا پیغام پہنچا کر انہیں ان کے خالق سے نہیں ملاتے جو ان کا بھی رب ہے اور ہمارا بھی رب ہے۔ ان کا بھی آقا، مالک اور حاکم ہے اور ہمارا بھی جو قیامت کے دن مومنین صالحین کو ان کی نیک عملی کی وجہ سے ابدی انعام سے سرفراز فرمائے گا اور منکرین حق کو ان کی بدکرداری کی سزا دے گا۔ اس وقت تک یہ بے چارے جہالت و گمراہی کی تاریک وادیوں میں بھٹکتے رہیں گے۔ اور ان کے ساتھ یہ عظیم ملک تباہی و بربادی کے عمیق کھڈ میں جا گرے گا اور دنیا و آخرت کی اس ساری تباہی کے ہم ذمہ دار ہوں گے۔ لا قدر اللہ

رفقائے عزیز! آپ یہ بھی یاد رکھیں کہ عمل کی زبان قول کی زبان سے کہیں زیادہ موثر ہوتی ہے اگر ہم چاہتے ہیں کہ بندگان خدا حقیقۃً خدا کے بندے بن جائیں تو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ ہم خدا کے سچے بندے بنیں۔ اپنی زندگیوں کو اسلام کے سانچے میں ڈھالیں۔ اللہ کے بندوں کے خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم۔ سچے بہی خواہ اور انسانوں کے لیے رحمت ثابت ہوں۔ ہم سراپا خیر و صلاح اور مجسم رشد و ہدایت ہوں۔ ہم جہاں ہوں اسلام کا نور ہماری ذات سے پھیلے۔ لوگ ہمارے وجود میں حق کا مشاہدہ کریں۔ انہیں ہمارے اندر انسانیت و اخلاق کا اعلیٰ نمونہ ملے۔ ہمیں دیکھ کر غافل انسانوں کو خدا یاد آجائے۔ اس صورت میں اگر ہماری زبان خاموش ہوگی تو ہمارا پورا وجود حق کی شہادت دے رہا ہوگا اور زبان گویا ہوگی تو زبان اور وجود ہم آواز اور ہم رنگ ہوں گے۔ ایسی دعوت عند اللہ مقبول اور عند الناس مؤثر ہوگی لیکن اگر ہمارا وجود اسلام اور اسلامی کردار کا پیکر نہ ہوا تو ہم اپنے عمل سے اپنی دعوت کی تکذیب کر رہے ہوں گے ایسی دعوت کی بے اثری واضح کرنے کے لیے کسی دلیل اور کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔

برادران عزیز! اس مقصد عظیم کی انجام دہی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ آپ مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ اسلام کا سچا نمونہ بنانے کی کوشش کریں اور انہیں یاد دلائیں کہ ان کا مقصد وجود شہادت حق اور اقامت دین ہے۔ یہ کام فی الواقع پوری امت مسلمہ کے کرنے کا ہے۔ اور جس دن اس نے اپنے آپ کو اس مقصد عظیم کی انجام دہی کے لیے تیار کر لیا ملک و ملت کے افق سے تباہیوں کے بادل چھٹنا شروع ہو جائیں گے اور ملت اسلامیہ کے ساتھ یہ ملک بھی حق و صداقت، اور فلاح و کامرانی سے ہم کنار ہوگا۔

میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے اور آپ کو، سب متوسلین جماعت کو اور پوری امت مسلمہ کو اسلام کا سچا نمونہ اور حق کا داعی بننے کی توفیق عطا کرے تا کہ اللہ کی زمین اللہ کے نور سے روشن ہو اور نوع انسانی جہالت و گمراہی اور مصائب و آلام کی مہیب تاریکیوں سے نکل کر حق کی اکمل روشنی میں آجائے۔

رفقائے عزیز! ان کلمات کے ساتھ میں آپ سے رخصت ہوتا ہوں اور توقع رکھتا ہوں کہ آپ حضرات یہاں سے جا کر اپنے اپنے محلوں اور بستیوں میں غیر مسلم بھائیوں سے ربط و تعلق کو زیادہ سے زیادہ بڑھائیں گے۔ ان کے دکھ درد میں شریک ہوں گے۔ ان کے مسائل کو سمجھیں گے، ان کی ذہنی الجھنوں اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کریں گے۔ ان کو ان کے رحیم و کریم خدا کا پیغام حق اور نظام رحمت پہنچائیں گے

اور تزکیہ و تقویٰ اور خیر و صلاح کے امور میں اُن کے ساتھ تعاون کریں گے اور ان کا تعاون حاصل کریں گے۔ الحدیث سے جتنے معاونین آپ کو مل جائیں ان کو حاصل کرنے کی فکر کیجیے۔ اور اس طرح ملک میں خدا پرستی اور دین و اخلاق کی فضا بنائیے۔ اس سلسلے میں آپ کو جو جو کام کرنے ہیں وہ تفصیل سے پالیسی و پروگرام میں دیے ہوئے ہیں اور ان کی مزید توضیح اور اس راہ کے لیے مزید زادِ راہ آپ کو اس تربیتی اجتماع سے حاصل ہو سکے گا جس میں آپ شرکت کر رہے ہیں اور جس سے آپ ان شاء اللہ پوری یکسوئی اور توجہ سے استفادہ کی کوشش کریں گے۔ اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

رمضان اور اس مبارک مہینے کے بارے میں ہم اور آپ بہت کچھ جانتے ہیں۔ اس کے علاوہ اخبارات اور رسالوں میں رمضان کی فضیلتوں اور اس کے روزوں سے متعلق بکثرت مضامین اور مقالات شائع کیے جاتے ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ یہ مہینہ نیکیوں کی فصلِ بہار ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ اس مہینے میں دوسرے مہینوں کی بہ نسبت نفل کا ثواب فرض کے برابر اور ایک فرض کا ثواب ستر فرض کے برابر ملتا ہے ہم سب جانتے ہیں کہ یہ مرحمت و مواسات کا مہینہ ہے۔ صبر اور ضبطِ نفس کا مہینہ ہے تراویح اور تلاوتِ قرآن کا مہینہ ہے تسبیح و تہلیل اور ذکر و استغفار کا مہینہ ہے۔ اسی مہینے میں شبِ قدر ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اسی مہینے میں آخری عشرے کا مسنون اعتکاف ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ غیبت جھوٹ دنگا فساد گالی گلوچ سے روزوں کا اجر و ثواب اور ان کی روحانیت اور انسانی زندگی پر ان کے بہتر اثرات ضائع ہو جاتے ہیں غارت ہو جاتے ہیں لیکن اے قارئینِ محترم! ہم جو کچھ جانتے ہیں اور جو کچھ دوسروں کو بتاتے ہیں کیا خود اس پر عمل کرتے ہیں؟ یہ ہے وہ اصل سوال جس پر مجھے اور آپ سب کو غور کرنا ہے اور صرف غور ہی نہیں کرنا ہے بلکہ عمل کرکے اس مبارک مہینے کی برکتیں حاصل کرنی ہیں (سعید احمد قادری)

مالک پکارتا ہے

مولانا حبیب اللہ صاحب

(۴)

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ قَالَ أُوحِيَ إِلَيَّ وَلَمْ يُوحَ إِلَيْهِ شَيْءٌ وَمَنْ قَالَ سَأُنْزِلُ مِثْلَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ ۗ وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الظَّالِمُونَ فِي غَمَرَاتِ الْمَوْتِ وَالْمَلَائِكَةُ بَاسِطُو أَيْدِيهِمْ أَخْرِجُوا أَنْفُسَكُمُ ۖ الْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ آيَاتِهِ تَسْتَكْبِرُونَ ۝ وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فُرَادَىٰ كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَتَرَكْتُمْ مَا خَوَّلْنَاكُمْ وَرَاءَ ظُهُورِكُمْ ۖ وَمَا نَرَىٰ مَعَكُمْ شُفَعَاءَكُمُ الَّذِينَ زَعَمْتُمْ أَنَّهُمْ فِيكُمْ شُرَكَاءُ ۚ لَقَدْ تَقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَا كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ ۝ إِنَّ اللَّهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوَىٰ ۖ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ۚ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ ۖ فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ ۝ (الانعام آیت ۹۴ تا ۹۶)

اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا کہے مجھ کو وحی آتی ہے اور اس کو وحی نہیں آتی اور جو کہے میں اتارتا ہوں اس کے برابر جو اللہ نے اتارا۔ اور کبھی تو دیکھے جب ظالم موت کی بے ہوشی میں ہوں اور فرشتے ہاتھ کھول رہے ہیں کہ نکالو اپنی جان آج تم کو جزا ملیگی ذلت کی مار۔ اس پر کہ اللہ پر جھوٹ باتیں باندھتے تھے اور اس کی آیتوں سے تکبر کرتے تھے اور تم ہمارے پاس آئے ایک ایک کرکے جیسے ہم نے پیدا کیے تھے پہلی بار اور جو اسباب ہم نے دیے تھے اسے پیٹھ پیچھے چھوڑ گئے۔ اور ہم تمہارے ساتھ ان سفارش والوں کو نہیں دیکھتے جن کو تم

بتاتے تھے کہ ان کا تم میں ساجھا ہے۔ تمہارا آپس کا رشتہ ٹوٹ گیا اور وہ دعوے جو تم کیے جاتے رہے۔ اللہ دانہ اور گٹھلی کو پھاڑتا ہے۔ مردہ سے زندہ کو نکالتا ہے اور زندہ سے مردہ نکالنے والا ہے۔ یہی اللہ ہے، تو تم کہاں پھرے جاتے ہو؟"

اللہ کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مکے کے لوگوں سے فرمایا کرتے تھے کہ ہم تمہارے درمیان چالیس سال تک رہے ہیں۔ سچ بتاؤ کیا کبھی کسی انسان کے معاملے میں ہمیں جھوٹ بولتے سنا؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں۔ تو پھر تم کیسے باور کرلیتے ہو کہ ہم اللہ کے معاملے میں جھوٹ بولیں گے۔ لیکن اس کے باوجود کچھ اللہ کے بندے جو شیطان اور نفس کے دھوکے میں پڑکر باؤلے ہو جاتے ہیں۔ مالک کے کلام کو رد کرنے کے لیے بڑی ڈھٹائی کے ساتھ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ ہم لوگوں پر اللہ کی طرف سے وحی آتی ہے حالانکہ وحی نہیں آئی ہوتی۔ کبھی کہتے ہیں کہ جیسا کلام اللہ نے اتارا ہے ایسا کلام ہم بھی اتار سکتے ہیں۔ یہ صریح جھوٹ ہے جو وہ اللہ کے معاملے میں بولتے ہیں۔ مالک ہمیں آگاہ کرتا ہے کہ ان سے بڑا ظالم کون ہوگا؟ یہی سب سے بڑے ظالم ہیں۔ آج انہیں مہلت ہے جتنا چاہیں ظلم کرلیں۔ کل جب مہلت ختم ہو جائے گی اور ان پر موت کی بے ہوشی طاری ہو چکی ہوگی تو اس وقت کا منظر بڑا ہی عبرتناک ہوگا۔ یہ تو موت کی بے ہوشی میں ہوں گے اور موت کے فرشتے ہاتھ کھول رہے ہوں گے کہ نکالو اپنی جان۔ آج تم کو سزا ملے گی۔ ذلت کی مار۔۔۔ اس بات پر کہ اللہ پر جھوٹ باتیں باندھتے تھے۔ اس کی آیتوں سے تکبر کرتے تھے۔ آخر تم ہمارے پاس آئے، ایک ایک کرکے جیسے ہم نے پہلی بار پیدا کیے تھے۔ اور جو برتنے اور کام میں لانے کے سامان واسباب ہم نے تمہیں دنیا میں دیے تھے، وہ سب وہیں چھوڑ کر آئے ہو، اور آج ہم تمہارے ساتھ اُن سفارشیوں کو نہیں دیکھتے جن کے بارے میں تم بتاتے تھے کہ تم میں ان کا بھی ساجھا ہے، تم تنہا اپنے مالک کے نہیں ہو۔ تم میں ان کی بھی شرکت ہے۔ آج ان سے تمہارا رشتہ ٹوٹ گیا اور وہ سارے دعوے جو تم کرتے رہے جاتے رہے۔ اے میرے بندو! تم اپنے اندر اور اپنے گردوپیش اپنے مالک کی قدرت کا مشاہدہ کرو۔ سچ بتاؤ مٹی کے نیچے دبے ہوئے دانے اور گٹھلی کو کون پھاڑتا ہے؟ اس سے ہرا بھرا انکھوا کون نکالتا ہے؟ مردہ سے زندہ اور زندہ سے مردہ کو نکالنے والا کون ہے؟ اللہ تمہارا مالک۔۔۔ یہی ہے اللہ۔ تو پھر اس مشاہدے کے باوجود تم کہاں پھرے جارہے ہو؟

عالم ہیں۔ ڈاکٹر حسن ذکی' انھوں نے لکھا ہے ابتدائے اسلام میں انسانی یا حیوانی تصاویر بنانا اس لیے نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا کہ اس عمل سے شرک کی پھر سے ابتدا نہ ہوجائے لہٰذا اسی لیے حضورؐ سے احادیث منسوب کرکے بیان کر دی گئی ہیں ورنہ تصویروں کی حرمت اسلام کا کوئی بنیادی عقیدہ نہیں ہے۔ یہ قید مسلمانوں کو شرک سے روکنے کے لیے وضع کی گئی تھی۔ جب مسلمانوں نے بتوں سے متعلق شرک کو خیرباد کہہ دیا تو یہ حرمت باقی نہیں رہی۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے قبروں کی زیارت کے سلسلے میں آئی ہے۔ ص۳۵

ایک اور مصری عالم ہیں شیخ شاؤس' انھوں نے کہا ہے کہ تصویروں کی حرمت ہر حال' ہر موقع اور ہر ملک کے لیے ثابت نہیں ہے۔ تصویروں کی حرمت کا تصور اس لیے پیدا ہوا کہ یہ شرک اور بت پرستی کے جذبات کو فروغ دینے کا سبب بن سکتی ہیں۔۔۔۔ ورنہ اگر تصویر حرام ہوتی تو قرآن اس کی حرمت کا اعلان کرتا اور اسلامی فن تصویر نام کی کوئی شئے قطعًا وجود میں نہ آتی۔ ص۳۵

تصویر کشی اور مجسمہ سازی کے اس مغربی اور غیر اسلامی آرٹ کو اسلامی آرٹ ثابت کرنے اور اس کو مسلمانوں میں رائج کرنے کے لیے احادیثِ رسولؐ اور اقوالِ فقہاء پر جو رائے زنی نہیں' نشتر زنی کی گئی ہے وہ کسی گہرے مطالعہ کا نتیجہ ہے نہ کسی غور و فکر کا ثمرہ' بلکہ حسن ذکی اور شیخ شاؤس نے فادروں پر (FATHERS) پر اعتماد و یقین کرکے جس ذہنی افلاس اور مرعوبیت کا ثبوت دیا ہے اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔

جو احادیثِ رسولؐ پوری چھان بین کے بعد صحاح میں نقل و روایت کی گئی ہیں اور ان سے فقہاء نے جو نتائج اخذ کیے ہیں ان پر مستشرقین کے اظہار خیال کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے۔ ہم اس کا خلاصہ پیش کرکے ان کی غلط اندیشی اور غلط بیانی واضح کریں گے۔

۱۔ ایک تو یہ کہا گیا ہے کہ بت پرستی کی پھر سے ابتدا ہوجانے کے اندیشے کی وجہ سے انسانی یا حیوانی تصاویر بنانا نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

۲۔ دوسری بات یہ کہ غالبًا حضورؐ سے احادیث منسوب کرکے بیان کر دی گئی ہیں۔

۳۔ تصویروں کی حرمت اسلام کا کوئی بنیادی عقیدہ نہیں ہے۔

۴۔ یہ (تصویروں کی حرمت) ایسی ہی بات ہے جیسے قبروں کی زیارت کے سلسلے میں آئی ہے۔

۵۔ تصویروں کی حرمت بہرحال ہر موقع اور ہر ملک کے لیے ثابت نہیں ہے
۶۔ اگر تصویر حرام ہوتی تو قرآن اس کا اعلان کرتا۔
غور کیجیے، پچھلے دلائل کی طرح، ان میں سے کوئی ایک بات بھی دلیل اور ثبوت بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔

ہم ان سب پر گفتگو کا آغاز تیسرے نمبر سے کریں گے۔ پہلے اور دوسرے ثبوت کا جائزہ آخر میں لیا جائے گا۔

کہنے والے نے کہا ہے کہ "تصویروں کی حرمت اسلام کا کوئی بنیادی عقیدہ نہیں ہے" اس ثبوت کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوا کہ موصوف بھی ـــــ صاحب قول کی طرح ـــ عقیدہ اور حکم کے فرق سے نا واقف ہیں۔ اس لیے ہم گوش گزار کریں گے کہ تصویر کی حرمت شریعت محمدی کے احکام و قوانین میں ایک ضابطہ اور ایک حکم ہے جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

کہا گیا ہے کہ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے قبروں کی زیارت کے سلسلے میں آئی ہے۔ اس قول میں ہوشیارانہ سادگی کی جو صنعت ہے اس کو نقل کرتے وقت انٹرویو دینے والے صاحب نے سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اس لیے کہ قبروں کی زیارت کی ممانعت کے بعد صریح الفاظ میں اجازت دی گئی تھی اور اس کی حکمت بھی سمجھ میں آتی ہے۔ تو کیا ایسی ہی بات تصویروں کی حرمت کی بھی ہے؟ اگر ایسا ہے تو کوئی محقق اس کے ثبوت میں کوئی حدیث پیش کریں۔ اس کے علاوہ موصوف تو ایک جگہ حرمت تصویر کی احادیث کو موضوع لکھ چکے ہیں اور یہاں بھی ان کو حضور سے منسوب کردہ لکھا ہے۔ پس جب مسئلہ تصویر کے بارے میں کوئی صحیح احادیث ہی نہیں تو اس کو زیارت قبور کے مسئلے کی مانند کہنے کی کیا ضرورت پیش آئی؟ دراصل ان مختلف اور متضاد اقوال کو نقل کرتے وقت سمجھ بوجھ سے کام نہیں لیا گیا۔

اور سنیے:۔ "تصویروں کی حرمت بہرحال، ہر موقع اور ہر ملک کے لیے ثابت نہیں ہے" اصل میں گویا وہ یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ اب وہ حالات بدل گئے، زمانہ ترقی کے اوج کمال کو پہنچ گیا اور لوگ ہوشیار و بیدار ہو گئے۔ اب بت پرستی کے خطرات کہاں باقی رہ گئے؟ کس قدر بے بنیاد ہے یہ دعویٰ۔ آج دنیا کا کون سا ملک، کون سا خطہ اور کون سی قوم ہے جو بت پرستی کے خطرات سے

محفوظ ہو گئی ہے حتیٰ کہ مسلمانوں کی خاصی تعداد بھی مخلوق پرستی کی آفتوں اور تصاویر کی فتنہ سامانیوں سے محفوظ نہیں ہے۔ آج تصویروں کے ذریعے جیسے شمار اور طرح طرح کے فتنے پھیلتے جا رہے ہیں وہ اتنے بڑے پیمانے پر اتنی منصوبہ بندی کے ساتھ اور اتنی ترقی یافتہ شکل میں کبھی نہ پھیل سکے۔ تعجب اور سخت تعجب ہے کہ تصاویر کی تباہ کاریاں اور فتنہ انگیزیاں ان دیدہ وروں کو نظر نہیں آتیں، یا انھوں نے اس خطرہ کو ماضی پر کوئی آنند بھون اور شانتی نگر دریافت کر لیا ہے اور وہاں سے یہ خبر دی جا رہی ہے جہاں کی جنتا پر شیطان کا بس نہیں کہ وہ تصویروں کے ذریعے، ان کے درمیان نفرت و عداوت کا بیج بو سکے، فساد ڈلوا سکا ور اسی طرح کی دوری اور گمراہیاں پیدا کرنے کے لیے تصویر کو استعمال کر سکے۔

ایک اور دلیل دیکھیے :۔ اگر تصویر حرام ہوتی تو قرآن اس کا اعلان کرتا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ حدیث رسول کو دلیل شرعی تسلیم نہ کیا جائے۔ حدیث کے دلیل و حجت ہونے سے انکار کر دیا جائے تو مسئلہ تصویر ہی کیا ایک سے زائد مسائل ہیں جن پر عقیدہ رکھنا اور ان پر عمل کرنا فرض نہ رہ جائے۔ نماز ہی کو لے لیجیے۔ قرآن مجید میں قیام، رکوع، سجود اور قعود کو اس طرح کہاں بتایا گیا ہے جس طرح عہد رسالت سے آج تک ادا کی جا رہی ہے اور جو دعائیں اس میں پڑھی جاتی ہیں کیا وہ بھی قرآن مجید میں ہیں یا حضور نے تعلیم دی جس پر بلا اختلاف عمل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اس انداز فکر سے نماز میں کتنی جولانیاں پیدا ہو جائے گی کہ گردن جھکا کر کچھ آیات یا اذکار پڑھ لیے اور نماز ہو گئی۔ بیٹھے کھڑے لیٹے جیسے چاہا چند آیات پڑھ لیں اور نماز سے فارغ ہو گئے۔

اس انداز سے سوچنے والے تمام لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ پوری کی پوری قرآن پاک کی تفسیر ہے اور آپ کے اقوال و ارشادات اسی کتاب ہدایت کی تشریح و ترجمانی ہیں۔ تصویر کی حرمت کا حکم صرف حضور نے قرآن پر کوئی اضافہ نہیں فرمایا ہے بلکہ مخلوق پرستی، بت پرستی اور خالقیت میں مشابہت اختیار کرنے کی حرمت و ممانعت کا جو حکم قرآن مجید میں دیا گیا ہے اسی کی آئینہ دار ہیں وہ احادیث جن میں تصویروں کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

ملاحظہ ہو یہ دلیل :۔ غالباً اسی لیے حضور سے احادیث منسوب کر کے بیان کر دی گئی ہیں یہ انداز تحقیق کتنا مضحکہ خیز ہے جو معمولی اردو داں بھی جانتا ہے کہ "غالباً" کے لفظ سے صرف شک

کا فائدہ حاصل ہوتا ہے اور یہ لفظ غیر یقینی اخبار و معلومات کے لیے بولا جاتا ہے۔ لیکن یہاں "اغلباً" سے احادیث رسولؐ کے موضوع ہونے کا فیصلہ صادر فرمایا جا رہا ہے، حالانکہ اس کے لیے ایک مستقل فن ہے جس سے ہر حدیث جانچی اور پرکھی جا سکتی ہے۔ حرمت تصاویر کی تمام احادیث تو درکنار کوئی ایک حدیث بھی موصوف اور ان کے محققین موضوع اور اس کا حضورؐ سے غلط منسوب ہونا ثابت نہیں کر سکتے۔ موصوف کو یہ بات ضرور معلوم ہوگی کہ احادیث رسولؐ کے راوی مقدس صحابہ کرام ہیں۔ ان کے تابعین اور تبع تابعین نے یہ امانت محدثینؒ کے گروہ تک منتقل کی جن کا صدق و عدل معلوم اور مسلم ہے۔ ان کے مقابل میں احادیث رسولؐ کو ساقط الاعتبار اور موضوع قرار دینے والے مستشرقین ہیں، جن کا کردار، مبلغ علم اور امانت و دیانت سب کچھ مشتبہ، بلکہ ناقابل اعتبار ہے۔ ان کے سُر میں سُر ملانا کسی صاحب علم مسلمان کو زیب نہیں دیتا۔

یہ دلیل بھی سنیے :— "وہ تصویریں اور مورتیاں جو انصاب یا اصنام ہیں۔ ایسی ہی تصویروں کو حضورؐ نے اپنی پاک حدیثوں میں حرام قرار دیا ہے "...... اور "ابتدائے اسلام میں انسانی یا حیوانی تصاویر بنانا اس لیے نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا کہ اس عمل سے شرک کی پھر سے ابتدا نہ ہو جائے "

یہ مجرد دعوے ہیں جنہیں دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ جن احادیث میں تحریم تصاویر کی کسی علت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ان میں صرف بت پرستی ہی کو علت قرار نہیں دیا گیا ہے بلکہ اس کی دوسری علتیں بھی ہیں، مثال کے طور پر اللہ کی تخلیق سے مشابہت اختیار کرنے کو بھی حرمت کی علت قرار دیا گیا ہے۔ ہم یہاں چند احادیث نقل کرتے ہیں جن سے ہر قسم کی انسانی و حیوانی تصاویر بنانے کی حرمت ثابت ہوتی ہے۔ عام ازیں کہ وہ انصاب و اصنام کی ہوں یا کسی اور کی۔ احادیث ملاحظہ کریں :—

۱۔ عن عائشۃ ام المومنین	ام المومنین حضرت عائشہؓ سے روایت
ان ام حبیبۃ وام سلمۃ ذکرتا	ہے کہ حضرت ام حبیبہؓ اور حضرت ام سلمہؓ
کنیسۃ رأینھا بالحبشۃ فیھا	نے حبشہ میں ایک کنیسہ دیکھا جس میں تصویریں
تصاویر فذکرتا للنبی صلی اللہ	تھیں۔ انھوں نے اس کا ذکر نبی صلی اللہ علیہ

عليه وسلم فقال ان اولئك
اذا كان فيهم الرجل الصالح
فمات بنوا على قبره مسجدا
وصوروا فيه تلك الصور
فاولئك شرار الخلق عند
الله يوم القيامة (مسلم كتاب الجنائز)

وسلم سے کیا۔ آپ نے فرمایا ان کا حال
تھا کہ جب ان میں کوئی شخص نیک ہوتا اور
وہ مر جاتا تو اس کی قبر پر عبادت گاہ
بنا لیتے اور اس میں یہ تصویریں بنا لیتے تھے
یہ لوگ قیامت کے دن اللہ کے نزدیک بدترین
خلائق ہوں گے۔

٢- عن ابی زرعة قال دخلت
مع ابی هريرة دارا بالمدينة
فرای اعلاها مصورا يصور
قال سمعت رسول الله صلى الله
عليه وسلم يقول ومن اظلم
ممن ذهب يخلق كخلقی
فليخلقوا حبة وليخلقوا
ذرة
(بخاری، کتاب اللباس)

ابو زرعہ بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت
ابو ہریرہؓ کے ساتھ مدینے میں ایک مکان میں
داخل ہوا۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے دیکھا کہ ایک
مصور مکان کے اوپر تصویر بنا رہا ہے۔ اس
پر انھوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا
ہے کہ اس شخص سے بڑا ظالم کون ہوگا جو میری
تخلیق کی طرح تخلیق کرنا چاہتا ہے، تو یہ لوگ
ایک دانہ اور ایک چیونٹی تو بنا کر دکھیں۔

عن ابی محمد الهذلی
عن علی قال كان رسول الله
صلى الله عليه وسلم فی جنازة
فقال ايكم ينطلق الى المدينة
فلا يدع بها وثنا الا كسره و
لا قبرا الا سواه ولا صورة
الا لطخها فقال رجل انا يا رسول
الله فانطلق فهاب اهل المدينة

ابو محمد ہذلی حضرت علیؓ سے روایت کرتے
ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک جنازہ
میں شریک تھے۔ آپ نے فرمایا تم میں سے کون
ہے جو مدینہ جا کر وہاں کوئی بت نہ چھوڑے
جسے توڑ نہ دے اور نہ کوئی قبر جسے زمین کے
برابر نہ کر دے اور کوئی تصویر نہ چھوڑے جسے
مٹا نہ دے۔ ایک شخص نے عرض کیا کہ اے
اللہ کے رسول میں اس کے لیے تیار ہوں چنانچہ

فرجع فقال علي انا انطلق
يا رسول الله قال فانطلق
فانطلق ثم رجع فقال يا رسول
الله لم ادع بها وثنا الا كسرته
ولا قبرا الا سويته ولا صورة
الا لطختها ثم قال رسول الله
صلى الله عليه وسلم من
عاد لصنعة شيء من هذا
فقد كفر بما انزل على محمد
(مسلم کتاب الجنائز ج ۱)

۴۔ عن سعيد بن الحسن
قال كنت عند ابن عباس
رضي الله عنهما اذ اتاه رجل
فقال يا اباعباس اني انسان
انما معيشتي من صنعة يدي
واني اصنع هذه التصاوير
فقال ابن عباس لا احدثك
الا ما سمعت رسول الله صلى
الله عليه وسلم يقول من صور
صورة فان الله معذبه حتى
ينفخ فيها الروح وليس بنافخ
ابدا فربا الرجل ربوة شديدة
واصفر وجهه فقال ويحك

وہ گیا مگر وہ اہل مدینہ کے ڈر سے واپس آ گیا
پھر حضرت علی رضؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ
میں جاتا ہوں۔ آپ نے فرمایا۔ جاؤ چنانچہ
حضرت علی گئے اور واپس آ کر کہا۔ میں نے
کوئی بت نہیں چھوڑا جسے توڑ نہ دیا ہو۔
کوئی قبر نہیں چھوڑی جسے برابر نہ کر دیا ہو
اور کوئی تصویر نہیں چھوڑی جسے مٹا نہ دیا ہو
حضورؐ نے فرمایا۔ اب اگر کسی نے ان میں سے
کوئی چیز بنائی تو اس نے اس تعلیم سے انکار
کیا جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل ہوئی ہے

سعید بن ابوالحسن کا بیان ہے کہ میں ابن
عباس کے پاس بیٹھا تھا کہ اتنے میں ایک شخص
آیا اور اس نے کہا کہ اے ابوعباس میں ایک
ایسا شخص ہوں جو اپنے ہاتھ سے روزی کماتا
ہے۔ میں یہ تصویریں بناتا ہوں۔ (یہ سنکر)
ابن عباس نے کہا کہ میں تم سے وہی بیان
کروں گا جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم کو فرماتے سنا ہے۔ میں نے آپ کو یہ
فرماتے سنا جو شخص تصویر بنائے گا اللہ اسے
عذاب دے گا یہاں تک کہ وہ اس میں روح
پھونکے اور وہ اس میں کبھی روح نہ پھونک
سکے گا۔ یہ سنکر وہ سخت برہم ہوا اور اس کا
چہرہ زرد ہو گیا۔ اس پر ابن عباس رضؓ نے کہا

ان ابیت الا ان تصنع فعلیک هذا الشجر وکل شیء لیس فیه روح (بخاری ۔ مسلم)

اگر تم کو تصویر بنانا ہی ہے تو اس درخت کی اور ہر چیز کی تصویر بناؤ جس میں روح نہ ہو۔

۵۔ عن عبد اللہ بن عمر ان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم قال ان الذین یصنعون هذه الصور یعذبون یوم القیامة یقال لهم احیوا ما خلقتم (بخاری و مسلم)

عبد اللہ بن عمرؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو لوگ یہ تصویریں بناتے ہیں ان کو قیامت کے دن عذاب دیا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ تم نے جو کچھ بنایا ہے اسے زندہ کرو۔

۶۔ عن عائشة رضی اللہ عنها انها اشترت نمرقة فیها تصاویر فقام النبی صلی اللہ علیه وسلم علی الباب ولم یدخل فقلت اتوب الی اللہ مما اذنبت قال ما هذه النمرقة قلت لتجلس علیها وتوسدها قال ان اصحاب هذه الصور یعذبون یوم القیامة یقال لهم احیوا ما خلقتم وان الملائکة لا تدخل بیتا فیه الصورة

(مسلم کتاب اللباس صفحہ ۲۰۱)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ انہوں نے ایک تکیہ خریدا جس میں تصویریں تھیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم دروازے میں کھڑے ہو گئے اور اندر داخل نہیں ہوئے۔ میں نے کہا میں اللہ سے توبہ کرتی ہوں اس گناہ پر جو میں نے کیا۔ آپؐ نے فرمایا۔ یہ تکیہ کیسا ہے؟ میں نے عرض کیا یہ اس لیے ہے کہ آپ یہاں تشریف رکھیں اور اس پر ٹیک لگائیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ ان تصویروں کے بنانے والوں کو قیامت کے دن عذاب دیا جائے گا۔ ان سے کہا جائے گا کہ جو کچھ تم نے بنایا ہے اس کو زندہ کرو۔ اور فرشتے (رحمت کے فرشتے) ایسے گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں تصویریں ہوں۔

عن ابن عباس عن ابی طلحة ان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم قال لا تدخل الملائکة بیتا

ابن عباسؓ ابو طلحہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فرشتے (رحمت کے فرشتے) کسی ایسے گھر میں داخل نہیں ہوتے

فیہ صورۃ ..... الا رقما فی ثوب (مسلم ج ۲ صلنے)

جس میں کوئی تصویر ہو ..... مگر کسی کپڑے میں کڑھی ہو (تو اس کا پردہ لٹکانا جائز ہے)

(۸) عن القاسم انہ سمع عائشۃ تقول دخل علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وقد سترت سھوۃ لی بقرام فیہ تماثیل فلما رآہ ھتکہ وتلون وجھہ وقال یا عائشۃ اشد الناس عذابا عند اللہ یوم القیمۃ الذین یضاھون بخلق اللہ تعالی قالت عائشۃ فقطعناہ فجعلنا منہ وسادۃ او وسادتین (مسلم ج ۲ صلنے)

قاسم سے مروی ہے کہ انھوں نے حضرت عائشہؓ کو فرماتے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں تشریف لائے اور میں نے ایک پردہ لٹکا رکھا تھا جس میں تصویریں تھیں جب آپ نے اس کو دیکھا تو اس کو پھاڑ دیا اور آپ کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور فرمایا اے عائشہ! قیامت کے دن سب سے زیادہ سخت عذاب ان لوگوں کو دیا جائے گا جو اللہ کی (صنعت) خلق سے مشابہت پیدا کرنا چاہتے ہیں (یا) اللہ کی مخلوق جیسی چیز بنانا چاہتے ہیں۔ عائشہؓ

ہم نے طولِ بیان سے بچنے کے لیے یہ چند احادیث یہاں نقل کی ہیں۔ ان کے علاوہ اس مضمون کی بہت سی احادیث ہیں جن کی سندیں قوی ہیں جو صحیح اور مرفوع ہیں اور جو اپنے معنے میں متواتر ہیں۔ ان احادیث سے بالکل واضح طور پر یہ بات سمجھی جا سکتی ہے کہ انسانی اور حیوانی تصویریں حرام اور بے جان کی تصویریں حلال اور جائز ہیں۔ ان کی یہ توجیہ کہ بت پرستی کی روک تھام کے لیے یہ احکام دیے گئے اور اسی لیے انسانی یا حیوانی تصاویر بنانا نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ تصاویر کے معاملے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت امت کے لیے ایک ضابطہ ہے جس پر اکابر صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور تمام ائمہ حدیث و فقہ کا عمل اور قول منقول ہے جو نہایت اختصار کے ساتھ درج ذیل ہے

قال عمر رضی اللہ عنہ انا لا ندخل فی کنائسکم من اجل التماثیل التی فیھا الصور (بخاری کتاب الصلوۃ)

حضرت عمرؓ نے فرمایا ہم تمہارے کنیسوں میں اس وجہ سے داخل نہیں ہوتے کہ ان میں تصویریں ہیں۔

عن ابی الھیاج الاسدی

ابو ہیاج اسدی کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے

قال لي علي الا ابعثك على ما	مجھ سے کہا کیا میں تم کو اس مہم پر نہ بھیجوں جس
بعثني رسول الله صلى الله عليه	پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو بھیجا
وسلم الا تدع تمثالا الا طمسته[1]	تھا وہ یہ کہ تم کوئی مجسمہ نہ چھوڑو جس کو مٹا نہ دو
و عن حنش الكناني عن علي انه	حنش کنانی بیان کرتے ہیں کہ حضرت
بعث عامل شرطته فقال اتدري	علیؓ نے اپنے پولس انسپکٹر سے کہا کیا تم جانتے
على ما ابعثك على ما بعثني عليه	ہو کہ میں تم کو کس مہم پر بھیج رہا ہوں۔ اس
رسول الله صلى الله عليه وسلم	مہم پر جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
ان انحت كل صورة وان اسوي	مجھ کو بھیجا تھا وہ یہ کہ میں ہر تصویر کو مٹا دوں
كل قبر (بخاری کتاب الصلوٰۃ)	اور ہر قبر کو برابر کر دوں۔
كان ابن عباس يصلي	حضرت عبد اللہ بن عباس گرجا میں نماز
في بيعة الا بيعة فيها	پڑھ لیتے تھے مگر ایسے گرجا میں نہ پڑھتے جن
تماثيل	میں تصویریں ہوں۔

ان عملی شواہد پر غور کیجیے۔ صاف ظاہر ہے کہ صحابہ کرام نے اسے شرعی قانون اور اسلامی ضابطہ قرار دیا۔ فقہائے اسلام نے بھی اسے ضابطہ ہی سمجھا ہے۔ واضح رہے کہ حکم شرعی اور قانون اسلامی کے لیے مطلق دلیل شرعی کافی ہے۔ شرعی دلائل چار ہیں۔ کتاب اللہ، سنت، اجماع اور قیاس —— اس سے جو قول و عمل مستند نہ ہو وہ نا قابل قبول اور قابل رد ہے۔

احادیث نبوی اور تعامل صحابہ کی اس تفصیل کے بعد فقہاء کے اقوال کا بھی ایک مختصر خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

قال اصحابنا وغيرهم	امام نووی کہتے ہیں کہ ہمارے اصحاب شافعیہ
من العلماء تصوير صورة	اور دوسرے علماء کا قول یہ ہے کہ جاندار کی
الحيوان حرام شديد التحريم	تصویر بنانا حرام اور سخت حرام ہے اور وہ
وهو من الكبائر لانه	کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔ اس لیے کہ اس
متوعد عليه بهذا الوعيد الشديد	پر سخت وعید آئی ہے جو احادیث میں مذکور ہے

[1] مسلم بحوالہ ریاض الصالحین مطبوعہ مصر ص ۴۳۵

المذكور في الاحاديث و
سواء صنعه بما يمتهن
او بغيره فصنعته حرام بكل
حال لان فيه مضاهاة
لخلق الله تعالى وسواء ما
كان في ثوب او بساط او
درهم او دينار او فلس او
حائط او غيرها واما
تصوير صورة الشجر ورحال
الابل وغير ذالك مماليس
فيه صورة الحيوان فليس بحرام
وهذا نفس حكم التصوير
واما اتخاذ المصور فيه صورة
حيوان فان كان معلقا على
حائط او ثوبا ملبوسا او عمامة
ونحو ذالك مما لا يعد ممتهنا
فهو حرام ولا فرق في هذا
كله بين ماله ظل وما لا
ظل له هذا تلخيص مذهبنا
في المسئلة. وقال جماهير
العلماء من الصحابة والتابعين
ومن بعدهم ومذهب الثوري
ومالك وابي حنيفة وغيرهم

چاہیے بنانے والے نے اس کو ایسے استعمال
کے لیے بنایا ہو جس کی تذلیل ہوتی ہو یا کسی
اور استعمال کے لیے بنایا ہو۔ ایسی تصویر کا بنانا
ہر حال میں حرام ہے۔ اس لیے کہ اس میں
باری تعالیٰ کی صفت تخلیق سے مشابہت اختیار
کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور خواہ تصویر میں
کپڑے میں، فرش میں، درہم و دینار میں، پیسے
میں، یا برتن اور دیوار وغیرہ میں ہوں۔ البتہ
درختوں، اونٹوں کے کجاووں اور اس طرح
کی دوسری چیزوں کی تصویریں جن میں
کسی جاندار کی تصویر نہ ہو تو اس طرح کی
تصویریں بنانا حرام نہیں ہے۔ یہ حکم تو نفس
تصویر بنانے کے بارے میں ہے۔ رہا ایسی مصور
چیز کا رکھنا اور استعمال کرنا جس میں جاندار کی
تصویر ہو تو اگر وہ دیوار میں ہو، یا پہننے کے
کپڑے یا پگڑی اور اسی طرح کی دوسری چیزوں
میں ہو جس سے اس کی تذلیل نہ ہوتی ہو تو ایسی
صورت میں حرام ہے اور اگر وہ فرش میں ہو
جو پامال ہوتا ہو یا تکیے میں ہو جس سے اس کی
تذلیل ہوتی ہو تو حرام نہیں ہے ۔۔۔۔ ان
تمام صورتوں میں اس امر میں کوئی فرق نہیں
ہے کہ تصویر سایہ دار ہو یا سایہ دار نہ ہو۔ یہ
ہے ہمارے اصحاب شوافع کے مسلک کا خلاصہ

...... وقال الزهري ......
وكذالك استعمال ما هي فيه
...... واجمعوا على منع ما
كان له ظل ووجوب تغييره
وقال القاضي الا ما ورد في
اللعب بالبنات لصغار البنات
والرخصة في ذالك ولكن كره
مالك شرى الرجل ذالك
لابنته (مسلم ج ۲ ص۱۹۹)

قال ابن العربي حاصل ما
في اتخاذ الصور انها ان كانت
ذات اجسام حرم بالاجماع
وان كانت رقما فاربعة اقوال
الاول يجوز مطلقا على ظاهر
قوله في حديث الباب الا
رقما، الثاني المنع مطلقا
حتى الرقم۔ الثالث ان كانت
الصورة باقية الهيئة قائمة
الشكل حرم وان قطعت الرأس
وتفرقت الاجزاء جاز۔ قال
هذا هو الاصح۔ الرابع ان
كان مما يمتهن جاز وان
كان معلقا لم يجز (فتح الباری ج ۱۰ ص۳۰۳)

یہی مسلک جمہور علمائے صحابہؓ تابعینؒ اور
ان کے بعد کے علماء کا ہے اور اسی کے قائل
ہیں امام ثوری، امام مالک، امام ابوحنیفہ اور
دوسرے علماء۔۔۔۔ قاضی عیاض کہتے ہیں کہ
اس حرمت سے چھوٹی بچیوں کے کھیل کی گڑیاں
مستثنیٰ ہیں اور اس کی اجازت ہے لیکن امام
مالک اس کو خریدنا مکروہ کہتے ہیں۔ امام زہری
اس بات کے قائل ہیں کہ جس چیز میں تصویر ہو
اس کا استعمال ہر حال میں ممنوع ہے۔

ابن عربی مالکی کہتے ہیں کہ ایسی تصویر رکھنا
جس کا سایہ پڑتا ہو اس کے حرام ہونے پر اجماع
ہے اور جس تصویر کا سایہ نہ پڑتا ہو اس کے
بارے میں چار قول ہیں۔ پہلا قول یہ ہے
کہ حدیث کے ظاہری الفاظ 'الا رقما' کی رو سے
مطلقاً جائز ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ مطلقاً حرام
ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اگر تصویر اپنی اصلی ہیئت
پر باقی رہے تو حرام ہے اور اگر اس کا سر کاٹ
دیا گیا ہو یا اس کے اجزاء الگ الگ کر دیے
گئے ہوں تو اس کا استعمال جائز ہے اور اس
قول کو نقل کرنے کے بعد ابن عربی کہتے ہیں کہ
سب سے صحیح قول یہی ہے اور چوتھا قول یہ ہے
کہ اگر اس کو حقارت سے رکھا گیا ہو تو جائز
ہے اور دیوار سے لگائی گئی ہو تو حرام ہے۔"

ان امام الحرمین نقل وجہا ان الذی یرخص فیہ مما لا ظل لہ ما کان علی ستر او وسادۃ واما ما علی الجدار والسقف فیمنع والمعنی فیہ انہ بذالک یصیر مرتفعاً فیخرج عن ہیئۃ الامتہان بخلاف الثوب فانہ بصدد

(ابن نجیم، البحر الرائق ج ۲ ص ۳۰)

امام الحرمین نے ایک توجیہ یہ نقل کی ہے کہ جس تصویر کے استعمال کی اجازت ہے وہ ایسی تصویر ہو جو پردے یا تکیے میں ہو اور اس کا استعمال نہ پڑتا ہو اور جو دیوار یا چھت میں لگائی گئی ہو وہ ممنوع ہے۔ کیونکہ اس صورت میں اس کی تعظیم ہوگی اس کے برخلاف پردے کی تصویر کی تذلیل ہوگی۔

قد اخرج ابن ابی شیبۃ من طریق ایوب عن عکرمۃ قال کانوا یقولون فی التصاویر فی البسط والوسائد التی توطأ ذل لہا..... ... ولا یرون باساً بما وطئت الاقدام ومن طریق ابن سیرین وسالم بن عبد اللہ وعکرمۃ بن خالد وسعید بن جبیر انہم قالوا لا باس بالصورۃ اذا کانت توطأ (بحوالہ مذکور)

ابن ابی شیبہ نے ایوب کے واسطے سے عکرمہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ وہ زمانہ تابعین کے علماء کہتے ہیں کہ جو پردے اور تکیے پامال ہوتے ہیں ان میں تصاویر کا ہونا ان کی تذلیل و حقارت کا باعث ہے۔ اس لیے ایسی تصویروں کا استعمال جائز ہے جو پیروں تلے روندی جاتی ہوں۔ ابن سیرین، سالم بن عبد اللہ، عکرمہ بن خالد اور سعید بن جبیر سے بھی یہی منقول ہے کہ جب تصویر پامال ہوتی ہو تو اس کے استعمال میں کوئی حرج نہیں۔

ومنہا ان مذہب الحنابلۃ جواز الصلوٰۃ فی الثوب ولو کان معلقاً علی ما فی خبر ابی طلحۃ لکن ان ستر بہ الجدار منع عندہم (بحوالہ مذکور)

حنبلی فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ کپڑے میں تصویر ہو تو ابو طلحہ کی حدیث کی رو سے پردہ لٹکانا بھی جائز ہے لیکن اگر اس سے دیوار چھپائی گئی ہو تو ممنوع ہے۔

اس تفصیلی وضاحت سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اسلام میں حرمت تصویر کشی کے مسئلے میں دو رائیں نہیں ہیں۔ رہا انٹرویو دینے والے صاحب کا بیان و اعلان کہ " اسلام میں فن تصویر کے بارے میں

مستند ائمہ اور مختلف رجحانات ہیں" تو اس کی سند اور حوالہ موصوف ہی پیش کر سکتے ہیں۔ ہمارے مطالعے اور تحقیق و جستجو کی حد تک تو یہ بات بالکل بے اصل ہے۔

جو مسئلہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح احادیث، صحابہ و تابعین کے قول و عمل اور فقہاء و محدثین کے متفقہ فتووں سے ایک مسلمہ قانون ثابت ہو چکا ہو اس کو مستشرقین کی بوالفضولیوں سے بدلا نہیں جا سکتا۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی پر بھی ایک نظر کرم

انٹرویو دینے والے فاضل کا خیال ہے کہ ..... "مولانا مودودی فرماتے ہیں کہ ان روایات کے مقابلہ میں کچھ روایات ایسی بھی پیش کی جاتی ہیں جن میں تصویروں کے بارے میں رخصت پائی جاتی ہے ...... مولانا نے ان روایات کو پیش نہیں کیا ہے ..... واقعہ یہ ہے کہ علماء کا اپنا بھی ایک رجحان ہوتا ہے وہ احکام کی تفہیم میں انہی رجحانات سے رہنمائی لیتے ہیں۔ مودودی صاحب بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں ہیں" (ص۳۷)

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی قلمی دیانت پر اور تفہیم احکام میں اپنے رجحان سے رہنمائی لینے کی جو تعریض کی گئی ہے وہ مغالطہ دینے اور مولانا کے دلائل کو بے وزن باور کرانے کی ایک ناکام کوشش کے سوا کچھ نہیں۔ مولانا نے رخصت کی جن احادیث کو پیش نہیں کیا ہے ان کو جناب مستفیض صاحب پیش کرنے کے بعد مولانا پر یہ الزام لگاتے تو ان کی بات میں کچھ وزن بھی ہوتا۔ تو کیا ان احادیث کی تفصیل پیش کر سکتے ہیں؟ احکام کی تفہیم میں اپنے رجحان سے رہنمائی لینے کی بات بھی اسی مقصد سے کہی گئی ہے کہ مولانا کی رائے ناقابلِ اعتماد قرار پائے۔ یہ دعویٰ بھی بلا دلیل و ثبوت ہونے کی وجہ سے بے وزن ہے۔ جہاں تک رخصت کی حدیثوں کو چھپانے کی بات ہو تو واضح رہے۔ مولانا نے ان کو چھپایا نہیں ہے۔ مولانا یا کسی کے چھپائے وہ چھپ نہیں سکتیں۔ اصل بات یہ ہے کہ موصوف نے مولانا کی تحریر کو پڑھا نہیں ہے بلکہ اس پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالی ہے۔ ورنہ ان کو معلوم ہو جاتا کہ رخصت و اجازت کی حدیث کہنے کا مطلب کیا ہے۔ صد درجہ افسوس اس بات کا ہے کہ اس موضوع پر مطالعہ کرنے کی زحمت کم اور لکھنے کی کوشش زیادہ کی گئی ہے۔

حضرت دحیہ کلبیؓ کی سفارت

اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے حضرت رسول کریمؐ نے ۶ھ میں حضرت دحیہ کلبیؓ کو ہرقل کے پاس سفیر بنا کر بھیجا۔ اس سفارت کا واقعہ انہوں نے اس طرح بیان کیا ہے کہ جب قیصر روم نے اپنی قوم کے لوگوں کو اسلام کی دعوت قبول کرنے میں ہچکچاتے پایا تو مجلس برخاست کر دی اور دوسرے دن مجھ کو علیحدہ ایک عالی شان محل میں بلایا وہاں کیا دیکھتا ہوں کہ مکان کے چاروں طرف تصویریں لگی ہیں۔۔ ۔۔۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ تمہارے صاحب کی تصویر کون سی ہے ۔۔۔۔ میں نے کہا "یہ تصویر"۔۔۔۔۔ یہ رسول کریمؐ کے ایک دوست ابوبکرؓ کی تصویر ہے"۔۔۔۔ "یہ ہمارے نبیؐ کے دوسرے دوست عمر بن الخطابؓ کی تصویر ہے۔" حضورؐ نے اس روایت کی تصدیق کی ہے۔ تصویروں کے بارے میں کوئی کراہت ظاہر نہیں فرمائی۔" (ص ۳۷، ۳۸)

یہاں بھی ہمیں اپنے محترم دوست سے وہی شکایت ہے کہ تاریخ و سیرت اور مصنف کا حوالہ نہیں دیا شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ کسی مستند کتاب میں اس کا ذکر نہ ہو۔ ہم نے جو کچھ پڑھا ہے اور اب جو بخاری جلد ثانی کے حوالے سے یہ واقعہ نظر سے گذرا تو معلوم ہوا کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۶ھ میں نہیں بلکہ ۷ھ میں عرب رئیسوں اور آس پاس کے بادشاہوں کے نام اسلام کی دعوت کے خطوط بھیجے تھے۔ حضرت دحیہ کلبیؓ ہرقل، شاہ روم کے پاس نامۂ مبارک لے کر گئے تھے۔ قیصر روم نے خط پا کر حکم دیا کہ حجاز کے تاجر ملیں تو ان کو بلواؤ۔ عجیب اتفاق کہ اس موقع پر وہ شخص ہاتھ آیا جو اس وقت تک اسلام کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ ابوسفیان۔ جناب ابوسفیانؓ اپنے چند ساتھیوں کو ہمراہ لے کر ہرقل کے دربار میں حاضر ہوئے قیصر روم نے ابوسفیان سے حضور کے خاندان، آپ کے اخلاق، دعوتِ اسلامی کی کامیابی، اس پر لبیک کہنے والوں کے احوال وغیرہ دریافت کیے۔ یہ سوال و جواب کا ایک لمبا مکالمہ ہے جس کو طوالت کے خیال سے ہم نظر انداز کرتے ہیں۔ ابوسفیان کے سب جواب سن کر قیصر روم۔ ہرقل ۔۔ نے کہا اگر یہ صحیح ہے تو یقیناً یہ شخص نبی ہے۔ یہ ایک دن ایسا آئے گا کہ اس کا اقتدار اس سرزمین پر بھی ہو کر رہے گا جو میرے پاؤں کے نیچے ہے۔ اگر ہو سکتا تو میں اس کی زیارت کو جاتا اور اس کے پاؤں دھوتا۔ اس کے بعد ہرقل نے نامۂ مبارک منگوایا اور اپنی قوم کو پڑھ کر سنایا۔ یہ واقعہ امام زہری اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

قال الزهري ثم دعا هرقل عظماء — امام زہری بیان کرتے ہیں کہ ہرقل نے

[illegible] جمعهم في دار له [illegible]

يا معشر الروم هل لكم في الفلاح والرشد آخر الابد وان يثبت لكم ملككم قال فحاصوا حيصة حمر الوحش الى الابواب فوجدوها قد غلقت: فقال علي بهم فقال اني انما اختبرت شدتكم على دينكم فقد رايت منكم الذي احببت فسجدوا له ورضوا عنه

کیا اور کہا اے قوم روم کیا تم چاہتے ہو کہ تمہاری فلاح و رشد ہمیشہ قائم رہے اور تمہارا ملک تمہارے ہی پاس رہے۔ یہ سنکر سب کے سب دروازوں کی طرف اس طرح بھاگے جیسے جنگلی گدھے بھاگتے ہیں۔ لیکن ان کو تمام دروازے بند ملے۔ ہرقل نے کہا۔ سب کو میرے پاس لاؤ۔ وہ آگئے تو کہا میں تمہاری دینی پختگی کی جانچ کر رہا تھا۔ میں نے وہی پایا جو میں چاہتا تھا۔ یہ سنکر سب اس کے آگے سجدے میں گر گئے اور اس سے راضی ہو گئے۔

یہ واقعہ جس طرح انٹرویو دینے والے صاحب نے بیان کیا ہے اگر وہ کسی کتاب میں ہو بھی تو چونکہ یہ بات کہ تصویروں کے بارے میں کوئی کراہیت ظاہر نہیں فرمائی۔ صحیح روایات کے صریح خلاف ہے اور پورا واقعہ بھی مستند کتابوں کی روایات کے خلاف ہے اس کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا

معذرت

ستمبر ۸۳ء کے شمارہ میں صفحہ ۲۳ پر ایک تصویر والا اشتہار شائع ہو گیا۔ یہ محض بھول چوک سے ہوا۔ ہمارے موقف میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ ہم اس غلطی کے لیے معذرت خواہ [illegible]

ادارۂ زندگی

رضاعت

(مولانا جلال الدین عمری)

ایک ماں سے فطری طور پر اس کی توقع کی جاتی ہے کہ وہ بچہ کو دودھ پلائے گی لیکن اس کے باوجود اس بات کا امکان ہے کہ صحت کی کمزوری، بیماری یا اور کسی مصروفیت کی وجہ سے وہ اسے دودھ نہ پلا سکے۔ اسی وجہ سے قرآن مجید نے ماں کو رضاعت پر مجبور نہیں کیا ہے۔ البتہ اس نے رضاعت سے متعلق بحث کرتے ہوئے ایسا انداز اختیار کیا ہے گویا جب تک کوئی حقیقی عذر نہ ہو، ماں بچہ کو یقیناً دودھ پلائے گی اور وہ اس نعمت سے محروم نہیں رہے گا۔

اسلام نے خاندان کا جو نقشہ مرتب کیا ہے اس پر اگر ٹھیک ٹھیک عمل ہو تو بہت سے وہ سوالات نہیں پیدا ہوتے جو اس نقشہ کے بگڑنے کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ رضاعت کا مسئلہ بھی اسی نوعیت کا ہے جب میاں اور بیوی ازدواجی زندگی میں اچھی طرح بندھے ہوئے ہوں اور ان کے درمیان الفت، محبت اور اولاد سے خیر خواہی کا وہ جذبہ پایا جائے جو اسلام کو مطلوب ہے تو وہ خود باہمی مشورہ سے اپنے حالات، ماں کی صحت اور بچے کے مفاد کو سامنے رکھ کر یہ طے کر سکتے ہیں کہ ماں بچہ کو دودھ پلائے یا نہ پلائے اور پلائے تو کتنی مدت تک پلائے۔ جہاں اس طرح کے حالات ہوں وہاں قرآن مجید نہ تو رضاعت کا حکم دیتا ہے اور نہ اس سے متعلق مسائل سے بحث کی ہے۔ اس سلسلے میں قرآن مجید کے رجحان اور مزاج کو اس ہدایت سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے جو اس نے بچے کے دودھ چھڑانے کے سلسلے میں ماں اور باپ دونوں کو دی ہے۔

فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ	پھر اگر ماں اور باپ آپس کی رضامندی
تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ	اور مشورے سے دودھ چھڑانا چاہیں تو دو

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا — ایسا کر سکتے ہیں ۲۳ اس میں ان کو کوئی گناہ نہیں ہے (البقرۃ ۲۳۳)

مطلب یہ ہے کہ بچے کے دودھ چھڑانے کا فیصلہ ماں اور باپ کے باہمی مشورے اور رضامندی سے ہونا چاہیے۔ اس معاملے میں کسی ایک کی ضد اور ہٹ اور خودرائی نہیں ہونی چاہیے۔ جہاں خاندانی زندگی سے یہ حسن و خوبی ختم ہوجائے اور میاں بیوی دونوں ایک دوسرے سے جدا ہونے اور ازدواجی رشتہ کو توڑ دینے کا فیصلہ کرلیں وہاں ان کے بارے میں بھی اور بچے کے بارے میں بھی بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں اور اپنا قانونی جواب چاہتے ہیں مثلاً بچہ ماں کا ہے یا باپ کا، اور ان کی جدائی کے بعد وہ کس کے پاس رہے گا۔ بچہ شیرخوار ہو تو ماں کے لیے دودھ پلانا ضروری ہے یا نہیں؟ قرآن مجید نے یہ اور اس طرح کے بعض دوسرے سوالات کا جواب دیا ہے۔ یہ جواب گو کہ ایک خاص صورت حال (جبکہ میاں اور بیوی میں تفریق ہوجائے) کو سامنے رکھ کر دیا گیا ہے لیکن اس کا انداز بالکل اصولی ہے۔ اس لیے اس کا انطباق عام حالات پر بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس کے اسی انداز بیان سے فقہاء نے بہت سی قانونی ہدایات اخذ کی ہیں اور ان کو ان حالات پر بھی منطبق کیا ہے جن میں ازدواجی تعلق باقی ہو اور میاں بیوی مل جل کر زندگی گذار رہے ہیں

حقِ رضاعت

ماں کو بچہ کی رضاعت کا قانونی حق حاصل ہے۔ اس حق کو قرآن مجید نے ان الفاظ میں بیان

لے امام ابن حزم نے قرآن کی اس ہدایت کو بالکل قانونی حیثیت دے دی ہے۔ ان کے نزدیک دو سال (یعنی مدت رضاعت) پوری ہونے سے پہلے ماں اور باپ میں سے کوئی بھی دوسرے کی رائے کے بغیر بچہ کا دودھ چھڑانا چاہے تو اسے اس کا حق نہیں ہے۔ قطع نظر اس سے کہ ان کے اس اقدام سے بچہ کو کوئی نقصان پہنچتا ہے یا نہیں لیکن اگر دونوں کی یہی رائے ہو کہ دو سال سے پہلے دودھ چھڑا دیا جائے اور اس میں بچہ کا بھی کوئی نقصان نہ ہو تو وہ ایسا کر سکتے ہیں لیکن اگر اس میں بچہ کا نقصان ہے مثلاً یہ کہ وہ بیمار ہے یا جسمانی لحاظ سے کمزور ہے یا دودھ کے علاوہ کوئی دوسری غذا اس کا معدہ قبول نہیں کر رہا ہو تو ان کے لیے دودھ چھڑانا جائز نہیں ہو (ایسی صورت میں ان کو رضاعت کی مدت پوری کرنی ہوگی) (المحلی ۱۰/۳۳۹)

کیا ہے :-

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ مائیں اپنے بچوں کو دودھ پلائیں

فقہاء کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ طلاق یا جدائی کے بعد بچہ کا باپ اس کی ماں کو اس کے اس حق سے محروم نہیں کرسکتا۔ وہ اگر دودھ پلانا چاہے تو باپ نہ تو اس کو منع کرسکتا ہے اور نہ اس کی جگہ کسی دوسری عورت ہی سے دودھ پلانے پر اصرار کرسکتا ہے بلکہ اسلامی فقہ کی رو سے اس کو قانوناً مجبور کیا جائے گا کہ وہ لازماً بچہ کی ماں ہی سے اس کو دودھ پلوائے ابوبکر جصاص کہتے ہیں :-

ان الاب اذا ابی استرضاع الام اجبر علیہ لہ — باپ اگر بچہ کی رضاعت کا کام اس کی ماں کو دینے سے انکار کردے تو اس کو مجبور کیا جائے گا کہ یہ خدمت اسی سے لے

البتہ اختلاف اس بات میں ہے کہ بچہ کے ماں اور باپ جب ازدواجی تعلق میں منسلک ہوں تو کیا باپ کو اس کا حق ہے کہ وہ ماں کو رضاعت سے منع کردے ؟

اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ اس مسئلے پر دو پہلوؤں سے غور کیا گیا ہے۔ ایک پہلو یہ ہے کہ رضاعت کے زمانے سے ماں کی مصروفیت بھی بڑھ جاتی ہے اور اس کی صحت پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے۔ اس لیے رضاعت کے زمانے میں یہ اس کے لیے بہت مشکل ہے کہ وہ شوہر کے حقوق پوری طرح ادا کرسکے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ نہ تو ماں سے زیادہ بچہ کی ہمدرد یہاں خواہ کوئی دوسری شخصیت ہوسکتی ہے اور نہ اس کے دودھ سے زیادہ مناسب اور موزوں غذا اس کے لیے ممکن ہے۔ ان میں سے ہر پہلو اہم ہے

فقہ مالکی میں اس بات کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے کہ عورت کی صحت و تندرستی اور حسن و جمال باقی رہے تاکہ مرد اس سے فائدہ اٹھا سکے۔ کیونکہ عورت کی صحت کی خرابی یا اس کی کسی تھکا دینے والی مصروفیت کی وجہ سے مرد اس سے جنسی تسکین نہ حاصل کرسکے تو اس کے اندر دوسری اخلاقی

لہ جصاص: احکام القرآن ۱/ ۴۷۷

خرابیوں کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس لیے یہ مرد کا ایک جائز حق ہے کہ وہ عورت کو ایسی کسی بھی مصروفیت سے روک دے جس کی وجہ سے اس کے لیے جنسی تعلق رکھنا دشوار ہو۔ ابن عربی مالکی کہتے ہیں۔

اگر بچہ کا باپ یہ چاہے کہ اس کو کوئی دوسری عورت دودھ پلائے تاکہ وہ اس کے (حقوق ادا کرنے کے) لیے فارغ ہو سکے تو اس کو اس کا حق ہے اور بیوی دودھ پلانے پر اصرار نہیں کر سکتی۔ بشرطیکہ بچہ دایہ کا دودھ پی سکتا ہو۔ ورنہ وہ شوہر کو بھی تکلیف پہنچائے گی اور اگر حمل ٹھہر جائے (اس کے باوجود وہ دودھ پلاتی رہے) تو بچہ کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ پھر یہ کہ قرآن مجید نے اس پر رضاعت کو صراحتہً فرض نہیں کیا ہے بلکہ اس کے الفاظ میں اس کا بھی امکان ہے کہ وہ محض اس کا ایک حق ہے۔ (ظاہر ہے شوہر کے حقوق کی ادائیگی کے لیے اپنے حق کو چھوڑ دینا زیادہ اچھا ہے[1]

فقہ شافعی میں بچے کے باپ کو اس کا حق تو دیا گیا ہے کہ وہ اس کی ماں کو دودھ پلانے سے منع کر دے لیکن اس کو ناپسندیدہ سمجھا گیا ہے۔ امام نووی کہتے ہیں کہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ باپ کو اس کے منع کرنے کا حق نہیں ہے اور اسی کو اکثر شافعی فقہاء نے صحیح مسلک قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ یہی بیان کی گئی ہے کہ ماں کو کسی بھی دوسری عورت کے مقابلہ میں بچے کے ساتھ زیادہ ہمدردی و شفقت ہوتی ہے اور اس کا دودھ بچے کے لیے زیادہ مفید اور مناسب ہوتا ہے[2]

فقہ حنفی میں بھی بچہ کی تربیت اور پرورش کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ چنانچہ فقہ حنفی کی رو سے بچہ کا باپ جس طرح ماں کو دودھ پلانے پر مجبور نہیں کر سکتا اسی طرح دودھ چھڑانے پر بھی مجبور نہیں کر سکتا۔ ہاں اگر ایسی کوئی صورت پیدا ہو جائے جس میں ماں کے لیے دودھ پلانا ضروری قرار پائے (اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے) تو بلاشبہہ باپ اصرار کر سکتا ہے۔[3]

---

[1] ابن عربی: احکام القرآن ۱/ ۸۶-۸۷

[2] جلال الدین المحلی۔ شرح منہاج الطالبین ۴/ ۸۶

[3] ابن عابدین۔ رد المحتار علی الدر المختار ۲/ ۵۰۶

حکم رضاعت

قرآن مجید نے رضاعت کے بارے میں کہا

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ — مائیں اپنے بچوں کو دودھ پلائیں۔

یہ بظاہر اصطلاح نحو میں خبر ہے لیکن حقیقتاً اس میں رضاعت کا حکم بیان ہوا ہے یعنی اس میں یہ بات نہیں کہی گئی ہے کہ تمام مائیں فی الواقع اپنے بچوں کو دودھ پلاتی ہیں اس لیے کہ یہ واقعہ کے خلاف بات ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بہت سی مائیں بچوں کو دودھ نہیں پلاتیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت میں واقعہ نہیں بیان کیا گیا ہے بلکہ رضاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ حکم کے لیے یہ انداز بیان قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر بھی اختیار کیا گیا ہے اور اس میں زیادہ زور پایا جاتا ہے۔[1]

اس طرح یہ ایک متفقہ مسئلہ ہے کہ آیت میں رضاعت کا حکم بیان ہوا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ حکم صرف ان ماؤں سے متعلق ہے جن کو طلاق ہو چکی ہے یا اس کا تعلق ان ماؤں سے بھی ہے جو بچہ کے باپ کے ساتھ ازدواجی رشتہ میں بندھی ہوئی ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ رضاعت کا یہ حکم ان ماؤں سے متعلق ہے جن کو طلاق ہو چکی ہو کیونکہ سیاق وسباق یہی ہے۔ اس کی دلیل یہ بھی ہے کہ اگر ماں بچہ کو دودھ پلائے تو بچے کے باپ کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اس کے کھانے اور کپڑے کے اخراجات برداشت کرے۔ عورت کی اگر طلاق نہیں ہوئی ہے تو چاہے وہ بچہ کو دودھ پلائے یا نہ پلائے، شوہر کو اس کا کھانا اور کپڑا بہرحال دینا ہی ہوگا۔ یہ سوال تو صرف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ اس کو طلاق ہو چکی ہو اور شوہر پر اس کا نفقہ واجب نہ ہو۔ آیت میں اس صورت حال سے بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ طلاق کے باوجود عورت اگر تمہارے بچہ کو دودھ پلا رہی ہے تو تمہیں اس کا کھانا اور کپڑا دینا ہوگا۔

دوسری رائے وہ ہے جو واحدی نیشاپوری نے اختیار کی ہے۔ وہ یہ کہ اس میں ان ماؤں کا ذکر ہے جو باپ کے عقد میں ہوں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ طلاق کے بعد اگر ماں بچہ کو دودھ پلائے تو

---

[1] جصاص: احکام القرآن ۱/ ۴۷۷۔ زمخشری نے لکھا ہے یرضعن اولادھن مثل یتربصن فی انہ خبر فی معنی الامر المؤکد۔ الکشاف عن حقائق التنزیل ۱/ اس سلسلے کی مزید توجیہات کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر کبیر ۲/ ۲۴۲

وہ کھانے کپڑے کی نہیں، بلکہ اجرت کی مستحق ہوگی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں رضاعت کے جو احکام بیان ہوئے ہیں وہ غیر مطلقہ ماؤں سے متعلق ہیں۔ اس پر ایک سوال یہ کیا جا سکتا ہے کہ عورت کو طلاق نہ ہو تو اس کا کھانا اور کپڑا مرد پر بہر حال واجب ہے رضاعت اس کی شرط نہیں ہے پھر یہاں اس کا ذکر کیوں کیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بلا شبہ رضاعت عورت کے کھانے اور کپڑے کے وجوب کی شرط نہیں ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ رضاعت کی وجہ سے عورت کو شوہر کی خدمت کے لیے وہ یکسوئی حاصل نہیں ہوتی جو اس ذمہ داری کے نہ ہونے کی صورت میں حاصل ہوتی ہے اس وجہ سے شوہر سوچ سکتا ہے کہ مدت رضاعت میں وہ بیوی کے اخراجات کیوں برداشت کرے؟ قرآن نے اس کی تردید کے لیے یہ بات کہی ہے کہ اس کے اخراجات تمہیں رضاعت کے دوران میں بھی برداشت کرنے ہوں گے۔

تیسری رائے یہ ہے کہ رضاعت کا یہ حکم گو کہ طلاق کے مسائل کے ذیل میں بیان ہوا ہے لیکن اس کے الفاظ بالکل عام ہیں۔ اس لیے ان میں مطلقہ اور غیر مطلقہ دونوں طرح کی مائیں آجاتی ہیں۔ [1]

صاحب روح المعانی کہتے ہیں :۔

والحکم عام للمطلقات و غیرھن کما یقتضیہ الظاھر[2]	حکم مطلقہ اور غیر مطلقہ دونوں طرح کی ماؤں کے لیے عام ہے جیسا کہ ظاہر الفاظ کا تقاضا ہے

ان مختلف رایوں کے ذکر کے بعد لکھتے ہیں :۔

ولا یخفی ان الحمل علی العموم اولی[3]	یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ عموم پر محمول کرنا زیادہ اچھا ہے

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رضاعت کا جو حکم قرآن نے دیا ہے اس کی نوعیت کیا ہے۔ کیا اس

---

[1] پوری تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو امام رازی : تفسیر کبیر ۲/ ۲۷۱ - ۲۷۲ - امام رازی نے اس تیسری رائے کو سب سے پہلے ذکر کیا ہے اور ان کے الفاظ ہیں - ان المراد منہ ما اشعر ظاھر اللفظ بہ وھو جمیع الوالدات سواء کن مزوجات او مطلقات والدلیل علیہ ان اللفظ عام وما قام دلیل التخصیص فواجب ترکہ علی عمومہ

[2] آلوسی : روح المعانی ۲/ ۱۴۵ [3] ایضاً

سے رضاعت کا وجوب ثابت ہوتا ہے۔ یا وہ محض استحباب کے لیے ہے۔ بالفاظ دیگر ماں کے لیے بچہ کو دودھ پلانا واجب ہے یا وہ صرف ایک پسندیدہ عمل ہے۔

جہاں تک مطلقہ ماؤں کا تعلق ہے، قرآن مجید سے صراحۃً معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لیے بچہ کو دودھ پلانا واجب نہیں ہے۔ اس لیے شوہر اس کو دودھ پلانے پر مجبور بھی نہیں کرسکتا۔ چنانچہ طلاق کے مسائل کے ذیل میں رضاعت کا حکم دینے کے بعد اس نے کہا۔

وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّا اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ	اگر تم چاہو کہ اپنی اولاد کو کسی دوسری عورت سے دودھ پلواؤ تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں جبکہ تم ان کو وہ دیدو جو دستور کے مطابق طے کیا ہے

ایک دوسری جگہ طلاق ہی کے احکام بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ وَاْتَمِرُوْا بَيْنَكُمْ وَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗۤ اُخْرٰى (الطلاق: ٦)	(طلاق کے بعد) اگر وہ تمہارے لیے (بچہ کو) دودھ پلائیں تو ان کی اجرت انہیں دو اور اجرت کے معاملہ کو آپس میں بھلے طریقے سے طے کرلو لیکن اگر تم نے ایک دوسرے کو تنگ کیا تو کوئی دوسری عورت بچہ پلائے گی۔

طلاق کے بعد ماں کے لیے دودھ پلانا واجب ہوتا تو ظاہر ہے وہ اجرت کی قانوناً مستحق نہ ہوتی اس صورت میں کوئی شخص اجرت دے یا نہ دے اس کو بہرحال اپنا فرض ادا کرنا پڑتا۔ اس لیے کہ کسی فرض کی ادائگی پر آدمی نہ تو اجرت کا قانوناً مطالبہ کرسکتا ہے اور نہ کوئی شخص اسے اجرت دینے پر مجبور ہوسکتا ہے۔ یہی بات مفسرین نے اس طرح کہی ہے۔

ولو وجب علیھا الرضاع لما استحقت الاجرۃ [1]	اگر اس پر رضاعت واجب ہوتی تو وہ اجرت کی مستحق نہ ہوتی۔

[1] رازی: تفسیر کبیر ۲/۲۷۲

اسی وجہ سے فقہاء کے درمیان اس مسئلے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ جس عورت کو طلاق ہو چکی ہو اس کے لیے بچہ کو دودھ پلانا واجب نہیں ہے۔ اس لیے اس کو قانوناً رضاعت پر مجبور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ مغنی میں ہے :-

ولا نعلم فی عدم اجبارها علی ذالك اذا كانت مفارقة خلافا[1]	ہمارے علم میں اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ عورت کی جب شوہر سے تفریق ہو چکی ہو تو اس کو رضاعت پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

البتہ فقہاء کے درمیان غیر مطلقہ ماں کے بارے میں اختلاف ہے کہ رضاعت اس کے لیے واجب ہے یا نہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ رضاعت اس کے لیے واجب ہے۔ اگر وہ اس سے انکار کرے تو اس کو رضاعت پر مجبور کیا جائے گا۔ ابن تیمیہ اس رائے کے متعلق لکھتے ہیں :-

وارضاع الطفل واجب علی الام بشرط ان تكون مع الزوج وهو قول ابن ابی لیلی وغیرہ من السلف ولا تستحق اجرة المثل زیادة علی نفقتها وكسوتها وهو اختیار القاضی فی المجرد[2]	بچہ کو دودھ پلانا ماں کے لیے واجب ہے بشرطیکہ وہ شوہر کے ساتھ (نکاح میں) ہو۔ یہ سلف میں سے ابن ابی لیلیٰ وغیرہ کا مسلک ہے اور وہ اس صورت میں اپنے نفقہ اور لباس پر مزید اجرت مثل کی مستحق نہیں ہو گی۔ اسی رائے کو قاضی نے اپنی کتاب مجرد میں اختیار کیا ہے۔

ابن بطال کہتے ہیں :-

قال مالك وابن ابی لیلی من الكوفیین تجبر علی ارضاع	امام مالک اور اہل کوفہ میں ابن ابی لیلیٰ کہتے ہیں کہ بچہ کی ماں جب تک اس کے باپ

---

[1] ابن قدامہ : المغنی ۹/ ۳۱۲

[2] الاختیارات العلمیہ ص۱۷۱

ولدها مادامت متزوجة	کی زوجیت میں ہے اس کو مجبور کیا جائے گا
بوالدة لہ[1]	کہ وہ بچہ کو دودھ پلائے۔

یہ رائے ابن لیلیٰ کے علاوہ حسن بن صالح اور ابو ثور وغیرہ کی بھی ہے[2] علامہ ابن حزم نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے اور اس پر بہت تفصیل سے بحث کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہر ماں کے لیے رضاعت واجب ہے چاہے وہ آزاد ہو یا لونڈی، چاہے اس کا بچہ جائز طریقے سے پیدا ہوا ہو یا ناجائز طریقے سے، چاہے وہ اس کو پسند کرتی ہو یا نہ کرتی ہو، چاہے وہ خلیفہ وقت کی بیٹی ہو یا نچلے طبقے کی عورت اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے صاف کہا ہے۔ والوالدات یرضعن اولادھن الفاظ بالکل عام ہیں۔ اس لیے ان کا اطلاق ہر ماں پر ہوتا ہے اور تخصیص کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سرے سے حکم ہی نہیں ہے بلکہ خبر ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر یہ خبر ہے تو اس کی مخالفت کرنا گویا اس کو غلط ثابت کر دکھانے کی کوشش کرنا ہے۔ علاوہ ازیں اس کو محض خبر کہنا بھی قابل غور ہے[3]

احناف کے نزدیک ماں کے لیے بچہ کو دودھ پلانا واجب نہیں ہے۔ چنانچہ قدوری میں ہے:

ان کان الصغیر رضیعا	چھوٹا بچہ اگر دودھ پینے والا ہے تو
فلیس علی امہ ان ترضعہ[4]	ماں کے لیے اس کو دودھ پلانا ضروری نہیں ہے

قطع نظر اس کے کہ بچہ کی ماں اس کے باپ کے نکاح میں ہے یا اس کو طلاق ہو چکی ہے۔ چنانچہ ابن عابدین کہتے ہیں۔

ولیس علی امہ (ای التی	بچہ کی ماں کے لیے، چاہے وہ باپ
فی نکاح الاب او المطلقۃ	کے نکاح میں ہو یا اس کو طلاق ہو چکی ہو
ارضاعہ[5]	دودھ پلانا ضروری نہیں ہے

---

[1] ابن حجر: فتح الباری ۹/۷،۴

[2] ابن قدامہ: المغنی ۹/۳۱۲

[3] ابن حزم: المحلی ۱۰/۳۳۵

[4] قدوری: کتاب النفقات

[5] ابن عابدین: رد المحتار علی الدر المختار ۲/۹۲۹

اس کی دلیل قرآن کا یہ حکم ہے کہ "مائیں دودھ پلائیں تو تم ان کو اس کی اجرت دو" یا قرآن کی یہ صراحت کہ "اگر تم آپس میں دشواری محسوس کرو تو کوئی دوسری عورت دودھ پلا سکتی ہے" الفاظ عام ہیں۔ اس لیے ان میں مطلقہ ماؤں کے ساتھ غیر مطلقہ مائیں بھی شامل ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید نے رضاعت کو ماں پر واجب نہیں کیا ہے۔ جصاص لکھتے ہیں:۔

دل ذالک علی انہ لیس المراد الرضاع شاءت الام او ابت وانہا مخیرۃ فی ان ترضع اولا ترضع [۱]	یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن مجید کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ماں چاہے یا نہ چاہے رضاعت اس کے لیے ضروری ہے بلکہ اس کو دودھ پلانے اور نہ پلانے دونوں ہی کا اختیار ہے

اس کی دوسری دلیل یہ ہے کہ بچہ کا نفقہ باپ کے ذمے ہے۔ اس لیے اس کو رضاعت کے اخراجات بھی برداشت کرنے چاہییں کیونکہ یہ نفقہ میں شامل ہے۔ پھر ابن نجیم کہتے ہیں:۔

ولا تجبر امہ لترضع لانہ کالنفقۃ وہی علی الاب [۲]	بچہ کی ماں کو رضاعت پر مجبور نہیں کیا جائے گا کیونکہ رضاعت کی حیثیت نفقہ کی ہے اور وہ باپ پر واجب ہے۔

یہی مسلک امام شافعی، امام احمد اور امام ثوری کا بھی ہے۔ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں:۔

ان رضاع الولد علی الاب وحدہ ولیس لہ اجبار امہ علی رضاعہ دنیئۃ کانت او شریفۃ سواء کانت فی حبال الزوج او مطلقۃ ..... وبہ یقول الثوری والشافعی واصحاب الرای [۳]	بچہ کی رضاعت کی ذمہ داری تنہا باپ پر ہے اور وہ ماں کو اسے دودھ پلانے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ چاہے وہ نچلے طبقہ کی ہو یا اونچے گھرانے کی چاہے وہ اس کے عقد نکاح میں ہو یا اس کو طلاق ہو چکی ہو ... یہ امام ثوری، شافعی اور اصحاب رائے (احناف) کی بھی رائے ہے

[۱] جصاص۔ احکام القرآن ج ۱ ص ۴۷۷

[۲] ابن نجیم۔ البحر الرائق ۴ / ۲۰۲

[۳] ابن قدامہ: المغنی ۹ / ۳۱۲

البتہ اگر یہ بات متعین ہو جائے کہ ماں کے دودھ پلائے بغیر بچہ کی جان بچنا ممکن نہیں ہے تو ماں کے لیے دودھ پلانا واجب ہو جائے گا۔ چنانچہ فقہ حنفی میں ہے :۔

ولیس علی امہ ارضاعہ الا اذا تعینت لہ	ماں کے لیے بچہ کو دودھ پلانا ضروری نہیں ہے الا یہ کہ اس کا تعین ہو جائے (اس کے علاوہ کسی اور سے دودھ پلانے کی کوئی صورت نہ ہو۔

اس کی مختلف صورتیں فقہاء نے بیان کی ہیں۔

۱۔ نہ تو بچہ کا اپنا مال ہو کہ اس سے اس کے دودھ کا انتظام کیا جاسکے اور نہ اس کا باپ ہی اس حیثیت میں ہو کہ یہ بوجھ اٹھانا اس کے لیے ممکن ہو۔ چنانچہ بحر الرائق میں ہے :۔

ان لم یکن للاب ولا للولد الصغیر مال تجبر الام علی الارضاع عند الکل ؎	نہ تو باپ کے پاس مال ہو اور نہ چھوٹے بچہ ہی کا کوئی مال ہو تو ایسی صورت میں سب کے نزدیک ماں کو مجبور کیا جائے گا کہ بچے کو دودھ پلائے۔

۲۔ دودھ پلانے کے لیے کوئی دوسری عورت نہ ملے۔ صاحب ہدایہ لکھتے ہیں :۔

اذا کان لا توجد من ترضعہ تجبر الام علی الارضاع صیانۃ للصبی عن الضیاع ؎	بچہ کو دودھ پلانے کے لیے کوئی عورت نہ ملے تو ماں کو دودھ پلانے پر مجبور کیا جائے گا تاکہ بچہ کو ضائع ہونے سے بچایا جاسکے۔

۳۔ بچہ ماں کے دودھ کے علاوہ کسی دوسری عورت کا دودھ نہ پیے۔ ابن عابدین لکھتے ہیں۔

او کان الولد لا یاخذ ثدی	یا یہ کہ بچہ ماں کے علاوہ کسی دوسری

؎ تنویر الابصار، باب النفقہ

؎ ابن نجیم: البحر الرائق ۴/۲۰۲

؎ ہدایہ ۲/۴۲۲

فقہ مالکی
عورت کا دودھ نہ پیے

فقہ شافعی میں بھی ان تینوں صورتوں میں سے جو بھی صورت پائی جائے ماں کے لیے رضاعت واجب ہے لیکن اگر ان میں سے کوئی ایک صورت بھی نہ پائی جائے تو وجوب ختم ہو جائے گا صرف استحباب باقی رہے گا۔ شیخ سلیمان الجمل لکھتے ہیں۔

هذا الامر للندب والوجوب	رضاعت کا حکم مندوب بھی ہے
فالاول عند اجتماع ثلثة	اور واجب بھی۔ مندوب تو اس وقت جبکہ
شروط قدرة الاب على الاستيجار	تین شرطیں پائی جائیں۔ باپ اجرت پر دودھ
ووجود غير الام وقبول الولد	پلانے کی قدرت رکھتا ہو، ماں کے سوا کوئی
للبن الغير وللوجوب عند	دوسری عورت اس خدمت کے لیے موجود ہو
فقد واحد منها ۲	اور بچہ اس کا دودھ پیے۔ ان شرائط میں سے
	کوئی ایک شرط بھی نہ پائی جائے تو رضاعت
	اس کے لیے واجب ہے۔

فقہاء کے نزدیک بچہ کی پیدائش کے بعد ماں کے لیے اس کو اپنا ابتدائی دودھ پلانا بھی واجب ہے۔ اس پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے۔ چنانچہ امام شعرانی کہتے ہیں:۔

وعلى انه يجب على المرأة	اور اس پر بھی ائمہ کا اتفاق ہے کہ عورت
ان ترضع ولدها اللباء ۳	کے لیے بچہ کو اپنا ابتدائی دودھ پلانا بھی
	واجب ہے۔

اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ بچہ کو ماں کا یہ دودھ نہ ملے تو اس کا زندہ رہنا دشوار ہے۔ یہ دودھ ماں کو کتنے دن تک پلانا ہو گا۔ فقہاء نے اس کی تعیین نہیں کی ہے۔ فقہ شافعی

---

۱ ابن عابدین: رد المحتار علی الدر المختار ۲/ ۶۲۹ فقہ حنفی میں ایک رائے یہ بھی ہے کہ ماں کے دودھ کے علاوہ دوسری چیزیں بھی بچہ کی غذا بن سکتی ہیں۔ اس لیے مذکورہ دوسری اور تیسری صورت میں دودھ پلانا ماں کے لیے واجب نہیں ہے لیکن ترجیح پہلی رائے ہی کو حاصل ہے۔

۲ حاشیۃ الجمل علی تفسیر الجلالین ۱/ ۲۲۵ ۳ شعرانی: کتاب المیزان ۲/ ۱۲۶

میں اس مسئلے پر کافی بحث موجود ہے لیکن وہاں بھی تھوڑی مدت کے لیے اس کو واجب قرار دیا گیا ہے بعض حضرات نے یہ مدت تین دن بتائی ہے اور بعض نے اس سے زیادہ لیکن خود شوافع کے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ اس معاملہ میں واقف کار لوگوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور ان کے مشورے سے مدت کی تعیین کی جانی چاہیے۔

لیکن سب سے پہلے یہی بات قابل غور ہے کہ ہر بچہ اپنی پیدائش کے بعد ماں کے ابتدائی دودھ کا لازماً محتاج ہوتا ہے اور اس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا ایسے بچے ہو سکتے ہیں جن کے بارے میں ڈاکٹر کا مشورہ یہ ہو کہ اس کو ماں کا یہ دودھ لازماً ملنا چاہیے۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں بچے کی زندگی کو بچانے کے لیے ضروری ہوگا کہ ماں اس کو دودھ پلائے لیکن جہاں یہ محسوس ہو کہ بچہ کی زندگی کے لیے ماں کا دودھ ضروری نہیں ہے وہاں ماں کے لیے دودھ پلانا ضروری نہیں ہونا چاہیے

لے جلال الدین المحلی: شرح منہاج الطالبین علی حاشیہ قلیوبی وغیرہ

نظریۂ افادیت

(افادیت کے بنتھمی نظریہ کی تحقیق اور قرآنی نظریۂ فطرت کا بیان)

(آخری قسط)

(جناب جے۔ اتیچ۔ مولبی)

اجتماعی پہلو حوالے کا آخری حصہ اس کے فلسفہ کو انفرادیت کے محدود دائرے سے نکال کر اسے اجتماعیت تک وسعت دیتا ہے۔ بنتھم ریاست وحکومت، جرم وسزا، حریت ومساوات، حقوق وفرائض اور اقتدارِ اعلیٰ اور قانون جیسی اصطلاحوں کی اپنی قدروں پر تشریح وتوضیح کرتا ہے۔ وہ فرد کا معاشرے سے الگ کوئی وجود نہیں مانتا۔ اس لیے مفاداتی ٹکراؤ کو جیسے معاشرے میں "امرِ لابدمنہ" کی حیثیت حاصل ہے، نظر انداز نہیں کرتا۔ وہ بتاتا ہے کہ اگرچہ ایک فرد کو دوسرے فرد کی خوشیاں دیکھ کر بھی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے متذکرہ ٹکراؤ کم سے کم ہوجائے گا۔ پھر بھی یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ یہ بالکل ختم ہوجائے اور ایسے وقت میں ایک بااختیار ادارہ کی ضرورت پیش آتی ہے۔

ریاست کی ابتدا کب اور کیسے ہوئی اس کی بحث کو وہ قطعی غیر ضروری سمجھتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ حکومت ایک مفید ادارہ ہے اور اس کا واحد مقصد زیادہ سے زیادہ افراد کے لیے زیادہ سے زیادہ راحت کا انتظام کرنا ہے۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ ایسے ہی قوانین بنائے جن سے ریاست میں بسنے والے افراد کی زیادہ سے زیادہ تعداد، زیادہ سے زیادہ مسرتیں حاصل کرسکے اور ایسے قوانین ہرگز نہ بنائے جو مطلوب ومقصود سے دور لے جانے والے اور عوام کی مسرت کشی کرنے والے ہوں۔ قانون کے اچھے یا برے ہونے کا وہ یہی معیار بتاتا ہے۔

۱۔ قوانین ریاست کے تمام شہریوں کو مناسب حفاظت فراہم کرتے ہیں کہ نہیں
۲۔ اس سے عوام کی ناگزیر ضروریات مناسب طریقے سے پوری ہوتی ہیں کہ نہیں
۳۔ اس سے افراد میں احساس مساوات پیدا ہوتا ہے کہ نہیں۔

قوانین فطرت وہ قوانین فطرت کا منکر ہے اور اس کا سبب وہ اس کا عدم استحکام و عدم استقلال بتاتا ہے۔ اس کی نظر میں قانون محض اقتدار اعلیٰ کا حکم ہے اور اپنی افادیت کے باعث قابل تعمیل ہے لیکن ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ قوانین مسرت بخش ہونے کی بجائے افراد کے لیے مصیبتوں اور دکھوں کا سبب بن جائیں۔ ایسے وقتوں میں قانون کی خلاف ورزی کرنے کے جواز کا فتویٰ بنتیھم دیتا ہے۔ اس کی نظر میں پیہم تجربات انسان کے اندر اتنی صلاحیت پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ اپنا اچھا برا سمجھ لے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایسی کوئی مستقل حد متعین کرنے کی کوشش نہیں کرتا جو متعلقہ فرد کے معصوم و مجرم ہونے میں تمیز پیدا کرے۔ مضر قوانین کی پابندی نہ کرنے کی دلیل وہ یہ دیتا ہے کہ ہر شخص کو اپنی خوشی محبوب ہوتی ہے اور یہ محبت اس کا فطری حق ہے۔

اچھے بُرے کا فرق بنتیھم مختلف سرچشموں سے حاصل شدہ مسرت وغم میں اچھے بُرے کا کوئی فرق (QUALITATIVE DIFFERENCE) تسلیم نہیں کرتا۔ اس کے مطابق ایک واعظ وعظ کہنے کے بعد یا ایک سائنس داں قوانین فطرت کے کسی جز کا انکشاف کر کے جو خوشی حاصل کرتے ہیں ان میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ اس کی نظر میں غم و مسرت کی مقدار میں کمی بیشی ہو سکتی ہے یعنی کوئی ایسا شخص ہو سکتا ہے جسے معمولی سا واقعہ بھی بہت زیادہ مسرت یا غم پہنچائے اور وہ اس خوشی یا غم کو تادیر محسوس کرے اور یہ بھی ممکن ہے کوئی شخص حادثات کی بڑی سے بڑی آندھی کو بھی اپنی حیات افروز مسکراہٹ میں جذب کر لے یعنی فرق صرف فاصلہ، وقت اور مقدار میں ہوتا ہے، خوبی میں نہیں۔

بعد میں جان اسٹیوارٹ مل نے اس غلطی کو محسوس کیا اور اس کی تردید ایک دل چسپ و معروف جملے سے کی۔ یعنی ایک نامطمئن سقراط ایک مطمئن احمق سے بہتر ہے

مسرت وغم کے سرچشمے بنتیھم یہ کہنے کے بعد کہ تمام قلیل الاختیار اور کثیر الاختیار سماجی اداروں کا واحد مقصود فرد اور مجموعہ افراد کی زندگی میں خوشیوں کی مقدار میں اضافہ

اور غموں کی مقدار میں کمی کرنا ہے۔ منابع مسرت و غم سے بھی بحث کرتا ہے یعنی وہ کون سے سرچشمے ہیں جن سے حیات انسانی میں مسرت و غم کے سوتے پھوٹتے ہیں' یا دوسرے لفظوں میں وہ کون سی قوتیں ہیں جو فرد کی مسرتوں یا غموں کو متعین کرتی ہیں اور اس میں اضافہ یا کمی کا سبب بنتی ہے ان کی تعداد وہ پانچ بتاتا ہے' جو حسب ذیل ہیں۔

۱۔ مادی یا قدرتی

ہمیں کوئی تکلیف یا راحت ایسے ذرائع سے پہنچتی ہے جن پر قابو پانا ہمارے دائرۂ اختیار سے باہر ہو تو ہم اسے مادی یا قدرتی سرچشمۂ مسرت و غم کہیں گے۔ جیسے بارش ایک قدرتی عمل ہے جس کا مناسب وقت پر ہونا باعث راحت ہے لیکن جب یہی بارش غیر مناسب اوقات میں زیادتی کے ساتھ ہو یا ضرورت سے کم ہو یا نہ ہو تو باعث رنج بن جاتی ہے اور اس سے نجات انسان کے بس سے باہر ہے۔

۲۔ سیاسی سیاسی ادارے مثلاً حکومت' پارٹیاں وغیرہ بھی ہماری خوشیوں یا غموں کو متعین کرتے ہیں۔ فرد جس سیاسی جماعت سے متعلق ہوتا ہے' انتخابات میں اس کی کامیابی سے خوش اور شکست سے رنجیدہ ہوتا ہے۔ اسی طرح حکومت کے ذریعے عائد کردہ ٹیکس وغیرہ بھی تکلیف کا باعث بنتے ہیں۔

۳۔ اخلاقی:۔ کچھ ایسے کام ہوتے ہیں جن کو ہم مادی مفاد سے پرے رہ کر محض اخلاقی اقدار کے زیر اثر رہ کر روبعمل لاتے ہیں جو کبھی ہمیں سکون سے ہمکنار اور کبھی تکالیف سے دوچار کرتے ہیں۔

۴۔ مذہبی:۔ مذہبی عقائد بھی کبھی ہمیں سکون بخشتے ہیں اور کبھی رنج کا سبب بنتے ہیں

۵۔ دنیوی۔ ایک سماجی جاندار کی حیثیت سے انسان کو متعدد ایسے کام کبھی بجبر اور کبھی بخوشی کرنے پڑتے ہیں جو بالآخر اس کے رنج و راحت کو متعین کرتے ہیں۔

اقسام مسرت و غم

انسانی سکھ دکھ کو ان پانچ سرچشموں میں محدود کرنے کے بعد بنتھم اقسام مسرت و غم کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اس کے مطابق عام طور پر چودہ قسم کی خوشیاں اور بارہ قسم کے غم پائے جاتے ہیں

چودہ قسم کی خوشیاں حسب ذیل ہیں:۔

[illegible] (۲) مال و دولت کی خوشی (۳) مہارت کی خوشی (۴) [illegible]

(۵) شہرت کی خوشی (۶) طاقت و اقتدار کی خوشی (۷) رحم کی خوشی (۸) دوستی و خیر [illegible]
خوشی (۹) بے رحمی کی خوشی (۱۰) یادوں کی خوشی (۱۱) امید کی خوشی (۱۲) ربط و اتصال [illegible]
(۱۳) احسان کی خوشی۔ (۱۴) ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی خوشی

اسی طرح بارہ قسم کے غم یہ ہیں:۔
۱۔ غریبی کا غم (۲) احساس کا غم (۳) پریشانیوں یا ہچکچاہٹوں کا غم (۴) دشمنی [illegible]
(۵) رسوائی کا غم (۶) مذہبیت کا غم (۷) رحم کا غم (۸) بے رحمی یا بدخواہی کا غم (۹) یاد [illegible]
(۱۰) امید کا غم (۱۱) تصور کا غم (۱۲) تعلقات کا غم۔

بنتھم نے ایسے ریاضی پیمانے بھی متعین کیے جن سے یہ پتہ چلایا جا سکے کہ مسرت اور غم [illegible]
کتنی ہے اور اسی حساب سے اس شے یا عمل کی افادیت و مضرت کیا ہے۔

غلط تنقیدیں افادیت کا یہ بنتھمی فلسفہ اگرچہ اپنے وقت کا ایک مقبول عام فلسفہ تھا [illegible]
بھی اس حیثیت سے کہ یہ اشیاء و اعمال کے معیار خیر و شر ہونے کا ایک نظریہ [illegible]
اسے ایک گونہ اہمیت حاصل ہے۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ دانشوران ماضی و حال نے اسے [illegible]
اعتبار سے بالکل درست و صحیح فلسفہ تسلیم کر لیا ہے۔ دوسرے کسی بھی فلسفہ کی طرح اس پر بھی ناقدانہ [illegible]
اٹھایا گیا اور اس کی تردید کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن اگر ایک غیر جانبدارانہ نگاہ ان تنقیدوں [illegible]
جائے تو چند قابل افسوس نتائج سامنے آئیں گے جو اس بات کے مظہر ہوں گے کہ ناقدین تنقید [illegible]
نہ کر سکے اور ایک صالح صحتمند اور بامقصد تنقید کی ضرورت اب بھی باقی ہے۔

پہلی بات جو ان تنقیدوں کے سرسری مطالعہ میں کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ تنقیدیں عموماً ان [illegible]
سے متعلق ہیں جو نظریہ میں نسبتاً ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر لوگوں نے بنتھم کے اس [illegible]
کہ مختلف سرچشموں سے حاصل شدہ مسرتوں یا غموں میں کوئی خوبیاتی فرق نہیں ہے [illegible]
ہے اور اسی طرح ایک گرفت اس کے زیادہ افراد کے لیے زیادہ تر راحت کے اصول پر کی گئی ہے [illegible]
[illegible] کہ حکومت کو ایسے قوانین کا نفاذ کرنا چاہیے جس سے افراد کی زیادہ سے زیادہ [illegible]
[illegible] کا انتظام ہو سکے تا کہ ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ حکومت کے [illegible]

ہو جائے جس میں ایک سے افراد کی کثیر تعداد کے لیے کم خوشی کا سامان ہوتا ہے اور دوسرے کے نفاذ سے نسبتاً زیادہ مسرتوں کا انتظام ہوتا ہو تو اس صورت میں کس کو کس پر ترجیح دی جائے، اس کا فیصلہ دشوار ہو جائے گا۔

سؤروں کا فلسفہ
دوسری بات جو ان تنقیدوں کے مطالعہ سے ظاہر ہوتی ہے یہ ہے کہ ناقدین نے عموماً جذبات پسندی سے زیادہ کام لیا ہے۔ بینتھم کی خود غرضی اور موقع پرستی کا علم اور اس کے فلسفہ کو سؤروں کا فلسفہ کہا گیا لیکن ظاہر ہے کہ جب تک کوئی ٹھوس دلیل اس کی تردید میں نہ لائی جائے، گالیاں اور طعنوں کی بوچھار عبث ہے۔ آپ اسے سؤروں کا فلسفہ کہیں یا کتوں کا، اس سے بینتھم کے فلسفہ کی صحت متاثر نہیں ہوتی۔ ناقدین نے جذباتیت میں غلط تنقیدیں کر ڈالیں۔ مثال کے طور پر کہا جاتا ہے کہ اگر ہم بینتھم کی یہ بات تسلیم کر لیں کہ ہمارے تمام اعمال کا انتہائی مقصود عارضی مسرتوں کا حصول ہے جو اس عمل کے نتیجے میں ظاہر ہوتی ہے تو پھر حب الوطنی، قومی وفاداری، خدمت عامہ جیسی مجرد اخلاقی قدروں کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔ کیونکہ یہ سب ہمیں کوئی فائدہ نہیں پہنچاتیں۔

بینتھم کے حامیوں نے اس کی معقول تردید کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قوم و وطن کے لیے قربانی دینے یا عوام کی بے غرض خدمت سے بھی ہمیں خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ ہماری روزمرہ کی خوشیوں سے ذرا مختلف ہوتی ہے۔ جب ایک محب وطن سپاہی اپنے وطن کی راہ میں یا ایک نظریہ پرست اپنے نظریہ کی خاطر جان دے رہا ہوتا ہے تو اسے اس بات کی خوشی ہوتی ہے کہ وہ اپنا فرض ادا کرتے ہوئے مر رہا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کی یہ قربانی رائگاں نہیں جائے گی۔ آنے والی نسلوں کے لیے اس کی زندگی اور موت دونوں منارۂ نور اور مشعل راہ ہوں گی

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ تنقیدیں عام طور پر پہلو دار، غلط یا پھر کم اہم پہلوؤں سے متعلق ہیں اور تنقید برائے تنقید کے لیے کی گئی ہیں اور یہ بات تو اظہر من الشمس ہے کہ پوچ اور ہلکی تنقیدیں کسی نظریہ کو نقصان پہنچانے کی بجائے اسے اور جلا بخشتی ہیں نیز اسے مزید مستحکم بنانے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔

ایسا کیوں ہوا، اسے بلا وقت نظر آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ دراصل جن معترضین نے اس پر ناقدانہ نگاہ ڈالی وہ خود زندگی کے حقیقی فلسفہ سے ناواقف تھے۔ شعوری طور پر اگرچہ وہ اس کی تردید کر رہے تھے لیکن غیر شعوری طور پر اسی سے متاثر بھی تھے۔ ان کی فکر یا خود انہیں مادہ پرستانہ تصورات کی بیڑیوں میں جکڑی ہوئی تھیں۔ نیز ایک عمدہ اور صحت مند تحقیق کے لیے جو کشادگی اور وسعت ذہن چاہیے نہیں

میسر نہ تھی۔ اسی وجہ سے ان میں اتنی صلاحیت پیدا نہ ہوئی کہ وہ اس کی تردید منطقی انداز میں کرتے اور دلائل و براہین کے ذریعے اس کی بنیادوں کو منہدم کر سکتے۔ وہ اس فلسفہ میں بے ضمیری کا شکوہ تو کرتے ہیں لیکن جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ یہ ضمیر آیا کہاں سے تو اس کا وہ کوئی جواب نہیں دے پاتے اسی طرح وہ بینتھم کو اس بات پر تو ملامت کرتے ہیں کہ وہ زندگی کی مقصدیت کا قائل نہیں اور خود بھی اس سوال کے جواب سے نابلد و ناآشنا ہیں۔ اس طرح حقیقت سے لاعلمی کی وجہ سے ان کی تنقیدیں ادھوری، ناقص اور نامکمل رہ گئیں وہ اس کی تائید بھی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اس کی مضرتوں سے وہ خوب واقف تھے۔ یہ فلسفہ کس طرح انسان کو مسرت پرست سے موقع پرست اور کلبہ پرست بنا دے گا نیز معاشرے میں اس کے عملی انطباق سے کیا کیا خرابیاں پیدا ہو جائیں گی اور ان کو دور کرنا کس قدر دشوار ہو گا۔ ان سب کا انہیں پوری طرح احساس تھا۔

معمولی ترمیم

بینتھم جو یہ کہتا ہے کہ ہر وہ کام جو ایک فرد یا مجموعہ افراد کے لیے مفید ہے، اچھا ہے اور اسی طرح ہر وہ عمل جو فرد یا مجموعہ افراد کے لیے مضر ہے برا ہے، تو اگر ہم اس جملہ میں معمولی ترمیم کر کے اس طرح کر دیں کہ ہر وہ عمل جو اچھا ہے، مفید ہے اور جو برا ہے مضر ہے یعنی اس اصول کو کہ جو مفید ہے وہی حسین ہے اور وہی حق ہے کو الٹ کر اس طرح کر دیں کہ جو حق ہے وہی حسین ہے اور وہی مفید بھی تو یہ وقت کا ایک انتہائی ترقی یافتہ اور علمی و عقلی اعتبار سے ناقابل تردید نظریہ ہو جاتا ہے۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ دونوں جملوں کا ایک ہی مفہوم نکلتا ہے۔ دراصل اس معمولی ترمیم نے ایک عظیم فرق دونوں کے عملی مطالب میں پیدا کر دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اول الذکر اعمال کے خیر و شر کا پیمانہ فرد کے شعور و تجربہ کو بتاتا ہے جس کے نتیجے میں معاشرے میں فساد ہی فساد پھیل جاتا ہے۔ جبکہ ثانی الذکر یہ پیمانہ اس ذات کو بتاتا ہے جو خود انتہائی حق ULTIMATE-REALITY اللہ ہے۔ اس طرح یہ اپنے دامن میں امن و خوش حالی کے سارے خزانے سمیٹے ہوئے ہے۔

آسمان بہت بارش برسائے گا۔ زمین بہت پیداوار کرے گی (امام مہدی) بڑے بڑے برتن بھر کر دولت بانٹیں گے۔ مویشیوں کی کثرت ہو گی اور آبادی بڑھ جائے گی[1] نیز میری امت وہ خوشحالی دیکھے گی جو اس نے کبھی دیکھی نہ سنی ہو گی۔ زمین پیداوار کو اگلے گی اور کسی بھی چیز کا ذخیرہ نہ کیا جائے گا۔ مال کے اس زمانے میں ڈھیر کے ڈھیر ہوں گے

له له مذکورہ بالا دو[illegible]

ضمنی طور پر اس فلسفے کو سمجھ لینے کے بعد اب ہم اس فلسفہ پر مکمل تنقید کر کے بتائیں گے کہ یہ فلسفہ اپنے آپ میں کس قدر غلط اور فرد و معاشرے کے لیے کتنا نقصان دہ ہے۔ اسی تنقید کی روشنی میں ہم ضمنی طور پر فطرت انسانی کے حقیقی قرآنی نکتہ نظر کی تشریح بھی کریں گے۔

دو حصّے

آسانی کے لیے ہم بینتھم کے فلسفے کو دو حصوں میں منقسم کر دیتے ہیں۔ ایک حصہ محض فرد سے یا فطرت انسانی سے متعلق ہے جس کا اصل الاصول یہ ہے کہ ہر شخص اس شے کو پسند کرتا ہے یا کرنا چاہیے جو اس کی زندگی میں مفید ہو اور اس طرح اس کی مسرت کا ضامن ہو۔ نیز ان کاموں سے بچنا چاہیے جو اس کے لیے غیر مفید ہو یا مضر ہو اور جو اس کے لیے رنج و تکالیف کا سبب بن سکتا ہو۔
دوسرا حصہ وہ ہے جس میں بینتھم اپنے فلسفہ کو جماعت و ریاست پر لاگو کرتا ہے جو اس کے زیادہ سے زیادہ افراد کے لیے زیادہ تر راحت کے اصول میں مضمر ہے۔ یعنی حکومت کو صرف ایسا ہی قانون بنانا چاہیے جو سماج کے زیادہ سے زیادہ اشخاص کے لیے زیادہ مسرتوں کا سبب بن سکے نیز ایسا کوئی قانون نہیں بنانا چاہیے جس سے فرد یا مجموعہ افراد کو تکلیف پہنچے اور ان کے فطری ارتقا میں رکاوٹ بنے۔ (اگرچہ یہ ممکن نہیں کہ ان دو حصص کو بالکل علیحدہ علیحدہ حصار میں مقید کر دیا جائے اور الگ الگ مطالعہ کیا جائے جیسا کہ ہم فرد کی زندگی کو سماج سے علیحدہ نہیں کر سکتے اور سماج بغیر فرد کے وجود میں نہیں آتا۔ ہم فرد کے متعلق کوئی گفتگو کریں گے سماج اس میں ضرور آئے گا اور اسی طرح سماج کے مطالعے میں فرد کی مداخلت بھی یقینی ہے۔)
سطور بالا میں ہم بینتھم کے ناقدین کا یہ خیال نقل کر آئے ہیں کہ وہ اس کے اس نظریہ کو تسلیم نہیں کرتے کہ انسان کا ہر عمل نتائج کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کا متعین کردہ ہوتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مختلف اوقات میں منبع حرکات ہمارے مختلف جذبات اور جبلتیں ہوتی ہیں نیز یہ بھی ضروری نہیں کہ ہم صرف انہیں کاموں

(پچھلے صفحہ کا باقی) ابو سعید خدریؓ سے مروی ہیں۔ اسی مضمون سے ملتی جلتی مختلف حدیثیں مختلف راویوں سے منقول ہیں جن میں سے کچھ نے کچھ کو ثقہ اور کسی نے کسی کو ضعیف ٹھہرایا ہے۔ مگر راقم السطور کی نظر میں یکساں مضمون کا مختلف راویوں (خواہ وہ کسی قدر ضعیف ہی ہوں) سے منقول ہونا حدیث کو معتبر بنا دیتا ہے۔ ویسے اگر یہ حدیثیں ضعیف بھی ہوں تو نفس مضمون پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کیونکہ یہاں یہ کسی دعوے کے لیے بطور حجت نہیں استعمال کی گئی ہیں۔ یہاں بتانا صرف یہ مقصود ہے کہ اگر انسان اپنی زندگی کامل طور پر خدا کے سپرد کر دے اور اسی کے قانون کی پابندی زندگی کے تمام دائروں میں کرے تو لازمی طور پر وہ مادی خوشحالی اور ذہنی سکون سے ہمکنار ہوگا۔

کو کریں جو ہمیں مسرت پہنچانے والے ہوں اور ان کاموں سے کنارہ کشی اختیار کریں جن کا باعث رنج ہونا ہم پر آشکارا ہو۔ ایسے مواقع انسان کی زندگی میں بکثرت آتے ہیں جب وہ ایسا کام کرنے کے لیے خود کو مجبور پاتا ہے جسے وہ دل سے ناپسند کرتا ہے۔ مثال کے طور پر بکر اپنا ایک جائز کام لے کر متعلقہ دفتر میں جاتا ہے مگر کلرک یا افسر جو ایسے ہی کاموں کو انجام دینے کے لیے مقرر رہے۔ اس کام کے لیے بکر سے رشوت طلب کرتا ہے اور بکر اپنی تمام تر ناپسندیدگی کے باوجود اس کا مطالبہ منظور کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں اس نظریہ کی غلطی واضح ہو جاتی ہے لیکن کہا جا سکتا ہے کہ ناقدین کی یہ تنقید صحیح نہیں ہے اور اس میں کم علمی اور دقت نظر کے فقدان کا دخل زیادہ ہے۔

ناقدین کی غلطی

غور کیجیے کہ بکر جو اپنی غرض لے کر متعلقہ دفتر میں گیا ہے وہ اس کے لیے انتہائی اہم اور ناگزیر ہے۔ بکر جانتا ہے کہ اگر وہ غرض پوری ہو گئی تو جلد ہی اسے کوئی بہت بڑا فائدہ حاصل ہو گا۔ وہ اس کی مسرت کے لیے اس چھوٹی ناپسندیدگی کو قبول کر لیتا ہے یعنی یہ رنج بھی اس نے کسی بڑی خوشی کی توقع پر گوارا کیا۔ نیز یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بکر بہت اصول پرست واقع ہو اور اپنی اس اصول پرستی کی وجہ سے وہ بغیر کام پورا کیے ہی لوٹ آئے اور ایک بڑی مسرت کو قربان کر دے تو ایسی صورت میں بھی مسرت کا نظریہ ناکام نہیں ہوتا۔ بلکہ مزید مستحکم ہو جاتا ہے۔ اب بکر کی نگاہ میں اصول کی پابندی سے حاصل شدہ مسرت کی مقدار اس سے بھی زیادہ ہے جو اسے کام مکمل ہو جانے کی صورت میں ملتی۔

واقعہ یہ ہے کہ ہم اپنے چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے کسی بھی عمل کا جائزہ لیں تو پائیں گے کہ ہم نے وہ کام صرف اس لیے کیا ہے کہ ہم خوشی حاصل کرنا یا غموں سے نجات پانا چاہتے تھے۔ چوری، ڈاکہ، قتل، آبروریزی یا پھر صدقہ و خیرات کرنا، عبادتیں کرنا، خاندان کی کفالت کے لیے تیز دھوپ میں محنت کرنا، غرض اچھا یا برا کوئی بھی عمل آپ لیں تو اس کی تہہ میں آپ صرف ایک جذبہ —— مسرتوں کے حصول کو ہی کارفرما پائیں گے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ انسان کے نفس کی کس سطح کو تسکین بخشتا ہے۔ نیز مسرت عارضی ہے یا مستقل صحیح ہے یا غلط۔ درحقیقت بنتھم اس وقت تک کوئی غلطی نہیں کرتا جب تک وہ بتاتا ہے کہ پورا معاشرہ انسانی دو مقتدر اعلیٰ قوتوں —— مسرت اور غم کے زیر اثر ہے۔ اور یہی وہ دو قوتیں ہیں جو ہر انسانی عمل کو منضبط (CONTROL) کرتی ہیں۔ اس کے فلسفہ میں نقص اس وقت پیدا ہوتا

ہے جب وہ یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ اشیاء و اعمال کی افادیت مسرت ہی میں مضمر ہے۔

بینتھم کی بنیادی غلطی

یہ اس کی بنیادی غلطی تھی کہ اس نے افادیت اور مسرت کو غلط ملط کر دیا۔ کیونکہ یہ بالکل ضروری نہیں ہے کہ ایک شے جو ہماری زندگی میں مفید ہو وہ ہمارے لیے باعث مسرت بھی ہو۔ اگرچہ یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ افادیت کبھی مسرت کی ضامن نہیں ہوتی لیکن اس مفروضہ کی بھی تردید محال ہے کہ افادیت ہی مسرت کی بنیاد نہیں ہے۔ افادیت اور مسرت لازم و ملزوم نہیں ہیں۔ اسے ذیل کی ایک مثال کے ذریعے سمجھا جاسکتا ہے۔

ایک مثال

فرض کیجیے، زید ایک قلم خریدنے کی غرض سے ایک دکان پر جاتا ہے۔ دوکان دار اس کی فرمائش پر اس کے سامنے دو قلمیں رکھتا ہے جن میں سے ایک ظاہری طور پر دل کش، لیکن کم مفید ہے، جب کہ دوسرا قلم کم خوبصورت لیکن افادیت کے اعتبار سے مقابلۃً بہتر ہے۔ ایسی صورت میں ضروری نہیں کہ زید دوسرا قلم ہی خریدے جو افادیت میں پہلے قلم سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ زید پہلے قلم کے جمال سے متاثر ہو کر اسی کو خرید سکتا ہے۔ نیز اس مثال کو اس طرح بھی دیکھیے کہ دونوں قلموں میں سے پہلا قلم کم مفید لیکن ارزاں ہے جبکہ دوسرا زیادہ مفید مگر گراں ہے۔ تو ایسی صورت میں بھی یہ لازم نہیں کہ زید زیادہ افادیت والے قلم کو ہی خریدے۔ وہ ارزانی کو افادیت پر ترجیح دے کر اس قلم کو خرید سکتا ہے جس کے بارے میں وہ یہ جانتا ہے کہ یہ افادیت کے لحاظ سے دوسرے کے مقابلہ میں فروتر ہے۔ غور کیجیے کہ افادیت کا نظریہ ان دونوں ہی صورتوں میں ناکام ہوگیا۔ لیکن مسرت کا اصول دونوں ہی صورتوں میں برقرار رہے یعنی پہلی صورت میں زید کو قلم کے ظاہری جمال نے متاثر کیا اور دوسری صورت میں اس کی ارزانی نے۔

(اس دوسری صورت میں زید کو اگرچہ تھوڑا سا غم ہوگا لیکن یہ اس مسرت کے سامنے حقیر ہوگا جو اسے پیسہ بچا لینے کی صورت میں ملے گی۔)

دراصل فطرت انسانی ایک ہمہ گیر شے ہے اور افادیت اپنی تنگ دامانی کے باعث اس ہمہ گیری کو سمیٹنے میں خود کو ناکام پاتی ہے۔ افادیت کے پاس محدود صلاحیتیں ہیں جبکہ انسان کی خواہشیں بے حد و حساب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ چند ہی قدم چل کر اپنی معذوری کا اعتراف کر لیتی ہے اور اپنا مقام کسی دوسری چیز کے لیے چھوڑ دیتی ہے۔

یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ پھر وہ کون سی ایسی شے ہے جو انسان کی وسیع تر مسرتوں کی ترجمان بن سکتی ہے اور اس طرح افادیت کا بدل ہو سکتی ہے

مسرت کی حقیقی بنیاد

کہا جا سکتا ہے کہ وہ حسن ہے یعنی انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے حسن پسند ہے۔ انسان کے مشاہدے میں وقتاً فوقتاً مختلف اشیاء آتی رہتی ہیں جن میں سے کچھ اسے پسند آتی ہیں اور کچھ ناپسند کچھ چیزوں سے وہ متاثر ہوتا ہے اور کچھ اس کے دل میں نفرت کے جذبات پیدا کرتی ہیں۔ انسان جب کوئی شے پسند کر لیتا ہے تو اس شے کا حسن وجمال اس کے احساسات میں ایک تحریک پیدا کر دیتا ہے جس سے وہ اس 'حسن' کو پانے کے لیے بے قرار ہو جاتا ہے اور یہ بے قراری اس وقت تک ختم نہیں ہوتی جب تک انسان اس کو حاصل نہیں کر لیتا۔ اسی احساسِ بے قراری کو جذبۂ محبت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگر یہ محبت ناکام ہو جائے یعنی انسان کسی وجہ سے مطلوبہ حسن کو نہ پا سکے تو اسے غم ہوتا ہے۔ اس کے ٹھیک برخلاف جو شے انسان کے لیے قابلِ نفرت ہوتی ہے اس سے دور رہ کر اسے آسودگی حاصل ہوتی ہے لیکن اگر وہی ناپسندیدہ شے زبردستی (خواہ اس زبردستی کا باعث کوئی بھی خارجی دباؤ مثلاً قدرتی آفات یا حکومتی قانون وغیرہ ہوں) مسلط کر دی جائے تو اسے دکھ ہوتا ہے۔

اس طرح یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ مسرتوں کی مستقل بنیاد اشیاء و اعمال کی افادیت نہیں بلکہ اس کا حسن ہے جو فرد کو اپنے حصول کی خاطر جدوجہد پر مجبور کرتا ہے۔ ممکن ہے کچھ لوگ پیش کردہ مثال کی بنیاد پر یہ اعتراض اٹھائیں کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ زید قلم کی ارزانی یا اس کی ظاہری کشش پر اس کی افادیت کو ترجیح دے۔ تو ایسی صورت میں بھی فلسفۂ حسن کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ کیونکہ اب زید کی نگاہوں میں قلم کی افادیت کا حسن اس کی ارزانی پر یا ظاہری جمال پر غالب ہے۔ اس طرح افادیت بھی اپنے اندر حسن کا ایک پہلو رکھتی ہے جو کبھی غالب ہو کر فرد کو اپنے مطابق عمل کرنے پر مجبور کر سکتی ہے۔

بنتھم کی دوسری غلطی

انسان مختلف اوقات میں مختلف اشیاء سے متاثر ہوتا ہے اور اس کے حصول کی تمنا کرتا ہے۔ جب اسے اس کی محبوب شے مل جاتی ہے تو اسے ایک عارضی خوشی کا احساس ہوتا ہے۔ بنتھم یہ کہتے ہوئے دوسری غلطی کرتا ہے کہ یہی عارضی مسرتیں تمام جدوجہد انسانی کا مقصودِ اصلی ہیں۔ اگر بنتھم کی یہ بات مان لی جائے تو حیوان اور انسان میں فرق کرنا دشوار ہو جائے گا۔ کیونکہ یہ خصوصیت عزم و ارادے سے محروم حیوانوں کی ہوتی ہے کہ ان کا سارا عمل جبلتوں کے تحت

ہوتا ہے اور ان جبلتوں کی تشفی ہی ان کے لیے انتہائی مقصود کی حیثیت رکھتی ہے۔ انسان کو حیوانوں پر یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ خود شعور ہے یعنی اسے اپنے وجود کا احساس ہے نیز اسے عزم و ارادہ کی بھی صلاحیتیں حاصل ہیں۔ اپنی اس خصوصیت کے باعث وہ نامحدودیت طلب ہو گیا ہے۔ یعنی حیوان جہاں اپنی جبلتوں (مثلاً بھوک، جنس، جھگڑا، فرار وغیرہ) کی تشفی کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ انسان ہر وقت خوب سے خوب تر کی جستجو میں لگا رہتا ہے۔ حیوانوں کی خواہشات میں جہاں جمود اور ٹھہراؤ ہے وہیں انسانی ضروریات و خواہشات لامحدود اور انتہائی وسیع ہیں۔ اس کے شوق طلب کی کوئی منزل نہیں کوئی وقتی مسرت اسے تسکین دینے کی بجائے اس کی آتش جستجو کو اور بھی ہوا دے دیتی ہے۔ انسان اپنی زندگی میں مسرتوں کی مقدار اتنی بڑھا دینا اور غموں کا عنصر اتنا کم کر دینا چاہتا ہے کہ ایسا بھی وقت آ جائے جب اس کی زندگی میں صرف خوشیاں ہی خوشیاں رہ جائیں۔ غم بالکلیہ ختم ہو جائے۔

غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ نفس انسانی میں ایسی کوئی جگہ موجود ہے جو لامحدود مسرتوں کی متلاشی ہے وہ اپنا ایک مستقل مطالبہ رکھتی ہے جسے پورا کرنے کے لیے انسان ہر اس شے کی طرف دوڑتا ہے جو اسے حسین لگتی ہے۔ اس حسن کو پا لینے کے بعد اسے ایسا لگتا ہے کہ اس نے اپنی مسرت پسند فطرت کی تشفی کر دی لیکن جلد ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے اور وہ اس سے بھی حسین تر اشیاء کی جستجو میں سرگرم ہو جاتا ہے۔ عارضی مسرتوں اور مستقل مطالبہ میں تطابق اسی صورت میں پیدا کیا جا سکتا ہے۔ جب ہم اپنے وقتی اعمال کی باگ اس کامل مسرت پسند فطرت کے ہاتھ میں دے دیں۔ کامل پسند فطرت کی پذیرائی ظاہر بات ہے کہ حسن کامل سے ہی ہو سکتی ہے۔ قرآن اسی حسن کامل کو اللہ سے تعبیر کرتا ہے جو فرد کی فطرت لامحدود طلب کی آخری منزل ہے۔

جھوٹے الٰہ

اب چونکہ انسان کا علم محدود و ناقص ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اکثر اپنی فطرت کے حقیقی مطالبہ کو نہیں سمجھ پاتا۔ وہ کبھی پہاڑوں، دریاؤں، انسانوں اور اصنام کو حسن کامل سمجھ کر اس کی پرستش کرتا ہے تو کبھی قوم، طبقہ، وطن یا مجرد نظریات کو الٰہ کا درجہ دے کر اس کے مطابق عمل کرتا ہے

ان لوگوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو اپنا رب بنا لیا ٥ (التوبہ - ٥)

کیا تم نے اس کو دیکھا جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا رب بنا لیا ٥ (الفرقان)

وہ کہتے ہیں کہ عیسٰے ابن مریم ہی اللہ ہیں۔

ظاہر ہے کہ انسانوں، مظاہر قدرت اور مجرد نظریات میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو نقص و عیب سے پاک ہو اس لیے ان کی طرف حسنِ کامل کی نسبت بے دلیل ہے۔

کیا ہم نے کوئی سند اور دلیل ان پر نازل کی اس شرک کی صداقت پر جو یہ کیے جا رہے ہیں ۰ (الروم)

اس لیے قرآن انسانوں کو ان تمام جھوٹے خداؤں کی پرستش سے روکتا ہے۔

—— سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو۔ (فصلت)

وہ انہیں اپنی حقیقی فطرت کی طرف لوٹنے کا مشورہ دیتا ہے ——

قائم ہو جاؤ اس فطرت پر جس پر اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا (الروم)

اور وہ فطرت کیا ہے ——

ہم نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لیے پیدا کیا کہ وہ خدا کی عبادت کریں۔

انسانوں سے قرآن کا مطالبہ یہی ہے کہ وہ تمام جھوٹے الہوں سے منہ موڑ کر اسی کی طرف یکسو ہو جائیں۔

ہر جگہ سے بھاگ کر اللہ کی طرف پناہ لو۔ ففروا الی اللہ

کیونکہ —— اللہ کے سوا کوئی اللہ نہیں۔ صرف اللہ ہی حقیقی الٰہ ہے۔ کیونکہ صرف وہی ہر نقص و عیب سے پاک ہے اور ہر حسن و خوبی کا سرچشمہ ہے —— سبھی اچھے نام اللہ کے لیے ہیں۔ وللہ الاسماء الحسنیٰ

حسن مکمل ہونے کے باعث ساری تعریفوں کا مستحق بھی وہی ہے —— سب تعریف اللہ کے لیے ہے۔ الحمد للہ

کائنات اور انسان بینتھم کے فلسفہ کی ایک اور بڑی کمی یہ ہے کہ اس نے انسانوں کا مطالعہ کائنات سے الگ کر کے کیا اور وہ اس کا فہم بھی حاصل نہ کر سکا کہ انسان اور انسان کے مابین تعلقات کی حقیقی نوعیت کیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ سورج، چاند، ستارے، زمین، پہاڑ، ندیاں، حیوانات، نباتات، یہ ساری چیزیں انسان سے غیر متعلق نہیں۔ عالم موجودات کی ان مختلف اشیاء کا باہمی تعلق ان کی علیحدہ علیحدہ افادیت اور ان کا حیرت انگیز نظم، سب مل کر صاف اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ یہ

کائنات کسی اعلیٰ تر مقصد کی طرف ارتقائی مراحل طے کر رہی ہے اور انسان کو بہ حیثیت ایک باشعور وجود کے اس بامقصد ارتقار میں مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ اس لیے نفسیات انسانی کی کسی بھی تشریح میں انسان اور دیگر موجودات کے درمیان تعلق کی توضیح ناگزیر ہے۔ بنتیھم نے سہولت پسندی کے چکر میں پڑکر فلسفہ کے اس موٹے اصول کو نظر انداز کر دیا اور نتیجہ میں انفرادی اور اجتماعی دائروں میں اس سے فاش غلطیاں ہوئیں۔

غور کیجیے کہ کائنات کی ہر شے دیگر اشیار سے علت و معلول کے ایک ناقابل انقطاع تعلق میں بندھی ہوئی ہے۔ ایک شے اگر کسی شے کی معلول ہے تو دوسری طرف متعدد اشیار کی علت بھی۔ علت و معلول کا یہ ہمہ گیر قانون ایک CONE کی شکل میں نیچے کی طرف پھیلتا اوپر کی طرف سمٹتا ہے۔ سمٹاؤ کا یہ سلسلہ بالکل اوپر ایک ایسے نقطہ پر جاکر ختم ہوتا ہے جس کی کوئی علت نہیں ہوتی اور جو ہر معلول کی علت ہوتا ہے۔ اسی کو ہم علتِ تامہ، علۃ العلل، یا خدا کے اسمار سے تعبیر کرتے ہیں۔ علۃ العلل ہونے کے باعث خدا خالق ہے اور دیگر اشیار معلول ہونے کے باعث مخلوق ــــ خالق و مخلوق کے درمیان تعلق عبد و معبود اور مالک و مملوک کا ہے۔ خدا یہ چاہتا ہے کہ اس کے بندے اسے پہچانیں کیونکہ وہی اپنے حسن و کمال کی بنا پر اس لائق ہے کہ اس کی معرفت حاصل کی جائے۔ معبود برحق اور جمال مطلق کے خود اظہاری کا یہی ارادہ تخلیق کائنات کا سبب بنا۔ یہ کائنات ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی اس دور اور اس مرحلے میں داخل ہوئی جب معبود برحق اور جمال مطلق نے حضرت انسان کو پیدا کیا۔ اس میں اپنی روح پھونکی اسے خود شعوری عطا کی، علم عطا کیا، اسے مختلف خصوصیات و صفات سے مرکب کیا۔ ایک طرف اس کو نفس حیوانی اور حیوانی جبلتیں عطا کیں اور دوسری طرف اس کو روحانی و ملکوتی داعیات و جذبات مرحمت فرمائے۔ اس کے سر پر اپنی خلافت و نیابت کا تاج رکھا اور آزمائش کے لیے اپنی وسیع سلطنت کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے ــ زمین ــ پر بھیجا۔ انسان کے نفس حیوانی و روحانی کے درمیان فرق کو واضح کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ ان کا عمل تو تقریباً یکساں ہوتا ہے لیکن نتائج میں بعد المشرقین کا فرق ہو سکتا ہے۔ دراصل وقتاً فوقتاً جو خارجی اشیار حواس مدرکہ کے ذریعے علم انسانی میں آتی ہیں۔ یہ نفسین ان کو علیحدہ علیحدہ اپنے طور پر استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ انسان سے ان کا الگ الگ مطالبہ ہوتا ہے جس کے پورے ہونے پر انہیں خوشی اور ناکامی کی صورت میں غم ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ نفسین جو مطالبا

کسی شے کے بارے میں انسان کے سامنے رکھیں ان میں یکسانیت ہی ہو، ان میں اختلافات بھی ہو سکتے

بنتھم کی غلطیاں

اس ضمن میں بنتھم ایک غلطی تو یہ کرتا ہے کہ نفس حیوانی و نفس روحانی کے مطالبات میں وہ کسی شے کے مسرت بخش یا مسرت کش ہونے کا فیصلہ خود فرد کے شعور و تجربہ پر چھوڑ دیتا ہے۔ اس دوسری غلطی کی نشان دہی کرتے ہوئے ایلبی ALBEE کہتا ہے کہ انسان کے پاس علم کامل نہیں ہے کہ کسی عمل (خواہ انفرادی دائرے میں ہو یا اجتماعی) کا نتیجہ رد عمل سے پہلے معلوم کر لے اسپنسر نے بھی اسی خامی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے کہ —— اس فلسفہ کی عملیت اس بات کا مطالبہ کرتی ہے کہ انسان کامل العلم ہو اور رد عمل کے پہلے نتائج کو جان لینے کی صلاحیت رکھتا ہو

اس طرح اجتماعیت کے دائرے میں پہنچ کر بنتھم کا نظریہ افراد کے لیے مزید خطرناک ہو جاتا ہے ایک حکمراں کوئی قانون[1] بناتے وقت اگر اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ یہ قانون زائد تر افراد کے لیے زائد تر راحت کا باعث ہوگا تو ضروری نہیں کہ اس کی خوش فہمی حقیقت کا روپ بھی دھار سکے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ زائد تر راحت بننے کی بجائے زائد تر مصیبت کا سبب بن جائے۔

پیغمبر اور شریعتیں

پھر اس کا حل کیا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے ہمیں ایک مرتبہ پھر ان سطور پر نظر ڈالنی ہوگی جس میں ہم نے کائنات کی مقصد خالق و مخلوق کے مابین تعلق کی بحث کی ہے۔ اس میں ہم یہ بتا چکے ہیں کہ تخلیق کائنات سے خدا کا مدعا اپنی صفات کا کامل اظہار ہے اور یہ کائنات بتدریج اسی مقصد کی طرف بڑھ رہی ہے۔ انسان کو خود شعوری کا وصف اس لیے عطا ہوا ہے کہ وہ شعوری طور پر اس مقصد کی تکمیل میں معاون بنے۔ یہ خود شعوری جو اسے سماج میں رہ کر حاصل ہوتی ہے ضروری نہیں کہ درست ہی ہو کیونکہ حواس خمسہ کے ذریعے حاصل شدہ علم بھی دو ناقص ہوتا ہے۔ اس لیے خدا اس کی کم علمی کے پیش نظر وقتاً فوقتاً انبیاء و رسل بھیجتا رہا ہے جو اپنے ساتھ شریعتیں لاتے رہے ہیں اور جنہیں قانون سازی کے لیے بنیاد کی حیثیت حاصل ہوتی رہی ہے۔ یہ شریعتیں پہلے مختلف قوموں میں ان کے معاشرتی نظم کے مطابق نازل کی جاتی تھیں لیکن مختلف

---

[1] یہاں قانون سے مراد محض حکومت کے ذریعے جاری کیے گئے قوانین نہیں ہیں بلکہ خاندانی، طبقہ واری اور ملکی اخلاقیات و معاملات تک اس کے دائرے میں آجاتے ہیں۔

سائنسی وعلمی دریافتوں کے باعث انسانوں کے درمیان فاصلے کم ہوتے گئے اور تاریخ انسانی میں ایک ایسا وقت آیا جب کائنات اپنے نظم کے اعتبار سے اس منزل پر پہنچی جب ایک ایسے قانون کا نزول ناگزیر ہوگیا جو بین الانسانی معاشرہ نیز قیامت (مقصد کی تکمیل) تک کے لیے کافی ہو۔ یہ قانون آج ہمارے سامنے قرآن مجید کی شکل میں موجود ہے۔

اسی قانون (شریعت) کے مطابق زندگی بسر کرکے ہم ہمہ جہتی سکون سے ہمکنار رہ سکتے ہیں۔ کیونکہ ان کا منبع حسن کامل ہے اسی کو ہم "حق" سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ انفرادی اور اجتماعی دونوں زندگیوں میں ہمارے جذبۂ حسن کی مکمل ترجمانی کرتا ہے اور اس طرح اپنے اندر حقیقی افادیت مضمر رکھتا ہے۔

آخر میں قارئین ہمارے اداریہ بالا جملے پر پھر نظر ڈالیں جس میں ہم نے کہا تھا:۔

جو حق ہے وہی حسین ہے اور وہی مفید بھی۔

(سید احمد قادری)

عربی لغت میں رجاء کسی مرغوب و محبوب اور پسندیدہ چیز کی توقع اور امید کو کہتے ہیں۔ شرعی اصطلاح میں رجاء اللہ تعالیٰ کی رحمت و کرم اور اعمال خیر پر اجر و ثواب کی توقع اور امید کو کہتے ہیں۔ خوف سے انسان کے دل میں گھبراہٹ اور تکلیف پیدا ہوتی ہے اور رجاء سے فرحت و لذت ۔ اور جس طرح اللہ کے عذاب کا حقیقی خوف وہ ہے جو انسان کو معصیتوں سے بچاتا اور طاعتوں میں مشغول کرتا ہے اسی طرح اللہ کے کرم کی سچی امید وہ ہے جو معصیت سے بچکر اور طاعت میں مشغول رہ کر پیدا ہوتی ہے۔ اس کے بغیر اللہ کی رحمتوں اور عنایتوں کی امید رجاء نہیں بلکہ تمنائے خام دھوکا اور حماقت ہے علماء اور صوفیہ نے حقیقی خوف و رجاء کو پرندے کے دو بازوؤں سے تشبیہ دی ہے۔ مومن انہیں دو بازوؤں سے ہر مطلوب و محمود مقام کی طرف پرواز کرتا ہے۔ ہر دشوار گذار وادی کو طے کرتا اور تقرب الٰہی کی منزل مقصود تک جا پہنچتا ہے۔ اگر کوئی ایک بازو بھی ٹوٹ جائے تو وہ اس پرندے کی طرح مفلوج ہو کر رہ جائے گا جس کا کوئی بازو ٹوٹ گیا ہو۔ مومن نہ خدا کے خوف سے بے نیاز ہوتا ہے اور نہ اس کی رحمت سے مایوس۔ ایک طرف وہ خدا کے خوف سے کانپتا ہے اور دوسری طرف اس کے فضل و کرم کا امیدوار رہتا ہے۔ قرآن میں برگزیدہ بندوں کی یہی حالت اور کیفیت بیان کی گئی ہے:

۱۔ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ (بنی اسرائیل ۶، آیۃ ۴) — اور وہ اس کی رحمت کے امیدوار اور اس کے عذاب سے خائف ہیں۔

۲۔ متعدد انبیاء کرام علیہم السلام کے حالات و واقعات بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے:۔

اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي — یہ لوگ نیکی کے کاموں میں دوڑ دھوپ

الْخَيْرَاتِ وَيَدْعُونَنَا رَغَبًا وَّ — کرتے تھے اور ہمیں رغبت اور خوف کے ساتھ

رَهَبًا ۖ وَكَانُوا لَنَا خَاشِعِينَ (الانبیاء ۶، آیۃ ۹) — پکارتے تھے اور ہمارے آگے جھکے ہوئے تھے۔

اس میں "رغبت" کا لفظ "رجاء" کے معنے میں استعمال ہوا ہے اور اس آیت میں حقیقی خوف و رجاء کو واضح کر دیا گیا ہے۔ نیکی کے کاموں میں آگے بڑھ کر حصہ لینا، اس میں دوڑ دھوپ کرنا، خدا کے سامنے جھکنا اور اس کے ساتھ ساتھ اللہ سے ڈرنا اور اس کے کرم کی توقع رکھنا، یہ ہے وہ مقام جس پر حقیقی خوف و رجاء کے الفاظ صادق آتے ہیں۔

۳۔ تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ — ان کی پیٹھیں بستروں سے الگ رہتی

يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا — ہیں۔ اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ

وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ — پکارتے ہیں اور جو کچھ رزق ہم نے انہیں دیا

(السجدہ ۲، آیۃ ۱۶) — ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

اس میں "طمع" کا لفظ "رجاء" کے معنے میں استعمال ہوا ہے۔ اس آیت میں بھی خوف و رجاء کے ساتھ نماز تہجد اور انفاق فی سبیل اللہ کا ذکر ہے۔

۴۔ أَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ آنَاءَ اللَّيْلِ — بھلا وہ شخص جو مطیع فرمان ہے، رات

سَاجِدًا وَقَائِمًا يَحْذَرُ — کی گھڑیوں میں کھڑا رہتا اور سجدے کرتا ہے

الْآخِرَةَ وَيَرْجُو رَحْمَةَ رَبِّهِ — آخرت سے ڈرتا ہے اور اپنے رب کی رحمت

(الزمر ۱۶، آیۃ ۹) — سے امید لگاتا ہے

ان آیتوں سے واضح ہوا کہ اللہ کے برگزیدہ اور فرماں بردار بندے خوف و رجاء دونوں کے حامل ہوتے ہیں۔ ان آیتوں کے علاوہ قرآن میں کہیں صالحین کے صرف خوف کا ذکر ہے اور کہیں صرف رجاء کا، لیکن ہر جگہ مراد دونوں ہی ہیں اس لیے کہ فی الواقع خوف و رجاء دونوں لازم و ملزوم ہیں، جو خوف شرعاً مطلوب و محمود ہے اس کا وجود رجاء کے بغیر ممکن نہیں۔ اسی طرح جو رجاء مطلوب و محمود ہے، اس کے ساتھ خوف بھی لگا ہوا ہے۔ اسی مفہوم میں خوف و رجاء مقامات تصوف کے دو مقام قرار دیے گئے ہیں۔

قرآن میں اللہ کی رحمت سے مایوسی کو کفر قرار دیا گیا ہے اور ساتھ ہی تمنائے خام کی بھی مذمت کی گئی ہے۔ سورۃ الاعراف میں اہل کتاب کا حال بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے:۔

"پھر اگلی نسلوں کے بعد ایسے ناخلف لوگ ان کے جانشین ہوئے جو کتاب الٰہی کے وارث ہو کر اسی دنیائے دنی کے فائدے سمیٹتے ہیں اور کہتے ہیں کہ توقع ہے ہمیں معاف کر دیا جائے گا اور اگر وہی متاع دنیا پھر سامنے آتی ہے تو پھر لپک کر اسے لیتے ہیں"

(الاعراف ع ۲۱)

یعنی اللہ کی نافرمانی کیے چلے جاتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہتے جاتے ہیں کہ اللہ ہمیں بخش دے گا۔ یہی وہ تمنائے خام ہے جو رجا مطلوب و محمود کی ضد ہے۔ اسی کی توضیح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کی ہے

الاحمق من اتبع نفسہ ھواھا وتمنی علی اللہ[1] — احمق وہ ہے جو اپنی خواہش نفس کے پیچھے چلے اور اللہ پر تمنا کرے۔

ڈھٹائی کے ساتھ گناہ کرتے ہوئے یہ امید کہ اللہ بخش دے گا اسی کو تمنی علی اللہ کہا گیا ہے۔ یہی بات اپنے وقت کے ایک بڑے صوفی نے دہرائی ہے۔

ایک وہ شخص ہے جو نیکی کرتا ہے اور اس کی قبولیت کا امیدوار رہتا ہے۔ دوسرا شخص وہ ہے جس نے کوئی برائی کی اس کے بعد اس نے توبہ کی اور وہ مغفرت کی امید رکھتا ہے تیسرا وہ جھوٹا شخص ہے جو گناہ کیے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے مغفرت کی امید ہے[2]

شاہ کرمانی رح نے رجا محمود کی علامت یہ بیان کی ہے:-

رجا کی علامت حسن طاعت ہے شیخ الاسلام نے اس کی یہ تشریح کی ہے کہ دنیوی اعمال میں یہ بات سب کو معلوم ہے کہ جو شخص اچھی زمین میں دانے بکھیرتا اور زمین کو سیراب کرتا ہے، فصل حاصل کرنے میں اس کی توقع اور امید قوی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اس شخص کا حال ہے جو موسم گرما میں بنجر زمین کے اندر اپنے بیج ڈالے اور یہ کہے کہ اللہ غلہ پیدا کرنے پر قادر ہے۔ اگرچہ اس کی یہ بات صحیح ہے لیکن قابل اتباع نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں اپنے قاعدے، ضابطے جاری اور نافذ کیے ہیں[3]

شاہ کرمانی نے اسی رجا کی علامت حسنِ طاعت بیان کی ہے۔ جو مقامات تصوف کا ایک مقام

---

[1] ترمذی [2] الرسالۃ القشیریۃ ج ۲ ص ۴۰۴ [3] ایضاً

ب سے کچھ اور معانی

علماء اور صوفیاء نے اللہ تعالیٰ کی بے کراں رحمت اور وسیع مغفرت کی نسبت سے بھی رجاء کا ذکر کیا ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ دنیا میں کسی کافر و مشرک کو بھی مایوس نہیں ہونا چاہیے کیونکہ وہ کفر و شرک سے باز آکر اور اسلام قبول کر کے اللہ کی رحمت کا مستحق بن سکتا ہے اسی طرح کسی بڑے سے بڑے گنہگار مسلمان کے لیے بھی مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ہے کیونکہ کفر و شرک کے سوا ہر گناہ (جس کا تعلق حقوق اللہ سے ہو) اللہ کی مشیت کے تحت ہے وہ چاہے تو معاف کر دے اور چاہے تو سزا دے یعنی یہ کہ کسی بندہ انسان کی ہدایت اور پھر اس کی مغفرت سے مایوس ہونا صحیح نہیں۔ نزع سے پہلے ہر شخص تائب ہو سکتا اور اس کی مغفرت ہو سکتی ہے۔

اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اس کی رحمت کی امید کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بندہ مومن اپنے اعمال پر اعتماد نہیں کرتا بلکہ صرف اللہ کی رحمت پر بھروسہ کرتا ہے خواہ اس کا تعلق اس کی نجات و مغفرت سے ہو یا درجات کی بلندی سے۔ کیونکہ اس کی رحمت کے بغیر نہ دوزخ سے نجات مل سکتی، نہ جنت حاصل ہو سکتی اور نہ کوئی بلند درجہ مل سکتا ہے

لینن نے کہا

ان دنوں یہ عام روش ہے کہ سوویٹ یونین میں آزادی اور جمہوریت کی پامالی کا ذمہ دار اسٹالن کو ٹھہرا دیا جائے لینن کو تو اس الزام سے خاص طور پر بری الذمہ قرار دیا جا رہا ہے، لیکن لینن کی تحریروں کا اگر مطالعہ کیا جائے تو اس واہمے کا جو مقامی کمیونسٹ، جمہوری جماعتوں میں نفوذ حاصل کرنے کے لیے پھیلا رہے ہیں، خاتمہ ہو جاتا ہے مثال کے طور پر اس کی تحریروں کے مندرجہ ذیل اقتباسات پر نظر ڈالیے۔

ایک شخص کی حکومت اور ڈکٹیٹرشپ سوویٹ سوشلسٹ جمہوریت کے منافی ہرگز نہیں کیونکہ بسا اوقات ایک ڈکٹیٹر کسی طبقے کے عزائم کی بہتر تکمیل کر دیتا ہے۔ یہ ڈکٹیٹر کئی بار بہت سے کام خود ہی کر دیتا ہے اور یہ ضرورت بسا اوقات پیش آتی ہے۔" (لینن کی مجموعی تحریریں ۱۹۲۳ء کا اڈیشن ۱۷ اویں جلد ص ۸۹)

"ایک بورژوا ملک جتنا زیادہ آزاد اور جتنا زیادہ جمہوری ہوگا اس کی سرمایہ دار ٹولی مزدوروں کے انقلاب کے خلاف اتنی ہی شدت سے زہر اگلے گی۔ (ایضاً جلد ۱۸ ص ۱۰)

رائے دہندگی کا عام حق ایک ایسا پیمانہ ہے جس سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ مختلف طبقے اپنے فرائض کو سمجھنے میں کس حد تک بالغ نظر ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مختلف طبقے مسائل کو حل کرنے پر کس حد تک آمادہ ہیں لیکن مسائل کا حل ووٹ کے ذریعے نہیں ہوتا بلکہ طبقاتی جنگ سے ہوتا ہے۔ طبقاتی جنگ کی کئی شکلیں ہیں جن میں خانہ جنگی بھی شامل ہے۔" (ایضاً جلد ۱۶ ص ۵۵۸)

کمیونسٹوں کو ہر قسم کی قربانی کے لیے تیار رہنا چاہیے اور اگر ضرورت پڑے تو ہر قسم کی چالاکی اور عیاری سے کام لینا چاہیے۔ انہیں غیر آئینی طریقے اختیار کرنے اور صداقت کی پردہ پوشی اور راست پہلو تہی کی تمام چالیں استعمال کرنی چاہییں تاکہ وہ ٹریڈ یونینوں میں نفوذ حاصل کر سکیں۔ ان میں رہ سکیں اور اپنی انقلابی سرگرمیاں جاری رکھ سکیں۔" (ایضاً جلد ۱۷ ص ۱۴۲)

(ماہنامہ تحریک دہلی آزادی نمبر)

رسائل و مسائل

مسلکِ ابو ذرؓ کے بارے میں ایک توضیح

ایک عالمِ دین کا خط

زندگی جولائی ۲،۷۰ سامنے ہے۔ اس میں "مال جمع کرنے کے بارے میں حضرت ابو ذر کا مسلک" کے عنوان سے محمد الغزالی صاحب کی کتاب کا جو اقتباس نقل ہوا ہے کہ سیدنا ابو ذرؓ نے ملک شام میں حضرت معاویہؓ کے تصرفات دیکھے تو انھوں نے اس کے خلاف آواز بلند کی حالانکہ بعض دوسری روایتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا ابو ذرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض روایات کے سبب شروع سے اس خیال کو ماننے والے تھے کہ ضرورت سے زائد مال خرچ ہو جانا چاہیے۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف میں باب الانفاق وکراھیۃ الامساک میں یہ روایت درج ہے:۔

عن ابی ذر انہ استاذن علی عثمان فاذن لہ وبیدہ عصاہ فقال عثمان یا کعب ان عبد الرحمن توفی وترک مالا فما تری فیہ فقال ان کان یصل فیہ حق اللہ فلا باس علیہ فرفع ابو ذر عصاہ فضرب کعبا وقال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ما احب لو ان لی ہذا الجبل ذہبا انفقہ ویتقبل منی اذر خلفی منہ ست اواقی انشدک باللہ یا عثمان اسمعتہ ثلث مرات قال نعم رواہ احمد

اس روایت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کعب احبار کا مسلک جمہور صحابہ کے قول کے مطابق یہی تھا کہ مال کا حق ادا کرنے کے بعد وہ کنز نہیں ہے مگر ابو ذرؓ اس روایت کی بنا پر شروع

ہے اس خیال کے حامل تھے کہ ضرورت سے زائد سب مال خرچ کر دینا چاہیے ۔ بے شک بعض لوگ سیدنا ابوذرؓ کے بارے میں یہ فرما دیتے ہیں کہ ھو اول من دعی الی الاشتراکیۃ وہ باطل ہے کیونکہ اللہ کے بندوں پر سب مال خرچ کر دینے کی دعوت اشتراکیت کی دعوت نہیں ہے ۔ زہد اور اشتراکیت میں نمایاں فرق ہے ۔ ایک میں پہلے خدا کا انکار ہے ۔ دوسرے میں سراسر عبودیت اور رضائیت ہے وشتان بینھما ۔ اور اسی لیے متقدمین نے بھی زہاد امت میں ان کا شمار کیا ہے ۔ اس لیے محمد الغزالی کی تاویل سمجھ میں نہیں آتی ۔

جواب

آں جناب نے مشکوٰۃ کی جس روایت کا حوالہ دیا ہے وہ محمد الغزالی کی تائید کرتی ہے نہ کہ تغلیط ۔ غور فرمائیے ـــ اس روایت میں جس واقعہ کا ذکر ہے وہ بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہی کے عہد خلافت کا ہے ۔ محمد الغزالی نے جو سوال قائم کیا ہے وہ یہ ہے کہ اگر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا مسلک جمہور صحابہ کے خلاف تھا تو اس کا ظہور حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے عہد خلافت میں کیوں نہیں ہوا حضرت عثمانؓ کی خلافت میں کیوں ہوا ؟ ان کے اس سوال کا کوئی جواب مشکوٰۃ کی روایت میں نہیں ہے ۔

اس روایت میں مرقاۃ ، شرح مشکوٰۃ کا جو حاشیہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ واقعہ شام سے ان کی واپسی کے بعد کا ہے جبکہ مدینہ واپس آکر بھی انھوں نے اپنی مہم جاری رکھی تھی اور اسی قسم کے واقعات کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا تھا کہ وہ مدینے سے باہر چلے جائیں اور وہ چلے گئے تھے جب تک حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے عہد خلافت کا کوئی ایسا واقعہ نہ مل جائے کہ حضرت ابوذر نے اپنی رائے کی حمایت میں تشدد دیا ہو ، اس وقت تک محمد الغزالی کا سوال جواب طلب باقی رہے گا ۔ محمد الغزالی کی تاویل و توجیہ کے غلط ہونے کے لیے کم سے کم کسی ایسی روایت کا ملنا ضروری ہے کہ حضرت ابوذر نے حضرت ابوبکر یا حضرت عمر کے عہد خلافت میں اپنی اس منفرد رائے کا اظہار کیا ہو جو ان کی طرف منسوب کی جاتی ہے ۔

سودی قرض سے بنوائے ہوئے مکانات کا کرایہ

سوال

میرا بھانجا ایک بینک کی ملازمت کر رہا ہے۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ بینک کی ملازمت ازروئے شرع صحیح نہیں ہے تو وہ کوشاں ہے کہ کئی برس کی ملازمت ترک کر کے کسی ایسی جگہ ملازم ہو جائے جہاں سودی کاروبار کی لگ لگی نہ ہو۔ بینک کے قواعد کے تحت اس کو ۷ ہزار روپے بطور قرض سود پر مل سکتے ہیں اور آسان قسطوں میں اس کو ادا کیا جا سکتا ہے اگر رقم لیکر اس سے مکانات بنوا لیے جائیں اور ان کے کرایہ کی رقم سے بینک کا قرض ادا کر دیا جائے تو کیا بعد ادائیگی قرض کرایہ کی رقم اس کے لیے ازروئے شرع جائز ہوگی؟

جواب

آپ نے جو سوال کیا ہے در اصل اس کے دو جز ہیں۔ ایک یہ کہ بینک سے سودی قرض حاصل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ دوسرا یہ کہ اگر کوئی شخص سودی قرض لیکر اس سے مکانات بنوائے تو ان کا کرایہ اس کے لیے جائز ہوگا یا نہیں؟

پہلے جز کا جواب یہ ہے کہ میرے نزدیک سودی قرض مجبوری کی حالت میں تو لیا جا سکتا ہے لیکن عام حالات میں جائز نہیں ہے۔

دوسرے جز کا جواب یہ ہے کہ سودی قرض لیکر بنوائے ہوئے مکانات کا کرایہ جائز ہے کیونکہ قرض لیے ہوئے روپے حرام نہیں بلکہ ان پر سود دینا ناجائز ہے۔ قرض لی ہوئی رقم سے جو مکانات بنوائے جائیں گے وہ جائز رقم سے بنے ہوئے مکانات ہوں گے۔

قرض اور زکوٰۃ

سوال

زید ایک شخص کو کچھ رقم امانت کے طور پر رکھنے کو دیتا ہے، ساتھ ہی وہ اس بات کی اجازت

بھی دیتا ہے کہ اس رقم کو کام میں لگایا جا سکتا ہے، فقط اتنی شرط لگاتا ہے کہ رقم محفوظ رہے
اور جس کے پاس رقم امانت ہے وہ سال بسال اس کی زکوٰۃ دیتا رہے کیا شرعاً یہ شکل صحیح ہے؟
اور اگر یہ شکل صحیح نہ ہو تو کوئی اور شکل صحیح ہو سکتی ہے۔

جواب

آپ نے جو صورت لکھی ہے وہ سرے سے امانت رکھنے کا معاملہ ہے ہی نہیں بلکہ قرض کا معاملہ ہے جب یہ اجازت دی گئی کہ رقم لینے والا اس کو اپنے کاموں میں خرچ کر سکتا ہے اور یہ کہ رقم ہر حال میں محفوظ رہنی چاہیے تو اب وہ رقم امانت نہیں رہی بلکہ قرض ہو گئی۔ اب زکوٰۃ ادا کرنے کی شرط پر غور کرنا ہے۔ اگر شرط یہ ہے کہ رقم لینے والا اس کی زکوٰۃ اپنی طرف سے یعنی اپنے پاس سے ادا کرتا رہے اور قرض کی رقم جوں کی توں باقی رہے تو یہ سود ہے۔ مثلاً زید نے خالد کو ایک ہزار روپیے دیے اور شرط یہ لگائی کہ تم کو اس کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی اور میری رقم ایک ہزار محفوظ رہے گی تمہیں مجھے ایک ہزار روپے واپس کرنے ہوں گے تو یہ معاملہ صریح سودی معاملہ ہوگا۔ آپ کا یہ سوال کہ اگر یہ شکل شرعاً صحیح نہ ہو تو صحیح شکل کیا ہوگی؟ آپ کے اس سوال کا جواب یہ ہے کہ پہلے دو باتیں سمجھ لیجیے۔ ایک یہ کہ کسی ضرورت مند کو قرض دینا ایک احسان ہے جس کا اجر بہت ہے۔ اس لیے مقروض پر قرض واپس کرنے کے علاوہ کوئی ذمہ داری ڈالنا روح احسان کے خلاف ہے۔ دوسری بات یہ کہ قرض میں دیے ہوئے روپے اگر ایک نصاب کے برابر یا اس سے زیادہ ہوں تو قرض دینے والے پر ان کی زکوٰۃ کی ادائیگی اس وقت واجب ہوتی ہے جب وہ روپیے واپس مل جائیں۔ اپنے پاس موجود روپیوں سے ان کی زکوٰۃ ادا کرنا قرض دینے والے پر واجب نہیں ہے۔ اس لحاظ سے بھی مقروض پر زکوٰۃ ادا کرنے کی ذمہ داری ڈالنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اور اگر کسی وجہ سے یہ ضروری ہو تو اس کی صحیح شکل یہ ہو سکتی ہے کہ قرض دار، قرض خواہ کی طرف سے جو زکوٰۃ ادا کرے وہ قرض کی رقم سے منہا کر دی جائے۔

اوپر والی مثال کو سامنے رکھ کر سمجھیے کہ زید نے خالد کو ایک ہزار روپے دیے اور دو سال میں خالد نے اس کی زکوٰۃ پچاس روپے ادا کی تو اب خالد کے ذمہ زید کے ساڑھے نو سو روپیے رہ گئے۔ زید اس سے ایک ہزار روپے کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔

اسلامی نظام زندگی کی بنیاد توحید

ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی، صفحات ۴۴، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر۔ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۶

زیر تبصرہ پمفلٹ ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی، استاذ معاشیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی ایک تقریر ہے جو انھوں نے جون ۷۶ء میں بمقام کانپور طلبا و نوجوانوں کی آل یوپی کانفرنس کے موقع پر کی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کو ایک مقالے کی شکل میں مرتب کر دیا تھا۔ یہ مقالہ ماہنامہ زندگی مارچ ۷۲ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا اور اب پمفلٹ کی شکل میں پبلیکیشن ڈویژن اسٹوڈینس اسلامک آرگنائزیشن علی گڈھ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے شائع کیا ہے۔ امید ہے کہ طلبا و نوجوان اس پمفلٹ سے استفادہ کریں گے۔

جناب نجات اللہ صدیقی نے طلبا و نوجوانوں سے بہت سی اچھی باتیں کہی ہیں اور انہیں قیام دین کی جد وجہد کے لیے ابھارا ہے اور مختلف انداز میں انہیں سمجھایا ہے کہ یہ کام یعنی ہندوستان میں اقامت دین کا کام اللہ کی دی ہوئی عقل کو پوری طرح استعمال کیے بغیر ممکن نہیں ہے لیکن عقل کا استعمال کتاب و سنت کی روشنی میں ہونا چاہیے۔ اس سے آزاد ہو کر نہیں۔ کتاب و سنت سے استفادے کے لیے مجتہدانہ ذہن کی ضرورت ہے۔ دوسروں کے علم و فہم اور ان کے اقوال و آرار کا سہارا لیکر تقلیدی ذہن کے ساتھ اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت سے استفادہ دراصل ناقص استفادہ ہوتا ہے۔ چونکہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی تقریر میں اجتہاد اور عقل کے استعمال پر بہت زور دیا ہے اس لیے امید ہے کہ طلبہ اور نوجوان ان کی کہی ہوئی باتوں کو بھی عقل کی ترازو پر تول کر ہی قبول کریں گے محض ڈاکٹر صاحب کی تقلید میں اس کو قبول نہیں کریں گے۔ چونکہ یہ پمفلٹ میرے پاس تبصرے کے لیے آیا ہے اس لیے اس کا حق ادا

نہ ہوگا۔ اگر وہ چند باتیں یہاں عرض نہ کردوں جو میں نے محسوس کی ہیں۔

۱۔ اس کتابچے کا جو موضوع اور عنوان ہے اس کو دیکھ کر قاری سب سے پہلے یہ جاننا چاہتا ہے کہ وہ عقیدہ توحید ہے کیا جو اسلامی نظام زندگی کی بنیاد ہے۔ لیکن پمفلٹ میں اس کی کہیں کوئی تشریح نہیں کی گئی ہے ـــ عقیدۂ توحید اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے بارے میں اس تصور کا نام ہے جو کتاب وسنت نے ہمیں عطا کیا ہے۔ جب تک کسی انسان کو اس تصور پر یقین نہ ہو وہ نہ غیر اللہ کی غلامی سے مکمل آزادی حاصل کرسکتا ہے اور نہ اللہ کی مکمل بندگی کرسکتا ہے ـــ اللہ کی مکمل بندگی اور غیر اللہ سے مکمل آزادی، عقیدہ توحید کا لازمی اقتضا اور اس کا حاصل ہے خود عقیدۂ توحید نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن میں اللہ کے واحد الٰہ اور واحد رب ہونے کو اس کی مکمل بندگی کے مطالبے کے لیے اساس وبنیاد کے طور پر پیش کیا گیا ہے اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہ (اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے) جب تک کوئی انسان، ان صفات کے ساتھ جو قرآن میں بیان کی گئی ہیں اللہ کو الٰہ واحد اور رب واحد مان لے اللہ کی مکمل بندگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ عبادت، عمل ہے، عقیدہ نہیں ہے

جب یہ کتابچہ ان افادۂ عام کے لیے شائع کیا گیا ہے تو ضروری تھا کہ کم سے کم ایک دو صفحہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے اس تصور کو پیش کرنے پر صرف کیا جاتا جس کی تعبیر لفظ 'توحید' سے کی جاتی ہے۔ موجودہ حالت میں اس کتابچے کے مباحث ومضامین اور اس کے عنوان میں مطابقت محسوس نہیں ہوتی۔ اس کے مباحث ومضامین کے لحاظ سے اس کا عنوان "اجتہاد کی ضرورت اور عقل کا استعمال" ہونا چاہیے

۲۔ فاضل مؤلف ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

مثال کے طور پر اسی سوال کو لیجیے کہ آج کے ہندوستان میں اسلام کی دعوت کس طرح دی جائے کہ بالآخر یہاں قیام دین کی راہ ہموار ہوجائے۔ یہ ایک نیا مسئلہ ہے۔ یہ پہلے کہیں موجود نہ تھا کیونکہ آج کا ہندوستان جو آج پایا جاتا ہے وہ پہلے تھا ہی نہیں۔ آج کا ہندوستان کل کے ہندوستان سے بہت مختلف ہے ہمیں اس سوال کا جواب خود سوچنا ہے۔ اس سوال کا جواب نہ مولانا مودودی کی تحریروں میں مل سکتا ہے، نہ مولانا الیاس کے ملفوظات میں۔ اس سے پہلے کے لوگوں کا ذکر کیا جائے۔ اس سوال کا جواب ہمیں قرآن وسنت میں اور اپنی عقل وتجربہ

مدد سے خود حاصل کرنا ہے۔ صفحہ ۲۷-۲۸

یہ عبارت پڑھ کر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کی دعوت پیش کرنے کے سیاق میں آج کے ہندوستان اور کل کے ہندوستان میں وہ کیا فرق پیدا ہو گیا ہے جس کی بنیاد پر آج دعوت اسلامی کا وہ طریقہ نہیں ہونا چاہیے جو کل تھا لیکن اس سوال کا کوئی جواب اس کتابچہ میں نہیں ہے۔ یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ آج کے ہندوستان میں دعوت اسلامی کا طریقہ کیا ہے؟ لیکن اس سوال کا بھی کوئی جواب موجود نہیں ہے۔ "اللہ کی مکمل بندگی اور غیر اللہ سے مکمل آزادی" نہ کل کے ہندوستان میں تھی اور نہ آج کے ہندوستان میں ہے۔ کل بھی باشندگانِ ملک سے یہ کہنا تھا کہ اللہ کی مکمل بندگی کرو اور غیر اللہ سے مکمل آزادی حاصل کرو اور آج بھی یہی کہنا ہے کل بھی انسان کو انسان کی غلامی سے آزاد کر کے اللہ کی غلامی میں داخل کرنے کی جدوجہد کرنی تھی اور آج بھی یہی کوشش کرنی ہے۔ تو پھر آج کے ہندوستان کو کل کے ہندوستان سے "بہت مختلف" کہنے کا مطلب کیا ہے؟ فاضل مولف کو دعوت توحید کے سیاق میں کل اور آج کے ہندوستان میں فرق واضح کرنا چاہیے تھا اور بتانا چاہیے تھا کہ آج دعوت اسلامی کا طریقہ کیا ہو۔

مولانا مودودی اور مولانا الیاس کے طریق دعوت میں شک پیدا کرنا اور خود کوئی طریقہ نہ بتانا کوئی مناسب بات نہیں ہے۔

۳۔ ایک طرف تو فاضل مؤلف کتاب و سنت کو تمام درمیانی واسطوں اور انسانی رجحانات سے آزاد ہو کر براہِ راست سمجھنے کی دعوت دیتے ہیں جس کے لیے دوسری شرطوں کو چھوڑ کر کم سے کم عربی زبان جاننا ضروری ہے اور دوسری طرف غیر عربی داں نوجوانوں کو کتاب و سنت کے اردو ترجموں تفسیروں اور تشریحوں کا سہارا لے کر مسائل حیات میں کتاب و سنت کی رہنمائی حاصل کرنے کی نصیحت بھی کرتے ہیں۔ یہ دونوں متضاد باتیں ہیں کیونکہ اگر کوئی شخص قرآن و حدیث کے دس ترجمے اور دس تفسیریں اور دس تشریحیں پڑھ کر بھی کوئی رائے قائم کرے گا جب بھی وہ درمیانی واسطوں اور انسانی رجحانات سے آزاد نہیں ہو گا۔

۴۔ یہ کتابچہ پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فاضل مؤلف نے اپنی سمجھ کے مطابق تقلید جامد کے جو مناظر دیکھے ہیں اسکی وجہ ان پر سخت ردعمل ہوا ہے اور وہ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ جب تک نوشت و خواند سے واقف ہر مسلمان مجتہد مطلق نہ ہو جائے وہ غیر اللہ سے مکمل آزادی حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ ایک غلط خیال ہے، کتاب و سنت کو براہ راست سمجھنے اور رہنمائی حاصل کرنے کے کچھ حدود و شرائط ہیں اگر کوئی شخص انہیں نظر انداز کریگا تو وہ کتاب و سنت سے صحیح رہنمائی حاصل نہیں کر سکے گا بلکہ یہ عین ممکن ہے کہ وہ خود کتاب و سنت کا رہنما بن جائے اور یہ کوئی قیاسی بات نہیں ہے۔ آج بہت سے لوگ ان حدود و شرائط کو نظر انداز کر کے اللہ و رسول کے رہنما بنے ہوئے ہیں۔

Only Title Printed at Shanker Press, Rampur.

ماہنامہ

نومبر سنہ ۱۹۷۳ء

ماہنامہ

زندگی

مدیر:- سید احمد قادری

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
دو ڈالر
ہوائی ڈاک سے

سالانہ چندہ
ہندوستان سے 15/-
پاکستان سے 15/-
ششماہی
ہندوستان سے 5/-
پاکستان سے 5/-
قیمت فی پرچہ 1/-

جلد:- 51 | شوال المکرم ۱۳۹۳ھ مطابق نومبر ۱۹۷۳ء | شمارہ: 5

اس دائرہ ◯ سرخ نشان کا مطلب ہے

کہ آپ کی مدت خریداری اس شمارے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ اگر آپ کی طرف سے چندہ یا رسالہ بند کرنے کے لیے خط نہ مل سکا تو اگلا پرچہ ان شاء اللہ وی پی سے حاضر ہوگا۔ امید ہے کہ وی پی وقت پر وصول فرمائیں گے

منیجر زندگی رام پور یوپی

مالک۔ دعوت ٹرسٹ دہلی۔ ایڈیٹر سید احمد قادری۔ پرنٹر پبلشر۔ احمد حسن۔ مطبع ناظم پریس بازار نصر اللہ خاں

مقام اشاعت دفتر "زندگی" رام پور۔ یوپی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(سید احمد قادری)

زندگی مئی ۷۳ء کے اشارات میں تل چری (کیرلا) کے اس سمپوزیم پر ایک مختصر نوٹ لکھا گیا تھا جس میں تین مسلمان ججوں نے مسلم پرسنل لا اور یکساں سول کوڈ پر اپنے مقالے پیش کیے تھے۔ وہ سمپوزیم ۱۸ مارچ ۱۹۷۳ء کو منعقد ہوا تھا۔ مارچ ۷۳ء ہی میں جناب محمد یوسف صاحب امیر جماعت اسلامی ہند نے ان تینوں ججوں کو خطوط لکھے تھے کہ وہ انہیں اپنے مقالات کی نقلیں بھیج دیں۔ کیرلا ہائی کورٹ کے دو ججوں مسٹر وی خالد اور مسٹر پی کے محمد و نے اپنے مقالات کی نقلیں انہیں بھیج دیں لیکن سپریم کورٹ کے جج مسٹر بیگ نے مقالہ بھیجنا تو الگ رہا خط کا جواب تک نہیں دیا۔ ۲۴ مئی ۷۳ء کو مسٹر جسٹس بیگ کا مقالہ "یکساں سول کوڈ" کے عنوان سے "انڈین ایکسپریس" دہلی میں شائع ہوا۔ ۲۳ جون ۱۹۷۳ء کو محترم امیر جماعت اسلامی ہند نے مسٹر جسٹس بیگ کو ایک مفصل خط لکھا اور دو ماہ تک اس کے جواب کا انتظار کیا لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ اب انھوں نے اپنا وہ خط متعدد اخبارات و رسائل کو اشاعت کے لیے بھیجا ہے۔ ان کے خط کی ایک نقل ادارۂ زندگی کو بھی ملی ہے۔ انھوں نے بجا طور پر یہ کہا ہے کہ سپریم کورٹ کے کسی جج کو کسی مختلف فیہ مسئلے میں یا تو جانب داری اختیار نہیں کرنی چاہیے اور اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو پھر تنقید کو خوش آمدید کہنا چاہیے اور ان لوگوں کو مطمئن کرنا چاہیے جو ان کی رائے سے متفق نہیں ہیں۔ چپ سادھ لینا صحیح طرز عمل نہیں ہے۔ محترم امیر جماعت نے یہ بھی کہا ہے کہ مسٹر جسٹس بیگ کو جو خط لکھا گیا تھا وہ برائے اشاعت نہ تھا بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ ایک اہم مسئلے پر باہم تبادلۂ خیال کیا جائے لیکن جواب موصول نہیں ہوا اس لیے وہ اسے پریس میں دے رہے ہیں۔

محترم امیر جماعت کے خط کا اردو ترجمہ ۱۶ ستمبر ۱۹۷۳ء کے اخبار دعوت دہلی میں شائع

ہوا تھا لیکن معلوم نہیں کس طرح ان کے خط کے متعدد پیراگرافوں کا ترجمہ شائع ہونے سے رہ گیا اور عبارت غیر مربوط ہو گئی۔ ان پیراگرافوں کا ترجمہ ہم نے خود کیا ہے۔ ہم اشارات کے صفحات میں محترم امیر جماعت کے خط کا مکمل ترجمہ شائع کر رہے ہیں۔

جسٹس بیگ کے نام امیر جماعت اسلامی ہند کا مکتوب

۲۳ جون ۱۹۷۳ء

مکرمی جناب بیگ صاحب!

میں نے ۱۳ مارچ کو آپ کی خدمت میں ایک خط روانہ کیا لیکن آپ کی طرف سے اب تک جواب سے محروم ہوں۔ امید ہے کہ آپ بفضل خدا روبصحت ہوں گے۔

نماز پنجگانہ کے بعد اگر آیت اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ کی تلاوت کرکے اللہ تعالیٰ سے خضوع اور خشوع سے دعا مانگی جائے تو ان شاء اللہ نفس یا دریدسے متعلق امراض قلب سے شفا حاصل ہو گی۔ مرض وصحت موت وحیات بہرحال خداوند قدوس ہی کے قبضہ واختیار میں ہے جس کے حضور ہمیں ہمیشہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے الفاظ میں یہ دعا کرتے رہنا چاہیے واذا مرضت فھو یشفین — میری دعا ہے کہ خدا آپ کو جلد شفایاب کرے۔

آپ کا مضمون جو اخبار انڈین ایکسپریس دہلی کی اشاعت مورخہ ۴ مئی میں زیر عنوان "یکساں سول کوڈ" شائع ہوا ہے۔ میں نے دیکھا۔

میری دانست میں آپ کا یہ ادعا کہ قرآن میں ایجابی قوانین کے ضوابط کا جز بہت کم ہے' درست نہیں ہے اور اس ذیل میں آپ کا یہ ارشاد کہ "اگر مسلم لا کی اصل کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ بڑی حد تک ان ضوابط پر مبنی ہے جنھیں خصوصاً دمشق کے ماہرین قانون نے مدون کیا ہے۔ میرے لیے بالکل ناقابلِ فہم ہے۔ کیا آپ براہ کرم وضاحت فرمائیں گے کہ دمشق کا اس مسئلے سے کیا تعلق ہے؟

جس سیاق میں آپ نے یہ مضمون قلمبند فرمایا ہے اس سے واضح ہے کہ ایجابی قوانین کے ضوابط سے آپ کی مراد وہ قوانین ہیں جنھیں عرف عام میں مسلم پرسنل لا کہا جاتا ہے درآنحالیکہ صورت واقعہ یہ ہے کہ پرسنل لا کے تقریباً تمام ہی موضوعات پر خود قرآن کریم ہی میں تفصیلی قوانین موجود ہیں اور یہ قوانین ۱۴ سو سال سے تمام

مسلم ممالک میں نافذ و رائج ہیں۔ مثال کے طور پر ان رشتوں کو لیجیے جن کے مابین مسلمانوں میں نکاح ممنوع ہے ان کی ایک مکمل فہرست قرآن شریف ہی میں موجود ہے۔ اسی طرح اسلامی قوانین وراثت کی اساسی بنیادیں اور ورثاء کی فہرست مع ان کے حصہ رسدی کی صراحت کے تفصیلاً قرآن میں مذکور ہے نکاح، مہر، طلاق، عدت اور وصایا کے معاملہ میں بھی یہی صورت حال ہے ان تمام امور کے بارے میں جامع ایجابی قوانین قرآن میں موجود ہیں اور سنت کے ذریعے ان قوانین میں بہت ہی قلیل اضافہ ہوا ہے۔

لیکن بہر حال یہ طے شدہ امر ہے کہ اسلامی قوانین کا واحد ماخذ قرآن نہیں ہے۔ حدیث و سنت رسول بھی اسلامی قوانین کا یکساں مستند ماخذ ہیں۔ اس لیے کہ شرعی امور کے بارے میں جو کچھ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان فیض ترجمان سے ارشاد فرمایا وہ وحی الٰہی کی روشنی میں فرمایا اور آپ نے اپنے قول و عمل سے منشائے ربانی کی توضیح و تشریح فرمائی ہے۔

مثال کے طور پر میں عرض کروں کہ جہاں قرآن شریف میں پنج وقتہ نماز کی ادائیگی کی تاکید بار بار آئی ہے وہیں نماز سے متعلق بہت سی تفصیلات کا قرآن میں کہیں ذکر نہیں اور ان کا علم حدیث رسول کے ذریعہ ہوتا ہے۔ دوسری فرض عبادات یعنی روزہ، زکاۃ اور حج اور دیگر بہت سارے سیاسی تمدنی سماجی اور معاشی وغیرہ امور کے بارے میں بھی صورت حال یہی ہے۔ اس طرح کتاب و سنت (نہ کہ صرف قرآن) اسلامی قوانین کی دو اصل بنیادیں ہیں اور اجماع و قیاس ان دونوں کے تابع ہیں

اس سلسلے میں اصل غلطی اس حقیقت کو نظر میں نہ رکھنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ اسلام کا مدعا ایک صالح اور نیک سماج کی تشکیل ہے اور یہ کہ ایسے سماج کی تشکیل مجرد قانون کے ذریعے ممکن نہیں بلکہ قانون کا احترام اور قانون ساز کی تکریم بھی ناگزیر ہے۔ اسلام کی خوبی ہی یہ ہے کہ قرآن میں جہاں احکام مذکور ہوئے ہیں ان کے ساتھ ساتھ ان کے اتباع پر جزا اور عدم اتباع پر سزا کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے اور ایسے مواقع پر اللہ تعالیٰ کے خوف اور اس کی عظمت کی طرف متوجہ کر دیا گیا ہے اس طرح قلوب و اذہان کو قانون کی پابندی کی طرف ہمہ جہتی طور سے مائل کیا گیا ہے۔ سیکولر قوانین کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔ علاوہ ازیں قانون کے پیچھے الوہی سند کا ہونا بجائے خود کسی دنیوی ریاست کی قاہرانہ طاقت سے زیادہ موثر ہوتا ہے۔ اس طرح قرآنی قوانین میں قانون اخلاقیات اور روحانیت

کا ایک حسین ولطیف امتزاج پایا جاتا ہے۔ اس طرح ان تینوں کی مجموعی تعلیم واشاعت اور روزمرہ کی زندگی میں ان کے عملی انطباق سے ہی سماج کی کامل اصلاح ممکن ہے۔ تمام انبیائے ماسبق کی تاریخ شاہد ہے کہ ان کی تعلیمات پر جب سوسائٹی کی تعمیر ہوئی وہ ایک صالح اور نیک سوسائٹی بنی۔

آپ کو اسلام میں تعدداز دواج کی گنجائش پر اعتراض ہے اور اس سلسلے میں آپ نے جسٹس امیر علی مرحوم کا حوالہ بھی دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو مرحوم کے اس فقرے سے غلط فہمی ہوگئی ہے جو انھوں نے اپنی کتاب محمڈن لا (ایڈیشن بابت ۱۹۰۸ء) کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ

"اس یقین کے نتیجے میں اسلامی علمار کا ایک بڑا اور روزافزوں طبقہ تعدداز دواج کو صراحۃً غیر قانونی سمجھتا ہے اور خصوصاً معتزلہ اس معاملے میں بہت آگے ہیں۔"

میں پوری صفائی سے یہ بات کہہ دینا چاہتا ہوں کہ یہ فقرہ لکھ کر امیر علی صاحب نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان اصحاب رسول کی تحقیر کا ارتکاب کیا ہے جن کی زوجیت میں ایک سے زائد بیویاں داخل تھیں۔ اس لیے کہ امیر علی صاحب کے اس بیان کا مطلب یہ ہے کہ رسول اور اصحاب رسول فہم قرآن سے عاری تھے، یا پھر نعوذ باللہ انھوں نے دانستہ طور پر احکام الٰہی کی خلاف ورزی کا ارتکاب کیا اور پھر امیر علی صاحب نے ان اسلامی علمار کی تفصیل بھی نہیں بیان کی ہے جو اس خیال کے حامل تھے اور جہاں تک اس بارے میں معتزلہ کے عقیدے کا تعلق ہے امیر علی صاحب نے صریحاً غلط بیانی کی ہے۔ علامہ زمخشری جو معتزلہ کے مستند ترین مفسر قرآن ہیں وہ اس عقیدے کو معتزلہ سے منسوب نہیں کرتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امیر علی صاحب کی راست قرآن وحدیث تک رسائی نہیں تھی فرقہ معتزلہ میں یہ عقیدہ نہیں پایا جاتا کہ تعدداز دواج غیر قانونی ہے اور اس فرقہ کے ایک دو افراد نے اگر ایسا عقیدہ رکھا ہو تو وہ حجت ہے اور نہ سند۔

میں اس موقع پر ان کثیر دلائل کا اعادہ نہیں کرنا چاہتا جو تعدداز دواج کی گنجائش کے حق میں دیے گئے ہیں۔ آپ کے مطالعے کے لیے علیحدہ سے صرف ایک کتابچہ روانہ کرنے پر اکتفا کر رہا ہوں لیکن اس موقع پر آپ کی توجہ ان حالیہ شرمناک داستانوں کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جن میں برطانیہ کے مسٹر لیبمٹن اور جیلیکو ملوث ہیں۔ امریکہ کے آنجہانی صدر روزویلٹ اور ان کے سکریٹری کے درمیان ناجائز تعلقات بھی ابھی دنیا کے علم میں آئے ہیں اور ماضی قریب میں لارڈ پروفیومو اور کرسٹین کیلر کی

حیا سوز داستان بھی ابھی ذہن سے فراموش نہیں ہوئی ہے کیا یہ سب اس بات کا ثبوت نہیں ہیں کہ قرآن کے اصولوں کی بنیاد پر تشکیل پائی ہوئی وہ سوسائٹی جس میں تعدد ازدواج کی رعایت موجود ہے اس سوسائٹی کے مقابلہ میں کہیں زیادہ صالح اور پاکیزہ ہوتی ہے جسے آج کل کی مہذب اور جدید سوسائٹی کہا جاتا ہے جس میں صنفی انارکی پائی جاتی ہے جہاں ناجائز جنسی تعلقات کو منضبط کیا جاتا ہے جس میں جنسی میلے منعقد کیے جاتے ہیں جن میں نوجوان جوڑے بلا جھجک اور کھلے عام جنسی افعال کا ارتکاب کرتے ہیں اور جہاں لواطت و زنا کاری کو قانونی درجہ حاصل ہو چکا ہے کس قدر گندی اور متعفن ہے یہ یک زوجگی پر عامل سوسائٹی

اسلامی تعدد ازدواج کی حمایت میں متعدد غیر مسلموں کی رائیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ مسز سروجنی نائیڈو کی رائے تو مشہور و معروف ہی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے کہ بینونی (BENONI) اس بارے میں کیا کہتے ہیں :-

> عیسائی ممالک یک زوجگی کا بڑا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں لیکن درحقیقت وہ تعدد ازدواج پر عامل ہیں۔ اس معاملہ میں اسلام بنیادی طور پر ایک دیانت دارانہ مذہب ہے اور دوسری بیوی کی اجازت دیتا ہے اگر شوہر کو ضرورت ہو اور اس طرح سماج کے اخلاق کی حفاظت کرتا ہے۔

آپ کا یہ بھی ادعا ہے کہ مسلم پرسنل لا کے باب میں شریعت اسلامی کے مغائر ریاست کے قانون سازی کے حق کو کسی بھی مسلم ملک میں چیلنج نہیں کیا گیا ہے۔

یہ تو ہو سکتا ہے کہ ہر اسلامی ملک میں بعض ایسے تجدد پسند لوگ موجود ہوں جو مسلم ریاست کے لیے ایسے لامحدود حق کے حامی و مؤید ہوں لیکن ہر اسلامی ملک کی آبادی کی عظیم اکثریت اس رائے کی مضبوطی سے حامل ہے کہ ریاست کو شرعی قوانین کے حق سے متناقض قانون سازی کا اختیار حاصل نہیں ہے اور حق تو یہ ہے کہ کتاب وسنت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اجماع اور قیاس کے ذریعے صرف ذیلی قواعد و ضوابط ہی اخذ کیے جا سکتے ہیں اور اس کام کو وہی لوگ کر سکتے ہیں جو کتاب وسنت کا گہرا مطالعہ علم و فہم رکھتے ہوں اور جن کی زندگیاں کتاب وسنت کے مطابق بسر ہوتی ہوں۔ ہر کہ و مہ اس کا مجاز نہیں ہے اور یہی وہ کام ہے جو نیک طبع اور صالح فقہائے اسلام نے انجام دیا ہے۔ قرآن یا سنت

میں موجود کسی قانون میں تبدیلی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

بنیادی حقیقت یہ ہے کہ خود رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اللہ کے دیئے ہوئے قانون میں تبدیلی کرنے کا اختیار نہ تھا۔ پھر کسی پارلیمنٹ یا کسی اور صاحب اختیار کے بارے میں کیا کہا جائے یہ اہم حقیقت کہ خود رسول خدا کو قانون الٰہی کو بدل دینے کا اختیار نہ تھا۔ ان لوگوں کو معلوم نہیں ہے جو قانون الٰہی میں تبدیلی کرنے کی حمایت کرتے ہیں۔ ورنہ وہ تبدیلی کی کوئی تجویز پیش کرنے کی جرات نہ کرتے۔

آپ نے دو مختلف الفاظ چینج (CHANG) اور کوڈی (CODiFiED) استعمال کیے ہیں یہ دونوں بالکل ہم معنے اور مترادف نہیں ہیں۔ اکثر مسلم ممالک میں مسلم پرسنل لا کی تدوین اس سے آگے نہیں بڑھی ہے کہ چار مسلمہ مذاہب فقہ میں سے کسی ایک کے قول کو اختیار کر لیا گیا ہے ان ممالک میں مسلم پرسنل لا کی تدوین اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس چیز کے لیے تبدیلی (چینج) کا لفظ استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں تک ان دو ایک مسلم ممالک کا تعلق ہے جنھوں نے فقہ کے چاروں مذاہب سے الگ ہٹ کر کچھ قوانین بنائے ہیں تو یہ محض چند ڈکٹیٹروں — جیسے ترکی کے اتاترک اور پاکستان کے ایوب — کی دھاندلی ہے۔ یہ کھلم کھلا شریعت کی خلاف ورزی اور ارتکاب جرم کا معاملہ ہے۔ ان کے اس عمل کو جائز اور قانونی نظیر کی حیثیت حاصل نہیں ہو۔ یہ ایک بالفعل (ڈی فیکٹو) تبدیلی ہے۔ جائز اور برحق (ڈی جوری) تبدیلی نہیں ہے۔ جمہوریت جو عوام کی رائے کا نام ہے ان کے اس جرم کی مذمت کرتی ہے۔

آپ اس بات کی حمایت و وکالت کرتے ہیں کہ مذہب کو معاشرتی، اقتصادی، تہذیبی اور قانونی معاملات سے الگ کر دیا جانا چاہیے۔ اس کی بنیاد خدا اور مذہب کے بارے میں محدود مغربی تصور پر ہے جو بالکل غیر اسلامی اور اس تصور کے خلاف ہے جو قرآن اور پیغمبر اسلام کی تعلیمات میں دیا گیا ہے۔ قدرتی طور پر عقل عام یہ سوال کرتی ہے کہ کسی ایسے خدا کی ضرورت و افادیت کیا ہو جو انسان کی روح وخیال کی اندرونی زندگی کی رہنمائی تو کرتا ہے لیکن وہ سماجی برتاؤ، اقتصادی معاملات اور سیاسی طرز عمل اور زندگی کی مختلف و متعدد سرگرمیاں میں انسان کی رہنمائی نہیں کر سکتا حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے جو خالق اور ہادیِ مطلق ہے انسانی زندگی کے مختلف دائروں کے

لیے بنیادی ہدایات دی ہیں اور ہر مسلمان کو انہیں کا پابند رہنا چاہیے کیونکہ جس خدا نے انسان کو پیدا کیا ہے وہی بہتر طور پر جانتا ہے کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں کیا چیز اچھی ہے اور کیا چیز بری ہے اور بلا شبہ اللہ نے واضح ہدایات دی ہیں جو انسان کی مادی روحانی اور اخلاقی زندگی کے لیے بیک وقت مفید اور سودمند ہیں۔ انسان "ہمہ دان و ہمہ بین" نہیں ہے، تنہا اللہ ہی "ہمہ دان و ہمہ بین" ہے اسی کا علم سب پر محیط ہے۔ صرف خالق ہی یہ جانتا ہے کہ اس کی مخلوق کے لیے کیا چیز اچھی ہے اور کیا چیز بری ہے۔ اسی طرح وہ فرمان جاری کرتا ہے اور یقیناً وہ یوم الحساب میں اس کا فیصلہ کرے گا کہ انسان کے اعمال اور اس کی سرگرمیاں قانونِ الٰہی کے مطابق تھیں یا نہیں اور اس طرح وہ نافرمان بندوں کو جزا اور نافرمانوں کو سزا دے گا۔

آپ کا یہ خیال کہ "قانون اور مذہب کو علیحدہ کر دیا جانا چاہیے" اس وقت تک ناقابلِ فہم ہے جب تک آپ مذہب سے بالکلیہ دستبردار ہو جانے کی وکالت نہ کریں۔ اس لیے کہ اگر مذہب باقی رہتا ہے تو اس کے وہ قوانین بھی باقی رہیں گے جو چودہ سو برس سے آج تک تسلیم شدہ ہیں اور جن کی تعبیر و تشریح ان لوگوں نے کی ہے جنہیں ان قوانین کا براہ راست اور گہرا علم حاصل تھا اور جو کتاب و سنت پر یقین رکھتے تھے۔

بنیادی حق کے تحت ہر شخص کو یہ آزادی حاصل ہے کہ مذہب کا اظہار اور اس پر عمل کرے اور پیروانِ اسلام کا یہ حق منسوخ نہیں ہوا کہ ان پر ان کے مذہبی قوانین نافذ ہوں اور وہ ان کے تحت زندگی بسر کریں۔ حکومت کو اس کا حق نہیں ہے کہ وہ ان کے مذہبی قوانین کے برعکس متوازی یا بالواسطہ قانون سازی کر کے مذہب میں مداخلت کرے۔

میں حیران ہوں کہ آپ ایک ایسے یکساں سول کوڈ کی حمایت کرتے ہیں جو لوگوں کی مرضی کے خلاف ان پر مسلط کر دیا جائے۔ یہ کلیت پسندی کی حمایت کے ہم معنی ہے۔ آپ کی یہ تجویز ہے کہ بدرجہ آخر خود حکومت کو ہندی کوڈ بنانا چاہیے اور اس کا اطلاق ان تمام لوگوں پر کرنا چاہیے جو اس کوڈ کو اپنے لیے اختیار کریں۔ اگر آپ کی یہ تجویز مان لی جائے تو یہ کچھ ایسے مسلمانوں کو جو قانونِ الٰہی کی خوبیوں، انمول قدر و قیمت اور اس کی برتری سے ناواقف ہیں۔ اس بات کی ترغیب دینے کے ہم معنی ہے کہ وہ کمتر درجے کے انسانی قانون کو اپنے لیے منتخب کر لیں جس کی نہ کوئی (باقی ص[illegible] پر)

رضاعت

(آخری قسط)

(مولانا سید جلال الدین عمری)

اخراجاتِ رضاعت اتنی بات طے ہے کہ رضاعت کے اخراجات برداشت کرنا باپ کی ذمہ داری ہے۔ اس لیے کہ قرآن نے صاف کہا ہے:

وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ

اور بچہ کے باپ پر ماؤں کا کھانا اور کپڑا دستور کے مطابق واجب ہے

ایک دوسرے مقام پر کہا:۔

فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ

اگر وہ تمہارے لیے (بچہ کو) دودھ پلائیں تو ان کو ان کی اجرت دو

یہ احکام مطلقہ عورتوں سے متعلق ہیں اس لیے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ طلاق کے بعد عورت اگر رضاعت کی اجرت طلب کرے تو باپ کو اجرت دینی ہوگی۔ ابن بطال کہتے ہیں

اجمع العلماء على ان اجرة الرضاع على الزوج اذا خرجت المطلقة من العدة لامه

علماء کا اس پر اجماع ہے کہ طلاق کے بعد جو عورت اپنی عدت پوری کر چکی ہو وہ اگر بچہ کو دودھ پلائے تو شوہر پر اس کی اجرت واجب ہے۔

البتہ غیر مطلقہ عورت کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ اجرت کا مطالبہ کر سکتی ہے یا نہیں

لے ابن حجر، فتح الباری ۹/۴۰۶

امام شافعی کے نزدیک اجرت اس کا قانونی حق ہے لہٰذا وہ اس کا مطالبہ کر سکتی ہے۔

لها اخذ الاجرة عنه — اس کو شوہر سے اجرت لینے کا حق
وطلبها لانه الذي ملكها[1] — ہے اور وہ اس کا مطالبہ کر سکتی ہے۔
کیونکہ اسی نے اس کو اس کا مالک بنایا ہے

فقہ شافعی کے مطابق رضاعت کی اجرت لینے کے بعد عورت بیوی کی حیثیت سے نفقہ کی اسی وقت مستحق ہوگی جب کہ مرد اس سے پورا فائدہ اٹھا سکے لیکن اگر رضاعت کی مصروفیت کی وجہ سے مرد کے لیے اس سے پورا فائدہ اٹھانا ممکن نہ ہو تو وہ نفقہ سے محروم ہو جائے گی

واذا اخذت الاجرة — اگر عورت رضاعت کی اجرت لے
سقطت نفقتها ان نقص — اور اس کی وجہ سے مرد اس سے پورا فائدہ
الاستمتاع — نہ اٹھا سکے تو اس کا نفقہ ساقط ہو جائے گا

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر عورت رضاعت کی اجرت نہ لے تو مرد چاہے اس سے پورا فائدہ نہ اٹھا سکے، وہ نفقہ سے محروم نہیں ہوگی۔[2]

اس مسئلے میں حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ جب تک بیوی شوہر کے نکاح میں ہے وہ رضاعت کی اجرت کی حقدار نہیں ہوگی۔ مبسوط میں ہے:۔

فان لم يكن وقع بينهما — اگر میاں اور بیوی کے درمیان تفریق
فرقة فلا اجر لها على — نہیں ہوئی ہے تو بیوی رضاعت کی اجرت
الرضاع — کی مستحق نہیں ہوگی۔

اس کی دلیل یہ دی گئی ہے کہ قرآن کی رو سے رضاعت کی اجرت یہ ہے کہ بیوی کو کھانا اور کپڑا دیا جائے اور یہ دونوں چیزیں شوہر پر پہلے سے واجب ہیں اس لیے الگ سے اجرت رضاعت اس پر واجب نہیں ہو سکتی۔ ورنہ عورت بیک وقت دو نفقوں کی مستحق ہوگی اور شوہر کو ان دونوں کا بوجھ اٹھانا پڑے گا۔ حالانکہ شریعت میں کسی کے دو نفقے آدمی پر واجب نہیں ہوتے

---

[1] قلیوبی وعمیرہ ۴/۸۶ [2] حاشیہ الجمل علی شرح المنہج ۴/۴۷۵
[3] سرخسی: المبسوط ۵/۱۰۹

بعض حضرات نے لکھا ہے کہ اگر بچہ کا مال موجود ہو اور اس سے ماں کو رضاعت کی اجرت دی جائے تو باپ پر نفقہ کی دوہری ذمہ داری بھی عائد نہیں ہوگی اور ماں کے لیے اس کا لینا بھی صحیح ہوگا۔

باقی رہا دو نفقوں کا استحقاق تو یہ غلط نہیں ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر کوئی عورت طلاق کے بعد دوسرے شخص سے نکاح کرلے اور ساتھ ہی اپنے پہلے شوہر کے بچہ کو اجرت پر دودھ بھی پلائے تو یہ بالاتفاق اس کے لیے جائز ہے۔ حالانکہ اس صورت میں وہ دو نفقے حاصل کر رہی ہوگی۔ ایک اپنے موجودہ شوہر کی طرف سے اس کی بیوی کی حیثیت سے اور دوسرا سابق شوہر سے اس کے بچے کو دودھ پلانے کے بدلے میں[1] اسی طرح یہ بھی جائز ہے کہ آدمی اپنی ایک بیوی کو دوسری بیوی سے پیدا ہونے والے بچہ کو دودھ پلانے کی اجرت دے[2] حالانکہ اس صورت میں بھی وہ دو نفقوں کی مستحق ہوگی

فقہ حنفی میں ایک خیال یہ بھی پایا جاتا ہے کہ ماں کے لیے جب تک وہ بچہ کے باپ کے عقد میں ہے کسی صورت میں، چاہے وہ شوہر کے مال سے ہو یا بچہ کے مال سے، اجرت لینا صحیح نہیں ہے۔ ہاں شوہر سے جدائی کے بعد اس کو اس کا حق حاصل ہے۔ اس کی دلیل یہ دی گئی ہے کہ رضاعت قانونی لحاظ سے نہ سہی دینی اور اخلاقی لحاظ سے اس پر واجب ہے۔ اس لیے اس کا اجرت لینا صحیح نہیں ہے۔ علامہ سرخسی نے لکھا ہے:۔

انها لا تستوجب الاجر	ماں ہمارے نزدیک بچہ کی رضاعت پر
علی ارضاع الولد وان استاجرها	اجرت کی مستحق نہیں ہوگی۔ چاہے شوہر نے
عندنا لان فی حال قیام النکاح	اس کو اجرت ہی پر کیوں نہ رکھا ہو۔ اس
الرضاع من الاعمال المستحقة	لیے کہ جب تک نکاح باقی ہے رضاعت
علیها دینا وبعد الفرقة لیس	ان اعمال میں سے ہے جن کا انجام دینا
ذالک بمستحق علیها دینا	اس کے لیے دینی لحاظ سے واجب ہے

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ابن نجیم: البحر الرائق ۲۰۸/۴

[2] مختصر القدوری، کتاب النفقات

ولا دیانۃ[1] البتہ تفریق کے بعد رضاعت نہ تو دینی لحاظ سے اس پر واجب ہے اور نہ قانونی لحاظ سے

صاحب ہدایہ نے یہی مسلک اختیار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رضاعت ماں کے لیے دینی لحاظ سے واجب ہے لیکن چونکہ اس بات کا امکان ہے کہ وہ کسی وجہ سے دودھ نہ پلا سکے۔ اس لیے یہ وجوب باقی نہیں رہا۔ اب اگر وہ اجرت لیکر دودھ پلانے پر آمادہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کو رضاعت کی قدرت حاصل ہے۔ ایسی صورت میں رضاعت اس کے لیے واجب ہو جائے گی[2]

اس پر اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ ماں کے لیے رضاعت کی اجرت لینا اگر اس لیے صحیح نہیں ہے کہ دینی اور اخلاقی لحاظ سے رضاعت اس پر واجب ہے تو طلاق کے بعد بھی اس کے لیے اجرت لینا صحیح نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس وقت بھی وہ بہر حال ماں ہی ہے اور آیت کے الفاظ مطلقہ اور غیر مطلقہ دونوں طرح کی ماؤں پر مشتمل ہیں۔ حالانکہ مطلقہ ماؤں کے لیے اجرت کا لینا بالاتفاق صحیح ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک طرف تو ماں کے لیے رضاعت کو واجب قرار دیا ہے اور دوسری طرف باپ پر یہ ذمہ داری ڈالی ہے کہ وہ اس کا معاشی بوجھ اٹھائے۔ جب تک باپ یہ بوجھ اٹھا رہا ہے ماں کو الگ سے اجرت کے مطالبہ کا حق نہیں ہے[3]

اگر شوہر نے عورت کو طلاق دی اور یہ طلاق رجعی ہے تو فقہ حنفی کی رو سے وہ عدت کے

[1] سرخسی: المبسوط/ ۱۰۸

[2] ہدایہ ۲/ ۴۲۴۔ ابن نجیم نے لکھا ہے لا تجبر علیہ قضاء وتؤمر بہ دیانۃ لانہ من باب الاستخدام وھو واجب علیھا دیانۃ۔ البحر الرائق ۴/ ۲۰۲ یعنی رضاعت پر ماں کو عدالت کی طرف سے مجبور تو نہیں کیا جائے گا لیکن اخلاقی لحاظ سے اس کو اس کا حکم دیا جائے گا اس لیے کہ اس کی نوعیت خدمت کی ہے اور وہ اس پر واجب ہے۔ اس استدلال پر یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ خدمت میں رضاعت شامل بھی ہے یا نہیں؟

[3] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ ابن عابدین: رد المحتار علی الدر المختار ۲/ ۹۳۰

زمانے میں اجرت رضاعت کی مستحق نہیں ہوگی لیکن طلاق بائنہ ہے تو اس کے بارے میں دو طرح کی رائیں پائی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ بھی اجرت کی مستحق نہیں ہوگی اور دوسری یہ کہ اس کو اجرت لینے کا حق حاصل ہے۔ صاحب ہدایہ کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک پہلی رائے کو ترجیح حاصل ہے۔ اس کی دلیل انھوں نے یہ دی ہے کہ طلاق بائنہ کے باوجود عورت بہت سے احکام میں بیوی ہی سمجھی جاتی ہے اس لیے وہ اجرت کی مستحق نہیں ہوگی [1]

یہ ایک حقیقت ہے کہ رضاعت کے زمانے میں ماں کی غذائی ضروریات بھی بدل جاتی ہیں اور اس کے اخراجات بھی بڑھ جاتے ہیں۔ فقہ حنفی کی رو سے رضاعت کی اجرت کی تو ایک غیر مطلقہ ماں حقدار نہیں ہوتی لیکن اس مدت میں معمول سے زائد ہونے والے اخراجات کی وہ حقدار ضرور ہوگی اور بچے کے باپ کو یہ اخراجات برداشت کرنے ہوں گے۔ علامہ کاشانی کہتے ہیں کہ عورت بچے کو دودھ پلائے یا نہ پلائے اس کا کھانا اور کپڑا مرد پر بہر حال واجب ہے لیکن قرآن مجید نے دودھ پلانے کی مدت میں ان دونوں چیزوں کے دینے کا خصوصیت سے اس لیے ذکر کیا ہے کہ وہ رضاعت کے زمانے میں مزید کھانے اور کپڑے کی محتاج ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے اس کو اس بات کی بھی اجازت ہے کہ رضاعت کے دوران رمضان کے روزے چھوڑ دے (اور بعد میں ان کی قضا کرے) [2]

یہی مسلک فقہ حنبلی میں بھی اختیار کیا گیا ہے۔ چنانچہ ابن قدامہ حنبلی کہتے ہیں کہ اگر بچہ کی ماں اس کے باپ کے عقد میں ہے اور رضاعت کی وجہ سے اس کی غذائی ضروریات بڑھ گئی ہیں تو باپ کو یہ ضروریات پوری کرنی ہوں گی۔ اس کی دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ عورت اپنی ضرورت کے مطابق نفقہ کی حقدار ہے اور جب اس کی ضرورت بڑھ گئی ہے تو اس کے نفقے میں بھی اضافہ ہونا چاہیے [3]

فقہ شافعی میں بچہ کی ماں رضاعت کی اجرت تو لے سکتی ہے لیکن مزید نفقہ کا مطالبہ نہیں کر سکتی چنانچہ شرح المنہج میں ہے :-

[1] ہدایہ ۲/۴۲۵

[2] کاسانی بدائع الصنائع ۴/۳۰-۳۱

[3] ابن قدامہ : المغنی ۹/۳۱۳

ولا یزاد فی نفقۃ الزوجۃ	رضاعت کی وجہ سے عورت کو زیادہ
للارضاع وان احتاجت فیہ	غذا کی ضرورت ہو بھی تو اس کے نفقے میں
الی زیادۃ الغذاء لان	اضافہ نہیں کیا جائے گا اس لیے کہ نفقہ کی
قدر النفقۃ لا یختلف	مقدار عورت کے حالات کے لحاظ سے نہیں
بحال المراۃ لہ	بدلتی ہے (بلکہ اس کا تعلق مرد کے حالات سے ہے)

اجرت کی نوعیت

قرآن مجید نے کہا کہ مائیں (طلاق کے بعد) اگر دودھ پلائیں تو ان کو اس کی اجرت دو۔ یہ اجرت معلوم و متعین ہو تو بالاتفاق سب کے نزدیک جائز ہے لیکن اس کے ساتھ قرآن مجید نے ایک دوسری جگہ یہ بھی کہا ہے کہ اگر بچہ کی ماں اس کو دودھ پلائے تو بچے کے باپ کو چاہیے کہ اس کے کھانے اور کپڑے کا بوجھ اٹھائے۔ امام ابو یوسف اور امام محمد کہتے ہیں کہ غلہ کی جنس اور مقدار بھی اور کپڑے کی نوعیت اور مقدار بھی پہلے سے طے ہونی چاہیے۔ اس لیے کہ کھانا کپڑا، اضافی الفاظ ہیں اگر ان کی پہلے سے تعیین نہ ہو تو اختلاف ہو سکتا ہے امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ کھانا اور کپڑا، بلاشبہ اضافی چیز ہے لیکن اس میں اختلاف کا امکان اس لیے کم ہے کہ دودھ پلانے والیوں کو عام طور پر اجرت زیادہ ہی ملتی ہے۔ لہٰذا اگر اس کا تعین نہ بھی ہو تو جائز ہے [۲]

یہی مسلک امام مالک اور امام شافعی کا بھی ہے۔ ان کے نزدیک جن کاموں کا معاوضہ عرف عادت کے تحت خود بخود سمجھا جائے ان کو مزید طے کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ دایہ گری بھی اسی طرح کے کاموں میں شامل ہے، ورنہ قرآن مجید یہ نہ کہتا کہ دودھ پلانے والی کو دستور کے مطابق اجرت دو [۳]

جامع ہدایت

طلاق کے بعد اس بات کا کافی امکان رہتا ہے کہ میاں اور بیوی کے درمیان کشیدگی اور ناچاقی پائی جائے اور وہ بچہ کو ایک دوسرے سے انتقام لینے کا ذریعہ بنالیں۔ اس لیے قرآن مجید نے دونوں کو ہدایت کی ہے۔

---

[۱] شیخ سلیمان الجمل: شرح المنہج ۴/۴۱۵

[۲] ہدایۃ ۳/۳۰۲

[۳] ابن عربی: احکام القرآن ۱/۸۶

لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَ لَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ — نہ نقصان پہنچایا جائے ماں کو اس کے بچہ کی وجہ سے اور نہ باپ کو اس کے بچہ کی وجہ

ماں اور باپ دونوں کے دل میں بچہ کی محبت ہوتی ہے۔ اس محبت کی وجہ سے وہ اپنا نقصان بھی برداشت کر سکتے ہیں لیکن قرآن کی ہدایت یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کریں۔ اپنے پچھلے اختلافات کو نظرانداز کر کے ہمدردی اور خیرخواہی کا رویہ اختیار کریں اور بچہ کی رضاعت کے مسئلے کو خوش اسلوبی کے ساتھ طے کریں۔ یہ جذبہ نہ ہو تو بڑی آسانی سے باپ ماں کو تنگ کر سکتا ہے اور ماں باپ کو پریشان کر سکتی ہے۔ مثال کے طور پر ماں کو حسب ذیل طریقوں سے باپ پریشان کر سکتا ہے۔

۱۔ ماں رضاعت کی اجرت کا بالکل مطالبہ ہی نہ کرے یا صرف معقول اجرت کا مطالبہ کرے تو بھی باپ اس کی بجائے کسی دوسری عورت سے دودھ پلانے پر اصرار کرے۔ ظاہر ہے ماں کے ساتھ یہ زیادتی ہے جس کی باپ کو اجازت نہیں دی جا سکتی۔ فقہاء نے یہاں تک لکھا ہے کہ ماں اگر زیادہ اجرت کا مطالبہ کر رہی ہو اور کوئی دوسری عورت اس سے کم اجرت پر دودھ پلا سکتی ہو تو باپ کو اجازت ہے کہ وہ اس سے دودھ پلوائے[1] لیکن اس معاملے کے بعد وہ کم ہی اجرت پر آمادہ ہو جائے تو باپ کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ اس معاملے کو ختم کر کے ماں سے دودھ پلوائے تدوری میں ہے:۔

---

[1] فقہ شافعی میں دو طرح کے نقطہ نظر ملتے ہیں۔ ایک نقطہ نظر وہی ہے جو فقہ حنفی میں بیان ہوا ہے۔ دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ اگر ماں اتنی ہی اجرت چاہ رہی ہے جتنی کہ اس جیسی عورت کی ہو سکتی ہے تو قطع نظر اس سے کہ کوئی دوسری عورت کم اجرت لیتی ہے یا نہیں لیتی، اسی سے دودھ پلوایا جائے۔ (شرح المحلی علی منہاج الطالبین ۴/۸۶)

فقہ حنبلی میں فقہ شافعی کے اسی دوسرے نقطہ نظر کو اختیار کیا گیا ہے۔ چنانچہ مغنی میں ہے اگر کوئی دوسری عورت بلا اجرت بچہ کو دودھ پلانے کے لیے تیار ہے اور ماں اجرت لیکر دودھ پلانا چاہتی ہے تو بھی ماں ہی رضاعت کی زیادہ حقدار ہوگی بشرطیکہ اس کا مطالبہ اجرت اس سے زیادہ نہ ہو جتنا کہ اس جیسی کسی دوسری عورت کا مطالبہ ہو سکتا ہے۔ (ابن قدامہ: المغنی ۹/۳۱۲)

فان قال الاب لا استاجرها	اگر باپ یہ کہے کہ میں اس کو اجرت پر
وجاء بغیرها فرضیت	نہیں رکھوں گا اور رضاعت کے لیے وہ
الام بمثل اجرا لاجنبیۃ	دوسری عورت کو لے آئے اس وقت (بھی)
اورضیت بغیر اجر کانت	ماں اگر اتنی ہی اجرت پر تیار ہو جائے
هی احق لہ	جتنی اجرت کہ یہ اجنبی عورت مانگ رہی
	ہے یا وہ بلا اجرت دودھ پلانے کے لیے
	آمادہ ہو جائے تو وہی رضاعت کی
	زیادہ حقدار ہوگی ۔

۲۔ ماں کو پریشان کرنے کی دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ وہ کسی وجہ سے بچے کو دودھ نہ پلاسکے تو رضاعت کے بہانے باپ اس کو ماں سے جدا کر دے ۔ فقہ کی رو سے باپ کو اس کی اجازت نہیں ہے ۔ وہ رضاعت کے لیے کسی دایہ کی خدمت لینا بھی چاہے تو اس کو ایسا انتظام کرنا ہوگا کہ وہ ماں ہی کے پاس جا کر بچہ کو دودھ پلایا کرے ۔ کیونکہ جب تک بچہ بالغ نہ ہو جائے ماں کا یہ حق ہے کہ اس کو اپنے پاس رکھے اور اس کی تربیت کرے ۔ چنانچہ فقہ حنفی میں ہے :۔

ویستاجر الاب من یرضعہ	باپ کسی ایسی عورت کو اجرت پر رکھے گا جو
عندها[2]	اس کے پاس پہنچ کر دودھ پلائے ۔

اسی طرح باپ کو بھی مختلف پہلوؤں سے پریشان کیا جا سکتا ہے ۔

۱۔ بچہ ماں کے دودھ کے علاوہ کسی اور کا دودھ پینے کے لیے تیار نہ ہو تو ظاہر ہے باپ مجبور ہوگا کہ اسی سے دودھ پلوائے ۔ باپ کی اس مجبوری سے فائدہ اٹھا کر ماں زیادہ اجرت کا مطالبہ کرے ۔ یہ ایک کھلی ہوئی زیادتی ہے اور ماں کو اس کی اجازت نہیں ہے ۔

۲۔ باپ کو پریشان کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ جب تک کہ بچہ ماں کے پاس ہے وہ اس کو بچہ سے ملنے اور اس سے پیار و محبت کرنے نہ دے ۔ حالانکہ باپ کو نہ صرف یہ کہ اس کی اجازت ہے

[1] مختصر القدوری کتاب النفقات

[2] مختصر القدوری

بلکہ یہ اس کا ایک قانونی حق ہے[1]

۳۔ باپ کو پریشان کرنے کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ماں بچہ کو کچھ عرصے تک اپنے پاس رکھ کر اسے خوب مانوس کرلے اور جب اس کو یقین ہو جائے کہ وہ اس کی جدائی برداشت نہیں کر سکے گا تو اسے باپ کے حوالے کر دے تاکہ وہ زحمت میں مبتلا ہو۔[1]

غرض یہ کہ کوئی بھی ایسی صورت جس میں بچے کی وجہ سے باپ یا ماں کو تکلیف اور زحمت ہو۔ دونوں میں سے کسی کے لیے بھی اختیار کرنا صحیح نہیں ہے۔

مدّتِ رضاعت اس سلسلے کا ایک اہم سوال یہ ہے کہ ماں کتنی مدت تک بچہ کو دودھ پلا سکتی ہے؟ امام ابوحنیفہ کے نزدیک یہ مدت ۳۰ مہینے ہے ان کی دلیل قرآن مجید کی یہ آیت ہے۔

وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا (الاحقاف) — اس کا پیٹ میں رہنا اور دودھ چھوٹنا ۳۰ مہینے میں ہے۔

ان کے نزدیک اس آیت میں حمل کی مدت بھی ۳۰ مہینے بتائی گئی ہے اور دودھ چھڑانے کی مدت بھی لیکن حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حمل کی مدت دو سال سے زیادہ کسی حال میں نہیں ہو سکتی[3] اس لیے ہم اس کو مستثنیٰ کرتے ہیں لیکن رضاعت کی مدت تو وہ بہرحال ۳۰ مہینے رہے گی۔

امام مالک کے نزدیک مدت رضاعت دو سال ہے لیکن یہ مدت ایسی نہیں ہے کہ اس میں کمی بیشی بالکل نہ ہو سکے بلکہ رواج کے مطابق یہ کم یا زیادہ ہو سکتی ہے۔ ان کی دلیل یہ آیت ہے

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ — اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں اس شخص کے لیے جو رضاعت کی مدت پوری کرنا چاہے

---

[1] جصاص: احکام القرآن ۱/۴۰۸

[2] خازن: تفسیر ۱/۱۹۰

[3] وہ حدیث یہ ہے الولد لا یبقیٰ فی بطن امہ اکثر من سنتین ولو بفلکۃ مغزل

وہ کہتے ہیں کہ مدت رضاعت میں کمی بیشی کی اجازت نہ ہوتی تو قرآن مجید اسے میاں بیوی کی رضامندی اور مشورے پر نہ چھوڑتا۔[1]

امام شافعیؒ کے نزدیک رضاعت کی آخری حد دو سال ہے اس سے زیادہ نہیں۔ ان کی دلیل حولین کاملین اور فصالہ فی عامین کے الفاظ ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رضاعت دو سال تک جاری رہ سکتی ہے جب دو سال پورے ہو جائیں تو رضاعت ختم ہو جانی چاہیے۔

وحملہ وفصالہ ثلثون شھرا (اس کا پیٹ میں رہنا اور دودھ چھوڑنا تیس مہینے میں ہے) سے امام ابوحنیفہؒ نے جو استدلال کیا ہے اس کا جواب انھوں نے یہ دیا ہے کہ اس میں حمل اور دودھ چھڑانے دونوں کی مدت بیان ہوئی ہے۔ قرآن سے جب مدت رضاعت دو سال متعین ہو گئی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ باقی مدت (چھ ماہ) مدت حمل ہے جو کم سے کم ہو سکتی ہے۔[2]

فقہائے احناف میں امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ کی بھی یہی رائے ہے۔ فقہ حنفی میں اس رائے کے مطابق بھی فتوی دیا گیا ہے اور امام ابوحنیفہ کی رائے کے مطابق بھی۔ فتح القدیر میں امام ابویوسف اور امام محمد کی رائے کو زیادہ صحیح کہا گیا ہے۔[3]

---

[1] ابن عربی: احکام القرآن ۱/

[2] مولانا انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ رضاعت کی مدت تو دو ہی سال ہے البتہ مزید چھ ماہ اس لیے ہیں کہ بچہ کو دوسری غذا کی عادت ہو سکے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن نے دو سال کے اندر بچہ کو دوسری غذا کا عادی بنانے کا حکم نہیں دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کام دو سال کے بعد ہوگا اور اس میں کچھ مدت ضرور لگے گی۔ گویا دو سال کی مدت ایسی نہیں ہے کہ اس سے زیادتی جائز ہی نہ ہو۔ اگر ایسی بات ہوتی تو احادیث میں صراحۃً اس کا ذکر ہوتا اور اس کی بنیاد پر احکام بیان ہوتے۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بیشتر احادیث میں ذکر صرف اس طرح کا ہے۔ انما الرضاعۃ من المجاعۃ یعنی رضاعت اس زمانے کی معتبر ہوگی جبکہ دودھ کے ذریعے بھوک مٹ جایا کرے۔ یعنی سوائے دودھ کے بھوک مٹانے کا دوسرا ذریعہ نہ ہو۔ اس میں عمر کی تعیین نہیں کی گئی ہے۔ (فیض الباری ۴/ ۲۷۹۔ اس طرح یہ توجیہ امام مالک کے مسلک سے قریب ہو جاتی ہے۔

[3] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ الدر المختار مع رد المحتار ۲/ ۴۵۵۔ امام ابوحنیفہؒ کے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

امام ابوحنیفہ کی رائے کے مطابق ماں اگر بچے کو پورے تیس مہینے دودھ پلائے تو کیا باپ کو اس پوری مدت کی اجرت برداشت کرنی ہوگی؟ فقہ میں اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ امام صاحب کی رائے کا مطلب صرف یہ ہے کہ دو سال کے بعد ماں کے لیے بچہ کو دودھ پلاتا نا حرام نہیں ہے بلکہ وہ مزید چھ ماہ دودھ پلا سکتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ باپ کو ان چھ مہینوں کی اجرت بھی برداشت کرنی ہوگی اجرت تو بالاتفاق باپ پر صرف دو سال کی واجب ہوتی ہے اسی طرح ماں کے لیے بچہ کو دودھ پلانا بھی صرف دو سال تک اخلاقاً فرض ہے۔ اس سے زیادہ نہیں۔ چنانچہ فقہ حنفی میں صراحت ہے۔

(اما لزوم اجر الرضاع للمطلقة فمقدر بحولين بالاجماع) وكذا وجوب الارضاع على الام ديانة[1]	اس بات پر اجماع ہے کہ مطلقہ کو رضاعت کی اجرت کا دینا جتنی مدت تک لازم ہے وہ دو سال تک محدود ہے اسی طرح دو ہی سال تک ماں کے لیے دودھ پلانا بھی دیانۃً واجب ہے۔

رضاعت کبیر جمہور کے نزدیک رضاعت کی مدت چونکہ دو سال ہے اس لیے اس سے ایک فقہی استنباط یہ کیا گیا ہے کہ اس مدت کے بعد کوئی بچہ اگر کسی عورت کا دودھ پی لے تو رضاعت کے احکام ثابت نہیں ہوں گے۔ یعنی یہ کہ نہ تو دودھ پلانے والی رضاعی ماں ہوگی اور نہ دودھ پینے والا اس کی رضاعی اولاد۔ اس کی تائید میں ایک روایت بھی پیش کی جاتی ہے وہ یہ ہے:۔

(بقیہ حاشیہ) مسلک کی تائید میں جتنی دلیلیں دی گئی ہیں مولانا عبدالحی صاحب نے ایک ایک کرکے ان سب کی تردید کے بعد فرمایا ہے تعجب ہے کہ فقہ حنفی کی ان کتابوں میں جو متون کے طور پر استعمال ہوتی ہیں امام صاحب کا مسلک تو بیان کیا گیا ہے لیکن امام ابویوسف اور امام محمد کے مسلک کا ذکر نہیں کیا گیا ہے حالانکہ (کتاب و سنت کی رو سے) وہ زیادہ صحیح اور درایۃ کے لحاظ سے زیادہ مضبوط ہے (شرح وقایۃ مع عمدۃ الرعایۃ کتاب الرضاع۔

[1] درالمختار مع ردالمحتار ۲/۵۵۵

لا رضاع الا ما کان فی الحولین[1] — رضاعت وہی معتبر ہے جو دو سال کے اندر ہو

اس معاملے میں حضرت عائشہ کی رائے یہ ہے کہ بڑی عمر والا آدمی بھی اگر دودھ پی لے تو رضاعت ثابت ہوجاتی ہے۔ اس رائے کو عروہ بن زبیر، عطاء بن ابی رباح، لیث بن سعد، داؤد ظاہری اور ابن حزم نے اختیار کیا ہے[2]۔

ان حضرات کی دلیل حضرت سالم کا واقعہ ہے۔ حضرت سالم حضرت ابو حذیفہ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ بچپن ہی سے وہ ان کے گھر رہتے تھے۔ ان کے جوان ہونے کے بعد حضرت ابو حذیفہ کی بیوی سہلہ کے سامنے یہ سوال تھا کہ وہ ان کے ساتھ گھر کے ایک فرد کی طرح کیسے رہیں۔ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا۔ حضور! سالم جوان ہوچکے ہیں اور میں محسوس کرتی ہوں کہ ان کی آمد و رفت ابو حذیفہ کو بھی پسند نہیں ہے لہٰذا مجھے کیا کرنا چاہیے؟ آپ نے فرمایا تم ان کو اپنا دودھ پلا دو پھر تم ان کی ماں بن جاؤگی اور ابو حذیفہ کو بھی کوئی کھٹک نہ ہوگی۔ اس پر انھوں نے کہا کہ حضور! وہ تو جوان آدمی ہیں، میں ان کو دودھ کیسے پلاؤں۔ آپ نے مسکرا کر فرمایا کہ میں بھی جانتا ہوں کہ وہ جوان ہیں لیکن مسئلہ کا حل یہ ہے کہ تم ان کو دودھ پلا دو۔ چنانچہ انھوں نے ان کو دودھ پلایا اور اس کے بعد اطلاع دی کہ واقعۃً اب میں محسوس کرتی ہوں کہ ابو حذیفہ کی کھٹک بھی دور ہوگئی ہے[3]۔

لیکن اس معاملے میں تمام اکابر صحابہ اور ازواج مطہرات نے حضرت عائشہ سے اختلاف کیا ہے۔ ان کے نزدیک حضرت سالم کا یہ واقعہ ایک مخصوص واقعہ ہے اس کی اجازت عام نہیں ہے۔ ان کی دلیل وہ بہت سی روایتیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ کم سنی کی رضاعت ہی معتبر ہے۔

---

[1] دارقطنی، رضاع۔ اس روایت کی سند پر تنقید کی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو دارقطنی، مع التعلیق المغنی ۴/۱۷۴ مطبوعہ ہند

[2] اس سلسلے میں مزید فقہی اختلافات بھی ہیں لیکن اہم اختلاف یہی ہے کہ بڑی عمر والا کوئی شخص اگر کسی عورت کا دودھ پی لے تو رضاعت کے احکام ثابت ہوتے ہیں یا نہیں؟ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:۔ شوکانی: نیل الاوطار ۷/ ۱۱۹، ۱۲۰

[3] تفصیلی روایات کے لیے ملاحظہ ہو مسلم، کتاب الرضاع

امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ رضاعت میں اصلاً کم سنی ہی کا اعتبار کیا جائے گا لیکن اگر معاملہ اس طرح کے ہوں جیسے حدیث میں بیان ہوئے ہیں اور عورت کے لیے کسی خاص شخص سے پردہ کرنا مشکل ہو اور اس کی آمد و رفت کو جاری رکھنا ضروری ہو تو اس کی رضاعت کا بھی اعتبار کیا جائے گا

شوکانی نے بھی اسی رائے کو پسند کیا ہے۔ ان کے نزدیک اس طرح مختلف احادیث کے درمیان تطبیق ہو جاتی ہے[1] لیکن اس رائے میں بہرحال انفرادیت پائی جاتی ہے اس لیے یہ مزید قابل غور ہے۔

فقہاء کے درمیان اس میں بھی اختلاف ہے کہ مدت رضاعت ختم ہونے سے پہلے اگر بچہ کا دودھ چھڑا دیا جائے اور اس کے بعد اس کو کوئی دوسری عورت دودھ پلا دے تو کیا اس سے احکام رضاعت ثابت ہوتے ہیں یا نہیں؟ امام مالک فرماتے ہیں کہ اس طرح کی رضاعت سے یہ احکام ثابت نہیں ہوتے لیکن امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کے نزدیک احکام رضاعت ثابت ہو جاتے ہیں کیونکہ مدت رضاعت ابھی باقی ہے[2]

بعض حضرات کا خیال یہ ہے کہ بچہ کسی عورت کا دو ایک مرتبہ دودھ پی لے تو اس سے رضاعت نہیں ثابت ہوتی بلکہ اس کے لیے کم از کم تین مرتبہ دودھ پینا ہوگا۔ کیونکہ روایت ہے کہ

لا تحرم الرضعة و الرضعتان و المصة و المصتان[3]

ایک مرتبہ اور دو مرتبہ دودھ پی لینے اور ایک مرتبہ اور دو مرتبہ چوس لینے سے حرمت نہیں ثابت ہوتی۔

امام شافعی اور بعض دوسرے اہلِ علم کی رائے یہ ہے کہ پانچ مرتبہ دودھ پینے سے رضاعت ثابت ہوتی ہے اس سے کم میں نہیں۔ امام احمد کا ظاہر مسلک بھی یہی بیان کیا جاتا ہے۔ ان حضرات کی دلیل حضرت عائشہ کی روایت ہے فرماتی ہیں کہ قرآن مجید ہی میں یہ بات نازل ہوئی تھی کہ دس مرتبہ بچہ دودھ پیئے تو اس سے حرمت ثابت ہوتی ہے۔ پھر یہ حکم منسوخ ہوا اور یہ نازل ہوا کہ

---

[1] نیل الاوطار ۷/۱۲۰-۱۲۱
[2] ابن رشد: بدایۃ المجتہد
[3] مسلم، کتاب الرضاع
[4] ایضاً

پانچ مرتبہ دودھ پینے سے حرمت ثابت ہوگی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک اس کی تلاوت ہوتی رہی [1]

امام ابوحنیفہ، امام مالک اور جمہور صحابہ وتابعین کے نزدیک مدت رضاعت کے اندر کوئی بچہ کسی عورت کا ایک بار ایک گھونٹ دودھ پی لے تو رضاعت ثابت ہوجائے گی۔ اس مسلک کی بنیاد قرآن کے الفاظ ہیں۔

وَاُمَّھٰتُکُمُ الّٰتِیْٓ اَرْضَعْنَکُمْ — تمہاری وہ مائیں بھی (حرام ہیں) جنھوں نے تم کو دودھ پلایا اور رضاعی بہنیں بھی

واخواتکم من الرضاعۃ (النساء)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مطلق رضاعت سے حرمت ثابت ہوجاتی ہے۔ اس لیے کہ قرآن مجید نے یہ فرق نہیں کیا ہے کہ کم یا زیادہ دودھ پلایا جائے، یا ایک وقت یا اس سے زیادہ اوقات میں دودھ پلایا جائے [2] رہا حضرت عائشہ کی روایت تو اس کی تردید کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ اس حکم کو وہ قرآن کی آیت کے طور پر پیش کرتی ہیں۔ حالانکہ اگر وہ قرآن کی آیت ہوتی تو اس میں درج ہوتی اور اس کی تلاوت جاری رہتی۔ علاوہ قرآن کی کوئی بھی آیت تو خبر واحد سے نہیں ثابت ہوتی۔ اس کے لیے تواتر ضروری ہے جو یہاں موجود نہیں ہے [3]

---

[1] مسلم ج ۱، الرضاع

[2] اس کی تائید ایک روایت سے بھی ہوتی ہے۔ یحرم من الرضاعۃ ما یحرم من النسب

[3] اس مسئلہ کی پوری تفصیل کے لیے دیکھیے شوکانی: نیل الاوطار ۷/ ۱۱۴-۱۱۸ - ابن الہمام فتح القدیر

تحریر: سید قطب شہید

اسلامی فتوحات کا مزاج

(مترجم :- سلطان احمد اصلاحی)

بسا اوقات ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسلامی فتوحات کے مزاج، اس کے محرکات نیز اس کے اغراض و مقاصد سے نہ صرف یہ کہ اہل مغرب ہی ناواقف نہیں ہیں، جن کے نزدیک اسلامی انقلاب محض تلوار کی جنبش خواہشات کی تکمیل اور حرص و طمع کے محرکات سے عبارت ہے بلکہ مسلمانوں کی وہ عظیم اکثریت بھی اس سے اسی طرح ناواقف ہے جو جنگی فتوحات میں محض توسیع پسندی کو اسلام کا بہت بڑا کارنامہ سمجھتی ہے اور اسے ویسے ہی فخر کا باعث سمجھتی ہے جس طرح سے کہ ہر زمانے میں فاتحین سمجھتے رہے ہیں۔ اس سے زیادہ ان کے نزدیک اس کی مزید کوئی اہمیت نہیں ہے۔

یہ دونوں کے دونوں ہی اسلامی فتوحات کے مزاج، اس کے محرکات اور اس کے حقیقی اغراض و مقاصد سے یکساں ناواقف ہیں۔ اس لیے مناسب ہوگا کہ ہم صرف اسلامی فتوحات کی اس جھوٹی اور من گھڑت تصویر ہی کی اصلاح پر اکتفا نہ کریں بلکہ اس کے ساتھ اسلامی فکر کی صحیح اور حقیقی تصویر بھی پیش کر دیں۔

اس سلسلے میں جب ہم کتاب الٰہی کی طرف رجوع کرتے ہیں تو سب سے پہلے یہ آیت ہمارے سامنے آتی ہے

لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی (القرآن)

دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔ ہدایت گمراہی کے مقابلے میں اچھی طرح واضح ہو چکی ہے

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

یا ایھا الناس انا خلقناکم من ذکر وانثیٰ وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا	اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تم کو مختلف قوموں اور قبیلوں میں بانٹ دیا ہے۔ (صرف اس لیے) تاکہ تم آپس میں ایک دوسرے کو پہچان سکو۔
القرآن	

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا

الرجل یقاتل للمغنم و الرجل یقاتل للذکر والرجل یقاتل لیریٰ فمن فی سبیل اللہ؟ قال من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللہ	آدمی جنگ کرتا ہے مال غنیمت کے لیے اور آدمی جنگ کرتا ہے نام ونمود کے لیے اور آدمی جنگ کرتا ہے دکھاوے کے لیے تو ان میں سے کون اللہ کی راہ میں ہے؟ آپ نے فرمایا: جو شخص جنگ کرے صرف اس لیے تاکہ اللہ کا کلمہ بلند ہو جائے تو وہی اللہ کی راہ میں ہے۔
(الحدیث)	

قرآن وحدیث کے یہ تینوں نصوص مختصر طور پر اسلامی جنگوں اور اسلامی فتوحات کے مزاج کو اچھی طرح بے نقاب کر دیتے ہیں

اسلام کے لیے سرے سے یہ بات ناقابل تصور ہے کہ کوئی جنگ اس مقصد سے برپا ہو، یا کوئی فتح اس مقصد سے حاصل کی جائے کہ کسی کو اسلام کے اندر داخل ہونے کے لیے مجبور کیا جا سکے اور اسی لیے اس کے لیے اس سیاق میں ان تمام جنگوں اور فتوحات کا تصور بھی محال ہے جنہیں مذہبی عصبیتوں نے ابھارا اور جو انہیں کی سرپرستی میں حاصل کی گئیں جن کا مزہ نہ صرف یہ کہ دنیا نے مشہور صلیبی جنگوں ہی میں چکھا اور نہ صرف یہ کہ اندلس کے مسلمان ہی اپنی ظلم نا استبداد میں اس کا شکار ہوئے بلکہ دنیا کے بیشتر حصے اس سے متاثر ہوئے اور تاریخ کے بیشتر ادوار میں کسی نہ کسی روپ میں ان کا منحوس سایہ برقرار رہا۔ بلکہ اس وقت تک انسانیت اس کے تلخ گھونٹ پی رہی ہے۔ اگرچہ آج مذہبی عصبیت کے علاوہ دوسرے خوبصورت عنوانوں کے تحت بہ ظاہر پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی جاتی

رہی ہے۔

اسی طرح اسلام کے لیے یہ بات بھی ناقابلِ تصوّر ہے کہ کوئی جنگ اس مقصد سے برپا ہو اور کوئی فتح اس مقصد سے حاصل کی جائے کہ کسی ایک گروہ کو حکمرانی حاصل ہو جائے یا کسی خاص قوم کو غلبہ نصیب ہو جائے۔ اس لیے کہ انسانوں کے اندر مختلف گروہ اور مختلف قبائل صرف اس لیے بنائے گئے ہیں تاکہ وہ باہم ایک دوسرے کو پہچان سکیں۔ اس لیے نہیں کہ ان میں سے کچھ لوگ دوسروں کو اپنا غلام بنالیں۔ اور سیادت و حکمرانی کسی قوم یا گروہ کی اجارہ داری بن جائے۔ اسی لیے اس کے لیے ان تمام ہی جنگوں اور فتوحات کا تصور محال ہے جنھیں نسلی اور لسانی عصبیتیں ابھاتی رہی ہیں۔ جن کے تلخ نتائج کو دنیا نے برابر چکھا ہے اور مزید چکھتی رہے گی۔ ہمارا یہ دور بھی جس کے متعلق بہت سے لوگوں کا یہ گمان ہے کہ وہ بہت ترقی یافتہ ہو چکا ہے اور قبائلی عصبیات و محرکات سے بہت بلند ہو چکا ہے۔ اس کے نتائج بھگت رہا ہے۔

اسی طرح اسلام کے لیے یہ بات بھی ناقابل تصور ہے کہ کوئی جنگ برپا ہو یا کوئی فتح حاصل کی جائے اس مقصد سے کہ زیادہ سے زیادہ مالِ غنیمت حاصل کیا جا سکے اسی لیے اس کے لیے ان استعماری فتوحات کا تصور بھی محال ہے جن کے پیچھے اقتصادی ہوس کا جذبہ کام کر رہا تھا تاکہ شہروں اور قصبات کو فتح کیا جا سکے۔ اشیائے خام کو زیادہ سے زیادہ حاصل کیا جا سکے۔ قدرتی ذرائع آمدنی کو کام میں لایا جا سکے اور تکنیکی مراکز اور جنگی اہمیت کے حامل مقامات پر قبضہ کیا جا سکے۔ اسلام کے لیے اس طرح تمام ہی فتوحات کا تصور محال ہے جن کی لائی ہوئی مصیبتوں کو انسانیت آج بھی جھیل رہی ہے اور جس کی بنیاد پر خود موجودہ مغربی تہذیب بھی قائم ہے۔ اس لیے کہ مغربی تہذیب جن بنیادوں پر قائم ہے یہ جذبہ ہوس رانی ان میں سے ایک اہم ترین بنیاد ہے۔

اور آخر میں اسلام کے لیے یہ بات بھی ناقابل تصور ہے کہ کوئی جنگ برپا ہو یا کوئی فتح حاصل کی جائے اس مقصد سے کہ چند بادشاہوں اور فوجی جنرلوں کو شخصی اعزازات حاصل ہو سکیں یا وہ غلبہ و اقتدار اور نام و نمود کے فطری جذبات کو تسکین دے سکیں جن کے تقاضوں سے مجبور ہو کر وہ قوموں کو زیرنگیں کرتے ہیں تاکہ ان کے تاج مملکت میں چند اور امتیازی علامات کا اضافہ ہو سکے اور ان کی وردیاں چند اور تمغوں سے مزین ہو سکیں۔

یہیں سے یہ بات بھی متعین ہو جاتی ہے کہ اسلامی فتوحات کا صرف ایک محرک اور ایک مقصد ہے۔ اور وہ وہی ہے جسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ یعنی یہ کہ جو شخص جنگ کرے کا صرف اس لیے تاکہ اللہ کا کلمہ بلند ہو، تو اسی کی جنگ اللہ کی راہ میں ہو گی۔ من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللہ۔
پس گویا ایک ہی نظریہ رہا ہے جس کا پھیلانا اور جس کا عملاً برپا کر دکھانا اسلامی فتوحات کے پیچھے محرک کی حیثیت سے کام کرتا رہا ہے اور وہ یہ کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو جس کلمۃ اللہ کا اس حدیث میں ذکر کیا گیا ہے وہ کیا ہے؟ اس کا مزاج کیا ہے؟ اس کے حدود و آداب کیا ہیں؟ ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اس نظریے کے مزاج اور اس کے حدود و آداب کو اچھی طرح سمجھ لیں تاکہ ہم اسلامی فتوحات کے مزاج کو بھی آسانی کے ساتھ سمجھ سکیں اور ان جنگوں اور دوسری جنگی فتوحات کے درمیان پائے جانے والے فرق کا بھی واضح ادراک کر سکیں۔ نیز ہم اس حقیقت سے بھی آگاہ ہو سکیں کہ اسلامی فتوحات اسلامی فکر کے اندر ہی پائی گئی ہیں اور جو اس دائرے سے خارج ہیں ان کا اسلامی فتوحات سے کوئی تعلق نہیں خواہ یہ مسلمانوں ہی کے ہاتھوں کیوں نہ انجام دی گئی ہوں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:-

ان الدین عند اللہ	بے شک اللہ کے نزدیک (قابل قبول) دین
الاسلام — القرآن	(صرف) اسلام ہے

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے

ومن یبتغ غیر الاسلام	اور جو کوئی اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا دین
دینا فلن یقبل منہ	پسند کرے گا تو اس کی (اللہ) طرف سے اسے قبول
القرآن	نہیں کیا جائے گا

اللہ کے کلمہ کی سربلندی اور دنیا میں اس کا نفاذ یہ اسی وقت ممکن ہے جب اسلام ساری انسانیت کا دین ہو جائے۔ اسلام اپنے وسیع تر معنوں میں یہ ہے کہ انسان کا قلب دوسرے تمام معبودوں سے کٹ کر صرف خدا سے جڑ جائے۔ اسلام کے نظریے کے مطابق تمام ہی رسولوں نے اسلام کو اسی وسیع تر

معنے میں پیش کیا تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز صرف یہ ہے کہ آپ اسلام کا وہ آخری اڈیشن لیکر آئے جسے اللہ تعالیٰ نے ساری انسانیت کے لیے پسند فرمایا ہے۔ چنانچہ آپ کی لائی ہوئی کتاب قرآن خود اس بات کا دعویٰ کرتی ہے کہ وہ کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ وہ ان پچھلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے رسولوں پر نازل ہوچکی ہیں البتہ یہ ضرور ہے کہ انسانی ہاتھوں نے ان کے اندر جو تحریفات کر دی تھیں وہ ان کی اصلاح کرتی ہے اور اس سلسلے میں وہ ان پر نگراں ہے۔ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ (قرآن) اپنے سے پچھلی آسمانی کتابوں (یعنی تورات وانجیل کی تصدیق کرنے والا ہے۔ (یعنی قرآن ان کتابوں کے اس حصہ کی تصدیق کرتا ہے جو انسانی تحریفات سے محفوظ رہ گیا تھا) اور ان پر نگراں ہے۔ (یعنی جن مقامات پر انسانی ہاتھوں نے تحریف کی ہے قرآن اس کی نشان دہی کرتا ہے) اسی لیے دنیا کے تمام انسانوں کو چاہیے کہ اس کی طرف پلٹ آئیں اور اس کی پیش کردہ دعوت کے علمبردار بن جائیں) تاکہ اللہ کا کلمہ بلند ہو سکے اور زمین میں عملاً اس کا نفاذ ممکن ہو سکے۔ اس سیاق میں اللہ کے کلمے کے ایک معنے یہ بھی ہیں۔

لیکن یہ بات کہ لوگ اس دین کی طرف پلٹ آئیں۔ اس کے طریقہ کار کو اس قاعدۂ کلیہ سے علیحدہ نہیں ہونا چاہیے کہ دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔ لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے متبعین بھی اس بات کے مکلف نہ تھے کہ لوگوں کو لازماً اسلام کے اندر داخل کر دیں، ان کی ذمہ داری صرف یہ تھی کہ پوری حکمت و دل [illegible] کے ساتھ دعوت کو پیش کر دیں اور موعظت حسنہ کے ذریعے لوگوں کو راہ یاب کرنے کی کوشش کریں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :۔

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (القرآن)	اے نبی! اپنے رب کے راستے کی طرف (لوگوں کو) دعوت دو حکمت کے ساتھ اور بہترین موعظت کے ساتھ اور ان کے ساتھ بحث و مباحثے میں بہتر سے بہتر طرز اختیار کرو۔

لیکن اگر صلح و آشتی کی اس علمبردار دعوت کی راہ میں کوئی مادی طاقت حائل ہوتی ہے تو اس صورت میں ہتھیار کا استعمال جائز ہوگا کسی اور مقصد سے نہیں بلکہ صرف اس لیے تاکہ دعوت کو قبول کرنے کی آزادی کو برقرار رکھا جا سکے۔ اسی طرح اگر یہ طاقت ان لوگوں کے راستے میں جو دعوت کو قبول کر چکے ہیں اس لیے حائل ہوتی ہے کہ انہیں ان کے اس دین سے پھیر دے جسے انھوں نے پوری آزادی اور دل کی آمادگی کے ساتھ اختیار کیا تھا تو اس وقت بھی ہتھیار کا استعمال جائز ہوگا اور اس وقت اس کا مقصد یہ ہوگا کہ عقیدے کی آزادی کو برقرار رکھا جا سکے۔ وقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ (اور ان دشمنان دین) سے جنگ کرو، یہاں تک کہ کوئی فتنہ باقی نہ رہ جائے

اس صورت میں یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ جس طرح قتال کا منشا یہ ہے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو ویسے ہی اس کا مقصد یہ بھی ہے کہ دعوت کو قبول کرنے اور اپنے عقیدے کو برقرار رکھنے کی آزادی بھی فراہم کی جا سکے اور ہر وہ مادی طاقت جو ان دونوں آزادیوں یا ان میں سے کسی ایک کی راہ میں حائل ہوتی ہے وہ ایک سرکش طاقت ہے جو اللہ کے کلمہ کی مخالفت میں سرگرم ہے۔ اس اللہ کے کلمہ کی جس نے کہ انسان کو عظمت و سربلندی سے نوازا۔ اسے اپنے اوپر گواہ ٹھہرایا۔ اس کی عقل کو فیصلہ کی قوت دی اور اس کی قوت ارادی کو احکام کا مکلف ہونے کا سبب قرار دیا۔ نیز وہ اللہ جس کے نزدیک دعوت کی راہ میں قوت کا سہارا لے کر مشکلات کا کھڑا کرنا یا کسی کو کسی عقیدے کے اختیار کرنے پر مجبور کرنے کے لیے قوت کا استعمال کرنا اس کے کلمہ کو معطل کر دینے کے مترادف ہے۔ پس جو شخص اس لیے جنگ کرے گا کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو تو یقیناً وہ جنگ خدا کی راہ میں ہوگی۔

قرن اول جس نے نہ صرف یہ کہ اسلام کو پھیلایا بلکہ اسے جزیرۂ عرب کے اندر اور باہر اس کی کلیدی جگہوں میں عملاً برپا کر کے دکھایا۔ اس عہد میں اسلام کے زیر سایہ جو جنگیں ہوئیں اور جو فتوحات بھی حاصل کی گئیں ان کے پیچھے یہی مقصد کارفرما تھا۔ ان جنگوں یا ان فتوحات کے واقع ہونے سے پہلے اسلام کی دعوت پوری طرح پیش کی جا چکی تھی جنگیں صرف دو ہی حالتوں میں لڑی گئیں یا تو یہ کہ کوئی مادی قوت صلح و آشتی کی اس علمبردار دعوت کے مقابلے میں آکھڑی ہوئی تھی، یا پھر یہ کہ عقیدے کی آزادی کے بنیادی حق کو پامال کیا جا رہا تھا اور مسلمانوں کو ان کے

پسندیدہ دین سے زبردستی پھیرا جا رہا تھا خواہ اس کا تعلق افراد سے رہا ہو یا جماعتوں سے۔
ظاہر ہے اس سے اس امکان کی نفی نہیں ہوتی کہ بعض وہ لوگ جنھوں نے ان فتوحات میں حصہ لیا۔ ان کے اندر مالِ غنیمت "فئے" اور دشمنوں کے ساز و سامان کا چھیننا بھی ایک اہم ترین محرک کی حیثیت سے کام کر رہا تھا لیکن اس سلسلے میں چند افراد کے محرکات کا لحاظ نہیں کیا جانا چاہیے۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ قیادت (LEADERSHIP) کے اغراض و مقاصد کیا تھے۔ میں کسی بھی حکومت کو جو اپنے حریف سے جنگ کرتی ہے اس کے کچھ فوجیوں کے معیار پر نہیں پرکھتا کہ وہ مالِ غنیمت کے حصول اور دشمنوں سے مال و اسباب کے چھیننے کے لیے اس میں شریک ہوتے ہیں یا دوسرے ساز و سامان اور مال و متاع کا حصول ان کے پیش نظر ہوتا ہے میں اسے اس کے اس نظریے کی بنیاد پر پرکھتا ہوں جس کے تحت وہ تلوار اٹھاتی ہے اور جو اس کی تمام جنگی سرگرمیوں کے پیچھے کارفرما ہوتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلامی قیادت کے پیش نظر اس کی ابتدائی فتوحات میں متعین طور پر اور بعد کی بیشتر فتوحات میں بحیثیت مجموعی اس کے سوا کوئی دوسرا مقصد نہیں تھا کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو اور اسلام ساری انسانیت کا دین بن جائے لیکن جبر و تشدد کے ذریعے نہیں بلکہ دعوت کو برضا و رغبت قبول کر لینے کے راستے سے دعوت کو قبول کرنے اور عقیدے کو برقرار رکھنے کی آزادی کی یقین دہانی کے لیے لشکر روانہ کیے گئے اور جنگیں لڑی گئیں۔ چنانچہ اس کا باضابطہ اعلان کر دیا جاتا تھا کہ یہی ان کا پہلا اور آخری مقصد ہے

اس طرح ان تمام جھوٹے الزامات اور افترا پردازیوں کی خود ساختہ عمارت منہدم ہو جاتی ہے جسے اہل مغرب نے اسلامی فتوحات، اس کے مزاج اور محرکات کے بارے میں بڑی محنت سے تیار کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان الزامات میں سے بعض اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مذہبی تعصب کی پیداوار ہیں اور بعض دوسرے اسلامی تعلیمات کی غلط تشریح کا شاخسانہ ہیں۔ اس لیے کہ مغربی مورخین نے اسلامی فتوحات کو اپنی فتوحات پر قیاس کر لیا ہے اور اسلامی فتوحات کے محرکات کو اپنی شہنشاہانہ (IMPERIAL) اور استعماری (COLONIAL) فتوحات کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں خواہ ان کا تعلق عہدِ قدیم سے ہو یا عہد جدید سے۔

یہ تھے اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے دو مفہوم) ان کے علاوہ اس کا ایک تیسرا مفہوم بھی ہے جو انہیں دونوں مفہوموں سے نکلا ہوا ہے اور ان کی تکمیل کرتا ہے۔ اسلام ایک وجدان سے تعلق رکھنے والا عقیدہ ہے جس سے ایک قانونی شریعت پھوٹتی ہے اور اس کی بنیاد پر ایک اجتماعی نظام (SOCIAL SYSTEM) تشکیل پاتا ہے۔ ایک ایسا نظام جو ان تمام اجتماعی نظاموں سے ممتاز حیثیت کا مالک ہے جنہیں اب تک انسانیت نے دیکھا ہے۔ وہ اپنی خاص بنیادیں رکھتا ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بعض چیزوں میں دوسرے نظام بھی مشترک ہوں لیکن بحیثیت مجموعی یقینی طور پر وہ دوسرے تمام نظاموں سے نمایاں اور ممتاز نظر آتا ہے۔

انہی انہیں خصوصیات کی بنا پر وہ ایک ایسا عالمی نظام ہے جو ہر طرح کی قومی نسلی اور مذہبی عصبیتوں سے پاک ہے اور اسی وجہ سے وہ ہر انسان کو اس بات کا کھلا موقع دیتا ہے کہ وہ اس کے قافلے میں کسی زحمت کے بغیر شامل ہو جائے نیز وہ اس شمولیت کے ساتھ ہی اسے ان تمام حقوق سے بہرہ اندوز ہونے کا موقع بھی دیتا ہے جن سے اب تک ہر مسلمان خواہ اس کا تعلق کسی جنس یا کسی قبیلے سے ہو، بہرہ اندوز ہو رہا تھا (اور ایسا کیوں نہ ہو جب کہ اللہ تعالیٰ نے صاف صاف فرما دیا ہے

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ القرآن	اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تم کو مختلف قوموں اور قبیلوں میں بانٹ دیا ہے (صرف اس لیے) تاکہ تم آپس میں ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ (ورنہ جہاں تک شرف و منزلت کا تعلق ہے تو) بلاشبہ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ صاحب شرف و منزلت وہی ہے جو تم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہے۔

اور انہی انہیں خصوصیات کی وجہ سے وہ ایک عادلانہ نظام ہے جو تمام افراد کے لیے یکساں حقوق کی ضمانت دیتا ہے اور کسی حاکم کسی خاندان اور کسی طبقے کو کسی ایسے مخصوص حق سے نہیں

نوازتا جو عام افراد کو حاصل نہ ہو اور قوموں اور قبیلوں کے درمیان مکمل عدل و مساوات کی ضمانت دیتا ہے۔ چنانچہ وہ دشمنی اور عداوت کو کوئی وزن نہیں دیتا بالکل ویسے ہی جیسے کہ دوستی اور رشتے داریاں اس کے نزدیک کوئی وزن نہیں رکھتیں۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ	اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات کا
قَوْمٍ عَلَىٰٓ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا	مجرم نہ بنائے کہ تم عدل نہ کرو۔ ہمیشہ عدل
هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ	کی روشنی کو اپنائے رکھو کہ یہی تقویٰ سے
القرآن	قریب تر ہے۔
وإذا قلتم فاعدلوا	اور تم جب بھی کوئی بات کہو تو عدل سے
ولو كان ذا قربى	کام لو خواہ معاملہ تمہارے کسی قریبی رشتہ دار
(القرآن)	ہی کا کیوں نہ ہو)

یہاں تک کہ جس چیز کو عہد حاضر میں "حکومت کے مفاد (Interest of the state)" کا نام دیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں بھی اسلام حکومت کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ افراد، جماعتوں اور قوموں کے ساتھ اپنے معاملات میں بے لوث عدل و انصاف سے روگردانی کرے۔ جملہ معاملات کا صرف ایک مقصد ہے اور وہ یہ کہ اسلامی شریعت کو روبہ عمل لایا جائے تاکہ اللہ کا کلمہ بلند ہو سکے۔

اسی لیے اسلام اپنے متبعین کو اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ وہ ساری دنیا میں عدل و انصاف کے قیام اور ظلم و سرکشی کو ختم کرنے کے نقیب بن کر رہیں تاکہ اللہ کا کلمہ عملاً قائم ہو سکے۔ پس جہاں کہیں بھی ظلم و سرکشی پائی جائے وہاں مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اسے مٹانے اور ختم کرنے کے لیے سب سے پہلے آگے بڑھیں۔ بلا لحاظ اس کے کہ یہ ظلم و سرکشی کن لوگوں کی طرف سے ہوتی ہے۔ خواہ یہ ظلم فرد کا فرد کے ساتھ ہو یا فرد کا جماعت کے ساتھ ہو۔ جماعت کا فرد کے ساتھ ہو یا جماعت کا جماعت کے ساتھ ہو سب کا سب برابر ہے اس لیے کہ سارے انسان برابر ہیں۔

وان طائفتان من المؤمنين	اور اگر مومنوں کے دو گروہ آپس میں
اقتتلوا فاصلحوا بينهما	لڑ جائیں تو ان کے درمیان صلح کرا دو لیکن اگر

فان بغت احدٰهما علی الاخریٰ فقاتلوا التی تبغی حتیٰ تفیٔ الیٰ امر اللہ فان فاءت فاصلحوا بینہما بالعدل واقسطوا ان اللہ یحب المقسطین

(القرآن)

(پھر اگر اس کے بعد بھی) ان میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو اس سے جنگ کرو جو زیادتی کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کو ماننے کے لیے آمادہ ہو جائے پس اگر وہ اس کے لیے آمادہ ہو جائے تو ان کے درمیان انصاف کے ساتھ صلح کرا دو اور ہمیشہ انصاف سے کام لو (کہ) بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں (ہی) کو پسند کرتا ہے۔

وما لکم لا تقاتلون فی سبیل اللہ والمستضعفین من الرجال والنساء والولدان الذین یقولون ربنا اخرجنا من ھٰذہ القریۃ الظالم اھلھا واجعل لنا من لدنک ولیا واجعل لنا من لدنک رحمة

(القرآن)

اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اور ان کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر جنگ نہیں کرتے جو (دشمنانِ دین کے ظلم و ستم سے تنگ آکر) یہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں ظالموں کی اس بستی سے نکال دے اور ہمارے لیے اپنی طرف سے ہمنوا بھیج اور ہمارے لیے اپنی طرف سے مددگار بھیج۔

جن چیزوں کا بھی تعلق عدل اجتماعی (Social Justice) کے قیام سے ہو گا انہیں ظلم کے ختم کرنے اور عدل کے قائم کرنے ہی میں شمار کیا جائے گا۔ اسلام نہ صرف یہ کہ عدل اجتماعی کو اس کی باریک ترین صورت میں۔ اپنی شریعت کا ایک جزو سمجھتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے انسان کو جن چیزوں کا مکلف بنایا ہے اسے ان کا ایک حصہ قرار دیتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ اسے ایک عبادت بھی قرار دیتا ہے جسے ایک مسلمان فرد بھی لیکر اٹھتا ہے اور ایک اسلامی حکومت بھی اسی کی علمبردار ہوتی ہے تاکہ اللہ کے ثواب کو حاصل کیا جا سکے اور اس کے عذاب سے بچا جا سکے اور اس طرح قانون کی ضمانت کے ساتھ ساتھ اسلام اس کے رشتے کو دین سے بھی استوار کر دیتا ہے

اور یہی نہیں بلکہ وہ اس عدل اجتماعی کو عملاً قائم کرنے کے لیے جنگ کو بھی فرض قرار دیتا ہے جبکہ اسے برپا کرنے کے لیے جنگ کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ باقی نہ رہ گیا ہو۔

ان تفصیلات سے جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی جنگوں اور اسلامی فتوحات کے تعلق سے ہمیشہ یہ چیز پیش نظر رہی ہے کہ ایک طرف دعوت کو قبول کرنے اور عقیدے کو برقرار رکھنے کی آزادی کو عملاً برپا کیا جا سکے اور دوسری طرف تمام انسانوں کے لیے مکمل عدل کا قیام عمل میں آ سکے لیکن اگر کوئی جنگ ان خصوصیات کی حامل نہیں ہے، جنگ کرنے والوں کے اندر اور جن ملکوں کو فتح کیا گیا ہے ان کے تعلق سے یہ اسپرٹ برقرار نہیں رہی ہے تو نہ وہ جنگ اسلامی جنگ ہوگی اور نہ اس فتح کو اسلامی فتح کہا جا سکے گا۔ اس کا حاصل اس سے زیادہ کچھ نہ ہوگا کہ اسلامی جھنڈے تلے ایک اور خطہ زمین کا اضافہ کر دیا جائے۔ (اسلام کے تعلق سے) اصل قدر و قیمت کی حامل چیز یہ ہے کہ عملاً مکمل طور پر وہ عادلانہ نظام قائم ہو سکے جس کی بنیاد اس اسلامی شریعت پر ہوتی ہے جو براہ راست اسلامی عقیدے سے پھوٹتی ہے یہی وہ قوت جاذبہ تھی جس کے تحت اسلام کی طرف قوموں کی قومیں اور قبیلوں کے قبیلے کھنچے چلے آتے تھے اور یہی در اصل ایک اسلامی فتح کا مقصد ہے کسی خطہ زمین پر قبضہ پانے اور مال غنیمت کا حصول، نیز ملکوں اور ان کی رعایا پر تسلط کسی بھی درجے میں اس کے مقاصد میں شامل نہیں ہے۔

اسلامی فتوحات کی یہی وہ اسپرٹ ہے جس کی تصدیق ٹی ڈبلیو آرنلڈ کے بیان سے ہوتی ہے) وہ اپنی کتاب الدعوۃ الی الاسلام[1] میں رقمطراز ہیں:-

اسی لیے میخائیل اعظم انطاکیہ کے یعقوبی بطریق MICHAEL THE GREAT THE IACOBIAN PATRIARCH OF ANTAKIA کے لیے یہ ممکن ہو سکا کہ۔ اور یہ بات اس نے بارہویں صدی کے نصف آخر میں کہی ہے۔ وہ اپنے دینی بھائیوں کے بیانات کو خوش آمد کہہ سکے جس کے تحت اسے عربوں کی فتوحات میں اللہ کا ہاتھ نظر آتا تھا اور اس کا یہ تاثر اس وقت سے متعلق ہے جب کہ مشرق کے گرجے اسلامی حکومت کے مسلسل پانچ سو برس تک پرکھ چکے تھے۔ وہ ہرقل کے مظالم کی تفصیل

---

[1] الدعوۃ الی الاسلام، مصنف کی کتاب کا عربی ترجمہ ہے جسے جناب حسن ابراہیم اور ان کے دو ساتھیوں نے تیار کیا ہے۔ (سید قطب)

سے بیان کرنے کے بعد لکھتا ہے :-

یہی وجہ ہے کہ جب اللہ نے اس اللہ نے جو کہ مناسب وقت پر انتقام لیے بغیر نہیں رہتا جو تنہا ساری قوت وسطوت کا مالک ہے اور جو انسانوں کے درمیان اپنی مرضی کے مطابق حکومت سلطنت کو برابر گردش دیتا رہتا ہے اور جسے چاہتا ہے اسے اس سے نواز دیتا ہے اور اس طرح کمزوروں کو بھی بلندی کے مقام تک پہنچا دیتا ہے اس اللہ نے جب اہل روم کی شرارتوں کو دیکھا جنہوں نے محض طاقت وقوت کے سہارے ہمارے گرجا گھروں کو لوٹا اور ہمارے عبادت خانوں کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور ہم پر بڑی بے دردی کے ساتھ ظلم وستم کے پہاڑ توڑے، تو اس جنوبی ملکوں سے بنو اسمٰعیل کو بھیجا تاکہ وہ ہمیں اہل روم کے قبضے سے نجات دلا سکیں یہ ایک حقیقت ہے کہ جب ہمیں اس خسارے کو برداشت کرنا پڑا کہ ہمارے کیتھولک چرچ ہم سے چھین لیے گئے اور انہیں اہل خلقیدونیہ کے حوالے کر دیا گیا تو یہ چرچ مستقلاً انہیں کے قبضہ میں برقرار رہے لیکن جب یہ شہر عربوں کے زیر اقتدار آئے تو ہر جماعت کے لیے وہ چرچ مخصوص کر دیے گئے جو واقعۃً ابتدا میں ان کے قبضے میں رہے تھے (جبر واستبداد کا یہی وہ زمانہ تھا جب ہم سے حمص کا چرچ عظیم اور حران کا چرچ چھین لیا گیا تھا) ظاہر ہے اس صورت حال میں ہمارے لیے کوئی آسان کام نہ تھا کہ ہم اہل روم کی سنگدلی سے، ایذا رسانی اور ان کے بدترین ظلم وستم سے اپنے آپ نجات حاصل کر لیتے اور اپنے لیے امن وسلامتی کی فضا میں سانس لینے کا موقع بہم پہنچا لیتے

اسی طرح جب اسلامی لشکر وادی اردن میں پہنچا اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں بھیجے جانے والے دستے نے فحل کے مقام پر پڑاؤ ڈالا تو ان علاقوں کے بسنے والے عیسائیوں نے عربوں کے پاس لکھ بھیجا۔

یا معشر المسلمین انتم احب	اے مسلمانو! تم ہمیں اہل روم کے مقابلہ
الینا من الروم وان کانوا علیٰ	میں زیادہ عزیز ہو۔ اگرچہ وہ ہمارے دین کے
دیننا انتم اوفیٰ لنا وارأف	ماننے والے ہیں۔ تم ہمارے لیے زیادہ
بنا واکفّ عن ظلمنا واحسن	باوفا رہو اور ہم پر زیادہ رحم کرنے والے
ولایۃ علینا ولکنہم غلبونا	ہو، ہم پر ظلم کرنے سے بہت دور رہنے والے

علی امرنا وعلی منازلنا — ہو اور ہم پر بہترین طریقے سے حکمرانی کرنے والے۔ تمہارے برخلاف ان لوگوں نے (اہل روم) ہم پر اور ہماری بستیوں پر زبردستی تسلط حاصل کر لیا تھا۔

اسی طرح اہل حمص نے بھی ہرقل کے لشکر کے سامنے اپنے شہر کے دروازے بند کر لیے تھے اور مسلمانوں کو یہ پیغام پہنچایا تھا کہ ان کی سرپرستی اور ان کا عدل و انصاف ان کے لیے از یقصوریح ظلم و ستم کے مقابلہ میں زیادہ بہتر ہے [۱]۔

اسلامی فتوحات انسانی تاریخ میں اپنی نوعیت کی واحد فتوحات تھیں جن کی کوئی نظیر نہ انسانیت نے ان سے پہلے دیکھی اور نہ ان کے بعد اور ایسا کیوں نہ ہو جبکہ ان کے پیش نظر یہ تھا ہی نہیں کہ خطۂ زمین اور اس کے خزانوں پر قبضہ کیا جائے۔ ان کا مقصد تو صرف یہ تھا کہ زمین پر بسنے والوں کے دل جیت لیے جائیں اور ان کے درمیان عدل و مساوات ہمدردی اور باہمی عفو و درگزر کا بیج بو دیا جائے۔

ہر انصاف پسند انسان جو اسلامی فتوحات کے مزاج کو جان لے گا اور ان کے اغراض و مقاصد اور محرکات کو سمجھ لے گا وہ تمنا کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اے کاش! یہ باران رحمت پوری سرزمین عالم کو سیراب کر گیا ہوتا اور اس کے اندر عدل و مساوات اور ہمدردی و عفو و درگزر کے اس بہترین بیج کو بو گیا ہوتا اور اب بلا شبہہ ہماری امیدیں اللہ ہماری مدد کرے۔ اسلام کی اس نشاۃ ثانیہ سے لگی ہوئی ہیں جس کے اثرات عالم اسلامی کی بیداری اور فکر اسلامی کے ابھار کی صورت میں نمودار ہونے لگے ہیں کہ وہ اپنے ابر رحمت سے زمین اور اہل زمین کو دوبارہ سیراب کر دے۔ آمین

---

[۱] یہ بیان کتاب مذکور کے ص۱۳۵ اور اس کے بعد کے صفحات میں مذکور ہے۔ (مصنف)

الزام سحر

(جناب محمد ذکی صاحب شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ)

ہمیشہ ہی سے یہ مسئلہ زیر بحث رہا ہے کہ آخر کس بنیاد پر ایک انسان کو اللہ کا رسول تسلیم کر لیا جائے اور اس کے ہاتھ میں زندگی کی باگ ڈور دے دی جائے۔ چنانچہ رسولوں کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی کسی رسول نے اپنی رسالت کا اعلان کیا ہے مخاطبین کی بھاری اکثریت نے یہی کہا ہے کہ تم ہم جیسے انسان ہو، ہماری ہی طرح کھاتے پیتے اور چلتے پھرتے ہو، کسی بھی حیثیت سے ممتاز نہیں۔ پھر ہم کس طرح مان لیں کہ اللہ تعالیٰ نے رسالت، جیسے بلند اور اہم منصب پر تمہیں فائز کر دیا ہے۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

حضرت نوح علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو توحید و رسالت کی دعوت دی تو اُن کی قوم کے سرداروں نے جنھوں نے ان کی دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا بولے :۔

> ہماری نظر میں تو تم اس کے سوا کچھ نہیں ہو کہ بس ایک انسان ہو ہم جیسے۔ اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری قوم میں سے بس ان لوگوں نے جو ہمارے ہاں اراذل تھے بے سوچے سمجھے تمہاری پیروی اختیار کر لی ہے اور ہم کوئی چیز بھی ایسی نہیں پاتے جس میں تم لوگ ہم سے کچھ بڑھے ہوئے ہو۔ بلکہ ہم تو تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں[1] (ہود ع ۳)

حضرت ہود علیہ السلام کی قوم کو بھی اس پر تعجب ہوا کہ اللہ نے ایک انسان کو رسول بنا کر بھیج دیا۔ ہود علیہ السلام نے سمجھایا :۔

> کیا تمہیں اس بات پر تعجب ہوا کہ تمہارے پاس خود تمہاری اپنی قوم کے ایک آدمی کے ذریعے سے تمہارے رب کی یاد دہانی آئی تاکہ وہ تمہیں خبردار کرے۔ بھول نہ جاؤ کہ

[1] ترجمہ تمامتر تفہیم القرآن سے لیا گیا ہے

تمہارے رب نے نوح کی قوم کے بعد تم کو اس کا جانشین بنایا اور تمہیں خوب تنومند
کیا پس اللہ کی قدرت کے کرشموں کو یاد رکھو، امید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔ (الاعراف ع۹)
حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کا جواب بھی یہی تھا کہ :-
تو ہم جیسے ایک انسان کے سوا اور کیا ہے۔ (الشعراء ع۸)
قرآن حکیم نے اسی قسم کے لوگوں کا یہ مقولہ بھی نقل کیا ہے۔
یہ شخص کچھ نہیں ہے مگر ایک بشر تم ہی جیسا۔ جو کچھ تم کھاتے ہو وہی یہ کھاتا ہے اور جو کچھ
تم پیتے ہو وہی یہ پیتا ہے۔ اب اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک بشر کی اطاعت قبول کرلی تو
تم گھاٹے ہی میں رہے۔ (المومنون ع۳)
شعیب علیہ السلام کو یہ جواب دیا گیا :-
اور تو کچھ نہیں ہے مگر ایک انسان ہم ہی جیسا اور ہم تو تجھے بالکل جھوٹا سمجھتے ہیں
(الشعراء ع۱۰)
جب موسےٰ و ہارون علیہما السلام فرعون کے دربار میں پہنچے اور توحید کی دعوت دی تو فرعون
اور اس کے اعیانِ سلطنت نے اکڑ کر کہا :-
کیا ہم اپنے ہی جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں ؟ (المومنون ع۳)
اور اہل مکہ نے سب سے آخری رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار ان
الفاظ میں کیا :-
یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ (الفرقان ع۱)
یہ لوگ آپس میں سرگوشیاں کرتے تھے کہ
یہ شخص آخر تم جیسا ایک بشر ہی تو ہے۔ پھر کیا تم آنکھوں دیکھتے جادو کے پھندے میں
پھنس جاؤ گے۔ (الانبیاء ع۱)
بہت ممکن ہے یہ اعتراض اس وجہ سے کیا گیا ہو کہ دنیا میں انسانوں کا نمائندہ یا سفیر اونچا
ہی ہوتا ہے لہذا خدا کا فرستادہ یا تو کوئی خدا ہو یا کم از کم خدا سے ملتا جلتا ہو۔ چنانچہ ان کی نظر میں
میں منصبِ رسالت کے مستحق فرشتے تھے۔ قرآن حکیم نے اس نظریہ کا ذکر بھی کیا ہے اور اس میں تمام

ہے وہ بھی ظاہر کر دی ہے ۔

لوگوں کے سامنے جب کبھی ہدایت آئی تو اس پر ایمان لانے سے ان کو کسی چیز نے نہیں روکا مگر ان کے اسی قول نے کہ "کیا اللہ نے بشر کو پیغمبر بنا کر بھیج دیا؟ ان سے کہو اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چل پھر رہے ہوتے تو ہم ضرور کسی فرشتے ہی کو ان کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجتے ۔ (بنی اسرائیل ع ۱۱)

اگر کسی فرشتے کو انسانوں کی طرف رسول بنا کر بھیج بھی دیا جاتا تو ظاہر ہے کہ نظر نہیں آتا اور جب نظر ہی نہ آتا تو بھیجنے سے کیا فائدہ ہوتا اور اگر انسانی شکل میں بھیجا جاتا تو لوگ یہ نہ کہتے کہ یہ تو انسان ہے، فرشتہ کہاں ہے ۔ غرض اس وقت بھی نہیں مانتے

اور اگر ہم فرشتے کو اتارتے تب بھی اسے انسانی شکل میں اتارتے اور اس طرح انہیں اسی شبہے میں مبتلا کر دیتے جس میں اب یہ مبتلا ہیں (الانعام ۔ ع)

اس جواب سے معترضین کی یہ غلط فہمی تو دور ہو گئی کہ انسان خدا کا رسول نہیں ہو سکتا ۔ البتہ یہ بات ان کے دلوں میں برابر کھٹکتی رہی کہ خدا کا رسول عام انسانوں کی طرح کیسے ہو سکتا ہے ۔ اس میں کچھ نہ کچھ غیر معمولی پن تو ضرور ہو مثلاً کوئی ایسا کام کر دکھائے جو دوسرے انسان دکھانے سے عاجز ہوں اور جسے رسول خدا کی سند کے طور پر پیش کر سکے تاکہ لوگوں پر ظاہر ہو جائے کہ رسالت کا مدعی سچا ہے یہی وجہ ہے کہ ہود علیہ السلام کی قوم نے کہا تھا :۔

اے ہود ! تو ہمارے پاس کوئی شہادت لے کر نہیں آیا ہے ۔ (ہود ع)

یعنی تیرے پاس کوئی خدائی سند تو ہے نہیں پھر ہم کس طرح تجھے خدا کا رسول مان لیں

صالح علیہ السلام کی قوم نے مطالبہ کیا کہ :۔

لا کوئی نشانی اگر تو سچا ہے (الشعراء ع)

دولت اور حکومت کے نشے میں سرشار فرعون نے بھی موسیٰ علیہ السلام سے یہی کہا تھا :۔

اگر تو کوئی نشانی لایا ہے اور اپنے دعوے میں سچا ہے تو اسے پیش کر (الاعراف ع ۱۳)

اصطلاح میں اس قسم کے نشان کو معجزہ کہتے ہیں ۔ بظاہر یہ مطالبہ معقول تھا کہ رسول اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی معجزہ دکھا دے ۔ لیکن کیا معجزات کا مشاہدہ کر لینے کے بعد لوگوں نے تسلیم کر دیا

اس کا جواب بھی تاریخ میں محفوظ ہے۔

مصر کے فرماں روا فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السّلام سے معجزہ دکھانے کی فرمائش کی

موسیٰ نے اپنا عصا پھینکا اور یکایک وہ ایک صریح اژدہا تھا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ (بغل سے) کھینچا اور یکایک وہ دیکھنے والوں کے سامنے چمک رہا تھا۔ (الشعراء ع۲)

ایک معمولی لاٹھی کا اژدہا بنجانا اور ہاتھ کا آفتاب کی طرح روشن ہوجانا فرعون اور حاضرین دربار کو حیرت میں ڈال دینے کے لیے کافی تھا لیکن فرعون نے جھٹ اس کی تاویل کر ڈالی ہے اور اپنے گرد وپیش کے سرداروں سے بولا:-

یہ شخص یقیناً ایک ماہر جادوگر ہے۔ چاہتا ہے کہ اپنے جادو کے زور سے تم کو تمہارے ملک سے نکال دے۔ اب بتاؤ تم کیا حکم دیتے ہو؟

فرعون باوجود خدائی کے دعوے کے اس قسم کا معجزہ دکھانے سے قاصر تھا۔ اس کے بڑے بڑے سردار بھی موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے سے عاجز تھے اور اب اس کو اپنا قصر فرمانروائی گرتا نظر آرہا تھا جسے کوئی بھی بچانے کے لیے تیار نہ تھا۔ یہ دیکھ کر فرعون نے ایک خالص مذہبی تحریک کو سیاسی رنگ دے دیا تاکہ پوری قوم اپنی لیکن دراصل فرعون کی مدافعت کے لیے تیار ہوجائے۔ تیر نشانہ پر لگ گیا سرداروں نے کہا:-

اسے اور اس کے بھائی کو روک لیجیے اور شہروں میں ہرکارے بھیج دیجیے کہ ہر سیانا جادوگر کو آپ کے پاس لے آئیں۔

فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے معجزے کو جادو کہہ دیا تھا اور اب وہ یہ دکھانا چاہتا تھا کہ اس جادو کا کاٹ جادوگر ہی کر سکتا ہے

چنانچہ ایک روز مقرر وقت پر جادوگر اکٹھے کر لیے گئے اور لوگوں سے کہا گیا تم جمع ہوں میں چلو گے؟ شاید کہ ہم جادوگروں کے دین ہی پر رہ جائیں۔ اگر وہ غالب رہے۔

یعنی یہ نیت ہی نہیں تھی کہ اگر واقعی موسیٰ علیہ السلام غالب رہے اور ان کا معجزہ سحر نہ ہوا تو ہم پھر ان کی بات مان لیں گے بلکہ یہی ارادہ تھا کہ جادوگروں کی روش پر ہی چلنے کا کوئی معقول بہانہ ہاتھ آجائے گا۔ بہرحال:-

جب جادوگر میدان میں آئے تو انھوں نے فرعون سے کہا ہمیں انعام تو ملے گا اگر ہم غالب رہے؟

اس نے کہا۔ ہاں، اور تم تو اس وقت مقربین میں شامل ہو جاؤ گے۔ موسیٰ نے کہا۔ پھینکو جو کچھ تمہیں پھینکنا ہے۔ انھوں نے فوراً اپنی رسیاں اور لاٹھیاں پھینک دیں اور بولے "فرعون کے اقبال سے ہم ہی غالب رہیں گے۔ پھر موسےٰ نے اپنا عصا پھینکا تو وہ یکایک ان کے جھوٹے کرشموں کو ہڑپ کرتا چلا جا رہا تھا[1]۔ اس پر سارے جادوگر بے اختیار سجدے میں گر پڑے اور بول اٹھے کہ "مان گئے ہم رب العالمین کو ——— موسےٰ اور ہارون کے رب کو

فرعون نے کہا تم موسےٰ کی بات مان گئے، قبل اس کے کہ میں تمہیں اجازت دیتا ضرور یہ تمہارا بڑا ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے۔ اچھا ابھی تمہیں معلوم ہوا جاتا ہے۔ میں تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹواؤں گا اور تم سب کو سولی پر چڑھا دوں گا۔

انھوں نے جواب دیا کچھ پروا نہیں۔ ہم اپنے رب کے حضور پہنچ جائیں گے اور ہمیں توقع ہے کہ ہمارا رب ہمارے گناہ معاف کر دے گا۔ کیونکہ سب سے پہلے ہم ایمان لائے ہیں۔ (الشعراء ع ۳)

اجتماع اور مقابلہ کا مقصد یہ تھا کہ موسےٰ علیہ السلام کا مقابلہ زیادہ اور ماہر جادوگروں سے کرایا جائے اس توقع پر کہ اتنے جادوگروں کے سامنے موسےٰ علیہ السلام کا جادو نہ چل سکے گا اور یہ اپنی شکست تسلیم کر لیں گے۔ اس طرح یہ "سیاسی شورش" یہیں ختم ہو جائے گی لیکن نتیجہ اس کے برعکس نکلا۔ جادوگروں کا جادو موسےٰ علیہ السلام کے سامنے نہ ٹھیر سکا۔ جادوگروں کے لیے اتنا اعتراف کر لینا کافی تھا کہ موسےٰ علیہ السلام واقعی بڑے جادوگر ہیں۔ ہم ان کا کم از کم اس وقت مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہم سے اور موسےٰ علیہ السلام سے بھی بڑے جادوگر کی تلاش کی جائے۔ لیکن انھوں نے برملا اقرار کر لیا کہ موسےٰ علیہ السلام رب العالمین کے سچے رسول ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ خود بھی ایمان لے آئے۔ اس سے بھی بڑھ کر جان خطرے میں ڈال دی اور دھمکیوں کے باوجود ایمان پر ثابت قدم

[1] دوسری جگہ تفصیل یہ ہے کہ "ان کی لاٹھیاں اور رسیاں سانپوں کی طرح لہراتی نظر آئیں۔ یہ تھا ان کا جادو

رہے۔ حالانکہ وہ اپنی جان چھڑانے کے لیے موسے علیہ السلام کو ایک زیادہ ماہر جادوگر کہتے تھے
بہر حال فرعون اور اس کے درباریوں کے سامنے یہ سب کچھ ہوا اور وہ موسے علیہ السلام کے معجزہ
کو جادو ہی کہتے رہے۔ گویا ان کے نزدیک دو ٹوک فیصلہ نہیں ہو سکا تھا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا
ہے کہ آخر یہ فیصلہ کس طرح ہو سکتا تھا۔ آخر موسے علیہ السلام کی صداقت کس طرح ظاہر ہو سکتی تھی
کیا موسے علیہ السلام کی سچائی اس صورت میں واضح ہوتی کہ وہ جادوگروں کے سامنے شکست
کھا جاتے؟ کیا ان کی اتنی شاندار کامیابی اس بات کی دلیل تھی کہ وہ اپنے دعوے میں
جھوٹے تھے؟

اگر کوئی بتا سکتا ہے تو بتائے کہ آخر وہ کون سی صورت ممکن تھی جس سے موسے علیہ السلام
کے دعوے کی صداقت ثابت ہوتی؟

ہم اس وقت اس بحث میں نہ الجھنا چاہتے ہیں نہ مخاطبین کو الجھانا چاہتے ہیں کہ سحر اور معجزہ
میں کیا فرق ہے، بلکہ یہ سوال سامنے رکھتے ہیں کہ آخر معجزہ کسے کہتے ہیں؟ اس میں شک نہیں کہ آج
فرعون دنیا میں نہیں، اس کے سرداروں کے نام و نشان بھی مٹ چکے لیکن اس کے ہمنوا تو آج بھی
دنیا میں موجود ہیں اور کثیر تعداد میں، ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ وہ صرف اتنا بتا دیں کہ معجزہ کسے کہتے
ہیں اور یہ کہ اگر ایک شخص واقعی خدا کا رسول ہو تو اس کی پہچان کس طرح ہو سکتی ہے؟ کیا آج تک کوئی
اتنا بڑا جادوگر پیدا نہیں ہو سکا جو موسے علیہ السلام جیسا "جادو" دکھا سکتا؟ نہیں تو اس بات
کا یقین ہے کہ فرعون اور اس کے سرداروں کی طرح اس کے ہمنوا بھی ہمیشہ عاجز و درماندہ رہیں
گے اور کبھی بھی انہیں مقابلہ کی جرأت نہ ہو سکے گی۔

کیا آپ نے معترضین کی اس ڈھٹائی پر بھی کبھی غور کیا ہے کہ جب بھی ان کے سامنے کوئی
رسول آیا تو انھوں نے پہلے یہ رٹ لگائی کہ تم ہمارے طرح کے انسان ہو پھر کس طرح خدا کا رسول
مان لیں کوئی نشانی (معجزہ) دکھاؤ تو مانیں۔ اور جب معجزہ دکھایا تو جادو کہہ دیا۔

عیسے علیہ السلام نے بھی کئی معجزے دکھائے مثلاً جب وہ ماں کی گود میں تھے تو لوگوں سے
کلام کرتے تھے۔ مٹی سے پرندے بنا کر ان میں پھونک مار دیتے تو وہ سچ مچ کے پرندوں کی طرح
اڑنے لگتے۔ مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کر دیتے۔ لوگ جو کچھ کھا کر آتے یا گھروں میں رکھ آتے

وہ سب بتا دیا گیا نے تھے۔ قرآن عزیز نے ان تمام معجزات کا ذکر کیا ہے۔

اور جب فرشتوں نے کہا "اے مریم! اللہ تجھے اپنے ایک فرمان کی خوش خبری دیتا ہے۔ اس کا نام مسیح عیسے ابن مریم ہوگا۔ دنیا اور آخرت میں معزز ہوگا۔ اللہ کے مقرب بندوں میں شمار کیا جائے گا۔ لوگوں سے گہوارے میں بھی کلام کرے گا۔ اور بڑی عمر کو پہنچکر بھی اور وہ ایک مرد صالح ہوگا۔ .... (اور جب وہ بحیثیت رسول بنی اسرائیل کے پاس آیا تو اس نے کہا) میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نشانی لیکر آیا ہوں میں تمہارے سامنے مٹی سے پرندے کی صورت کا ایک مجسمہ بناتا ہوں اور اس میں پھونک مارتا ہوں وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے۔ میں اللہ کے حکم سے مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کرتا ہوں اور مردے کو زندہ کرتا ہوں۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تم کیا کھاتے ہو اور کیا اپنے گھروں میں ذخیرہ کرکے رکھتے ہو۔ اس میں تمہارے لیے کافی نشانی ہے۔ اگر تم ایمان لانے والے ہو۔ (آل عمران ع ۵)

نہ ماننے والوں نے اسے بھی جادو کہہ دیا۔ بنی اسرائیل میں سے جو لوگ منکر حق تھے انھوں نے کہا کہ:-

یہ نشانیاں جادوگری کے سوا اور کچھ نہیں ہیں　　　(المائدہ ع ۱۵)

یعنی وہی بات جو موسے علیہ السلام کے بارے میں کہی گئی تھی۔ وقت بدلتا رہا لیکن منکرین رسالت کی روش میں کوئی فرق نہیں آیا۔ معجزات کی فرمائش کرتے تھے۔ پھر انہیں جادو کہکر ٹال دیتے تھے۔ نتیجہ میں ہلاکت کے گڈھے میں گر جاتے تھے۔ پھر دوسری قوم ان کی جگہ آئی۔ وہ بھی اسی داستان کو دہراتی مگر عبرت حاصل نہیں کرتی تھی۔

اور سب سے آخر میں جب حضرت محمد مصطفے صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رسالت کا اعلان کیا تو اہل مکہ نے بھی وہی ایک رٹ لگائی کہ معجزہ دکھاؤ۔ اس کے بغیر ہم کس طرح ایمان لائیں۔ قرآن حکیم نے متعدد جگہ ان کے مطالبات کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً سورہ العنکبوت میں ہے:-

یہ لوگ کہتے ہیں کہ "کیوں نہ اتاری گئیں اس شخص پر نشانیاں اس کے رب کی طرف سے" کہو "نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں اور میں صرف خبردار کرنے والا ہوں کھول کھول کر

اور کیا ان لوگوں کے لیے یہ (نشانی) کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر کتاب نازل کی جو انہیں پڑھکر سنائی جاتی ہیں۔ درحقیقت اس میں رحمت ہے اور نصیحت ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔ (ع۵)

موسٰے علیہ السلام کا قصہ سنا تو کہنے لگے کہ ایسے ہی معجزات پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھی کیوں نہیں دیے گئے۔

مگر جب ہمارے ہاں سے حق ان کے پاس آگیا تو وہ کہنے لگے "کیوں نہ دیا گیا اس کو وہی کچھ جو موسٰے کو دیا گیا تھا؟

لیکن سوال یہ ہے کہ

کیا یہ لوگ اس کا انکار نہیں کر چکے ہیں جو اس سے پہلے موسٰے کو دیا گیا تھا۔

اس کے جواب میں

انھوں نے کہا" دونوں جادو ہیں جو ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور کہا "ہم کسی کو نہیں مانتے۔ (القصص ع۵)

یعنی یہ کیسے مان لیا جائے کہ اگر پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی ویسے ہی معجزات دکھا دیئے جیسے موسٰے علیہ السلام نے دکھائے تھے تو اب لوگ ایمان لائیں گے جنھوں نے اپنی آنکھوں سے معجزات کا مشاہدہ کیا تھا انھوں نے کب مانا، بلکہ جادو کہہ کر ٹال دیا۔ نیز یہ بات بھی تو قابل غور ہے کہ توراۃ میں موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا ذکر موجود تھا پھر اہل مکہ نے کیا توراۃ کے بیان کو تسلیم کرتے ہوئے موسٰے علیہ السلام کو خدا کا رسول تسلیم کر لیا تھا۔ اور آج (بیسویں صدی میں) کتنے اہل کتاب ہیں جو ان معجزات پر ایمان رکھتے ہیں۔ پھر بھی اہل مکہ اصرار کرتے رہے:۔

یہ لوگ کڑی کڑی قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ اگر کوئی نشانی ہمارے سامنے آجائے تو ہم اس پر ایمان لے آئیں گے۔ اے محمد! ان سے کہو کہ "نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں اور تمہیں کیسے سمجھایا جائے کہ اگر نشانیاں آبھی جائیں تو یہ ایمان لانے والے نہیں۔ ہم اسی طرح ان کے دلوں اور نگاہوں کو پھیر رہے ہیں جس طرح یہ پہلی مرتبہ اس پر ایمان نہیں لائے تھے ہم ان کی سرکشی ہی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں (الانعام ع۱۳)

ان کی ڈھٹائی کا تو یہ عالم تھا کہ :-

اگر ہم فرشتے بھی اُن پر نازل کر دیتے اور مُردے ان سے باتیں کرتے اور دنیا بھر کی چیزوں کو ہم ان کی آنکھوں کے سامنے جمع کر دیتے تب بھی یہ ایمان لانے والے نہ تھے۔ الّا یہ کہ مشیتِ الٰہی یہی ہو کہ وہ ایمان لائیں۔ مگر اکثر لوگ نادانی کی باتیں کرتے ہیں۔

(الانعام ع ۱۴)

کیا یہ لوگ واقعی نیک نیتی سے معجزات کی فرمائش کرتے تھے؟ اس کا اندازہ مندرجہ ذیل فرمائشوں سے لگایا جا سکتا ہے :-

اور انھوں نے کہا۔ ہم تیری بات نہ مانیں گے جب تک کہ تو ہمارے لیے زمین کو پھاڑ کر ایک چشمہ جاری نہ کر دے یا تیرے لیے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ پیدا ہو اور تو اس میں نہریں رواں کر دے۔ یا تو آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہمارے اوپر گرا دے جیسا کہ تیرا دعوٰی ہے یا خدا اور فرشتوں کو رُو در رُو ہمارے سامنے لے آئے یا تیرے لیے سونے کا ایک گھر بن جائے یا تو آسمان پر چڑھ جائے اور تیرے چڑھنے کا بھی ہم یقین نہ کریں گے جب تک کہ تو ہمارے اوپر ایک ایسی تحریر نہ اتار لائے جسے ہم پڑھیں ــــ اے محمد ان سے کہو۔ پاک ہے میرا پروردگار کیا میں ایک پیغام لانے والے انسان کے سوا اور بھی کچھ ہوں؟ (بنی اسرائیل ع ۱۰)

یہ تمام فرمائشیں پوری ہو جانے کے بعد بھی معترضین ایمان لاتے یا نہ لاتے اس کا اندازہ عبداللہ ابن امیہ کے اس قول سے لگایا جا سکتا ہے۔

واللہ! میں تو آپ پر ہرگز ایمان نہ لاؤں گا۔ یہاں تک کہ آپ کوئی ایسی سیڑھی حاصل نہ کریں جو آسمان کی جانب جاتی ہو اور آپ اس پر اس طرح چڑھیں کہ میں دیکھتا رہوں آپ آسمان پر پہنچ جائیں۔ پھر آپ اپنے ساتھ ایک نوشتہ لائیں اور آپ کے ساتھ فرشتوں میں سے چار ایسے ہوں جو آپ کے موافق گواہی دیں کہ آپ ایسے ہی ہیں جیسا کہ آپ کہتے ہیں۔ اللہ کی قسم! اگر آپ نے ایسا کیا بھی تو میرا خیال ہے کہ میں آپ کی تصدیق نہ کروں گا۔[1]

---

[1] سیرت ابن ہشام (اردو ترجمہ: مولانا عبدالجلیل صدیقی۔ ۲۸۹-۲۹۰

ایسا تو نہیں کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کوئی معجزہ نہیں دکھایا، بڑے بڑے معجزات دکھائے لیکن انکار پر اڑنے والے لوگوں نے سب کچھ دیکھ کر وہی کیا جو اُن سے پہلوں نے کیا تھا منکرین نے کہا کہ یہ شخص تو کھلا جادوگر ہے ۔ (یونس ع ۱)

تم (اللہ کی قدرت کے کرشموں پر) حیران ہو اور یہ اس کا مذاق اڑا رہے ہیں سمجھایا جاتا ہے تو سمجھ کر نہیں دیتے۔ کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو اسے ٹھٹھوں میں اڑاتے اور کہتے ہیں۔ "یہ تو صریح جادو ہے"۔ (الصفت ع ۱)

قیامت کی گھڑی قریب آگئی اور چاند پھٹ گیا مگر ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں، منہ موڑ جاتے ہیں اور کہتے ہیں یہ تو چلتا ہوا جادو ہے۔ انھوں نے (اس کو بھی) جھٹلا دیا اور اپنی خواہشات نفس ہی کی پیروی کی (القمر ع ۱)

پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قرآن اقدس کو بھی بطور معجزہ پیش کیا اور کل مخالفین کو چیلنج دیا کہ اگر تم اسے انسانی کلام سمجھتے ہو تو سب جمع ہو کر اس قرآن جیسا یا اس کی ایک سورۃ جیسی ہی ایک سورۃ بنا کر پیش کر دو لیکن سب عاجز رہے۔ مگر جواب وہی دیا جو فرعون اور اس کے ساتھیوں نے دیا تھا۔ مثلاً ولید بن مغیرہ کا قول قرآن میں اس طرح نقل کیا گیا ہے :-

اس نے سوچا اور کچھ بات بنانے کی کوشش کی تو خدا کی مار اس پر کیسی بات بنانے کی کوشش کی، ہاں خدا کی مار اس پر کیسی بات بنانے کی کوشش کی۔ پھر (لوگوں کی طرف) دیکھا پھر پیشانی سکیڑی اور منہ بنایا۔ پھر پلٹا اور تکبر میں پڑ گیا۔ آخر کار بولا کہ یہ کچھ نہیں ہے مگر ایک جادو جو پہلے سے چلا آرہا ہے (المدثر ع ۱)

تاریخ کا یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ اگر کسی رسول نے معجزہ نہیں دکھایا تو مخالفین نے یہ اعتراض کیا کہ کسی سند کے بغیر ہم کس طرح رسول مان لیں اور جب معجزہ دکھایا تو اسے جادوگر کہہ دیا۔ سمجھ میں نہیں آتا آخر ان کے ذہن میں رسول کا کیا تصور تھا۔ اس قسم کی ذہنیت رکھنے والے آج بھی بکثرت دنیا میں موجود ہیں ان کو چاہیے کہ سب جمع ہو کر ٹھنڈے دل سے غور کریں مسئلہ کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیں۔ انبیاء کرام کی تاریخ کا مطالعہ کریں اور آپس میں بحث و مشورہ کے بعد صرف اتنا بتا دیں کہ خدا کے رسول کی کیا صفات ہوں مثلاً اس کا تعلق نوع انسانی سے ہو یا کسی اور نوع سے۔ عام انسانوں

کی طرح بھی سب میں ممتاز۔ اگر ممتاز ہو تو کن کن باتوں میں اس کا تعلق کس قوم سے ہو، مالدار ہو یا غریب وغیرہ وغیرہ۔

اس کے بعد بتائیں کہ ان کی شرائط کے مطابق آج تک کوئی رسول دنیا میں آیا ہے یا نہیں ہے اگر آیا ہے تو ذرا اس کا نام تو بتا دیں اور یہ کہ اس کے بارے میں ان کی کیا رائے ہے ...... ہم سمجھتے ہیں معترضین اس میدان میں قدم ہی نہیں رکھ سکیں گے۔

ان لوگوں کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ اگر ان کے مقرر کردہ معیار کے مطابق کوئی رسول نہیں آیا تو بتائیں کہ خدا کی طرف سے ہدایت کا کیا انتظام کیا گیا ہے۔ اگر اس مسلک کو اختیار کیا گیا تو پھر انہیں اس کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ یہ رسالت کے قائل نہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ یہ سرے سے رسالت ہی کے منکر ہیں۔ اس صورت میں انہیں اس کا حق نہیں رہتا کہ رسولوں پر اعتراضات کریں یا معجزات کی فرمائش کریں۔

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ رسولوں کی رسالت کا انکار اس وجہ سے نہیں کیا گیا کہ ان کی رسالت میں شبہ تھا یا ثبوت کی کمی تھی۔ معجزات کا مطالبہ اس لیے نہیں کیا گیا کہ مخالفین حق کی تلاش میں تھے اور ماننے کے لیے تیار تھے بلکہ جان بوجھ کر انکار کرتے رہے اور کر رہے ہیں۔ ہم پھر یہی کہیں گے کہ اگر ایسا نہیں تو پھر منکرین رسالت بتائیں کہ خدا کا رسول کیسا ہو جسے یہ مان لیں گے۔ کیا کسی میں جرأت ہے جو اس چیلنج کو قبول کر سکے ؟

شرائط ایجنسی

۱۔ ایجنسی کم سے کم پانچ رسائل پر دی جائے گی۔

۲۔ ۱۵/- ایڈوانس جمع کرنے ہوں گے

۳۔ ۵ سے ۵۰ پرچوں تک ۲۵ فیصدی کمیشن دیا جائے گا البتہ پچاس سے زائد پر ۳۳ فیصدی کمیشن دیا جائے گا

۴۔ رسائل کی روانگی کا خرچ دفتر برداشت کریگا اور وی پی کا خرچ ایجنٹ صاحبان کے ذمہ ہوگا۔

۵۔ ہر مہینے کا بل باقاعدگی سے ادا کرنا چاہیے۔

منیجر زندگی رام پور۔ یوپی

(مولینا سید ابوالاعلیٰ مودودی)

مسلمان دراصل ایک جماعت یا پارٹی کا نام ہے اور اس کو مجرد ایک قوم سمجھ لینا غلطی ہے۔ یہ نئی آواز لوگوں کے لیے وجہ پریشانی بن گئی ہے۔ ان مضامین کو دیکھ کر متعدد اصحاب نے اپنے شکوک و شبہات کا اظہار کیا ہے۔ ایک صاحب نے تو بگڑ کر یہاں تک لکھ دیا کہ تم متضاد باتیں کر رہے ہو۔ آج تک تو تم مسلم قوم اور اسلامی قومیت کے تصور کی وکالت کر رہے تھے۔ اب خود اپنے ہی سابق دعوے کی نفی کرنے لگے۔ اب تم کہتے ہو کہ مسلمان قوم نہیں بلکہ پارٹی ہیں۔ کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ جس طرح ایک قوم میں مختلف سیاسی پارٹیاں ہوتی ہیں اور اپنا الگ مسلک رکھنے کے باوجود سب کی سب اس بڑے مجموعہ میں شامل رہتی ہیں جس کو قوم کہا جاتا ہے۔ اسی طرح مسلمان بھی ایک پارٹی ہیں اور یہ ہندوستانی قوم کا ایک جزو بن کر رہ سکتے ہیں۔ اگر تمہارا یہی مطلب ہے تو آج تک تم ہندوستانی قوم پرستی کی مخالفت کس بنا پر کر رہے تھے؟

اسی قسم کے خیالات بعض دوسرے لوگوں نے بھی ظاہر کیے ہیں جن سے مجھے اندازہ ہوا کہ ابھی ہمارے عوام تو درکنار بہت سے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ بھی ان باتوں کو سمجھنے کے لیے پوری طرح تیار نہیں جو آگے چل کر میں کہنا چاہتا ہوں۔ مدتوں سے جو خود فراموشی ان پر طاری ہے اور غیر اسلامی حالات کی گہرائی نے جس طرح ان کو اپنے آپ سے اجنبی بنا دیا ہے۔ اس کا طبعی اقتضا یہی ہے کہ خود شناسی کی طرف پہلا ہی قدم اٹھانے میں ان کو ذہنی الجھنیں پیش آئیں لہٰذا بعد کے مباحث کو ملتوی کر کے سب سے پہلے میں ان الجھنوں کو صاف کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

جماعت یا پارٹی کے لفظ کو عام طور پر لوگ سیاسی جماعت یا پولیٹیکل پارٹی کے معنے میں لیتے ہیں

اسی معنے سے وہ غلطی بھی پیدا ہوئی ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ لیکن یہ اس لفظ کا اصلی مفہوم نہیں ہے بلکہ ایک خاص معنے میں بکثرت مستعمل ہونے سے پیدا ہو گیا ہے۔ اصلی مفہوم اس لفظ کا یہ ہے کہ جو لوگ ایک مخصوص عقیدے، نظریے، مسلک اور مقصد پر مجتمع ہوں وہ ایک جماعت ہیں۔ اسی معنے میں قرآن نے "حزب" اور "امت" کے لفظ استعمال کیے ہیں اور اسی معنے میں جماعت کا لفظ احادیث اور آثار میں مستعمل ہوا ہے۔ یہی مفہوم پارٹی کا بھی ہے۔

اب ایک جماعت تو وہ ہوتی ہے جس کے پیش نظر ایک قوم یا ملک کے مخصوص حالات کے لحاظ سے تدبیر کا ایک خاص نظریہ اور پروگرام ہوتا ہے اس قسم کی جماعت محض ایک سیاسی جماعت ہوتی ہے اس لیے وہ اس قوم کا جز بنکر کام کر سکتی ہے اور کرتی ہے جس میں وہ پیدا ہوا۔

دوسری جماعت وہ ہوتی ہے جو ایک کلی نظریہ اور جہانی تصور لیکر اٹھتی ہے جس کے سامنے تمام نوع انسانی کے لیے بلحاظ قوم و وطن ایک عالمگیر مسلک ہوتا ہے جو پوری زندگی کی تشکیل و تعمیر ایک نئے ڈھنگ پر کرنا چاہتی ہے جس کا نظریہ و مسلک عقائد و افکار اور اصول اخلاق سے لیکر انفرادی برتاؤ اور اجتماعی نظام کی تفصیلات تک ہر چیز کو اپنے سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے جو ایک مستقل تہذیب اور ایک مخصوص تمدن کو وجود میں لانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ یہ جماعت بھی اگرچہ حقیقت میں ایک جماعت ہی ہوتی ہے لیکن یہ اس قسم کی جماعت نہیں ہوتی جو کسی قوم کا جز بنکر کام کر سکتی ہو۔ یہ محدود قومیتوں سے بالاتر ہوتی ہے۔ اس کا تو مشن ہی یہ ہوتا ہے کہ ان نسلی و روایتی تعصبات کو توڑ دے جن پر دنیا میں مختلف قومیتیں بنی ہیں پھر یہ خود اپنے آپ کو کس طرح ان قومیتوں کے ساتھ وابستہ کر سکتی ہے؟ یہ نسلی و تاریخی قومیتوں کے بجائے ایک عقلی قومیت بناتی ہے۔ جامد قومیتوں کی جگہ ایک نامی قومیت بناتی ہے یہ خود ایک ایسی قومیت بنتی ہے جو عقلی و تہذیبی وحدت کی بنیاد پر روئے زمین کی پوری آبادی کو اپنے دائرے میں لینے کے لیے تیار رہتی ہے لیکن ایک قومیت بننے کے باوجود حقیقت میں یہ ایک جماعت ہی رہتی ہے کیونکہ اس میں شامل ہونے کا مدار پیدائش پر نہیں ہوتا بلکہ اس نظریہ و مسلک کی پیروی پر ہوتا ہے جس کی بنیاد پر یہ جماعت بنی ہے

مسلمان دراصل اسی دوسری قسم کی جماعت کا نام ہے یہ اس قسم کی پارٹی نہیں ہے جیسی پارٹیاں

ایک قوم میں بنا کرتی ہیں۔ بلکہ یہ اس قسم کی پارٹی ہے جو ایک مستقل نظام تہذیب و تمدن بنانے کے
لیے اٹھتی ہے اور چھوٹی چھوٹی قومیتوں کی تنگ سرحدوں کو توڑ کر عقلی بنیادوں پر ایک بڑی جہانی
قومیت بنانا چاہتی ہے۔ اس کو قوم کہنا اس لحاظ سے یقیناً درست ہو گا کہ یہ اپنے آپ کو دنیا
کی نسلی یا تاریخی قومیتوں میں سے کسی قومیت کے ساتھ باعتبار تمدن یا باعتبار جذبات وابستہ
کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی بلکہ اپنے نظریہ حیات اور فلسفہ اجتماع کے مطابق خود اپنی تہذیب و
مدنیت کی عمارت الگ بناتی ہے لیکن اس معنے کے لحاظ سے قوم ہونے کے باوجود یہ حقیقت
میں "جماعت" ہی رہتی ہے۔ کیونکہ محض اتفاق پیدائش کسی شخص کو اس قوم کا ممبر نہیں بنا سکتی جب
تک کہ وہ اس کے مسلک کا معتقد اور پیرو نہ ہو اور اسی طرح کسی شخص کا کسی دوسری قوم میں پیدا
ہونا اس کے لیے اس امر میں مانع نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنی قوم سے نکل کر اس قوم میں داخل ہو جائے
جبکہ وہ اس کے مسلک پر ایمان لانے کے لیے تیار ہو۔ پس جو کچھ میں نے کہا ہے اس کا مطلب اصل
میں یہ ہے کہ اس قوم کی قومیت اس کے ایک جماعت یا پارٹی ہونے کی بنا پر قائم ہے۔ جماعت ہونا اصل ہے قومیت
اس کی فرع ہے اگر جماعتی حیثیت کو اس سے الگ کر لیا جائے اور پھر وہ ایک قوم بن کر رہ جائے
تو یہ اس کا تنزل ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی اجتماعات کی تاریخ میں اسلامی جماعت کی حیثیت بالکل نرالی ہے۔
اسلام سے پہلے بودھ مت اور مسیحیت نے قومیتوں کے حدود کو توڑ کر تمام عالم انسانی کو خطاب کیا
اور ایک نظریہ و مسلک کی بنیاد پر عالمگیر برادری بنانے کی کوشش کی مگر ان دونوں مسلکوں کے پاس
چند اخلاقی اصولوں کے سوا کوئی ایسا فلسفہ اجتماع نہ تھا جس پر یہ تہذیب و تمدن کا کوئی نظام
بنا سکتے اس لیے یہ دونوں مسلک کوئی عالمگیر قومیت نہ بنا سکے۔ بلکہ ایک طرح کی برادری بنا کر رہ گئے
اسلام کے بعد مغرب کی سائنٹفک تہذیب اٹھی جس نے اپنے خطاب کو بین الاقوامی بنانا چاہا مگر اول
یوم پیدائش سے اس پر نیشنلزم کا بھوت سوار ہو گیا لہٰذا یہ بھی عالمگیر قومیت بنانے میں ناکام ہو گئی
اب اشتراکیت آگے بڑھی ہے اور قومیتوں کی حدود کو توڑ کر معاشی مقصد کی بنیاد پر ایک
ایسی تہذیب وجود میں لانا چاہتی ہے جو عالمگیر ہو سکے لیکن چونکہ ابھی تک وہ مکمل تہذیب پوری طرح وجود
میں نہیں آئی ہے جو اس کے پیش نظر ہے اس لیے ابھی تک اشتراکیت بھی ایک عالمگیر قومیت نہیں بنا سکی

نہیں ہوسکتی ہے۔ اس وقت تک میدان میں تنہا اسلام ہی ایک ایسا نظریہ و مسلک ہے جو نسلی
و تاریخی قومیتوں کو توڑ کر تہذیبی بنیادوں پر ایک عالمگیر قومیت بناتا ہے لہٰذا جو لوگ اسلام
کی اسپرٹ سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں ان کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ایک ہی
اجتماعی حیثیت کس طرح بیک وقت قوم بھی اور پارٹی بھی ہوسکتی ہے وہ دنیا کی جتنی قوموں
کو جانتے ہیں ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں ہے جن کے ارکان پیدا نہ ہوتے ہوں بلکہ بنتے
ہوں وہ دیکھتے ہیں کہ جو شخص اٹالین پیدا ہوا ہے وہ اٹالین قومیت کا رکن ہے اور جو
اٹالین پیدا نہیں ہوا وہ کسی طرح اٹالین نہیں بن سکتا۔ ایسی کسی قومیت سے وہ واقف نہیں ہیں
جس کے اندر آدمی اعتقاد اور مسلک کی بنا پر داخل ہوتا ہو اور اعتقاد اور مسلک بدل جانے
پر اس سے خارج ہو جاتا ہو ان کے نزدیک یہ صفت ایک قوم کی نہیں بلکہ ایک پارٹی کی ہوسکتی ہے
مگر جب وہ دیکھتے ہیں کہ یہ نرالی پارٹی اپنی الگ تہذیب بناتی ہے اپنی مستقل قومیت کا ادعا
کرتی ہے اور کسی جگہ بھی مقامی قومیت کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کرنے پر راضی نہیں ہوتی
تو ان کے لیے یہ معاملہ ایک چیستاں بنکر رہ جاتا ہے۔ یہی نافہمی اب غیر مسلموں کی طرح مسلمانوں کو
بھی پیش آ رہی ہے۔ مدتوں سے غیر اسلامی تعلیم و تربیت پاتے رہنے اور غیر اسلامی ماحول میں
زندگی گذارنے کی وجہ سے ان کے اندر تاریخی قومیت کا جاہلی تصور پیدا ہو گیا ہے۔ یہ اس
بات کو بھول گئے ہیں کہ ہماری اصلی حیثیت ایک ایسی جماعت کی تھی جو دنیا میں عالمگیر انقلاب
برپا کرنے کے لیے وجود میں آئی تھی جس کی زندگی کا مقصد اپنے نظریہ کو دنیا میں پھیلانا تھا جس
کا کام دنیا کے غلط اجتماعی نظامات کو توڑ پھوڑ کر اپنے فلسفہ اجتماع کی بنیاد پر ایک عالمگیر
اجتماعی نظام مرتب کرنا تھا۔ یہ سب کچھ بھول بھال کر انھوں نے اپنے آپ کو بس اسی قسم کی ایک قوم
سمجھ لیا ہے جیسی اور بہت سی قومیں دنیا میں موجود ہیں۔ اب ان کی مجلسوں اور انجمنوں میں ان
کی کانفرنسوں اور جمعیتوں میں ان کے اخباروں اور رسالوں میں کہیں بھی ان کی اجتماعی زندگی
کے اس مشن کا ذکر نہیں آتا جس کے لیے ان کو دنیا بھر کی قوموں سے نکال کر ایک امت بنایا گیا تھا
اس مشن کے بجائے اب جو چیز ان کی تمام توجہات کا مرکز بنی ہوئی ہے وہ مسلمانوں کا مفاد ہے
مسلمانوں سے مراد وہ سب لوگ ہیں جو مسلمان ماں باپ کی نسل سے پیدا ہوئے ہوں اور مفاد سے

مراد نسلی مسلمانوں کا مادی و سیاسی مفاد ہے۔ یا بدرجہ آخر اس کلچر کا تحفظ ہے جو ان کو آبائی ورثے میں ملی ہے اس مفاد کی حفاظت اور ترقی کے لیے جو تدبیر بھی کارگر ہو اس کی طرف یہ دوڑ جاتے ہیں بالکل اسی طرح جس طرح مسولینی ہر اس طریقے کو اختیار کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے جو اطالیوں کے مفاد کے لیے مناسب ہو کسی اصول و نظریہ کا نہ وہ پابند ہے نہ یہ۔ وہ کہتا ہے کہ جو کچھ اطالیوں کے لیے مفید ہو وہ حق ہے۔ یہ کہتے ہیں جو کچھ مسلمانوں کے لیے مفید ہو وہ حق ہے یہی چیز ہے جس کو میں مسلمانوں کا تنزل کہتا ہوں اسی تنزل کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے مجھے یہ یاد دلانے کی ضرورت پیش آئی ہے کہ تم نسلی اور تاریخی قوموں کی طرح ایک قوم نہیں ہو بلکہ حقیقت میں ایک جماعت ہو اور تمہاری نجات صرف اس چیز میں ہے کہ اپنے اندر جماعتی احساس پیدا کرو۔

اس جماعتی احساس کے فقدان یا خود فراموشی کے برے نتائج اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا شمار کرنا مشکل ہے۔ یہ اسی بے حسی و خود فراموشی کا نتیجہ ہے کہ مسلمان ہر جگہ مقتدی کی حیثیت سے نظر آرہا ہے۔ گویا مسلمان کی حیثیت سے نہ ان کا کوئی مشن ہے نہ کوئی نظریہ نہ کوئی اصول بلکہ ہر مشن کی خدمت بجا لانے اور ہر نظریہ پر ایمان لانے کے لیے آزاد ہیں ان کے لیے کوئی منزل مقصود متعین نہیں جو راہبر جس منزل کی طرف بھی جا رہا ہو یہ اس کے پیچھے جا سکتے ہیں اور مسلمان کا لقب ان کا پیدائشی لقب ہے کہ اسلام کے مشن کو چھوڑ کر یہ خواہ کسی مشن کی خدمت کریں یہ لقب بہرحال ان کے ساتھ چپکا رہے گا۔

اسی خود فراموشی کا نتیجہ آج ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ مسلمان کے لیے تاریخ میں پہلی مرتبہ اقلیت اور اکثریت کا سوال پیدا ہوا ہے اور اس کے لیے یہ بات سخت پریشانی کا موجب بن گئی ہے کہ مردم شماری کے اعتبار سے جب میں چار کے مقابلہ میں ایک کی نسبت رکھتا ہوں تو اب میں جو گنتی تعداد کے غلبہ سے اپنے آپ کو کیسے بچاؤں۔ یہ پریشانی اب رفتہ رفتہ شکست خوردہ ذہنیت میں تبدیل ہو رہی ہے اور کمزور فریق کی طرح اب اس کو بچاؤ کی کوئی تدبیر اس کے سوا نہیں سوجھتی کہ سمٹ سمٹا ہو کر اپنے خول میں سمٹ آئے اس صورتِ حال کی تنہا وجہ یہی ہے کہ مسلمان اپنے آپ کو محض ایک قوم سمجھ رہا ہے جس کی قوت کا انحصار زیادہ تر تعداد پر ہوتا ہے اگر اس کو یاد ہوتا کہ میں ایک جماعت ہوں جس کا مشن ہی دنیا کو اپنے نظریہ و مسلک اور اپنے فلسفۂ اجتماع کی طاقت

سے صحیح [illegible] [illegible] کی پریشانی پیش نہ آتی اس کے لیے اکثریت و اقلیت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ یہ اپنے خول میں سمٹ آنے کی فکر نہ کرتا، بلکہ آگے بڑھ کر میدان جیتنے کی تدبیریں سوچتا۔ کثرت و قلت کا سوال صرف قوموں ہی کے لیے پیدا ہوتا ہے جماعتوں کے لیے نہیں جو جماعتیں کسی طاقتور نظریہ اور جاندار اجتماعی فلسفہ کو لیکر اٹھتی ہیں وہ ہمیشہ قلیل التعداد ہی ہوتی ہیں آپ مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کا جائزہ لے لیجیے۔ ہر جگہ آپ کو یہی نظر آئے گا کہ ایک نہ ایک شیطان اس قوم کا اگوا بنا ہوا ہے اور پوری مستعدی کے ساتھ اپنے کام میں منہمک ہے جہاں مسلمانوں میں مذہب کے ساتھ ابھی کچھ دلچسپی باقی ہے وہاں یہ شیاطین مذہبیت کا جامہ پہن کر آتے ہیں اور دین کے نام سے ان مسائل پر بحثیں چھیڑتے اور نزاعیں برپا کرتے ہیں بلکہ بسا اوقات سر پھٹول اور مقدمہ بازیوں تک نوبت پہنچا دیتے ہیں جن کی دین میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ اسی طرح مسلمانوں کا سارا مذہبی جوش ان کی اپنی تخریب میں ضائع ہو جاتا ہے اور جہاں مذہب کی طرف سے کچھ سرد مہری پیدا ہو گئی ہے وہاں کچھ دوسری قسم کے شیاطین نمودار ہوتے ہیں اور وہ دنیوی ترقی و خوشحالی کا سبز باغ دکھا کر مسلمانوں کو ایسی تحریک کی طرف کھینچے لیے جاتے ہیں جو اپنے مقاصد اور طریق کار کے لحاظ سے قطعاً غیر اسلامی ہیں۔

جن لوگوں کو مسلم عوام کی حالت دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس گئی گذری حالت میں بھی ان لوگوں کے اندر اچھی خاصی اخلاقی طاقت موجود ہے۔ جس سے بہت کچھ کام لیا جا سکتا ہے لیکن یہ بہت سے روگ جو اس قوم کو لگے ہوئے ہیں انھوں نے آٹھ، نو کروڑ مسلمانوں کی اس عظیم الشان تعداد کو صفر کے درجے تک گرا دیا ہے۔ اسلام جس مقصد کے لیے جہاد اور محنت و جاں فشانی چاہتا ہے یہ اس سے بہت دور ہٹا دیے گئے ہیں۔ ان کے ذہن سے اسلام کا صحیح تصور اور مسلمان کا حقیقی مفہوم نکال دیا گیا ہے۔ یہ درحقیقت خود اپنے آپ سے بیگانہ کر دیے گئے ہیں جو اسلام ان کے اندر پایا جاتا ہے اس کے لیے کوئی مستقبل نہیں۔ کامیابی کا کوئی موقع نہیں ان وجوہ سے وہ عظیم الشان تعداد جو ہم کو مردم شماری کے رجسٹروں میں نظر آتی ہے۔ اسلامی اغراض کے لیے قریب قریب بالکل بے کار ہو چکی ہے۔ اس تعداد کے بھروسے پر اگر کچھ کیا جائے گا تو محنت

مایوسی سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ جو امید وابستہ کی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام اگر از سر نو ایک زندہ تحریک کی حیثیت سے اٹھے اور شیطانی قوتوں کے مقابلہ میں حکمرانی و فرماں روائی حاصل کرنے کے لیے نبرد آزما ہو تو شاید غیر مسلموں کی بہ نسبت ان مسلمانوں کا ایک معتد بہ حصہ زیادہ آسانی سے اور زیادہ جلدی اس تحریک کو قبول کر لے گا۔

اب جو لوگ حقیقت میں اس اسلام کو سمجھتے اور جانتے ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا اور جن کا قلب اس امر پر پوری طرح مطمئن ہے کہ انسانیت کی فلاح و سعادت الٰہی اسلام کی حکمرانی میں ہے اور صرف اسلام ہی کے اصول پر انسانی تمدن و اجتماع کا ایک معتدل و متوازن نظام تعمیر ہو سکتا ہے۔ ان کو چند غلط فہمیوں سے اپنے ذہن کو صاف کر لینا چاہیے اور چند حقیقتیں اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہییں۔

اول یہ کہ "مسلمانوں کے مفاد" سے اسلام کا ذہن باندھنا غلطی ہے۔ اسلام کی نگاہ میں یہ سوال ہرگز کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ ایک غیر اسلامی نظام حکومت کو چلانے کے لیے کتنے مسلمانوں کی خدمات فوج میں اور کتنے کی پولس میں اور کتنوں کی دفتروں میں حاصل کی جاتی ہیں۔ اور کتنی نشستیں ان کو مجالس قانون ساز میں ملتی ہیں تاکہ غیر اسلامی اصول پر قانون بنانے میں وہ بھی غیر مسلموں کے ساتھ حصہ دار ہوں اور کن ریاستوں کی مسند حکمرانی مسلمان فرماں رواؤں کے لیے محفوظ رکھی جائے تاکہ وہ غیر اسلامی طرز پر حکومت کرتے رہیں۔ اس قسم کے سوالات کو اسلامی سوالات کہنا اسلام کی توہین ہے۔ ایک اسلامی تحریک کو اس قسم کے تمام سوالات سے قطعاً بے تعلق ہونا چاہیے۔

دوسرے یہ کہ اسلام کی کامیابی نہ تو ان مسلمانوں کی تعداد اور طاقت پر منحصر ہے جو اس وقت مردم شماری میں مسلمان کی حیثیت سے لکھے ہوئے ہیں اور نہ اس کامیابی کی راہ میں ہندوؤں اور دوسرے غیر مسلموں کی کثرت تعداد کوئی مضبوط رکاوٹ ہے۔ مردم شماری کے رجسٹروں میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کی آبادی کا تناسب دیکھ کر یہ گمان کرنا کہ اسلام کی طاقت ہندوستان میں صرف اتنی ہی ہے جتنا آبادی میں مسلمانوں کا تناسب ہے اور یہ سمجھنا کہ آبادی میں غیر مسلموں کا تناسب زیادہ ہے اتنا ہی اسلام کی کامیابی کا امکان کم ہے۔ یہ صرف ان لوگوں کا کام ہے جو اسلام کو محض ایک جامد مذہبی رسم کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ اگر اسلام ایک زندہ عملی تحریک دیا جائے۔

اقوامِ متحدہ کے سکریٹری جنرل کے نام

دو خط

جناب محمد یوسف امیر جماعت اسلامی ہند نے ۱۳ اگست ۶۷ کو ڈاکٹر کرٹ والڈ ہائم کے نام ایک خط لکھا تھا۔ ہم اس کا ترجمہ یہاں شائع کر رہے ہیں۔

امیر جماعت اسلامی ہند کا پہلا خط

یہ افسوسناک بات ہے کہ اسرائیل نے ایک بار پھر اس کا مظاہرہ کیا ہے کہ اس کے نزدیک اقوامِ متحدہ کے عالمی ادارے اور اس کی قراردادوں کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ اس نے فیصلہ کیا ہے کہ مصر کے شہر "شرم الشیخ" کو وہ ایک بین الاقوامی ہوائی اڈے میں تبدیل کر دے گا اور اس سے متعلق اس نے کچھ منصوبے بھی بنائے ہیں۔ اس کا یہ فیصلہ اسی بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ اسرائیل، یہ شہر مصر کو واپس کرنے کا قطعی کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ حالانکہ اقوام متحدہ کی قرارداد کے مطابق اسے یہ شہر بھی مصر کو واپس کر دینا چاہیے۔ اس نے شرمناک طور پر اس کا مصمم ارادہ کر رکھا ہے کہ اس شہر کو وہ ہمیشہ اپنے کنٹرول میں رکھے گا۔ یہ ایک انتہائی درجے کی اشتعال انگیزی ہے جو وسیع پیمانے پر ایک دوسری جنگ کے شعلے بھڑکا دینے کا سبب بن سکتی ہے

ہندوستان کے مسلمان، اسرائیل کی اس مسلسل متکبرانہ و جابرانہ روش کی وجہ سے بڑی بے چینی اور اضطراب محسوس کر رہے ہیں اور آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ اقوام متحدہ کو بے بس تماشائی کی طرح خاموش نہ بیٹھنا چاہیے بلکہ اپنا اختیار پورے طور پر استعمال کرنا چاہیے اور واقعی ایسی مؤثر تدابیر اختیار کرنی چاہییں جو اسرائیل کو اپنی حد کے اندر رکھیں اور ان کو اس بات پر مجبور کریں کہ وہ اقوام متحدہ

کی قرار دادوں کا احترام اور ان کی تعمیل کرے۔

اگر ایسا نہیں ہوا اور اسرائیل اسی طرح بددیانتی کے منصوبے بناتا رہا تو امن عالم درہم برہم ہو جائے گا اور اقوام متحدہ کا ادارہ اس الزام سے بچ نہیں سکے گا کہ وہی اس المیہ کا ذمہ دار ہے۔

یہ انتہائی مناسب وقت ہے کہ اقوام متحدہ کے تعزیری قوانین اسرائیل کے خلاف استعمال کیے جائیں۔

امیر جماعت کے خط کا جواب

۶ ستمبر ۷۳ء کو سیکورٹی کونسل اور پولیٹکل کمیٹی کے ڈائرکٹر کا خط امیر جماعت کو ملا۔ اس کا ترجمہ یہ ہے:

مجھے ہدایت کی گئی ہے کہ میں آپ کے ۱۲ اگست ۷۳ء کے اس خط کا جواب دوں جو آپ نے سکریٹری جنرل کے نام لکھا تھا جس میں آپ نے مشرق وسطیٰ کے موجودہ حالات پر اپنے تعلق خاطر کا اظہار کیا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ آپ اس سے واقف ہوں گے کہ سکریٹری جنرل نے ابھی حال میں مشرق وسطیٰ کے چند ممالک کا دورہ کیا تھا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اس علاقے کی صورت حال کا جائزہ لیں۔

آپ کو یہ اطمینان دلایا جا سکتا ہے کہ وہ اقوام متحدہ کے چارٹر اور قرار دادوں کے تحت حتی الامکان ہر ایسا امکان تلاش کریں گے جو دنیا کے اس حصے کی صورت حال کے پر امن اور منصفانہ حل میں مددگار ثابت ہو۔

مقررہ ضابطے اور طریق کار کے مطابق آپ کا خط ان مراسلوں کی فہرست میں داخل کر دیا جائے گا جو سلامتی کونسل کے تمام نمائندوں کو اطلاع و آگاہی کے لیے بھیجے جائیں گے۔

امیر جماعت کا دوسرا خط

۲۲ ستمبر ۷۳ء کو امیر جماعت اسلامی ہند نے اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل کو دوسرا خط لکھا۔ اس کا ترجمہ یہ ہے:-

یہ انتہائی اندوہناک بات ہے کہ آپ کی حالیہ کوششوں کے باوجود جو آپ نے دنیا کے اس حصہ کی صورت حال کے پر امن اور منصفانہ حل کے امکانات تلاش کرنے کے لیے کی ہیں۔ اسرائیل کی شرارت بڑھتی

رہی جا رہی ہے۔

جارحیت، حملہ، جبر اور ساتھ ہی ساتھ اقوام متحدہ کی قراردادوں اور دنیا کی رائے عامہ کی توہین و تحقیر کرنے میں اسرائیل عرصہ دراز سے اپنے آخری حد تک پہنچ چکا ہے۔ اقوام متحدہ کے چارٹر کے باب سات میں جو جرائم شمار کیے گئے ہیں، اسرائیل ان کا مجرم ہے۔ وہ امن عالم کے لیے دھمکی بھی بنا ہوا ہے اور بار بار جنگ جوئی اور جارحانہ کارروائیوں کا ارتکاب بھی کر رہا ہے۔ اس نے چارٹر کی دفعہ ۲۵ کو مکمل طور پر نظر انداز کر رکھا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

> اقوام متحدہ کے ممبروں نے اس بات سے اتفاق کیا ہے کہ وہ موجودہ چارٹر کے مطابق سلامتی کونسل کے فیصلوں کو قبول اور اس کی تعمیل کریں گے۔

۲۴ ستمبر ۱۹۸۲ء کا اچانک حملہ اور شام کے خطے میں مداخلت ایک دوسری سنگین مثال ہے اس بات کی کہ اسرائیل فتنہ پردازی کر رہا ہے اور دنیا کے امن و سلامتی کو درہم برہم کرنا چاہتا ہے۔ اس کا علاج اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ اسرائیل پر اقوام متحدہ کے تعزیری قوانین نافذ کیے جائیں۔ اس موقع پر ان قوانین کا نافذ نہ کرنا کیا یہ ظاہر نہیں کرے گا کہ اقوام متحدہ کا عالمی ادارہ ان جرائم سے چشم پوشی کر رہا ہے جو خود اس کے چارٹر کے ساتویں باب میں شمار کیے گئے ہیں جبکہ اسرائیل نے بار بار اور ہمیشہ بڑھ چڑھ کر ان جرائم کا ارتکاب کیا ہے۔

آپ اس کی قدر کریں گے کہ ہمارے ملک کی حکومت نے ہمیشہ عربوں اور فلسطینیوں کے معاملے میں انصاف اور بے تعصبی کی تائید کی ہے اور اس نے ۲۴ ستمبر کے اسرائیلی حملے کی بھی مذمت کی ہے۔ کیا میں یہ تجویز پیش کر سکتا ہوں کہ اسرائیل نے ہٹ دھرمی کا جو رویہ اختیار کر رکھا ہے اس کی بنا پر آپ سلامتی کونسل پر زور ڈالیں اور سکریٹری جنرل کی حیثیت سے اپنا اثر استعمال کر کے اس پر آمادہ کریں کہ وہ فوری طور پر اسرائیل کے خلاف ان قوانین کا استعمال کرے، جو چارٹر کی دفعہ ۴۱ اور ۴۲ میں تجویز کیے گئے ہیں۔ موجودہ معاملے سے زیادہ کوئی دوسرا معاملہ اس کا مستحق اور مستوجب نہیں ہے کہ سلامتی کونسل اپنے اختیارات استعمال کرے۔

رسائل و مسائل

نیویارک سے ایک خط

خط

ایک مسئلے میں آپ کی رائے کی ضرورت شدت سے محسوس ہوئی۔ امید ہے کہ آپ جواب سے نوازیں گے ـــــ مسئلہ یہ ہے کہ یہاں یونیورسٹی میں خاصی تعداد میں مسلمان لڑکے ہیں۔ کم سے کم سب ملا کر چالیس پچاس کے قریب۔ ہندوستان سے دو۔ پاکستان سے ۱۰-۱۱ ہیں۔ بنگلہ دیش سے ۸-۱۰ ہیں۔ انڈونیشیا، ملیشیا سے ۱۲-۱۴ ہیں۔ ترکی، ایران، اردن، لیبیا اور دیگر ممالک کے بھی لڑکے موجود ہیں۔

یہاں جو گوشت ملتا ہے (سور کے گوشت کو چھوڑیئے) مشینوں کا ذبح کیا ہوا ہوتا ہے۔ اس کو استعمال کرنے میں تین رائیں ہو گئی ہیں

۱۔ چونکہ مجبوری ہے اور موسم کی شدت کی وجہ سے گوشت کا استعمال لازمی ہے اس لیے یہ مشینری کا ذبح کیا ہوا گوشت جائز ہے۔ (بکری، بھیڑ، گائے، مرغ وغیرہ)

۲۔ چونکہ یہ شرعی ذبیحہ نہیں اس لیے ناجائز ہے بلکہ حرام ہے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے دین کو یسر بنایا ہے عسر نہیں۔ دوسرے اہل کتاب کا ذبیحہ جائز ہے اس لیے یہ گوشت جائز ہے۔ عموماً یہاں آنے والے مسلمان لڑکے جن خاندانوں سے آتے ہیں وہاں اسلام کا زیادہ چرچا یا اس سے کوئی شغف نہیں ہوتا اس لیے وہ لڑکے حرام حلال کی تمیز کیے بغیر ہی گوشت استعمال کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ سور کا گوشت تو خرید کر استعمال نہیں کرتے لیکن بقیہ کے استعمال میں کوئی قباحت نہیں سمجھتے۔ میرے ساتھ بنگلہ دیش کے ایک صاحب

ہیں وہ بغیر ذبح کرنے کے باوجود اسے مستقل استعمال کر رہے ہیں۔

میرے خیال میں تو یہ گوشت چونکہ ذبیحہ کا نہیں اس لیے اس کا جواز نہیں نکالا جا سکتا۔
میں اب تک اس سے اجتناب کر رہا ہوں اور صرف ترکاریوں پر گذر کرنے کا ارادہ ہے۔

اُردن کے ایک نوجوان جو ماشاءاللہ خاصے پرجوش اور اسلام پسند ہیں بلکہ اسلامی ذہن کے بھی مالک ہیں اس لئے کے قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کا ذبیحہ جائز کیا ہے اور دین میں عسر کی جگہ نہیں ہے اس لیے اس گوشت کے حلال ہونے میں شبہ نہیں۔ یہاں دو تین باتیں اور بھی اس سے متعلق ہیں جو سامنے رہیں تو بہتر ہے

۱۔ یہودیوں کے ہاتھ کا ذبیحہ کوشیر کے نام سے ملتا ہے لیکن ہر جگہ نہیں۔

۲۔ عموماً قیمت میں زیادہ ہوتا ہے اس لیے کہ زیادہ فروخت نہیں ہوتا۔ جو چیز زیادہ بکتی ہے وہ کم قیمت میں دستیاب ہوتی ہے۔

۳۔ بغیر گوشت کے شمالی امریکے کے اکثر حصوں میں سردیوں میں گذارا مشکل ہے۔

۴۔ یہاں ہندوستان کا حال نہیں کہ شہر سے باہر نکلے دیہات سے مرغ، مرغی خرید لائے اور ذبح کر لیا۔ مرغ مرغیاں کم سے کم میری کوششوں کے باوجود اب تک فراہم نہیں ہو سکی ہیں یہاں عموماً فارم ہوتے ہیں اور وہ بڑے پیمانے پر یہ کاروبار کرتے ہیں۔ ایک دو مرغ دینا ان کے تجارتی اصولوں کے خلاف ہے۔

کوشش کر رہا ہوں کہ مسلمان لڑکوں کے لیے ذبیحہ کے گوشت کا انتظام ہو جائے تو کسی فارم سے ایک بھیڑ یا بکرا باقاعدہ ذبح کرا کے اس کے مختلف حصے لوگوں کو بٹوا دیے جائیں۔ ہر لڑکے کے پاس ریفریجریٹر ہوتا ہے اس لیے ۱۵۔۲۰ دنوں تک استعمال ہو سکتا ہے۔ آج بھی اس تجویز پر غور ہوا ہے۔ دیکھیے کیا شکل پیدا ہوتی ہے۔

خدا کا شکر ہے کچھ مسلمان خاصے جاندار ہیں۔ ان شاء اللہ تفصیل سے پھر لکھوں گا۔ ایک مقامی نیگرو مسلمان، ایک ترکی کے نوجوان، ایک اردن کے اور ایک فلیپائن کے مسلمان بڑے خاصے اسلام پسند ہیں یہ فعال بھی ہیں۔ مسلم طلبہ کی شاخ بھی کام کر رہی ہے اگرچہ ابھی بہت متحرک نہیں۔

جواب

آپ نے جو مسئلہ بھیجا اور میری رائے دریافت کی ہے وہ ہر اس مسلمان طالب علم کے سامنے آتا ہے جو یورپ یا امریکہ میں تعلیم حاصل کرنے جاتا ہے اور حلال و حرام کی تمیز بھی کرتا ہے۔ عرصہ ہوا شکاگو کے ایک طالب العلم کا یہی سوال میرے پاس آیا تھا اور میں نے زندگی اگست ۱۹۶۶ء کے رسائل و مسائل میں اس کا جواب بھی شائع کیا تھا۔ اس مسئلے سے متعلق اب تک میں نے جو کچھ مطالعہ کیا ہے اس کی بنا پر میری بھی یہی رائے ہے کہ اللہ کا نام لیے بغیر مشینوں سے جو جانور قتل کیے جاتے ہیں ان کا گوشت حرام ہے۔ آپ نے اس مسئلے کے بارے میں جو تین رائیں لکھی ہیں ان میں دوسری رائے صحیح ہے اور غالباً آپ کی رائے بھی وہی ہے۔ مناسب یہی ہے کہ آپ وہاں ویجی ٹیرین بن جائیے الا یہ کہ کبھی یہودیوں کے ذبیحے کا گوشت آپ کو مل جائے یا آپ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو جائیں جس کا ذکر آپ نے اپنے خط میں کیا ہے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مدظلہ نے اس مسئلے پر ایک بہت جامع مقالہ لکھا تھا جو ترجمان القرآن اپریل ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا تھا اور اب وہ مقالہ تفہیمات حصہ سوم میں شائع کیا گیا ہے۔ معلوم نہیں وہ مقالہ آپ نے پڑھا ہے یا نہیں۔ اگر نہ پڑھا ہو تو اس کتاب میں ضرور پڑھیے۔ ممکن ہے تفہیمات حصہ سوم امریکہ ہی میں مل جائے اور اگر نہ ملے تو پاکستان سے منگوا لیجیے۔

مولانا کے مقالے کی تقریب یہ ہوئی تھی کہ ایک پاکستانی طالب العلم نے لندن سے ان کو خط لکھا تھا اور علماء عراق کے دو فتوے بھی ان کو بھیجے تھے جن میں اہل کتاب کے ذبیحے کو ہر حال میں حلال کیا گیا ہے خواہ اس پر اللہ کا نام لیا جائے یا نہ لیا جائے۔ مولانا نے ان کے دلائل کا تشفی بخش جواب دیا ہے اور اس سلسلے کی آیات و احادیث کو جمع کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ شافعی علماء کا فتویٰ اور ان کی رائے اس مسئلے میں صحیح نہیں ہے۔

اسی مسئلے پر مفتی محمد شفیع صاحب نے بھی ایک مقالہ لکھا تھا جو بینات کراچی میں شائع ہوا تھا۔ دیوبند کے دوسرے علماء نے بھی اس مسئلے پر لکھا ہے اور سب کا حاصل یہ ہے کہ تسمیہ کے بغیر جو جانور مشینوں سے ہلاک کیے جاتے ہیں ان کا گوشت حرام ہے۔

یورپ اور امریکہ میں مشینوں سے جانوروں کو ذبح (قتل) کرنے کے بارے میں ان کا خیال اور روش یہ معلوم ہوتی ہے کہ جانوروں کو اللہ کا نام لے کر ذبح کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

گویا اللہ کا نام لیکر ذبح کرنا ایک فضول اور بے کار کام ہے ۔ ورنہ وہ آسانی کے ساتھ اپنا انتظام کر سکتے تھے کہ مشینوں سے جانور ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا جاتا ۔ ظاہر ہے کہ اس تخیل کے ساتھ جو جانور مشینوں سے قتل کیے جاتے ہیں ان کے جائز اور حلال ہونے کا سوال ہی کیسے پیدا ہوتا ہے ۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی ۔ ذبح کرتے وقت اللہ کا نام نہ لینا ایک بات ہے اور اللہ کا نام لینے کو بے کار و فضول سمجھنا بالکل دوسری بات ہے ۔ اسی طرح جانور ذبح کرتے وقت کبھی کبھی اللہ کا نام نہ لینا ایک بات ہے اور اس کو مستقل عادت اور روش بنا لینا بالکل دوسری بات ہے ۔ امام شافعی رحمۃ اللہ کی یہ رائے کہ اگر کوئی مسلمان جانور ذبح کرتے وقت بالقصد بھی اللہ کا نام نہ لے تو ذبیحہ حلال ہو گا ۔ میرے نزدیک صحیح نہیں ہے لیکن میرا خیال ہے کہ انھوں نے جو رائے دی ہے وہ پہلی دو صورتوں کے پیش نظر دی ہے ۔ اللہ کا نام لینے کو بے کار فضول سمجھنے اور اس کو مستقل عادت بنا لینے کی صورتوں کو سامنے رکھ کر نہیں دی ہے ۔ اگر وہ موجودہ زمانے میں ہوتے تو اللہ کا نام لیے بغیر مشینوں سے ہلاک کیے جانے والے جانوروں کو حلال نہ قرار دیتے ۔ جو لوگ ان کی رائے سے استدلال کر کے ان جانوروں کے ذبیحہ کو حلال کہتے ہیں ان کا یہ استدلال بھی محل نظر ہے آپ اس مسئلے کی تحقیق کے وقت امام شافعی کی رائے کے بارے میں میرے اس خیال کو بھی سامنے رکھیں ۔

(صفحہ ۵ کا بقیہ) کی حیثیت سے میدان میں آجائے اور اس کے اصولوں کی بنیاد پر ہندوستانی زندگی کے حقیقی مسائل کو حل کرنے کے لیے ایک عملی پروگرام لیکر کوئی منظم جماعت اٹھ کھڑی ہو تو یقین رکھیے کہ اس کا اپیل پیدائشی مسلمانوں تک محدود نہ رہے گا بلکہ شاید مسلمانوں سے بڑھ کر غیر مسلموں کو اپنی طرف کھینچے گا اور کوئی طاقت اس سیل رواں کو نہ روک سکے گی ۔

بقیہ اشارات

پائدار بنیاد نہ ہو اور نہ جسے کوئی تقدس و احترام حاصل ہو۔ آپ کی تجویز اس وجہ سے اور بھی افسوسناک ہے کہ مسلمانوں کے متفقہ مطالبہ پر جس کی گونج بمبئی کے مسلم پرسنل لا کنونشن میں سنی گئی۔ وزیر اعظم اور حکمراں پارٹی کے دوسرے قائدین نے حال ہی میں مسلمانوں کو اس بابت یقین دہانی کی ہے کہ حکومت مسلمانوں کے پرسنل لا میں مداخلت نہیں کرنا چاہتی حکومت اس یقین دہانی کا کہاں تک پاس کرے گی۔ یہ بات فی الحال موضوع سے خارج ہے۔

آپ غالباً متبنیت کے تعلق سے اس مسودہ قانون سے واقف ہیں ADOPTION OF THE CHILDREN BILL 1972 جو فی الحال پارلیمنٹ کی جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی کے زیر غور ہے یہ مسودہ قانون بھی یکساں سول کوڈ کا نقیب ہے۔ اس مسودہ قانون کے ذریعے تبنیت کے تعلق سے ان تمام قوانین کو جو اب تک صرف ہندو طبقہ کے لیے مخصوص رہے ہیں۔ تمام ہندوستانیوں کے لیے عام کر دینا پیش نظر ہے۔ اسی بنا پر بمبئی کنونشن میں مسلمانوں نے اس کی متفقہ طور پر مخالفت کی ہے۔

آپ کی اطلاع کے لیے یہ بھی بتا دوں کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان عورتوں اور مردوں نے اس بمبئی کنونشن کے فیصلوں کی بھرپور حمایت کی ہے۔ ذیل میں ایک مکتوب مورخہ ۱۲ رفروری ۱۹۷۳ء کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔ جو امریکہ اور کناڈا میں تعلیم حاصل کرنے والے ہندوستانی مسلمانوں کی مشاورتی کمیٹی کے چیرمین نے اخبار ہندوستان ٹائمز کے ایڈیٹر کو لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

بمبئی مسلم پرسنل لا کنونشن میں مسلمانوں کے اتفاق رائے کے بارے میں آپ کے موقر اخبار نے اپنی اشاعت مورخہ ۳۰ ردسمبر ۷۲ء میں لکھا ہے کہ "لیکن ہندوستانی مسلمانوں کی نئی اور نوجوان نسل بعض امور خصوصاً طلاق اور وراثت وغیرہ کے معاملات میں اصلاحات کی اتنی ہی شدت سے حامی ہے" C.C.I.M کے چیرمین کی حیثیت سے میں عرض کروں گا کہ صورت حال کا یہ جائزہ غلط اور گمراہ کن ہے۔ ہماری انجمن امریکہ اور کینیڈا میں رہنے والے نوجوان مسلمانوں پر مشتمل ہے جو سب کے سب اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اس میں زیادہ تر ڈاکٹر، انجینیر، سماجی علوم کے ماہرین، قانون داں پروفیسر اور گریجویٹ طلبہ شامل ہیں جو امریکہ اور کناڈا کی یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم ہیں۔ دنیا کے انتہائی ترقی یافتہ ملکوں میں رہنے اور اس سوسائٹی میں ہر کر نوع بہ نوع تجربات سے استفادہ کا موقع پانے

والے ہم لوگوں کے بارے میں یہ توقع تو کی ہی جا سکتی ہے کہ ہمارا ذہنی افق وسیع ہوگا اور مسائل کو
وسیع تر اور جدید تر سیاق میں دیکھنے کی ہماری اہلیت ہی ہے جس کی بنیاد پر ہم محسوس کرتے ہیں کہ
ریاست کو اسلامی پرسنل لا میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے۔ ہم واشگاف الفاظ میں مسلم پرسنل لا کی
قرارداد کی حمایت کرتے ہیں۔ منقول از CCIM NEWS LETTER

اصلاحات ختم نہیں ہو جاتی۔ تعلیم یافتہ اور روشن خیال خواتین نے بھی اس کنونشن کی قراردادوں
کی پوری حمایت کی ہے۔ گزشتہ ماہ ممبئی میں صوبہ مہاراشٹر کی تقریباً ۵۰۰ خواتین کا ایک اجتماع ممبئی میں ہوا اور
اس اجتماع میں ممبئی کنونشن کے فیصلوں کی متفقہ طور پر حمایت کی گئی۔ ان خواتین میں بی اے، بی ایس سی اور ایم اے
پاس اور کالجوں میں زیر تعلیم ہر طرح کی خواتین شریک تھیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اس موضوع پر استصواب عام
کرایا جائے تو مسلمان مردوں اور عورتوں کی ایک عظیم اکثریت شریعت اسلامی کو برقرار رکھنے کے حق میں رائے دیگی

آپ کے اس ریمارک سے مجھے رنج ہے اور یقیناً دوسرے مسلمانوں کو بھی ہوگا کہ مسلم قائدین اصلاحات
کی مخالفت اس لیے کرتے ہیں کہ اس طرح ان کے خیال میں ان کی وہ اہمیت کم ہو جائے گی جو بزعم خود اسلام
اور اسلامی کلچر کے محافظوں کی حیثیت سے انہیں حاصل ہے۔

حقیقت کچھ اور ہی ہے۔ مسلمان الٰہی قوانین کی پابندی پر اس لیے مصر ہیں کہ ان کے عقیدے کے بموجب اگر انہوں
نے ان قوانین کا اتباع نہیں کیا تو حیات بعد الموت میں وہ سزا کے مستوجب ہوں گے اور اگر انھوں نے الٰہی رہنمائی
کا اتباع کیا تو وہ ابدی مسرتوں سے ہمکنار ہوں گے۔ میں آپ سے گذارش کرتا ہوں کہ آپ براہ کرم اس ریمارک کو واپس
لے لیجیے اس لیے کہ آپ نے ایسے لوگوں کے خلاف ادنیٰ قسم کے محرکات منسوب کیے ہیں جنہیں سب ہی مسلمان عزت اور
احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں اور جن کی صفوں میں علماء، چیف جسٹس، ہائی کورٹ کے جج اور مسلمانوں کے ہر طبقے اور مکتب فکر
کے زعماء شامل ہیں۔

میں آپ کو یاد دلاؤں کہ ہماری زبان اور ہمارے قلم سے نکلا ہوا ہر ہر لفظ ریکارڈ کیا جاتا ہے اور ہمیں
یوم حساب ہر ہر لفظ کے بارے میں مالک الملک کے آگے جوابدہی کرنی ہوگی اور ہم جزا و سزا کے مستوجب ہوں گے۔
میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ آپ کی غلطیوں سے درگذر فرمائے۔ آمین

میں منتظر رہوں گا کہ آپ میرے اٹھائے ہوئے نکات پر روشنی ڈالیں۔ میں ایک بار پھر خدا سے دعا
کرتا ہوں کہ وہ آپ کو جلد شفا کلی عطا فرمائے۔ آمین

آپ کا دینی بھائی محمد یوسف

"زندگی" کی قیمت میں اضافہ

کاغذ کی ہوش ربا گرانی، بلکہ نایابی کی وجہ سے نیز رسالہ سے متعلق دوسرے اخراجات میں اضافہ کی وجہ سے "زندگی" کا خسارہ اب ناقابل برداشت ہوگیا ہے۔ اس کا اندازہ آپ اس بات سے کرسکتے ہیں کہ ہم پچھلے چند ماہ میں لاگت سے تقریباً نصف قیمت پر زندگی آپ کو پیش کرتے رہے ہیں۔ اس عرصے میں دوسرے اخبار و رسائل اپنی قیمت میں اضافہ کرچکے ہیں۔ ہماری کوشش یہی رہی کہ ہم موجودہ قیمت میں ہی آپ کو رسالہ "زندگی" پیش کرتے رہیں۔ مگر اب یہ بوجھ ناقابل برداشت ہوگیا ہے۔ مجبوراً جنوری ۱۹۷۵ء کے شمارے سے 'زندگی' کی قیمت میں معمولی اضافہ کیا جارہا ہے۔ جنوری ۷۵ء سے 'زندگی' کے عام شمارے کی قیمت ۲۵ /۱ اور سالانہ چندہ -/۱۲ ہوگا۔

امید ہے خریداران زندگی ہماری مجبوریوں کے پیش نظر یہ اضافہ قبول فرمالیں گے۔

منیجر ماہنامہ "زندگی" رام پور یوپی

TONIC
یہ اہم نہیں کہ کسی ٹانک کے اجزا
کیا ہیں ۔ اہم بات یہ ہے کہ
آپ کے جسم کو اس سے کیا ملتا ہے ؟
سِنکارا
آپ کے جسم کو بہت کچھ دیتا ہے
cinkara
ہمدرد

دسمبر سنہ ۳ ۷ ۹ ۱ ع

ماہنامہ

زندگی رامپور

(مدیر:- سید احمد قادری)

سالانہ چندہ
ہندوستان سے -/10
پاکستان سے -/10
ششماہی
ہندوستان سے -/5
پاکستان سے -/5
قیمت فی پرچہ

سالانہ چندہ
ممالک غیر سے
دو ڈالر
ہوائی ڈاک سے

جلد: ۵۱ | ذیقعدہ ۱۳۹۳ھ مطابق دسمبر ۱۹۷۳ء | شمارہ:- ۶

اس دائرہ ◯ میں سرخ نشان کا مطلب

کہ آپکی مدت خریداری اس شمارے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں ورنہ اگلا پرچہ وی پی سے بھیجدیا جائے گا۔

مالک:- دعوت ٹرسٹ [illegible] ایڈیٹر سید احمد قادری - پرنٹر پبلشر احمد [illegible] مطبع [illegible]
مقام اشاعت:- دفتر زندگی رامپور (یوپی)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

(سید احمد قادری)

عرب و اسرائیل کی حالیہ جنگ پر ۱۷ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو میں نے "مبارک یاد" کے عنوان سے ایک مختصر نوٹ لکھا تھا لیکن نومبر کے شمارے میں اس کے لیے جگہ نہیں نکل سکی۔ پہلے ہم وہ مختصر نوٹ یہاں نقل کرتے ہیں:۔

رمضان کے مبارک مہینے میں یہ مبارک خبر، دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے مژدۂ جاں فزا بن گئی کہ عرب فوجیں، اسرائیلی فوجوں کو پیچھے دھکیل رہی ہیں۔ اسرائیل کی وہ ہوائی طاقت دم بخود ہوا میں چکر کاٹ رہی ہے جس نے جون ۱۹۶۷ء میں چند گھنٹوں کے اندر مصر کی فضائیہ کو زمین ہی پر ختم کر دیا تھا۔ جس طرح ۵ جون ۱۹۶۷ء کا دن ایک تاریخی یادگار بن گیا تھا اسی طرح ۶ اکتوبر ۱۹۷۳ء کا (۸ رمضان المبارک ۱۳۹۳ھ) دن ایک تاریخی یادگار بن چکا ہے۔ پہلا عربوں کی ذلت کا دن تھا اور دوسرا عربوں کی عزت کا — ۵ جون ۶۷ء کو جمال عبدالناصر مصر کے ڈکٹیٹر تھے اور ۶ اکتوبر ۷۳ء کو انور السادات مصری حکومت کے صدر ہیں۔

جس وقت یہ سطریں لکھی جا رہی ہیں شرق اوسط کی عرب، اسرائیل جنگ دوسرے ہفتے میں داخل ہو چکی ہے۔ گیارہ دن گذر چکے ہیں۔ شام کے میدان کا حال ابھی غیر یقینی ہے اس لیے عربوں کی مکمل فتح کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہم دعاگو ہیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ عربوں کو مکمل فتح عطا کرے جو خود اپنی زمین پر اسرائیل کے غاصبانہ قبضے کو ہٹانے کے لیے لڑ رہے ہیں۔ اگر امریکہ نے کھل کر براہ راست مداخلت نہیں کی تو عرب، اسرائیل کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیں گے۔ نتیجہ خواہ کچھ بھی ہو عربوں

نے اپنے دامن پر لگے ہوئے ذلت کے سیاہ داغ کو اپنے سرخ اور گرم خون سے دھو دیا ہے۔ وہ [illegible] جس میں جہاد، زندگی، بہادری، خود اعتمادی اور جنگی مہارت کی قوس قزح دمک رہی ہے۔

جون ۱۹۶۷ء کی شکست پر تبصرہ کرتے ہوئے زندگی اگست ۱۹۶۷ء کے اشارات میں لکھا گیا تھا:

صیہونیت سے کامیاب مقابلے کے لیے عرب ممالک کو فوری طور پر چند چیزیں تو اختیار کرنی ہی ہوں گی۔ اس کے بغیر اسرائیل کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔

۱۔ نظریاتی اختلاف کے باوجود مشترکہ دشمن سے نمٹنے کے لیے متحد ہونا اور ایک متفقہ پالیسی پر عمل کرنا۔

۲۔ امریکہ ہو یا روس، کسی کو بھی اپنے ملک اور اپنی پالیسی میں دخیل نہ بنانا۔

۳۔ عیش و عشرت کی مسرفانہ زندگی ترک کرکے اپنے وسائل دولت کا معتد بہ حصہ اس مقصد کے لیے وقف کرنا۔

۴۔ جدید ترین آلات جنگ کے استعمال اور جدید طریقہ ہائے جنگ کی ماہرانہ تعلیم حاصل کرنا اور اپنی فوجوں میں حصول مقصد کا حقیقی جوش اور ولولہ پیدا کرنا۔

۵۔ اندرونی اختلافات اور باہمی جنگ و جدال کو کم سے کم اس وقت تک ملتوی کر دینا جب تک یہودی خطرے سے نجات نہ مل جائے۔

۶۔ باہمی اعتماد کی فضا پیدا کرنا، ایک دوسرے کی مشکلات کو سمجھنا اور انہیں مخلصانہ طور پر حل کرنے کی کوشش کرنا۔

عرب اسرائیل جنگ اس بات کی دلیل ہے کہ عربوں نے اوپر لکھی ہوئی تقریباً تمام باتوں پر عمل کیا ہے۔ مقصد یہ بتانا نہیں ہے کہ زندگی کے اشارات پڑھ کر انھوں نے عمل کیا ہے بلکہ یہ بتانا ہے کہ وہ باتیں اتنی واضح تھیں کہ ان پر عمل کیے بغیر اسرائیل سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا تھا — آج وہ نظریاتی اختلافات کے باوجود اپنے مشترکہ دشمن سے نمٹنے کے لیے متحد ہیں۔ دوسری بڑی بات یہ کہ عرب فوجوں نے سات سال کے عرصے میں جدید ترین آلات جنگ کے استعمال اور جدید طریقہ ہائے جنگ کی تعلیم و تربیت حاصل کرنے میں قابل تعریف ترقی کی ہے۔

یہ چند سطریں محض اظہار مسرت کے لیے سپرد قلم کی گئی ہیں۔ عربوں کی حمایت صرف [illegible] نہیں

بلکہ حق وانصاف کو پسند کرنے والے دوسرے لوگ بھی کر رہے ہیں۔

ابھی ان چند سطروں کی سیاہی خشک بھی نہ ہوئی تھی کہ آئینۂ مسرت پر ایک غبار چھا گیا۔ خبر یہ آئی کہ مسز گولڈا مائیر نے اسرائیلی پارلیمنٹ میں یہ بیان دے کر سنسنی پھیلا دی کہ اسرائیلی فوجوں کے ایک ہراول دستے نے نہر سوئز کے مغربی کنارے پر اپنا مورچہ جما لیا ہے اور وہ قاہرہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔

یہ وقت وہ تھا جب جنگ بندی کے لیے روس اور امریکہ دونوں کی کوششیں تیز ہو چکی تھیں۔ مصر کی طرف سے کبھی یہ کہا گیا کہ اس دستے کا صفایا کر دیا گیا ہے اور کبھی یہ کہا گیا کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ آخر کار جنگ بندی کے وقت یہ ثابت ہو گیا کہ اسرائیلی فوج مغربی کنارے پر موجود رہی بلکہ پہلی جنگ بندی کے بعد اس نے آگے بڑھ کر ایسی پوزیشن اختیار کر لی کہ مصر کی تھرڈ آرمی اس کے نرغے میں آگئی اور سوئز شہر بھی گھر گیا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مصری فوجوں نے اپنے جو علاقے دوبارہ حاصل کیے ہیں وہ بڑی بہادری سے لڑ کر حاصل کیے ہیں اور اسرائیلی فوج نے دھوکے چالاکی اور جنگ بندی کی خلاف ورزی کر کے مغربی کنارے پر اپنی پوزیشن مضبوط کر لی ہے لیکن جو سوال ذہن میں کھٹک پیدا کرتا ہے وہ یہ ہے کہ مصری فوج کی اعلیٰ کمان نے مغربی کنارے کی حفاظت سے غفلت کیوں برتی؟ ایسی غفلت جس نے جنگ کا پانسہ پلٹ دیا اور مصری فوج کی کامیابی ناقص ہو کر رہ گئی۔

اسرائیل نے یہ دیکھ کر کہ اب وہ جنگ میں شکست کھا جائے گا۔ یہ منصوبہ بنایا کہ ایک طرف اس کی فوج کا ایک مضبوط دستہ کسی طرح نہر سوئز کے مغربی کنارے پر اپنے قدم جما لے اور دوسری طرف امریکہ براہ راست جنگ میں مداخلت کرے۔ اس کے بغیر جنگ بندی کی صورت میں اس کو مضبوط پوزیشن حاصل نہیں ہو سکے گی۔ مصر کی غفلت نے اس منصوبے کو پوری طرح کامیاب کر دیا۔ اگر جنگ بندی کے وقت اسرائیل کی فوج مغربی کنارے پر موجود نہ ہوتی تو اس کی پوزیشن بہت کمزور اور مصر کی بہت مضبوط ہوتی اس صورت میں جنگ بندی کو مستحکم کرنے کے لیے اس سمجھوتے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی جو اب آ رہی ہے۔ الغرض اگر ایسا کوئی سمجھوتہ کرنا ہی پڑتا تو اس کی نوعیت یہ نہ ہوتی جو اب ہے۔ اس وقت مصر سب سے زیادہ اس بات کے لیے فکرمند ہے کہ اسرائیلی فوج ۲۲ اکتوبر کی پوزیشن پر واپس چلی جائے

تاکہ شہر سوئز کا راستہ اور مشرقی کنارے پر مصر کی "تیسری فوج" کا راستہ کھل جائے۔ اسرائیل اس پوزیشن پر واپس جانا نہیں چاہتا بلکہ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ پہلے جنگی قیدیوں کا تبادلہ کیا جائے۔

اسرائیل کے وزیر دفاع موشے دایان پر اسرائیل میں سخت نکتہ چینی کی جا رہی ہے۔ اسرائیلی حکومت کے وزیر انصاف اس بنا پر استعفا دے چکے ہیں اور اب وزیر خارجہ بھی علی الاعلان موشے دایان پر نکتہ چینی کر رہے ہیں۔ موشے دایان نے جو بھی غفلت کی ہو لیکن اگر یہ منصوبہ اسی کا تھا کہ اسرائیل کی فوج کا ایک مضبوط دستہ مغربی کنارے پر قدم جمالے تو اس کی اس ہوشیاری نے غفلت کی تلافی کر دی ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ اسرائیل کی وزیر اعظم کا اعتماد اس کو حاصل ہے۔ مصر کی ایک ذرا سی غفلت نے خود اس کے لیے اور دوسری عرب حکومتوں کے لیے کتنی بڑی الجھن پیدا کر دی۔

۱۹۶۷ء کی جنگ میں روس نے جو رویہ اختیار کیا تھا اس کی بنا پر صدر سادات کی حکومت سے اس کے تعلقات خراب ہو گئے تھے۔ روس نے اس کو محسوس کیا اور مصر کو کچھ جدید کار آمد ہتھیار مہیا کر دیے۔ ۷۳ء کی جنگ میں اس کا رویہ پہلے سے کچھ مختلف رہا ہے لیکن اب بھی وہ مصر و شام کا ساتھ اس حد تک دینے کو تیار نہیں ہے جس حد تک امریکہ اسرائیل کا ساتھ دے رہا ہے۔ تازہ جنگ کے اس مرحلے میں جب اسرائیل کی مکمل شکست قریب آ گئی تھی امریکہ براہ راست جنگ میں کود پڑا لیکن دوسری طرف روس کے وزیر اعظم خفیہ طور پر مصر پہنچ گئے اور پانچ بار صدر سادات سے ملاقات کر کے ان کو جنگ بندی قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس کی وجہ بالکل کھلی ہوئی ہے۔ امریکہ اور روس دونوں اس پر متفق ہیں کہ اسرائیل کی تلوار عربوں کے سروں پر لٹکتی رہے بلکہ اس پوزیشن میں رہے کہ جب چاہے عربوں پر وار کر سکے۔ اس صورت حال سے دونوں ہی کے مفادات وابستہ ہیں۔ اسرائیل، امریکہ کے بل پر قائم اور اس کا غلام بنے رہنے پر مجبور ہے۔ امریکہ اپنے اس غلام کو مضبوط اور توانا رکھنا چاہتا ہے کیونکہ اگر یہ کمزور ہو جائے تو بحر روم اور مشرق اوسط میں اس کے مفادات کا خاتمہ ہو جائے گا۔

اسرائیل کو مضبوط رکھنے میں روس کا مفاد یہ ہے کہ اگر وہ کمزور ہو کر عربوں کے زیر اثر آ جائے تو مصر و شام و عراق اس کے اقتصادی و فوجی شکنجے سے نکل بھاگیں گے اور آزاد فضا میں سانس لینے کی کوشش شروع کر دیں گے۔

ان دو بڑی طاقتوں میں سے کسی کی دوستی عربوں کو اس چکر سے نکلنے میں مدد نہیں دے سکتی۔ ان کی آزمائش کا دور طویل ہے۔ اس چکر سے نکلنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک عرب ممالک اپنے ذرائع و وسائل میں ہم آہنگی اور ربط پیدا کرکے ان دونوں طاقتوں کے اقتصادی و فوجی شکنجے سے نکلنے کی متحدہ و متفقہ کوشش نہ کریں۔ اسرائیل کو مضبوط رکھنا اور عربوں میں پھوٹ ڈالنا امریکہ و روس دونوں کی متفقہ پالیسی ہے۔ جب تک اس پالیسی کو ناکام نہیں بنایا جاتا عربوں کی کامیابی بہت مشکل ہے یہ مستقبل ہی بتلائے گا کہ عرب اس پالیسی کو سمجھ کر اسے ناکام بنانے کی سعی کرتے ہیں یا نہیں؟

اس جنگ میں اپنی بعض غلطیوں کی وجہ سے پوری طرح کامیاب نہ ہونے کے باوجود عربوں نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ ان کے روشن مستقبل کی ایک نمایاں علامت ہے۔ صدر سادات نے اپنی عالمی پریس کانفرنس میں یہ بالکل سچ کہا ہے کہ اس جنگ نے ثابت کر دیا ہے کہ عرب مرے نہیں ہیں زندہ ہیں۔ زندگی کا ثبوت کسی قوم کی کامیابی کی اولین بنیاد ہے۔

اس جنگ میں ایک بہت بڑی بات جو دنیا کے سامنے آئی یہ ہے کہ عربوں نے اپنے جنگی منصوبے کو مخفی رکھنے کے لیے ایک ایسی رازداری کا مظاہرہ کیا جو بالکل خلاف توقع ہے۔ سی آئی اے جیسی تنظیم بھی اسے معلوم نہ کر سکی۔ اگر پہلے کی طرح ان کا جنگی منصوبہ ان کے لیڈروں کے نعروں میں طشت از بام ہو گیا ہوتا تو وہ اپنی موجودہ کامیابی کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ متعدد پل بنا کر بھاری ہتھیاروں کے ساتھ نہر سوئز سے اپنی فوجوں کو پار اتار دینا اور دیکھتے دیکھتے بارلیف قلعہ بندیوں کے پرخچے اڑا دینا حرب و ضرب کی تاریخ میں ایک ایسا واقعہ ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔ ان کی اس حربی مہارت اور بہادری پر یورپ و امریکہ بھی انگشت بدنداں ہو گئے۔ اسی کا سیاسی نتیجہ یہ ہے کہ افریقہ کے ۲۵ ممالک اب تک اسرائیل سے اپنے سفارتی تعلقات توڑ چکے ہیں۔ پوری توقع ہے کہ ۱۹۶۷ء میں حاصل کیے ہوئے عرب علاقوں پر اسرائیل کا غاصبانہ قبضہ اب زیادہ دنوں تک باقی نہیں رہ سکے گا۔ لیکن کیا شرم الشیخ، گولان کی پہاڑیوں اور بیت المقدس سب کچھ چھوڑنے پر اسرائیل کو مجبور کیا جا سکے گا؟ اور کیا ان سب پر عرب حکومتوں کو دوبارہ قبضہ دے دیا جائے گا؟ امریکہ و روس کی موجودہ پالیسی کے پیش نظر اس کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ یہ دونوں حکومتیں اسرائیل کی سرحدوں کو پہلے سے

زیادہ مستحکم بنانے پر متفق معلوم ہوتی ہیں۔ اِن علاقوں سے انھوں نے اگر اسرائیل کو ہلنے پر مجبور بھی کیا تو ان پر بین الاقوامی نگرانی مسلط کرنے کی کوشش ضرور کریں گی۔

۱۲ر نومبر ۷۳ء

مولانا حبیب الرحمٰن اعظم گڈھ　　　　مولانا شمس پیرزادہ بمبئی

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صدر آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت اور

مدیر زندگی مولانا سید احمد عروج قادری کے مضامین شائع کر رہے ہیں۔ اور آخر میں اسی مسئلے پر مندرجہ بالا حضرات کا ایک متفقہ بیان شائع کر رہے ہیں۔

ضرورت ہے کہ ماہنامہ زندگی کا یہ خاص نمبر زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچا کر عوام کو مسئلے سے باخبر کیا جائے۔

یہ نمبر انشاء اللہ جنوری کے آخر میں شائع ہوگا، جو جنوری و فروری کا مشترکہ شمارہ ہوگا۔

براہ کرم آپ اپنی اضافہ شدہ تعداد سے دسمبر کے آخری ہفتہ تک ضرور مطلع فرما دیں تاکہ طباعت کے وقت تعداد کا لحاظ رکھا جا سکے۔ جنوری کا شمارہ الگ سے شائع نہیں ہوگا۔

نمبر زندگی سائز کے تقریباً ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل ہوگا۔ ٹائیٹل خوبصورت، دورنگا ہوگا۔

قیمت صرف تین روپیہ پچاس پیسے — ایجنٹوں کا کمیشن 25٪ پچاس سے زائد کاپیوں پر 33٪ — نمبر حاصل کرنے کے لیے دسمبر کے آخر تک آپ کا تمام سابقہ بقایا بھی ادا ہونا ضروری ہے۔ نیز نمبر کے آرڈر کے ساتھ مزید رقم بھی ارسال فرمائیں۔

منیجر ماہنامہ زندگی رام پور یوپی

شرائط ایجنسی

۱۔ ایجنسی کم سے کم ۵ رسائل پر دی جائے گی

۲۔ دس روپیے ایڈوانس جمع کرنے ہوں گے۔

۳۔ ۵ سے ۵۰ پرچوں تک ۲۵ فی صدی کمیشن دیا جائے گا البتہ ۵۰ سے زائد پہ 33٪ کمیشن دیا جائے گا۔

۴۔ رسائل کی روانگی کا خرچ دفتر برداشت کرے گا۔ جسٹری اور وی پی کا خرچ ایجنٹ صاحبان کے ذمہ ہوگا

۵۔ ہر مہینے کا بل باقاعدہ ادا کرنا چاہیے۔　　　　منیجر زندگی رام پور

ہندو دھرم کی جدید شخصیتیں

(یہ مقالہ مرزاپور کے تربیتی اجتماع میں ۲۰ر اگست کو پڑھا گیا)

(جناب محمد فاروق خانصاحب)

ہندو دھرم کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ تاریخ کے طویل سفر کے بعد ۱۸ ویں صدی عیسوی میں ہندو سماج میں مذہب کی جو شکل پائی جاتی تھی وہ صرف یہ تھی کہ لوگ دھرم شاستروں سے گہری عقیدت رکھتے تھے۔ ویدوں کا نام بھی وہ لیتے اور وید منتروں کو حفظ بھی کرتے تھے لیکن ان کے معنے سے انہیں کوئی خاص سروکار نہ تھا۔ لوگ پوجا پاٹ بھی کرتے اور تیرتھ یاترا کو بھی نکلتے تھے۔ زندگی میں مذہبی رسوم کی بھی پابندی کی جاتی تھی لیکن فکر و بصیرت اس قدر مفقود ہو چکی تھی کہ ظالمانہ اور غیر منصفانہ رسم و رواج کو اصل دھرم سمجھ لیا گیا تھا۔ شودروں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ سماج میں اونچ نیچ کا تصور پایا جاتا تھا۔ عورتیں تعلیم سے محروم تھیں۔ دختر کشی اور ستی کو لوگ خاندانی شرافت کی علامت سمجھتے تھے۔ علمی انداز فکر سے اذہان بیگانہ اور تاریخ جغرافیہ اور دیگر علوم کی حقیقت سے لوگ بالکل نا آشنا تھے۔ بیرونی ملکوں کے سفر تک کو ناجائز خیال کیا جاتا تھا۔ لوگوں میں سیاسی شعور کی بھی کمی تھی۔ آزادی و حریت کی قدر و قیمت سے بڑے بڑے لوگ بھی نا آشنا تھے یہاں تک کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ترقی و فتح پر راجہ رام موہن رائے جیسا شخص بھی ایشور کو دھنیہ واد دیتا دکھائی دیتا ہے۔

لیکن ۱۹ صدی کا ہندوستان بہت بدل چکا تھا۔ ہندو سماج میں بیداری کی لہریں اٹھنے لگی تھیں۔ مختلف مذہبی تحریکیں وجود میں آ چکی تھیں۔ غلط اور غیر منصفانہ رسم و رواج کے خلاف آوازیں اٹھنے لگی تھیں۔ ستی کی وحشیانہ رسم کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ لوگوں میں سیاسی شعور بھی ابھر

تھا۔ بعض سیاسی جماعتیں میدان میں عملاً کام کرنے لگی تھیں۔ اخبارات نکلنے لگے تھے اور لٹریچر میں تیزی سے اضافے ہو رہے تھے۔

اس بیداری کے مختلف اسباب تھے۔ اس میں سب سے بڑا دخل جدید تعلیم کو ہے۔ ہندوستان میں جدید تعلیم کو فروغ دینے میں عیسائی مشنری کا بڑا حصہ ہے۔ یہاں انگریزی تعلیم کی ابتدا انہیں کے ذریعے سے ہوئی۔ بعض ہندوستانی بھی اس تعلیم کے حق میں تھے جن میں راجہ رام موہن رائے کو خاص شہرت حاصل ہے۔ انھوں نے ۱۸۱۶ء میں ہندو کالج کی بنیاد ڈالی جو پریسیڈنسی کالج کے نام سے مشہور ہے۔ شروع میں انگریزی تعلیم کی بڑی مخالفت ہوئی لیکن آہستہ آہستہ انگریزی تعلیم کی طرف لوگوں کا رجحان بڑھنے لگا۔ ۱۸۳۵ء میں لارڈ ولیم بینٹنگ نے اعلان کر دیا کہ ہندوستان میں ذریعہ تعلیم انگریزی ہوگی۔ اس اعلان کے بعد تیزی سے اسکول اور کالج کھلنے لگے۔ ۱۸۵۷ء میں کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں آیا۔ تعلیم کے راستے سے یہاں جدید علوم کی بھی اشاعت ہونے لگی۔ اس سے لوگوں کی فکری دنیا میں بڑی تبدیلی رونما ہوئی۔

اس سلسلے میں مستشرقین کے کارنامے بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ چارلس ولکنس نے ۱۷۸۵ء میں بھگوت گیتا کا انگریزی ترجمہ شائع کیا۔ اس کے دو برس کے بعد ہتوپدیش اور پھر مہابھارت کی شکنتلا کہانی شائع ہوئی۔ سر ولیم جونس جو ۱۷۸۳ء میں فورٹ ولیم کے جج مقرر ہوئے تھے۔ انھوں نے ایک سال کے اندر ہی رائل ایشیاٹک سوسائٹی قائم کی اور اس سوسائٹی کے ذریعے سے مشرقی علوم کے ریسرچ کے سلسلے میں اچھا خاصا تعاون کیا۔ جونس نے خود کالیداس کے شکنتلا ناٹک کا انگریزی ترجمہ کیا۔ جس کا جرمن ترجمہ شائع ہوا۔ اس کے علاوہ انھوں نے رتو سنہار کا بھی ترجمہ شائع کیا۔ منوسمرتی کا ترجمہ انھوں نے ۱۷۹۴ء میں شائع کرایا۔ کولبرک نے ۱۸۰۵ء میں ویدوں پر تحقیقی تفصیلات پیش کیں۔ کولبرک کے علاوہ ہملٹن، برناف، میکسمولر، گراسمین، راتھ، پشل، ولسن میکڈونلڈ وغیرہ نے بھی سنسکرت علوم میں دلچسپی لی۔ میکسمولر کو ہندوستان میں کافی شہرت حاصل ہوئی۔ انھوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی کو اپنے کاموں کا مرکز بنایا۔ تیس سال کی غیر معمولی محنت کے بعد انھوں نے پہلی بار رگ ویدکی ساین شرح اپنے تبصرے کے ساتھ شائع کی۔ اس کے علاوہ

SACRED BOOK OF THE FAST کو مرتب کیا۔ پرم ہنس رام کرشن کی سوانح حیات لکھی اور مذاہب کے تقابلی مطالعہ کی روایت قائم کی میکسمولر کی ایک تصنیف اس موضوع پر بھی ہے کہ بھارت دنیا کو کیا سکھا سکتا ہے۔

ان یورپین حضرات کے مطالعہ اور ان کی تحقیقات نے ہندو سماج پر گہرا اثر ڈالا۔ اس سے ذہنوں کو بڑی غذا ملی۔ ہندو قوم کے اندر اعتماد اور حوصلہ پیدا ہوا۔ ان میں بہت سے ایسے لوگ پیدا ہوئے جو ہندو دھرم کو ایک عالمگیر دھرم کی حیثیت سے دیکھنے کے خواہشمند تھے۔ نئے ہندو سماج میں بیداری لانے اور ہندو دھرم کے تجدیدی کاموں میں جن شخصیتوں کو نمایاں حیثیت حاصل ہوئی ان میں راجہ رام موہن رائے، پرم ہنس رام کرشن، ویویکانند، دیانند سرسوتی۔ اروند، رویندر ناتھ ٹیگور، مہاتما گاندھی اور ڈاکٹر رادھا کرشنن کے نام خاص طور سے لیے جا سکتے ہیں۔ ہم یہاں ان میں سے ہر ایک کے کاموں کا مختصر جائزہ لینا چاہتے ہیں۔

راجہ رام موہن رائے

رام موہن رائے ۱۷۷۴ء میں بنگال کے بردوان ضلع میں ایک برہمن خاندان میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم کے بعد وہ عربی و فارسی کی تعلیم کے لیے پٹنہ گئے اور وہاں سے بقول شخصے زبردست مولوی بنکر لوٹے۔ ان کی زبان، لباس اور کھانا پینا تک مسلموں جیسا تھا۔ ان کے خیالات پہ اسلام کے گہرے اثرات تھے۔ قرآن اور دیگر اسلامی کتب کا انھوں نے براہ راست عربی زبان میں مطالعہ کیا تھا۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی شخص کسی قسم کا اعتراض کرتا تو رام موہن رائے کو اس کا جواب دینے میں بڑی خوشی ہوتی۔ بت پرستی سے انہیں سخت نفرت ہوگئی تھی۔ ان کے والد کو جب ان باتوں کی خبر ہوئی تو وہ سخت ناراض ہوئے اور رام موہن رائے کو گھر سے نکال دیا۔ گھر سے نکلنے کے بعد انھوں نے پورے ہندوستان کا دورہ کیا۔ وہ تبت بھی گئے اور وہاں کے لاماؤں سے بودھ دھرم کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد وہ گھر واپس لوٹ آئے۔ والد نے انہیں بنارس بھیجا۔ بنارس پہنچکر انھوں نے سنسکرت اور دھرم شاستروں کا مطالعہ کیا۔ ۱۸۰۳ء میں والد کے انتقال کے بعد وہ مرشدآباد منتقل ہوگئے اور یہاں انھوں نے اپنی تصنیف تحفۃ الموحدین مرتب کی۔ اس کتاب میں انھوں نے بت پرستی کی مذمت اور توحید کی تعریف کی اور ایک عالمگیر

مذہب کی ضرورت کا اظہار کیا۔

رام موہن رائے نے کچھ دنوں تک ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت بھی اختیار کی لیکن آخر میں وہ اس سے الگ ہو گئے۔

۱۸۰۹ء سے ۱۸۱۴ء تک راجہ رام موہن رائے کا قیام رنگ پور میں رہا۔ یہاں انھوں نے ویدانت، تنتر اور جین دھرم کی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ مذہبی مذاکروں کے لیے وہ اپنے مکان پر مجلسیں منعقد کرتے رہے۔

۲۲ سال کی عمر میں انھوں نے انگریزی پڑھنی شروع کی اور بہت جلد انگریزی زبان میں ان کی اچھی خاصی استعداد ہو گئی۔ ۱۸۱۴ء میں وہ کلکتہ آگئے۔ اسی سال وہ کمپنی کی ملازمت سے الگ ہوئے ہیں۔ کلکتہ پہنچکر وہ سماج سیوا اور اصلاحِ رسوم کی تحریکوں میں حصہ لینے لگے۔ کلکتہ میں عیسائی مشنریوں سے ان کے تعلقات پیدا ہوئے۔ بائبل کو اس کی اصلی زبان میں پڑھنے کے لیے انھوں نے عبرانی اور یونانی زبان سیکھی۔ رام موہن رائے ہندوؤں میں وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے بائبل کو اس کی اصل زبان میں پڑھا اور آزادانہ غور و فکر کیا۔ انھوں نے پہلی تین انجیلوں کے حوالے سے اپنی تصنیف Precept of Jesus, The Guide to peace and Happiness میں یہ ثابت کیا کہ حضرت مسیح موحد تھے اور مسیح سے متعلق کلیسا کے عقائد صحیح نہیں ہیں۔

راجہ رام موہن رائے اس کے حق میں تھے کہ ہندوستانیوں کی تعلیم کا ذریعہ انگریزی زبان ہو۔ انھوں نے وقت کے تقاضوں کے پیش نظر سنسکرت کالج کے بجائے کلکتہ میں انگریزی پڑھانے کے لیے ہندو کالج کھولنے پر اپنا پورا تعاون پیش کیا۔ ۱۸۳۰ء میں ڈف ہندوستان آئے تو رام موہن رائے نے انہیں انگریزی اسکول کھولنے کے لیے مکان بھی دلایا اور طلبہ بھی فراہم کیے۔

عیسائی مشنریوں سے کہیں زیادہ رام موہن رائے نے ہندو دھرم اور اپنے پنڈتوں اور پیتاؤں پر تنقیدیں کیں۔ بت پرستی، شرک اور ستی وغیرہ کے خلاف قدم اٹھایا۔ وہ کہتے تھے کہ ہم قدیم اور سچے ہندو دھرم کے مخالف ہرگز نہیں ہیں۔ ہم تو صرف ان برائیوں کے خلاف ہیں جو بعد میں ہندو سماج میں گھس آئی ہیں لیکن کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ جس چیز کو وہ قدیم اور سچا ہندو دھرم

قرار دیتے ہیں وہ حقیقت میں ہندو شاستروں کی محض اسلامی اور مسیحی تعبیر و تشریح ہے۔ انھوں نے اپنشدوں کی روشنی میں برمھ (خدا) کا جو تصور پیش کیا وہ شنکر اور را مانج وغیرہ کی بہ نسبت اسلام سے کہیں زیادہ قریب ہے

دھرم پرچار کے لیے راجہ رام موہن رائے نے ۱۸۱۵ء میں آتمی سبھا قائم کی۔ اس کے اجتماعات میں مذہب کے اسرار و موز پر گفتگو ہوتی تھی اور بحث و مباحثے بھی ہوتے رہتے تھے۔ یہ سبھا ۱۸۱۹ء تک قائم رہی اس کے بعد راجہ رام موہن رائے اور ولیم ریڈن نے باہم ملکر یونیٹیرین سوسائٹی قائم کی۔ یہ سوسائٹی زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی۔ بالآخر ۱۸۲۸ء میں رام موہن رائے نے براہمو سماج کی بنیاد ڈالی۔ اس سماج کے اجتماعات میں وید کا پاٹھ ہوتا اور بنگالی میں اس کا ترجمہ پیش کیا جاتا اور اس کی تشریح کی جاتی۔ اس کے علاوہ تقریر و تذکیر کا پروگرام بھی رکھا جاتا تھا۔

براہمو سماج کو قائم ہوئے ابھی دو ہی سال ہوئے تھے کہ راجہ رام موہن رائے انگلینڈ گئے اور وہیں ۱۸۳۳ء میں برسٹل میں ان کا انتقال ہو گیا۔

رام موہن رائے کے علاوہ براہمو سماج کی دوسری اہم شخصیت دیویندر ناتھ ٹھاکر کی ہے۔ آپ دیویندر ناتھ نے تتو بودھنی سبھا قائم کی تھی۔ ۱۸۴۳ء میں وہ براہمو سماج کے رکن ہو گئے۔ بنگالی زبان میں تتو بودھنی پتر نکالنا شروع کیا جس میں ویدوں اور اپنشدوں کے تراجم اور سماج سے متعلق زوردار مضامین شائع ہوئے۔ کلکتہ کے قریبی شہروں میں براہمو سندیش کا اچھا خاصہ پرچار ہوا لیکن ایک مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ ویدوں کو مستند مانا جائے یا نہ مانا جائے۔ راجہ رام موہن رائے کہتے تھے کہ ان کے خیالات کو ویدوں کی تائید حاصل ہے۔ سماج کے اکثر ارکان وید کو خدا کا کلام سمجھتے تھے۔ اسکاٹش مشنری الیکزنڈر ڈف نے اعتراض کیا کہ ویدوں کی تعلیم براہمو سماج کے اصولوں کے خلاف ہے۔ ویدوں میں تو شرک اور وحدۃ الوجود کی تعلیم پائی جاتی ہے وہ توحید کے حامل نہیں ہیں۔ اس سے متاثر ہو کر سماج کے کچھ ارکان نے ویدوں کو سند ماننے سے انکار کر دیا۔ بحث و مباحثہ کا سلسلہ کئی سال تک جاری رہا۔ بالآخر دیویندر نے ۱۸۴۵ء میں چار طالب علموں کو اس مقصد سے کاشی بھیجا کہ وہ وہاں ویدوں اور اپنشدوں کا مطالعہ کریں اور اصل حقیقت کا پتہ لگائیں۔ چار برس کے مطالعہ کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ویدوں میں بہ کثرت دیوتاؤں کی اپاسنا (پوجا) کی تعلیم دی گئی ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ اپنشد کی رو سے

جیوا تما (روح) ہی برمھ ہے۔ اس اطلاع کے بعد دیویندر نے اعلان کیا کہ برامھو سماج کسی بھی کتاب کو آخری سند نہیں مانتا۔ فطرت اور ضمیر ہی برامھو سماج کی اصل بنیاد ہے لیکن ہندو دھرم گرنتھوں کو بالکل ترک بھی نہیں کیا گیا۔

۱۸۵۷ء میں کیشو چندر برامھو سماج کے رکن ہوئے۔ ۱۸۵۹ء میں انھوں نے ایک مختصر سی سبھا سنگت سبھا کے نام سے قائم کی۔ اس سبھا کے ارکان اکثر نوجوان تھے۔ کیشو نے کچھ ٹریکٹ بھی شائع کیے۔ ۱۸۶۴ء میں مدراس میں ان کی تقاریر ہوئیں اور وہاں وید سماج کا قیام عمل میں آیا۔ یہ وید سماج آگے چل کر برامھو سماج میں ضم ہو گیا۔ بمبئی پہنچکر کیشو چندر نے پرارتھنا سبھا کی بنیاد ڈالی۔

۱۸۶۶ء میں دیویندر نے اپنا ایک الگ سماج بنایا جس کا نام انھوں نے بھارتی برامھو سماج رکھا۔ ہندو، بودھ، اسلام وغیرہ مذاہب کی کتابوں کے منتخبات کو انھوں نے ایک کتاب کی شکل میں "اشلوک سنگرہ" کے نام سے شائع کیا۔ بھگتی بھاؤ اس نئے سماج کی نمایاں خصوصیت تھی۔ اس کے ارکان انجیل کا مطالعہ بڑے شوق سے کرتے۔ اس کے علاوہ ڈین اسٹینلی کی ورکس روبنس کی سرمنس، سیلے کی "اکسے ہوموا" اور تھیا لاجیکا جرمینکا بھی ان کی خاص پسندیدہ کتابیں تھیں۔

کیشو چندر وشنو خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے بعض رشتہ دار چیتنیہ مت سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ اسی کا اثر تھا کہ انھوں نے برامھو سماج میں جس کی پرستش میں فکر اور دھیان کو اصل اہمیت حاصل تھی بھگتی کا جذبہ پیدا کیا اور کیرتن کو رواج دیا۔

۱۸۷۰ء میں کیشو چندر لندن گئے۔ وہاں سے واپس آکر انھوں نے بھارتی سدھار سنگھ قائم کیا۔ اس سنگھ کے پانچ شعبے تھے، تعلیم نشہ بندی، انفاق، ارزاں لٹریچر کی اشاعت اور عوام میں صنعتی تعلیم و تربیت کو عام کرنا۔ ہر شعبے کے لیے ایک ذیلی کمیٹی بھی بنائی گئی۔ عورتوں اور بالغوں کی تعلیم کی طرف بھی توجہ دی گئی۔ قلیوں کے لیے شبینہ اسکول قائم کیا گیا۔ غریبوں کے لیے رسائل جاری ہوئے۔ نابالغوں کی شادی کو بند کرانے کی بھی کوشش کی گئی۔ کتنی ہی بیواؤں کی شادیاں کرائی گئیں اور کتنی شادی کے رشتے مختلف قوموں کے درمیان قائم کیے گئے۔

آگے چل کر کیشو بابو کے ایک ذاتی معاملہ کی بنیاد پر ایک جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ کیشو چندر اپنی نابالغہ بیٹی کی شادی کرنے جا رہے تھے۔ یہ برامھو سماج کے اصول کی سر تا سر خلاف ورزی تھی۔

کیشو چندر نے یہ کہہ کر جھگڑا ختم کرنا چاہا کہ یہ شادی ایشور کے آدیش سے ہورہی ہے۔ ایشور کا آدیش تو یقیناً پورا ہوا لیکن سماج میں ایک بار پھر انتشار پیدا ہوگیا۔

کیشو اور ان کے پیرو وںنے ایک نیا سماج قائم کیا جس کا نام انھوں نے 'نو ودھان' رکھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نئے ودھان کا تصور انھوں نے بائبل سے لیا اور کچھ چیزیں ہندو سماج سے اخذ کیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بنگال میں کالی وغیرہ دیویوں کی پوجا ہوتی تھی۔ کیشو، ایشور کو ماتا کہہ کر خطاب کرنے لگے۔ وشنومت میں 'بشنو سہسر نام' ایک معروف عقیدہ تھا۔ کیشو نے پرمیشر سہسر نام کتاب لکھی اور اسے اپنے 'نو ودھان' کی عبادت میں داخل کیا۔ ہوم اور آرتی کے ساتھ بپتسما اور عشائیہ کی رسم بھی نو ودھان میں جاری کی۔ ۱۸۸۴ء میں کیشو کا انتقال ہوگیا۔ ان کے انتقال کے بعد نو ودھان مختلف گروہوں میں تقسیم ہوگیا۔

۱۸۷۸ء میں کیشو چندر کے مخالف گروپ نے 'سادھارن براہمو سماج' قائم کیا۔ اس نئے سماج نے اپنا یہ عقیدہ بنایا کہ آدمی کے لیے یہ صحیح نہیں ہے کہ وہ کسی مخصوص کتاب یا شخص کے ساتھ وابستہ ہوکر رہ جائے۔ جس کتاب میں بھی کردار کو بلند کرنے والی تعلیمات پائی جائیں وہی براہمو سماج کا شاستر ہے اور جو شخص بھی کردار کو بلند کرنے والی تعلیم دے وہی گرو کہلانے کا مستحق ہے۔

براہمو سماج نے بعض عام ہندو عقائد کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے

براہمو سماج شروتی' اسمرتی وغیرہ شاستروں کو دلیل قاطع تسلیم نہیں کرتا۔ اس کے یہاں بنیادی اہمیت جس چیز کو حاصل ہے وہ ضمیر کی آواز ہے۔

دیوتاؤں اور بتوں کی پوجا اس کی نگاہ میں کسی پاپ سے کم نہیں ہے۔

اوتار کے عقیدے کو اس نے تسلیم نہیں کیا اور نہ پنرجنم کے نظریے کو قابلِ قبول سمجھا۔

ذات پات کی تفریق کو بھی وہ غلط سمجھتا ہے۔

براہمو سماجیوں کی تعداد اگرچہ کم ہے' اس کی اشاعت تعلیم یافتہ لوگوں میں ہی ہوئی لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ براہمو سماج کے تقریباً سبھی نظریات کو ترقی یافتہ ذہن تسلیم کرتا ہے۔

دیانند سرسوتی

آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند سرسوتی کی پیدائش ۱۸۲۴ء میں سوراشٹر میں ہوئی۔

راجہ رام موہن رائے کی طرح ان کا تعلق بھی برہمن خاندان سے ہے ۔ دیانند کا اصل نام مول شنکر تھا ان کے بچپن کا یہ واقعہ ہے جب وہ چودہ سال کے تھے ۔ انھوں نے شیوراتری کا برت رکھا شب بیداری کے لیے وہ شیو مندر گئے ۔ آدھی رات گذرنے تک مندر کے تقریباً سبھی لوگوں پر نیند طاری ہوگئی لیکن مول شنکر جاگتے ہی رہے ۔ مندر میں سناٹا ہوا تو بلوں سے چوہے نکل آئے اور شیو کی مورتی پر چڑھائی ہوئی مٹھائی کھانے لگے ۔ مول شنکر کے دل میں خیال گذرا کہ کیسے تریلوکی ناتھ ہیں جو چوہوں تک سے اپنی حفاظت نہیں کر سکتے ۔ انھوں نے اس کا ذکر اپنے والد سے کیا لیکن انہیں کوئی اطمینان بخش جواب نہ ملا ۔ اس کے کچھ ہی عرصے کے بعد ان کی بہن اور چچا کا انتقال ہو گیا اس کا بھی ان پر گہرا اثر ہوا ۔ ان کا دل دنیا سے اچاٹ ہو گیا ۔ والدین نے ان کی شادی کر دینی چاہی مگر وہ گھر سے نکل کھڑے ہوئے ۔

۸ا سال تک وہ مختلف مقامات کی سیاحت کرتے اور تحصیل علم میں لگے رہے ۔ ان کا خیال تھا کہ یوگ کے ذریعے سے مکتی حاصل ہو سکتی ہے ۔ اس کے لیے انھوں نے بندھیاچل، ہمالیہ کے جنگلات اور غاروں کی خاک چھانی ہے لیکن اکثر یوگی انہیں ایسے ملے جن کی حیثیت ٹھگ سے زیادہ نہ تھی لیکن کچھ یوگی ایسے بھی ملے جن سے انھوں نے یوگ کی تربیت حاصل کی ۔ شنکر کے سرسوتی فرقہ سے سنیاس کی تعلیم بھی انھوں نے حاصل کی ۔ اسی تعلق سے وہ دیانند سرسوتی کے نام سے مشہور ہوئے ۔ لیکن شنکراچاریہ کے نظریہ وحدت الوجود پر وہ زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکے ۔ آخر میں سانکھیا اور یوگ درشن سے کچھ اصول اخذ کر کے انھوں نے تثلیث کا نظریہ اختیار کیا ۔ انھوں نے پرکرتی کی واقعیت، روح کی قدامت اور خدا کی شخصیت کا نظریہ اپنایا اور اپنے اصولوں کو سائنٹیفک انداز میں مرتب کیا ۔

تقریباً ۱۵ سال کی تگ و دو کے بعد وہ متھرا میں ورجانند سے ملے ۔ ورجانند نہایت ذہین اور سنسکرت کے بڑے عالم تھے ۔ سنسکرت کی گرامر میں انھیں خاص دخل حاصل تھا ۔ پرانے رشیوں کی کتابوں سے وہ گہری عقیدت رکھتے تھے لیکن متاخرین کے سنسکرت گرنتھوں سے انہیں شدید نفرت تھی ۔ مورتی پوجا اور بہو دیو واد (شرک) کے بھی وہ بڑے مخالف تھے ۔ دیانند ان کی خدمت میں رہ کر ڈھائی سال تک حصول علم میں لگے رہے ۔ گرو کے خیالات کا ان پر گہرا اثر پڑا ۔ تعلیم کی

تکمیل کے بعد ورجانند نے اپنے شاگرد سے جو دکشنا (حق استاد) طلب کی وہ یہ تھی بعض شاستروں کی تجدید کرو، غلط تصورات اور بعض کو مٹا کر ویدک دھرم کا پرچار کرو۔ اس سلسلے میں آریہ سماج کے مشہور و معروف اپدیشک پنڈت لکشمن جی نے لکھا ہے کہ سوامی ورجانند نے دیانند سرسوتی کو اس کا بھی حکم دیا تھا کہ وہ ان کتابوں کو جو قرآن کے خلاف ہوں۔ جمنا میں پھینک دیں۔ اس سے پنڈت لکشمن جی یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ سوامی ورجانند قرآن کی مخالف چیزوں کی بیخ کنی کو ضروری خیال کرتے تھے[1] اس سے بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سوامی ورجانند قرآن کی بنیادی تعلیم توحید سے حد درجہ متاثر تھے۔ توحید پر گہرا اور غیر متزلزل یقین انہیں قرآن ہی سے حاصل ہوا تھا۔

۱۸۶۳ء میں دیانند متھرا سے آگرہ آئے۔ یہاں سے وہ گوالیر، جے پور، اجمیر، ہردوار وغیرہ مقامات پر گئے۔ ۱۸۶۶ء میں مشنریوں اور انگریزوں سے بھی ان کے تعلقات پیدا ہوئے۔ دیانند اپنے خیالات کی اشاعت میں مصروف تھے وہ ایسی باتیں کہتے جو عام ہندو عقائد کے منافی تھیں۔ وہ کہتے کہ شیو دراصل ایشور کا نام ہے۔ شیو پاربتی کے شوہر نہیں ہیں۔ تیرتھ یاترا اور گنگا اشنان کا بھی ان کے نزدیک کوئی وزن نہ تھا۔ بھاگوت، پران اور کھنڈ درشن کے بارے میں کہتے کہ یہ مستند اور قابل تسلیم کتابیں نہیں ہیں اور مورتی پوجا کو وید کے خلاف قرار دیتے۔ پنڈتوں سے ان کے کئی مناظرے ہوئے۔ ان کا مشہور مناظرہ کاشی کے پنڈتوں سے ہوا۔ مناظرے کا موضوع تھا کہ ویدوں میں مورتی پوجا ہے یا نہیں؟ اور دھرم کے بارے میں کن گرنتھوں کو سند کا درجہ حاصل ہے؟

دیانند پریاگ، مرزاپور، پٹنہ، مونگیر، بھاگل پور وغیرہ مقامات سے ہوتے ہوئے کلکتہ گئے۔ یہاں کچھ براہمو سماجی نیتاؤں سے جن میں کیشو چندر بھی شامل تھے۔ ان کا استقبال کیا۔ براہمو سماج کے لوگ دیانند سے متاثر تھے لیکن ویدوں کے نص قطعی ہونے اور پنر جنم کے حق ہونے میں انہیں دیانند سے اختلاف تھا۔ قرین قیاس بات یہ ہے کہ براہمو سماج کو دیکھنے کے بعد ہی دیانند جی کے دل میں اپنا ایک خاص سماج قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا جو ان کے اصول و نظریات کا حامل ہو۔

[1] دیکھیے پنڈت لکشمن کی کتاب وید اور قرآن جلد اول ص ۲۴۲

کلکتہ سے واپس ہو کر شمالی ہند کے مختلف مقامات پر انھوں نے اپنے اصول و نظریات کی تبلیغ کی۔ ۱۸۷۴ء میں انھوں نے اپنی مشہور و معروف کتاب ستیارتھ پرکاش شائع کی ۱۸۷۵ء میں بمبئی میں انھوں نے آریہ سماج کی بنیاد ڈالی۔ اس وقت تک ان کے پیرووں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ چکی تھی۔ بمبئی میں پہلے سے پرارتھنا سماج موجود تھا۔ براہمو سماج اور پرارتھنا سماج دونوں کے طریق کار سے دیانند سرسوتی نے استفادہ کیا۔

اس کے دو سال کے بعد ملکہ وکٹوریہ کی تخت نشینی کے سلسلے میں دہلی میں دربار لگا۔ دیانند سرسوتی نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی پوری کوشش کی۔ انھوں نے تمام سماج سدھاروں کو جمع کر کے ان کے سامنے ویدک دھرم کو پیش کیا اور اس کی پیروی پر زور دیا لیکن انہیں اس میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ ۱۸۷۷ء میں وہ لاہور پہنچے۔ دو مہینے کی کوششوں کے بعد وہاں آریہ سماج کی ایک شاخ قائم ہوئی۔ کچھ ہی عرصے کے بعد لاہور آریہ سماج کا مرکز قرار پایا۔ بمبئی میں آریہ سماج کے ۲۸ اصول متعین کیے گئے تھے۔ یہاں ان اصولوں میں ترمیم کی گئی اور ان کی تعداد ۲۸ سے گھٹا کر دس رکھی گئی۔ لاہور کے بعد امرتسر، گرداس پور، جالندھر، فیروز پور، راولپنڈی، وزیر آباد، گجرانوالہ، ملتان وغیرہ مقامات پر آریہ سماج کا قیام عمل میں آیا۔ انہیں دنوں میں آریہ سماج کا تعلق امریکی تھیوسوفیکل سوسائٹی سے بھی قائم ہوا لیکن تین سال سے زیادہ یہ تعلق قائم نہ رہ سکا۔

سوامی دیانند کی زندگی کے آخری ایام راجستھان میں گذرے۔ انھوں نے چتوڑ، اندور، اودے پور، جودھپور وغیرہ کے دورے کیے۔ اجمیر میں ۱۸۸۳ء میں ۵۹ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔

سوامی دیانند نے جو کتابیں لکھی ہیں ان میں اہم کتابیں یہ ہیں:-

۱۔ ستیارتھ پرکاش۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۷۴ء میں شائع ہوا تھا۔ اس ایڈیشن میں وہ باب موجود نہ تھا جس میں قرآن کی مختلف آیات پر اعتراض کیے گئے ہیں۔ ایک اطلاع کے مطابق ستیارتھ پرکاش کا دوسرا ایڈیشن سوامی جی کے انتقال کے بعد شائع ہوا۔

۲۔ رگ وید بھاشیہ بھومکا۔ یہ ۱۸۷۸ء کی تصنیف ہے۔ اس میں دیانند سرسوتی نے اپنے سے پہلے کے ویدوں کے شارحین سے خواہ وہ مغربی شارح ہوں یا مشرقی، شدید اختلاف کیا ہے۔

۳۔ یجر وید بھاشیہ ۔ اس میں سوامی جی نے اپنے بیان کردہ اصولوں کے مطابق یجر وید کی شرح کی ہے۔

دیانند سرسوتی کے عقیدے کے مطابق وید خدائی کتابیں ہیں۔ ویدوں کے مستند ہونے کے لیے سوامی جی کے نزدیک کسی خارجی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ وید بذات خود اپنی دلیل ہیں ٹھیک اسی طرح جس طرح آفتاب اپنی آمد کی دلیل بذات خود ہوتا ہے۔ وید سے سوامی جی کی مراد صرف منتر بھاگ یعنی چار سنہتاؤں سے ہے۔ باقی چیزوں کو وہ رشیوں کی تصنیف قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح وہ شری مد بھاگوت، بشنو پران وغیرہ گرنتھوں کو بھی اصل پران تسلیم نہیں کرتے اور نہ انہیں مستند سمجھتے ہیں۔ بھگوت گیتا کو بھی انھوں نے کوئی خاص اہمیت نہیں دی ہے۔

دیانند سرسوتی کی تحقیق کی رو سے ویدوں میں دیوتاؤں کا ذکر نہیں پایا جاتا۔ اگنی، ورن، اندر وغیرہ سے مراد ایشور یا قدرتی طاقتیں ہیں۔

سوامی جی کا تتو درشن (علم الالٰہیات) بڑی حد تک سانکھیہ یوگ پر قائم ہے۔ سانکھیہ اور یوگ درشن کے مطابق پرکرتی (NATURE) جیو (روح) اور ایشور تینوں قدیم اور ازلی ہیں۔ خدا کائنات کا خالق نہیں محض مدبّر اور منتظم ہے۔ سوامی جی نے یہ بھی کہا کہ مکتی صرف کچھ مقرر وقت کے لیے ہی ہوتی ہے۔ اس لیے کہ یہ ناممکن ہے کہ محدود اعمال کی جزا لامحدود ہو۔ مکتی کی مدت ختم ہونے کے بعد آدمی کو کرم (عمل) کے لیے پھر نئے سرے سے جنم لینا پڑتا ہے۔ دیانند سرسوتی نے ایک قدیم رسم نیوگ کی بھی تائید کی لیکن اس پر شاید ہی کسی نے عمل کیا ہو۔

۱۸۹۲ء میں آریہ سماج دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔

۱۔ ماس یا کالج پارٹی ۔ ۲۔ شاکاہاری یا مہاتما پارٹی

پہلی پارٹی ترقی پسندوں کی تھی۔ یہ پارٹی جدید تعلیم اور کالجوں کے قیام کی حمایت کرتی تھی۔ دوسری پارٹی گروکل کے طرز پر تعلیم دینے کی حامی اور گوشت خوری کی مخالف تھی۔ منشی رام اس کے نیتا تھے۔ انھوں نے کانگڑی اور ہردوار میں گروکل کی بنیاد ڈالی۔ آج اس کا شمار ملک کے اہم تعلیمی مراکز میں ہوتا ہے۔ یہاں جدید علوم کے ساتھ سنسکرت اور ہندو دھرم گرنتھوں کی خاص طور سے تعلیم دی جاتی ہے۔

آگے چل کر آریہ سماج نے شدھی اور سنگٹھن تحریک بھی چلائی۔ شدھی تحریک کا مقصد مسلم عیسائی وغیرہ غیر ہندو اقوام کو ویدک دھرم قبول کرنے کی دعوت دینی اور سنگٹھن کا مقصد ہندو قوم کو ایسی تربیت دینی ہے کہ وہ اپنی حفاظت اور مخالفین کا مقابلہ کر سکے۔

تقسیم ملک کے بعد ۱۹۴۸ء سے آریہ سماج کا مرکز دہلی ہے۔ کچھ ہی دن ہوئے آریہ سماج نے اپنے نوجوانوں کی تنظیم آریہ ویر دل کو طاقتور بنایا۔ اس دل نے کئی مقامات پر ریلیف کا قابل قدر کام کیا ہے۔

رام کرشن پرم ہنس

رام کرشن پرم ہنس ۱۸۳۶ء میں ایک غریب برہمن گھرانے میں پیدا ہوئے۔ انہیں کچھ زیادہ پڑھنے لکھنے کا موقع نہیں ملا۔ ست سنگ اور بھجن وغیرہ سے انہیں شروع ہی سے دلی رغبت تھی سب سے پہلے انھوں نے بھیروی نام کی ایک برہمنی سنیاسنی سے یوگ اور تنتر سادھن کی تعلیم حاصل کی۔ پھر وشنو بھگتی مارگ کو اختیار کیا۔ آخر میں انھوں نے طوطا پوری نام کے ایک شخص کو اپنا گرو بنایا جو نظریہ وحدت الوجود کا حامل تھا۔ رام کرشن نے گرو سے ویدانت کے گیان دھیان سیکھے۔ کچھ دنوں تک اسلامی تعلیم کے مطابق انھوں نے نماز اور روزے کی بھی پابندی کی۔ ایک مسیحی سے بائبل بھی پڑھا کر سنی۔ کئی تیرتھ یاترائیں بھی کیں۔ لوگوں میں مشہور ہوا کہ دکن میں ایک ایسا سنت رہتا ہے جس میں غیر معمولی روحانی طاقت پائی جاتی ہے۔ اس نے ایشور کے درشن کیے ہیں۔ عام لوگوں نے تو ان کو ایک سنت اور یوگی ہی سمجھا لیکن خود ان کے اپنے شاگردوں نے یہ خیال قائم کیا کہ وہ ایشور کے اوتار ہیں۔ عام لوگوں کے علاوہ انگریزی تعلیم یافتہ لوگ بھی ان سے متاثر ہوئے۔ ان میں کیشو چندر سین، ایشور چندر ودیا ساگر اور ویویکانند خاص ہیں۔

رام کرشن پرم ہنس کوئی زیادہ پڑھے لکھے تو نہ تھے لیکن لوگوں کی خوبیوں کمزوریوں اور ان کے کردار کے پرکھنے کی ان میں غیر معمولی صلاحیت تھی۔ وہ مخاطب کو پہچان کر اس کی ضرورت کے مطابق اپدیش دیتے تھے۔ وہ مقرر نہ تھے لیکن گفتگو کا فن انہیں آتا تھا۔ ان کی بات چیت خشک منطق نہیں ہوتی تھی۔ وہ لوگوں کو مثالوں کے ذریعے سے اپنی بات سمجھاتے تھے۔ پرم ہنس خیالات و نظریات کے لحاظ سے اگرچہ پرانے قسم کے آدمی تھے لیکن جدید تعلیم سے انہیں کوئی نفرت نہ تھی۔

برہمو سماجیوں، انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں، مسلموں اور غیر ملکی لوگوں سے وہ رواداری کا سلوک کرتے تھے اور ہر ایک سے ہمدردی اور تعلق ظاہر کرتے تھے۔ یہی خاص وجہ ہے کہ نئے اور پرانے ہر طرح کے لوگ ان سے عقیدت رکھتے تھے۔

رام کرشن کے نزدیک دھرم کا اصل راز اور اس کی روح ایشور انو بھوتی یعنی خدا کو دل سے محسوس کرنا ہے۔ دھرم کی حیثیت ان کے خیال میں محض ایک تدبیر کی ہے۔ گیان کے مقابلہ میں وہ بھگتی مارگ کو فوقیت دیتے تھے۔ انھوں نے کسی گرنتھ یا شاستر کی تردید نہیں کی اور نہ کسی طریقے کی مخالفت کی۔ وہ دراصل وحدت ادیان کے مؤید تھے۔ ان کی وجہ سے ان لوگوں کو جو پرانے خیالات کے حامل تھے یا پرانے رسم و رواج کے پابند تھے بڑا سہارا ملا۔

رام کرشن پرم ہنس نے نہ تو کوئی کتاب لکھی اور نہ کبھی کوئی تقریر کی جیسا کہ اس کا ذکر آچکا ہے انھوں نے عام مثالوں کے ذریعے سے ہی لوگوں کو اپنی باتیں سمجھائیں۔ اپنے اصول اور خیالات کو انھوں نے فلسفیوں کی طرح مرتب نہیں کیا وہ بس سنتوں اور صوفیوں کی طرح روحانی اور عملی باتیں کرتے تھے۔ وہ صرف وہی باتیں کرتے جو ان کے نزدیک کارآمد ہوتیں۔ ان کی بیان کی ہوئی دو مثالیں ملاحظہ ہوں۔

"ماں کے پانچ بچے ہیں۔ اس نے کسی کو کھلونا، کسی کو گڑیا اور کسی کو کھانا دے کر بھلا رکھا ہے۔ ان میں سے جو کھلونا پھینک کر ماں ماں کہہ کر رونے لگتا ہے۔ ماں فوراً اسے گود میں اٹھا کر چپ کرنے لگتی ہے"

وہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ جس وقت کوئی شخص خدا کے لیے صحیح معنے میں بے قرار ہوا اٹھتا ہے اور خدا کے مقابلہ میں دنیا کی کسی چیز کو خاطر میں نہیں لاتا۔ خدا اسے اپنے آغوش رحمت میں لے لیتا ہے۔ انسان وجدانی طور پر خدا کو پا لیتا ہے تو سارے جھگڑے ختم ہو جاتے ہیں اسے عجیب سکون و طمانیت حاصل ہوتی ہے۔ اسے وہ ایک عجیب و غریب مثال دے کر سمجھاتے ہیں

بھونرا اسی وقت تک بھن بھن کرتا ہے جب تک وہ پھولوں کا رس نہیں پیتا۔ جہاں رس پینا شروع کیا۔ اس کی بھنبھنا ہٹ بند ہو جاتی ہے۔

رام کرشن مشن کے پروگرام میں آج خدمت خلق کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مشن کی طرف سے کتنے

ہی اسکول کالج، اسپتال اور لائبریریاں قائم ہیں۔ اس کے پیچھے درحقیقت پرم ہنس کے خاص شاگرد ویویکانند کا ذہن کارفرما ہے۔ پرم ہنس کی نگاہ میں اس طرح کے کاموں کو اصل اہمیت حاصل نہ تھی وہ کہتے تھے۔

جتنا پریم بڑھے گا کرم (اعمال) اتنے ہی کم ہوتے جائیں گے۔

ویویکانند

رام کرشن پرم ہنس کے یوں تو بہت سے شاگرد ہوئے ہیں لیکن ویویکانند کو ان میں سب سے زیادہ عزت وشہرت حاصل ہوئی۔ ویویکانند کا اصل نام نریندر تھا۔ وہ کلکتہ کے ایک کالستھ خاندان میں پیدا ہوئے۔ جدید اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم پائی۔ ایک طرف تو انھوں نے کالج میں مغربی فلسفہ کا مطالعہ کیا۔ دوسری طرف براہمو سماج کے لٹریچر کے ذریعے سے اپنشد، گیتا وغیرہ کے بارے میں اچھی خاصی معلومات بہم پہنچائی۔ لیکن اس کے باوجود وہ تشکیک میں مبتلا ہوگئے۔

۱۸۸۱ء میں وہ پرم ہنس کے پاس گئے۔ شروع میں وہ پرم ہنس کے خیالات کی تردید کرتے رہے لیکن بالآخر اپنے گرو سے انھوں نے سیکھا کہ مذہب میں صرف عقل ومنطق سے کام نہیں چلتا اس کے لیے روحانی مشاہدہ اور کشف کی ضرورت پیش آتی ہے۔

رام کرشن پرم ہنس کے انتقال کے بعد ویویکانند نے اپنے کچھ گرو بھائیوں کے ساتھ سنیاس لے لیا اور بارانگر میں ایک مٹھ قائم کیا۔ اس کے بعد انھوں نے ہندوستان کے دورہ کا پروگرام بنایا۔ اس دورے سے انہیں ملک کی معاشی اخلاقی اور مذہبی حالت کا صحیح اندازہ ہوا۔ سیاحت کے زمانہ میں بھی انھوں نے اپنا مطالعہ جاری رکھا۔ الموڑے میں انھوں نے سنسکرت گرامر کی تعلیم حاصل کی۔ احمدآباد میں جین اور اسلامی تہذیب سے متعارف ہونے کا انہیں موقع ملا۔ الور میں خاص طور سے تاریخ کا مطالعہ کیا۔

۱۸۹۳ء میں انہیں اطلاع ملی کہ شکاگو میں تمام مذاہب کی ایک کانفرنس ہونے والی ہے مختلف پریشانیوں اور تکلیفوں کا مقابلہ کرتے ہوئے وہ امریکہ پہنچے۔ وہاں "لیڈیز اینڈ جنٹلمین" کہنے کے بجائے "میرے امریکی بھائیو اور بہنو" کے الفاظ سے لوگوں کو خطاب کیا۔ امریکن ان سے بے حد متاثر ہوئے۔ پارلیمنٹ میں انہیں کم از کم پانچ بار تقریر کرنی پڑی۔ کانفرنس کے بعد ویوکانند

نے امریکہ کے مختلف شہروں اور مضافات کا دورہ کیا۔ ہفتہ میں ۱۴ یا اس سے بھی زیادہ ان کی تقاریر کا پروگرام رہتا تھا۔ وہاں مختلف مقامات پر ہندو دھرم کے مطالعہ کے لیے مراکز قائم ہوئے
امریکہ سے دیوکانند پیرس ہوتے ہوئے انگلینڈ پہنچے۔ ان مقاموں پر ان کی تقریریں ہوئیں ۱۸۹۷ء میں وہ ہندوستان واپس ہوئے تو ہر جگہ ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔
دیویکانند نے رام کرشن آشرموں اور مٹھوں کی طرف توجہ دی۔ ۱۸۹۹ء میں باڑانگر کے آشرم کو بیلڑ منتقل کر دیا۔ آشرم سے انھوں نے انگریزی میں ایک ماہنامہ 'پربدھ بھارت' جاری کیا۔ اس کے علاوہ بنگ زبان میں بھی پندرہ روزہ 'ادبودھن' جاری کیا گیا۔
سوامی دیویکانند نے ۱۸۹۷ء میں رام کرشن مشن کی بنیاد ڈالی۔ ۱۸۹۹ء میں وہ دوسری بار امریکہ گئے۔ وہاں سے واپس ہوئے تو پیرس میں قیام کیا اور وہاں 'تاریخ مذہب' کانفرنس میں شریک ہوئے اور ہندو دھرم پر تقریر کی۔ دیویکانند کا انتقال نہایت کم عمری میں ۱۹۰۲ء میں ہوا انتقال کے وقت ان کی عمر صرف ۳۹ سال کی تھی۔
دیویکانند کی سب سے بڑی کوشش یہ رہی ہے کہ وہ ہندو اصولوں کو جدید شکل میں پیش کریں تاکہ وہ ہر ایک کے لیے قابلِ فہم ہو سکے۔ انھوں نے ایک بار خود کہا تھا کہ میرا مقصد ویدانت کو قدیم بحثوں سے نکال کر اسے قابلِ فہم اور عملی بنانا اور اسی طرح یوگ کو پیچیدہ اشغال سے نکال کر اسے علمی و نفسیاتی شکل دینا ہے۔ دیویکانند نے ویدانت درشن کو بڑی اہمیت دی ہے۔ کیونکہ یہ درشن درحقیقت خاص کر PARTICULUR کو عام UNIVERSAL کے ذریعے سے سمجھنے کی کوشش ہے۔ یہ اتحاد و توافق پر زور دیتا ہے۔ اور اشخاص کے بجائے دائمی اصولوں پر قائم ہے۔ یہ بھید میں ابھید یعنی اختلافات میں اتفاق اور انیکتا میں ایکتا یعنی کثرت میں وحدت کی تعلیم دیتا ہے اس کی رو سے نظر آنے والی مختلف شکلوں کے پیچھے ایک ہی ہستی ہے سنسار کو مایا کہنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ دنیا کی کوئی واقعیت ہی نہیں ہے، بلکہ اس کے معنے صرف یہ ہوتے ہیں کہ سنسار تغیر پذیر ہے ست (حقیقت) تو وہ ہے جو ماضی، حال اور مستقبل تینوں ہی زمانوں میں ایک جیسا رہے۔
سوامی دیویکانند نے دھرم کے پرچار میں عقلی دلائل کو خاصہ وزن دیا ہے۔ جدید سائنس کی اہمیت کے بھی وہ معترف رہے ہیں۔ انگریزی زبان پر انہیں غیر معمولی اختیار حاصل تھا۔ گیتا اور اپنشد کے

علاوہ انھوں نے کالیداس، بھوبھوتی، دانتے اور ملٹن کا بھی مطالعہ کیا تھا۔

گیان یوگ، راج یوگ، کرم یوگ اور بھکتی یوگ وغیرہ ان کی مشہور تصنیفات ہیں۔

اس وقت رام کرشن مٹھ اور رام کرشن مشن دو تنظیمیں کام کر رہی ہیں۔ مٹھ سنیاسیوں کی تنظیم ہے۔ مشن ایک عام تنظیم ہے جس کا رکن غیر سنیاسی شخص بھی ہو سکتا ہے لیکن ان دونوں تنظیموں میں گہرا تعلق ہے۔ مٹھ کے ٹرسٹی لوگ ہی مشن کی مجلس عاملہ کے ممبر ہیں اور مٹھ کے سنیاسی ہی مشن کے بھی خاص کارکن ہیں۔ مشن کی ۱۳۸ شاخیں قائم ہیں جن میں ۲۰ بنگال، ۵۵ ملک کے باقی حصوں میں ۱۱ بنگلہ دیش، ۲ برما، ۱ لنکا، ۱ سنگاپور، ۱ فیجی، ۱ ماریشس، ۱ فرانس، ۱ سوئزرلینڈ، ۱ انگلینڈ، ۱ ارجنٹینا اور ۱۰ امریکہ میں قائم ہیں۔ ان شاخوں کی ۲۲ ذیلی شاخیں بھی ہیں۔

مٹھ کے ذریعے سے مختلف زبانوں میں دس ماہنامے شائع ہو رہے ہیں اور کتابیں تو کئی ایک شائع ہو چکی ہیں۔ مٹھ کے سنیاسی اور اہل علم حضرات تقریروں کے ذریعے رام کرشن پرم ہنس اور ویویکانند کے اصولوں کی تبلیغ کرتے رہتے ہیں۔ سبھی شاخوں کے مراکز پر پوجا پاٹ اور دھیان کا نظم ہے۔ مختلف جگہوں پر ست سنگ (مذاکرہ) تقریر اور بھجن وغیرہ کے پروگرام بھی چلائے جاتے ہیں۔

تقریباً سبھی مراکز پر مفت علاج کا بھی نظم ہے۔ مشن کی طرف سے ۱۲ اسپتال بھی قائم ہیں۔ ملک اور بیرون ملک میں مٹھ اور مشن کے ذریعے سے کئی ایک تعلیمی ادارے چلائے جا رہے ہیں۔ ان میں ۳ ڈگری کالج، ۵ ٹریننگ کالج، ۲۱ ہائر سکنڈری اسکول، ۲ جسمانی تربیت سے متعلق کالج، ۴ انجینیرنگ اسکول اور ۲ سماجی تعلیم اور تنظیمی تربیت سے متعلق کالج چل رہے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ سنسکرت کی پاٹھ شالائیں بھی ہیں۔ بعض مقامات پر پیچھے رہ جانے والی قوموں کی ترقی کے لیے تبلیغ اور نظم کے ذریعے سے تعلیم بالغان کا پروگرام چل رہا ہے۔ اس سلسلہ میں انسٹیٹیوٹ آف کلچر اور گولا پارک کلکتہ کے پروگرام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ رامائن، گیتا وغیرہ پر کلاسیں لگتی ہیں۔ آرٹ، موسیقی، فلسفہ وغیرہ پر تقاریر ہوتی ہیں۔ نمائش کا نظم کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ طلبہ کے لیے میز، کرسی، روشنی اور صحت بخش کھانے کا بھی انتظام کرتے ہیں۔

(باقی)

انسان ہدایت الٰہی کا محتاج ہے

(سلطان احمد اصلاحی، ادارہ تصنیف جماعت اسلامی ہند علیگڈھ)

حضرت مسیح علیہ السلام نے کہا تھا کہ انسان صرف روٹی ہی سے نہیں جیتا بلکہ اس روزی سے جیتا ہے جسے اللہ تعالیٰ اس کے منھ میں ڈالتا ہے۔ سیدنا مسیحؑ کا یہ قول فطرت انسانی کے عین مطابق ہے۔ انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے اجتماعیت پسند واقع ہوا ہے۔ انسانی اجتماع اور اس کے نتیجے میں باہمی تعاون اس کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ بچہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے ضرورتوں کا ایک انبار لیکر آتا ہے جو اسے اس بات پر مجبور کرتی ہیں کہ وہ ماں سے تعاون کرے اور اس طرح اس سے اپنی ضروریات کو حاصل کرے۔ انسان کے لیے اپنے وجود کو برقرار رکھنے کی خاطر کچھ چیزیں ناگزیر ہوتی ہیں۔ غذا، لباس اور مکان ایسی بنیادی ضروریات ہیں جن کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان میں سے کسی ایک چیز کا بھی حصول کسی ایک چیز کا بھی حصول کسی ایک فرد کے بس کی بات نہیں ہے۔ ان میں سے ہر مسئلہ بجائے خود اپنے ساتھ اتنے مسائل رکھتا ہے کہ کسی ایک فرد کی قوت و صلاحیت اسے تنہا انجام نہیں دے سکتی۔ غذا کے مسئلے کو ہی لے لیجیے جو نسبتاً آسان نظر آتا ہے۔ کم سے کم غذا جس پر انسان اپنی زندگی بسر کر سکتا ہے، اس کے حصول کے لیے جن تدابیر کو اختیار کرنا اور جن آلات سے مدد لینا ضروری ہے اس کے تصور سے بھی ایک انسان گھبرا جاتا ہے۔ پھر ان آلات کی تیاری جن سے غذا کے حصول میں مدد لی جائے گی بجائے خود ایک مسئلہ ہے جو فرد کے بس کی بات نہیں۔ غرضیکہ ہر مسئلہ اپنے ساتھ اتنے مسائل رکھتا ہے کہ کسی ایک فرد کے لیے ان سب کا حصول بالکل ناممکن ہے لباس اور مکان کے بنیادی مسائل کو بھی غذا کے مسئلے پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ انہیں مسائل کے ساتھ

جنسی خواہش کی تسکین کا جذبہ بھی انسان کی ایک اہم ضرورت ہے جو بجا طور پر اس کی بنیادی ضروریات میں شامل ہے کہ اس کے بغیر اسے اپنا وجود ناممکن نظر آتا ہے۔ اور ظاہر ہے اس کی تسکین بھی اسی وقت ممکن ہے جبکہ انسان تنہائی کی زندگی بسر کرنے کے بجائے ایک ساتھ مل جل کر رہے۔ اس طرح ان بنیادی ضروریات کی فراہمی اور ان کی تسکین کا مسئلہ انسان کو آبادیاں بسانے اور اجتماعی زندگی گزارنے کے لیے مجبور کرتا ہے۔ انسان کے اجتماعی زندگی اختیار کرنے کی پہلی قوت محرکہ یہی ہے۔

اس کے علاوہ ایک دوسرا محرک بھی ہے جو اسے علیحدہ زندگی گزارنے سے روکتا ہے اور اجتماعی زندگی اختیار کرنے کے لیے مجبور کرتا ہے۔ انسان اگرچہ اپنی عقلی اور فکری صلاحیتوں کے لحاظ سے دنیا کی تمام جاندار مخلوقات پر فوقیت رکھتا ہے لیکن جسمانی قوت و توانائی کے لحاظ سے دنیا کی بہت سی جاندار مخلوقات کے مقابلے میں اپنے کو بالکل بے بس محسوس کرتا ہے۔ وہ تنہا ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور نہ اپنے کو ان کے خطرات سے محفوظ ہی رکھ سکتا ہے۔ اپنی اسی کمزوری کے پیش نظر وہ آبادیاں بساتا اور اجتماعی زندگی گزارتا ہے تاکہ اس طرح ان کی جارحیت سے محفوظ رہ سکے۔ اگرچہ صرف اجتماعی زندگی ہی ان سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے کافی نہیں ہوتی چنانچہ وہ ان کا مقابلہ کرنے کے لیے مختلف قسم کے ہتھیار تیار کرتا ہے تاکہ ان کے ذریعے اپنی فطری کمزوری کو پورا کر سکے اور ان کی جارحیت کا مؤثر طور پر مقابلہ کر سکے۔ بہر حال یہ ایک دوسری قوت محرکہ ہے جو انسان کو اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ وہ علیحدہ زندگی بسر کرنے کے بجائے آبادیاں بسائے اور اجتماعی زندگی گذارے۔

لیکن جہاں یہ حقیقت ہے کہ انسان اجتماعیت پسند واقع ہوا ہے علیحدگی کی زندگی اس کے لیے ناممکن اور اجتماعی زندگی ناگزیر ہے وہیں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان بہت حد تک خود غرض یا دوسرے لفظوں میں مفاد پرست واقع ہوا ہے۔ اسے اپنا عیش و آرام سب سے زیادہ عزیز ہوتا ہے غذا، لباس اور مکان کی بنیادی ضروریات کی تکمیل میں وہ اونچے سے اونچے معیار تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اقتدار کی خواہش اور معاشرے میں اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ مؤثر بنانے کی کوشش نیز اس طرح کے دوسرے جذبات کی تسکین میں وہ ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کا آرزومند ہوتا ہے اور یہ اسباب بسا اوقات اسے اپنی ہی جنس کے دوسرے افراد پر زیادتی کرنے کے لیے آمادہ کرتے ہیں

چنانچہ وہ اپنے آرام و آسائش کے حصول، بنیادی ضروریات کی تکمیل میں اعلیٰ سے اعلیٰ معیار تک پہنچنے اقتدار کو حاصل کرنے اور اسے برقرار رکھنے نیز سوسائٹی میں اپنے کو مؤثر بنانے اور با اثر ثابت کرنے کے لیے دوسروں پر ظلم و زیادتی کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتا۔ اور اپنی خواہشات کی قربان گاہ پر بڑی سے بڑی قابلِ احترام قدروں (VALUES) کو قربان کر دیتا ہے۔ انسان کے اندر کسی نہ کسی درجے میں مقابلے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک کو دیکھ کر سماج کے دوسرے افراد بھی میدان میں اتر آتے ہیں اور مقابلہ کی دوڑ شروع ہو جاتی ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہوتا ہے جب معاشرے کے اندر کشمکش کا آغاز ہوتا ہے اور اگر مؤثر طور سے اس سے نہ نمٹا جا سکے تو اس بات کا عین امکان ہوتا ہے کہ آپس کے اس ٹکراؤ کے نتیجے میں وہ ہلاکت کے منہ میں جا گرے۔

اس سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ معاشرے کے اندر لازماً تمام ہی افراد خود غرض اور مفاد پرست ہوتے ہیں۔ انہیں صرف اپنا چین و آرام مطلوب ہوتا ہے اور وہ اس مقصد کے حصول کے لیے ہر طرح کے جائز اور ناجائز ذرائع اختیار کر سکتے ہیں۔ نہیں، ایسا نہیں ہے۔ بلکہ ہر معاشرے کے اندر جہاں کچھ لوگ بد طینت اور اپنے مفاد کے بندے ہوتے ہیں وہیں کچھ لوگ نیک سیرت اور دوسروں کے خیر خواہ و ہمدرد بھی ہوتے ہیں۔ کوئی بھی انسانی معاشرہ ان دو گونہ عناصر سے خالی نہیں ہو سکتا۔ اس میں ایک گروہ کا کام تو یہ ہوتا ہے کہ وہ الٹی سمت میں سفر کرے۔ اس کی یہ سرشت بن چکی ہوتی ہے کہ اپنا ہر قدم مطلوبہ راستے کے خلاف ہی اٹھائے۔ وہ اپنے ضمیر کو اس قدر مردہ کر چکا ہوتا ہے کہ مصالحِ کلیہ کی خلاف ورزی اس کی فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہے۔ وہ اس مرحلے میں داخل ہو چکا ہوتا ہے جہاں زیاں کے ساتھ احساسِ زیاں بھی ختم ہو چکا ہوتا ہے لیکن اس کا دوسرا عنصر اس کے برخلاف خیر پسند واقع ہوتا ہے۔ وہ معاشرے کے مصالح کا خیال رکھتا ہے۔ اپنا ہر قدم مطلوبہ راستے ہی پر ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسروں کے مفاد کو اپنے مفاد پر ترجیح دینے کا رجحان رکھتا ہے۔ بسا اوقات دوسروں کے آرام و سکون کے لیے اپنے سکون و چین سے دست بردار ہو جاتا ہے۔ بحیثیت مجموعی اس کا وجود معاشرے کے لیے فلاح و بہتری کا سبب ہوتا ہے۔ اور بجا طور پر اس سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ اگر صحیح سمت میں اس کی رہنمائی کر دی گئی تو وہ ایک صالح سماج کو جنم دے گا اور تمدن کی گاڑی کو مطلوبہ سمت میں اطمینان بخش طریقے پر آگے بڑھا سکے گا۔

لیکن اس حقیقت کے باوجود کہ معاشرے کے اندر یہ دونوں ہی عناصر موجود رہتے ہیں۔ گوناگوں اسباب کی بنا پر پہلا عنصر زیادہ مؤثر اور غالب ہوجاتا ہے اور اسے برابر تباہی اور ہلاکت کی سمت میں آگے بڑھاتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اسے انتشار اور کش مکش کے اس مرحلے پر پہنچا دیتا ہے کہ اگر ہدایت ورہنمائی اس کا تعاون نہ کرے تو معاشرے کے اندر ٹکراؤ پیدا ہوجائے اور اس ٹکراؤ کے نتیجے میں وہ پاش پاش ہوجائے

اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ کسی بھی معاشرے کو زندہ برقرار رہنے اور نہ صرف زندہ برقرار رہنے بلکہ اسے پروان چڑھنے اور پیہم ترقی کی منازل طے کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے پاس ایک ایسی ہدایت ہو جو ایک طرف اس کے بدباطن اور بیمار عنصر کو بیخ وبن سے اکھاڑ سکے اور اس طرح معاشرے کو اس کے ہلاکت آمیز اثرات سے محفوظ رکھ سکے اور دوسری طرف اس کے صالح عنصر کے اندر جو کمی رہ گئی ہے اسے پورا کرسکے اور اس طرح معاشرے کی ترقی اور اس کی خوش حالی کا سامان فراہم کرسکے۔ ایک معاشرے کے لیے ہدایت کی اس اہمیت کے پیش نظر پوری انسانیت اور پورے تمدن کی ضرورت کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے جب ایک چھوٹا سا معاشرہ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ یا کم از کم صحت مند زندگی نہیں گزار سکتا۔ تو پوری انسانیت اور پورے تمدن کے لیے اس کی جو اہمیت ہوگی وہ بالکل واضح ہے۔

ہدایت کی اس اہمیت اور ناگزیریت کو جان لینے کے بعد آئیے اب ہم غور کریں کہ یہ ہدایت ہمیں کن ذرائع سے حاصل ہوسکتی ہے۔ لیکن اس موضوع پر غور کرنے سے پہلے ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ہدایت صحیح معنوں میں چند گنے بندھے قوانین کے مجموعے کا نام نہیں ہے جو انسانی فطرت کی گہرائیوں میں کوئی بنیاد نہ رکھتا ہو کا اس طرح کی نام نہاد ہدایت کی تیاری جو صرف چند اوامر و نواہی پر مشتمل ہو چنداں مشکل نہیں لیکن جیسا کہ تجربہ شاہد ہے اس طرح کی ہدایت معاشرے کی فلاح وبہبود اور اس کی تعمیر وترقی میں کوئی قابل قدر رول ادا نہیں کرسکتے۔ لا اینڈ آرڈر کی لمبی چوڑی دفعات دفاتر میں بند رہتی ہیں اور انسانی معاشرہ اپنی مرضی کے مطابق چلتا اور ہلاکت و تباہی کی دہلیز کی طرف مسلسل آگے بڑھتا رہتا ہے۔ اس لیے ہدایت سے مراد ایک ایسا ہم آہنگ اور متوازن نظام زندگی (System of life) ہے جو انسانیت کے ہمہ گیر مسائل کو پوری

خوبی اور توازن کے ساتھ عمل کرتا ہو۔ یا یہ طور کہ اپنے نفاذ کے لیے خارجی دباؤ کے ساتھ انسانی فطرت میں گہری بنیادیں بھی رکھتا ہو کہ اس داخلی قوت نافذہ کے بغیر اچھی سے اچھی ہدایت بھی معاشرے کے اندر کوئی قابل قدر خدمت انجام نہیں دے سکتی۔ اس سلسلے میں ہم جب غور کرتے ہیں تو چار چیزیں ابھر کر ہمارے سامنے آتی ہیں جن سے ہم اس طرح کی ہدایت کے اخذ کرنے کی توقع کر سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں جنھیں ہم اخذ ہدایت کے امکانی ذرائع کا نام دے سکتے ہیں اور وہ یہ ہیں۔

۱۔ عقل۔ ۲۔ وجدان۔ ۳۔ تجربہ۔ ۴۔ وحی الٰہی

۱۔ عقل۔ اس تعلق سے سب سے پہلے جو چیز ہمارے سامنے ابھر کر آتی ہے وہ عقل ہے۔ یقیناً عقل کو انسانی زندگی میں کلیدی مقام حاصل ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو اسے دنیا کی تمام مخلوقات کے مقابلے میں امتیاز بخشتی ہے۔ اس سے محروم ہو جانے کے بعد انسان اپنے وجود کی معنویت ہی کھو بیٹھتا ہے۔ کسی بھی چیز کے متعلق فیصلہ کرنے کے لیے کہ آیا وہ اچھی ہے یا خراب، مفید ہے یا مضر یا کچھ پہلو افادیت کے ہیں اور کچھ مضرت کے ہمیں عقل ہی کی مدد سے کام لینا پڑتا ہے۔ اپنی انفرادی زندگی سے لیکر اجتماعی اور سیاسی زندگی کے جملہ مسائل کے حل کے لیے ہمیں عقل ہی کے دروازے پر دستک دینی پڑتی ہے۔ چنانچہ ہر دور میں دنیا کے تمام انسانوں نے اس کی اس اہمیت کو برابر تسلیم کیا ہے۔ ایک عام انسان اسے عقل ہی کے عمومی نام سے یاد کرتا ہے اور ایک فلسفی اسے نفس ملکی اور نفس انسانی سے موسوم کرتا ہے۔ الفاظ کا اختلاف کچھ زیادہ معنویت نہیں رکھتا۔ اصل چیز دیکھنے کی یہ ہے کہ ہر انسان اس کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے اور ایسا کیوں نہ ہو جب کہ یہی اس کی تمام فکری صلاحیتوں کا مرکز ہے فکر و تخیل کا یہی وہ پاور ہاؤس ہے جس سے برابر وہ ایک نئی طاقت حاصل کرتا ہے۔

صرف عقل ہی کو اپنی اہمیت کا احساس نہیں ہے نقل بھی اس کی اس اہمیت کو برابر تسلیم کرتی آئی ہے۔ قرآن[1] و حدیث نے نہ صرف اس کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے بلکہ اس سے کام لینے کی برابر

---

[1] یہاں اور اسی طرح آگے بھی ہم نے قرآن اور اس کی تبعیت میں حدیث سے ضمنی طور پر استدلال کیا ہے سوال کیا جا سکتا ہے کہ ایسی صورت میں جبکہ اخذ ہدایت کے امکانی ذرائع میں سے کسی کی تعیین ہی نہ ہو سکی ہو قرآن و حدیث سے استدلال کیا معنے رکھتا ہے؟ اور اگر اس کا جواز نکلتا ہے تو دوسری آسمانی ہونے کی دعوے دار کتابوں کو اس ضمن میں شامل کیوں نہیں کیا گیا؟ پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ ان مقامات (باقی اگلے صفحہ پر)

ترغیب دی ہے۔ قرآن انسان کو مخاطب کرتے وقت اسے بار بار عقل سے کام لینے کی تلقین کرتا ہے
کسی بھی مسئلے کی طرف جب وہ اس کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہے تو سب سے پہلے اس کی عقل ہی کو
اپیل کرتا ہے۔ خدا کے وجود کی ناگزیریت اور اس کے مطلق اقتدار (Absolute authority)
نیز زندگی کے دوسرے حقائق کو ثابت کرنے کے سلسلے میں سب سے پہلے اس کا روئے خطاب عقل
ہی کی طرف ہوتا ہے۔ اولوا الالباب (صاحب عقل لوگ) اولوا الابصار (صاحب بصیرت) اور
لقوم یعقلون (سمجھ رکھنے والے لوگ) وغیرہ اس کی معروف اصطلاحات ہیں جنھیں وہ جگہ جگہ
استعمال کرتا ہے۔ خدا کی قدرت وعظمت کے دو مظاہر یعنی بجلی اور آسمان سے پانی برسانے اور اس
سے مردہ زمین کو زندہ کر دینے کو بیان کر دینے کے بعد وہ کہتا ہے کہ بلاشبہ اس کے اندر سمجھدار
لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (الروم ۲۴)
اسی طرح آسمان وزمین کی تخلیق اور اس کے دوسرے کارناموں کو بیان کرنے کے بعد وہ یہی
کہتا ہے کہ ان کے اندر صاحب عقل لوگوں کے لیے بے شمار نشانیاں ہیں۔ اگر وہ ان پر غور کریں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹) پر قرآن وحدیث سے ہمارے استدلال کی نوعیت ضمنی ہے، بنیادی نہیں
ہے۔ اصلاً ہمارے استدلال کی بنیاد عقل عام (Common sense) اور تجربہ ہے۔ دوسرے
یہ کہ قرآن دنیا کے اندر وہ واحد کتاب ہے جو اپنے لیے خدا کی طرف سے نازل ہونے والی آخری کتاب ہونے
کا دعوے کرتی ہے اور اس دعوے کی تصدیق کے لیے اپنے داخل اور خارج میں اتنے معقول اور باوزن
دلائل رکھتی ہے کہ کوئی انصاف پسند انسان اس پر سنجیدگی سے غور کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ نیز یہ بھی تنہا اسی کا
امتیاز ہے کہ تاریخی طور پر بھی وہ واحد کتاب ہے جو ہر طرح کی انسانی تحریف سے پاک ہے۔ کوئی خواہ اس
کے کتاب الٰہی ہونے کی تصدیق کرے یا نہ کرے لیکن اس حقیقت کے انکار کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اس امتیازی
وصف اور ترجیح کے ان پہلوؤں کے پیش نظر اسے کم سے کم یہ حق ملنا چاہیے کہ کسی مسئلے پر غور کرتے وقت اس سے
ضمنی طور پر استدلال کیا جا سکے اور بجا طور پر وہ اس کا مستحق قرار پاتا ہے کہ اسے جملہ آسمانی کتابوں کا نمائندہ تسلیم
کیا جائے۔ اور ظاہر ہے قرآن کی اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کے بعد، جسے تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں۔ حدیث خود
بخود اس دائرے میں شامل ہو جاتی ہے کہ اس ضمن میں ان دونوں کے درمیان کسی حد فاصل کا کھینچنا ایک
بالکل غیر منطقی بات ہوگی۔ (اصلاحی)

توخدا کے مطلق اقتدار کے قائل ہو جائیں اور اس کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک کرنے کی حماقت کا ارتکاب نہ کریں۔ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ ...... لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (البقرہ ۲:۱۶۴) ۔ خدا کے ساتھ اوروں کو شریک کرنے کے غیر منطقی اقدام کو ایک خوبصورت مثال کے ذریعے بے بنیاد ثابت کرنے کے بعد وہ کہتا ہے کہ ہم اسی طرح سمجھ دار لوگوں کے لیے اپنی آیتوں کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں ۔ کَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (الروم ۲۸) دنیا کی زندگی کو بچوں کے کھیل کود سے تعبیر کرنے اور اس طرح اس کی بے مائگی کو ظاہر کرنے اور اس کے مقابلے میں آخرت کی پائداری اور اس کی بہتری کا تذکرہ کرنے کے بعد وہ کہتا ہے کہ کیا تم غور نہیں کرتے کہ اگر ذرا بھی اپنی عقل کا استعمال کرو اور اس حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرو تو تمہیں تقوے کی روش اپنا کر آخرت کا انتخاب کرنے میں ذرا بھی تامل نہ ہوگا وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (الانعام ۳۲) چنانچہ جب کافروں کو جہنم میں ڈالا جائے گا اور ان سے جہنم پر مامور فرشتے سوال کریں گے کہ کیا آپ لوگوں کے پاس ڈرانے والے نبی نہیں آئے تھے کہ آپ ان کی دعوت کو قبول کر لیتے اور اس عذاب کے مستحق قرار نہ پاتے تو اپنے جواب میں وہ یہ کہیں گے کہ اگر صحیح معنوں میں ہم نے ان کی دعوت کو سنا اور اپنی عقل کا استعمال کیا ہوتا تو آج جہنمیوں میں نہ ہوتے ۔ وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِیْٓ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ (الملک ۱۰)

حدیث نبوی میں بھی عقل کی اس اہمیت کو بار ہا واضح کیا گیا ہے ۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے :-

دین المرء عقلہ ومن لا عقل لہ لا دین لہ (حجۃ اللہ البالغہ) — انسان کا دین اس کی عقل ہے اور جس کے پاس عقل نہیں اس کے پاس دین نہیں

ایک دوسری حدیث میں ہے :-

اَفْلَحَ مَنْ رُزِقَ لُبًّا (ایضاً) — کامیاب ہے وہ جسے عقل عطا کی گئی

اسی طرح ایک دوسری حدیث میں آتا ہے کہ سب سے پہلے اللہ نے عقل کو پیدا کیا ۔ پھر اس سے کہا کہ آگے بڑھ ۔ وہ آگے بڑھی ۔ پھر اس سے کہا پیچھے ہٹ ، پس وہ پیچھے ہٹ گئی ۔ تب اللہ تعالیٰ

[illegible] ہی بنیاد پر میں لوگوں کا مواخذہ کروں گا ۔ اول ماخلق الله تعالیٰ العقل فقال له: اقبل فاقبل وقال له: ادبر فادبر فقال: بك اواخذ[1] حجۃ اللہ البالغہ جلد دوم

قرآن وحدیث کی ان تصریحات سے نہ صرف یہ کہ عقل کی اہمیت وافادیت واضح ہوتی ہے بلکہ حقائق زندگی کے فہم اور فلاح آخرت کے حصول کے سلسلے میں اس سے استفادہ کی ترغیب بھی ملتی ہے۔ نیز یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قرآن وحدیث اصولی طور پر انسان کے لیے ہدایت فراہم کردینے اور زندگی سے تعلق رکھنے والے احکام کی ایک حد تک تفصیل کردینے کے بعد اس کی جامع تشکیل کرنے، تفصیلی روپ دینے اور زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ نت نئی بدلتی ضروریات کے لحاظ سے اخذ واستنباط کے ذریعے اسے حالات کے مطابق کرنے کے اہم کام کو بھی وہ عقل ہی کے سپرد کرتے ہیں۔ چنانچہ اسلامی شریعت میں قیاس واجتہاد کا ایک مستقل باب قائم ہے جو اسی استعمال عقل کا دوسرا نام ہے۔ یقیناً اس کے ذمے یہ اہم ذمہ داری سپرد کیے جانے سے بھی اس کی نمائندہ حیثیت کا اظہار ہوتا ہے۔

لیکن اس کی اس تمام تر اہمیت وافادیت کے باوجود اس پر بالکلیہ اعتماد نہیں کیا جاسکتا کہ اسے تنہا ہدایت سازی کا مجاز قرار دے دیا جائے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ عقل کو جو معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں وہ اس کی براہ راست اخذ کردہ نہیں ہوتیں۔ بلکہ وہ اپنی ساری معلومات کو حواس کے ذریعے حاصل کرتی ہے قطع نظر اس کے کہ حواس کا دائرہ بہت تنگ ہوتا ہے اور وہ ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ ان معلومات کی صحت وعدم صحت کا مدار اس پر ہوتا ہے کہ آیا حواس نے انہیں صحیح طور پر اخذ کیا ہے یا نہیں اور اگر صحیح طور پر اخذ کیا بھی تو اس تک ان کو صحیح طور پر پہنچایا یا نہیں۔ پھر بات یہیں نہیں ختم ہوجاتی۔ اگر حواس معلومات کو صحیح طور پر اخذ کریں اور پھر انہیں ٹھیک ٹھیک عقل تک پہنچا دیں جب بھی فیصلہ عقل پر نہیں چھوڑا جاسکتا اس لیے کہ کسی بھی چیز کے متعلق فیصلہ

---

[1] ان احادیث کے بارے میں شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ اگرچہ محدثین کے نزدیک ان احادیث میں کچھ ضعف ہے لیکن یہ مختلف سندوں سے مروی ہیں۔ اور اس طرح ان میں سے بعض سے بعض کی تقویت ہوجاتی ہے۔ شاہ صاحب کے الفاظ یہ ہیں:- وهذه الاحاديث وان كان لاهل الحديث في ثبوتها مقال، فان لها اسانيد يتقوى بعضها بعضا حجۃ اللہ البالغہ جلد دوم ص

کرنے میں عقل خود مختار نہیں ہوتی بلکہ جیسا کہ ہم آگے چل کر واضح کریں گے وہ وجدان کی پابند ہوتی ہے۔ انسان کے اندر اصل قوت محرکہ وجدان ہے جس کا تعلق قلب سے ہوتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح عقل کا تعلق دماغ سے ہوتا ہے۔ اصل محرک وجدان فراہم کرتا ہے عقل صرف اس کا آلۂ کار ہوتی ہے۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ بسا اوقات انسان کو ایک چیز کی افادیت پوری طرح معلوم ہوتی ہے لیکن پھر بھی وہ اسے انجام نہیں دیتا۔ اس کے برخلاف اسے ایک چیز کی مضرت کا پورا یقین ہوتا ہے پھر بھی وہ اسے کر ڈالتا ہے۔ ان دونوں ہی صورتوں میں اس کا اقدام عقل کے فیصلے کے برعکس ہوتا ہے لیکن ایسا کرکے وہ اس سے ایک بلند تر شے وجدان کے تقاضے کا جواب دے رہا ہوتا ہے۔

پھر بھی اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے عقل کو ہدایت سازی کا مجاز مان بھی لیں جب بھی بہت سے سوالات حل طلب باقی رہ جاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کن لوگوں کی عقلیں ہدایت سازی کی مجاز ہوں گی۔ کیا ان کا تعلق کسی خاص زمانے سے ہوگا؟ اگر ایسا ہے تو بعد کے لوگ اس حق سے کیوں محروم کر دیے جائیں؟ یا ایسے لوگ ہر زمانے میں ہوں گے؟ اور اگر ایسا ہے تو پھر ان کی تعیین کون کرے گا؟ اگر ان میں سے بعض کو بعض پر ترجیح دی جاتی ہے تو اس کے جواز کے لیے بھی دلیل چاہیے۔ عقل و منطق ہی کا تقاضا ہے کہ کسی کو کسی پر بغیر مرجح کے ترجیح نہ دی جائے۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کی بنائی ہوئی ہدایت ہمیشہ کے لیے ہوگی یا صرف کسی خاص زمانے کے لیے ہوگی۔ پہلی صورت میں بعد کے زمانے کے لوگوں کو اس کی پابندی کے لیے کس دلیل سے مجبور کیا جائے گا۔ دوسری صورت میں اس کی پابندی کا دائرہ کتنا وسیع ہوگا۔ تمام انسانوں کے لیے ہوگا یا کچھ لوگ اس سے مستثنیٰ ہوں گے۔ بہرحال عقل کو ہدایت سازی کا مجاز مان لینے کے بعد بھی بیا دراس طرح اور بہت سے سوالات حل طلب باقی رہ جاتے ہیں اور ظاہر ہے جب تک ان کا جواب نہ دے لیا جائے اس وقت تک عقل کو اس منصب پر فائز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ پھر یہ بات اس پر مستزاد ہے کہ اس طرح کی ہدایت کے لیے انسانی فطرت میں کون سی جگہ ہوگی۔ وہ کون سا جذبہ ہوگا جو اسے اس کی پابندی کے لیے اکسائے گا اور اس کے لیے برابر آمادہ رکھے گا۔ اس لیے کہ یہ بات بہت واضح ہے کہ کوئی بھی ایسی ہدایت یا قانون جس کی جڑیں انسانی فطرت کی گہرائی میں بہت دور

تک آزمی ہوئی نہ ہوں انسانی دنیا میں کوئی مؤثر رول ادا نہیں کرسکتا۔ ماضی کی تاریخ اس پر شاہد ہے اور حال اس کی شہادت دے رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ اگرچہ عقل انسان کا ایک بڑا قیمتی سرمایہ ہے، اسے انسانی زندگی میں بڑا مقام حاصل ہے۔ کوئی بھی انسان اس سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ اور وہی اپنے لیے ہدایت کو تفصیلی روپ دینے میں اس سے صرف نظر کرسکتا ہے۔ لیکن اپنی ان کوتاہ دستیوں اور اپنے ساتھ ان نقائص کے ہوتے ہوئے جن کا اوپر تذکرہ کیا گیا وہ تنہا انسان کے لیے ایسی جامع اور متوازن ہدایت فراہم نہیں کرسکتی جو ایک طرف انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں میں اس کی رہنمائی کرسکے۔ نیز اس کی نت نئی بدلتی ضروریات کا ساتھ دے سکے اور دوسری طرف خارجی دباؤ کے ساتھ ساتھ اپنے نفاذ کے لیے انسانی فطرت میں گہری بنیادیں بھی رکھتی ہو کہ اس وصف سے محروم ہو جانے کے بعد ہدایت کا لفظ اپنی معنویت ہی کھو بیٹھتا ہے۔

۲۔ وجدان

اخذ ہدایت کے امکانی ذرائع کی تلاش میں دوسری چیز جو ہمارے سامنے آتی ہے وہ وجدان ہے۔ یقیناً وجدان ہماری زندگی میں بڑا بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ عقل حواس کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں کسی چیز کے صحیح یا غلط، مفید یا مضر، مناسب یا نامناسب ہونے کا فیصلہ دے دیتی ہے لیکن آیا انسان اس کو کرے یا نہ کرے، اسے انجام دے یا اس سے کنارہ کش رہے اس کا دار و مدار سر تا سر وجدان پر ہوتا ہے۔ اس لیے کہ وجدان کا تعلق قلب سے ہوتا ہے جس طرح کہ عقل کا تعلق دماغ سے ہوتا ہے۔ اور ہمیں یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ یہی وہ واحد قوت ہے جو انسان کے اندر محرک فراہم کرتی ہے۔ یہ اگر کسی کام کے کرنے پر آمادہ ہو جائے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے روک نہیں سکتی اور اس کے برخلاف اگر کسی کام سے باز رہنے کا فیصلہ کرے تو کسی بھی طریقے سے اسے اس کے کرنے کے لیے مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ اوپری دباؤ یا خارجی اثرات سے ایک انسان کو کسی کام کے کرنے یا کسی کام سے باز رہنے کے لیے کچھ دیر کے لیے تو مجبور کیا جاسکتا ہے لیکن اس کے دل کو کسی خارجی طاقت کے ذریعے فتح نہیں کیا جاسکتا۔ وجدان کے مستقر قلب کی یہی غیر معمولی طاقت ہے جس کے پیش نظر فلسفی اسے "نفس سبعی" کا نام دیتا ہے اور اس کی یہی عظمت و بلندی ہے جسے دیکھ کر صوفیا اسے "روح" سے تعبیر کرتے ہیں اور بجا طور پر یہ اس کا مستحق ہے

کہ یہی ہمارے جملہ مثبت اور منفی جذبات و احساسات کا مرکز ہے۔ یہیں سے ہمارے جذبات اٹھتے اور اسی سے اپنی راہ عمل تلاش کرتے ہیں۔

یہ تو تھا عقل کا فیصلہ لیکن نقل بھی اس کی اس اہمیت کے اعتراف سے غافل نہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن و حدیث قلب کو بنیادی اہمیت کا حامل قرار دیتے ہیں اور کیوں نہ ہو جبکہ یہی پورے جسم کا امیر کارواں ہے۔ اگر دل کی دنیا بدل دی جائے تو کرنے کا کوئی کام ہی باقی نہیں رہ جاتا۔ قرآن انسان کو خطاب کرتے وقت سب سے پہلے اسے آگاہی دیتا ہے کہ اس سے صرف وہی لوگ یاد دہانی حاصل کر سکیں گے جن کے دل زندہ ہوں گے اور اسی کے نتیجے میں وہ اسے کان لگا کے سنتے ہوں گے۔ یقیناً قرآن حقائق سے لبریز کتاب ہے اور غافل انسان کو جگا دینے کے لیے بالکل کافی ہے لیکن جو لوگ اپنی اس متاع گراں بہا ہی کو کھو چکے ہوں وہ اس سے ذرا بھی فائدہ نہ اٹھا سکیں گے

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَھُوَ شَہِیْدٌ (ق ۳۷)

لَھُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَھُوْنَ بِھَا وَلَھُمْ	ان کے دل ہیں لیکن ان سے سمجھتے نہیں
اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِھَا وَلَھُمْ اٰذَانٌ	اور ان کی آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں اور
لَّا یَسْمَعُوْنَ بِھَا اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ	ان کے کان ہیں مگر ان سے سنتے نہیں۔ یہ لوگ
بَلْ ھُمْ اَضَلُّ (الاعراف ۱۷۹)	چارپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے

اور جو لوگ دل سے کام لینے کی صلاحیت کو بالکل ہی مردہ کر چکے ہوتے ہیں۔ ان کے اندر زندگی کی ذرا بھی رمق باقی نہیں رہ جاتی، ان کے دلوں کو وہ پتھر سے تشبیہ دیتا ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت قرار دیتا ہے کہ بسا اوقات پتھر بھی پسیج جاتا ہے اور اس سے پانی پھوٹ بہتا ہے۔ لیکن ان کے دل ہیں کہ پسیجنے کا نام نہیں لیتے۔ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُکُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِکَ فَھِیَ کَالْحِجَارَۃِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَۃً وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَۃِ لَمَا یَتَفَجَّرُ مِنْہُ الْاَنْھٰرُ وَاِنَّ مِنْھَا لَمَا یَشَّقَّقُ فَیَخْرُجُ مِنْہُ الْمَآءُ (البقرہ ۷۴)

چنانچہ وہ ان کے بارے میں کہتا ہے کہ یہ اس مرحلے میں داخل ہو جاتے ہیں جہاں خدا ان کے دلوں پر مہر کر دیتا ہے۔ بس وہ سننے اور دیکھنے کی صلاحیت سے بالکل محروم ہو جاتے ہیں۔ خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ وَعَلٰی اَبْصَارِھِمْ غِشَاوَۃٌ۔ (البقرہ: ۷)

اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے دلوں پر پردہ ڈال دیتا ہے کہ وہ حق بات کو سمجھ ہی نہیں سکتے اور کانوں کو بہرا کر دیتا ہے۔ وَجَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا (الانعام ۲۵) ایک بندہ مومن اس بھیانک عذاب کے تصور سے ہمیشہ کانپتا رہتا ہے۔ وہ بارگاہِ ایزدی میں ہمیشہ دست بدعا ہوتا ہے کہ اے اللہ! تیری ہدایت پا لینے کے بعد ہمارے دل سخت نہ ہونے پائیں اور تو ہمیشہ ہمیں اپنی رحمت سے نوازتا رہ۔ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً (آل عمران)
حدیث نبوی بھی قلب کی اس اہمیت کا برا اعتراف کرتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:۔

الا وان فی الجسد مضغۃ	سنو! جسم کے اندر گوشت کا ایک
اذا صلحت صلح الجسد کلہ واذا	ٹکڑا ہے جب وہ صالح ہو گا تو پورا جسم
فسدت فسد الجسد کلہٗ	صالح ہو گا اور اگر اس کے اندر فساد
الا وھی القلب	آجائے تو پورے جسم کے اندر فساد برپا
(بخاری کتاب الایمان باب فضل من استبرأ لدینہ)	ہو جائے گا سنو اور وہ قلب ہے۔

ایک دوسری حدیث سے بھی اس کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

عن ابی ھریرۃ قال قال	جب مومن گناہ کرتا ہے تو اس کے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	دل میں ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے پس
ان المومن اذا اذنب کانت نکتۃ	اگر وہ اللہ تعالیٰ سے توبہ کرے اور اپنے
سوداء فی قلبہ فان تاب استغفر	گناہ کی معافی مانگ لے تو اس کا دل
صقل قلبہ وان زاد زادت	صاف ہو جاتا ہے لیکن اگر وہ مزید گناہ
حتی تعلو قلبہ فذلکم الران	کرتا جاتا ہے تو اس کے دل کی سیاہی
الذی ذکر اللہ تعالیٰ کلا	بھی بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ اس
بل ران علی قلوبھم ما	پر بالکل چھا جاتی ہے اور یہی وہ ران
کانوا یکسبون	(میل) ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا

ہے۔ کلا بل ران ...... الخ (مشکوٰۃ المصابیح باب الاستغفار والتوبۃ)

قرآن و حدیث کی یہ تصریحات بھی قلب کی اس اہمیت کی پردہ کشائی کے لیے کافی ہیں لیکن اس کی اس اہمیت کا اعتراف کر لینے کے بعد ہم اخذ ہدایت کے سلسلے میں اس پر بالکلیہ اعتماد نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ یہ بھی اپنے فیصلے میں خود مختار نہیں ہے۔ بلکہ انسان کی ایک دوسری قوت یعنی نفس کا تابع ہے اور بسا اوقات اسے اس کے حق میں اپنی آزادی سے دستبردار ہو جانا پڑتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ قلب کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کے سلسلے میں اپنا فیصلہ دے دیتا ہے لیکن نفس کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اسے واپس لے لیتا ہے۔ نفس انسان کے اندر ایک بڑی زبردست قوت ہے جو اکثر و بیشتر اسے اپنے فیصلے کے مطابق عمل کرنے کے لیے مجبور کر دیتی ہے۔ اور ہمیں معلوم ہے کہ اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک اسے بھلائی کا حکم دیتی ہے اور برائی سے باز رہنے کی تلقین کرتی ہے جسے ہم نفس لوامہ کہتے ہیں اور دوسری برائی کا حکم دیتی اور بھلائی سے دور رہنے کی ترغیب دیتی ہے اور اسے ہم نفس امارہ کا نام دیتے ہیں۔ یہ بات کہ نفس کے اندر دونوں ہی صلاحیتیں ہیں کہ وہ اگر چاہے تو بھلائی کا راستہ اپنائے اور اگر چاہے تو برائی کی راہ اپنائے قرآن بھی اس کا اعتراف کرتا ہے چنانچہ وہ کہتا ہے کہ نفس کے اندر فجور اور تقویٰ دونوں ہی کے اختیار کرنے کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا (الشمس ۷-۸) نفس کی یہی دوگونہ صلاحیت ہے جس کے پیش نظر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے انسان کو بھلے اور برے دونوں ہی راستے دکھا دیے ہیں وہ جس راستے کو چاہے اپنا سکتا ہے۔ وھدینٰہ النجدین (البلد ۱۰) اس کی یہی قوت ہے جو ایک انسان کو اللہ تعالیٰ کا شکر گذار اور دوسرے کو احسان فراموش بنا دیتی ہے۔ وَهَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا (الدہر ۳) حدیث شریف کے اندر بھی نفس کی اس صلاحیت کو بیان کر دیا گیا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

النفس تمنی وتشتھی	نفس تمنا کرتا ہے اور اس کے اندر خواہش
والفرج یصدق ذلک ویکذبہ	پیدا ہوتی ہے پھر شرمگاہ یا تو اسے
(حجۃ اللہ البالغہ جلد دوم صفحہ ...)	پورا کر ڈالتی ہے یا اسے جھٹلا دیتی ہے

ایک دوسری حدیث میں ایک مثال کے ذریعے قلب کی اس کمزوری کو واضح کر دیا گیا ہے جو

نفس کے ساتھ لگ جانے کے سبب اس کے اندر پیدا ہوگئی ہے۔ آپ نے اسے پرندے کے اس گرے ہوئے پر سے تشبیہ دی ہے جسے ہوائیں نیچے سے اوپر پلٹتی رہتی ہیں۔ مثل القلب کریشۃ فی فلاۃ تقلبہا الریاح ظہرا لبطن (ایضاً) یہ ہوائیں جو قلب کو نیچے اوپر پلٹتی رہتی ہیں، یہ نفس نہیں تو اور کون ہے؟

عقل ونقل کی ان تصریحات کی روشنی میں جو قلب کی اہمیت اور جسم انسانی میں اس کے بنیادی کردار کے سلسلے میں پیچھے گذر چکی ہیں۔ ہم اس کی اہمیت کا انکار نہیں کرسکتے لیکن اس کمزوری کے پیش نظر جو نفس کے اس کے ساتھ لگ جانے کے سبب اس کے اندر پیدا ہوگئی ہے ہم اس پر بالکلیہ اعتماد بھی نہیں کرسکتے۔ اور اسی لیے ہم اس سے پیدا ہونے والی قوت یعنی وجدان سے کسی ایسی ہدایت کی توقع بھی نہیں کرسکتے جو مکمل اعتدال پر مبنی ہو اور ہر طرح کے افراط وتفریط سے پاک ہو۔ بدیہی طور پر جو ہدایت بھی صرف وجدان پر اعتماد کرکے بنائی جائے گی اعتدال وتوازن سے محروم ہوگی۔ افراط وتفریط اس کے لازمی عناصر ہوں گے۔ معلوم ہوا کہ وجدان بھی ہمارے لیے اعتدال وتوازن سے محروم ہدایت تو دے سکتا ہے لیکن وہ ہمیں کوئی ایسی متوازن اور ہم آہنگ ہدایت فراہم نہیں کرسکتا جو بے لاگ انصاف پر مبنی ہو اور پوری انسانیت کے زخم کا مداوا بن سکے۔ جو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے ہو اور اس کی نت نئی بدلتی ضروریات اور تغیر پذیر زمانے کا بھی ساتھ دے سکے۔ اس پر اس بات کا اضافہ کرلیجیے کہ وجدان کی اس عطا کردہ ہدایت کے لیے انسان کے اندر وہ کون سا داعیہ ہوگا جو برابر اسے اس کی تعمیل کے لیے آمادہ کرتا رہے گا جب کہ یہ معلوم ہے کہ اس داعیہ کے بغیر کوئی ہدایت صحیح معنوں میں اپنا فریضۂ منصبی انجام نہیں دے سکتی لیکن بفرض محال اگر ہم وجدان کو ہدایت سازی کا مجاز مان لیں تو بھی وہ تمام سوالات حل طلب باقی رہ جاتے ہیں جنھیں ہم عقل کے سلسلے میں پیش کرچکے ہیں اور ظاہر ہے جب تک وہ حل نہیں ہو جاتے اس وقت تک کسی کے لیے ہدایت سازی کا جواز کہاں سے فراہم کیا جاسکتا ہے؟

سید جمال الدین افغانی

(سلیم فاروقی کراچی)

جمال الدین افغانی کا شمار دنیا کی ان عظیم الشان ہستیوں میں ہوتا ہے کہ جو دنیا کے مال و منال کے لیے نہیں جیتیں وہ اپنے علم و تدبر سے دنیا کی لذتیں اور راحتیں نہیں خریدتیں بلکہ ان کا کوئی نصب العین ہوتا ہے۔ کچھ مقاصد زندگی ہوتے ہیں۔ سید صاحب ایک مجاہدانہ عزم اور حریت پسند طبیعت لیکر اٹھے۔ ان کا دل اسلام کی محبت اور مسلمانوں کی زبوں حالی سے آزردہ تھا۔ وہ دنیا کی دوسری قوموں کو ترقی کے میدان میں رواں دواں دیکھ رہے تھے اس لیے یہ ان کی دلی تمنا تھی کہ مسلمان بھی عروج و ترقی حاصل کریں۔ لہذا انھوں نے علوم حاضرہ کی روشنی میں اسلامی فکر کو پیش کیا وہ دنیا کے جن جن ممالک میں گئے اپنے افکار و خیالات کو قرآن و سنت کی روشنی میں پیش کیا انہیں یہ یقین واثق تھا کہ بنی نوع انسان کی دینی اور دنیاوی فلاح و بہبود کا دار و مدار قرآنی فکر میں مضمر ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ وہ اسلام کا پیغام لیکر مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے اٹھے تھے، مسلمانوں نے اسلام کے نام پر ان کی مخالفت کی

سید جمال الدین افغانی کہاں پیدا ہوئے اس سلسلے میں ان کے تذکرہ نگاروں کے بیانات مختلف ہیں۔ سید حسن تقی زادہ لکھتے ہیں:۔

تاریخ زندگانی او اوائل عمرش روشن	ان کی ابتدائی زندگی کی تاریخ واضح
نیست دو روایت مختلفہ کہ ہر دو دلائل و	نہیں ہے۔ ان کے وطن، جائے پیدائش
قرائن قوی دارد، وطن و مولد منشا او	اور نشو و نما کے بارے میں دو مختلف روایتیں
ہست۔ یکے روایت افغانی بودن و دیگر	ہیں اور ہر روایت کے حق میں کچھ دلائل و

بودن و مناصب بزرگ افغانستان ۱۲ طے کردن و دیگرے بودن او ست از اہالی اسد آباد ہمدان و تحصیل او در ہمدان و قزوین و اصفہان مشہد مشار الیہ در حدود ۱۲۵۴ھ مطابق ۱۸۳۸ء میلادی متولد شدہ

قرائن موجود ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ وہ افغانی تھے، ہندوستان میں بھی رہے اور حکومت افغانستان کے بڑے بڑے عہدے اور مناصب انہیں حاصل ہوئے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ وہ اسد آباد ہمدان کے باشندے تھے۔ ہمدان، قزوین، اصفہان میں تحصیل علم کی اور ۱۲۵۴ ہجری مطابق ۱۸۳۸ عیسوی کے لگ بھگ پیدا ہوئے

مولانا ظفر علی خاں لکھتے ہیں :۔

سید محمد جمال الدین افغانی موضع اسد آباد میں کنار کہ متصل مضافات کابل سے ہے سنہ ۱۲۵۴ھ م ۱۸۳۹ء میں پیدا ہوئے۔

مؤرخ ام قری لکھتے ہیں :۔

• ۱۸۳۹ء میں افغانستان کے مشہور شہر کونان میں پیدا ہوئے۔

عبد المجید سالک اپنی کتاب 'اسلام اور تحریک تجدد مصر' کے حاشیے میں لکھتے ہیں :۔

"ایرانی ماخذ مظہر ہے کہ آپ ایران میں ہمدان کے نزدیک اسی نام کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔

سید جمال الدین افغانی کے والد کا نام سید صفدر تھا۔ سید صفدر حسینی سید تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب سید علی ترمذی کی وساطت سے امام عالی مقام حضرت سیدنا حسین رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔

سید صفدر مرحوم کے معاشی حالات اچھے نہ تھے۔ ان کی تعلیم بھی زیادہ نہ تھی لیکن یہ ان کی دلی تمنا تھی کہ ان کا بیٹا پڑھ لکھ کر دنیا میں نام پیدا کرے۔ اس لیے انہیں اپنے بیٹے جمال الدین کی معقول تعلیم و تربیت کی ہر وقت فکر لگی رہتی۔ جمال الدین افغانی نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی۔ بعد ازاں وہ علوم دینیہ کی تحصیل کے لیے باہر گئے اور تقریباً ۱۸ سال کی عمر میں جملہ علوم مثلاً فلسفہ، منطق، ریاضی، علم ہیئت، طب، مابعد الطبیعیات، علم اللسان، بلاغت، تاریخ، تصوف، الٰہیات

دا رت بھی ملا انھوں نے یہاں سے نکل کر چلا جانا ہی میں مصلحت سمجھا۔ لاخر وہ خفات سے ریاست کے بہانے کابل سے نکلے اور سیدھے ہندوستان آئے۔ اہل ہند سید صاحب سے بخوبی واقف تھے اس لیے انھوں نے آپ کی بہت پذیرائی کی اور حکومت ہند نے بھی آپ کی آمد پر کوئی اعتراض نہ کیا لیکن چونکہ وہ ان کی سیاسی سرگرمیوں سے اچھی طرح واقف تھی لہذا اس کی تاکید کی کہ سید صاحب سیاست میں کوئی حصہ نہ لے سکتے تھے۔ اس پابندی سے سید صاحب کی طبیعت بہت جلد اچاٹ ہوگئی اور وہ ہندوستان سے مصر چلے گئے اور قاہرہ میں قیام پذیر ہوئے۔ قاہرہ میں آپ کا زیادہ تر وقت جامعہ ازہر میں گذرتا۔ جہاں وہ اساتذہ سے سیاسی اور مذہبی امور پر تبادلۂ خیالات کرتے اور طلبا سید صاحب سے اکتساب فیض کرتے لیکن یہاں کا ماحول بھی سید صاحب کی دعوت کے لیے سازگار ثابت نہ ہوا۔ انھوں نے یہاں صرف چالیس دن قیام کیا۔ قاہرہ سے سید صاحب قسطنطنیہ آئے۔ یہاں انہیں قیام کا کافی طویل موقع ملا۔ انھوں نے اپنے خیالات پھیلانا شروع کیے۔ ان کے افکار و خیالات سے عوام و خواص سب متاثر ہوئے۔ اور آہستہ آہستہ ان کے گرد جمع ہوتے گئے۔ سید صاحب ترکی زبان پر قدرت رکھتے تھے اسی کو انھوں نے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور اس میں انہیں بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ اس زمانے میں دولت عثمانیہ کے عوام بھی علمی اور فکری سطح پر انحطاط پذیر تھے۔ فرنگی خیالات نے ان کے سوچنے سمجھنے کا انداز بدل دیا تھا۔ نیز ملوکانہ زندگی سے عوام و خواص دونوں کی حیات اجتماعی، معاشرتی زندگی اور خیالات متاثر ہو رہے تھے سید صاحب کی نگاہ دوربیں اس کے نتائج دیکھ رہی تھی۔ انھوں نے قوم کو اس کے خطرات سے خبردار کرنا شروع کیا۔ انھوں نے کہا۔

"اقوام عالم کے لیے انگریز ایک گھن ہے جو اپنی کمزوری کے باوصف نظام جسمانی کو کھوکھلا اور صحت کو برباد کر دیتا ہے"

سید صاحب کی شخصیت سوز و ساز رومی اور پیچ و تاب رازی کا مجموعہ تھی۔ قومی درمندی اسلامی حمیت اور اخلاص و للہیت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ان کی تقریروں میں فکری بلندی اور تعمیری جذبہ بدرجہ اتم موجود تھا۔ چنانچہ دولت عثمانیہ کے ارباب نقد و نظر اور قوم کی بے کسی کا احساس رکھنے والے آپ کا دایاں بازو بن گئے۔ انھوں نے یہاں کی مشہور انجمن "دانش" کا آپ کو

رکن بنادیا اس زمانے میں دارالفنون یعنی عثمانی یونیورسٹی کے رئیس تحسین آفندی تھے۔ انھوں نے علمار اور عمائدین شہر کی جانب سے یہ فرمائش کی کہ وہ ترکی زبان میں 'فنون صنائع' کی تحصیل پر لکچر دیں چونکہ ملکی سطح پر یہاں کے حالات بہتر نہ تھے اس لیے سید صاحب نے اس سے گریز کیا لیکن ان کے اشتیاق فراواں اور اصرار شدید پر لکچر دینے کا وعدہ کرلیا حسن فہمی دولت عثمانیہ کے شیخ الاسلام تھے وہ غائبانہ طور پر سید صاحب سے واقف تھے جب انھوں نے سید صاحب کا شہرہ سنا تو انھیں بڑی تشویش ہوئی کہ اگر عوام وخواص پر جمال الدین افغانی نے اپنا اثر جما لیا تو دو کا پھیکی پڑجائے گی۔ چنانچہ انھوں نے سید صاحب کی گرفت کرنے کی ترکیبیں کرنا شروع کیں۔ سیحین تقی زادہ فرماتے ہیں:۔

شیخ الاسلام پے فرصت می گشت کہ
حربہ مخصوص خود راکہ ہزار سال بایں طرف
زہر مخصوص ایں گونہ حشرات سامہ والتے
مدافعہ آنہا برضد علمائی حقیقی ودانشمندان
بودہ، استعمال کند یعنی با تکفیر حریف خود را
ازمیان درکند

شیخ الاسلام اس تاک میں تھے کہ ان
کے خلاف اپنا وہ حربہ استعمال کریں جو ہزار
سال سے حقیقی علمار اور دانشمندوں کے
خلاف استعمال کیا جاتا رہا ہے یعنی کافر
قرار دے کر اپنے حریف کو میدان سے
ہٹادیں۔

اس کام میں شیخ الاسلام کے ہواخواہوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور سید صاحب کو بدنام کرنے کے لیے ایک خاص اسکیم تیار کرلی۔ سید صاحب وقت مقررہ پر تقریر کرنے آئے۔ اس تقریر میں انھوں نے اپنے جن خیالات کا اظہار کیا ان کا خلاصہ مولانا ظفر علی خاں کے الفاظ میں یہ تھا۔

سید صاحب نے اپنی تقریر میں نظام تمدن کو ایک زندہ ومتحرک جسم ذوی الاعضا سے تشبیہ دے کر بیان کیا تھا کہ اس جسم کے اعضار مختلف حرفے اور پیشے ہیں۔ مثلاً بادشاہ اگر دماغ ہے تو لوہار ہاتھ ہیں کاشتکار جگر ہیں، ملاح پاؤں ہیں۔ اس تمہید کے بعد سید صاحب نے کہا کہ انسانی جماعت کی ہیئت ترکیبی کا بھی یہی حال ہے لیکن جسم بغیر روح کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ انسانی جماعت کے جسم کی روح ملکہ نبوت ہے یا ملکہ فلسفہ۔ اگرچہ ان دونوں میں بھی یہ امر ما بہ الامتیاز ہے کہ نبوت ایک انعام مذہبی ہے جو کوشش سے ہاتھ نہیں آتا بلکہ اس شخص کو ملتا ہے جسے جناب باری کی عنایت خاص اس کا مستحق خیال کرے اور

دوسرا ملکہ یعنی فلسفیانہ قوت اکتسابی ہے جو غور و فکر اور مشاہدہ و تجربے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ان ملکات دوگانہ میں یہ فرق بھی ہے کہ پیغمبر غیر خاطی ہوتا ہے حالانکہ فلسفی گمراہ ہو سکتا ہے اور اس سے خطا سرزد ہو سکتی ہے۔

شیخ الاسلام موقع کے منتظر تھے۔ اس تقریر میں انھوں نے اپنے مطلب کی بات پالی اور لوگوں میں یہ مشہور کر دیا کہ سید جمال الدین افغانی نے مقام رسالت مآب کی توہین کی ہے۔ وہ رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو سیاسی شاطر کہتے ہیں۔ اس تاویل پر ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ تقی زادہ صاحب فرماتے ہیں:۔

شیخ الاسلام ازیں جملۂ نطق را سوء تفسیر کردہ غوغا بلند کرد و ایں فقرہ مدتی در محافل و جرائد عثمانی از طرفین موجب قیل و قال شد۔

ترجمہ۔ شیخ الاسلام نے ان کے ایک جملہ کی غلط تشریح کر کے ان کے خلاف شور مچایا اور اس فقرے پر ایک مدت تک اہل علم کی مجلسوں اور عثمانی اخبارات میں دونوں جانب سے بحث ہوتی رہی۔

چونکہ دولت عثمانیہ میں ہر طرف شیخ الاسلام کا سکہ جما ہوا تھا۔ اس لیے لوگ جمال الدین افغانی کے خلاف ہو گئے۔ جب اس واقعہ نے فتنہ عظیم کی صورت اختیار کی تو وہ مجبوراً مصر روانہ ہو گئے۔

جامعہ ازہر کے طالب علم سید صاحب کے فضائل و کمالات کے بہت معترف تھے اور ان سے خاص عقیدت رکھتے تھے لہٰذا وہ آپ کی آمد پر بہت خوش ہوئے۔ اور حکومت نے بھی آپ کا خیر مقدم کیا اور کچھ وظیفہ مقرر کر دیا۔ اب سید صاحب نے باقاعدہ درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ سید صاحب کا خیال تھا کہ کوئی قوم اس وقت تک ارتقائی منزل سے ہمکنار نہیں ہو سکتی جب تک اس کے نوجوانوں کی ذہنی اور شعوری نشو و نما صحیح خطوط پر نہ ہو چنانچہ اس مقصد کی تکمیل کے لیے انھوں نے طالب علموں کو تقریر اور تحریر میں آگے بڑھایا اور آہستہ آہستہ وہ ذہین اور مسائل کو سمجھنے والے نوجوانوں کی ایک جماعت تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے اور پھر اس جماعت نے استحصالی قوتوں کے خلاف عملی جہاد شروع کیا۔ چنانچہ ان نوجوانوں کے عزم کا اور جذبۂ بیداری نے سب کو چونکا دیا۔ اس تحریک سے وہ لوگ بھی اپنے اقتدار کے لیے خطرہ محسوس کرنے لگے جو قوماً مسلمان تھے لیکن عملاً استحصالیوں کے ترجمان خاص طور پر خدیو توفیق پاشا

کی ساری شان و شوکت انگریز بہادر کے فیض و کرم کا عطیہ تھی۔ انگریز بہادر کا خیال تھا کہ اگر جمال الدین افغانی کی تحریک سے عوام میں سیاسی بیداری پیدا ہو گئی تو کوئی تعجب نہیں کہ مصر پھر ان کے دائرہ استعماریت سے نکل جائے۔ لہٰذا خدیو توفیق پاشا کو اس بات پر مجبور کر لیا کہ جمال الدین افغانی مع اپنے طائفہ کے مصر چھوڑ کر چلے جائیں۔ حالانکہ سید صاحب نے پہلے پہل اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا تھا تو توفیق پاشا ان کا ہمنوا تھا لیکن اقتدار کی بقا کے لیے اس نے یہ سودا منظور کر لیا۔

ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی
خراب کر گئی شاہین بچے کو صحبت زاغ

توفیق پاشا کے فرمان ناگہانی پر سید صاحب نے مصر چھوڑ دیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اس دوران میں مصری عوام کے سامنے انگریزوں کی مکاریوں اور سیاسی ہتھکنڈوں کا جو پوسٹ مارٹم کیا تھا اس کے نتائج انگریزوں کے حق میں بہت ضرر رساں ثابت ہوئے حتیٰ کہ انہیں مصر میں اپنا قیام بارگراں گزرنے لگا۔

سید صاحب مصر سے حیدرآباد دکن آئے۔ اس وقت یہاں کی سیاسی فضا بڑی مکدر تھی قوم کے بڑے، انگریزوں کے آلۂ کار تھے اور چھوٹے ان کی چیرہ دستیوں کا شکار، غرض کہ کوئی آواز حق بلند کرنے والا نہ تھا۔ یہ زہریلے اثرات صرف دکن ہی تک محدود نہ تھے بلکہ تمام ہندوستان اس کی لپیٹ میں تھا اصحاب جبہ و دستار اپنے مسائل دنیاداری میں الجھے ہوئے تھے۔ اگر دین و ملت کی کچھ خدمت تھی تو یہ تھی کہ فروعی اور اختلافی مسائل کو اچھالا جاتا پھر اس پر مناظرے بازی ہوتی بحث و تمحیص کے لاتناہی سلسلے شروع ہوتے حالانکہ عوامی سطح پر لوگ دین کے بنیادی ارکان سے بھی واقف نہ تھے۔ سید صاحب نے جب یہاں کا یہ رنگ ڈھنگ دیکھا تو ان کا دل شدت غم سے بھر آیا اور انھوں نے دین متین کے نمائندوں سے اس طرح خطاب کیا کہ

اے علماء ہندوستان! اے منابع انظار دقیق، اے معادن الرائے سدید، اے ینابیع الحکم عمیق، اے اصحاب تالیف و تصنیف کثیر، اے ارباب رسائل و تعلیقات انیق! کیا تمہاری پاک طینت اور تمہاری مقدس فطرت ـــــ اس بات پر راضی و خوشنود ہو جاتی ہے کہ اپنے روشن اور تابندہ ذہنوں کو ایسے مباحث میں صرف کرو ......

کیا تم پر واجب نہیں کہ آنے والی نسلوں کی خدمت اپنے افکار عالیہ سے کرو جیسی کہ سابقین کرام نے تمہاری خدمت کی ہے ۔

آگے فرماتے ہیں :۔

وہ عالم نہیں جو اوہام کے وحشت ناک ظلمت کدوں میں بیٹھا رہے یا جو ہمیشہ اپنی شان وشوکت کے لیے کوشاں رہتا ہے اور فساد کو اصلاح سمجھتا ہے ۔ سچ پوچھو تو یہ عالم نہیں بلکہ تباہی اور بربادی کے علم بردار ہیں اور ہلاکت و ویرانی کے خبر رساں اور مصائب و آلام کے قاصد ۔۔۔ عالم نہیں بلکہ ننگِ عالم ہیں ۔

اس کے بعد فرمایا کہ

عزت حق کی قسم! راز عدل اس پر گواہ ہے ۔ اگر مسلمان اپنے عقائد کی پناہ اور اپنے باعمل عالموں کی نگرانی میں اپنے ہی حال پر رہتے تو ان کی نگریں متحد اور ان کے افراد آپس میں ایک دوسرے سے پیوست رہتے ۔

ہندوستان میں سید صاحب کا زیادہ تر قیام حیدر آباد دکن ہی میں رہا ۔ ان کی شعلہ نوائی حق گوئی نیز روشن خیالات نے مجموعی طور پر بڑا اثر پیدا کیا ۔ حیدر آباد میں سکونت پذیر پٹھانوں اور عربوں کے دلوں میں انگریز کے لیے بالکل جگہ نہ تھی کیونکہ وہ ایک عرصے سے ان کے ظلم سہتے چلے آرہے تھے لیکن ان کے خلاف کوئی آواز اٹھانے والا نہ تھا ۔ سید صاحب کی آمد سے ان میں ایک خاص جوش پیدا ہو گیا اور انھوں نے انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا ۔ حالات جب زیادہ کشیدہ ہوئے تو سالار جنگ نے سید صاحب کو کلکتہ جانے پر مجبور کیا لہذا وہ حیدر آباد سے کلکتہ آئے ۔ یہاں ان کی تقریر اور تحریر پر بالکل پابندی لگا دی گئی ۔ نتیجتاً وہ نہایت دل برداشتہ ہو کر ہندوستان سے پیرس آ گئے ۔۔۔ اتفاق سے مفتی عبدہ بھی یہاں صعوبت جلاوطنی برداشت کر رہے تھے ۔ سید جمال الدین افغانی اور مفتی عبدہ ہم خیال وہم نوا تھے ۔ دونوں دین متین اور امت مرحومہ کی خدمت کے نشے میں سرشار تھے چنانچہ سید صاحب نے مفتی عبدہ کی معاونت میں یہاں سے ایک اخبار عروۃ الوثقیٰ نکالا ۔ جس نے سارے یورپ میں ایک تہلکہ مچا دیا ۔ انگریز بہادر کے کان کھڑے ہو گئے ۔ آخر کار وہی ہوا جس کا ڈر تھا ۔ عروۃ الوثقیٰ بند کر دیا گیا ۔ اس کے بعد سید صاحب نے یہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور پیرس سے ماسکو آ گئے ۔ حکومت روس

نے آپ کا خیر مقدم کیا۔

روس میں سید جمال الدین افغانی تقریباً چار یا پانچ سال رہے۔ اس عرصے میں انھوں نے یہاں کے مسلمانوں کے لیے جو کچھ بھی ہو سکتا تھا وہ کیا۔ ان کی آمد سے قبل زار کی حکومت مسلمانوں پر بہت ظلم کرتی تھی۔ ان پر بے شمار پابندیاں عائد تھیں۔ یہاں تک کہ قرآن اور دیگر مذہبی کتب کی نشر و اشاعت خرید و فروخت کی اجازت بھی نہ تھی۔ چنانچہ سید صاحب نے زار روس کے اس انتہا پسندانہ رویے کے خلاف شدید احتجاج کرتے ہوئے اس سے پرزور مطالبہ کیا کہ روسی مسلمانوں کو مذہبی آزادی دی جائے۔ اس نے بے چون و چرا اس مطالبہ کو مان لیا اور روسی مسلمانوں کی مذہبی آزادیاں بحال کر دیں۔

درحقیقت جمال الدین افغانی کا یہ کارنامہ زندۂ جاوید ہے اس سے ان کی دینی حمیت، عقیدت اور مسلمانوں سے غیر معمولی خلوص و محبت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

روس میں ان کا طویل عرصے تک قیام رہا پھر وولنسدن ہوتے ہوئے ایران آئے۔ ایران میں اس وقت ناصر الدین شاہ قاچار کی حکومت تھی۔ شاہ قاچار اپنے قیام یورپ کے دوران سید صاحب سے مل چکا تھا۔ وہ ان کی علمی برتری اور سیاسی سوجھ بوجھ کا اندازہ لگا چکا تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ شاہ قاچار انگریزوں کے دست راست تھے اور سید صاحب انگریزوں کے لیے شمشیر برہنہ۔ اس نے ایران میں سید صاحب کے داخلے پر کسی قسم کی اینٹ واں نہیں کی لیکن پھر بھی وہ ان کی طرف سے چوکنا ہو گیا۔ اس دوران میں اس نے سید صاحب کو منصب وزارت کی پیش کش کر کے اپنا ہم خیال بنانا چاہا لیکن سید صاحب نے اسے مسترد کر دیا۔

ایران میں سید صاحب کے ارادتمندوں کا حلقہ بہت وسیع ہو گیا۔ یہاں ان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ہر طرح کے لوگ ان کے گرد جمع رہتے۔ آخر ایک وقت ایسا بھی آ گیا کہ جب انھوں نے ملت ایران سے اس طرح جرأت مندانہ خطاب کیا کہ۔

> میں کہتا ہوں کہ ملتِ ایران کو ان کے مسلسل حوادث نے اپنے دین و ایمان کے راستے سے ہٹا دیا ہے اور مسلمانوں کے حقوق پر اغیار کی دست اندازیوں نے اسے اس قابل نہیں چھوڑا کہ وہ کسی بھلائی کے حصول کی کوشش کرے۔ ان کے تقدس نے روشنی کو چھوڑ دیا ہے ان کے افکار مضمحل ہو گئے ہیں۔ وہ صحیح راستے سے کچھ اس طرح بھٹکے ہوئے ہیں کہ انہیں کوئی

جرم میں شیخ صاحب کو اگرچہ کوئی جسمانی اذیت نہیں لیکن زبان بندی کا حکم صادر فرما دیا گیا۔ قدرت ...
جمال الدین افغانی سے جو کام لینا تھا وہ لے چکی تھی۔ چنانچہ قسطنطنیہ میں اپنی زندگی کے بقیہ چند سال نظر بندی کی
حالت میں گزارنے کے بعد یہ پیکر شجاعت و شہامت امت مرحومہ کا دردمند، غنیم اسلام ۹ مارچ ...
میں اپنے محبوب حقیقی سے جا ملا۔

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ — عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام

زندگی کی قیمت میں اضافہ

کاغذ کی ہوش رُبا گرانی، بلکہ نایابی کی وجہ سے، نیز رسالہ سے متعلق دوسرے اخراجات میں اضافہ کی وجہ سے زندگی کا خسارہ اب ناقابل برداشت ہوگیا ہے۔ اس کا اندازہ آپ اس بات سے کرسکتے ہیں کہ ہم پچھلے چند ماہ میں لاگت سے تقریباً نصف قیمت پر زندگی آپ کو پیش کرتے رہے ہیں۔ اس عرصے میں دوسرے اخبار و رسائل اپنی قیمت میں اضافہ کرچکے ہیں۔ ہماری کوشش یہی رہی کہ ہم موجودہ قیمت پر آپ کو رسالہ زندگی پیش کرتے رہیں۔ مگر اب یہ بوجھ ناقابل برداشت ہوگیا ہے۔ مجبوراً جنوری ۱۹۷۴ء سے زندگی کی قیمت میں معمولی اضافہ کیا جارہا ہے۔

اب زندگی کے عام شمارے کی قیمت 1/20 اور سالانہ چندہ =/12 ہوگا۔ البتہ مستقل خریداروں کو خاص نمبر ان کے سالانہ چندے ہی میں پیش کیا جائے گا۔ امید ہے خریداران زندگی ہماری مجبوریوں کے پیش نظر یہ اضافہ قبول فرمالیں گے۔

منیجر — ماہنامہ "زندگی" رامپور یوپی

نئے خریداروں سے

جو لوگ "زندگی" کا سالانہ چندہ =/12 ہمیں بھیج کر خریدار بنیں گے ان کو 3/50 قیمت کا خاص نمبر اسی چندے میں پیش کیا جائے گا۔ اس کی اشاعت کے بعد جو لوگ خریدار بنیں گے وہ اسے اس نمبر سالانہ چندے میں نہ پا سکیں گے۔

منیجر ماہنامہ "زندگی" رامپور یوپی

لیبیا میں

مسلم نوجوانوں کی عالمی کانفرنس

جناب سید امین الحسن رضوی

> جناب رضوی صاحب اس کانفرنس میں شریک ہوئے تھے اس کی مختصر روداد اور اپنے تاثرات انھوں نے ریڈینس دہلی میں شائع کرائے تھے۔ میری فرمائش پر انھوں نے اس کا ترجمہ خود ہی کیا ہے اس لئے اس کو اوریجنل ہی سمجھنا چاہیئے۔ میں ان کے شکریہ کے ساتھ اسے زندگی میں شائع کر رہا ہوں۔ (ادارۂ زندگی)

لیبیا ایک خاصا طویل اور عریض ملک ہے لیکن اس کی کل آبادی بیس لاکھ ہے جس میں سے بھی تقریباً دو لاکھ غیر لیبی ہیں۔ ابھی کچھ دنوں قبل تک یہ ایک غیر معروف سا ملک تھا لیکن جب سے یہاں سیال سونا یعنی تیل دریافت ہوا اس وقت سے اس کی اہمیت بڑھ گئی اور ۱۹۶۹ء کے ماہ ستمبر میں جب سے وہاں کے ضعیف العمر صوفی شہنشاہ ادریس کی حکومت کا تختہ الٹ کر نوجوان کرنل معمر قذافی کی قیادت میں نئی انقلابی کاؤنسل وہاں برسر اقتدار آئی ہے اس وقت سے تو اس ملک کے چرچے روز ہی اخبارات میں ہو رہے ہیں۔

یہ بھی واقعی اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ عرب ملکوں میں تیل کی دریافت ایسے زمانہ میں ہوئی جبکہ ان ملکوں پر برطانیہ، فرانس اور اٹلی کی حکومتوں کا تسلط ختم ہو چکا تھا اور ہر عرب ملک میں جہاں تیل دریافت ہوا کسی نہ کسی مقامی شخص کی حکمرانی قائم ہو چکی تھی۔ یورپ کی طاقتوں کا اگر عرب

ممالک سے ایسا کوئی معاشی مفاد وابستہ نہ تھا کہ وہاں ملکوں کو اپنی ایک کالونی کی حیثیت سے اپنے زیر نگیں رکھتے بلکہ ان عرب ممالک سے یورپی طاقتوں کی دلچسپی محض جنگی نقطہ نظر تھی اس لئے وہ ان ممالک کو اپنی سلطنتوں کا جزو بنا کر رکھنے کے زیادہ متمنی نہ تھے جیسے مثلاً ہندوستان اور الجزائر کے معاملہ میں۔ ان کے لئے یہ کافی تھا کہ یہ ممالک برائے نام ہی سہی خود مختار ہوں لیکن عملاً یہاں کے حکمراں ان کے زیر اثر ہوں۔ اگر کہیں ان ملکوں کو یورپی طاقتوں نے اپنی نوآبادی کے طور پر رکھا ہوتا اور پھر تیل دریافت ہوتا تو یہ یورپی طاقتیں مقامی باشندوں کو ایک کرکے ہلاک کر دیتیں لیکن ان پر سے اپنا اقتدار ہرگز نہ ہٹاتیں وہ تو خدا کا شکر ہے کہ ایسی صورت حال پیش نہیں آئی اور اب یہ تیل کی دولت سے مالا مال عرب ریاستیں اس پوزیشن میں ہیں کہ اپنی اس خداداد نعمت پر آزادانہ تصرف کر سکیں۔

عرب جمہوریہ لیبیا ان مملکتوں میں ایک ہے جو اپنی تیل کی دولتِ فراواں کو نہ صرف اپنے اہل ملک کی مادی اور معاشی خوشحالی کی ترقی کے کاموں میں صرف کر رہی ہے بلکہ وہ اس دولت کو اسلام کی حکومت کے لئے بھی دل کھول کر صرف کر رہی ہے۔ موتمر شباب العالمی الاسلامی یعنی مسلم نوجوانوں کی عالمی کانفرنس جس کا اہتمام لیبیا کی جماعۃ الدعوۃ الاسلامی کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اسلام اور مسلمانوں کی بین الاقوامی سطح پر خدمت کے پروگرام کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

کانفرنس ۲۔ جولائی سے شروع ہوئی اور ۱۲۔ جولائی تک رہی۔ ۱۷ ملکوں کے تین سو سے زیادہ نمائندوں نے اس میں شرکت کی۔ مدعو کئے جانے والے لوگوں کی تعداد تو اور زیادہ تھی لیکن وہ سب جنھیں مدعو کیا گیا تھا مختلف وجوہ کے باعث کانفرنس میں شریک نہ ہو سکے۔ ان وجوہ میں ایک وجہ حکومت کی "عنایت"، بھی تھی۔ مثلاً ہندوستان سے ہی دس سے زیادہ آدمیوں کو دعوت وصول ہوا تھا لیکن جا سکے ہم صرف دو، ایک راقم اور دوسرے کیرالا کے ابوالجلال صاحب۔

لیبیا کا کل رقبہ سترہ لاکھ ساٹھ ہزار مربع کلومیٹر ہے لیکن آباد علاقہ صرف دو ہزار کلومیٹر کی اس پٹی پر مشتمل ہے جو ساحل سمندر سے متصل شرقاً غرباً پھیلا گیا ہے۔ یہ علاقہ بھی گنجان آبادی کا نہیں ہے اور اس میں کل بڑے شہر طبروق، زبویا، بن غازی اور طرابلس واقع ہیں۔ طرابلس اس وقت لیبیا کا دارالحکومت ہے۔ ان بڑے شہروں کے علاوہ چند چھوٹے چھوٹے قصبات ہیں اور باقی صحرا

علاقہ ہے جس میں اکادکا قبائیلی آبادیاں ہیں۔
کرنل قذافی دنیا کے کم عمر ترین صدر حکومت ہیں اس وقت ان کی عمر ۳۱ سال ہے اور جب ان کی قیادت میں انقلاب آیا تو اس وقت وہ صرف ۲۸ سال کے تھے۔ لیبیا کی انقلابی کاونسل نے ملک میں زرعی انقلاب لانے کے لئے ایک عظیم الشان منصوبہ بنایا ہے
اور بڑی محنت اور تندہی سے اس منصوبہ کی تکمیل کے لئے سرگرم عمل ہے۔ لیبیا کے مخصوص جغرافی اور مقامی حالات کے پیش نظر یہ ایک بڑا کام ہے اور یا یہ تکمیل کو پہنچ جائے تو ایک زبردست کارنامہ ہوگا
زرعی انقلاب کے پروگرام کو گیارہ پراجکٹوں میں تقسیم کیا گیا ہے ہر پراجکیٹ کے تحت ہزاروں ایکڑ اراضی کو قابل کاشت بنایا جاتا ہے۔ پھر اس زمین کو دس، ہیکٹر پر مشتمل ایک ایک اکائی میں تقسیم کیا جائے گا اور پوری اراضی پر جنگلی اور میوہ دار درخت لاکھوں کی تعداد میں لگائے جائیں گے۔ ہر فارم کی اکائی کے لئے ایک بالکل جدید وضع کا مکان جس میں پانی، بجلی، گیس کے چولہوں وغیرہ کی سہولتیں حاصل ہوں گی بنایا جائے گا جس میں اس کاشتکار خاندان کی رہائش ہوگی جس کو وہ زرعی فارم الاٹ کیا گیا ہوگا۔ چند فارموں کے لئے ایک مرکزی قصبہ ہوگا جس میں مسجدیں، مدرسہ، شفاخانہ، ہاسٹل، ہوٹل، تفریح گاہیں، بینک، سرکاری دفاتر وغیرہ سب کچھ ہوں گے۔ کاشتکار خاندان اپنے فارم کی پیداوار اس مرکزی قصبہ میں برائے فروخت لائے گا اور دوسری تخم ریزی کے وقت تک اس مرکزی قصبہ میں وقت گذارے گا اور پھر تخم ریزی کا ہنگامہ شروع ہوتے ہی اپنے فارم پر واپس چلا جائے گا۔ یہ نظام روس کے اجتماعی کاشت کے نظام سے مختلف اور امریکہ کے نظام سے قریب تر ہے۔
ان پراجکٹوں پر مصارف کا تخمینہ اربوں روپیہ ہے لیکن پیسہ کی فکر لیبی حکومت کو نہیں ہے قدرت نے دولت بہت دے رکھی ہے۔ لیکن میں نے خصوصیت سے وہاں کے زرعی منصوبہ کا تذکرہ اس لئے پسند کیا ہے کہ صنعتی ترقی کے مقابلہ میں زرعی ترقی زیادہ وقت طلب ہوتی ہے اور عوامی تعاون کی زیادہ محتاج ہوتی ہے۔ بیرونی زرمبادلہ صرف کرنے کی سکت اگر حکومت میں ہو تو صنعتی ترقی کچھ مشکل نہیں، مشنری اور ماہرین دونوں حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن زرعی انقلاب کے لئے منصوبہ بندی سے لیکر اس پر عمل آوری تک کے لئے مقامی لوگوں کا اشتراک لازمی ہے۔

یہ بات دلچسپی کا باعث ہوگی کہ ان گیارہ پراجکٹوں کے منجملہ ایک پوری طرح مکمل ہو چکا ہے پانچ دو تہائی سے زیادہ مکمل ہو چکے ہیں سوادی مارکاس کا پراجیکٹ ۸۰ فیصد مکمل ہوا ہے اور بقیہ چار ابھی ابتدائی مراحل میں ہیں۔ تین چار سال کے عرصہ میں اتنا کام ہر لحاظ سے قابل تعریف ہے۔

تیل کی آمدنی کو لیبیا کی حکمران انقلابی کاؤنسل محض سرکاری خزانہ کے بھرنے کا ذریعہ نہیں سمجھتی بلکہ اپنے ملک کے ترقیاتی پروگراموں کی تکمیل کا ایک ذریعہ سمجھتی ہے۔ سمجھنے کے انداز کے اس فرق کا نتیجہ ہے کہ حکومت لیبیا بڑی فراخ حوصلگی سے ترقیاتی منصوبے بنا رہی ہے۔ اور ان منصوبوں پر بے دریغ روپیہ صرف بھی کر رہی ہے۔

لیبیا میں ہر سال اوسطاً ایک ارب بیرل تیل نکلتا ہے اور کوئی پانچ کھرب مکعب فیٹ گیس حاصل ہوتی ہے۔ ملک کی معیشت پر انقلابی کاؤنسل کا کنٹرول کتنا سخت ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مختلف ترقیاتی منصوبوں پر بے دریغ روپیہ صرف کرنے کے باوجود لیبیا کے کھاتہ میں اس وقت ڈھائی ہزار ملین ڈالر (یعنی تقریباً ۲۰ ارب روپیہ) کا بیرونی زرمبادلہ موجود ہے۔

پٹرول کے معاملہ میں لیبیا کی انقلابی کاؤنسل نے ایک دانشمندانہ فیصلہ یہ کیا ہے کہ بیرونی تیل کمپنیوں کے زبردست اصرار کے باوجود انھوں نے سالانہ نکالے جانے والے تیل کی مقدار میں اضافہ کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ امریکہ کی پالیسی یہ ہے کہ عرب ملکوں سے زیادہ سے زیادہ تیل حاصل کیا جائے تاکہ اس کے اپنے جو تیل کے ذخائر ہیں ان پر کم سے کم بار پڑے اور وہ محفوظ رہیں۔ نوعمر قذافی نے امریکہ کی اس چال کو سمجھ لیا اور اب تو تیل کمپنیوں کے ۵۱ فیصد حصے بھی لیبی حکومت نے حاصل کر لئے ہیں۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا موتمر شباب العالم الاسلامی کی کانفرنس کا منعقد کرنا جماعت الدعوۃ الاسلامی کی متعدد سرگرمیوں کے منجملہ تھا۔ الشیخ محمود الصبحی اس جماعت الدعوۃ الاسلامی کے مستقل جنرل سکریٹری ہیں اور اس تنظیم کو حکومت کی کامل سرپرستی حاصل ہے۔ یہ جماعت اسلام کی خدمت بڑی دلچسپی اور منصوبہ بند طریقہ پر کر رہی ہے محمود صبحی صاحب کے دست راست صالح محمد تیناز صاحب ہیں۔ مجھے شیخ صبحی سے تو زیادہ واقف ہونے کا موقعہ نہیں مل البتہ صالح محمد تیناز سے دوران کانفرنس میں اور کانفرنس کے بعد بھی خاصی ملاقاتیں رہیں اور ان کے

دفتر میں بھی میں نے ان کے ساتھ کافی وقت گذارا اور اس ہوٹل میں بھی ان سے گفتگو کا موقع ملا جہاں ہم ٹھہرائے گئے تھے۔ میں نے انھیں وقیع شخصیت کا حامل پایا اور ان کے کام کے انداز میں مجھے وہ اکملیت (THOROUGHNESS) نظر آئی جو جرمنوں کا خاصّہ ہے میں نے ان میں کام کرنے کی صلاحیت اور امنگ دونوں کا عمدہ امتزاج پایا۔

کانفرنس کا پروگرام جس نہج پر ترتیب دیا گیا تھا اور مباحث کے لئے جن جن موضوعات کا انتخاب کیا گیا تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کانفرنس کو محض روا روی میں اور رسماً ہی نہیں منعقد کیا گیا تھا بلکہ اس پر گہرا غور و خوض کیا گیا تھا اور اس بات کی پوری کوشش کی گئی تھی کہ یہ کانفرنس مقصد کی حامل اور نتیجہ خیز ہو۔ کانفرنس کا صبح کا سشن ایک متعین موضوع پر مباحثہ کے لئے وقف ہوتا۔ اس موضوع پر کوئی ایک مندوب اظہار خیال کرتا۔ پھر اس پر عام تبصرہ اور سوالات ہوتے جس سے موضوع کے تقریباً سارے ہی گوشوں کی تنقیح ہوتی۔ ظہر بعد کا سشن مختلف ممالک میں مسلمانوں کی حالت پر معلومات کے لئے وقف ہوتا لیکن اگر صبح کے سشن کے موضوع پر تبصرہ تشنہ رہ گیا ہوتا تو ظہر بعد کے سشن میں اس کو مکمل کر لیا جاتا تھا، اور مغرب کی نمازیں کانفرنس ہال ہی میں پڑھی جاتی تھیں۔

جس ہوٹل میں ہم لوگوں کو ٹھہرایا گیا تھا کانفرنس ہال وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ پھر بھی تمام مندوبین کو ہوٹل سے کانفرنس ہال تک لے جانے اور واپس لانے کے لئے موٹروں کا انتظام تھا۔ ہم میں سے بعض مندوبین کبھی کبھی پیدل ہی کانفرنس ہال تک چلے جایا کرتے تھے۔ ہوٹل میں نہ صرف تینوں وقت کے کھانے کا انتظام تھا بلکہ ہمہ وقت چائے، کافی اور دوسرے متعدد اقسام کے ٹھنڈے مشروبات بھی مندوبین کے لئے حاضر رہتے تھے اور اسی طرح کانفرنس کے داخلہ پر مشروبات کا ایک بڑا کاؤنٹر تھا جس میں چند اقسام کے مشروبات ملتے تھے اور کانفرنس ہال کے اندر بھی تھوڑے تھوڑے وقفہ سے مشروبات کا دور چلتا رہتا تھا۔

ہوٹل میں خط لکھنے کے لئے کاغذ اور لفافے عند الطلب مل جاتے تھے اور ہوٹل کے عملہ کو ایک مخصوص مہر مہیا کر دی گئی تھی جو لفافوں پر لگا دی جاتی اور ڈاک کے ٹکٹ کے بغیر خطوط روانہ ہو جاتے۔ کانفرنس ہال میں اخباری نمائندوں کے لئے مفت تار کے ذریعہ رپورٹیں روانہ کرنے

کا استقبال کیا گیا تھا۔

جو موضوعات مباحثہ کے لئے منتخب کئے گئے تھے وہ حسب ذیل تھے۔

(۱) النظریۃ الثالث یعنی اسلام بحیثیت مسائل حاضرہ کے حل کے (۲) اسلام کا تعلیمی نظام اور عصر حاضر میں اس کی تنفیذ (۳) دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کی آزادی کی تحریکیں خصوصاً فلسطین، ارٹیریا، فلپائن اور زنجبار میں (۴) مستشرقین سے اسلام کو خطرہ اور اس کا سدباب (۵) عربی زبان کی ترویج و اشاعت اور (۶) عہد حاضر میں تبلیغ اسلام کا طریقہ کار۔

مباحث پر مغز اور خیال آفریں ہوتے تھے اور ابتدائی تقریر کے بعد جو تنقید و تبصرہ ہوتا تھا اور جو سوالات پوچھے جاتے تھے اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ مندوبین تقریروں کو توجہ سے سن رہے ہیں اور اس پر گہرا غور بھی کر رہے ہیں۔ مختلف ممالک میں مسلمانوں میں ہونے والے مظالم کی داستانیں خصوصاً ارٹیریا، فلپائن اور زنجبار کے مسلمانوں کی مظلومیت کے بارہ میں صحیح اور مستند معلومات حاصل ہوئیں۔

کانفرنس کی روزمرہ کی روئداد تو ہیں ذریعہ تار ریڈینس اور دعوت کو روانہ کرتا رہتا تھا اور یوں بھی کانفرنس کے مباحث کی تفصیل بہت زیادہ ضخامت چاہتی ہے لیکن میں دو باتوں کا تذکرہ یہاں ضروری سمجھتا ہوں۔ ایک واقعہ تو یہ پیش آیا کہ دوران کانفرنس میں یہ پتہ چلا کہ امریکہ کا ایک نیگرو جان علی نامی جو عالی جاہ محمد کی جماعت BLACK MUSLEMS کا پیرو ہے وہ بھی بطور مندوب کے کانفرنس میں مدعو ہے۔ عالیجاہ محمد مدعی نبوت ہے اور اس کے پیرو اس کو نبی ہی مانتے ہیں۔ اس پر کانفرنس کے دیگر شرکاء کو اعتراض ہوا کہ چونکہ عالیجاہ محمد بہ سبب ادعائے نبوت خارج از اسلام ہے اور اس کو نبی ماننے والے بھی خارج از اسلام ہیں اس لئے جان علی کو اس کانفرنس میں بطور مندوب شامل نہیں ہونا چاہئیے اور اگر اس کو شامل ہونے دیا گیا تو کانفرنس کے بقیہ سارے مندوب کانفرنس کا بائیکاٹ کر دیں گے۔ میجر شبیر حوادی جو حکمران انقلابی کاؤنسل کے ممبر ہیں اور کانفرنس کے تمام اجلاسوں کی صدارت کر رہے تھے مندوبین کے اس مطالبہ پر اپنا فیصلہ محفوظ رکھا اور اس دن کانفرنس کی کارروائی مکمل ہوگئی۔

دوسرے دن صبح کو کانفرنس کی کارروائی کے آغاز سے قبل میجر شبیر حوادی صاحب نے یہ اعلان

کہ جان علی اپنے عقائد سے تائب ہو گئے ہیں اور کلمہ پڑھ کر داخل اسلام ہوں گے بڑی مسرت کے ساتھ اس اعلان کا خیر مقدم کیا گیا۔ اور جماعۃ الدعوۃ کے سکریٹری جنرل شیخ محمود صبحی نے ڈائس پر جان علی کو مندوبین کے نعرۂ تکبیر کی گونج میں کلمہ پڑھا کر مشرف بہ اسلام کیا۔

دوسری بات جسے میں قابل تذکرہ سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ پاکستان کے ریٹائرڈ اکاؤنٹنٹ جنرل صاحب تھے (جن کا نام افسوس ہے کہ میں بھول گیا) اپنی تقریر کے دوران ایک نہایت فکر انگیز سوال اٹھایا۔ انھوں نے کانفرنس کے شرکاء کو اس بات پر غور کرنے کی دعوت دی کہ مسلمان تعداد کے لحاظ سے جتنے آج کل ہیں اتنے اس سے پہلے کبھی نہ تھے۔ مجموعی طور پر دولت کے اعتبار سے بھی جتنے صاحب ثروت وہ آج ہیں اس سے پہلے کبھی نہ تھے پھر بھی وہ خوار اور درماندہ کیوں ہیں۔

اس سیدھے سادے اور بظاہر ایک سیدھے سادے سوال نے کانفرنس کے شرکاء کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا بعد میں نے محسوس کیا کہ شرکاء کانفرنس اس سوال پر جیسے زور سے چونک پڑے ہوں۔

احمد آباد میں ایک سیمنار

سید احمد قادری

اسلامک ریسرچ سنٹر احمد آباد کی طرف سے تعلیقات ثلثہ یعنی ایک مجلس کی تین طلاقوں کے مسئلے پر ایک مجلس مذاکرہ (سیمنار) ۴۔۵۔۶۔ نومبر ۱۹۷۳ء کو احمد آباد میں منعقد ہوئی۔ ۲ر نومبر ۷۳ء کو رات کے دس بج کر دس منٹ پر دہلی کے چھوٹی لائن والے اسٹیشن سے جب دہلی میل چھک چھک کرتا احمد آباد کی طرف بڑھا تو میرا ذہن احمد شاہ گجراتی کی طرف مڑ گیا جس نے اپنے نام سے اپنی حکومت کی راج دھانی بسائی تھی اور آج بھی وہ حکومت گجرات کی راجدھانی ہے۔ ذہن کے پردے پر وہ احمد آباد آیا جو مسلمانوں کی شان و شوکت، حکومت و سلطنت، علم و فضل اور مہارت فن کا ایک بڑا مرکز اور دلکش نشان تھا اور پھر یکایک مجھے چند سال پہلے بسائی ہوئی مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی بستی "ملت نگر" یاد آئی جس کے ساتھ مسلمانوں کی مظلومیت و محکومیت کی ایک روح فرسا داستان وابستہ ہے۔ انسان کا ذہن ایک ایسا عجیب و غریب انجن یا ایک ایسا حیرت انگیز راکٹ ہے جو ایک آن میں آسمان پر پہنچ جاتا اور دوسرے ہی لمحہ زمین پر اتر آتا ہے۔

دہلی میل فراٹے بھر رہا تھا اور میرا ذہن نہ جانے کس کس فکر میں غلطاں و پیچاں تھا۔ احمد آباد قریب آ رہا تھا اور میں راستے کے مختلف تجربات سے گزر رہا تھا ۳ر نومبر کو رات کے آٹھ بجکر پچیس منٹ پر دہلی میل شور مچاتا احمد آباد اسٹیشن میں داخل ہوا اور تکان آمیز سانس لیتا کھڑا ہو گیا جیسے ایک تھکا ہارا مسافر منزل پر پہنچکر سانس لیتا ہے جس میں تکان بھی ہوتی ہے اور منزل پر پہنچ جانے کی خوشی بھی۔

میں تھرڈ کلاس سلیپر سے پلیٹ فارم پر اترا اور چند منٹ میں جناب حبیب الرحمٰن صاحب امیر حلقہ گجرات ہنستے چہرے اور خندہ پیشانی کے ساتھ میرے قریب آ گئے ان کے ساتھ ایک رفیق اور تھے پہلے ہم دفتر جماعت اسلامی احمد آباد پہنچے۔ یہاں برادرم مولانا شمس پیرزادہ سے ملاقات ہوئی وہ بمبئی سے صبح کی ٹرین سے احمد آباد پہنچ چکے تھے۔ جناب عبدالرحمن صاحب (مالیگاؤں) اور دارالعلوم دیوبند سے فارغ

ایک نوجوان عالم دین جناب محفوظ الرحمٰن بھی دفتر میں موجود تھے۔ چند اور نوجوان بھی تھے جن کے نام ذہن میں محفوظ نہیں رہے۔ پھر ہم لوگ اعظم بیگ مغل جہیر منتقل ہو گئے۔ یہ مکان، سیمینار میں حصہ لینے والے مہمانوں کے لئے احمد آباد کے ایک ایسے خاندان نے خالی کیا تھا جو ملت اسلامیہ کی فلاح و بہبود اور اس کی امداد و اعانت کے کاموں میں عملاً حصہ لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جزائے خیر عطا فرمائے

۴ر نومبر صبح کی ٹرین سے مولانا مختار احمد ندوی اور مولانا عبدالرحمٰن تشریف لے آئے۔ دہلی ایکسپریس سے مولانا مفتی عتیق الرحمان، مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور مولانا سید حامد علی تشریف لانے والے تھے۔ اتفاق سے اُس دن ٹرین لیٹ تھی۔

مجلس مذاکرہ کی پہلی نشست کچھ تاخیر سے ساڑھے نو بجے دن کو گجرات چیمبر آف کامرس ہال میں شروع ہوئی۔ ابتدا میں "اصلاح معاشرہ" کے عنوان پر حاضر ارکان مجلس نے مختصر طور پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ احمد آباد کے تعلیم یافتہ افراد کی ایک مختصر لیکن منتخب تعداد ہال میں موجود تھی۔

جن تین علماء کا انتظار تھا تشریف لے آئے اور پھر مولانا مفتی عتیق الرحمٰن کی صدارت میں سب سے پہلے مولانا محفوظ الرحمٰن (فاضل دیوبند) نے اپنا مقالہ پیش کیا۔ دوسری نشست میں جو ۳ بجے شروع ہوئی۔ میں نے اور شمس پیرزادہ نے اپنا اپنا مقالہ پڑھا۔

۵ر نومبر کو پہلی نشست میں جو تقریباً چار گھنٹوں کی تھی مولانا حامد علی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی مولانا مختار احمد ندوی اور مولانا عبدالرحمٰن نے اپنے مقالات پڑھے۔ دوسری نشست میں صدر مجلس مولانا مفتی عتیق الرحمٰن نے اپنے خیالات تقریر کی شکل میں پیش کئے، وہ مصروفیت کی وجہ سے اپنا مقالہ لکھ نہ سکے تھے۔ اس نشست پر عام نشستوں کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ تیسرا دن مقالات پر بحث و تمحیص اور کسی نتیجے پر پہنچنے کے لئے تھا۔ نماز عصر کے بعد اسی ہال میں ایک مخصوص نشست ہوئی جس میں صرف ارکان مجلس مذاکرہ شریک ہوئے۔ اس نشست میں کل کیلئے پروگرام طے کرنا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ اب کسی نتیجے پر پہنچنے کیلئے کیا طریقہ کار اختیار کیا جائے۔ کچھ دیر گفتگو ہوتی رہی۔ مقالات میں ہر ایک کا نقطۂ نظر اور دلائل سامنے آچکے تھے اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ ایک سب کمیٹی بنادی جائے جو مجلس مذاکرہ کی طرف سے ایک ایسا بیان مرتب کرے جس سے تمام ارکان مجلس مذاکرہ کو اتفاق ہو۔ کل ۶ر نومبر کی نشست میں اس تحریر پر گفتگو ہو اور جن نکات پر سب کا اتفاق ہو اس کو مجلس مذاکرہ کے حاصل اور نتیجہ کے طور پر

شائع کر دیا جانا چاہیے۔ اس کی حیثیت فتوی کی نہ ہوگی مولانا حامد علی مولانا شمس پیرزادہ اور راقم الحروف پر مشتمل ایک سب کمیٹی ارکان مجلس مذاکرہ نے منتخب کی۔ شب کے وقت، قیام گاہ پر، مولانا حامد علی نے مولانا شمس پیرزادہ اور راقم الحروف کے مشورے سے ایک تحریر مرتب کی۔

۱۲ نومبر کی نشست جناب اقبال ورق والا ایڈوکیٹ، کنوینر اسلامک ریسرچ سنٹر کی قیامگاہ پر ہوئی۔ مولانا حامد علی نے وہ تحریر پڑھ کر سنائی۔ اس کے بعد دیر تک اس پر گفتگو ہوتی رہی اور کچھ حذف و اضافہ کے بعد ایک متفقہ بیان مرتب ہوا۔ تمام ارکان مجلس مذاکرہ نے اس پر اپنے دستخط ثبت کئے۔ اس طرح اس آخری نشست نے تین یکجائی طلاقوں کے مسئلے پر اس سمینار کو ایک سنگ میل کی حیثیت دیدی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس مسئلے پر مزید مجالس مذاکرہ منعقد کرنے کی طرف اہل علم متوجہ ہوں۔ درج ذیل اشخاص نے اس مجلس مذاکرہ میں اظہار خیال کیا۔

(۱) مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صدر آل انڈیا مجلس مشاورت (۲) مولانا سعید احمد اکبرآبادی سابق صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (مدیر برہان دہلی)، (۳) مولانا محفوظ الرحمٰن (فاضل دیوبند، مدرس مدرسہ بیت العلوم مالیگاؤں (۴) مولانا مختار احمد ندوی ناظم جمعیۃ اہل حدیث بمبئی (۵) مولانا عبد الرحمٰن ابن شیخ الحدیث مولانا عبید اللہ رحمانی (۶) سید احمد عروج قادری مدیر ماہنامہ زندگی (۷) مولانا سید حامد علی سکریٹری جماعت اسلامی ہند دہلی (۸) مولانا شمس پیرزادہ امیر جماعت اسلامی، مہاراشٹر اسٹیٹ

مجلس مذاکرہ کا پورا بیان ہم ماہنامہ زندگی کے خاص نمبر میں شائع کریں گے یہاں صرف وہ چار نکات نقل کیے جارہے ہیں جن پر سب کا اتفاق تھا۔

(۱) ایک مجلس میں تین طلاق کے طلاقِ مغلظہ بائنہ ہونے کا مسئلہ اجماعی اور قطعی نہیں ہے اس میں سلف ہی کے زمانے سے اختلاف موجود ہے۔

(۲) فقہی جزئیات و تفصیلات سے قطع نظر مندرجہ ذیل دو صورتوں کے بارے میں مجلس مذاکرہ کی رائے یہ ہے۔

(۱) اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے طلاق، طلاق، طلاق کہتا ہے اور کہتا ہے کہ میری نیت صرف ایک طلاق دینے کی تھی میں نے طلاق کا لفظ تاکید کے لئے دہرایا تھا تو اس کی اس بات کو باور کیا جائے گا اور یہ طلاق، طلاق مغلظہ بائنہ نہ ہوگی۔

(۲) اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے کہتا ہے "تجھے تین طلاق"، مگر وہ حلفیہ بیان دیتا ہے کہ میری نیت تین طلاق دینے کی نہیں تھی میں تو یہ سمجھا تھا کہ جب طلاق کا لفظ کہے بغیر طلاق واقع نہیں ہوتی اس لئے میں نے تین طلاق کے الفاظ استعمال کئے تھے تو اس کی بات باور کی جائے گی اور یہ طلاق طلاق مغلظہ بائنہ شمار نہ ہوگی۔

(۳) اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ مسلمانوں کو طلاق کا صحیح طریقہ بتایا جائے اور ان پر واضح کیا جائے کہ ایک مجلس میں تین طلاق دینے کا طریقہ بدعت و معصیت اور عورت کے حق میں ظلم و زیادتی ہے۔ طلاق کے اس غلط طریقے سے مسلمانوں کو اجتناب کرنا چاہیئے اور طلاق دینا ضروری ہو تو ایک طلاق پر بس کرنا چاہیئے اور یہ طلاق بھی عورت کی پاکی کی حالت میں دینی چاہیئے جس میں شوہر نے اس سے مقاربت نہ کی ہو۔

یہ احمد آباد کے سیمنار کی مختصر روداد تھی اب ہم اپنے چند تاثرات پیش کرنا چاہتے ہیں

اسلامک ریسرچ سنٹر احمد آباد کا کارنامہ

تین یکجائی طلاقوں کے مسئلے پر مجلس مذاکرہ کا انعقاد اسلامک ریسرچ سنٹر احمد آباد کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس کی شاید کوئی مثال ہندوستان کی مذہبی تاریخ میں نہیں ملتی یا کم سے کم راقم الحروف کے علم میں نہیں ہے۔ اس مسئلے پر دونوں طرف سے کتابیں لکھی گئی ہیں، کتابچوں، رسالوں اور اخبارات میں مناظرانہ مضامین لکھے گئے ہیں لیکن کسی ایک مجلس میں دونوں نقطہ ہائے نظر کے اہل علم جمع ہو کر تحقیقی مقالے پیش کریں اس پر انتہائی سنجیدہ اور خوشگوار فضا میں گفتگو کریں اور پھر کسی متفقہ نتیجے تک پہنچیں اس کی ایک کوئی مثال مجھے معلوم نہیں۔ اس لحاظ سے اسلامک ریسرچ سنٹر احمد آباد کے کارکن مبارکباد کے مستحق ہیں انھوں نے مختلف فیہ دینی و مذہبی مسائل پر باہمی سنجیدہ و تحقیقی بحث و تمحیص کی ایک اچھی داغ بیل ڈالی ہے امید کی جاسکتی ہے کہ دوسرے اہل علم بھی اس کام کی طرف توجہ کریں گے۔

مقالات کی سنجیدگی اور ان کا علمی انداز بیان

بیک کلمہ یا بیک مجلس تین طلاقوں کا مسئلہ صدیوں سے ایک ایسا مسئلہ بن گیا ہے جس میں جذباتیت داخل ہو گئی ہے۔ اردو میں اس مسئلے پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں یا جو مقالات و مضامین شائع کئے گئے ہیں وہ تحقیقی کم اور مناظرانہ زیادہ ہیں اس لئے اس کا اندیشہ موجود تھا کہ اس مجلس مذاکرہ کے مقالات بھی کہیں جذباتیت اور مناظرانہ

انداز بیان کا شکار نہ ہو جائیں لیکن شکر ہے کہ جو مقالات پڑھے گئے ان میں کسی میں بھی مناظرہ کا انداز نہ تھا بلکہ سب کے سب سنجیدہ، تحقیقی اور علمی انداز بیان کے حامل تھے اور یہی وجہ ہے کہ یہ مجلس مذاکرہ ایک متفقہ نتیجے تک پہنچ سکی۔

اسلامک ریسرچ سنٹر کی فیاضی و مہمان نوازی

یہ ادارہ اس لحاظ سے بھی قابل تعریف ہے کہ اس نے اپنے مہمانوں کے قیام و طعام کا انتظام کرنے اور مصارف آمد و رفت ادا کرنے میں فیاضی کا ثبوت دیا اور حتی الوسع مہمانوں کو آرام پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

مہمانوں کو آرام پہنچانے میں ہمارے احمد آباد کے رفقا شکریے کے مستحق ہیں۔ ان کی سرگرمی اور خلوص نے متاثر کیا۔ امیر حلقہ گجرات جناب حبیب الرحمٰن بھی ہر وقت مستعد رہے اور ان کی مستعدی نے دوسروں کو بھی مستعد رکھا۔ ہم ان سب کے شکر گزار ہیں

ماہنامہ زندگی کا آئندہ خاص نمبر

احمد آباد ہی میں یہ خیال آیا تھا کہ یہ مقالات ماہنامہ زندگی کے ایک خاص نمبر میں شائع کئے جائیں جب میں احمد آباد سے دہلی واپس آیا تو دعوت ٹرسٹ کے محترم چیرمین جناب محمد یوسف سے اس کا ذکر کیا اور اجازت طلب کی۔ انھوں نے اجازت دیدی ہے اور یہ طے ہوا ہے کہ جنوری و فروری ۱۹۷۴ء کا مشترکہ شمارہ تین یکجائی طلاقوں کے مسئلے پر شائع کیا جائے۔ اس خاص نمبر میں مجلس مذاکرہ کے مقالات بھی شائع کئے جائیں گے اور اس مسئلے سے متعلق کچھ دوسری چیزیں شائع ہوں گی۔

دسمبر ۱۹۷۳ء کے اس آخری شمارے میں متعدد اعلانات شائع کئے جا رہے ہیں متعلقہ اشخاص سے گزارش ہے کہ وہ انہیں توجہ سے پڑھیں۔

اعلان

جنوری ۷۴ء کا شمارہ شائع نہیں ہوگا بلکہ جنوری کی آخری تاریخوں میں خاص نمبر شائع ہوگا جو جنوری و فروری کا مشترکہ شمارہ ہوگا۔

منیجر زندگی رام پور

تازہ ترین مطبوعات

اولیاء اللہ از سید احمد عروج قادری۔ صفحات ۵۶ سائز ۲۰×۳۰/۱۶

قیمت:۔ ۷۵ پیسے

اولیاء اللہ کی تعریف قرآن وسنت کی روشنی میں

اولیاء اللہ کے بارے میں جو خیالات پھیلے ہوئے ہیں ان پر اظہار خیال

اولیاء اللہ کے بارے میں وہی خیالات رکھے جائیں جو کتاب وسنت سے ثابت ہوں۔ یہ کتاب ہر خاص وعام کے لیے نہایت ضروری ہے۔

تربیتی کہانیاں

از: مائل خیر آبادی

اول تا چہارم ہر ایک ۴۰ پیسے —— چھوٹی چھوٹی کہانیوں کا یہ سٹ بچوں کے لیے تیار کرایا گیا ہے۔ چھوٹے بچوں کو مائیں ان کہانیوں کو پڑھکر سنایا کریں۔ بچوں کے ذہن کو سنوارنے میں اس مفید سٹ سے مدد لیں۔ بڑے خود بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

- تجدید احیاء دین کا انگریزی ترجمہ قیمت -/۴ روپے
- مسلم پرسنل لا انگریزی (علیگڑھ سیمینار کی روداد) قیمت -/۶ روپے ڈی لکس -/۸ روپے
- پردہ (آفسٹ) سائز ۲۳×۳۶/۱۶ پیپر بیک ۵/۵۰ روپے ڈی لکس ۷/۵۰ روپے

مرکزی مکتبہ اسلامی۔ دھلی ۱۱۰۰۰۶

دسمبر ۱۹۷۳ء میں

جن خریداروں کی مدت خریداری ختم ہو رہی ہے

دسمبر کے موجودہ شمارے کے ساتھ مندرجہ ذیل خریداروں کے چندے ختم ہو گئے ہیں۔ براہ کرم سالانہ چندہ -/12 منی آرڈر سے فوری ارسال فرمائیں تاکہ جنوری کے آخر میں شائع ہونے والا 3/50 قیمت کا "خاص نمبر" سادہ ڈاک سے حاضر خدمت کر دیا جائے۔ اگر آپ خریداری بند کرنا

چاہتے ہیں تو براہ کرم ہمیں مطلع فرمادیں۔

۵ا جنوری ۷۴ء تک اگر آپ کا چندہ نہیں آیا۔ ورنہ آپ نے خریداری بند کرنے کے لیے کوئی اطلاع دی تو ہم سمجھیں گے کہ آپ آئندہ شمارہ وی۔پی سے چاہتے ہیں۔ اس صورت میں جنوری فروری کا مشترکہ شمارہ "خاص نمبر" سالانہ چندہ -/12، اور وی پی فیس 1/25 کل 13/25 کی وی پی سے حاضر ہوگا۔ امید ہے وی پی وقت پر وصول فرما کر اخلاقی ذمہ داری کا ثبوت دیں گے۔

خریداری ۸۰۳ محمد اقبال انصاری صاحب علیگڈھ — خریداری ۸۵۷ ڈاکٹر ایچ این سید صاحب وساڈا

۸۳۹ اسلامی لائبریری جوگی پیٹ۔ انڈول — ۸۴۴ حافظ محمد ادریس صاحب نیول گنج، اناؤ

۱۰۲۱ محمد غوث محی الدین صاحب ناظم بستاوریٹ کرنول — ۱۰۵۲ ایم اے منظور صاحب۔ پٹنہ

۱۱۹۵ کے فضل اللہ صاحب تھنکارہ۔ کیرلا — ۱۱۹۸ یو۔سی موسیٰ صاحب اپی ننگڈی ساؤتھ کنارہ

۱۲۰۱ جلال الدین خاں صاحب کھڑک پور۔ مدنہ پور — ۱۲۰۹ عبدالرزاق بیگ صاحب مانکواڑہ ایوت محل

۱۲۱۵ شیخ امام صاحب اگرگیر۔ عثمان آباد — ۱۲۲۳ اسلامی دارالمطالعہ۔ شب پور۔ ہوڑہ

۱۶۵۶ نج محمد صاحب بلرام پور۔ گونڈہ — ۱۶۵۸ عبدالوحید صدیقی صاحب راجہ کا تاجپور۔ بجنور

۱۶۵۹ عبدالکار داری صاحب۔ بھانڈوپ بمبئی — ۱۶۶۰ سید جلال الدین صاحب۔ ترنی پورہ کشمیر

۱۶۶۱ جناب رفیع احمد صاحب بنگلور — ۱۶۶۲ سید شبیر احمد صاحب بنگلور

۱۶۶۶ ابوالحفیظ صدیقی صاحب سرینگر — ۱۶۶۵ چیرمین صاحب اسلامک اسٹڈی سرکل سرینگر

۱۶۹۵ موسے اسمٰعیل ڈاگیہ صاحب پور بندر — ۱۷۰۳ اشتیاق احمد صدیقی صاحب بھلسر۔ بارہ بنکی

۱۷۰۶ اسٹر جی یو رچھوانی مندرگی دھارواڑ — ۱۷۳۶ دفتر جماعت اسلامی۔ ململ۔ دربھنگہ

۱۷۵۷ لائبریرین مولانا آزاد لائبریری علیگڈھ — ۱۷۶۶ جمیل احمد نگینوی صاحب نگینہ۔ بجنور

۱۷۷۹ محمد سلیم خاں صاحب سرائے بھجولی فیض آباد — ۱۷۸۰ جناب ایم اے لطیف صاحب بنگلور

۱۷۸۴ حلقہ جماعت اسلامی۔ کوکل۔ پلوامہ کشمیر — ۱۷۹۸ اسلامی اسٹڈی سرکل داونگیری میسور

۱۷۹۸ اسلامی اسٹڈی سرکل داونگیری میسور — ۱۸۰۱ عبدالرشید بٹ صاحب تاری گام دیوسر کشمیر

۱۸۰۹ بدرالدین صاحب برہانپور — ۱۸۳۴ سکریٹری اسٹوڈنٹ ایسوسی ایشن پاراوانا کلم کیرلا

۱۸۳۵ عبدالرب ناصر پاشا صاحب آلنڈ میسور — ۱۸۸۹ ڈاکٹر عبداللطیف صاحب وارانسی بالاگھاٹ

۱۸۹۳ انجمن اصلاح اللسان۔ دہلی — ۱۸۹۷ عبدالوحید خاں صاحب راوڑ کیلا

۱۹۴۹ محمد علی صاحب سینتھ پلی یکھسم — ۲۰۵۱ شیخ محبوب علی صاحب۔ یوسف پیٹھ بلاک

۲۰۵۲ یوسف علی صاحب تاجر یوسف پیٹھ میدک — ۲۰۶۳ سید عبداللہ الوحش صاحب۔ گودھرا

۲۰۱۱ ماجد سنز۔ مرادآباد — ۲۰۹۶ ڈاکٹر اظہار الحق صاحب۔ مختار گنج۔ نالند